فتاویٰ ثنائیہ مدنیہ

تالیف شیخ العرب والعجم مفتی حافظ ثناء اللہ مدنی مدظلہ العالی

فاضل مدینہ یونیورسٹی

تقدیم

فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف

جمع وترتیب،

حافظ عبد الرؤف خان

عبد القدوس السلفی

فَسْئَلُوٓا أَهْلَ الذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ

جلد سوم

كلية القرآن الكريم والتربية الإسلامية

فتاویٰ ثنائیہ مدنیہ

تالیف شیخ العرب والعجم مفتی حافظ ثناء اللہ مدنی مدظلہ العالی

فاضل مدینہ یونیورسٹی

تقدیم

فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف

جمع وترتیب،

حافظ عبدالرؤف خان

عبدالقدوس السلفی

فَسْئَلُوٓا أَهْلَ الذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ

جلد سوم

كلية القرآن الكريم والتربية الإسلامية

کتاب الجنائز، صیام، زکاۃ، حج اور دیگر مسائل پر مشتمل
"الاعتصام" اور "محدث" کے فتاوی جات

فتاویٰ ثنائیہ مدنیہ

تالیف
شیخ العرب والعجم مفتی حافظ ثناء اللہ مدنی مدظلہ العالی
فاضل مدینہ یونیورسٹی

تقدیم
فضیلۃ الشیخ حافظ صلاح الدین یوسف

جمع و ترتیب
حافظ عبد الرؤف خان، عبد القدوس السلفی

جلد سوم

كلية القرآن الكريم والتربية الإسلامية

نام کتاب

فتاویٰ

شیخ العرب والعجم مفتی حافظ ثناء اللہ مدنی مدظلہ العالی

جمع وترتیب، تبویب وتخریج : ـــــ حافظ عبدالرؤف خان، عبدالقدوس السلفی

اشاعت ـــــ نومبر 2017ء

ناشر ـــــ کلیۃ القرآن الکریم والتربیۃ الاسلامیۃ

مطبع

ثوبان نعمان پرنٹنگ پریس، لاہور
0300-8661763

ملنے کے پتے

① مکتبہ اسلامیہ®

(لاہور) G/F-26 بادیہ حلیمہ سینٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
0300-0997821-22-23-24، 042-37244973-37232369

(فیصل آباد) بیسمنٹ سمٹ بینک بالمقابل شیل پٹرول پمپ کوتوالی روڈ، فیصل آباد
0300-0997826-27-28، 041-2631204-2641204

0300-8661763 0321-8661763
www.facebook.com/maktabaislamia1
maktabaislamiainfo@gmail.com
www.maktabaislamia.com.pk

② حافظ صہیب انور مدنی C-476 پاک عرب فیروز پور روڈ لاہور، موبائل نمبر: 0306-3348710

③ حافظ عبدالرؤف خان مکان نمبر1، گلی نمبر 3، نیو یونین پارک سمن آباد لاہور/ 78 چوہدری کالونی سمن آباد لاہور
موبائل: 0334-4382195

④ جامعہ عائشہ صدیقہ للبنات سرھالی کلاں ضلع قصور

بسم الله الرحمن الرحيم

انتساب

محترم والدین اور

شیخی العظیم علامۃ الدھر مجتہد العصر

حافظ عبداللہ محدث روپڑی

کے نام

جن کا مقام فتویٰ نویسی میں

سند کی حیثیت رکھتا ہے۔

رحمہم اللہ تعالیٰ

فہرست مضامین

کتاب الجنائز

کتاب الصوم

مسائل عید الفطر و صدقۃ الفطر

زکوٰۃ، عشر، صدقات

حج وعمرہ

قربانی (مسائل قربانی)

جہاد

البیعة

آداب (کتاب اللباس)

کھانے پینے کے آداب

تاریخی و تحقیقی مسائل

تلاوتِ قرآن اور ذکر و اذکار

متفرقات

عرضِ مؤلف

إِنَّ الْحَمْدَلِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ اَمَّا بَعْدُ!

اس سے قبل میرے فتاویٰ کی پہلی اور دوسری جلد محترم حافظ عبد الشکور بن علم الدین شائع کر چکے ہیں۔ جزاہ اللہ خیراً۔

اس سے پہلے ہم بھی کمی بیشی کے ساتھ دوسری جلد بنام ''فتاوی حافظ ثناء اللہ مدنی'' شائع کر چکے ہیں۔

اب تیسری جلد تلمیذ رشید حافظ عبدالرؤف خان بن عبدالوکیل خان شائع کر رہے ہیں، جو کتاب الجنائز، کتاب الصیام، کتاب الحج، آداب اور دیگر متفرق مسائل پر مشتمل ہے۔ جزاہ اللہ احسن الجزاء

اور میں حافظ صلاح الدین یوسف ﷾ کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے کتاب ہذا کا مفصل مقدمہ لکھ کر چار چاند لگا دیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے علم و عمل میں برکت فرمائے اور تادیر ان سے دینِ حنیف کی خدمت لیتا رہے اور ان کی تحریرات کو مقامِ قبولیت سے نوازے۔ آمین

اور ہمارے وہ مخلص احباب جو اس کتاب کی اشاعت میں مادی اور معنوی تعاون فرما رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی مساعی جمیلہ کو قبول فرمائے۔ آمین۔

الراقم

ثناء اللہ بن عیسیٰ خان المدنی

۱۰ رمضان المبارک ۱۴۳۸ ہجری بمطابق ۶ جون ۲۰۱۷ م

حرفِ چند

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام علی رسوله الكريم. وبعد!

سب سے پہلے اللہ رب العزت کی مہربانی ہے اس کی توفیق سے دینی خدمت کی سعادت حاصل ہے۔ پھر میرے والدین کی دعاؤں کے ساتھ ساتھ میرے اساتذہ کرام کی دعائیں اور کوششیں ہیں خصوصاً استاذ گرامی استاذ الاساتذہ محترم حافظ ثناء اللہ مدنی ﷾ -متعنا الله بطول حياته- کہ جن کے زیر سایہ ''فتاویٰ حافظ ثناء اللہ مدنی'' کی دوسری اور تیسری جلد کی ترتیب کا کام کیا ان کے حکم اور اجازت سے یہ کام کیا ہے اور ان شاء اللہ مزید جاری ہے اور اس سلسلے میں عبدالقدوس بھائی کا کافی تعاون شامل ہے۔

اس سے پہلے "الوصائل فی شرح الشمائل" کی نظر ثانی کئی مرتبہ کی اور اس کو تیاری کے تکمیلی مراحل تک پہنچایا۔ مزید برآں "جائزة الاحوذي" کی قراءت مع متن حضرت الاستاذ شیخ الحدیث حافظ ثناء اللہ المدنی پر مکمل طور پر کی اور میرے ساتھ قاری محمد احمد طور بھی تھے اور حافظ صہیب انور مدنی بھی شریک مجلس رہے۔ اس طرح پروف ریڈنگ کے بعد کتاب کا دوسرا طبع منظر عام پر آیا اور چند سالوں سے عون الباری شرح صحیح البخاری کے کام میں بھی محترم حافظ صاحب کے ساتھ معاون کی حیثیت سے باقاعدہ کام کر رہا ہوں۔

اللہ تعالیٰ اس معمولی سی کاوش کو قبولیت سے نوازے میرے لیے اور میرے تمام معاونین کے لیے اسے صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین

ضروری وضاحت:

مجمع فقہائے شریعت، امریکہ کی فتاویٰ کمیٹی کے چند سوالات کے جوابات بھی فتاویٰ میں شامل کیے گئے ہیں: اکتوبر ۲۰۰۲ء میں امریکہ کے دارالحکومت واشنگٹن میں ''مجمع فقہائے شریعت، امریکہ (Assembly of Muslim Jurists of America) کا تاسیسی اجلاس منعقد ہوا، جس میں دنیا بھر سے اہل علم کو دعوت دی گئی۔ پاکستان سے شیخ الحدیث حافظ ثناء اللہ مدنی اور مولانا ارشاد الحق اثری، فیصل آباد رکن کی حیثیت سے اس میں شامل ہوئے۔ مجمع کا مرکزی دفتر میری لینڈ میں قائم کیا گیا۔ اس اجلاس میں ایک کمیٹی تشکیل پائی جس کو ہمہ وقت شرعی سوالات کے جوابات دینے کی ذمہ داری سونپی گئی۔

مئی ۲۰۰۳ء میں امریکہ کی ریاست ''کیلیفورنیا'' کے شہر ''ساکرامنٹو'' میں بھی ایک اہم دعوتی کانفرنس تھی، جس میں

محترم حافظ ثناء اللہ مدنی ﷾ بھی شریک تھے۔ یہاں ''مجمع'' کے جنرل سیکرٹری ڈاکٹر صلاح صاوی سے ان کی ملاقات ہوئی تو انھوں نے محترم حافظ صاحب کو کمیٹی کی طرف سے صادر شدہ چند فتوے پیش کیے۔ چونکہ سوالات کی نوعیت ایسی تھی جو عموماً یورپ میں بسنے والے مسلمانوں کو درپیش ہوتے ہیں۔ اسی طرح جوابات بھی کسی ایک عالم دین کی طرف سے دینے کی بجائے باقاعدہ مجلس علما نے اجتماعی کاوش کے طور پر ان کے بارے میں شرعی رہنمائی پیش کی، اس بناء پر جوابات کی افادیت اور علمی حیثیت بہت بڑھ گئی۔ چنانچہ اِفادۂ عام کی غرض سے ان کا اُردو ترجمہ کروایا گیا۔ ترجمہ کروانے میں بھی سلاست اور روانی کو بطورِ خاص ملحوظ رکھا گیا۔

بعض ایسے فتاویٰ جات جن میں کوئی تشنگی محسوس ہوتی تھی، ان پر حضرت شیخ الحدیث حافظ ثناء اللہ مدنی صاحب سے نظرثانی کی درخواست کی گئی۔ سوالات کی اہمیت کے پیشِ نظر بعض سوالات (مغربی مسلمانوں کے روزمرہ مسائل) کے نام سے اس فتاویٰ میں شامل کیے گئے۔

حافظ عبدالرؤف خان
۵ محرم الحرام ۱۴۳۹ھ
۲۶ ستمبر ۲۰۱۷ء

صاحب کتاب کے بارے میں حافظ عبدالرشید اظہر رحمہ اللہ کے تاثرات

زیر نظر مجموعہ شیخ الحدیث والفقہ، استاذ العلماء والعالم الفقیہ الاصولی النظار محترم القام حافظ ثناء اللہ مدنی بن عیسیٰ حفظہ اللہ کے ان فتاویٰ پر مشتمل ہے جو سالہا سال سے ملکی رسائل وجرائد میں چھپ رہے ہیں۔ خصوصاً ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور میں۔ موصوف کی شخصیت جہاں تدریس حدیث وفقہ میں اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے وہاں آپ افتاء وارشاد میں بھی خصوصاً اہل حدیث حلقوں میں مرجع کی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ (متعنا اللہ بطول حیاتہ) موصوف نے از اول تا آخر علوم متداولہ کی جملہ کتب حضرت العلام مجتہد العصر حافظ محمد عبداللہ محدث روپڑی رحمہ اللہ سے پڑھیں، پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے ''جامعہ اسلامیہ'' مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ جہاں ان کو ایسے نادر روزگار اساتذۂ کرام سے کسب فیض کا موقع ملا جو کم ہی کسی سعادت مند کو میسر آتا ہے۔

دور حاضر میں پورے عالم اسلام میں جن لوگوں کا نام اور کام لوحِ اعزاز واکرام پر جلی حروف سے ثبت ہے وہ پانچ اساطین واعلام علم ودعوت ہیں:

- حافظ عبداللہ محدث روپڑی رحمہ اللہ (متوفی ۱۳۸۴ھ الموافق ۱۹۶۴ء)
- الشیخ محمد الأمین الشنقیطی رحمہ اللہ (متوفی ۱۳۹۳ھ الموافق ۱۹۷۴ء)
- حافظ محمد محدث گوندلوی رحمہ اللہ (متوفی ۱۴۰۵ھ الموافق ۱۹۸۵ء)
- الشیخ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ (متوفی ۱۴۲۰ھ (محرم) الموافق ۱۹۹۹ء (مئی))
- الشیخ محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ (متوفی ۱۴۲۰ھ (جمادی ثانیہ) الموافق ۱۹۹۹ء (اکتوبر))

ان میں سے اول الذکر تفقہ فی الدین اور مجتہدانہ بصیرت میں اپنی مثال آپ تھے۔ ثانی الذکر تفسیر القرآن بالقرآن اور فہم علوم القرآن میں بے نظیر ملکہ رکھتے تھے، ثالث الذکر علمی گہرائی، زہد وتقوی اور کثرت تلامذہ میں یکتائے روزگار تھے، رابع الذکر خدمت دین، اعتدال ومروت، فقہی استدلال اور احکام شریعت کے باہمی ربط میں امامت کا درجہ رکھتے تھے اور آخر الذکر معرفت حدیث وعلوم حدیث، تصحیح وتضعیف اور نقد رجال وعلل حدیث میں سند کی حیثیت رکھتے تھے، اور عصر حاضر میں جرح وتعدیل کے باب میں ان کا کلام قول فیصل ہے۔ ان سب کی مشترکہ خصوصیت یہ ہے کہ ہر

حال میں درس وتدریس کتاب وسنت اور تعلیم وتربیتِ امت میں مشغول رہے اور کبھی بھی اس منصب شریف سے منقطع نہیں ہوئے، رحمہم اللہ تعالیٰ. صاحب کتاب حافظ صاحب ممدوح کو ان سب سے تحصیلِ علم کا شرف حاصل ہے۔ ایسی عظیم الشان سعادت بھی کم خوش نصیبوں کو ہی حاصل ہوتی ہے۔

﴿ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ﴾ (القرآن)

جیسے ان سب کا پرتو موصوف میں نظر آتا ہے تو قع کی جاسکتی ہے کہ ان کا یہ مجموعۂ فتاویٰ ان جملہ خصوصیات کا آئینہ دار ہوگا، ان شاء اللہ. جبکہ ان کے ذاتی اوصاف اور شخصی محاسن اس پر مستزاد ہیں، دینی قدریں اور شرعی حدود و قیود مانع ہیں ورنہ موصوف کی شخصیت کے بارے میں کہنے اور لکھنے کو بہت کچھ ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اجرِ جزیل سے نوازے، ان کے علم وعمل اور عمر میں برکت فرمائے!! آمین!

یہ چند سطور بھی نوک قلم پر اس لئے آ گئی ہیں کہ یہ رسم دنیا ہے اور آداب الفت ومحبت بھی، حق اخوت ہے اور ان کی خدمات کے اعتراف کا تقاضا بھی۔ ورنہ ممدوح محترم تعارف کے محتاج ہیں نہ تعریف کے شائق، آنجناب اللہ کی توفیق اور اس کے فضل وکرم سے مدح وستائش سے بے نیاز اور خدمت دین کے جذبہ سے مالا مال ہیں، درس وتدریس اور نشر واشاعت قرآن وسنت اور فتویٰ نویسی میں ان کی خدمات کا دائرہ بحمد اللہ بہت وسیع ہو چکا ہے، ان سطور کا مقصد صرف یہ ہے کہ قارئین کرام کا شوق مطالعہ فزوں سے فزوں تر ہو اور ان کی دین سمجھنے اور سیکھنے کی تڑپ کے لئے مہمیز کا کام دیں۔ والله من وراء القصد.

ربنا تقبل منا إنك أنت السميع العليم.

ڈاکٹر حافظ عبدالرشید اظہر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ

اسلام آباد

۱۷ ذی القعدہ ۱۴۲۳ھ ...... ۲۱ جنوری ۲۰۰۳ م

تقدیم

منصب افتاء کی اہمیت، تقاضے اور اس میں اہل حدیث کا امتیاز

[از...... حافظ صلاح الدین یوسف ﷾]

فَتْوٰی کے معنی (جسے فُتْیَا بھی کہا جاتا ہے) اظہارِ رائے اور وضاحت کرنے کے ہیں، لیکن شرعی اصطلاح میں اس سے مراد وہ وضاحت ہوتی ہے جس میں کسی پیش آمدہ مسئلہ، واقعہ یا اِشکال کی بابت شرعی حکم بیان کیا جاتا ہے۔ گویا شریعت کی روشنی میں کسی اشکال کا حل پیش کرنا، کسی مسئلے کی وضاحت کرنا اور کسی واقعے کی بابت جواز یا عدمِ جواز کی تشریح کرنا ''فتویٰ'' کہلاتا ہے۔

عہدِ رسالت میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے کوئی ایسا واقعہ یا اشکال پیش آتا، جس کی بابت ان کو شریعت کا حکم معلوم نہ ہوتا، تو صحابہ رضی اللہ عنہم رسول اللہ ﷺ سے استفسار کرتے، تب اللہ تعالیٰ قرآنِ مجید میں اس کی وضاحت فرما دیتا یا وحیٔ الٰہی کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ اس کا جواب عنایت فرما دیتے۔

اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی مفتی ہے اور رسول اللہ ﷺ بھی صاحب افتاء تھے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی بابت یہ الفاظ موجود ہیں: ﴿اَللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ﴾ (النساء:۱۲۷) ''اللہ تعالیٰ تمھیں ان عورتوں کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے (جن کی بابت تم نے استفسار کیا ہے)'' ﴿اَللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ﴾ (النساء:۱۷۶) ''اللہ تمھیں کلالہ کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے۔'' اور رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے پوچھنے پر بہت سے احکام و مسائل بیان فرمائے، یہ گویا نبی ﷺ کے فتوے ہوئے۔ یہ فتوے احادیث کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔

اس تفصیل سے چند باتیں واضح ہوتی ہیں:

① مفتی کو قرآنی احکام کا بھی پورا علم ہونا چاہیے اور ذخیرۂ احادیث پر بھی اس کی نظر گہری اور وسیع ہونی چاہیے، علاوہ ازیں اسے مجتہدانہ بصیرت بھی حاصل ہو، تاکہ ہر پیش آمدہ مسئلے کا حل وہ قرآن و حدیث کی روشنی میں پیش کر سکے، کوئی نص صریح نہ ہو تو قرآن و حدیث کے نظائر کو سامنے رکھتے ہوئے اس کی حلت و حرمت اور جواز و عدم جواز کا فیصلہ کر سکے۔

② وہ کسی حالت میں بھی قرآن و حدیث اور ان کے نظائر سے صرفِ نظر کر کے محض آرائے رجال اور اقوال ائمہ

کی روشنی میں فتویٰ نہ دے، کیونکہ وہ کسی خاص فقہ یا امام کا نمائندہ نہیں، بلکہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے منصب افتاء کا جانشین ہے، جس کا تقاضا یہ ہے کہ اس کا فتویٰ صرف اور صرف اللہ و رسول کے بتائے ہوئے احکام اور شریعت کے اصول وضوابط کے دائرے میں ہو، نہ کہ اس سے متجاوز ہو۔

۴ مفتی کے اندر فقہی جمود نہیں، بلکہ فقہی توسع ہو، کیونکہ نئے نئے مسائل میں عوام کو سہولت اسی وقت مل سکتی ہے جب مفتی فقہی جمود سے پاک اور اسلاف کے علمی ذخیرے سے بلاتعصب استفادہ کرنے کا قائل ہو۔ ورنہ وہ قرآن و حدیث کی نصوص کو بھی نظر انداز یا ان کی دور از کار تاویل کرے گا اور عوام کی سہولت کی بھی اسے پرواہ نہ ہوگی۔ یوں وہ اپنے فتویٰ میں اَوفق بالکتاب دالسنۃ کا اہتمام کرے گا اور نہ ارفق بالناس ہی کا۔ جب کہ یہ منصب ان دونوں ہی باتوں کا متقاضی ہے۔

علمائے اہل حدیث کا امتیاز:

الحمد للہ علمائے اہل حدیث کے فتاویٰ مذکورہ خصوصیات اور منہج محدثین ہی کے حامل ہوتے ہیں، کیونکہ انہی کی تدریسی، تبلیغی اور علمی خدمات کے نتیجے میں برصغیر پاک و ہند میں فقہی وتقلیدی جمود ٹوٹا اور عمل بالحدیث کو فروغ حاصل ہوا، اس لیے اہل حدیث میں شخصیت پرستی ہے نہ اکابر پرستی اور نہ ہی کسی ایک فقہ کی پابندی پر زور۔ ان کے عوام بھی کسی مسئلے میں علماء کی طرف رجوع کرتے ہیں تو اس سے ان کا مقصد صرف قرآن و حدیث کی روشنی میں اس کا حل معلوم کرنا ہوتا ہے اور علماء بھی اپنی فہم کی حد تک سوال کا جواب دیتے وقت قرآن و حدیث کے دائرے سے تجاوز نہیں کرتے۔ بنابریں منصب افتاء کی اہمیت کو صرف علمائے اہل حدیث ہی سمجھتے اور اس کے تقاضوں کو بھی وہی ادا کرتے ہیں۔ كَثَّرَ اللّٰهُ سَوَادَهُمْ.

یہی وجہ ہے کہ محدثین اور ان کے فکر وعمل کے وارث عاملین بالحدیث کے علاوہ، سب ہی گروہ حدیثِ رسول کو اُس طرح شرح صدر کے ساتھ قبول کرتے ہیں، نہ قبول کرنے کے لیے تیار ہی ہیں، جس طرح کہ اس کے ماخذِ شریعت ہونے کا تقاضا ہے، جب کہ صحیح گروہ وہی ہوسکتا ہے جو احادیثِ صحیحہ کو ذہنی تحفظ کے بغیر قبول کرے اور اس پر عمل کرے۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر حدیث واقعی ماخذِ شریعت ہے، یعنی اسے تشریعی اور تقنینی حیثیت حاصل ہے (اور بلاشبہ اسے یہ مقام اور حیثیت حاصل ہے) تو پھر ہر فرقے کا اپنے ذہنی تحفظات اور مخصوص فقہی استنباطات واجتہادات کو اہمیت دینا اور حدیث کو بہ لطائف الحیل نظر انداز کر دینا یا کسی نہ کسی خوش نما خانہ ساز اصول کے ذریعے سے اسے مسترد کر دینا، اسے کس طرح مستحسن قرار دیا جاسکتا ہے؟ یا کس طرح اسے حدیثِ رسول کو ماننا تسلیم کیا جاسکتا ہے؟

حدیثِ رسول کو ماخذِ شریعت ماننے کا مطلب اور تقاضا تو یہ ہے کہ جو حدیث، محدثانہ اصولِ جرح و تعدیل

کی روشنی میں صحیح قرار پائے، اسے مان لیا جائے اور جو ضعیف قرار پائے، اسے نا قابل استدلال تسلیم کیا جائے۔ محدثین کا یہی اصول اور منہج ہے اور یہی منہج یا طرزِ فکر و عمل امتِ مسلمہ کے باہمی اختلافات کے ختم یا کم سے کم کرنے کا واحد طریقہ یا اس کا ضامن ہے۔ اس کے برعکس رویہ کہ صحتِ سند کے باوجود اپنی ہی یا کسی مخصوص فقہی رائے ہی کو ماننا اور ضعفِ سند کے باوجود ضعیف حدیث ہی کو ترجیح دینا، اسے نہ حدیثِ رسول کو ماننا ہی تسلیم کیا جاسکتا ہے اور نہ اس طریقے سے فقہی اختلافات اور حزبی تعصّبات کا خاتمہ ہی ممکن ہے، جب کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان متحد ہوں، فکر و عمل کی یک جہتی ان کے اندر پیدا ہو اور دشمن کے مقابلے میں وہ بنیانِ مرصوص بن جائیں۔ اور ایسا ہونا فقہی و حزبی اختلافات و تعصّبات کی شدت ختم ہوئے بغیر ممکن نہیں۔

غیر محدثانہ روش اور اس کے نقصانات:

یہ غیر محدثانہ رویہ، جس نے امتِ واحدہ کو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہے، کن لوگوں نے اپنایا ہوا ہے؟ اور کیوں اپنایا ہوا ہے؟ اور اسے چھوڑنے کے لیے وہ تیار کیوں نہیں ہیں؟ ان تینوں سوالوں کا جواب واضح ہے:

1. یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے محدثین کی روش سے انحراف کیا ہے جو خالص اور ٹھیٹھ اسلام کی آئینہ دار اور «مَا أَنَا عَلَيْهِ وَ أَصْحَابِيْ» کی مصداق تھی اور ہے۔
2. انھوں نے ایسا کیوں کیا؟ اس لیے کہ انھوں نے اپنے آپ کو کسی ایک فقہی مذہب سے وابستہ کر لیا جس کا اللہ نے اور اللہ کے رسول ﷺ نے قطعاً حکم نہیں دیا۔ اتباع کے بجائے، انھوں نے ابتداع (اپنی طرف سے شریعت سازی) کا اور اطاعت کے بجائے تقلید کا راستہ اختیار کیا۔

اتباع کیا ہے اور ابتداع کیا؟

اتباع کا مطلب ہے، اللہ کے رسول ﷺ کے پیچھے لگنا، کیونکہ صرف وہی اللہ کا نمائندہ ہے، اللہ نے اسی کے اتباع کا حکم دیا ہے۔ اور ابتداع یہ ہے کہ اس اتباعِ رسول سے تجاوز کر کے اپنی طرف سے کسی چیز کو واجب قرار دینا، جیسے کسی نہ کسی امام کی تقلید یا خود ساختہ فقہ کی پابندی کو لازم سمجھنا اور لازم قرار دینا۔ امتیوں کو تو اتباع کا حکم ہے نہ کہ ابتداع کا۔ اور اطاعت کا مطلب بھی صرف ﴿مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ (اللہ کی نازل کردہ باتوں) کا ماننا ہے۔ ہم اللہ کے رسول کی اطاعت و اتباع بھی اسی لیے کرتے ہیں کہ اللہ نے اپنی اطاعت کے ساتھ اپنے رسول کی بھی غیر مشروط اطاعت کا حکم دیا ہے۔ غیر مشروط اطاعت کا یہ حق صرف اللہ کے رسول ﷺ کا ہے، مخلوق میں سے کسی اور کو یہ حق حاصل نہیں۔ اسی لیے اللہ نے اپنے رسول کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا ہے۔

﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (النساء:٤/ ٨٠)

''جس نے رسول کی اطاعت کی بلاشبہ اس نے اللہ کی اطاعت کی۔''

یہ بلند مقام اللہ کے رسول کے علاوہ کسی اور کو حاصل ہے؟ نہیں، یقیناً نہیں۔ اور اللہ نے اپنے رسول کو یہ بلند مقام اس لیے دیا ہے کہ وہ اللہ کا نمائندہ ہے۔ علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ اس کی براہِ راست حفاظت و نگرانی بھی فرماتا ہے اور اسے راہِ راست (صراطِ مستقیم) سے اِدھر اُدھر نہیں ہونے دیتا۔ (دیکھئے سورۃ الاسراء: ١٧/ ٧٣، ٧٤ و نحوھا من الایات) یہ مقامِ عصمت بھی اللہ کے رسول کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں۔ ائمہ کی تقلید کو لازم قرار دینے والے کیا یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ان کے امام کو یہ مقامِ عصمت حاصل ہے؟ اس کی رائے میں غلطی کا امکان نہیں ہے؟ اس کا ہر قول اور ہر اجتہاد صحیح ہے؟ یقیناً کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اگر ایسا ہے اور یقیناً ایسا ہی ہے، تو پھر ہر مسئلے میں کسی ایک ہی شخص کی بات کو بلا دلیل ماننے کو لازم قرار دینا، (جسے اصطلاحاً اور عرفاً تقلید کہا جاتا ہے) کیا یہ اس کے لیے غیر مشروط اطاعت کا حق تسلیم کروانا اور اسے مقامِ عصمت پر فائز کرنا نہیں ہے؟

٣۔ یہاں سے اس تیسرے سوال کا جواب، کہ یہ حضرات یہ روش چھوڑنے کے لیے کیوں تیار نہیں؟ سامنے آجاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ گویا اپنی زبانوں سے عصمتِ ائمہ کا اظہار یا دعویٰ نہیں کرتے لیکن عملاً صورت حال یہی ہے کہ انھوں نے ائمۂ کرام کو ائمۂ معصومین کا درجہ دے رکھا ہے۔ اپنے امام کی ہر بات کو ﴿مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ کی طرح بلکہ اس سے بھی بڑھ کر تسلیم کرتے ہیں اور اپنی خود ساختہ فقہوں کے مقابلے میں حدیث رسول سے اعراض و گریز، ان کا وطیرہ اور شیوۂ گفتار ہے۔

ان کا یہ طرزِ عمل و فکر محدثین کے منہج و مسلک سے یکسر مختلف ہے، شیوۂ مسلمانی کے برعکس ہے اور امت کی فکری وحدت و یک جہتی کو سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والا ہے۔

ان حضرات کے بارے میں ہماری بات کوئی مفروضہ یا واہمہ نہیں، ایک حقیقتِ واقعہ ہے، شک و شبہ سے بالا ہے اور روزِ روشن کی طرح واضح ہے۔ جس کا مشاہدہ صدیوں سے ہو رہا ہے اور ہر دور کے اہل علم نے اس کا اظہار کیا ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ جن کی بابت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اہل تقلید سے کوئی مخاصمت رکھتے تھے، بلکہ پاک و ہند کے وابستگانِ تقلید تو اپنے آپ کو مسند ولی اللہ ہی کے جانشین اور فکر ولی اللہ کے وارث سمجھتے ہیں۔ شاہ صاحب نے اپنی کتابوں میں متعدد جگہ اہل تقلید کے مذکورہ رویے پر سخت تنقید کی ہے اور اسے اتباع رسول کے تقاضوں سے صریح انحراف اور ائمۂ کرام کو معصوم ماننے کے مترادف قرار دیا ہے۔ اس کی تفصیل شاہ صاحب کی کتابوں "التفهيمات الالهية، حجة الله البالغة، اور العقد الجيد وغیرہ میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ اہل تقلید کے اس رویے کے بارے میں خود اکابر علمائے احناف نے بھی اسی قسم کے تأثرات کا اظہار کیا ہے۔

اہل علم ان سے باخبر ہیں تاہم یہاں مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم کے بھی دو اقتباسات پیش کرنے مناسب معلوم

ہوتے ہیں، ان میں انھوں نے اہل تقلید کے اس رویے کا اعتراف بھی کیا ہے اور اس پر سخت افسوس کا اظہار بھی۔ مولانا تھانوی اپنے ایک مکتوب میں، جو انھوں نے مولانا رشید احمد گنگوہی مرحوم کے نام تحریر کیا، لکھتے ہیں:

''اکثر مقلدین عوام بلکہ خواص اس قدر جامد ہوتے ہیں کہ اگر قولِ مجتہد کے خلاف کوئی آیت یا حدیث کان میں پڑتی ہے (تو) اُن کے قلب میں انشراح و انبساط نہیں رہتا بلکہ اول استنکار قلب میں پیدا ہوتا ہے پھر تاویل کی فکر ہوتی ہے خواہ کتنی ہی بعید ہو اور خواہ دوسری دلیل قوی اُس کے معارض ہو بلکہ مجتہد کی دلیل اس مسئلہ میں بہ جز قیاس کے کچھ بھی نہ ہو بلکہ خود اپنے دل میں اُس تاویل کی وقعت نہ ہو مگر نصرت مذہب کے لیے تاویل ضروری سمجھتے ہیں۔ دل یہ نہیں مانتا کہ قول مجتہد کو چھوڑ کر حدیث صحیح صریح پر عمل کرلیں۔ بعض سنن مختلف فیہا مثلاً آمین بالجہر وغیرہ پر حرب و ضرب کی نوبت آ جاتی ہے۔ اور قرونِ ثلاثہ میں اس کا شیوع بھی نہ ہوا تھا بلکہ کَیْفَمَا اتَّفَقَ جس سے چاہا مسئلہ دریافت کرلیا اگر چہ اس امر پر اجماع نقل کیا گیا ہے کہ مذاہب اربعہ کو چھوڑ کر مذہب خامس مستحدث کرنا جائز نہیں، یعنی جو مسئلہ چاروں مذہبوں کے خلاف ہو اُس پر عمل جائز نہیں کہ حق دائر و منحصر ان چار میں ہے مگر اس پر بھی کوئی دلیل نہیں کیونکہ اہل ظاہر ہر زمانہ میں رہے اور یہ بھی نہیں کہ سب اہل ہوئی ہوں، وہ اس اتفاق سے علیحدہ رہے۔ دوسرے اگر اجماع ثابت بھی ہو جاوے مگر تقلید شخصی پر تو کبھی اجماع بھی نہیں ہوا۔''

اس مکتوب میں اس سے قبل مولانا تھانوی نے یہ لکھا ہے، یہ بھی بڑا قابل عبرت ہے، لکھتے ہیں:

''تقلید شخصی کہ عوام میں شائع ہو رہی ہے اور وہ اس کو علماً اور عملاً اس قدر ضروری سمجھتے ہیں کہ تارکِ تقلید سے، گو کہ اس کے تمام عقائد موافق کتاب وسنت کے ہوں، اس قدر بغض و نفرت رکھتے ہیں کہ تارکین صلاۃ فساق و فجار سے بھی نہیں رکھتے اور خواص کا عمل وفتویٰ وجوب اس کا مؤید ہے۔''

مولانا تھانوی ایک اور مقام پر تقلید و عدم تقلید کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''بعض مقلدین نے اپنے ائمہ کو معصوم عن الخطا و مصیب وجوباً و مفروض الاطاعت تصور کر کے عزم بالجزم کیا، کہ خواہ کیسی ہی حدیث صحیح مخالف قول امام کے ہو اور مستند قول امام کا بہ جز قیاس امرِ دیگر نہ ہو، پھر بھی بہت سی علل و خلل حدیث میں پیدا کر کے، یا اس کی تاویل بعید کر کے حدیث کو رد کریں گے اور قول امام کو نہ چھوڑیں گے۔ ایسی تقلید حرام اور مصداق قولہ تعالیٰ ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ اور خلاف وصیت ائمہ مرحومین کے ہے۔''

اس قسم کی تقلید جامد کو، جس کا تذکرہ مذکورہ اقتباسات میں کیا گیا ہے، مولانا محمود الحسن نے بھی کفر سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ وہ ''ایضاح الادلہ'' میں تقلید کے اثبات پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تمام نصوص ردّ تقلید سے اُس تقلید کا بُطلان ثابت ہوتا ہے کہ جو تقلید بہ مقابلہ تقلید احکامِ خدا اور رسولِ خدا ہو اوران کے اتباع کو اتباع احکامِ الٰہی پر ترجیح دے۔ سو پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس تقلید کے مردود و ممنوع، بلکہ کفر ہونے میں کس کو کلام ہے؟''

اقتداء واتباع تو ناگزیر ہے لیکن زیر بحث تقلید اس سے قطعاً مختلف ہے:

ان اقتباسات سے یہ تو واضح ہے کہ کسی امام کی اس انداز سے تقلید کرنا کہ صحیح اور واضح حدیث کے سامنے آجانے کے بعد بھی قولِ امام ہی کو ترجیح دینا اور اس کے مقابلے میں صحیح حدیث کو چھوڑ دینا ممنوع، حرام ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ کا مصداق اور بقول صاحبِ ''ایضاح الادلّہ'' کفر ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مروّجہ تقلید اس سے مختلف ہے یا وہ اِسی ذیل میں آتی ہے جس کی مذمت و حرمت پر سب کا اتفاق ہے؟

اہل تقلید کا دعویٰ ہے کہ ہمارا وہی طریقہ ہے جو عہد صحابہ و تابعین میں تھا، یعنی جس شخص کو مسئلے کا علم نہ ہوتا تھا، وہ کسی بھی صاحب علم سے دریافت کر لیتا تھا۔ تین سو سال سے زیادہ عرصے تک یہی طریقہ رائج تھا، یہ طریقہ ظاہر بات ہے بالکل صحیح بھی ہے اور ناگزیر بھی۔ کیونکہ ہر شخص تو ماہر شریعت نہیں ہوسکتا، لہٰذا ضروری ہے کہ بے خبر شخص، باخبر شخص سے پوچھے۔ بے علم عالم سے دریافت کرے اور کم علم والا اپنے سے زیادہ علم رکھنے والے کی طرف رجوع کرے۔ یہ معاملہ شریعت ہی کے ساتھ خاص نہیں، ہر علم وفن کا معاملہ یہی ہے۔ شرعی مسائل و احکام معلوم کرنے کا بھی یہی طریقہ ہے اور عوام کے لیے اس کے بغیر چارہ نہیں ہے۔ لیکن اس میں دو باتیں ضروری ہیں اور صحابہ و تابعین کے زمانے میں ان دونوں باتوں کا پورا اہتمام موجود تھا۔

۱۔ پوچھنے والا صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام پوچھتا تھا، اِس کے علاوہ اس کے ذہن میں کچھ اور نہیں ہوتا تھا۔

۲۔ بتانے والا بھی اپنے علم کی حد تک اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام ہی بتلاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر اسے اس مسئلے کا علم نہ ہوتا، تو وہ سائل کو کسی اور کی طرف بھیج دیتا، یا اپنی سمجھ کے مطابق بتلاتا، پھر اسے اس کے مطابق حدیث مل جاتی تو خوش ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے منہ سے صحیح بات نکلوائی۔ اور اگر اسے اس کے خلاف حدیث مل جاتی، تو فوراً اپنی بات سے رجوع کر لیتا۔

خیر القرون کا یہی طریقہ شاہ ولی اللہ نے پوری تفصیل سے ''حجۃ اللہ البالغہ'' اور اپنی بعض دیگر کتابوں میں بیان کیا ہے حتی کہ مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی ''امداد الفتاویٰ'' (ج:۵ ص:۲۹۴۔۳۰۰) میں اس کی بابت یہی تفصیل بیان کی ہے۔

اس طریقے کو اصطلاحی طور پر تقلید نہیں کہا جاتا، کیونکہ تقلید کی تعریف اس پر صادق نہیں آتی۔ تقلید تو کسی کی بات کو بغیر دلیل کے ماننے کا نام ہے۔ علاوہ ازیں اس میں یہ بات بھی داخل ہے کہ ماننے والا (مقلِد) مُقلَّد (امام وغیرہ) سے دلیل کا مطالبہ نہیں کرسکتا، جب کہ ایک عام شخص جب کسی عالم سے کوئی مسئلہ پوچھتا ہے یا کسی مفتی سے فتویٰ طلب کرتا ہے تو اس کے پیش نظر اللہ اور اس کے رسول کا حکم معلوم کرنا ہوتا ہے، اسی لیے وہ اس کی دلیل بھی، بہ وقت ضرورت، پوچھ لیتا ہے اور پوچھ سکتا ہے، یا اس کی بتلائی ہوئی دلیل سے اس کی تشفی نہیں ہوتی تو وہ کسی اور عالم یا مفتی سے پوچھ لیتا ہے۔ اس طریقے میں عالم اور مفتی بھی قرآن وحدیث کی روشنی ہی میں مسئلے کی وضاحت کرتا ہے، کسی مخصوص فقہ کو سامنے نہیں رکھتا۔

یہ طریقہ اقتدا اور اتباع کہلاتا ہے کیونکہ اس میں اصل جذبہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی پیروی کرنے کا ہوتا ہے۔ چوتھی صدی ہجری سے پہلے تک تمام مسلمان عوام وخواص، جاہل وعالم اسی طریقے پر کاربند تھے۔ لیکن جب چوتھی صدی میں فقہی مذاہب کو فروغ حاصل ہوا اور محدثین اور اُن کے ہم مسلک لوگوں کے علاوہ دوسروں نے اپنے آپ کو کسی نہ کسی مذہب سے وابستہ کرلیا تو مذکورہ طریقہ صرف محدثین اور ان کی روش پر چلنے والوں تک محدود ہو گیا اور دوسروں کے ہاں ایک مخصوص فقہ کی پابندی ضروری ہوگئی اور ان کے عوام وخواص سب ہی نے صحابہ وتابعین کے طریقے کو چھوڑ دیا اور تقلید کو واجب قرار دے دیا۔ جس کا مطلب ہی یہ تھا اور ہے کہ اب براہِ راست قرآن وحدیث سے اخذِ مسائل کی ضرورت نہیں حتی کہ علماء ومفتیان بھی اپنے عوام کو قرآن وحدیث کے مطابق مسائل بتلانے کے پابند نہیں۔ وہ پابند ہیں تو صرف اس بات کے کہ ان کی مخصوص فقہ میں کیا درج ہے، اس کی روشنی میں یہ جائز ہے یا ناجائز؟ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے عوام کو احادیث کی کتابوں کے مطالعے سے روکتے ہیں اور کئی مفتی حضرات تو اس حد تک جسارت کرتے ہیں کہ اسے گمراہی قرار دیتے ہیں۔

افتراقِ امت کا باعث تقلید حرام ہے، نہ کہ علماء کی پیروی:

افتراقِ امت کے المیے کا اصل نقطۂ آغاز بھی یہی ہے ورنہ قرآن وحدیث کے فہم وتعبیر کا یا اجتہاد واستنباط کا کچھ نہ کچھ اختلاف تو صحابہ وتابعین میں بھی تھا۔ یہ اختلاف محدثین کے درمیان بھی تھا اور ان کے مسلک ومنہج کے پیروکار عاملین بالحدیث کے درمیان بھی ہے لیکن یہ اختلاف فہم وتعبیر کا ہے یا استنباط واجتہاد کا یا پھر اس کا مبنی حدیث کی صحت وضعف کا اختلاف ہے، جیسے صحابہ میں اختلاف کی ایک وجہ کسی حدیث سے بے خبری یا اس کے نسخ یا عدم نسخ سے لاعلمی بھی تھی۔ یہ اختلاف افتراقِ امت کا باعث نہیں، اسی لیے صحابہ وتابعین کا دور، اختلافات کے باوجود، فرقہ بندیوں سے پاک تھا۔

بنابریں اہل تقلید کا یہ دعویٰ کہ ہماری تقلید وہ نہیں جس کو ممنوع اور حرام کہا گیا ہے بلکہ ہمارا طریقہ تو وہی ہے جو صحابہ

وتابعین کا تھا، کس طرح درست قرار دیا جا سکتا ہے، جب کہ دونوں طریقے فکر و منہج سے لے کر مقصد و مدعا تک ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں؟ اور ان کے درمیان اتنی وسیع خلیج حائل ہے کہ جس کا پاٹنا بظاہر نہایت مشکل ہے۔ ﴿إِلَّا أَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ اس دعوے کے ردّ میں یا دونوں نقطہ ہائے نظر کے فرق و اختلاف پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے اور تقلید کے وہ نمونے بھی پیش کیے جا سکتے ہیں، جن میں فقہ کے مقابلے میں صحیح احادیث کو نظر انداز کیا گیا ہے یا ان میں دوراز کار تاویلیں کی گئی ہیں۔ لیکن ہمارا مقصد چونکہ اختلافات کی خلیج کو، جو پہلے ہی ناقابلِ عبور بنی ہوئی ہے، وسیع کرنا نہیں ہے، ﴿وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ﴾ اس لیے اس پر گفتگو کرنے کے بجائے ہم «اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ» (دین خیر خواہی کا نام ہے) کے طور پر اختلافات کی شدّت کو ختم کرنے کے لیے چند گزارشات پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ علماء سے تو ہمیں یہ امید بہت کم ہے کہ وہ سنجیدگی سے ان پر غور فرمائیں گے، تاہم عوام سے ہم یہ استدعا ضرور کریں گے کہ وہ ان پہلوؤں پر غور کریں اور اس کی روشنی میں فیصلہ کریں کہ وہ اب تک جس راہ پر چلتے آئے ہیں وہ واقعی صحیح ہے؟ یا اس کا رُخ بدلنے کی ضرورت ہے؟ حدیث کی کتاب کا مطالعہ کرتے وقت اگر عوام میں یہ احساس اُجاگر ہو جائے اور غور وفکر کا داعیہ اور جذبہ پیدا ہو جائے اور اس کے ساتھ ساتھ صراطِ مستقیم کی اللہ تعالیٰ سے دعا اور اس کی طلبِ صادق بھی ان کے اندر ہو، تو یقیناً اللہ تعالیٰ مدد فرمائے گا۔ بقولِ علامہ اقبال۔

ہم تو مائل بہ کرم ہیں ، کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے ، راہروِ منزل ہی نہیں

قابلِ غور وفکر پہلو:

۱۔ اللہ کا نازل کردہ دین ایک ہی ہے اور وہ اسلام اور صرف اسلام ہے۔

﴿إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ﴾ (آل عمران:۳/ ۱۹)

﴿وَ مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ (آل عمران:۳/ ۸۵)

اس دین کو اللہ تعالیٰ نے یا اللہ کے رسول نے ''مذاہب'' میں تقسیم نہیں فرمایا، بلکہ اس ایک دین ہی کو مل کر مضبوطی سے تھامنے کا حکم دیا اور جدا جدا ہونے سے منع فرمایا ہے:

﴿وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾ (آل عمران:۳/ ۱۰۳)

اور اپنے رسول کے ذریعے سے بھی اعلان کروایا:

﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ (الأنعام: ٦/ ١٥٤)

''یہ میرا سیدھا راستہ ہے، تم اسی کی پیروی کرو، اور کئی راستوں کے پیچھے مت لگو، وہ تمھیں اس سیدھے راستے سے پلٹا دیں گے۔''

۲۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے متعدد مقامات پر تفرُّق سے روکا ہے، جس کا مطلب فرقوں اور گروہوں میں بٹ جانا ہے اور فقہی مذاہب میں منقسم ہو جانا بھی اس سے خارج نہیں ہے۔ علاوہ ازیں نبی ﷺ نے بھی ایک ہی راستے پر چلنے کی تلقین فرمائی ہے اور دوسرے تمام راستوں کو غلط قرار دیا ہے۔ اس اعتبار سے حق کا راستہ ایک ہی ہو سکتا ہے نہ کہ متعدد۔ عقل و نقل کے اعتبار سے متعدد راستے بہ یک وقت کس طرح ''حق'' ہو سکتے ہیں۔ قرآن تو کہتا ہے:

﴿فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ﴾ (یونس: ١٠/ ٣٢)

''حق ایک ہی ہے، باقی سب گمراہی۔''

۳۔ یہ دین اسلام یا صراطِ مستقیم کیا ہے؟ اور کہاں ہے؟ یہ قرآنِ مجید اور نبی ﷺ کی احادیث کا نام ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

« تَرَكْتُ فِيْكُمْ أَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا ، كِتَابَ اللّٰهِ وَ سُنَّةَ نَبِيِّهٖ »

''میں تمہارے اندر دو چیزیں چھوڑ چلا ہوں، تم جب تک اِن دونوں کو تھامے رہو گے، ہرگز گمراہ نہیں ہو گے، ایک اللہ کی کتاب اور دوسری اس کے نبی کی سنت۔''

۴۔ یہ دین، سابقہ دینوں کی طرح غیر محفوظ نہیں رہا چونکہ قیامت تک آنے والے انسانوں کے لیے یہی دین راہِ نجات ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا بھی ذمہ لیا اور فرمایا:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ (الحجر: ١٥/ ٩)

''ہم ہی نے اس ''الذکر'' کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔''

﴿الذکر﴾ سے مراد قرآن مجید ہے، جو محفوظ ہے، اِس میں کسی قسم کا تغیر نہیں ہوا ہے اور نہ آئندہ ہی ہو سکے گا اور چونکہ حدیثِ رسول کے بغیر اس کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا ممکن نہیں تھا، اس لیے اس کی حفاظت کے مفہوم میں حدیث کی حفاظت بھی شامل ہے۔ چنانچہ حدیث کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ نے محدثین کا گروہ پیدا فرمایا جس نے بے مثال کاوش و محنت سے حدیث کی حفاظت کا عظیم الشان کام سرانجام دیا، اس لیے اس دین کا ماخذ صرف اور صرف قرآنِ کریم

اور احادیث صحیحہ ہیں اور ان کو سمجھنے کے لیے کسی بھی فقہی کتاب کی ضرورت نہیں، البتہ صحابہ کرام کا منہج اور ان کی تعبیرات کی پابندی ضروری ہے۔

۵۔ ائمہ کرام میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ ان کی بات حرفِ آخر ہے بلکہ اس کے برعکس انھوں نے یہ کہا ہے کہ ان سے بھی غلطی ہو سکتی ہے۔ اس لیے انھوں نے اس امر کی بھی تاکید کی ہے کہ ان کے قول کے مقابلے میں صحیح حدیث آجائے، تو ہماری بات کو چھوڑ دینا اور حدیث پر عمل کرنا۔ علاوہ ازیں خود ان کا بھی کئی باتوں میں رجوع ثابت ہے۔ اور بعض مسائل میں ان کے شاگردوں کی بھی یہ صراحت موجود ہے کہ یہ حدیث ہمارے استاد اور امام کے سامنے نہیں تھی، اس لیے انھوں نے اس کے برعکس رائے اختیار کی اگر انھیں یہ حدیث مل جاتی، تو وہ یقیناً اپنی رائے سے رجوع کر لیتے۔ ائمہ کے دور میں احادیث کی جمع و تدوین اور ان کی جانچ پرکھ کا وہ کام نہیں ہوا تھا جو کتب ستہ اور دیگر کتابوں کے مؤلفین نے کیا، اس لیے ان کے سامنے بطورِ خاص امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے سامنے احادیث کے یہ مجموعے نہیں تھے، اس لیے وہ تو اپنی غلطی پر معذور بلکہ ماجور ہی ہوں گے۔ لیکن احادیث صحیحہ کے مجموعے مرتب و مدوّن ہو جانے کے بعد، حدیث کے مقابلے میں، کسی فقہی رائے پر اصرار کرنے اور مختلف انداز سے حدیثوں کو مسترد کرنے کا کیا جواز ہے؟

۶۔ ان ائمہ کے شاگردانِ رشید نے بہت سے مسائل میں اپنے امام اور استاذ سے اختلاف کیا ہے۔ قاضی ابو یوسف اور امام محمد دونوں امام ابوحنیفہ کے سب سے اہم شاگرد ہیں۔ انھوں نے اپنے امام سے فروع ہی میں نہیں، اصول میں بھی اختلاف کیا ہے۔ اور اختلاف بھی چند ایک مسائل ہی میں نہیں بلکہ دو تہائی مسائل میں کیا ہے۔ اگر وہ امام صاحب سے اتنے اختلاف کے باوجود مقلد کے مقلد ہی ہیں، تو بعد کے لوگ بھی اگر دلائل کی بنیاد پر ایسا کریں گے، تو اسے کون غیر معقول یا امام کے مذہب سے خروج قرار دے سکتا ہے؟

اس اختلاف کی اور بھی کئی مثالیں ہیں۔ ان میں ایک اور نہایت نمایاں مثال مولانا عبدالحئی لکھنوی حنفی کی ہے۔ انھوں نے فقہ کے مقابلے میں احادیث کو ترجیح دیتے ہوئے بیسیوں مسائل میں محدثین کے مسلک کو راجح قرار دے کر انھیں اختیار کیا ہے جس کی تفصیل ہمارے فاضل دوست مولانا ارشاد الحق اثری حفظہ اللہ (فیصل آباد) کی تالیف ''مسلک احناف اور مولانا عبدالحئی لکھنوی'' میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ بلکہ مولانا اشرف علی تھانوی اور ان کے ہم عصر علمائے دیوبند نے بھی زوجۂ مفقود الخبر اور بعض دیگر صورتوں میں فقہ حنفی کو چھوڑ کر فقہ مالکی کی رائے کو اختیار کیا ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، الحیلة الناجزة، تالیف مولانا اشرف علی تھانوی)

بلکہ اس کتاب کے نئے ایڈیشن میں حرفِ آغاز کے عنوان سے مولانا تقی عثمانی صاحب کا دیباچہ ہے، اس میں ان

کا بھی یہ اعتراف موجود ہے:

''ایسی خواتین جنھوں نے نکاح کے وقت تفویض طلاق کے طریقے کو اختیار نہ کیا ہو، اگر بعد میں کسی شدید مجبوری کے تحت شوہر سے گلوخلاصی حاصل کرنا چاہیں، مثلاً شوہر اتنا ظالم ہو کہ نہ نفقہ دیتا ہو نہ آباد کرتا ہو۔ یا وہ پاگل ہو جائے یا مفقود الخبر ہو جائے یا نامرد ہو اور از خود طلاق یا خلع پر آمادہ نہ ہو، تو اصل حنفی مسلک میں ایسی عورتوں کے لیے شدید مشکلات ہیں، خاص طور پر اُن مقامات پر جہاں شریعت کے مطابق فیصلے کرنے والا کوئی قاضی موجود نہ ہو، ایسی عورتوں کے لیے اصل حنفی مسلک میں شوہر سے رہائی کی کوئی صورت نہیں ہے...... حضرت حکیم الامت (مولانا تھانوی) قدس سرہ نے ایسے بیشتر مسائل میں مالکی مذہب کے مطابق فتویٰ دیا ہے۔''

اس میں یہ بھی صراحت ہے کہ (متحدہ) ہندوستان کے علماء نے بھی مولانا تھانوی کی تصدیق وتائید فرمائی۔

مثال کے طور پر زوجۂ مفقود الخبر کے متعلق فقہ مالکی کے مطابق یہ موقف اختیار کیا گیا ہے کہ وہ عدالتی فیصلے کے بعد چار سال انتظار کرے اور اس کے بعد چار مہینے ۱۰ دن عدت گزار کے دوسری جگہ نکاح کرلے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ مرافعہ (عدالتی چارہ جوئی) کے بعد مزید انتظار کی صورت میں اگر عورت اندیشۂ ابتلاء ظاہر کرے اور اس نے ایک عرصۂ دراز تک مفقود کا انتظار کرنے کے بعد مجبور ہو کر اس حالت میں درخواست دی ہو جب کہ صبر سے عاجز آ گئی ہو، تو اس صورت میں اس کی بھی گنجائش ہے کہ مذہب مالکیہ کے موافق چار سال کی میعاد میں تخفیف کردی جائے، کیونکہ جب عورت کے ابتلا کا شدید اندیشہ ہو تو ان (مالکیوں) کے نزدیک کم از کم ایک سال صبر کے بعد تفریق جائز ہے۔

ایک اور حنفی عالم ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن (سابق چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل) نے اس سے بھی کم مدت کے اندر، یعنی فی الفور عدالت کو نکاح فسخ کر کے دوسری جگہ شادی کرنے کی اجازت دی ہے۔ چنانچہ وہ ایک سال کے قول کو (چار سال کے مقابلے میں) موجودہ زمانے کے لحاظ سے ترجیح دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مگر لازم ہے کہ مزید ایک سال انتظار کا حکم اس صورت میں دیا جائے گا جب کہ عورت کے پاس ایک سال کے نفقے کا انتظام موجود ہو۔ بصورتِ دیگر عدالت، بعد ثبوت مفقود الخبری، بوجہ مفقود الخبری شوہر و عدم موجودگی نفقہ، فی الفور نکاح فسخ کرنے کی مجاز ہوگی۔''

ایک مجلس کی تین طلاقوں کا مسئلہ بھی اہل حدیث و احناف کے مابین ایک اہم مسئلہ ہے لیکن اس میں بھی متعدد علمائے احناف نے اہل حدیث کے نقطۂ نظر کو اپنایا ہے اور دوسروں کو بھی اس کے اپنانے کی تلقین کی ہے جیسے مولانا سعید

احمد اکبر آبادی مدیر ''برھان'' دہلی، مولانا عبدالحلیم قاسمی (بانی جامعہ حنفیہ گلبرگ، لاہور) مولانا حسین علی واں بھچراں، پیر کرم شاہ ازہری وغیرھم ہیں۔ اور ایسے بھی متعدد علماء ہیں جنھوں نے بہ وقت ضرورت (یعنی ناگزیر حالات میں) مجلس واحد کی تین طلاقوں کو ایک طلاق شمار کر کے رجوع کرنے کا فتویٰ دیا ہے جیسے مفتی کفایت اللہ دہلوی اور مولانا عبدالحیٰ لکھنوی وغیرہ۔ (دیکھیے ''کفایت المفتی'' اور ''فتاویٰ مولانا عبدالحیٰ لکھنوی'') اور ایسے بھی ہیں جو خود تو فتویٰ دینے سے گریز کرتے ہیں لیکن بعض خصوصی حالات میں وہ اپنے خاص مریدوں یا متعلقین کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ کسی اہل حدیث عالم سے فتوی حاصل کر کے رجوع کرلیں۔ بعض اور مسائل میں بھی اس قسم کی مثالیں موجود ہیں جیسے مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی مثال سطورِ بالا میں گزری ہے۔ یہ مولانا انور شاہ کشمیری کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں، اس کے باوجود انھوں نے فقہ حنفی کے بہت سے مسائل کو چھوڑ کر دوسری رائے اختیار کی۔ علاوہ ازیں انھوں نے حدیث کے بارے میں بعض علمائے احناف کی روش پر بھی سخت تنقید کی اور اسے محدثین کا استخفاف، ان کی سعی و کاوش پر پانی پھیرنے اور منکرینِ حدیث کی ہم نوائی سے تعبیر کیا۔ (اس کی تفصیل راقم کے مضمون ''مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور ان کا فقہی توسُّع'' میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے، جو ان کی وفات کے بعد لکھا گیا تھا اور اُس وقت ''الاعتصام''، ''میثاق'' اور ''محدث'' بنارس (بھارت) وغیرہ میں شائع ہوا تھا۔

اس تقلید کو آخر کیا کہا جائے؟

جب اس قسم کی مثالیں موجود ہیں جو یقیناً مستحسن بھی ہیں اور وقت کی ضرورت بھی ہیں اور سب سے بڑھ کر نصوصِ شریعت کا اقتضاء بھی۔ تو پھر اِس کے برعکس فقہی جمود کی یہ مثالیں ناقابل یقین لگتی ہیں جو بعض اکابر کی طرف سے سامنے آئی ہیں۔ لیکن چونکہ وہ ان کی کتابوں میں موجود ہیں، اس لیے انھیں جھٹلانا بھی ممکن نہیں ہے جیسے مثال کے طور پر مولانا محمود الحسن صاحب، جن کو شیخ الہند کہا جاتا ہے، فرماتے ہیں:

« اَلْحَقُّ وَالْاِنْصَافُ أَنَّ التَّرْجِيْحَ لِلشَّافِعِيِّ فِي هٰذِهِ الْمَسْئَلَةِ وَ نَحْنُ مُقَلِّدُوْنَ يَجِبُ عَلَيْنَا تَقْلِيْدُ اِمَامِنَا أَبِيْ حَنِيْفَةَ »

''حق و انصاف کی بات یہی ہے کہ (احادیث و نصوص کے اعتبار سے اس مسئلۂ خیارِ مجلس) میں اِمام شافعی کی رائے کو ترجیح حاصل ہے۔ لیکن ہم مقلِّد ہیں، ہم پر اپنے امام ابوحنیفہ، کی تقلید ہی واجب ہے۔''

اِسی ذیل میں بعض وہ تبدیلیاں بھی آتی ہیں جو نصوص حدیث میں محض اس لیے کی گئی ہیں کہ ان کے معمول بہ مسائل کا اثبات ہو سکے جیسے مسند حمیدی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے جو اثبات رفع الیدین میں واضح ہے، لیکن الفاظ کے معمولی ردّ و بدل سے اسے عدم رفع الیدین کی دلیل بنا دیا گیا ہے۔ اسی طرح مصنَّف ابن أبی

شیبۃ کی ایک روایت اور سنن ابوداؤد کی ایک روایت میں کیا گیا۔ان کی تفصیل بہ وقت ضرورت پیش کی جا سکتی ہے۔

حتی کہ تقلیدی جمود کا یہ نقشہ بھی سامنے آیا کہ اثباتِ تقلید کے جوش میں قرآن مجید کی ایک آیت میں ﴿وَ اِلٰی اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ﴾ کا اضافہ کر دیا گیا۔اسے کتابت کی غلطی اس لیے نہیں سمجھا جا سکتا کہ استدلال کی ساری بنیاد ہی اس اضافی ٹکڑے پر ہے۔

ایک اور صاحب نے قرآن مجید کی ایک آیت میں لفظی و معنوی تصرف کر کے عدم رفع الیدین کو ''ثابت'' کر دکھایا ہے۔ (ملاحظہ ہو ''تحقیق مسئلہ رفع الیدین ، از ابو معاویہ صفدر جالندھری ، ابوحنیفہ اکیڈی ، فقیر والی ، ضلع بہاول نگر ، تاریخِ اشاعت درج نہیں)

آج اُس فقہی توسُّع کی ضرورت ہے جس کی بعض مثالیں مولانا عبدالحیٔ لکھنوی وغیرہ کے طرزِ عمل میں ملتی ہیں ، جس میں نصوصِ شریعت کی بالادستی قائم رہتی ہے ، نہ کہ اس فقہی جمود کی جس کی کچھ مثالیں عرض کی گئی ہیں جس کے عدم جواز میں کوئی اختلاف نہیں ، بلکہ ان کی اپنی صراحت کے مطابق اس میں کفر تک کا اندیشہ پایا جاتا ہے۔علمائے اسلام اور مفتیانِ دینِ متین کو کون سی راہ اختیار کرنی چاہیے یا ان کا منصبِ عظیم کس راہ کو اپنانے کا تقاضا کرتا ہے؟ اس کی وضاحت یا فیصلہ کوئی مشکل امر نہیں۔

﴿ فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ (الأنعام:٦/ ٨١)

''دونوں فریقوں میں سے کون امن و سلامتی کا زیادہ مستحق ہے ، اگر تم علم رکھتے ہو؟''

امن و سلامتی کی راہ وہی ہے جس کی نشاندہی ہم نے بالکل آغاز میں کی تھی جو امت مسلمہ کی وحدت کی ضامن بھی ہے اور فقہی اختلافات و حزبی تعصّبات کے خاتمے یا کم از کم اس کی شدت کو کم کرنے کا واحد ذریعہ بھی۔اور یہ محدثین کی راہ ہے ، کسی ذہنی تحفظ کے بغیر عمل بالحدیث کی راہ ہے ، فقہی جمود کے بجائے فقہی توسُّع کی راہ ہے اور ہر صورت میں نصوصِ شریعت کی برتری کو ماننے اور قائم رکھنے کی راہ ہے اور اس کے خطوط حسب ذیل ہیں:

محدثین کا مسلک و منہج:

ا۔ پہلا وصف: حدیث کی صحت و ضعف کی تحقیق میں سند کو بنیادی اہمیت حاصل ہے:

« لَو لَا الِاسْنَادُ لَقَالَ مَنْ شَاءَ مَا شَاءَ »

''سند کو تسلیم نہ کیا جائے تو پھر ہر شخص جو چاہے ، کہہ سکتا ہے۔''

سند ہی غیر صحیح روایات کو جانچنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔اس بنیاد سے روایات صحیح قرار دینے کے تمام چور

دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

اہل تقلید کا رویہ:

اہل تقلید کا رویہ اس کے برعکس ہے، وہ ردّ حدیث کے لیے کئی طریقے اختیار کرتے ہیں، مثلاً کہا جاتا ہے:

- فلاں امام نے جو بات کہی ہے، آخر ان کے سامنے بھی تو کوئی حدیث ہوگی؟
- یا اُن کے دَور تک اس حدیث کی سند میں کوئی راوی ضعیف، متروک اور کذاب نہیں ہوگا۔
- یا حدیث کی صحت وضعف ایک اجتہادی امر ہے۔ اس لیے ایک مجتہد نے جس حدیث سے استدلال کیا ہے، چاہے وہ ضعیف بلکہ موضوع ہی ہو، اس کا استدلال صحیح ہے۔ کسی دوسرے مجتہد کو اس کی بات کو ردّ کرنے کا حق نہیں ہے۔
- یا روایت تو ضعیف یا موضوع (من گھڑت، یعنی بے سند) ہے، لیکن اسے تَلَقِّي بِالْقَبُوْل کا درجہ حاصل ہے۔ جیسے «أَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ نُوْرِی» یا «لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْأَفْلَاكَ» جیسی بے سند بنائی ہوئی حدیثیں ہیں۔ یہ دونوں من گھڑت روایات بریلوی حضرات ہی نہیں، علمائے دیوبند بھی اپنی کتابوں میں لکھتے اور اپنے وعظ و تقریر میں بیان کرتے ہیں۔
- یا حسن ظن کی بنیاد پر مرسل روایات کو صحیح تسلیم کرنا۔
- یا ''درایت'' کے خلاف ہونے کا دعویٰ کر کے روایت کو ردّ کر دینا۔
- یا اپنے خودساختہ اصولوں کی روشنی میں صحیح احادیث کو ردّ کر دینا، جس پر شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہما نے بھی احتجاج کیا ہے۔
- یا (بہ زعم خویش) یہ دعویٰ کر کے کہ فلاں حدیث قرآن کے معارض ہے، حدیث کو ردّ کر دینا۔ (جب کہ کوئی صحیح حدیث قرآن کے معارض نہیں)
- یا حدیثِ آحاد کو نظر انداز کرنا۔
- یا غیر فقیہ راوی (صحابی) کی روایت قیاس کے خلاف ہوگی، تو نامقبول ہوگی۔

اور اس قسم کے دیگر طریقے یا اصول، جن کے ذریعے سے صحیح حدیث کو بلا تامل ردّ کر دیا جاتا ہے اور ضعیف، مرسل حتیٰ کہ موضوع حدیث تک کو قبول کر لیا جاتا ہے۔ یہ محدثین کے مسلک ومنہج کے خلاف یا بہ الفاظ دیگر، ثابت شدہ نصوص حدیث کو مسترد کرنے یا غیر ثابت شدہ بات کو شریعت باور کرانے کی مذموم سعی ہے۔ جس کے ہوتے ہوئے کبھی نصوصِ شریعت کی بالادستی قائم نہیں ہو سکتی اور نہ اختلافات کا خاتمہ ہی ممکن ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان چور دروازوں کا کوئی تعلق امام ابوحنیفہ سے نہیں ہے۔ یہ سب بعد کے لوگوں کی ایجاد ہے۔ ان میں سے کوئی ایک اصول بھی

امام ابوحنیفہ سے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ گویا محدثین کی روش کو اپنانا امام صاحب کی تقلید کے منافی نہیں ہے۔

②۔ دوسرا وصف:

محدثین کا دوسرا وصف، امانت اور دیانت کا اہتمام ہے۔ انھوں نے احادیث کی جمع وتدوین میں بھی کمال دیانت کا مظاہرہ کیا ہے۔ اور جرح وتعدیل کے اصولوں کو استعمال کرکے احادیث کا رتبہ متعین کرنے میں بھی انھوں نے کسی ذہنی تحفظ کا مظاہرہ کیا ہے، نہ کسی حزبی وفقہی تعصب کا۔

اہل تقلید کا رویہ:

اہل تقلید میں اِس کی بھی کمی ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں، لیکن یہاں ہم صرف چار مثالیں پیش کریں گے، دو علمائے دیوبند کی، تیسری بریلوی حضرات کی یہ دونوں ہی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مقلد کہلاتے ہیں۔ چوتھی مثال دونوں میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔

پہلی مثال: خواتین نماز کس طرح پڑھیں؟ یعنی وہ رکوع سجدہ کس طرح کریں؟ ہاتھ کہاں باندھیں؟ رفع الیدین کس طرح کریں؟ عورتوں کی بابت کسی بھی صحیح حدیث میں ان امور کی وضاحت نہیں ملتی، اس لیے وہ نبی ﷺ کے فرمان: «صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ» ''تم اس طرح نماز پڑھو، جس طرح تم نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔'' کے عموم میں شامل ہوں گی اور مذکورہ سارے کام مردوں ہی کی طرح سرانجام دیں گی۔ لیکن علمائے احناف کہتے ہیں کہ مرد اور عورت کی نماز میں فرق ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ عورت ہاتھ سینے پر باندھے (جب کہ مرد ناف کے نیچے) عورت ہاتھ باندھتے، یعنی تکبیر تحریمہ کے وقت اپنے ہاتھ کندھوں تک اُٹھائے (جب کہ مرد کانوں کی لَو کو ہاتھ لگائے) عورت سجدہ بالکل سمٹ کر اور زمین سے چمٹ کر کرے، جب کہ سجدے میں مردوں کی کہنیاں اور بازو زمین سے اُٹھے ہونے چاہئیں۔ اِسی طرح کچھ اور فرق بھی بتلائے جاتے ہیں (ہم نے اختصار کی خاطر موٹی موٹی باتیں بیان کی ہیں۔) ''خواتین کا طریقۂ نماز'' تالیف مولانا عبدالرؤف سکھروی ہمارے سامنے ہے، اِس میں ان فروق کو بیان کرنے کے لیے احادیث کے نام سے کئی احادیث بیان کی گئی ہیں لیکن ان میں سے کوئی ایک حدیث بھی صحیح نہیں ہے اور ستم ظریفی کی انتہا ہے یا امانت ودیانت کے فقدان کا یہ حال ہے کہ ان بیان کردہ احادیث میں السنن الکبریٰ للبیھقی کی دو روایات بھی ہیں۔ جن کو درج کرکے امام بیہقی نے لکھا ہے «لَا يُحْتَجُّ بِأَمْثَالِهِمَا» ''یہ روایات اتنی ضعیف ہیں کہ ان جیسی روایات سے استدلال نہیں کیا جاسکتا۔'' لیکن مذکورہ کتاب کے مؤلف نے ان الفاظ کو تو نقل نہیں کیا، البتہ دونوں ناقابل استدلال روایات کو اپنے استدلال میں پیش کیا ہے۔ یہی حال دیگر روایات کا ہے جو انھوں نے پیش کی ہیں۔ فإلى الله المشتكى۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، راقم کی کتاب ''کیا عورتوں کا طریقۂ نماز

مردوں سے مختلف ہے؟'')

دوسری مثال: علمائے احناف کے چوٹی کے عالم مولانا احمد علی سہارنپوری کی ہے جن کا حاشیۂ صحیح بخاری متداول ہے۔انھوں نے حدیث «إِذَا أُقِيْمَتِ الصَّلَاةُ فَلَا صَلَاةَ إِلَّا الْمَكْتُوْبَةَ» جسے امام بخاری نے ترجمۃ الباب (الصَّلَاة، باب:۳۸) میں ذکر کیا ہے۔اس کے حاشیے میں سنن بیہقی کے حوالے سے یہی حدیث (اذا اقیمت الصلاۃ......الحدیث) نقل کی ہے،اس میں اِلَّا رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ کے الفاظ کا اضافہ ہے یعنی ''فرض نماز کی تکبیر ہو جانے کے بعد کوئی نماز نہیں،البتہ فجر کی دو رکعتیں (سنتیں) پڑھنا جائز ہے۔'' حالانکہ امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس اضافے کی بابت صراحت کی ہے کہ ''یہ اضافہ (البتہ فجر کی دو سنتیں پڑھنا جائز ہے) بے اصل ہے'' وَ هَذِهِ الزِّيَادَةُ لَا أَصْلَ لَهَا. اور لکھتے ہیں کہ اس اضافے کو بیان کرنے والے حجاج بن نصیر اور عباد بن کثیر ہیں اور یہ دونوں راوی ضعیف ہیں۔ اس کے باوجود ایک صحیح حدیث کو رد کرنے اور اپنے خلافِ حدیث رواج کو صحیح باور کرانے کے لیے صحیح بخاری کے فاضل محشی نے اس بے اصل اضافے کو حدیث رسول کہہ کر بیان کیا ہے۔(صحيح البخاری:۱/۱۹۷،طبع نور محمد) انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ صحیح بخاری کا یہ حاشیہ آج سے تقریباً سوا سو سال قبل جب چھپ کر پہلی مرتبہ منظر عام پر آیا تھا تو شیخ الکل میاں نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ نے ایک مکتوب کے ذریعے سے اس کوتاہی یا بددیانتی کی طرف توجہ دلائی تھی،لیکن اس کی اصلاح نہیں کی گئی۔اور صحیح بخاری کے عربی حاشیے میں یہ بے اصل حدیث، حدیث رسول کے نام سے اب تک موجود ہے۔میاں نذیر حسین محدث دہلوی کا یہ مکتوب جو عربی میں ہے، کتاب «أعلام أهل العصر» (تالیف مولانا شمس الحق ڈیانوی) میں موجود ہے۔ فإلى اللّٰه المشتكى۔ غالباً اسی بے بنیاد روایت کی بنیاد پر عام مسجدوں میں فجر کی جماعت کے دوران میں لوگ بے دھڑک سنتیں پڑھ رہے ہوتے ہیں اور حدیثِ رسول (نماز کی تکبیر ہو جانے کے بعد فرض نماز کے علاوہ کوئی نماز نہیں) (صحیح مسلم) کی خلاف ورزی کی جاتی ہے اور ﴿وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا﴾ (الأعراف:۷/۲۰٤) ''جب قرآن پڑھا جارہا ہو،تو تم کان لگا کر سنو اور خاموش رہو۔'' کا ذرا لحاظ نہیں کیا جاتا۔اور علماء یہ منظر روزانہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں،لیکن فقہی جمود نے ان کی آنکھوں پر پٹیاں باندھی ہیں۔

تیسری مثال: بریلوی حضرات کے ہاں رواج ہے کہ نمازِ جنازہ کے فوراً بعد میت کے اِردگرد کھڑے ہو کر سب ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے ہیں،اِس کو وہ بہت ضروری سمجھتے ہیں۔دلیل کیا ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے: «إِذَا صَلَّيْتُمْ عَلَى الْمَيِّتِ فَأَخْلِصُوْا لَهُ الدُّعَاءَ» ''اس کا صحیح ترجمہ تو یہ ہے کہ جب تم میت کی نمازِ جنازہ پڑھنے لگو،تو اخلاص کے ساتھ اس کے لیے (مغفرت کی) دعا کرو۔جیسے قرآن مجید میں ہے:

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ ﴾ (المائدۃ:٥/ ٦)

''اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے کھڑے ہونے لگو، تو وضو کرو۔''

لیکن بریلوی حضرات إِذَا صَلَّيْتُمْ عَلَى ...... کا ترجمہ کرتے ہیں: ''جب تم نماز پڑھ چکو تو......'' اور اس طرح ترجمے میں بد دیانتی کا ارتکاب کرکے جنازے کے بعد دعا مانگنے کے اپنے غیر مسنون عمل کا جواز ثابت کرتے ہیں، حالانکہ اگر یہ ترجمہ صحیح ہے تو پھر ان کو وضوء بھی نماز کھڑے ہونے کے بعد ہی کرنا چاہیے، نہ کہ نماز سے پہلے۔ جیسا کہ

﴿ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ ﴾ (المائدۃ:٥/ ٦)

کا ترجمہ بریلوی استدلال کے مطابق کرنے کا اقتضاء ہے۔

چوتھی مثال: یہی حال ان احادیث کی صحت وضعف کے معاملے میں ہے جو اختلافی مسائل میں مدارِ بحث بنتی ہیں۔ ان میں نہایت بے خوفی کے ساتھ امانت و دیانت کا خون کرکے ثقہ راویوں کو ضعیف اور ضعیف راویوں کو ثقہ ثابت کرنے پر زور صرف کیا جاتا ہے، جس کی تفصیل التنكيل بما في تأنيب الكوثري من الأباطيل (عربی) تالیف شیخ عبدالرحمٰن بن یحییٰ یمانی میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ اس میں ایک لطیفہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک راوی اپنی کسی من پسند روایت میں ہوتا ہے، تو اسے اس وقت ثقہ باور کرایا جاتا ہے اور وہی راوی جب اس روایت میں آتا ہے جس سے دوسرا فریق استدلال کرتا ہے، تو وہ ضعیف قرار پاجاتا ہے۔ ایک اور لطیفہ یہ ہوتا ہے، کہ ایک حدیث میں دو تین باتیں ہوتی ہیں، ان میں سے کوئی ایک بات تو قبول کرلی جاتی ہے کہ اس سے ان کے کسی فقہی مسلکے کا اثبات ہوتا ہے اور دوسری باتیں ردّ کر دی جاتی ہیں کیونکہ وہ فریق مخالف کے موافق ہوتی ہیں، حالانکہ حدیث ایک ہے، سند ایک ہے، اگر وہ حدیث صحیح ہے تو اس میں بیان کردہ ساری ہی باتیں صحیح ہیں، ان میں سے کسی بات کو مان لینا اور بعض کو نہ ماننا، اسے کون معقول طرزِ عمل قرار دے سکتا ہے؟ اسی طرح اگر وہ ضعیف ہے، تب بھی معاملہ ایسا ہی ہے، اس کی ساری ہی باتیں ناقابل تسلیم ہونی چاہئیں اس کا کوئی ایک جز قابل استدلال نہیں ہوسکتا۔

یہ لطائف ہمارے فقہی جدل و مناظرہ میں عام ہیں۔ ظاہر بات ہے، امانت و دیانت کی موجودگی میں اس کا امکان ہے، نہ جواز ہی ہے۔

③۔ محدثین کا تیسرا وصف:

محدثین کے منہج کی تیسری نمایاں خوبی جمع و تطبیق کا اہتمام ہے۔ بعض روایات میں جو ظاہری تعارض نظر آتا ہے، اس کے حل کے لیے محدثین حسب ذیل طریقے اختیار کرتے ہیں:

ا۔ سند کے اعتبار سے اگر ایک روایت صحیح ہے اور دوسری ضعیف، تو صحیح السند روایت کو وہ قبول کرلیتے اور ضعیف کو نظر

انداز کردیتے ہیں۔

۲۔ اگر سند کے اعتبار سے دونوں صحیح ہوتی ہیں، لیکن درجۂ صحت میں ایک کو دوسری پر کسی وجہ سے برتری حاصل ہوتی ہے، تو وہ راجح قرار پاتی ہے۔ جیسے ایک روایت سنن کی ہے، جب کہ دوسری متفق علیہ یا صحیح بخاری یا صحیح مسلم کی ہے تو یہ دوسری قسم کی روایات صحت کے اعتبار سے سنن اربعہ کی روایات سے فائق ہیں۔ ان کو سنن کی روایات پر ترجیح حاصل ہوگی۔

۳۔ بعض متعارض روایات میں قرائن سے تقدیم وتاخیر کا علم بھی ہو جاتا ہے۔ وہاں مؤخر روایت کو ناسخ اور مقدم روایت کو منسوخ تسلیم کرلیا جاتا ہے۔

۴۔ جہاں تقدیم وتاخیر کا علم بھی نہ ہو اور صحت کے لحاظ سے بھی دونوں یکساں ہوں، تو محدثین دونوں روایات کا ایسا محمل اور مفہوم بیان کرتے ہیں، جس سے ان کا ظاہری تعارض دور ہو جاتا ہے، اس کو جمع وتطبیق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

جیسے مزارعت کی احادیث ہیں، بعض سے مزارعت کا جواز ثابت ہوتا ہے، بعض سے ممانعت۔ محدثین نے کہا: ممانعت کا تعلق ان صورتوں سے ہے جن میں کسی ایک فریق پر ظلم وزیادتی کا امکان ہے، اور جن میں ایسی صورت نہ ہو، وہاں جواز ہے۔

اس طرح کئی اور احادیث ہیں جن میں کسی میں نہی ہے، تو کسی میں جواز ہے۔ یہاں محدثین نہی کو نہی تنزیہی قرار دیتے ہیں، یعنی اس کام کو نہ کرنا بہتر ہے، تاہم کسی موقعے پر اسے کرلیا جائے تو اس کا جواز ہے، جیسے کھڑے ہو کر پانی پینے کی ممانعت کی روایات بھی ہیں اور جواز کی بھی۔ اس میں بھی تطبیق یہی ہے۔ کہ بیٹھ کر پانی پینا بہتر ہے، تاہم کھڑے ہو کر پینا بھی جائز ہے۔ وعلی ھذا القیاس اسی طرح کی دیگر روایات ہیں۔

اہل تقلید کا رویہ:

اس کے برعکس منہج محدثین سے انحراف کرنے والے جمع وتطبیق کے معاملے میں بھی بہت سے گھپلے کرتے ہیں، وہ حدیث کو اہمیت دینے کے بجائے فقہی اقوال وآراء کو اہمیت دیتے ہوئے بعض متعارض روایات میں خلافِ واقعہ ناسخ و منسوخ کا فیصلہ کرتے ہیں، جیسے بعض لوگ کہتے ہیں کہ رفع الیدین کی احادیث منسوخ ہیں، اور رفع الیدین نہ کرنے کی احادیث ناسخ ہیں، جب کہ اِس کی کوئی معقول دلیل ان کے پاس نہیں ہے حتی کہ مولانا انور شاہ کشمیری نے بھی اس دعوے کی نفی کی ہے۔ لیکن اپنے عوام کو مطمئن کرنے کے لیے اس قسم کے دعوے ان کی طرف سے عام ہیں۔ اور بعض ستم ظریف تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ ابتداء میں رفع الیدین کا حکم اس لیے دیا گیا تھا کہ لوگ اپنی بغلوں میں بت چھپا کر لے آیا کرتے تھے۔ جب بتوں کی یہ محبت ختم ہوگئی، تو رفع الیدین کا حکم بھی منسوخ ہوگیا۔

﴿مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا﴾ (الکھف:۱۸/ ۵)

یا محدثین کرام کی اس طرح توہین کرتے ہیں کہ محدثین تو محض عطار (دوا فروش) تھے، جس طرح ایک عطار اپنی دکان پر ہر طرح کی جڑی بوٹیاں رکھتا ہے، لیکن وہ ان کے خواص اور تاثیرات سے لاعلم ہوتا ہے۔ ان کے خواص و تاثیرات سے ایک طبیب حاذق ہی واقف ہوتا ہے۔ مجتہدین یا فقہاء کی حیثیت بھی طبیب حاذق کی طرح ہے۔ ایک فقیہ ہی نے یہ فیصلہ کرنا ہے کہ محدثین نے اپنی دکان (احادیث کے مجموعوں) میں جو (نعوذ باللہ) ہر طرح کی جڑی بوٹیاں (احادیث) جمع کرلی ہیں۔ ان میں سے کون سی حدیث کو لینا ہے اور کس کو ترک کرنا ہے؟ یعنی تطبیق وترجیح یا اخذ و ترک کا فیصلہ نقد وتحقیق حدیث کے مسلمہ اصولوں کی روشنی میں نہیں، بلکہ فقیہ نے اپنی فقاہت کی روشنی میں کرنا ہے۔ اور یہ فقاہت ایک مخصوص عینک کا نام ہے۔ ہری عینک والے کو ہر چیز ہری، کالی عینک والے کو کالی اور لال عینک والے کو لال نظر آتی ہے۔ چنانچہ حنفی فقیہ کا استدلال کچھ ہوتا ہے، شافعی فقیہ کا کچھ، و ھلم جرا اس لیے کہ ان سب کی عینکیں الگ الگ رنگ کی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسلام کی تعبیر

شد پریشاں خواب من ز کثرت تعبیر ھا

کی آئینہ دار بن جاتی ہے۔ محدثین کی صاف شفاف، بے غبار اور بے آمیز عینک کوئی استعمال نہیں کرتا، جس میں ہر چیز اپنی صحیح اور اصلی شکل میں نظر آتی ہے۔

طبیب حاذق کی یہ حذاقت یا فقیہ کی یہ فقاہت ہی یا الگ الگ رنگ کی یہ عینکیں ہی افتراقِ امت کے المیے کا سب سے بڑا سبب ہے، اس لیے جب تک محدثین کے منہج ومسلک کو اختیار نہیں کیا جائے گا، اس افتراق کا سدِّ باب ممکن نہیں ہے۔

محدثین کرام رحمہم اللہ کو فقاہت سے عاری محض ایک عطار کہنا، اِسی طرح خلافِ واقعہ اور ان کی توہین ہے، جیسے نور الانوار اور اصول الشاشی وغیرہ میں حضرت ابو ہریرہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہما جیسے صحابہ کو غیر فقیہ قرار دینا خلافِ واقعہ اور ان کی توہین ہے۔ اور یہ دونوں ہی باتیں انکارِ حدیث کے چور دروازے ہیں۔ مذکورہ صحابہ کو غیر فقیہ قرار دینے سے مقصود بھی ان کی بیان کردہ روایات سے جان چھڑانا اور اپنے قیاس ورائے کو ترجیح دینا ہے۔ اسی طرح محدثین کو عطار کہنے سے مقصود بھی ان کی جمع کردہ حدیثوں کے مقابلے میں فقہاء کی موشگافیوں کو اختیار کرنا ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ مذکورہ صحابی غیر فقیہ تھے، نہ محدثین کرام ہی فقاہت سے عاری تھے۔ ان کی فقاہت تو ابواب بندی (تراجم) ہی سے واضح ہو جاتی ہے۔ بالخصوص امام بخاری رحمہ اللہ کی فقاہت تو ان کے ایک ایک ترجمۃ الباب سے نمایاں ہے۔ اِسی لیے کہا جاتا ہے،

« فِقْهُ الْبُخَارِيِّ فِي تَرَاجِمِه» ''امام بخاری کی فقاہت ان کے تراجم میں ہے۔'' تاریخ اسلام کے ایسے بے مثال فقیہ کو محض عطار کہنا، ایک ایسی شوخ چشمانہ جسارت ہے جس کا حوصلہ ایسے ہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے دلوں میں حدیث کی عظمت کے بجائے فقیہانہ قیل وقال کا احترام زیادہ ہے۔ سبحٰنك هذا بهتان عظيم

بہرحال بات ہو رہی تھی محدثین کرام کے جمع وتطبیق کے اصولوں کی۔ اگر ان اصولوں کو ان مسائل میں بھی اختیار کر لیا جائے جو فریقین کے درمیان ما بہ النزاع ہیں، تو بہت سے نزاعات کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ اور اگر محدثین کی مذکورہ تینوں امتیازی خصوصیات ہی کو اپنا لیا جائے، جن کی وضاحت کی گئی ہے تو بیشتر اختلافات کا خاتمہ ممکن ہے۔ اختلافات کی بنیاد، حدیث کے بارے میں نقطۂ نظر کا فرق ہی ہے۔ جب تک نقطۂ نظر کا یہ فرق ختم نہیں ہوگا، اور حدیث کی عظمت کو اس طرح تسلیم نہیں کیا جائے گا جس طرح کہ اس کا حق ہے، اور احادیثِ صحیحہ کو کسی بھی عنوان، حیلے یا وضعی اصولوں سے ردّ کرنے کا طریقہ نہیں چھوڑا جائے گا، جن کی بابت پورے یقین واذعان سے ہمارا دعویٰ ہے کہ اِمام ابوحنیفہ کا ان اصولوں سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اس وقت تک اختلافات کا خاتمہ تو کجا، ان کی شدّت کو کم بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اہل حدیث کا طرزِ عمل اور عند اللہ باز پرس کا احساس:

جہاں تک اہل حدیث کا تعلق ہے، الحمد للہ وہ اللہ عز وجل کو گواہ بنا کر کہہ سکتے ہیں کہ وہ حدیث کی صحت و ضعف کا فیصلہ کرنے میں کسی حزبی تعصب اور جانب داری کا مظاہرہ نہیں کرتے، اپنے ذہنی تحفظات کو سامنے نہیں رکھتے اور اپنے خاندان اور ماحول کے اثرات کو اس پر اثر انداز نہیں ہونے دیتے، بلکہ پوری امانت و دیانت سے نقد وتحقیق کے محدثانہ اصول ہی کی روشنی میں احادیث کو جانچتے اور پرکھتے ہیں اور پھر انہی مسائل کا اثبات یا ان کی اَرجحیت کا فیصلہ کرتے ہیں جو احادیثِ صحیحہ کا اقتضاء ہے۔ احادیث کو توڑ مروڑ کر ان کی دُور از کار تاویل کرنا، یا صحیح حدیث کو ضعیف اور ضعیف حدیث کو صحیح ثابت کرنا، یا بلا دلیل کسی حدیث کو ناسخ یا منسوخ قرار دینا، یہ سب طریقے اہل حدیث کے نزدیک دجل وتلبیس اور کتمانِ حق کی ذیل میں آتے ہیں۔ وہ ان سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں اور دوسروں کو بھی پورے اعتماد اوراذعان سے یہ یقیناً دلاتے ہیں کہ ان کا دامن ان تمام چابک دستیوں سے یکسر پاک ہے۔ محدثانہ اصول کے انطباق میں ان سے غلطی ہوسکتی ہے۔ معلومات میں کمی یا ان تک عدم رسائی کی وجہ سے غلطی ہوسکتی ہے، فہم واستنباط میں ان سے غلطی ہوسکتی ہے لیکن ان کوتاہیوں میں الحمد للہ کسی قسم کی بددیانتی کا عنصر شامل نہیں ہے، مسلکی پس منظر کا دخل نہیں ہے، کسی اور جذبے اور مفاد کی اس میں کارفرمائی نہیں ہے۔ وَاللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِيْل.

برصغیر پاک و ہند میں علمائے اہل حدیث کی خدمات:

پاک و ہند میں جب عمل بالحدیث کا جذبہ عام ہوا تو عوام بھی بکثرت علمائے اہل حدیث کی طرف رجوع کرنے لگے اور علماء نے بھی اپنی مسئولیت اور ذمے داری کا احساس کرتے ہوئے اس فرض کو خوب ادا کیا۔ لیکن المیہ یہ ہوا کہ اس وقت ان فتاویٰ کو سنبھال کر رکھنے کا خصوصی اہتمام نہیں کیا گیا۔ اس لیے ان کا ایک بہت بڑا حصہ محفوظ نہ رہ سکا۔ جیسے شیخ الکل میاں نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ کی بابت ان کے ایک فاضل شاگرد مولانا سید عبدالحیٔ (سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ) کی قابل قدر کتاب ''نزهة الخواطر'' میں ہے:

« أَمَّا الْفَتَاوَى الْمُتَفَرِّقَةُ الَّتِيْ شَاعَتْ فِي الْبِلَادِ فَلَا تَكَادُ أَنْ تُحْصَرَ وَظَنِّيْ أَنَّهَا لَوْ جُمِعَتْ لَبَلَغَتْ إِلٰى مُجَلَّدَاتٍ ضِخَامٍ »

''انکے صرف وہ متفرق فتاویٰ ہی جو مختلف شہروں میں پھیلے ہوئے تھے، حیطۂ شمار سے باہر ہیں۔ میرے خیال کے مطابق اگر وہ جمع کیے جاتے تو کئی ضخیم جلدیں بنتیں۔''

میاں صاحب رحمہ اللہ کی وفات کے بعد یہ احساس ہوا، تو پھر اس کی طرف کچھ توجہ دی گئی، اور انھیں جمع اور مرتب کر کے فتاویٰ نذیریہ کے نام سے دو جلدوں میں دہلی سے شائع کیا گیا، جو بعد میں حضرت الاستاذ مولانا محمد عطاء اللہ حنیف رحمہ اللہ کی مساعی کے نتیجے میں اہل حدیث اکادمی لاہور کی طرف سے دوبارہ تین جلدوں میں شائع ہوا۔ لیکن یہ شائع شدہ فتوے بہت قلیل حصہ ہیں، بہ نسبت ان فتووں کے جو انھوں نے تحریر فرمائے۔ اسی طرح دوسرے علمائے اہل حدیث کی علمی کاوشوں اور فتووں کا حشر ہوا، ان کا ریکارڈ رکھا گیا نہ ان کی وفات کے بعد انھیں جمع کرنے کی کوئی کوشش کی گئی، نتیجتًا بہت سی علمی و قیمتی تحریرات و دستاویزات دست برد زمانہ کی نذر ہو گئیں۔

ہمارے (ماضی قریب) کے اکابر علماء میں بھی اگرچہ متعدد علماء فتویٰ نویسی کے میدان میں نمایاں رہے، لیکن ان میں دو شخصیتیں نہایت ممتاز اور سرفہرست ہیں: ایک صاحب مرعاۃ المفاتیح مولانا عبید اللہ رحمانی مبارکپوری (متوفی ۱۹۹۰ء) اور دوسرے مجتہد العصر حافظ عبداللہ محدث روپڑی (متوفی ۲۰ اگست ۱۹۶۴ء) رحمہما اللہ تقسیم ملک کے بعد اول الذکر بھارت ہی میں مقیم رہے، جب کہ ثانی الذکر روپڑ (انبالہ ضلع، مشرقی پنجاب) سے لاہور آ گئے۔ یہ دونوں ہی یگانۂ عصر شخصیتیں تھیں، علم و عمل کے بحر بیکراں، مجتہدانہ ذوق و صلاحیت سے بہرہ ور اور تحقیق و تدقیق کے ذروۂ علیا پر فائز۔ بنا بریں دونوں ہی عوام و خواص کے مرجع اور تحقیق و افتاء کی مسند کے صدر نشین رہے۔ حضرت محدث روپڑی کے فتاویٰ ان کی وفات کے بعد ان کے شاگرِ رشید مولانا ابو السلام محمد صدیق رحمہ اللہ (سرگودھا) نے مرتب کر کے ''فتاویٰ اہل حدیث'' کے نام سے شائع کر دیے تھے، جس سے اہل علم و تحقیق خوب استفادہ کرتے ہیں۔ اور اب محدث مبارکپوری

کے فتاویٰ اور تحقیقی مقالات بھی جہاں تک مل سکے یا مرتب ہو سکے، دو جلدوں میں شائع ہو گئے ہیں، باقی کی تلاش اور ترتیب کا کام جاری ہے۔ اللہ کرے وہ بھی جلد منظر عام پر آ جائیں تا کہ یہ بیش قیمت علمی ورثہ بھی محفوظ ہو جائے۔ اسی طرح استاذ الاساتذہ حضرت حافظ عبداللہ غازی پوری رحمہ اللہ کے فتووں کا ایک مجموعہ مولانا عبدالرحمن مبارکپوری نے جمع ومرتب کیا تھا لیکن ابھی تک غیر مطبوعہ تھا، الحمد للہ وہ بھی پوری ایک صدی کے بعد زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ گیا ہے۔ مولانا عبدالرحمن مبارکپوری صاحبِ ''تحفۃ الاحوذی'' کا مجموعۂ فتاویٰ بھی الحمد للہ ایک عرصہ دراز کے بعد تحقیق وتخریج کے ساتھ شائع ہو گیا ہے۔ اور عنقریب ''فتاویٰ غزنویہ'' بھی ان شاء اللہ منظر عام پر آنے والا ہے جس میں حضرت الامام مولانا عبدالجبار غزنوی اور ان کے دو صاحبزادگان گرامی قدر مولانا سید محمد داؤد غزنوی اور مولانا عبدالواحد غزنوی رحمہم اللہ کے فتاوے ہوں گے پہلے فتاویٰ غزنویہ ایک مختصر سی جلد میں شائع ہوئے تھے جس میں صرف مولانا عبدالجبار غزنوی کے فتاوے تھے، اب وہ بالکل نایاب ہے۔ اب یہ ایڈیشن تین غزنوی اکابر کے فتوؤں کا مجموعہ ہوگا۔ اسی طرح ''مقالات وفتاویٰ مولانا شمس الحق ڈیانوی'' بھی یکجا شائع ہوئے ہیں۔ فللہ الحمد۔

اور یہ مآثر سلف کے پروانے اور ان کے احیاء کے لیے دیوانے شیخ خالد المطیری اور شیخ عارف جاوید محمدی الکویت اور ان کے معاون خصوصی حافظ شاہد محمود (گوجرانوالہ) اور ان کے رفقائے کار کی مساعیٔ حسنہ کا نتیجہ ہے۔ تقبل اللہ جھودھم۔

اسی طرح شیخ الحدیث حافظ عبدالمنان نوری پوری رحمہ اللہ (متوفی ۳ ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ بمطابق ۲۶ فروری ۲۰۱۲ء) ہیں، ان کے فتاوی ''احکام ومسائل'' کے عنوان سے ان کی زندگی میں دو ضخیم جلدوں میں شائع ہوئے تھے، مزید دو جلدوں کا مواد جمع وترتیب کے مراحل میں تھا جو ناشر کی سستی یا عدم توجہی کی وجہ سے تا حال شائع نہیں ہو سکے۔ حالانکہ وہ بھی ان کی زندگی ہی میں شائع ہو سکتے تھے۔ بہر حال مَا شَاءَ اللّٰهُ كَانَ وَ مَا لَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ یہ فتاوے بھی بڑی اہمیت کے حامل، حافظ صاحب رحمہ اللہ کے علوم قرآن وحدیث کے گہرے مطالعے اور استحضار کے مظہر اور مجتہدانہ بصیرت کے غماز ہیں۔ ناشر اور مرتب کو اللہ تعالیٰ توفیق دے کہ وہ اس علمی سرمایے کو جلد از جلد منظر عام پر لا سکیں، یا ان کی اشاعت کسی اور ادارے کے سپرد کر دیں۔

مولانا حافظ عبدالستار الحماد حفظہ اللہ شیخ الحدیث، شارح صحیح بخاری (اردو) ان کے فتاوے سالہا سال سے مرکزی جمعیت اہل حدیث کے ترجمان ہفت روزہ اہل حدیث لاہور میں شائع ہوتے آ رہے ہیں۔ یہ فتاوے بھی اور صاحب فتویٰ بھی ان تمام مذکورہ خوبیوں اور اعلیٰ علمی صلاحیتوں کے حامل ہیں جو مذکورہ علمائے اہل حدیث کا امتیاز رہے ہیں۔ ان کے مطبوعہ فتاوے ''فتاویٰ اصحاب الحدیث'' کے نام سے چار جلدوں میں مکتبہ اسلامیہ لاہور کے زیر اہتمام شائع ہو چکے

ہیں۔ امید ہے کہ مزید پر بھی کام جاری ہوگا۔

شیخ الحدیث مفتی عبید اللہ عفیف حفظہ اللہ بھی موجودہ مفتیانِ کرام میں ایک ممتاز حیثیت کے حامل ہیں، ان کے فتاوے بھی تحقیقی اور مفصل ہوتے ہیں۔ ان کے فتاوے کا ایک مجموعہ ''فتاویٰ محمدی'' کے نام سے کئی سال قبل شائع ہوا تھا، اس کی دیگر جلدیں بھی ناشر کی بے اعتنائی کا شکار ہیں۔ وفقهم الله تعالیٰ

مولانا مبشر احمد ربانی حفظہ اللہ ہیں، یہ بھی تحقیق کے نہایت اعلیٰ ذوق سے بہرہ ور ہیں اور ان کے فتاوے بھی اس کے مظہر اور مذکورہ کتب فتاویٰ کی خصوصیت کے حامل ہیں۔ ان کے فتووں کا مجموعہ بھی احکام و مسائل کے عنوان سے تین جلدوں میں مطبوعہ اور دستیاب ہیں۔

مولانا حافظ زبیر علی زئی رحمہ اللہ ہماری ماضی قریب کی ایک اہم علمی شخصیت تھی، موصوف بالخصوص فن اسماء الرجال اور تحقیق حدیث کے ذوق میں نہایت ممتاز مقام کے حامل تھے۔ ماہنامہ ''الحدیث'' حضرو ضلع اٹک میں ان کے علمی و تحقیقی مقالات اور فتاوے شائع ہوتے تھے۔ یہ مقالات (چھ جلدوں میں) اور فتاوے۔ فتاویٰ علمیہ، المعروف توضیح الاحکام۔ (دو جلدوں میں) مکتبہ اسلامیہ اردو بازار لاہور کی طرف سے شائع ہو گئے ہیں جس پر مولانا سرور عاصم صاحب اہل علم کی طرف سے شکریے اور قدر افزائی کے مستحق ہیں۔ جزاه الله احسن الجزاء عن الاسلام والمسلمين۔

مولانا عبدالقادر عارف حصاروی بھی ہماری جماعت کے ایک محقق عالم تھے۔ ان کے مقالات جماعتی جرائد و مجلّات میں شائع ہوتے رہے اور وہ اخبارات ہی تک محدود تھے۔ اللہ تعالیٰ نے شیخ الحدیث مولانا محمد یوسف راجووال رحمہ اللہ کو توفیق دی کہ انھوں نے مولانا ابراہیم خلیل حفظہ اللہ (حجرہ شاہ مقیم) کے ذریعے سے ان کو جمع اور مرتب کروا کے سات جلدوں میں شائع کروا دیے۔ یہ بھی ان دونوں بزرگوں کی ایک عظیم علمی و مسلکی خدمت ہے۔ یہ بھی اہل علم کی طرف سے شکریے اور قدر افزائی کے مستحق ہیں۔ جزاهم الله احسن الجزاء

ان کے علاوہ بھی جماعت کے رسائل و جرائد میں جماعت کے دیگر اہل علم اور اہل تحقیق کے فتوے الحمد للہ شائع ہو رہے ہیں۔ اور علمائے اہلحدیث کے علمی و تحقیقی ذوق کے مظہر ہیں۔ جیسے مثلاً: مفتی عبدالخالق صاحب (دارالسلام) مفتی عبدالرحمٰن عابد (جماعۃ الدعوۃ) شیخ الحدیث حافظ محمد سلیم کراچی اور دیگر مفتیان کرام (جیسے مفتی محمد ادریس بن مولانا عبدالقہار رحمہ اللہ کراچی وغیرہ) ہیں۔ استقصاء مقصود نہیں۔ صرف چند نمایاں مفتیان گرامی کے نام ذکر کیے گئے ہیں۔ (حفظهم الله)

شیخ الحدیث حافظ ثناء اللہ مدنی حفظہ اللہ:

ہمارے ممدوح شیخ الحدیث مولانا حافظ ثناء اللہ مدنی حفظہ اللہ بھی (جن کا مجموعۂ فتاویٰ اس وقت زیر نظر ہے) اسی سلسلۃ

الذہب کی ایک کڑی اور اسلاف کی علمی وعملی روایات کے حامل ہیں، علم وفضل میں نمایاں، زہد وتقویٰ میں ممتاز، سادگی اور تواضع کے پیکر اور اجتہاد وتفقہ کی صلاحیتوں سے بہرہ ور۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں پہلے حضرت محدث روپڑی رحمہ اللہ سے کسب فیض کی سعادت سے نوازا، اس کے بعد جامعہ اسلامیہ (مدینہ منورہ) میں محدث عصر شیخ البانی، محقق دوراں شیخ ابن باز مفتیٔ اعظم سعودی عرب اور عظیم مفسر شیخ محمد امین الشنقیطی (صاحب تفسیر أضواء البیان) (رحمہم اللہ) جیسے اساطین علم اور اصحاب علم وفضل کے سامنے زانوئے ادب طے کرنے کا موقع دیا، جس سے ان کی علمی صلاحیتوں میں اضافہ اور تحقیقی ذوق میں مزید نکھار پیدا ہوا۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

چنانچہ وہ ایک عرصے سے جہاں ایک طرف شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہیں تو دوسری طرف اپنے بے مثال اساتذہ کی طرح مسندِ افتاء کے بھی صدر نشیں ہیں۔ اپنے فتاویٰ کے ذریعے سے وہ اہل حدیث کی اس علمی روایت کو بھی قائم رکھے ہوئے ہیں جس کا ذکر گزشتہ سطور میں ہوا اور اس مشن کو بھی آگے بڑھا رہے ہیں جو ہمیشہ علمائے اہل حدیث کے پیش نظر رہا، یعنی عمل بالحدیث کے جذبے کا فروغ واحیاء، اور یہی مشن ان کی تدریسی، دعوتی وتبلیغی، علمی وتحقیقی اور تصنیفی وتألیفی خدمات کا محور ومرکز رہا اور ہے۔ تَقَبَّلَ اللّٰهُ جُهُوْدَهُمْ وَ جَعَلَ مَسَاعِيَهُمْ مَشْكُوْرًا

حافظ صاحب کے یہ فتاویٰ ربع صدی سے زیادہ عرصے سے ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں نہایت پابندی سے شائع ہو رہے ہیں جن سے عوام وخواص مستفید ہوتے رہے اور ہو رہے ہیں۔ اب انہی فتوؤں کو مرتب کر کے شائع کیا جا رہا ہے۔ جس سے یقیناً ان کی افادیت کا دائرہ بھی وسیع ہو گا اور ان کی محفوظیت بھی یقینی۔ کیونکہ اخبار یا رسالہ چاہے وہ کتنا بھی وقیع ہو اُس کے قارئین کا حلقہ مخصوص اور محدود ہی ہوتا ہے۔ اور اسی طرح اس کی زندگی بھی چند روزہ ہی ہوتی ہے، جب کہ کتاب کا معاملہ اس کے برعکس ہے، وہ ہر صاحب ذوق اور ضرورت مند جب چاہے خرید سکتا ہے، اور کتاب کی زندگی بھی دیرپا اور مستقل ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ حافظ صاحب حفظہ اللہ کی زندگی میں برکت عطا فرمائے اور انہیں صحت وعافیت سے رکھے اور قرآن وحدیث کے اس سرچشمۂ صافی کو تادیر جاری رکھے! تاکہ تشنگانِ علم وتحقیق اس سے سیراب اور فیض یاب ہوتے رہیں۔ وَ يَرْحَمُ اللّٰهُ عَبْدًا قَالَ آمِيْنًا.

اخی الفاضل حافظ عبدالشکور حفظہ اللہ (فاضل جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ، مبعوث فی الباکستان) بھی تمام اہل علم کی طرف سے شکریے اور قدر افزائی کے مستحق ہیں جنھوں نے اخبارات کی فائلوں سے یہ لولوئے منتاثرہ اور معارف منتشرہ جمع کیے اور

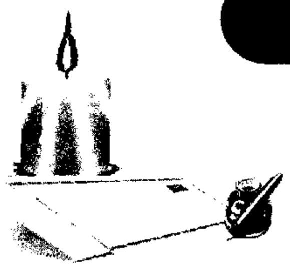
سات سال کی محنت شاقہ کے بعد انھیں مرتب کر کے اس کی پہلی جلد آج سے تقریباً ۱۵ سال قبل شائع کی تھی، جو یقیناً ایک عظیم الشان دینی، علمی اور مسلکی خدمت تھی۔ لیکن معلوم نہیں کن وجوہات کی بناء پر مزید جلدیں منظر عام پر نہیں آ رہیں۔ حالانکہ حافظ صاحب ﷾ کا اصرار اور خواہش تھی کہ وہ بھی جلد از جلد شائع ہوں اور جماعت کے عوام و خواص بھی ان کے بے چینی سے منتظر تھے۔

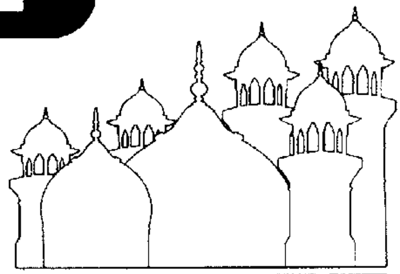
مدت مدید کے انتظار کے بعد بالآخر حضرت حافظ صاحب ﷾ نے اس کی اشاعت کا خود بیڑا اٹھایا ہے۔ اور کتاب ہذا کی جمع و ترتیب، تبویب و تخریج کی ذمہ داری اپنے تلمیذ حافظ عبدالرؤف خان اور عبدالقدوس السّلفی کے سپرد کی۔ اللہ کرے حافظ صاحب کے بقیہ فتاویٰ جلد از جلد مرتب ہو کر شائع ہو جائیں تا کہ اخبارات کے صفحات میں مدفون علوم و معارف کا یہ بیش قیمت گنجینہ اور تحقیق و تدقیق کا یہ نادر خزینہ مکمل شکل میں منظر عام پر آ سکے۔ وَ يَرْحَمُ اللّٰهُ عَبْدًا قَالَ آمِيْنا.

صلاح الدین یوسف

رمضان المبارک ۱۴۳۷ھ۔ جون ۲۰۱۶ء

کتاب الجنائز





ناگہانی موت اچھی ہے یا بری؟

سوال : اچانک موت جس سے اللہ کے نبی نے پناہ مانگی ہے اگر کوئی نیک آدمی اچانک حادثہ میں فوت ہو جاتا ہے، ایسی موت شہادت کی موت تصور کریں گے یا کہ بری موت ہے؟

(عنایت اللہ امین خطیب سبر کھائی و مدرس جامعہ ضیاء الاسلام گہلن ہٹھاڑ) (۲۲ مئی ۱۹۹۲ء)

جواب : اچانک موت بری نہیں۔ ''صحیح بخاری'' میں حدیث ہے: ایک شخص نے نبی اکرم ﷺ سے عرض کی، میری ماں ناگہانی مرگئی ہے۔ میرا خیال ہے اگر اُسے گفتگو کا موقع میسر آتا تو وہ صدقہ کرتی پس اگر میں اسکی طرف سے صدقہ کردوں تو اُس کے لیے ثواب ہے۔ فرمایا: ہاں۔

وجہ استدلال یہ ہے کہ اُس آدمی نے اپنی ماں کی ناگہانی موت کی اطلاع جب نبی ﷺ کو دی تو آپ ﷺ نے کراہت کا اظہار نہیں فرمایا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی ''صحیح'' میں حدیث ہذا پر بایں الفاظ تبویب قائم کی ہے: « بَابُ مَوْتِ الْفَجْأَةِ الْبَغْتَةِ »

مصنف کا مقصود اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ اچانک موت مکروہ نہیں البتہ اس کو شہید قرار دینے کے لیے کوئی نص صریح موجود نہیں۔ نجات کا دارومدار انسان کی نیت و اعمال پر ہے۔ علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ مسئلہ ہذا کے بارے میں رقمطراز ہیں۔ ناگہانی موت کے بارے میں مختلف روایتیں آئی ہیں۔ بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ ناگہانی موت اچھی نہیں۔ عبید بن خالد سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے ناگہانی موت غضب کی پکڑ ہے۔ [1]

---

[1] سنن أبی داؤد، بَابٌ فِی مَوْتِ الْفَجْأَةِ، رقم: ۳۱۱۰

اور بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ناگہانی موت اچھی ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ناگہانی موت مومن کے واسطے راحت ہے اور فاجر کے واسطے غضب ہے۔ ❶

علمائے حدیث نے ان حدیثوں میں اس طرح جمع و توفیق بیان کی ہے کہ جو شخص موت سے غافل نہ ہو اور مرنے کے لیے ہر وقت تیار و مستعد و آمادہ رہتا ہو۔ اس کے لیے ناگہانی موت اچھی ہے۔ اور جو شخص ایسا نہ ہو اس کے لیے اچھی نہیں۔ (وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ .) (کتاب الجنائز، ص:۱۴)

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (فتح الباری، ج:۳، ص:۲۵۴۔۲۵۵)

مسلمان ہونے کا پکا ارادہ تھا کہ فوت ہو گیا، وہ کس حالت میں فوت ہوا؟

سوال: ایک شخص مسلمان ہونے کا پکا ارادہ کر چکا ہو۔ اور اسی دوران اس پر موت آ جائے جبکہ اس نے کلمۂ شہادت نہ پڑھا ہو تو کیا وہ مسلم مرا ہے یا غیر مسلم؟ (ایم فاروق) (۹ مئی ۱۹۹۷ء)

جواب: ایسا شخص غیر مسلم مرا ہے۔ کیوں کہ دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے لیے نطق بالشہادتین شرط ہے۔ صرف اس کی صداقت کا یقین رکھنا کافی نہیں۔

کیا فوت شدہ کو مُردے لینے آتے ہیں؟

سوال: آدمی کے فوت ہونے کے وقت اس کے رشتہ دار جو پہلے فوت ہو چکے ہوتے ہیں کیا وہ ان کو لینے آتے ہیں۔ کیا اُن کی روح فوت ہونے والے کے قریب اُس وقت ہوتی ہے۔ کیا انسان مرنے کے بعد اپنے رشتہ دار کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ کیا وہ ان کو پہچان لیتا ہے وضاحت فرمائیں۔ (ابو حنظلہ محمد محمود علوی، ضلع اوکاڑہ) (۱۵ مئی ۱۹۹۸ء)

جواب: مردے فوت ہونے والے کو لینے آتے ہوں۔ کتاب و سنت سے ثابت نہیں۔ ہاں البتہ مرنے والے کی بعض فوت شدگان سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ بعض روایات میں پیغام رسانی کا ذکر ہے جو قابلِ حجت ہیں۔ ملاحظہ ہو: تنقیح الرواۃ:۱/۳۱۵۔

مرنے کے بعد دفن سے قبل کیا روح رشتے داروں کو پہچانتی ہے؟

سوال: موت کے بعد غسل، جنازے اور دفن ہونے تک انسانی روح پر کیا بیتتی ہے؟ اس کے کیا احساسات ہوتے ہیں کیا وہ رشتہ داروں کو دیکھتا اور ان کی آہ و بکا کو سنتا ہے، جسم کو چھونے سے اُسے تکلیف ہوتی ہے یا نہیں؟

(سائل محمد اسلم عظیم منصوری، چونیاں) (۳ نومبر ۱۹۸۹ء)

جواب: اس دوران بھی من وجہ روح کا تعلق بلا اعادہ بدن سے قائم رہتا ہے جس کا احساس اسے مختلف امور میں

❶ مصنف ابن أبي شيبة ، بَابُ فِي مَوْتِ الْفُجَاءَةِ، وَمَا ذُكِرَ فِيهِ ، رقم:۱۲۰۰۷

کرادیا جاتا ہے۔ مثلاً صالح انسان شدت سے ثواب موعود کا منتظر رہتا ہے۔ جب کہ نافرمان پریشانی کا اظہار کرتا ہے۔اس پر امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی ''صحیح'' میں بایں الفاظ تبویب قائم کی ہے: «بَاب قول الميت و هُوَ عَلى الجَنازة قَدِّمُوْنِیْ» (باب اس بات کا کہ میت، اُس وقت جب کہ اس کی لاش چارپائی پر ہوتی ہے، یہ کہتی ہے مجھے جلدی لے چلو) هٰذَا مَا عِنْدِي وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ، وَ عِلْمُهُ اَتَمُّ:

کیا مرنے والے کی مدح سرائی کرنا درست ہے؟

سوال: بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ جنازے کے موقع پر مرنے والے کی مدح سرائی کرنے کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں۔ یہ بدعت ہے کیا یہ خیال درست ہے؟ (سائل محمد یحییٰ عزیز ڈاھروی۔قصور) (۵مئی ۲۰۰۰ء)

جواب: واقعہ کے مطابق (مبالغہ کیے بغیر) میت کی مدح سرائی ہوسکتی ہے۔ بشرطیکہ تعریف کرنے والے متقی اور ثقہ قسم کے لوگ ہوں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے بَابَ ثَناء الناس علی المیت کے تحت ''صحیح بخاری'' میں جواز کی حدیث بیان کی ہے۔

« هَذَا أَثْنَيْتُم عَلَيْهِ خَيْرًا، فَوَجَبَتْ لَهُ الجَنَّةُ، وَهَذَا أَثْنَيْتُم عَلَيْهِ شَرًّا، فَوَجَبَتْ لَهُ النَّارُ، أَنْتُمْ شُهَدَاءُ اللَّهِ فِي الْأَرْضِ» [1]

''یعنی تم نے اس کی اچھی تعریف کی تو اس کے لیے جنت واجب ہوگئی۔ تم نے اس کی برائی کی تو دوزخ واجب ہوگئی۔ تم زمین میں اللہ کے گواہ ہو۔''

حائضہ عورت کا میت کو ہاتھ لگانا

سوال: کیا حائضہ عورت میت کو ہاتھ لگا سکتی ہے اور کیا صرف باوضوء ہو کر میت کو ہاتھ لگایا جاتا ہے یا بغیر وضوء کے بھی؟ (ایک سائلہ۔اوکاڑہ) (۶ جولائی ۲۰۰۱ء)

جواب: حائضہ عورت میت کو ہاتھ لگا سکتی ہے کیونکہ اصلاً وہ پاک ہے۔ ''صحیح مسلم'' میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہود کی عادت تھی کہ بحالت حیض عورتوں سے کھانے پینے میں بھی علیحدگی اختیار کر لیتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے لیے مجامعت کے ماسواء فائدہ حاصل کرنے کی اجازت ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ﴾ (البقرة:۲۲۲)

''حیض میں عورتوں سے علیحدہ رہو۔''

سے مراد بھی یہی ہے۔ اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ

[1] صحيح البخاري، بَابُ ثَنَاءِ النَّاسِ عَلَى الْمَيِّتِ، رقم:۱۳٦٧

«وَكَانَ يَأْمُرُنِی، فَأَتَّزِرُ، فَيُبَاشِرُنِی وَأَنَا حَائِضٌ.» ❶

''آپ ﷺ مجھے حکم فرماتے میں کپڑا باندھ لیتی پھر میرے جسم کے ساتھ جسم لگاتے جب کہ میں حیض سے ہوتی۔''

حدیث ہذا عورت کے جسم کی طہارت کی دلیل ہے۔ لہٰذا حائضہ عورت کا میت کو ہاتھ لگانا جائز ہے۔ سابقہ دلائل سے معلوم ہوا کہ اصل کے اعتبار سے عورت طاہرہ ہے۔ لہٰذا ہاتھ لگانے کے لیے وضوء کی ضرورت نہیں۔

یوم تمنائے موت، جمعہ یا سوموار؟

سوال: کہا جاتا ہے کہ جب کوئی آدمی جمعہ کی رات یا جمعہ کے دن فوت ہو جائے تو اللہ جل جلالہ اس پر سے قیامت تک عذاب ہٹا لیتا ہے۔ یہ مسئلہ کہاں تک درست ہے؟ (سائل زرین جمال سلفی نگری ضلع بونیر) (۲۵ اکتوبر ۱۹۹۱ء)

جواب: جمعہ کی رات یا دن موت کی فضیلت کے بارے میں وارد روایات ضعیف ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''صحیح بخاری'' کے کتاب الجنائز کے اختتام پر حضرت عبد اللہ بن عمرو سے مروی حدیث:

« مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَمُوتُ يَوْمَ الجُمُعَةِ أَوْ لَيْلَةَ الجُمُعَةِ إِلَّا وَقَاهُ اللَّهُ فِتْنَةَ القَبْرِ.» ❷

''یعنی جو مسلمان جمعہ کے دن یا جمعہ کی رات فوت ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے عذاب قبر سے محفوظ فرما لیتا ہے۔''

نقل کرنے کے بعد رقمطراز ہیں:

«وَفِی إِسْنَادِهِ ضَعْفٌ وَأَخْرَجَهُ أَبُو يَعْلَى مِنْ حَدِيثِ أَنَسٍ نَحْوَهُ وَإِسْنَادُهُ أَضْعَفُ» ❸

''اس حدیث کی سند میں ضعف ہے اور اس کی مانند حدیث ابو یعلی نے بھی حضرت انس سے بیان کی ہے لیکن اس کی سند اس سے بھی زیادہ کمزور ہے۔''

مذکور حدیث کے بارے میں امام ترمذی فرماتے ہیں:

« وَهٰذَا حَدِيثٌ غَرِيبٌ وَ لَيْسَ إِسْنَادُهُ بِمُتَّصِلٍ رَبِيعَةُ بْنُ سَيْفٍ إِنَّمَا يَرْوِی عَنْ أَبِی عَبْدِ الرَّحْمَنِ الحُبُلِیِّ، عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو، وَلَا نَعْرِفُ لِرَبِيعَةَ بْنِ سَيْفٍ سَمَاعًا مِنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو. » ❹

❶ متفق علیه، صحیح البخاری، بَابُ مُبَاشَرَةِ الحَائِضِ، رقم:۳۰۰

❷ سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِيمَنْ مَاتَ يَوْمَ الجُمُعَةِ، رقم:۱۰۷۴

❸ فتح الباری:۳/ ۲۵۳

❹ سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِيمَنْ مَاتَ يَوْمَ الجُمُعَةِ، رقم: ۱۰۷۴

''یہ حدیث غریب ہے اور اس کی سند متصل نہیں۔ ربیعہ بن سیف کی روایت تو عبداللہ بن عمرو سے ابوعبدالرحمٰن حبلی کے واسطہ سے ہے۔ ربیعہ بن سیف کا سماع عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے معلوم نہیں ہو سکا۔''

شارح ترمذی علامہ مبارکپوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« فَالْحَدِيْثُ ضَعِيْفٌ لِانْقِطَاعِهِ لٰكِنْ لَهُ شَوَاهِدُ »

''پس انقطاع کی بنا پر حدیث ضعیف ہے لیکن اس کے کچھ شواہد ہیں۔''

پھر علامہ سیوطی سے بحوالہ ''مرقاۃ'' کچھ آثار وشواہد نقل کیے ہیں۔ (تحفۃ الاحوذی، ج:۴،ص:۱۸۸) بہرصورت ان آثار کی صحت یا قابلِ صحت ہونا مشکوک ہی نظر آتا ہے۔ جب کہ علامہ سیوطی کی شخصیت بھی رطب و یابس جمع کرنے میں معروف ہے۔ مجھے اس وقت سخت تعجب ہوا جب میں نے استاذِ محترم مفتی محمد عبدہ صاحب مدظلہ العالی کی کتاب ''احکام جنائز'' کا مراجعہ کیا تو اس کے حواشی میں بحوالہ ''تحفہ'' فرماتے ہیں:

«مسند احمد۔ ترمذی وَ لَهُ شَوَاهِدُ فَالْحَدِيْثُ بِمَجْمُوْعِ طُرُقِهِ حَسَنٌ اَوْ صَحِيْحٌ»

''یعنی عبداللہ بن عمرو کی روایت ''مسند احمد'' اور ترمذی میں ہے اور اس کے کچھ شواہد بھی ہیں۔ پس حدیث مجموع طرق کے اعتبار سے حسن یا صحیح ہے۔''

دراں حالیکہ مذکور عبارت محل مقصود میں قطعاً نہیں ہے۔ البتہ ایک دوسرے مقام پر علامہ موصوف فرماتے ہیں: ''یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے لیکن اس کی تائید متعدد حدیثوں سے ہوتی ہے۔ (فتاویٰ ثنائیہ، ج:۲،ص:۴۵)

گویا کہ موصوف کا رجحان اثبات مسئلہ رفع عذاب کی طرف ہے لیکن اس بارے میں درجہ حجت و استدلال کا حصول ایک مشکل امر ہے۔ اور یہ بات مسلّمہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا انتقال سوموار کے روز ہوا تھا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مرض الموت میں اسی تمنا کا اظہار کیا تھا۔ اس پر امام بخاری نے اپنی ''صحیح'' میں تبویب یوں قائم کی ہے: « بَابُ مَوْتِ يَوْمِ الاِثْنَيْنِ »

شارحین حدیث نے لکھا ہے اس سے مصنف کا مقصود جمعہ کی فضیلت کے بارے میں وارد حدیث کی تضعیف ہے۔ واقعاتی طور پر وفات کا جو دن اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولِ خاتم النّبیین ﷺ کے لیے منتخب اور پسند فرمایا وہی افضل اور بہتر ہونا چاہیے۔ اسی بنا پر خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس دن موت کی چاہت کی تھی۔ (هٰذَا مَا عِنْدِيْ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.)

کیا بحالتِ حمل مرنے والی عورت کے حمل کا بھی روزِ قیامت ظہور ہوگا؟

سوال : جو عورت فوت ہو جاتی ہے اور بچہ ابھی پیدا نہیں ہوا بطن میں ہی ہے تو اس کی دو صورتیں ہیں۔ اس میں روح ڈال دی گئی ہو یا نہ، اگر اس میں روح ڈال دی گئی ہو تو کیا قیامت کے روز دوبارہ ماں کے بطن سے جدا کیا جائے گا، اگر

روح نہ ڈالی گئی ہو تو کیا ہو گا؟

جواب: وہ بچہ جو فوت شدہ والدہ کے شکم میں رہ جاتا ہے نفخ روح سے قبل یا بعد ہر دو صورت میں روزِ جزاء اس کا ظہور ہو گا۔

قرآنِ مجید میں ہے: ﴿وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا﴾ (الحج:۲) ''اور تمام حمل والیوں کے حمل گر پڑیں گے۔''

امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«اِنَّهَا تُلْقِي جَنِيْنَهَا لِغَيْرِ تَمَامٍ مِنْ شِدَّةِ الْهَوْلِ.» ❶

''یعنی عورت ہولناکی کی وجہ سے اپنے پیٹ میں چھپا ہوا بچہ گرا دے گی۔''

اسلام نے اس قسم کے بچوں کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں ایک ذمیہ عورت مسلمان کی منکوحہ جس کے بطن میں بچہ تھا۔ فوت ہو گئی، حمل کے احترام کی خاطر فرمایا کہ اس کو مسلم قبرستان میں دفن کیا جائے۔ حالانکہ وہ غیر مسلم تھی۔ ❷

پھر ''مسند احمد'' میں حدیث ہے:

«والسقط يصلى عَلَيْهِ.» ❸

''قبل از وقت پیدا ہونے والا یا مردہ بچہ، اس کی نمازِ (جنازہ) پڑھی جائے۔''

اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچا بچہ جس کے والدین پر دوزخ واجب ہو چکی ہو گی وہ اللہ عزوجل سے مخاصمہ اور منازعہ کر کے ان کو جنت میں لے جائے گا۔ ❹

اور ''صحیح مسلم'' میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت میں ہے:

«صِغَارُهُمْ دَعَامِيصُ الْجَنَّةِ يَتَلَقَّى أَحَدُهُمْ أَبَاهُ۔ فَيَأْخُذُ بِثَوْبِهِ ۔ فَلَا يُفَارِقُه حَتَّى يُدْخِلَهُ الْجَنَّةَ.» ❺

''یعنی چھوٹے بچے اہل جنت کے پانی کے سیاہ کیڑے (کورے) کی طرح ہوں گے، ان میں سے ایک اپنے باپ سے ملے گا جب تک جنت میں داخل نہیں کرے گا چھوڑے گا نہیں۔''

''مسند احمد'' میں ہے: « اِنَّ السقط ليجر اُمَّه اِلَى الْجَنَّةِ اِذَا احْتَسَبَتْهُ » ❻

''ناقص یا مردہ بچہ اپنی ماں کو جنت کی طرف کھینچ کر لے جائے گا بشرطیکہ ماں نے ثواب کی نیت سے صبر کیا ہو۔''

---

❶ فتح القدير، ج:۳، ص:۴۳۵ ❷ تلخيص الحبير (۲/ ۱۴۷)

❸ مسند احمد، رقم: ۱۸۱۷۴، سنده حسن ❹ ابن ماجه، سنده ضعيف

❺ بحواله المرعاة: ۲/ ۵۱۶

❻ سنن ابن ماجه، بَابُ مَا جَاءَ فِيمَنْ أُصِيبَ بِسِقْطٍ، رقم: ۱۶۰۹، مسند احمد، رقم: ۲۲۰۹۰

(تجہیز و تکفین کے مسائل)

کیا مرد اور عورت کے کفن میں فرق ہے؟

سوال : کیا مرد اور عورت کے کفن میں فرق ہے؟ کتاب و سنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں؟

جواب : مرد اور عورت کا کفن ایک جیسا تین چادریں ہیں، لیلیٰ بنت قائف ثقفیہ کی حدیث میں عورت کے لیے پانچ کپڑوں کا ذکر ہے لیکن اس کی سند صحیح نہیں کیوں کہ اس میں نوح بن حکیم ثقفی مجہول ہے اور علامہ زیلعی نے ایک دوسری علت کی بھی نشان دہی کی ہے، ملاحظہ ہو: نصب الرایہ:۲/ ۲۵۸۔

میت کو غسل دینے کا مسنون طریقہ:

سوال : محترم مفتی صاحب! السلام علیکم! میت کو نہلانے کا طریقہ تفصیل سے تحریر فرمادیں۔

(ایک سائلہ۔ اوکاڑہ) (٦ جولائی ٢٠٠١ء)

جواب : اس سوال کے تفصیلی جواب کے لیے علامہ عبدالرحمٰن مبارک پوریؒ کی کتاب ''کتاب الجنائز'' کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

''میت کو غسل دینے کا ارادہ کریں تو اس کا کپڑا اتار دیں۔ مگر بدن کا جتنا حصہ زندگی کی حالت میں چھپانا ضروری ہے اس کو بے ستر نہ کریں، پھر ہاتھ میں کپڑا لپیٹ کر اس کا استنجا کرائیں اور بدن پر کہیں نجاست ہو تو اس کو پاک کریں، پھر وضوء کرائیں اور سر اور داڑھی میں بال ہوں تو خطمی (ایک بوٹی) سے یا کسی اور صاف کرنے والی چیز سے دھوئیں اور اگر میت عورت ہو تو اس کے سر کی چوٹیوں کو کھول کر اس کا سر دھوئیں، پھر تین بار پانی اور بیری کے پتوں سے غسل دیں اور اخیر بار پانی میں کافور ملائیں، اگر تین بار سے زیادہ غسل دینے کی ضرورت معلوم ہو تو پانچ بار غسل دیں یا پانچ بار سے بھی زیادہ مگر طاق ہونا چاہیے اور غسل دینے میں داہنی طرف سے شروع کریں۔ ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی بیٹی کو غسل دے رہی تھیں، اسی حالت میں رسول اللہ ﷺ ہم پر داخل ہوئے اور فرمایا کہ ان کو غسل دو اور پانی بیری کے پتوں سے تین بار یا پانچ بار یا اس سے زیادہ اگر تم کو ضرورت معلوم ہو اور اخیر غسل میں کافور ڈالو۔ [1]

اور ایک روایت میں ہے کہ ان کی داہنی طرف سے اور وضوء کی جگہوں سے شروع کرو۔ [2]

---

[1] اس حدیث سے معلوم ہوا کہ میت کے تینوں غسل پانی اور بیری کے پتوں سے ہونے چاہئیں، اور تیسرے غسل میں کچھ کافور بھی ملا لینا چاہیے، لیکن سنن ابی داؤد میں محمد بن سیرین سے روایت ہے کہ انھوں نے غسل میت کا طریقہ ام عطیہ سے سیکھا تھا، وہ غسل دیتے تھے پانی اور بیری کے پتوں سے دوبار اور تیسری بار پانی اور کافور سے۔

[2] صحيح البخاري، بَابُ مَا يُسْتَحَبُّ أَنْ يُغْسَلَ وِتْرًا، رقم:١٢٥٤، وبَابُ مَوَاضِعِ الوُضُوءِ مِنَ المَيِّتِ، رقم:١٢٥٦، و صحيح مسلم.

نرمی اور آہستگی سے غسل دیں اور میت سے کوئی مکروہ اور معیوب بات معلوم ہو تو اس کو چھپائیں اور کسی سے ظاہر نہ کریں اور جس مقام میں غسل دیں وہاں پردہ کرلیں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جو شخص کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی فرمائے گا۔ [1]

نیز حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مُردوں کی خوبیوں کو بیان کرو اور ان کی برائیوں کے ذکر سے باز رہو۔ [2]

علماء لکھتے ہیں کہ غسل دینے والا جب میت کی کوئی اچھی بات دیکھے، مثلاً اس کے چہرہ کا چمکنا اور روشن ہونا یا اس سے خوشبو کا معلوم ہونا تو بہتر ہے کہ اس کو لوگوں سے بیان کرے اور اگر کوئی بات مکروہ دیکھے، مثلاً اس کے چہرے یا بدن کا سیاہ ہو جانا یا اس کی صورت کا بدل جانا یا اس سے بدبو معلوم ہونا تو اس کو لوگوں سے ظاہر کرنا جائز نہیں۔

فقہائے حنفیہ لکھتے ہیں کہ میت کو غسل دینے کے واسطے تخت یا چارپائی پر پہلے بائیں کروٹ لٹائیں تاکہ غسل دینے میں داہنی طرف سے شروع ہو۔ پھر غسل دیں، یہاں تک کہ اوپر سے نیچے تک تمام بدن کا غسل ہو جائے۔ یہ ایک غسل ہوا پھر داہنی کروٹ پر لٹا کر اسی طرح غسل دیں، یہ دوسرا غسل ہوا۔ پھر بائیں کروٹ پر لٹا کر اسی طرح غسل دیں یہ تیسرا غسل ہوا۔

فوائد متفرقہ:

فائدہ: جب میت کو غسل دینے کے واسطے تخت یا چارپائی پر فرمائیں تو کس رُخ پر لٹائیں؟ اس بارے میں کوئی حدیث نظر سے نہیں گزری، علماء کی آرائیں اس بارے میں مختلف ہیں۔ بعض کہتے ہیں جیسے قبر میں لٹایا جاتا ہے، اسی طرح غسل دینے کے وقت بھی لٹانا چاہیے اور بعض کہتے ہیں اس طرح لٹایا جائے کہ اس کے پیر قبلہ کی طرف ہوں۔ فقیہ سرخسی حنفی کہتے ہیں کہ اصح یہ ہے کہ جس رخ لٹانے میں آسانی ہو اسی رُخ لٹائیں۔

فائدہ: حنفی مذہب کی کتابوں میں لکھا ہے کہ ''جس تخت پر میت کو غسل دینا ہو اس کو پہلے کسی خوشبودار چیز مثلاً اگربتی یا لوبان سے تین بار یا پانچ بار دھونی دے لیں۔'' لیکن اس دھونی کا ثبوت حدیث سے نہیں ملتا ہے۔ ہاں کفن کے دھونی دینے کا ثبوت حدیث سے ہے۔ جیسا کہ تم کو آگے معلوم ہوگا۔

فائدہ: اوپر حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے معلوم ہوا کہ میت کو پانی اور بیری کے پتوں سے غسل دینا چاہیے، رہی یہ بات کہ بیری کے پتوں کو کس طریق سے استعمال کرنا چاہیے سو اس کے متعلق حدیث سے کوئی تشریح نہیں ملتی ہے۔

---

[1] صحیح البخاری و صحیح مسلم، بَابُ تَحْرِیمِ الظُّلْمِ، رقم:۲۵۸۰

[2] سنن ابی داؤد، بَابٌ فِی النَّهْیِ عَنْ سَبِّ الْمَوْتَی، رقم: ۴۹۰۰، سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِی دَفْنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَيْثُ قُبِضَ، رقم:۱۰۱۹

فقہائے حنفیہ لکھتے ہیں کہ بیری کے پتوں کو پانی میں جوش دیا جائے اور اسی جوش دیے ہوئے پانی کے پتوں کو پانی میں ڈالیں اور پانی کو خوب حرکت دیں یہاں تک کہ گاج نکلے، پس اس گاج کو میت کے تمام بدن پر ملیں۔ پھر خالص پانی ڈالیں۔ یہ ایک غسل ہوا۔ ملک عرب میں یہ دستور ہے کہ بیری کے پتوں کو پانی میں پیس کر میت کو تمام بدن پر ملتے ہیں پھر خالص پانی سے بدن کو صاف کر دیتے ہیں۔

فائدہ:...... میت چونکہ منہ اور ناک سے پانی خارج نہیں کر سکتی، اس وجہ سے فقہائے حنفیہ کہتے ہیں کہ میت کو بلا مضمضمہ (کلی) استنشاق (ناک میں پانی ڈالنا) کے وضوء کرانا چاہیے، اور بعض فقہاء لکھتے ہیں کہ میت کو مضمضہ اور استنشاق اس طرح کرایا جائے کہ انگلی میں کپڑا لپیٹ کر اس کے مسوڑھوں اور دانتوں اور لبوں کو مل دیا جائے اور ناک کے نتھنوں میں انگلی پھرائی جائے اور بعض فقہاء لکھتے ہیں کہ میت اگر جب ہو تو اس کو مضمضمہ اور استنشاق کے ساتھ وضوء کرانا چاہیے اور فقہائے شافعیہ لکھتے ہیں کہ میت کو مضمضہ اور استنشاق کے ساتھ وضوء کرانا چاہیے، جب ہو یا نہ ہو۔

میں کہتا ہوں کہ ظاہر یہی ہے کہ میت کو مضمضہ اور استنشاق کے ساتھ وضوء کرانا چاہیے اور اگر مضمضہ اور استنشاق نہ ہو سکے تو وہی کیا جائے جو فقہائے حنفیہ نے لکھا ہے، یعنی انگلی میں کپڑا لپیٹ کر اس کے مسوڑھوں اور دانتوں اور لبوں کو مل دیا جائے اور ناک کے نتھنوں میں انگلی پھرائی جائے۔

فائدہ:...... تین بار غسل دینے کے بعد میت کی شرمگاہ سے کوئی شئے خارج ہو تو اس کو دھو دینا کافی ہے۔ یا پھر سے غسل دینا چاہیے؟ اس بارے میں علماء کے دو قول ہیں: حسن بصری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ دھو دینا کافی ہے۔ پھر سے غسل دینے کی ضرورت نہیں اور یہی قول ہے علمائے حنفیہ کا اور محمد بن سیرین کہتے ہیں کہ تین بار غسل دیا جائے۔ اگر تین بار غسل دینے کے بعد کوئی شئے خارج ہو تو پانچ بار غسل دیا جائے اور اگر پانچ بار غسل دینے کے بعد کوئی شئے خارج ہو تو سات بار غسل دیا جائے، یہ محمد بن سیرین وہ شخص ہیں جو تجہیز و تکفین کے احکام و مسائل کو تمام تابعین سے زیادہ جاننے والے تھے۔ اور غسل دینے کا طریقہ ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے سیکھا تھا۔

فائدہ:...... کوئی مسلمان مر جانے کے بعد نجس و ناپاک نہیں ہوتا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اپنے مُردوں کو نجس مت کہو، کیونکہ مومن نجس نہیں، نہ زندگی کی حالت میں اور نہ مرنے کے بعد، روایت کیا اس کو سعید بن منصور نے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''شرح بخاری'' میں لکھا ہے کہ اس کی اسناد صحیح ہے۔ اور یہ اثر مرفوعاً بھی روایت کیا گیا ہے۔''

کیا غسل کے وقت مردے کے پاؤں قبلہ رخ ہونا درست ہیں؟

سوال: مردے کو نہلاتے ہوئے اس کے پیر کس سمت رہیں۔ حدیث و آثارِ صحابہ کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔

(عبدالغنی عاصم۔ لسبیلا) (۵ مئی ۲۰۰۰ء)

جواب: بظاہر اختیار ہے کسی حدیث یا اثر میں پیروں کی سمت کا تعین نہیں۔

غسل کے وقت قبلے کی سمت پیروں کی صریح ممانعت ہے تو بتائیں:

سوال : قبلے کی سمت پیروں کی صریح ممانعت ہو تو بتائیں۔ (عبدالغنی عاصم۔لسبیلا) (۵ مئی ۲۰۰۰ء)

جواب : قبلے کی سمت پاؤں کی ممانعت کا کسی حدیث میں ذکر نہیں۔

کیا شوہر اور بیوی وفات کے بعد ایک دوسرے کو غسل دے سکتے ہیں؟

سوال : کیا شوہر اور بیوی وفات کے بعد ایک دوسرے کو غسل دے سکتے ہیں؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔ (ایک سائل۔لاہور) (۹ جولائی ۱۹۹۹ء)

جواب : حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک شخص کے جنازے سے لوٹے اور میرے سر میں درد ہو رہا تھا اور میں ہائے ہائے کر رہی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بلکہ میرے سر میں درد ہوتا ہے۔ تجھے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اگر تو مجھ سے پہلے مرگئی تو میں تجھے غسل اور کفن دوں گا۔ پھر تجھ پر نمازِ جنازہ پڑھوں گا۔ اور تجھے دفن کروں گا۔ ❶

نیز حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، فرماتی ہیں، اگر ہمیں پہلے خیال آتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی بیویوں کے سوا کوئی غسل نہ دیتا۔ ❷ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے وفات کے وقت اپنی بیوی اسماء کو وصیت کی کہ وہ انھیں غسل دے۔ پس اس نے حضرت ابوبکر کو غسل دیا۔ ❸

''نیل الاوطار'' (۴/ ۲۹) میں ہے کہ:

> ''اس میں دلیل ہے کہ مرد اپنی بیوی کو غسل دے سکتا ہے اور عورت بھی اس دلیل سے خاوند کو غسل دے سکتی ہے کیونکہ خاوند بیوی کا ایک پردہ ہے۔ جس طرح مرد عورت کو دیکھ سکتا ہے عورت بھی مرد کو دیکھ سکتی ہے۔ نیز اسماء، (حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیوی) نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو غسل دیا۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو غسل دیا۔ اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے کسی نے اس پر انکار نہیں کیا۔ پس اس پر صحابہ رضی اللہ عنہم کا اجماع ہو گیا کہ خاوند بیوی ایک دوسرے کو غسل دے سکتے ہیں۔''

---

❶ مسند احمد، رقم:۲۵۹۰۸، سنن الدارمی، بَابُ فِي وَفَاةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، رقم:۸۱، سنن ابن ماجه، بَابُ مَا جَاءَ فِي غَسْلِ الرَّجُلِ امْرَأَتَهُ، وَغَسْلِ الْمَرْأَةِ زَوْجَهَا، رقم:۱٤٦٥

❷ مسند احمد، سنن ابن ماجه، بَابُ مَا جَاءَ فِي غَسْلِ الرَّجُلِ امْرَأَتَهُ، وَغَسْلِ الْمَرْأَةِ زَوْجَهَا، رقم:۱٤٦٤

❸ المنتقیٰ باب ما جاء فی غسل احد الزوجین للآخر

غسل کے دوران میت کے ناخن تراشنا یا زیر ناف صاف کرنا جائز ہے؟

سوال : اگر میت کے ناخن اور موئے زیرِ ناف بڑھے ہوئے ہوں تو غسال (غسل دینے والے) کے لیے ان بالوں اور ناخنوں کو صاف کرنا ضروری ہے یا نہ چھیڑے؟ (وقار علی۔ لاہور) (۱۸ اپریل ۱۹۹۷ء)

جواب : میت کے نزدیک ناف بڑھے ہوئے بالوں کو صاف کرنا چاہیے۔ ابن ابی شیبہ وغیرہ میں ایسے آثار و اقوال موجود ہیں۔

کیا وفات کے بعد میت کے مصنوعی دانت نکالنے ضروری ہیں؟

سوال : اگر کسی شخص نے سونے یا کسی اور قیمتی دھات کے مصنوعی دانت لگوائے ہوں اور وہ فوت ہو جائے تو کیا ان دانتوں کو نکال کر استعمال میں لایا جاسکتا ہے؟ اگر دفناتے وقت دانت نکالنے مشکل ہوں تو کیا اسے مصنوعی دانتوں سمیت دفنایا جاسکتا ہے؟ (سائل) (۲۰ مئی ۲۰۰۵ء)

جواب : وفات کی صورت میں ایسے دانت کو نکال کر استعمال میں لایا جاسکتا ہے، حدیث میں مال ضائع کرنے سے منع کیا گیا ہے اور اگر وہ کسی وجہ سے اتر نہ سکتے ہوں تو اسی حالت میں میت کو دفن کر دیا جائے۔

﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرۃ:۲۸۶)

مخنث کی میت کو غسل کون دے؟

سوال : مخنث کی میّت کو کون غسل دے؟ (عبدالحفیظ سموں، بدین) (۹ جنوری ۱۹۹۸ء)

جواب : وفات کی صورت میں اس کو غسل وہ صنف دے گی جس کے ساتھ ملحق ہوگا اور عدمِ انکشاف کی صورت میں اس کو غسل مرد دیں گے کیونکہ کتاب وسنت میں عام حالات میں تذکیر کو تانیث پر غلبہ حاصل ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿وَ كَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِیْنَ﴾ (التحریم:۱۲)

نیز فرمایا: ﴿فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْا﴾ (طٰہٰ:۱۰)

کیا مرد کے کفن میں قمیص ضروری ہے؟

سوال : اگر کوئی شخص مر جائے تو اس کی کفنی (قمیص) آگے تو گھٹنوں سے ذرا نیچے تک اور پچھلی طرف کیا کمر تک ہونی چاہیے یا آگے کی طرح پوری بنائی جائے۔ (ڈاکٹر محمد اسحاق شاہ، یارو خیل، میانوالی)

جواب : مرد کے کفن میں قمیص کا کسی قابلِ حجت و استدلال روایت سے ثبوت نہیں ملتا بلکہ بعض صحیح روایات نفی پر دال ہیں۔ آدمی کا کامل اور مکمل کفن صرف تین چادریں ہیں۔ (نیل الاوطار، ج:۴، ص:۴۱)

میت کے کفن پر کوئی سورت وغیرہ لکھنا

سوال: میت کو غسل دے کر کفن پہنا کر کفن پر کوئی سورت وغیرہ لکھنا جائز ہے یا نہیں؟

(محمد عرفان محمدی، ضلع وہاڑی) (۳۰ اگست ۱۹۹۶ء)

جواب: کفن پر کچھ لکھنا کتاب وسنت سے ثابت نہیں۔ صحیح حدیث میں ہے:

« مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَیْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ »[1]

''یعنی جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے۔''

عورت کی میت کو خوشبو لگانے کا حکم

سوال: میت اگر عورت ہو تو خوشبو لگائی جا سکتی ہے؟ (سائل) (۲۲ اپریل ۲۰۰۵ء)

جواب: عورت میت کے لیے بھی کافور، وغیرہ استعمال ہو سکتا ہے۔ نبی ﷺ کی صاحبزادی کے غسل میں استعمال ہوا تھا۔[2]

(جنازہ اٹھائے جانے کے متعلق بعض مسائل)

کیا غیر محرم مرد عورت کے جنازہ کو کندھا دے سکتا ہے؟

سوال: کیا غیر محرم مرد عورت کے جنازہ کو کندھا دے سکتا ہے؟ (ایک سائل۔لاہور) (۲ مئی ۱۹۹۷ء)

جواب: غیر محرم مرد عورت کے جنازہ کو کندھا دے سکتا ہے۔ حدیث میں ہے:

«إِذَا وُضِعَتِ الْجِنَازَةُ ، وَاحْتَمَلَهَا الرِّجَالُ عَلَى أَعْنَاقِهِمْ.»[3]

یہاں امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں بایں الفاظ تبویب قائم کی ہے:

«بَابُ حَمْلِ الرِّجَالِ الْجِنَازَةَ دُونَ النِّسَاءِ .»

یعنی ''جنازہ کو صرف مرد کندھا دیں، عورتیں نہ دیں۔''

غیر محرم عورت کا جنازہ اٹھانا

سوال: کسی عالم دین سے سنا تھا کہ میت اگر عورت ہو تو اس کے جنازے کو غیر محرم نہیں اٹھا سکتا۔ کیا واقعی کوئی ایسا

---

[1] صحیح البخاری، بَابُ إِذَا اصْطَلَحُوا عَلَى صُلْحِ جَوْرٍ فَالصُّلْحُ مَرْدُودٌ، رقم:۲۶۹۷

[2] صحیح البخاری ،بَابُ یُجْعَلُ الكَافُورُ فِي آخِرِهِ، رقم:۱۲۵۸

[3] صحیح البخاری، بَابُ حَمْلِ الرِّجَالِ الجِنَازَةَ دُونَ النِّسَاءِ، رقم:۱۳۱٤

مسئلہ ہے؟ (محمد ادریس عتیق۔ ملتان) (۲۱۔اپریل ۲۰۰۰ء)

جواب: غیر محرم عورت کا جنازہ اٹھا سکتا ہے۔کوئی حرج نہیں۔ حدیث میں مطلقاً وارد ہے:

« وَاحْتَمَلَهَا الرِّجَالُ عَلَى أَعْنَاقِهِمْ » ❶

''یعنی مرد میت کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیتے ہیں۔''

امام بخاری رحمہ اللہ کی ''صحیح بخاری'' میں تبویب سے بات واضح ہے:

«بَابُ حَمْلِ الرِّجَالِ الْجِنَازَةَ دُونَ النِّسَاءِ.»

غیر محرم عورت کے جنازے کو کندھا دینا

سوال: غیر محرم عورت کے جنازے کو غیر مرد اٹھا سکتا ہے یا نہیں؟

جواب: امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی ''صحیح'' میں تبویب قائم کی ہے:« بَابُ حَمْلِ الرِّجَالِ الْجَنَازَةَ دُونَ النِّسَآءِ »یعنی جنازہ صرف مرد اٹھائیں۔عورتیں نہ اٹھائیں۔ پھر اس کے تحت مشہور حدیث بیان کی ہے کہ

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب جنازہ تیار ہو جاتا ہے اور مرد اُسے اپنی گردنوں پر اٹھا لیتے ہیں،تو وہ واویلا کرتا ہے کہ مجھے کہاں لے چلے ہو؟ میت کی اس آواز کو انسان کے ماسوا ہر شے سنتی ہے اور اگر زندہ انسان اس آواز کو سن لے تو وہ مرجائے۔''

اس حدیث میں جنازہ کو اٹھانے والے مَردوں میں مَحرم اور غیر محرم کی تفریق روا نہیں رکھی گئی۔

لہٰذا عمومِ حدیث کے اعتبار سے غیر محرم کے جنازے کو اٹھانے کا جواز معلوم ہوتا ہے۔مصنف امام بخاری رحمہ اللہ کا فہم بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔(واللّٰہ أعلم بالصواب)

غیر محرم عورت کے جنازے کو کندھا دینا اور قبر میں اتارنا جائز ہے؟

سوال: کیا شرعی طور پر کوئی ایسا حکم ہے کہ عورت کے جنازے کو غیر محرم کندھا نہیں دے سکتا اور نہ قبر میں ہی اتار سکتا ہے؟

جواب: عورت کے جنازے کو غیر محرم کندھا دے سکتا ہے۔شرعاً اس میں کوئی پابندی نہیں۔ حدیث کے الفاظ «وَاحتَمَلَهَا الرِّجَالُ عَلٰى أَعنَاقِهِم» سب کو شامل ہیں۔ ❷

اسی طرح قبر میں محرم یا کوئی دوسرا نیک صالح آدمی اتار سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو! (صحیح بخاری) ❸

---

❶ المصدر السابق. ❷ صحیح بخاری، بَابُ حَمْلِ الرِّجَالِ الجِنَازَةَ دُونَ النِّسَاءِ، رقم:١٣١٤

❸ صحیح البخاری، بَابُ مَنْ يَدْخُلُ قَبْرَ المَرْأَةِ، رقم:١٣٤٢

قبرستان لے جاتے ہوئے میت کے پاؤں قبلہ رخ ہو جائیں تو......؟

سوال : جنازہ اٹھایا ہوا ہو تو میت کے پاؤں قبلہ کی طرف ہو جائیں تو کوئی حرج تو نہیں؟ جب کہ قبرستان کی طرف جائیں تو پیٹھ قبلہ کی طرف ہوتی ہے (یعنی راستہ ہی ایسا ہے)

نیز بتائیں کہ قبلہ کی طرف پاؤں نہ کرنے کا حکم آیا حدیث سے ثابت ہے یا کہ صرف تعظیم اور آدب کی خاطر ہے؟

(۲۶ جولائی ۱۹۹۶ء)

جواب : میت کے پاؤں قبلہ رخ ہو جائیں تو کوئی حرج نہیں۔ کسی روایت میں منع نہیں آیا۔ البتہ اگر کوئی عمومی آیت ﴿وَ مَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ﴾ (الحج:۳۲) کے پیش نظر ایسا کرلے تو یہ بھی درست فعل ہے۔

جب کہ دوسری طرف نماز پڑھنے کی بعض صورتوں میں قبلہ رخ پاؤں کرنے کا جواز بھی وارد ہے تو اس صورت میں ان روایات کو مستثنیات کی ہی حیثیت حاصل ہوگی۔ (وَاللّٰهُ تَعَالٰى اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.)

بہر صورت مسئلہ ہذا میں تشدد کا پہلو نہیں اختیار کرنا چاہیے جونسی صورت ہو درست فعل ہے۔

جنازہ قبرستان لے جاتے ہوئے پاؤں کس طرف ہونے چاہئیں؟

سوال : میت کو قبرستان کی طرف لے جاتے ہوئے پاؤں کس طرف ہونے چاہئیں؟ بعض لوگ کہتے ہیں قبرستان کی طرف میت کے پاؤں نہیں ہونے چاہئیں۔ سید کائنات ﷺ کا فرمان کیا ہے؟ دلائل سے وضاحت فرمائیں۔

(احقر قاری ضیاء اللہ بخاری) (۱۲ دسمبر ۱۹۹۷ء)

جواب : جنازہ قبرستان لے جاتے ہوئے میت کے پاؤں کسی طرف بھی ہو سکتے ہیں۔ شریعت میں کوئی پابندی نہیں۔

قبرستان لے جاتے وقت میت کے پاؤں کس طرف ہونے چاہئیں؟

سوال : گاؤں کے مشرق کی طرف قبرستان ہے میت کو قبرستان میں لے جانے کے لیے میت کے پاؤں قبرستان کی طرف کریں یا خانہ کعبہ کی طرف؟ (محمد ادریس شائق، خطیب جامع مسجد اہل حدیث شاہ والی ڈاکخانہ فضل آباد تحصیل دیپالپور ضلع اوکاڑہ)

جواب : اس موقع پر کسی حدیث میں جہت کے تعین کی صراحت نظر سے نہیں گزری بظاہر مسئلہ ہذا میں وسعت معلوم ہوتی ہے ہاں البتہ آولیٰ یہ معلوم ہوتا ہے کہ پاؤں قبلہ رُخ نہ کیے جائیں۔ قرآنِ مجید میں ہے:

﴿وَ مَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ﴾ (الحج:۳۲)

''اور جو شخص ادب کی چیزوں کی جو اللہ نے مقرر کی ہیں عظمت رکھے تو یہ (فعل) والوں کی پرہیزگاری میں ہے۔''

ظاہر ہے کہ بصورتِ دیگر پاؤں قبرستان کی طرف ہوں گے جس کے جواز میں کوئی کلام نہیں۔ (وَاللّٰهُ تَعَالٰى اَعْلَمُ)

تعاقب: میت کے پاؤں قبلہ رخ نہ ہونا کیا فی الواقع اولیٰ ہے (از ڈاکٹر عبیدالرحمٰن چوہدری)

''الاعتصام'' شمارہ ۳۸، میں ایک سوال کا جواب شائع ہوا۔ اس سلسلے میں مجھے کچھ اختلاف ہے۔ ''الاعتصام'' کی وساطت سے وضاحت درکار ہے۔ ۲۱ ستمبر ۱۹۹۰ء کے شمارہ ''الاعتصام'' کے ص: ۸، پر ایک سوال ''میت کو قبرستان کی طرف (مشرق) لے جاتے وقت اس کے پاؤں قبرستان کی طرف کریں یا قبلہ کی طرف؟'' کے جواب میں مرقوم ہے کہ اس موقعہ پر کسی حدیث میں جہت کے تعین کی صراحت نظر سے نہیں گزری۔ بظاہر مسئلہ ہذا میں وسعت معلوم ہوتی ہے۔ ہاں البتہ اولیٰ یہ معلوم ہوتا ہے کہ پاؤں قبلہ رُخ نہ کیے جائیں ۔ کیوں کہ قرآن مجید میں ہے کہ جو شخص آدب کی چیزوں (شعائرَ اللہ) کی عظمت رکھے تو یہ (فعل) دلوں کی پرہیزگاری میں ہے۔ ظاہر ہے کہ بصورتِ دیگر پاؤں قبرستان کی طرف ہوں گے، جس کے جواز میں کوئی کلام نہیں۔''

اس مسئلے میں پاؤں قبلہ رُخ نہ کرنے کو اولیٰ سمجھنا محل نظر ہے کیونکہ آدب و احترام والی چیزوں کے موقعہ اور محلِ آدب کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اوّلاً یہ کہ قرآن و سنت میں میت کو قبرستان لے جانے کے لیے ایسے آداب کی صراحت نہیں۔ ثانیاً سلف صالحین میں بھی ایسا عمل اولیٰ تصور نہیں کیا گیا۔ اس میں بہت سی الجھنیں پیدا ہوکر پریشانی کا باعث بن سکتی ہیں۔ مثلاً

1. میت کا جنازہ اٹھا کر اس حالت میں چلا جائے کہ اس کے پاؤں آگے کی طرف ہوں، کچھ عیب سا معلوم ہوتا ہے اور نزاع کا باعث بھی ہوسکتا ہے۔
2. شہروں کے محلوں کی گلیوں، سڑکوں کے ایچ پیچ کبھی شرقاً کبھی غرباً ہونے کی وجہ سے مشکل پیش آئے گی۔
3. مدینہ منورہ یا اس علاقے کا قبرستان اگر قبلہ کی طرف ہے یا یا مخالف سمت تو اولویت ملحوظ رکھ کر جنازہ لے جانے والے کیا کریں گے؟ اگر میت کا سرہانہ کعبہ کی طرف کریں تو قبلہ اول (بیت المقدس) کی طرف پاؤں ہوں گے وہ بھی تو سوءِ ادبی سمجھی جائے گی اور اگر سر قبلہ اوّل کی طرف کریں تو خانہ کعبہ کی سوءِ ادبی تصور ہوگی۔ خانہ کعبہ سے یا شہر مکہ سے۔ جنازہ اٹھا کر باہر قبرستان کی طرف لے جانے والوں نے کیا کبھی میت کے پاؤں کو قبرستان کی طرف کرنے کو اولیٰ سمجھا؟
4. انسان کے پاؤں اگر مساجد کی سوءِ ادبی کا باعث بنتے ہوں تو پھر خانہ کعبہ کے اندر جانے یا نماز پڑھنے کی کیا صورت ہوگی؟ ظاہر ہے کہ پاؤں جوتوں کی طرح الگ نہیں ہو سکتے۔ یہ تو خانہ کعبہ کی زمین پر رکھے ہوئے ہوتے ہیں بلکہ ایسا کرنا تو قبلہ کے آداب میں شامل ہے۔ دیگر حالت جائز نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے قبلہ رخ تھوکنے، پیشاب پاخانے کے وقت (کھلی جگہ میں) اس طرف منہ کرنے سے پرہیز کی ہدایت فرمائی ہے۔ پاؤں کی جہت و

تو ملحوظ نہ رکھا۔

محمد رسول اللہ ﷺ تو مسلّمہ قابلِ احترام ہستی ہیں۔ ان کی محبت اپنی جان سے بھی زیادہ چاہیے بایں ہمہ انھوں نے کسی مجلس میں اپنی آمد پر لوگوں کو کھڑا ہو جانے کی بھی اجازت نہیں دی جیسے آج کل لوگ کسی بڑے کے اَدب کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جہلا تو اپنے پیروں مرشدوں سے رخصت ہوتے وقت اَدباً احتراماً اُلٹے پاؤں چلتے ہیں مگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ایسے آداب کو اَدب نہیں گردانا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاؤں رسول اللہ ﷺ کی نفلی نماز کے وقت ان کے سجدے کی جگہ پر ہوتے جو سجدے کے وقت ٹانگیں سکیڑ کر پاؤں وہاں سے ہٹا لیتی تھیں۔ ایسی ہستی کے آگے پاؤں رکھنا بھی تو بے اَدبی سمجھی جا سکتی تھی۔ اگر جگہ کم تھی تو آپ کی نماز کے وقت بیٹھ سکتی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ اگر ایسے آداب کو بہتر خیال فرماتے تو کبھی خاموش نہ رہتے بلکہ پاؤں آگے نہ رکھنے کی آئندہ کے لیے ہدایت فرماتے مگر ایسا ثابت نہیں۔

محولہ بالا ''اولیٰ'' یا ایسے مستحباتی قسم کے اجتہادات سے تو بدعات جنم لینے کا احتمال ہو سکتا ہے۔ محترم مفتی صاحب سے گزارش ہے کہ اس مسئلے پر نظر ثانی فرما کر وضاحت فرما دیں۔

(ڈاکٹر عبید الرحمٰن چوہدری، مکان: ۵۴۹، گلی ۲۶، گلستان کالونی مصطفیٰ آباد، لاہور۔ ۱۵)

وضاحت (از حافظ ثناء اللہ مدنی حفظہ اللہ)

جواباً عرض ہے کہ آپ کی وضاحت درست ہے۔ ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (التغابن: ١٦)

ہاں البتہ اختیاری حالت میں اولیٰ وہی ہے جو فتویٰ میں ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿وَ مَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ﴾ (الحج: ٣٢) (٢٠١٦-١٢-٧)

جنازے کو قبرستان لے جاتے وقت بآوازِ بلند کلمۂ شہادت پڑھنا کیسا ہے؟

سوال: مردے کو لے جاتے وقت کلمۂ شہادت پڑھنا کیسا ہے؟ (ابو عبداللہ نذیر احمد جونیجو، سندھ) (۷ مئی ۱۹۹۹ء)

جواب: میت کو قبرستان لے جاتے وقت کلمۂ شہادت کا وِرد کرنا احادیث سے ثابت نہیں۔ دین میں اپنی طرف سے اضافہ کرنا درست نہیں۔ کما تقدم۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«اِتَّبِعُوْا وَلَا تَبْتَدِعُوْا فَقَدْ كُفِيْتُمْ.»

''پیروی کرو بدعت مت نکالو۔ تمہارے لیے یہی کافی ہے۔''

اور امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«فَمَا لَمْ يَكُنْ يَوْمَئِذٍ دِيْنًا لَايَكُوْنَ الْيَوْمَ دِيْنًا.»

''یعنی جو شئے عہدِ رسالت میں دین نہیں تھی۔ وہ آج بھی دین نہیں بن سکتی۔''

اس لیے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ .... ﴾ (المائدۃ:۳) جو شخص اسلام میں بدعت ایجاد کر کے اسے مستحسن خیال کرتا ہے، وہ گویا یہ سمجھتا ہے کہ محمد ﷺ نے پیغام رسانی میں (نعوذ باللہ من ذلک) خیانت کی ہے۔

اصل یہ ہے کہ ایسے موقع پر انسان خود اپنی موت بھی یاد کر کے اپنے لیے زادِ راہ بنائے۔ شریعت میں زیارتِ قبور کا یہی فلسفہ بیان ہوا ہے کہ «فَإِنَّهَا تُذَكِّرُ الآخرة »

واضح ہو کہ بدعت کا یہ خاصہ ہے کہ ہمیشہ استحسانی صورت میں سامنے آتی ہے جب کہ فی الواقع ایک مسلم کا مطمح نظر ہر حالت میں ہمیشہ کتاب و سنت کی پیروی ہونا چاہیے۔ خواہ وہ عمل بظاہر کتنا ہی کم نظر آئے۔ کیونکہ اصل قدر و قیمت تعلق بالشریعت کی ہے۔ «اَلْخَيْرُ فِي الاتِّبَاعِ وَالشَّرُّ كُلّ الشَّر فِي الْإِبْتِدَاعِ»

قبرستان کی طرف گزرتے جنازہ کے لیے کھڑا ہونے کا حکم

سوال : جب جنازہ گزر رہا ہو تو کھڑا ہونا چاہیے یا نہیں؟ (محمد آصف عزیز سلفی، شیخوپورہ) (۱۶ اکتوبر ۱۹۹۵ء)

جواب : اس بارے میں جواز عدمِ جواز دونوں قسم کی روایات کتب احادیث میں موجود ہیں۔ جمہور اہل علم جنازہ کے لیے قیام کے لیے نسخ کے قائل ہیں۔ ان کی بنیاد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث پر ہے:

«أَنَّهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَامَ لِلْجَنَازَةِ ثُمَّ قَعَدَ أَخْرَجَهُ مُسْلِمٌ .» ❶

کہ ''آنحضرت ﷺ جنازہ کے لیے پہلے کھڑے ہوئے مگر بعد میں کھڑا ہونا چھوڑ دیا اور بیٹھے رہتے۔''

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی دوسری روایت میں ہے:

«كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَأْمُرُنَا بِالْقِيَامِ فِي الْجَنَازَةِ ثُمَّ جَلَسَ بَعْدَ ذٰلِكَ وَ أَمَرَ بِالْجُلُوْسِ .» ❷

''کہ آنحضرت ﷺ نے ہمیں جنازہ کے لیے کھڑا ہونے کا حکم دیا تھا مگر بعد میں آپ بھی بیٹھ گئے اور ہمیں بھی بیٹھنے کا حکم دے دیا۔''

---

❶ صحیح مسلم، بَابُ نَسْخِ الْقِيَامِ لِلْجَنَازَةِ، رقم:۹۶۲، بحواله فتح الباری، ج:۳، ص:۱۸۱

❷ صحیح ابن حبان، ذِكْرُ الْأَمْرِ بِالْجُلُوسِ عِنْدَ رُؤْيَةِ الْجَنَائِزِ بَعْدَ الْأَمْرِ بِالْقِيَامِ لَهَا، رقم:۳۰۵۶ ۔ و رواه ابوداؤد، و احمد و ابن ماجه، والبيهقی باختلاف اللفظ قال الشوكانی رجال اسناده ثقات،

(صلوٰۃ الجنازۃ/نمازِ جنازہ)

نمازِ جنازہ سے پہلے فرض نماز کا پڑھنا

سوال : نمازِ جنازہ سے پہلے فرض نماز کا پڑھنا کیا ضروری ہے اور اگر فرض نہیں پڑھ سکتا تو جنازہ میں شامل نہ ہو؟

جواب : فرضی نماز سے قبل یا بعد ہر دو صورت میں نمازِ جنازہ میں شمولیت کا جواز ہے۔ اس لیے کہ کسی حدیث میں نہی وارد نہیں۔

بلا عذر بیٹھ کر نمازِ جنازہ پڑھانا

سوال : ایک اخبار میں ہم نے دیکھا ایک امریکی مسلمان ڈاکٹر مرنے والوں کا غائبانہ جنازہ پڑھا رہا ہے اور امام و مقتدی سب بیٹھ کر ادا کر رہے ہیں، کیا ایسا کرنا قرآن وحدیث کی رُو سے جائز ہے؟ (ابوطلحہ محمد خالد عزیز) (۲۱۔اپریل ۲۰۰۰ء)

جواب : استطاعت کی صورت میں نماز کھڑے ہوکر پڑھنی چاہیے۔ نماز جنازہ ہو یا کوئی اور نماز حکم سب کا ایک جیسا ہے۔ بلاوجہ بیٹھ کر جنازہ پڑھنا درست عمل نہیں۔

نمازِ جنازہ کے موقع پر صفیں طاق بنانا ضروری ہے؟

سوال : نمازِ جنازہ کے موقع پر صفیں طاق بنانا ضروری ہے یا مستحب ہے؟

(محمد صدیق تلیاں، ایبٹ آباد) (۲۱ جنوری ۲۰۰۰ء)

جواب : نمازِ جنازہ میں صفیں طاق بنانا ضروری نہیں۔ ابوداؤد وغیرہ میں مالک بن ہبیرہ کی روایت میں طاق کا ذکر ہے۔لیکن اس میں محمد بن اسحاق مدلس راوی ہے۔ اس نے یہ روایت عن کے ساتھ بیان کی ہے اور مدلس میں یہ علت موثر ہے۔ اس بناء پر یہ حدیث قابلِ حجت نہیں۔ یہاں تک کہ کوئی ایسے شے پائی جائے جو اس کی صحت کی شہادت دے۔ اور امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی ''صحیح'' میں بایں الفاظ باب قائم کیا ہے:

«بَابُ مَنْ صَفَّ صَفَّيْنِ أَوْ ثَلَاثَةً عَلَى الجِنَازَةِ خَلْفَ الْإِمَامِ.»

''یعنی جس نے امام کی اقتداء میں دو یا تین صفیں بنائیں۔''

پھر قصہ النجاشی سے استدلال کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا امام بخاری بھی نماز جنازہ میں صفوں کے طاق ہونے کے قائل نہیں۔ جب کہ دیگر بعض اہل علم نے اس سے استحباب ثابت کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: ''نیل الاوطار'' وغیرہ، لیکن راجح مسلک پہلا ہے۔

کیا جنازہ کی صفوں کو طاق بنانا ضروری ہے؟

سوال : حضرت حافظ صاحب۔السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! عرض ہے کہ جنازہ کی صفوں کے متعلق یہ تأثر غالب ہے کہ صفیں پانچ سات یا نو ہوں بلکہ یہ تاثر بھی پایا جاتا ہے کہ یہ تحدید ہی سنتِ نبوی ﷺ ہے۔ حالانکہ سنن وغیرہ کی مالک بن ہبیرہ والی روایت سے صرف تین صفوں کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ بلکہ ائمہ کرام کی خاموشی سے اہل حدیث اور غیر اہل حدیث میں سات نو وغیرہ کی تعداد مستقل مسئلہ بن گیا ہے۔آپ سے درخواست ہے کہ اس پر تفصیلی روشنی ڈالیں۔

(سائل) (۳۱ مارچ ۲۰۰۰ء)

جواب : نمازِ جنازہ میں طاق صفیں بنانے والی مالک بن ہبیرہ کی روایت میں راوی محمد بن اسحاق ''مدلس'' ہے۔اس حدیث کو اس نے عنعنہ کے ساتھ بیان کیا ہے۔اور مدلس راوی کی عنعنہ کے ساتھ روایت ناقابلِ حجت ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ کوئی شے ایسی مل جائے جس سے اس کی صحت کی تائید ہوتی ہو۔اور وہ یہاں ناپید ہے۔

یہ روایت ''سنن ابی داوٗد'' کے «بَابُ فِي الصَّفِّ عَلَى الْجَنَازَةِ» کے تحت بیان ہوئی ہے اور امام ترمذی نے «بَابُ كَيْفَ الصَّلٰوة عَلَى الْمَيِّتِ...... الخ» کے تحت بیان کی ہے اور علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو ضعیف ،ابن ماجہ میں ذکر کیا ہے۔ ❶

علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، محمد بن اسحاق جب تحدیث کی صراحت کردے تو وہ ''حسن الحدیث'' ہے لیکن یہاں اس نے عنعن سے بیان کی ہے۔

«فَلَا أَدْرِيْ وَجْهُ تَحْسِيْنهم لِلْحَدِيْثِ فَكَيْفَ التَّصْحِيْح!؟» ❷

''میں نہیں جانتا جن لوگوں نے اسے حسن قرار دیا ہے، اس کی وجہ کیا ہے چہ جائیکہ اس کو صحیح کہا جائے۔''

بہرصورت یہ روایت کمزور اور ناقابلِ عمل ہے۔ جنازے کی صفوں کو اہتمام سے طاق بنانا ضروری نہیں۔ طاق اور جفت ہر ممکنہ صورت کا جواز ہے۔

نمازِ جنازہ میں ثناء پڑھنی چاہیے یا نہیں؟

سوال : نمازِ جنازہ میں ثناء پڑھنی چاہیے یا نہیں؟

جواب : نمازِ جنازہ میں ثناء پڑھنی ثابت نہیں۔ (ملاحظہ ہو: احکام الجنائز علامہ البانی رحمہ اللہ)

سوال : آدھی نمازِ جنازہ سری اور آدھی جہری پڑھنے کی وضاحت؟

❶ سنن أبي داؤد، بَابُ مَا جَاءَ فِيمَنْ صَلَّى عَلَيْهِ جَمَاعَةٌ مِنَ الْمُسْلِمِينَ

❷ احكام الجنائز، ص: ۱۰۰

جواب: امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَالظَّاهِرُ اَنَّ الجَهرَ، وَالِاسرَارَ بِالدُّعَاءِ جَائِزَانِ »❶

''ظاہر یہ ہے کہ جہری اور سری دعا دونوں طرح جائز ہے۔''

نمازِ جنازہ میں سورۃ فاتحہ کا پڑھنا

سوال: (۱) نمازِ جنازہ میں سورۃ فاتحہ کا پڑھنا۔ (۲) نمازِ جنازہ میں دوسری نمازوں کی طرح سورۂ فاتحہ کے بعد کوئی اور سورت ملانا۔ (۳) اور جنازے کی دعائیں بلند آواز سے پڑھنا۔ کیا یہ تینوں باتیں قرآن وحدیث سے ثابت ہیں؟ اگر ایسا نہیں تو کیا ایسے امام کے پیچھے نمازِ جنازہ پڑھنا درست ہے؟ اور یہ جنازہ ادا ہوگیا یا اس کا اعادہ ضروری ہے؟

جواب: (۱) نمازِ جنازہ میں فاتحہ پڑھنی مسنون ہے۔ حدیث میں ہے: « وَاِذَا صَلّٰی عَلَیهِ کَبَّرَ، ثُمَّ قَرَأَ الفَاتِحَة » یعنی جب آپ میت پر نماز پڑھتے تو تکبیر کہتے پھر فاتحہ پڑھتے۔❷

اس کی سند صحیح ہے۔ پھر صحیح حدیث کا عموم بھی ہے « لَا صَلٰوةَ لِمَن لَّم یَقرَأ بِفَاتِحَةِ الکِتَاب »❸ یعنی ''جس نے نماز میں فاتحہ نہ پڑھی، اس کی کوئی نماز نہیں۔'' یہ بھی اس کی مشروعیت پر دالّ ہے۔ کیونکہ شریعت نے جنازہ کا نام بھی نماز ہی رکھا ہے اور کسی بھی نماز کا وجود بلا فاتحہ نہیں۔ اسی طرح طلحہ بن عبداللہ بن عوف کا بیان ہے، کہ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اقتداء میں ایک جنازہ پڑھا، تو انھوں نے ''سورۃ فاتحہ'' پڑھی اور فرمایا: کہ تم کو معلوم ہونا چاہیے یہ سنت طریقہ ہے۔❹

(۲) سورہ فاتحہ کے بعد جنازہ میں سورت ملانے کا جواز ہے۔ چنانچہ زید بن طلحہ سے مروی ہے، کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سنا: « قَرَأَ عَلٰی جَنَازَةٍ فَاتِحَةَ الکِتَابِ وَ سُورَةً وَ جَهَرَ بِالقِرَاءَةِ »❺

یعنی ''انھوں نے جنازہ میں فاتحہ اور ایک سورت پڑھی اور قرأت جہری کی۔''

اسی طرح طلحہ بن عبداللہ کے طریق سے ہے، کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پیچھے نمازِ جنازہ پڑھی:

---

❶ نيل الأوطار: ٤/ ٧٠

❷ اخرجه الطيالسى: ١/ ١٦٣، ابن ابى شيبه: ٣/ ٢١٢، ابوداؤد: ٣١٩٤، سنن الترمذى، بَابُ مَا جَاء فِى القِرَاءَةِ عَلَى الجَنَازَةِ بِفَاتِحَةِ الكِتَابِ، رقم: ١٠٢٧، سنن ابن ماجه، بَابُ مَا جَاء فِى القِرَاءَةِ عَلَى الجَنَازَةِ، رقم: ١٤٩٥

❸ صحيح البخارى، بَابُ وُجُوبِ القِرَاءَةِ لِلإِمَامِ وَالمَأمُومِ ...... الخ، رقم: ٧٥٦

❹ صحيح البخارى، الجنائز، بَابُ قِرَاءَةِ فَاتِحَةِ الكِتَابِ عَلَى الجَنَازَةِ، رقم: ١٣٣٥

❺ المنتقى لابن الجارود، كِتَابُ الجَنَائِزِ، رقم: ٥٣٦، مصنف ابن ابى شيبة، مَن كَانَ يَقرَأُ عَلَى الجِنَازَةِ بِفَاتِحَةِ الكِتَابِ، رقم: ١١٤٠٠

« فَقَرَأَ بِفَاتِحَةِ الكِتَابِ وَ سُورَةً، فَجَهَرَ حَتّٰى سَمِعنَا »[1]
یعنی ''ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جنازہ میں سورۃ فاتحہ اور ایک سورت پڑھی۔ پس اسے جہری پڑھا، حتی کہ ہم نے سنا۔''

اور صاحب ''عون المعبود'' فرماتے ہیں:
« وَهٰذِهِ الأَحَادِيثُ فِيهَا دَلَالَةٌ وَاضِحَةٌ عَلٰى مَشرُوعِيَّةِ فَاتِحَةِ الكِتَابِ فِي صَلَاةِ الجَنَازَةِ. وَ فِيهَا دَلَالَةٌ أَيضًا عَلٰى جَوَازِ قِرَاءَةِ سُورَةٍ مَعَ الفَاتِحَةِ فِي صَلَاةِ الجَنَازَةِ.»[2]
یعنی ان احادیث میں واضح طور پر دلالت ہے کہ نمازِ جنازہ میں فاتحہ پڑھنی مشروع ہے اور ان میں یہ بھی ہے کہ نمازِ جنازہ میں فاتحہ کے ساتھ سورت ملانی بھی جائز ہے۔

نیز امام ابن حزم ''المحلّٰی'' میں فرماتے ہیں:
« صَلّٰى المِسوَرُ بنُ مَخرَمَةَ، فَقَرَأَ فِي التَّكبِيرَةِ الأُولٰى بِفَاتِحَةِ الكِتَابِ، وَسُورَةً قَصِيرَةً، وَ رَفَعَ بِهِمَا صَوتَهُ.»
یعنی مسور بن مخرمہ نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ پہلی تکبیر کے بعد میں فاتحہ اور چھوٹی سی سورت پڑھی، اور ان دونوں کو بلند آواز سے پڑھا۔

(۳) پہلے گزر چکا ہے کہ فاتحہ اور سورت کو باآواز بلند پڑھا گیا اور جہاں تک دیگر دعاؤں کا تعلق ہے۔ سو اس بارے میں حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ کا بیان ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جنازہ پڑھایا:
« فَحَفِظتُ مِن دُعَائِهِ، وَ هُوَ يَقُولُ: اَللّٰهُمَّ اغفِر لَهُ وَ ارحَمهُ......» الخ[3]
''پس میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے یاد کیا، کہ آپ فرما رہے تھے: «اَللّٰهُمَّ اغفِر لَهُ وَارحَمهُ ......الخ »

ظاہر ہے کوئی شے دوسرے سے تب ہی یاد ہو سکتی ہے جب اسے بلند آواز سے پڑھا جائے اور لفظ ''يَقُولُ'' بھی اس بات کا متقاضی ہے، کیونکہ اس کا اطلاقِ عام بلا قرینہ صارفہ بالجہر پر ہوتا ہے (اس کے عام حکم سے پھیرنے والی کوئی دلیل موجود نہ ہو، تو پھر بلند آواز سے پڑھنا مراد ہوتا ہے)، نیز دیگر بعض روایات میں لفظ ''فَهِمتُ'' اس کے منافی نہیں ہے، کیونکہ فہم کی بناء حفظ پر ہے۔

''اَلمُنتَقٰى'' میں حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت میں لفظ «سَمِعتُ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم» ہے جب کہ واثلہ بن

---

[1] المنتقٰی لابن الجارود، كِتَابُ الجَنَائِزِ، رقم:۵۳۷

[2] عون المعبود: ۳/ ۱۹۱

[3] صحیح مسلم، بَابُ الدُّعَاءِ لِلْمَيِّتِ فِي الصَّلَاةِ، رقم:۹۶۳

الاسقع رضی اللہ عنہ کی روایت میں "فَسَمِعْتُهُ" کے الفاظ ہیں۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ اس پر رقمطراز ہیں:

« جَمِيعُ ذٰلِكَ يَدُلُّ عَلَى أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ جَهَرَ بِالدُّعَاءِ » ❶

''یہ تمام الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں، کہ نبی ﷺ نے دعا کو بلند آواز سے پڑھا ہے۔''

اور امام بخاری رحمہ اللہ نے بایں الفاظ تبویب قائم کی ہے:

«بَابُ قِرَاءَةِ فَاتِحَةِ الْكِتَابِ عَلَى الْجَنَازَةِ. وَ قَالَ الْحَسَنُ: يَقْرَأُ عَلَى الطِّفْلِ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ»

''جنازے پر سورہ فاتحہ پڑھنے کا بیان۔ حضرت حسن نے کہا کہ آپ ﷺ بچے کی نمازِ جنازہ میں سورۂ فاتحہ پڑھتے تھے۔''

یاد رہے اس بحث کا تعلق صرف جوازِ جہر سے ہے لا غیر (نہ کہ کوئی اور) مذکورہ تینوں مسئلوں میں بالاختصار شریعت کی روشنی میں وضاحت ہو چکی، جو راہنمائی کے لیے کافی ہے۔ تاہم امام ایسا شخص مقرر کرنا چاہیے جس میں اتباعِ سنت کا جذبہ موجزن ہو۔ واللہ ولی التوفیق۔

نمازِ جنازہ میں سورۃ فاتحہ پڑھنا

سوال : نمازِ جنازہ میں سورۃ فاتحہ پڑھنا۔

① ...... ''صحیح بخاری'' میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ » ❷

''جس نے نماز میں فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز نہیں۔''

وجہِ استدلال یہ ہے کہ حدیث ہذا عموم کے اعتبار سے نمازِ جنازہ کو بھی شامل ہے، اس لیے کہ نبی ﷺ نے اس کا نام بھی نماز رکھا ہے۔ چنانچہ فرمایا: «مَنْ صَلّٰى عَلَى الْجَنَازَةِ » نیز فرمایا: « صَلُّوا عَلٰى صَاحِبِكُمْ» اور دوسری روایت میں ہے: « صَلُّوا عَلَى النَّجَاشِي » امام بخاری رحمہ اللہ اپنی 'صحیح' کے (ترجمۃ الباب) میں رقمطراز ہیں: « سَمَّاهَا صَلَاةً لَيْسَ فِيهَا رُكُوعٌ، وَ لَا سُجُودٌ»

یعنی نمازِ جنازہ میں رکوع اور سجود نہ ہونے کے باوجود اللہ کے رسول ﷺ نے اس کا نام نماز رکھا ہے۔

② ...... ''صحیح بخاری'' میں طلحہ بن عبداللہ بن عوف رضی اللہ عنہ کا بیان ہے:

« صَلَّيْتُ خَلْفَ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا عَلٰى جَنَازَةٍ، فَقَرَأَ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ.

---

❶ نیل الأوطار: ٤/ ٦٩

❷ صحیح البخاری، باب وُجُوبِ الْقِرَائَةِ لِلامَامِ وَالْمَامُومِ فِي الصَّلٰوةِ كُلِّهَا ...... الخ، رقم: ٧٥٦، صحیح مسلم: ٣٩٤

قَالَ: لِتَعلَمُوا أَنَّهَا سُنَّةٌ » ❶

''میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں نمازِ جنازہ پڑھی تو انھوں نے ''سورہ فاتحہ'' کی تلاوت کی۔فرمایا، یہ اس لیے کیا ہے تاکہ تمھیں اس کے سنت ہونے کا علم ہوجائے۔''

صحابہ کا کسی فعل کو «مِنَ السُّنَّة» کہنا اکثر علماء کے نزدیک مرفوع حدیث کے حکم میں ہے۔امام شافعی رحمہ اللہ ''کتاب الام'' میں لکھتے ہیں کہ آنحضرت کے صحابہ رضی اللہ عنہم جب کسی فعل کو سنت کہتے ہیں، تو اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مراد ہوتی ہے۔''فتح الباری'' (۲۰۴/۳) میں ہے: « وَقَد أَجمَعُوا عَلٰی اَنَّ قَولَ الصَّحَابِی سُنَّةٌ »

حدیث مسند ہے علمائے حنفیہ نے بھی متعدد فروع اسی اصل پر قائم کی ہیں مثلاً: ہدایہ میں ہے''اور جب میت کی چارپائی اٹھائیں تو اس کے چارپائے پکڑ کر اٹھائیں۔اس کے ساتھ سنت وارد ہے۔امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سنت طریقہ یہ ہے کہ چارپائی کو دو شخص اٹھائیں۔اگلا شخص اپنی گردن پر رکھے اور پچھلا اپنے سینہ پر۔شارح ہدایہ ابن الہمام رحمہ اللہ امام شافعی رحمہ اللہ پر رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں: امام شافعی کا یہ قول سنت کے خلاف ہے۔حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« مَنِ اتَّبَعَ الجَنَازَةَ فَليَأخُذ بِجَوَانِبِ السَّرِيرِ كُلِّهَا فَاِنَّهُ مِنَ السُّنَّةِ » ❷

''جو شخص جنازے کے ساتھ جائے وہ باری باری اس کے سب جوانب سے پکڑ کر اٹھائے۔بے شک یہ مسنون ہے۔'' لہٰذا اس سنت پر عمل ضروری ہے۔

③.....ابوامامہ بن سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نمازِ جنازہ میں سنت طریقہ یہ ہے، کہ امام پہلے تکبیر کہے، پھر فاتحہ پڑھے۔حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "إسنادہ صحیح" اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ (۲۰۴/۳) نیز صحیح بخاری کے (ترجمۃ الباب) میں حضرت حسن سے منقول ہے: « يَقرَأُ عَلَی الطِّفلِ بِفَاتِحَةِ الكِتَابِ» ❸ بچے کی نمازِ جنازہ میں سورۃ فاتحہ پڑھی جائے۔

ابن المنذر نے حضرت عبداللہ بن مسعود، حسن بن علی، ابن زبیر اور مسور بن مخرمہ سے نمازِ جنازہ میں فاتحہ کی مشروعیت نقل کی ہے۔نیز امام شافعی، امام احمد اور دیگر اہلِ علم نمازِ جنازہ میں فاتحہ اور ایک دیگر سورت کی قرأت کی مشروعیت کے قائل ہیں۔حضرت مجاہد کہتے ہیں:

---

❶ صحيح البخاری، بَابُ قِرَاءَةِ فَاتِحَةِ الكِتَابِ عَلَی الجَنَازَةِ، رقم:١٣٣٥

❷ سنن ابن ماجه، بَابُ مَا جَاءَ فِي شُهُودِ الْجَنَائِزِ، رقم:١٤٧٨

❸ صحيح البخاری، بَابُ قِرَاءَةِ فَاتِحَةِ الكِتَابِ عَلَی الجَنَازَةِ

« سَأَلْتُ ثَمَانِيَةَ عَشَرَ صَحَابِيًّا، فَقَالُوا : يَقرَأُ » ❶

''میں نے اس کے بارے میں اٹھارہ صحابہ کرام سے دریافت کیا تو انھوں نے کہا: ''فاتحہ'' پڑھی جائے۔''

دوسری طرف علمائے حنفیہ ہیں، جو نمازِ جنازہ میں قرأت کے قائل نہیں ہیں۔ چنانچہ امام محمد ''الموطأ'' میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا اثر نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

« وَ بِهٰذَا نَاخُذُ لَا قِرَاءَةَ عَلَى الْجَنَازَةِ. وَ هُوَ قَولُ أَبِي حَنِيفَةِ » ❷

نیز صاحبِ ''ہدایہ'' صفت نمازِ جنازہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

« وَالْبَدَاءَةُ بِالثَّنَاءِ، ثُمَّ بِالصَّلٰوةِ لِأَنَّهَا سُنَّةُ الدُّعَاءِ .»

یعنی پہلے ثناء اور پھر درود شریف پڑھے۔ کیونکہ دعا کا یہ مسنون طریقہ ہے۔

امام محمد رحمہ اللہ کے قول کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا عبدالحی حاشیہ مؤطا پر لکھتے ہیں:

''ہوسکتا ہے کہ اس سے کراہت کی طرف اشارہ ہو جیسا کہ متأخرین میں سے اکثر حنفیہ نے تصریح کی ہے......اور لکھا ہے کہ اگر دعا کے طور پر ''سورۃ فاتحہ'' پڑھ لی جائے تو کچھ حرج نہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ امام محمد کی مراد لزوم کی نفی ہو، اور وہ جواز قرأت کے قائل ہوں۔ چنانچہ ہمارے متأخرین علماء میں سے حسن شرنبلالی نے اس کو اختیار کیا ہے اور انھوں نے اپنے رسالہ ''النظم المستطاب'' میں اس کی خوب وضاحت کی ہے اور جو علماء کراہت کے قائل ہیں، ان کی تردید کی ہے، اور لکھا ہے:

« وَ هٰذَا هُوَ الْأَولٰى لِثُبُوتِ ذٰلِكَ عَن رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ .»

''اور یہی بات اولیٰ ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے۔''

مولانا عبدالحی نے ''التعلیق الممجد'' میں بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ قاضی ثناء اللہ حنفی مجددی بھی اپنے ''وصیت نامہ'' میں اس بات کے قائل ہیں۔ ❸

امام طحاوی رحمہ اللہ وغیرہ نے بھی اپنے مسلک کی حمایت کے لیے احادیث قرأت کی تأویل کو ضروری خیال کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

« مَن قَرَأَهَا مِنَ الصَّحَابَةِ يَحتَمِلُ أَن يَكُونَ عَلٰى وَجهِ الدُّعَاءِ، لَا التِّلَاوَةِ .»

''ممکن ہے جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جنازے میں سورۂ فاتحہ پڑھی انھوں نے تلاوت وقرأت کی بجائے بطورِ

❶ رواه الاثرم حاشيه موطأ امام محمد

❷ مؤطا امام مالك، بَابُ: الصَّلاةِ عَلَى الْمَيِّتِ وَالدُّعَاءِ رقم:٣١١

❸ فتاویٰ مفيد الاحناف، ص:٢

دعا پڑھی ہو۔''

حالانکہ اس تأویل کی تردید کے لیے یہی کافی ہے، کہ احادیث میں تو ''فاتحہ الکتاب'' کی قرأت کے ساتھ ایک سورت کا بھی ذکر ہے، جس میں علی وجہ الدعا والی تأویل ممکن نہیں، اور پھر یہ محض دعویٰ ہے، جس پر کوئی دلیل نہیں۔ چنانچہ امام ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَهٰذَا بَاطِلٌ لِأَنَّهُم ثَبَتَ عَنهُم الامرُ بِالقِرَائَةِ وَ اِنَّهَا سُنَّتُهَا فَقَولُ مَن قَالَ : لَعَلَّهُم قَرَاءُ وهَا دُعَاءًا كَذِبٌ بُحتٌ .»

یعنی ''بطورِ دعا والا نظریہ باطل ہے۔ کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے قرأت کا حکم ثابت ہے اور یہ نمازِ جنازہ میں مسنون ہے۔ پس جن لوگوں نے کہا ہے، کہ ممکن ہے انھوں نے فاتحہ کو بطورِ دعا پڑھا ہو سفید جھوٹ ہے۔''

ان اصحابِ قیاس پر تعجب ہے کہ ایک طرف تو نمازِ جنازہ کو نماز کہتے ہیں، اس میں تکبیر، استقبالِ قبلہ، امامتِ رجال، طہارت، سلام واجب قرار دیتے ہیں، اور پھر قرأت کو ساقط کرتے ہیں۔

حالانکہ حدیث «لَا صَلَاةَ اِلَّا بِفَاتِحَةِ الكِتَابِ »[1] اپنے عموم کے اعتبار سے نمازِ جنازہ کو بھی شامل ہے۔ لہٰذا سابقہ دلائل کے بعد ان بے اصل تأویلات کی قطعاً کوئی اہمیت نہیں۔ اب جنازے میں سورۃ الفاتحہ کا پڑھنا جائز کی بجائے واجب ماننا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

پھر یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ حنفیہ کے نزدیک سُبحَانَكَ اللّٰهُمَّ پڑھنا مسنون ہے۔ حالانکہ جنازے میں اس کا اصلاً ثبوت ہی نہیں ہے (جیسا کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ وغیرہ نے تصریح کی ہے) اور قرأت کی نفی کرتے ہیں جو کہ احادیث وآثار سے ثابت ہے۔ (کتاب احکام جنائز)

لہٰذا ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت کے صحیح طُرق سے صرفِ نظر کر کے محض ضعیف طریق پر اعتماد کر بیٹھنا سراسر بے انصافی اور مسلک پروری ہے۔ امید ہے راہِ حق کے متلاشی کے لیے یہ چند دلائل کافی ہوں گے۔ (والتوفیق بید اللہ)

نمازِ جنازہ میں سورہ فاتحہ کی قراءت پر اعتراضات کا جائزہ

ماہنامہ ''محدث'' اور ہفت روزہ ''الاعتصام'' مؤرخہ ۱۵؍ دسمبر ۲۰۰۰ء میں جنازہ کے بعد مروجہ دعا کے سلسلہ میں حنفی، بریلوی فتویٰ کے تعاقب میں میرا ایک فتویٰ شائع ہوا۔ اس میں ضمناً جنازہ میں سورۂ فاتحہ کی قراءت کا مسئلہ بھی زیرِ بحث آیا۔ اس پر اسلام آباد سے محترم ابوبکر صدیق صاحب بایں الفاظ معترض ہیں:

[1] صحیح البخاری، باب وُجُوبِ القِرَائَةِ لِلاِمَامِ وَالمَامُومِ فِي الصَّلٰوةِ كُلِّهَا ...... الخ، رقم: ۷۵۶، صحیح مسلم: ۳۹۴

''بخاری میں اس سلسلہ کی کوئی مسند روایت کہاں ہے؟ اس بات کے ضعف کا آپ کو اندازہ تھا، اس لئے گول مول الفاظ استعمال کر کے قارئین کو یہ تاثر دیا گیا گویا بخاری میں کوئی مرفوع حدیث اس سلسلہ میں موجود ہے۔ اگر اس باب میں مرفوع حدیث ہوتی تو بحوالہ ابن حجر رحمہ اللہ حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابہ قراءتِ فاتحہ کیوں نہ کرتے؟''

قارئین کرام! اس وقت بنیادی طور پر اس بات کا جائزہ لینا مقصود ہے کہ کیا نمازِ جنازہ میں قراءۃ فاتحہ ثابت ہے یا نہیں؟

(۱) پہلے صحیح بخاری میں باب قراءۃ فاتحۃ الکتاب علی الجنازۃ کے تحت مشارٌ الیہ حدیث ملاحظہ فرمائیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ

''انہوں نے ایک جنازہ پر نماز پڑھی، جس میں سورۃ فاتحہ پڑھی اور فرمایا (میں نے فاتحہ اس لئے پڑھی ہے) تاکہ تم جان لو کہ جنازہ میں سورۂ فاتحہ پڑھنا سنت ہے''❶ ...... اور حاکم کی روایت میں ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ایک جنازہ میں الحمد جہر سے پڑھی، پھر فرمایا: میں نے جہر سے اس لئے پڑھا ہے تاکہ تم لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ جنازہ میں الحمد پڑھنا سنت ہے۔''❷

(۲) اور حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نمازِ جنازہ میں سنت یہ ہے کہ نمازی سورۂ فاتحہ پڑھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے، پھر میت کے واسطے اِخلاص کے ساتھ دعا کرے اور قراءت صرف ایک ہی مرتبہ کرے، پھر سلام پھیرے۔ ملاحظہ ہو کتاب فضل الصلاۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور المنتقی ابن جارود۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس حدیث کے راوی صحیحین کے رواۃ ہیں: کذا فی النیل۔

(۳) امام عبدالرزاق اور نسائی رحمہما اللہ نے حضرت ابو اُمامہ رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے کہ ''نمازِ جنازہ میں سنت طریقہ یہ ہے کہ نمازی اللہ اکبر کہے پھر سورۂ فاتحہ پڑھے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے۔ پھر میت کے لئے اِخلاص کے ساتھ دعا کرے اور قراءت صرف پہلی تکبیر میں کرے''۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ إسنادہ صحیح ''اس کی سند صحیح ہے''۔❸

(۴) سنن ترمذی میں مروی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک جنازہ پڑھایا تو فاتحہ پڑھی۔ طلحہ بن عبداللہ بن عوف کہتے ہیں کہ میں نے اس کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا: "إِنَّـهُ مِنَ السُّنَّةِ أَوْ مِنْ تَمَامِ السُّنَّةِ."

❶ صحيح البخاري، الجنائز، بَابُ قِرَاءَةِ فَاتِحَةِ الكِتَابِ عَلَى الجَنَازَةِ، رقم:۱۳۳۵

❷ مستدرك على الصحيحين للحاكم، كِتَابُ الْجَنَائِزِ، رقم:۱۳۲۳

❸ مصنف عبدالرزاق، بَابُ الْقِرَاءَةِ وَالدُّعَاءِ فِي الصَّلَاةِ عَلَى الْمَيِّتِ، رقم:٦٤٢٨، سنن النسائي، الدُّعَاءُ، رقم:۱۹۸۹

''کہ نمازِ جنازہ میں فاتحہ سنت ہے، یا اس سے سنت کی تکمیل ہوتی ہے۔'' ❶

پھر یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ جنازہ کو نماز سے موسوم کیا گیا ہے جس کی دلیل نبی اکرم ﷺ کے یہ فرامین ہیں: « مَنْ صَلَّى عَلَى الْجَنَازَةِ ...... ، صَلُّوْا عَلٰى صَاحِبِكُمْ ، صَلُّوا عَلَى النَّجَاشِيِّ »

امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''رسول اللہ ﷺ نے اسے نماز کہا ہے حالانکہ اس میں رکوع ہے نہ سجود، اس میں کلام نہ کرے اور اس میں تکبیر اور تسلیم ہے۔''

پھر یاد رہے کہ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی صحیح حدیث لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ کا عموم نمازِ جنازہ کو بھی شامل ہے۔

اس بحث میں جو اہم شے قابل التفات ہے، وہ یہ ہے کہ صحابی کا کسی فعل یا عمل کو سنت قرار دینے سے کیا وہ واقعی سنتِ نبوی قرار پائے گا؟ اس سے متعلق امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَ اَصْحَابُ النَّبِيِّ لَا يَقُوْلُوْنَ بِالسُّنَّةِ وَالْحَقِّ إِلَّا لِسُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ ، إِنْ شَاءَ اللّٰهُ.»

''نبی اکرم ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سنت اور حق کا اطلاق صرف سنت رسول ﷺ کے لیے ہی کرتے تھے''

اور امام نووی رحمہ اللہ نے المجموع (۲۲۴/۵) میں اسی کو صحیح مذہب قرار دیا اور کہا ہے کہ اصول میں ہمارے اصحاب میں سے جمہور علماء اور دیگر اُصولی اور محدثین اسی بات کے قائل ہیں۔

محقق علامہ ابن ہمام رحمہ اللہ حنفی نے التحریر میں اسی بات کو قطعی قرار دیا ہے۔ اس کے شارح ابن امیر حاج کہتے ہیں: ہمارے متقدمین اصحاب کا یہی قول ہے۔ صاحبِ میزان، رافع اور جمہور محدثین نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ (۲۲۴/۲)

پھر تعجب کی بات یہ ہے کہ اثباتِ سنت کے باوجود حنفیہ کا اس صحیح حدیث پر عمل نہیں حالانکہ ان کے اصول کے مطابق ہے۔ موطا امام محمد میں ہے: لَا قِرَاءَةَ عَلَى الْجَنَازَةِ وَهُوَ قَوْلُ اَبِیْ حَنِيْفَةَ جنازہ میں عدمِ قراءت ہے اور امام ابوحنیفہ کا یہی قول ہے۔ متاخرین حنفیہ نے جب بنظر غائر اسی کو صحیح پایا اور صحیح حدیث کے مقابلہ میں اپنے مسلک کو مرجوح دیکھا تو اس کی تاویل انہوں نے اس طرح کی کہ فاتحہ کی قراءت کا جواز تو ہے بشرطیکہ نمازی دعا اور ثنا کی نیت کرے۔ یہ محض اس زعم کی بنا پر ہے کہ حدیث اور قولِ امام میں تطبیق ہو سکے۔ گویا کہ امام صاحب کا قول دوسری ایک حدیث ہے حالانکہ یہ شرط (تاویل) فی نفسہ باطل ہے۔ جب ایک حدیث ثابت ہے تو پھر عمل اسی پر ہونا چاہیے۔

دوسری عجیب بات یہ ہے کہ حنفیہ کے ہاں تکبیر اولیٰ کے بعد نمازِ جنازہ میں ثنا پڑھنا جنازہ کی سنتوں میں شمار ہوتا ہے حالانکہ سنت میں اس کی کوئی اصل نہیں۔ ملاحظہ فرمائیے کہ جو شے ثابت ہے، احناف اس کا انکار کرتے ہیں اور جو ثابت

❶ سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي الْقِرَاءَةِ عَلَى الْجَنَازَةِ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ، رقم:۱۰۲۷، مصنف عبدالرزاق، بَابُ الْقِرَاءَةِ وَالدُّعَاءِ فِي الصَّلَاةِ عَلَى الْمَيِّتِ، رقم:٦٤٢٧

نہیں، اس کے اثبات کی ناکام سعی کرتے ہیں تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ! علامہ ابن ہمام فتح القدیر (۱/۴۵۹) میں لکھتے ہیں کہ

''جنازہ میں فاتحہ نہ پڑھی جائے اِلا یہ کہ ثنا کی نیت ہو، قراءت رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں۔''

عجب تضاد ہے، خود ہی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ صحابی کا قولِ ''سنت'' مسند مرفوع کے حکم میں ہے جس کا نبی ﷺ تک اتصال ہوتا ہے جیسا کہ ابھی گزرا ہے پھر خود ہی اس قاعدہ کو مقامِ بحث میں ترک کردیا ہے۔

نیز ہدایہ میں ہے کہ میت کی چارپائی اُٹھاتے ہوئے چاروں اَطراف سے پکڑا جائے۔ سنت میں اسی طرح آیا ہے۔ علامہ ابن ہمام نے اس پر دلیل یہ قائم کی ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جو جنازہ کے پیچھے لگا، اسے چاہیے کہ سب طرفوں سے پکڑے: فَاِنَّهٗ مِنَ السُّنَّةِ ، فَوَجَبَ الْحُكْمِ بِاَنَّ هٰذَا هُوَ السُّنَّةُ ''سنت طریقہ یہی ہے۔ ❶ یعنی اس طریقہ کار کو اختیار کرنا ہی سنت ہے۔

غور فرمایئے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے قول من السنة کو یہاں مرفوع کے حکم میں قرار دیا ہے جبکہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول اِنَّهَا سُنَّةٌ سے عدمِ اعتناء کا مظاہرہ کیا ہے۔ اسے مذہبی تعصب کے علاوہ اور کیا نام دیا جاسکتا ہے؟ جبکہ اثر ابن مسعود رضی اللہ عنہ منقطع ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کا اثر صحیح بخاری وغیرہ میں۔

محترم! اب آپ خود ہی فیصلہ کیجئے کہ اتنے بڑے محقق کی بات پر تعجب کا اظہار نہ کیا جائے تو اور کیا کیا جائے؟ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ قلم سے بعض سخت جملے صادر ہوئے۔ عَافَانِی اللّٰهُ۔ لیکن بنظر انصاف حقائق تک رسائی حاصل کرنا سب کا فرض ہے۔ حنفی علماء میں علامہ عبدالحیٔ لکھنوی رحمہ اللہ کافی حد تک انصاف پسند گزرے ہیں۔ ''عمدة الرعایہ'' (۱/۲۵۳) میں انہوں نے جنازہ میں فاتحہ پڑھنے کے مسلک کو دلیل کے اعتبار سے قوی قرار دیا ہے اور ''موطأ امام محمد'' کے حاشیہ میں رقم طراز ہیں کہ:

''فاتحہ پڑھنا ہی اولیٰ ہے کیونکہ یہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے۔''

بلکہ انہوں نے یہاں تک کہا ہے کہ متاخرین علماءِ احناف نے جو جنازہ میں فاتحہ پڑھنے کو مکروہ لکھا ہے تو علامہ حسن الشرنبلالی نے اس کی تردید میں ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جس کا نام ہے:

« اَلنَّظْمُ الْمُسْتَطَابُ بِحُكْمِ الْقِرَاءَةِ فِی صَلَاةِ الْجَنَازَةِ بِاُمِّ الْكِتَابِ .» ❷

اور جن علماءِ احناف نے فاتحہ پڑھنے کی تاویل یوں کی ہے کہ بطورِ ثنا فاتحہ پڑھی جائے، ان کی تردید میں مولانا

---

❶ سنن ابن ماجه، بَابُ مَا جَاءَ فِی شُهُوْدِ الْجَنَائِزِ، رقم:١٤٧٨، السنن الكبرىٰ للبيهقی، بَابُ مَنْ حَمَلَ الْجِنَازَةَ فَدَارَ عَلَى جَوَانِبِهَا الْأَرْبَعَةِ، رقم:٦٨٣٤

❷ التعليق الممجد: ص:١٦٥

لکھنوی فرماتے ہیں کہ اگر اس قسم کی تاویلات کا دروازہ کھول دیا جائے تو بہت سی مسنون قراءات بھی ختم ہو کر رہ جائیں گی۔ پھر یہ دعویٰ فی نفسہ باطل ہے کیونکہ نیت کا تعلق تو باطن سے ہے جس پر نیت کرنے والے کے بتلائے بغیر مطلع ہونا ممکن نہیں۔ ❶

دوسری طرف حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہما بلاشبہ جلیل القدر صحابہ ہیں۔ لیکن مسند روایات کے مقابلہ میں ان کے اَقوال کو اختیار کرنا دن کی روشنی میں چراغ جلانے کے مترادف ہے۔ ویسے بھی صحابہ کرام کئی طرح سے عنداللہ معذور ہیں لیکن واضح دلائل ثابت ہونے کے بعد ہمارے لئے کوئی عذر باقی نہیں رہ جاتا۔

تعجب خیز بات یہ ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ جن پر فقہ حنفی کا انحصار ہے، وہ بھی جنازہ میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کے قائل ہیں۔ ان کے قول پر تو عمل نہیں کرتے دوسری طرف احناف حضرت ابو ہریرہ کو تو غیر فقیہ قرار دیتے ہیں (جیسا کہ نور الانوار میں ہے) اس کے باوجود جنازہ میں فاتحہ پڑھنے کے سلسلہ میں ان کی بات کو تسلیم کرتے ہوئے ان کا ''غیر فقیہ'' ہونا انہیں نظر نہیں آتا۔ احناف کے ہاں ان دو صحابہ کی اگر اتنی ہی عظمت ہوتی جتنی ظاہر کر رہے ہیں تو وہ انکی روایات کو کبھی ردّ نہ کرتے حالانکہ واقعات اس کے خلاف ہیں۔ حدیث المصراۃ، حدیث التسبیع اور احادیث رفع الیدین وغیرہ اس امر کے واضح شواہد ہیں۔

احناف کی نماز جنازہ کو ''جھٹکا'' سے تعبیر کرنا اگرچہ کسی حد تک سخت جملہ ہے لیکن امر واقعہ یہی ہے کہ نمازِ جنازہ میں یہ طرزِ عمل جہاں خلافِ سنت ہے وہاں میت سے عدم اعتنائی کا مظہر بھی ہے۔

اب آخری بات یہ ہے کہ میرا تعاقب چونکہ ایک خاص مکتبِ فکر کے حاملین سے متعلق تھا۔ ظاہر ہے اس کے حقیقی مخاطب وہ لوگ ہیں جو اس بدعت کے موجد ہیں نہ کہ جملہ اَحناف، اگرچہ فقہی مسلک میں دیوبندی اور بریلوی سب متفق ہیں۔ مجھے قوی اُمید ہے کہ یہ چند گزارشات آپ کی تشفی کے لئے کافی ہوں گی۔ اللہ ربّ العزت ہم سب کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین!

نماز جنازہ میں دیگر دعاؤں کے علاوہ ''سورۃ فاتحہ'' پڑھنے یا نہ پڑھنے کے دلائل کا جائزہ:

① ...... ''صحیح بخاری'' میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الكِتَابِ.» ❷

''جس نے نماز میں فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز نہیں۔''

❶ غيث الغمام: ص:٣١٨

❷ صحيح البخاري، بَابُ وُجُوبِ القِرَاءَةِ لِلْإِمَامِ وَالمَأْمُومِ فِي الصَّلَوَاتِ كُلِّهَا، ...... الخ، رقم:٧٥٦

وجہ استدلال یہ ہے کہ حدیث ہذا عموم کے اعتبار سے نماز جنازہ کو بھی شامل ہے اس لیے کہ نبی ﷺ نے اس کا نام بھی نماز رکھا ہے۔ چنانچہ فرمایا: « مَنْ صَلَّى عَلَى الْجَنَازَةِ . » نیز فرمایا« صَلُّوْا عَلٰى صَاحِبِكُمْ . » اور دوسری روایت میں ہے: « صَلُّوْا عَلَى النَّجَاشِيِّ . » امام بخاری رحمہ اللہ اپنی ''صحیح'' کے ترجمۃ الباب میں رقم طراز ہیں: « سَمَّاهَا صَلَاةً لَيْسَ فِيْهَا رُكُوْعٌ وَ لَا سُجُوْدٌ . »

''نماز جنازہ میں رکوع اور سجود نہ ہونے کے باوجود اللہ کے رسول ﷺ نے اس کا نام نماز رکھا ہے۔''

②..... ''صحیح بخاری'' میں طلحہ بن عبداللہ بن عوف رضی اللہ عنہ کا بیان ہے:

« صَلَّيْتُ خَلْفَ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا عَلَى جَنَازَةٍ فَقَرَأَ بِفَاتِحَةِ الكِتَابِ قَالَ :لِتَعْلَمُوا أَنَّهَا سُنَّةٌ . » ❶

''میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں نماز جنازہ پڑھی تو انھوں نے ''سورۂ فاتحہ'' کی تلاوت کی۔ فرمایا یہ اس لیے کہ تمھیں اس کے سنت ہونے کا علم ہو جائے۔''

صحابہ کا کسی فعل کو « من السنة » کہنا اکثر علماء کے نزدیک مرفوع حدیث کے حکم میں ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ ''کتاب الام'' میں لکھتے ہیں ''آنحضرت کے صحابہ رضی اللہ عنہم جب کسی فعل کو سنت کہتے ہیں تو اس سے آپ ﷺ کی سنت مراد ہوتی ہے۔''

''فتح الباری'' (۳/۲۰۴) میں ہے:

«وَقَدْ أَجْمَعُوا عَلَى أَنَّ قَوْلَ الصَّحَابِيِّ سُنَّةٌ حَدِيثٌ مُسْنَدٌ»

علمائے حنفیہ نے بھی متعدد فروع اسی اصل پر قائم کی ہیں مثلاً: ہدایہ میں ہے ''اور جب میت کی سریر اٹھائیں تو اس کے چارپائے پکڑ کر اٹھائیں اس کے ساتھ سنت وارد ہے۔'' امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں سنت طریقہ یہ ہے کہ سریر کو دو شخص اٹھائیں۔ اگلا شخص اپنی گردن پر رکھے اور پچھلا اپنے سینہ پر۔

شارح ''ہدایہ'' ابن الہمام، امام شافعی رحمہ اللہ پر رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں: امام شافعی کا یہ قول سنت کے خلاف ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« مَنِ اتَّبَعَ الْجَنَازَةَ فَلْيَأْخُذْ بِجَوَانِبِ السَّرِيْرِ كُلِّهَا فَإِنَّهُ مِنَ السُّنَّةِ.» ❷

''جو شخص جنازے کے ساتھ جائے وہ باری باری اس کے سب جوانب سے پکڑ کر اٹھائے بے شک یہ مسنون ہے۔'' لہٰذا اس سنت پر عمل ضروری ہے۔

❶ صحيح البخارى ، بَابُ قِرَاءَةِ فَاتِحَةِ الْكِتَابِ عَلَى الْجَنَازَةِ ، رقم:١٣٣٥

❷ البناية شرح الهداية: ٣/ ٢٤١

③......ابوامامہ بن سہل بن حنیف سے مروی ہے نماز جنازہ میں سنت طریقہ یہ ہے کہ امام پہلے تکبیر کہے پھر فاتحہ پڑھے۔
حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: «إِسْنَادُهٗ صَحِيْحٌ » اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ (۲۰۴/۳)
نیز ''صحیح بخاری'' کے ترجمۃ الباب میں حضرت حسن سے منقول ہے: «يَقْرَأُ عَلَى الطِّفْلِ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ.»
''بچے کی نماز جنازہ میں ''سورۂ فاتحہ'' پڑھی جائے۔''

ابن المنذر نے حضرت عبداللہ بن مسعود، حسن بن علی، ابن زبیر اور مسور بن مخرمہ سے نماز جنازہ میں فاتحہ کی مشروعیت نقل کی ہے۔ نیز امام شافعی رحمہ اللہ، امام احمد رحمہ اللہ اور دیگر اہل علم نمازِ جنازہ میں فاتحہ اور ایک سورہ کی قراءت کی مشروعیت کے قائل ہیں۔ حضرت مجاہد رحمہ اللہ کہتے ہیں:

«سَأَلْتُ ثَمَانِيَةَ عَشَرَ صَحَابِيًا فَقَالُوْا : يَقْرَأُ .» ❶

''میں نے اس کے بارے میں اٹھارہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے دریافت کیا تو انھوں نے کہا فاتحہ پڑھی جائے۔''

دوسری طرف علمائے حنفیہ ہیں جو نماز جنازہ میں قراءت کے قائل نہیں ہیں۔ چناں چہ امام محمد ''الموطأ'' میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا اثر نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

« وَ بِهٰذَا نَأْخُذُ لَا قِرَاءَ ةَعَلَى الْجَنَازَةِ وَ هُوَ قَوْلُ أَبِيْ حَنِيْفَةَ.»

نیز صاحب ''ہدایہ'' صفت نماز جنازہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

«وَالْبِدَاءَ ة بِالثَّنَاءِ ثُمَّ بِالصَّلَاةِ لِأَنَّهَا سُنَّةُ الدُّعَاءِ.»

یعنی ''پہلے ثناء اور پھر درود شریف پڑھے۔ کیوں کہ دعاء کا یہ مسنون طریقہ ہے۔''

امام محمد رحمہ اللہ کے قول کی وضاحت کرتے ہوئے، مولانا عبدالحی ''حاشیہ موطأ'' پر لکھتے ہیں:

''ہوسکتا ہے کہ اس سے کراہت کی طرف اشارہ ہو جیسا کہ متاخرین میں سے اکثر حنفیہ نے تصریح کی ہے''
اور لکھا ہے کہ ''اگر دعاء کے طور پر ''سورۃ فاتحہ'' پڑھ لی جائے تو کچھ حرج نہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے امام محمد کی مراد لزوم کی نفی ہو اور وہ جواز قراءت کے قائل ہوں۔''

چناں چہ ہمارے متاخرین علماء میں سے حسن شرنبلالی نے اس کو اختیار کیا ہے اور انھوں نے اپنے رسالہ "النظم المستطاب" میں اس کی خوب وضاحت کی ہے اور جو علماء کراہت کے قائل ہیں ان کی تردید کی ہے اور لکھا ہے: «وَ هٰذَا هُوَ الْأَوْلٰى لِثُبُوْتِ ذٰلِكَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ.»

''اور یہی بات اولیٰ ہے کیوں کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام سے ثابت ہے۔''

مولانا عبدالحی نے ''التعليق الممجد'' میں بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ قاضی ثناء اللہ حنفی مجددی

❶ رواه الاثرم حاشيه موطأ امام محمد

بھی اپنے وصیت نامہ میں اس بات کے قائل ہیں۔ (فتاویٰ مفید الاحناف ،ص:۲)

امام طحاوی رحمہ اللہ وغیرہ نے بھی اپنے مسلک کی حمایت کے لیے احادیث قراءت کی تاویل کو ضروری خیال کیا ہے۔ چناں چہ لکھتے ہیں:

« مَنْ قَرَأَهَا مِنَ الصَّحَابَةِ يَحْتَمِلُ أَنْ يَكُوْنَ عَلٰى وَجْهِ الدُّعَاءِ لَا التِّلَاوَةِ.»

''ممکن ہے جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جنازے میں ''سورۂ فاتحہ'' پڑھی انھوں نے تلاوت وقراءت کی بجائے بطورِ دعا پڑھی ہو۔''

حالاں کہ اس تاویل کی تردید کے لیے یہی کافی ہے کہ احادیث میں تو 'فاتحہ الکتاب'' کی قراءت کے ساتھ ایک سورت کا بھی ذکر ہے جس میں علی وجہ الدعاء والی تاویل ممکن نہیں، اور پھر یہ محض دعویٰ ہے جس پر کوئی دلیل نہیں۔ چناں چہ امام ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«وَ هٰذَا بَاطِلٌ لِأَنَّهُمْ ثَبَتَ عَنْهُمُ الْأَمْرُ بِالْقِرَاءَةِ وَ اِنَّهَا سُنَّتُهَا فَقَوْلُ مَنْ قَالَ: لَعَلَّهُمْ قَرَءُ اوْهَا دَعَاءً كَذِبٌ بَحْتٌ.»

یعنی ''بطورِ دعاء والا نظریہ باطل ہے۔ کیوں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے قراءت کا حکم ثابت ہے اور یہ نمازِ جنازہ میں مسنون ہے۔ پس جن لوگوں نے کہا ہے کہ ممکن ہے انھوں نے فاتحہ کو بطورِ دعا پڑھا ہو سفید جھوٹ ہے۔''

ان اصحابِ قیاس پر تعجب ہے کہ ایک طرف تو نماز جنازہ کو نماز کہتے ہیں اس میں تکبیر، استقبالِ قبلہ، امامت رجال، طہارت، سلام واجب قرار دیتے ہیں اور پھر قراءت کو ساقط کرتے ہیں۔ حالاں کہ حدیث « لَا صَلَاةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ.» [1] اپنے عموم کے اعتبار سے نمازِ جنازہ کو بھی شامل ہے۔

لہٰذا سابقہ دلائل کے بعد ان بے اصل تاویلات کی قطعاً کوئی اہمیت نہیں۔ اب جنازے میں ''سورۃ الفاتحہ'' کا پڑھنا جائز کی بجائے واجب ماننا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

پھر یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ حنفیہ کے نزدیک سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ پڑھنا مسنون ہے۔ حالاں کہ جنازے میں اس کا اصلاً ثبوت نہیں ہے (جیسا کہ امام احمد بن حنبل وغیرہ نے تصریح کی ہے) اور قراءت کی نفی کرتے ہیں جو کہ احادیث وآثار سے ثابت ہے۔ (کتاب احکام جنائز)

لہٰذا ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت کے صحیح طرق سے صرف نظر کرکے محض ضعیف طریق پر اعتماد کر بیٹھنا سراسر بے انصافی اور دھونس ہے۔ امید ہے راہِ حق کے متلاشی کے لیے یہ چند دلائل کافی ہوں گے۔ والتوفیق بید اللہ (۱۶ جنوری ۲۰۰۹ء)

---

[1] صحيح البخاري ، بَابُ وُجُوبِ الْقِرَاءَةِ لِلْإِمَامِ وَالْمَأْمُومِ فِي الصَّلَوَاتِ كُلِّهَا ، ......الخ ، رقم:۷۵۶

کیا مقتدی نمازِ جنازہ میں ''آمین'' کہہ سکتے ہیں؟

سوال : بعض علماء کہتے ہیں کہ عوام کو چونکہ نماز جنازہ نہیں آتی، اس لیے جہراً جنازہ پڑھیں گے۔ پھر نمازِ جنازہ میں وہ بلند آواز سے میت کے لیے دعا کرتے ہیں۔ مقتدی خود بھی نمازِ جنازہ میں دعا کریں یا امام کی دعا سننے کی صورت میں آمین کہیں۔ بعض علماء آمین کہنے کو بدعت کہتے ہیں؟ (ہدایت الٰہی۔ لاہور) (۲۷ ستمبر ۲۰۰۲ء)

جواب : مقتدی کو خود جنازے کی دعائیں پڑھنی چاہئیں، نمازِ جنازہ میں بطورِ خاص مقتدی کے لیے آمین کہنے کی کوئی نص نہیں۔ البتہ شرع میں دعا پر آمین کہنے کی صورت میں آدمی چونکہ داعی اور شریک دعا قرار پاتا ہے۔ (تفسیر قرطبی: ۸/ ۳۷۵) اس لیے بعض اہل علم اس حالت میں مقتدی کے لیے آمین کے جواز کے قائل ہیں، اس کو بدعت کہنا ثقیل امر ہے۔ اگرچہ میرا میلان پہلی صورت کی طرف ہے، بامرِ مجبوری دوسری صورت بھی ممکن ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ﴾ (طٰہٰ: ۱۴) ''اور میری یاد کے لیے نماز پڑھا کرو۔''

نمازِ جنازہ میں رفع الیدین

سوال : نمازِ جنازہ میں رفع الیدین ثابت ہے یا نہیں؟

جواب : نمازِ جنازہ کی تکبیرِ اولیٰ میں رفع الیدین پر جملہ اہلِ علم متفق ہیں۔ باقی تکبیرات میں اختلاف ہے۔

چنانچہ امام نووی رحمہ اللہ بحوالہ کتاب ''الاشراف'' ''الاجماع'' لابن المنذر فرماتے ہیں:

«أَجمَعُوا عَلٰى أَنَّهُ يُرفَعُ فِي أَوَّلِ تَكبِيرَةٍ، وَاختَلَفُوا فِي سَائِرِهَا» [1]

''پہلی تکبیر پر رفع الیدین تو بالاجماع مشروع ہے۔ لیکن باقی تکبیرات پر رفع الیدین میں اختلاف ہے۔''

البتہ امام ترمذی نے اپنی ''جامع'' میں باقی تکبیرات میں رفع الیدین کو اکثر اہلِ علم کی طرف منسوب کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

« وَاختَلَفَ أَهلُ العِلمِ فِي هٰذَا، فَرَأَى أَكثَرُ أَهلِ العِلمِ مِن أَصحَابِ النَّبِيِّ ﷺ، وَغَيرِهِم أَن يَّرفَعَ الرَّجُلُ يَدَيهِ فِي كُلِّ تَكبِيرَةٍ عَلَى الجَنَازَةِ، وَ هُوَ ابنُ المُبَارَكِ وَالشَّافِعِيُّ، وَأَحمَدُ، وَإِسحٰقُ. وَ قَالَ بَعضُ أَهلِ العِلمِ: لَا يَرفَعُ يَدَيهِ إِلَّا فِي أَوَّلِ مَرَّةٍ، وَ هُوَ قَولُ الثَّورِي، وَ أَهلِ الكُوفَةِ.» [2]

یعنی اہلِ علم کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وغیرہم میں سے اکثر اہلِ علم اس بات کے قائل

---

[1] المجموع: ۵/ ۲۳۲

[2] سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي رَفعِ اليَدَينِ عَلَى الجَنَازَةِ، رقم: ۱۰۷۷

ہیں کہ جنازہ میں ہر تکبیر پر رفع الیدین کی جائے۔ یہی قول ابن المبارک، امام شافعی، احمد اور اسحاق کا ہے۔ بعض اہلِ علم صرف پہلی تکبیر میں رفع الیدین کے قائل ہیں۔ یہ قول امام ثوری رحمہ اللہ اور اہلِ کوفہ کا ہے۔

جو لوگ تمام تکبیرات میں رفع الیدین کے قائل ہیں، وہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں: « اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ کَانَ إِذَا صَلّٰی عَلَی الجَنَازَةِ، رَفَعَ یَدَیهِ فِی کُلِّ تَکبِیرَةٍ » [1]

یعنی ''نبی ﷺ جب نمازِ جنازہ پڑھاتے تو ہر تکبیر میں رفع یدین کرتے۔''

حدیث ہذا کی سند کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ اس کو ''طبرانی اَوسط'' کے علاوہ ''دارقطنی'' نے بھی اپنی ''العلل'' میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً بیان کیا ہے۔ پھر اس کے موقوف ہونے کو درست قرار دیا ہے۔ وجہ یہ بیان کی ہے کہ عمر بن شبہ کے علاوہ کسی نے اس کو مرفوع ذکر نہیں کیا۔ لیکن شیخ ابن باز رحمہ اللہ ''فتح الباری'' پر تعلیقات میں فرماتے ہیں:

« وَالأَظْهَرُ عَدَمُ الالتِفَاتِ إِلٰی هٰذِهِ العِلَّةِ، لِأَنَّ عُمَرَ المَذکُورَ ثِقَةٌ، فَیُقبَلُ رَفعُهُ، لِأَنَّ ذٰلِكَ زِیَادَةٌ مِّنْ ثِقَةٍ. وَ هِیَ مَقبُولَةٌ عَلَی الرَّاجِحِ عِندَ أَئِمَّةِ الحَدِیثِ، وَ یَکُونُ ذٰلِكَ دَلِیلًا عَلٰی شَرعِیَّةِ رَفعِ الیَدَینِ فِی تَکبِیرَاتِ الجَنَازَةِ. (وَاللّٰهُ أَعلَم) » [2]

یعنی ''زیادہ واضح بات یہ ہے کہ یہ علت نا قابلِ التفات ہے، کیونکہ عمر مذکور ثقہ ہے۔ اس کا رفع (حدیث کو مرفوع بیان کرنا) قابلِ قبول ہے۔ راجح قول کے مطابق ائمہ حدیث کے ہاں ثقہ راوی کی زیادتی مقبول ہوتی ہے۔ لہٰذا حدیث ہذا اس بات کی دلیل ہے کہ نمازِ جنازہ کی تکبیرات میں رفع یدین مشروع ہے۔'' (واللہ اعلم)

دوسری طرف حنفیہ و ثوری کے علاوہ حافظ ابن حزم، امام شوکانی اور علامہ البانی رحمہم اللہ وغیرہ تکبیرِ اُولیٰ میں رفع یدین کے ماسوا باقی تکبیروں میں عدمِ رفع کے قائل ہیں۔ وجہ یہ بیان کی ہے کہ کوئی قابلِ حجت مرفوع دلیل نہیں مل سکی۔ یاد رہے شیخ ابن باز رحمہ اللہ کی بات بھی محلِ نظر ہے، کیونکہ راوی عمر بن شبہ بقول ابن حجر رحمہ اللہ ''صدوق''، ''درجۂ رابعہ'' سے ہے۔ اس کی زیادتی ثقات کے خلاف قابلِ قبول نہیں۔ البتہ ابن عمر رضی اللہ عنہما اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح سندوں سے رفع یدین ثابت ہے۔ اس بناء پر امام عبدالجبار رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ہاتھ اٹھانا، نہ اٹھانے سے بہتر ہے۔ [3]

مولانا محمد عبدہٗ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ان دلائل کی روشنی میں ہم رفع الیدین کو غیر مشروع نہیں کہہ سکتے۔ [4]

---

[1] معرفة السنن والآثار، بَابُ التَّكْبِيرِ عَلَى الْجَنَائِزِ وَغَيْرِ ذَلِكَ، رقم:٧٦١٣

[2] فتح الباری:٣/ ١٩٠

[3] فتاویٰ غزنویہ:ص:٩٩، ١٠٠

[4] أحکام جنائز، ص:١٧٩

ایک روایت کے مطابق امام ابوحنیفہ بھی تمام تکبیروں میں رفع یدین کے قائل ہیں۔اکثر ائمہ بلخ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ملاحظہ ہو!''المبسوط'' للسرخسی (۲/۶۴) حنفیہ کے اس قول کو علامہ البانی رحمہ اللہ نے حدیث ''أُسكُنُوا فِي الصَّلَاةِ'' کے جواب میں استعمال کیا ہے۔ملاحظہ ہو! حاشیہ ''التنکیل'' (۲/۳۸)

جنازہ میں ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کرنا

سوال: نمازِ جنازہ میں ہر تکبیر کے ساتھ رفع الیدین کرنے کا کیا حکم ہے؟

جواب: ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے جواز منقول ہے بلکہ امام ترمذی نے اکثر علما کا اس پر عمل نقل کیا ہے۔اگرچہ مرفوعاً کوئی روایت ثابت نہیں۔

جنازہ سرّی یا جہری؟

سوال: جنازہ سری پڑھانا جائز ہے؟

جواب: سرّی جنازہ درست ہے۔نمازِ جنازہ میں سنت یہ ہے کہ پہلی تکبیر کے بعد ''سورۃ فاتحہ'' آہستہ پڑھی جائے۔❶ بلکہ امام شوکانی رحمہ اللہ نے ''نیل الأوطار'' میں جمہور کا مسلک سری نقل کیا ہے۔(۴/۶۶)

نمازِ جنازہ بلند آواز میں پڑھانا جائز ہے؟

سوال: نمازِ جنازہ بلند آواز میں پڑھانا جائز ہے؟ اور نبی کریم ﷺ نے خود پڑھایا ہے؟ حوالہ سے وضاحت فرمائیں۔

جواب: بلند آواز سے جنازہ پڑھانے کا جواز ہے۔چنانچہ صحیح مسلم میں عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« صَلَّى رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ عَلٰى جَنَازَةٍ فَحَفِظْتُ مِن دُعَائِهٖ، وَهُوَ يَقُولُ: اَللّٰهُمَّ اغفِرلَهٗ وَارحَمهُ »❷

رسول اللہ ﷺ نے ایک جنازہ پڑھایا۔آپ ﷺ کی دعا سے میں نے یاد کیا۔آپ فرما رہے تھے: اے اللہ! اس میت کو معاف کردے اور اس پر رحم فرما! الخ۔''

اخیر میں کہتے ہیں کہ « حَتّٰى تَمَنَّيتُ اَن اَكُونَ اَنَا ذٰلِكَ المَيِّتَ » ''یہاں تک کہ (دعا پر تاثیر ہونے کی بناء پر) مجھے آرزو پیدا ہوئی کہ میں ہی یہ میت ہوتا۔'' اور نسائی کی روایت میں سماع کی تصریح بھی موجود ہے اور واثلہ بن الاسقع رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے۔

---

❶ سنن النسائی، الدُّعَاءُ، رقم:۱۹۸۹

❷ صحیح مسلم، بَابُ الدُّعَاءِ لِلْمَيِّتِ فِي الصَّلَاةِ، رقم:۹۶۳

« فَسَمِعتُهُ يَقُولُ: اَللّٰهُمَّ اِنَّ فُلَانَ بنَ فُلَانٍ فِي ذِمَّتِكَ......الخ » ❶

''میں نے آپ ﷺ سے سنا، فرمارہے تھے: اے اللہ! فلاں بن فلاں تیرے ذمے ہے......''

اسی طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں بھی سماع کی تصریح ہے، جس میں مذکور ہے کہ آپ نے دعا کرتے ہوئے فرمایا: '' اَللّٰهُمَّ أَنتَ رَبُّهَا...... الخ''❷

علامہ شوکانی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

« جَمِيعُ ذٰلِكَ يَدُلُّ عَلٰى اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ جَهَرَ بِالدُّعَاءِ، وَ هُوَ خِلَافُ مَا صَرَّحَ بِهٖ كَجَمَاعَةٍ مِن استِحبَابِ الاِسرَارِ بِالدُّعَاءِ. وَ قَد قِيلَ: اِن جَهرَهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالدُّعَاءِ لِقَصدِ تَعلِيمِهِم. قَالَ: وَالظَّاهِرُ اَنَّ الجَهرَ، وَالاِسرَارَ بِالدُّعَاءِ جَائِزَانِ، اِنتَهٰى » ❸

مندرجہ بالا روایات میں خود رسول اللہ ﷺ کے جہری جنازہ پڑھانے کا تذکرہ ہے، کیونکہ سماع بلا جہر ناممکن ہے۔

جنازہ سری پڑھانا جائز ہے؟

سوال: جنازہ سرّی پڑھانا جائز ہے؟ (ولی اللہ رحمانی دوست پورہ کھڈیاں خاص ضلع قصور) (۹ ستمبر ۱۹۹۴ء)

جواب: سرّی جنازہ درست ہے۔ نمازِ جنازہ میں سنت یہ ہے کہ پہلی تکبیر کے بعد ''سورۃ فاتحہ'' آہستہ پڑھی جائے۔❹ بلکہ امام شوکانی رحمہ اللہ نے ''نیل الاوطار'' میں جمہور کا مسلک سری نقل کیا ہے۔ (۴/۶۶)

نمازِ جنازہ بلند آواز سے پڑھی جائے یا آہستہ؟

سوال: کیا نمازِ جنازہ اونچی آواز سے پڑھنی چاہیے یا آہستہ؟ اگر دونوں طرح جائز ہے تو افضل کونسا عمل ہے۔

(زاہد لطیف، باغبانپورہ لاہور) (۲۶ جنوری ۱۹۹۶ء)

جواب: اصل یہ ہے کہ نمازِ جنازہ سرّی پڑھی جائے جہر کا محض جواز ہے۔

نمازِ جنازہ میں تذکیر و تانیث کے لحاظ سے صیغوں میں تبدیلی

سوال: نمازِ جنازہ میں پڑھی جانے والی دعاؤں کے صیغے مذکر، مونث کے لحاظ سے تبدیل کر کے پڑھنے کا جواز ہے؟

(عبدالرزاق، اختر، محمدی پینٹرز، رحیم یار خان) (۲ اگست ۱۹۹۶ء)

---

❶ سنن ابن ماجه، بَابُ مَا جَاءَ فِي الدُّعَاءِ فِي الصَّلَاةِ عَلَى الْجَنَازَةِ، رقم:١٤٩٩، سنن أبي داؤد، بَابُ الدُّعَاءِ لِلْمَيِّتِ، رقم:٣٢٠٢

❷ سنن أبي داؤد، بَابُ الدُّعَاءِ لِلْمَيِّتِ، رقم:٣٢٠٠ ❸ المرعاة:٢/ ٤٧٨

❹ سنن النسائي، الدُّعَاءُ، رقم:١٩٨٩

جواب : نمازِ جنازہ میں تذکیر و تانیث کے اعتبار سے صیغوں کو تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں۔

''نیل الاوطار'' میں امام شوکانی رحمہ اللہ نے اسی مسلک کو اختیار کیا ہے۔ (۴/۷۰)

نمازِ جنازہ میں میت اگر عورت ہو تو ضمائر کو تبدیل کرنا؟

سوال : نمازِ جنازہ میں میت اگر عورت ہو تو ضمائر کو تبدیل کرنا یعنی بصورتِ مؤنث پڑھنا ضروری ہے؟

(محمد صدیق تلیاں، ایبٹ آباد) (۲۱ جنوری ۲۰۰۰ء)

جواب : عورت کے ضمائر کو تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس صورت میں مرجع ضمیر ''میت'' ہوگا۔ امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«وَالظَّاهِرُ أَنَّهُ يَدْعُو بِهَذِهِ الْأَلْفَاظِ الْوَارِدَةِ فِي هَذِهِ الْأَحَادِيثِ سَوَاءٌ كَانَ الْمَيِّتُ ذَكَرًا أَوْ أُنْثَى، وَلَا يُحَوِّلُ الضَّمَائِرَ الْمُذَكَّرَةَ إِلَى صِيغَةِ التَّأْنِيثِ إِذَا كَانَ الْمَيِّتُ أُنْثَى؛ لِأَنَّ مَرْجِعَهَا الْمَيِّتُ، وَهُوَ يُقَالُ عَلَى الذَّكَرِ وَالْأُنْثَى..» [1]

نمازِ جنازہ میں میت کے لیے ضمائر بدلنا ضروری ہے؟

سوال : جو لوگ ضمائر بدلتے ہیں وہ عورت کے جنازہ میں الفاظ «وَ اَهلًا خَيْرًا مِنْ اَهْلِهَا وَ زَوْجًا خَيْرًا مِنْ زَوْجِهَا» بالکل پڑھتے ہی نہیں۔ صحیح حدیث کی روشنی میں اصل بات کو واضح فرمائیں۔ والسلام

(محمد صدیق تلیاں، ایبٹ آباد) (۲۱ جنوری ۲۰۰۰ء)

جواب : ضمائر بدلنے کی ضرورت نہیں۔ اہل اور زوج سے مراد وہی کچھ ہوگا جو جواب نمبر۴ میں گزرا ہے۔

بالغوں کے جنازوں میں پڑھی جانے والی دعائیں، بچوں کے جنازوں میں پڑھی جا سکتی ہیں؟

سوال : بالغ خواتین و حضرات کے جنازوں میں عام طور پر دعائیں: (ا)«اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِحَيِّنَا وَ مَيِّتِنَا...... وَلَا تُضِلَّنَا بَعْدَه» تک (ب)«اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَهٗ وَارْحَمْهُ وَ عَافِهٖ وَاعْفُ عَنْه...... وَاَعِذْهُ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَ مِنْ عَذَابِ النَّارِ» تک (ج)«اَللّٰهُمَّ اَنْتَ رَبُّهَا......الخ» وغیرہ پڑھی جاتی ہیں جب کہ نابالغ بچوں کی نمازِ جنازہ میں دعاء «اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِحَيِّنَا ......الخ» کے بعد مخصوص دعا «اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ لَنَا سَلَفًا......الخ» پڑھی جاتی ہے۔ کیا دوسری دعائیں مذکورہ بالا جو بالغوں کے لیے پڑھی جاتی ہیں بچوں کی نمازِ جنازہ میں پڑھی جا سکتی ہیں؟ خاص کر دعا «اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهٗ وَارْحَمْهُ ......» اور اس میں الفاظ «وَ اَهلًا خَيْرًا مِنْ اَهْلِهٖ وَ زَوْجًا خَيْرًا مِنْ زَوْجِهٖ»......؟

(محمد صدیق تلیاں، ایبٹ آباد) (۲۱ جنوری ۲۰۰۰ء)

[1] نیل الاوطار: ٤/٧٠

جواب : مخصوص دعا کے علاوہ بچوں کے لیے دوسری دعائیں پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ اور اگر کسی موقع پر پڑھ لی جائیں تو بظاہر کوئی حرج نہیں۔ اس صورت میں ان لفظوں کا مفہوم یہ ہوگا۔ یہاں کے لوگوں سے بہتر لوگ اور یہاں کے جوڑے سے بہتر جوڑا یعنی احباب وغیرہ۔ قرآن میں ہے:

﴿اُحْشُرُوْا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ﴾ (الصافات : ۲۲) اَیْ اَشْبَاهَهُمْ وَ اَمْثَالَهُمْ

''یعنی ظالموں اور ان کے ازواج یعنی ان کے مشابہ لوگوں کو اکٹھا کرو۔''

اور غیر شادی شدہ بالغ اگر فوت ہو جائے تو اس کے جنازے میں یہ دعا پڑھنے سے بھی یہی مقصود ہوگا۔ اور حدیث «اِذَا صَلَّیْتُمْ عَلَی الْمَیِّتِ فَاَخْلِصُوا لَهُ الدُّعَاءَ» [1] کے عموم کا تقاضا ہے کہ نیک و بد سب کے لیے یہ دعائیں پڑھی جا سکتی ہیں۔ کیونکہ اخلاصِ دعا کا تعلق سب سے ہے۔

کیا بچے کی نمازِ جنازہ میں دعا خاص وقت کے لیے ہے؟

سوال : کیا بچہ کی نمازِ جنازہ میں دعا « اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ لَنَا سَلَفًا وَ فَرَطًا » خاص نہیں بلکہ عام وقت میں دعا کرنے کے لیے ہے؟

جواب : مشارٌ الیہ دعا صحیح بخاری کی تبویب «باب قراءة فاتحة الکتاب علی الجنازة» کے تحت حسن سے منقول ہے۔ حسن کے اثر میں بچہ کی نمازِ جنازہ کی تصریح موجود ہے۔

جنازہ کی نماز میں سلام ایک طرف کا حکم ہے یا دونوں طرف؟

سوال : : جنازہ کی نماز میں سلام ایک طرف کا حکم ہے یا دونوں طرف؟ (حاجی بشیر احمد کشمیری) (۲ جنوری ۱۹۹۸ء)

جواب : نمازِ جنازہ میں دو سلام ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے:

« ثَلَاثُ خِلَالٍ کَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَفْعَلُهُنَّ، تَرَکَهُنَّ النَّاسُ ، إِحْدَاهُنَّ :اَلتَّسْلِیْمُ عَلَی الْجَنَازَةِ مِثْلُ التَّسْلِیْمِ فِی الصَّلَاةِ.» [2]

یعنی'' تین خصلتیں ایسی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان پر عمل پیرا تھے لیکن لوگوں نے انھیں ترک کر دیا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ جنازہ میں سلام نماز کی طرح ہے۔''

اور ''صحیح مسلم'' وغیرہ میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے:

«اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ کَانَ یُسَلِّمُ تَسْلِمَتَیْنِ فِی الصَّلٰوةِ.» [3]

---

[1] سنن ابن ماجه ، بَابُ مَا جَاءَ فِی الدُّعَاءِ فِی الصَّلَاةِ عَلَی الْجَنَازَةِ ، رقم:۱٤۹۷

[2] السنن الکبریٰ للبیهقی ، بَابُ مَنْ قَالَ یُسَلِّمُ عَنْ یَمِینِهِ وَعَنْ شِمَالِهِ ، رقم:٦۹۸۹

[3] صحیح مسلم ، بَابُ السَّلَامِ لِلتَّحْلِیلِ مِنَ الصَّلَاةِ عِنْدَ فَرَاغِهَا وَکَیْفِیَّتِهِ ، رقم:٥۸۱

''یعنی نبی ﷺ نماز میں دو سلام پھیرتے تھے۔''

اس سے پہلی حدیث کے اجمال کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ (تلخیص احکام الجنائز)

لیکن علامہ عینی کی شرح بخاری بحوالہ المعرفہ ابن مسعود کی اسی روایت میں دو سلام کی تصریح ہے۔ نیز سنن کبریٰ بیہقی میں عبد اللہ بن ابی اوفیٰ کی روایت میں ہے کہ انھوں نے اپنی بیٹی کی نمازِ جنازہ پر دو سلام پھیرے تو کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کے عمل سے زیادہ نہیں کیا۔ آپ ﷺ اسی طرح کرتے تھے۔ لیکن اس میں شریک عن ابراہیم منفرد ہے۔ معروف ان سے ایک سلام ہے۔ اور اگر کوئی صرف ایک سلام پر اکتفا کرے تو یہ بھی جائز ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں تصریح ہے:

«أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَّى عَلَى جِنَازَةٍ فَكَبَّرَ عَلَيْهَا أَرْبَعًا وَسَلَّمَ تَسْلِيمَةً وَرُوِينَا عَنْ عَطَاءِ بْنِ السَّائِبِ مُرْسَلًا أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: سَلَّمَ عَلَى الْجِنَازَةِ تَسْلِيمَةً وَاحِدَةً.» [1]

''رسول اللہ ﷺ نے نمازِ جنازہ پڑھی اور چار تکبیریں کہیں اور ایک سلام پھیرا۔''

اس بناء پر علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے ''زاد المعاد'' میں دونوں طرح جواز نقل کیا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ عون المعبود: ۳/۱۹۳۔

اختتامِ جنازہ پر سلام پھیرتے ہوئے ہاتھ کیسے چھوڑے جائیں؟

سوال: لوگ جب نمازِ جنازہ میں دائیں طرف سلام پھیرتے ہیں تو دایاں ہاتھ اور جب بائیں طرف سلام پھیرتے ہیں تو بایاں ہاتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ مذکورہ کیفیت صحیح ہے یا غلط؟ (ہدایت الٰہی۔ لاہور) (۲۷ ستمبر ۲۰۰۲ء)

جواب: نمازِ جنازہ میں دونوں طرف سلام پھیرنے کے بعد ہاتھ چھوڑنے چاہئیں کیوں کہ اسی حالت میں آدمی نماز سے فارغ سمجھا جاتا ہے۔ ہاں البتہ اگر صرف ایک ہی سلام پر اکتفا کرنی ہو۔ (جو احادیث سے ثابت ہے) تو پھر ہاتھ چھوڑنا بلاتردد جائز ہے۔

نمازِ جنازہ کا سلام ہاتھ چھوڑ کر پھیرنے کی وضاحت

سوال: ایک شخص کہتا ہے کہ نمازِ جنازہ کا سلام ہاتھ چھوڑ کر پھیرنا چاہیے۔ جب کہ دوسرا شخص کہتا ہے کہ اگر سلام سے قبل ہاتھ چھوڑ دیے جائیں تو پھر نماز نہیں ہوگی۔ اس لیے سلام کے بعد ہاتھ چھوڑنا چاہیے۔

---

[1] السنن الكبرىٰ للبيهقي، بَابُ مَا رُوِيَ فِي التَّحَلُّلِ مِنْ صَلَاةِ الْجِنَازَةِ بِتَسْلِيمَةٍ وَاحِدَةٍ، رقم: ٦٩٨٢، المستدرك للحاكم، رقم: ١٣٣٢

ان دونوں میں سے کس کا قول کتاب وسنت سے ثابت ہے۔ بحوالہ تفصیل جواب عنایت فرمائیے۔

جواب: نماز کی کیفیت سے فراغت انسان کو اس وقت ہوتی ہے۔ جب وہ سلام پھیر لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ہاتھ باندھنا ہے۔ چھوڑنا نہیں۔ حدیث میں ہے:

« تَحرِيمُهَا التَّكبِيرُ، وَ تَحلِيلُهَا التَّسلِيمُ » ❶

نمازِ جنازہ میں امام کے بھول جانے کی صورت میں کیا کرنا چاہیے:

سوال: احمد خان سپرا کی اہلیہ وفات پا گئیں۔ امام صاحب نے چوتھی تکبیر کہنے کی بجائے دونوں طرف سلام پھیر دیا۔ بعد میں مقتدیوں کے یاد دلانے پر امام نے بھولنے کا اعتراف کیا۔ اعادہ نہیں کیا گیا۔ وہ جنازہ ہوا ہے یا نہیں؟ آئندہ اس قسم کا سہو ہو جائے تو امام اور مقتدی کو کیا کرنا چاہیے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں الاعتصام میں جواب شائع کریں؟

(سائل: ملک قادر بخش بلوچ کوٹ بھائی خان سرگودھا) (۱۸ جولائی ۱۹۹۷ء)

جواب: مقتدیوں کے یاد دلانے پر امام صاحب کو چوتھی تکبیر کی تکمیل کرنی چاہیے تھی۔ اس کے باوجود نمازِ جنازہ ہوگئی۔ ان شاء اللہ۔ اور اگر آئندہ ایسا کوئی واقعہ پیش آ جائے تو فوراً اس کی تکمیل کر لی جائے۔

یہ بھی یاد رہے کہ جنازہ میں چار سے لے کر نو تک تکبیریں کہی جا سکتی ہیں اگرچہ ترجیح چار تکبیرات کو ہے۔

نمازِ جنازہ میں زندہ مسلمانوں کے لیے مغفرت کی دعا کر سکتے ہیں یا نہیں؟

سوال: زندہ مسلمانوں کے لیے مغفرت کی دعا کر سکتے ہیں یا نہیں؟ (سائل: حافظ محمد سلیم عنایت اللہ) (۱۹ دسمبر ۱۹۹۷ء)

جواب: زندہ مسلمان اپنے اور دوسرے کے لیے مغفرت کی دعا کر سکتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا فرمائی: ﴿رَبِّ اغْفِرْلِيْ وَلِاَخِيْ﴾ (الاعراف: ۱۵۱)

"اے میرے پروردگار مجھے اور میرے بھائی کو معاف فرما۔"

نمازِ جنازہ میں تاخیر سے شریک ہونے والا کیا کرے؟

سوال: نمازِ جنازہ میں ایک یا دو تکبیرات کے بعد ملنے والا شخص امام کے ساتھ سلام پھیرے گا یا بعد میں اپنی نماز مکمل کرے گا۔ جب کہ وہ فاتحہ اور درود سے محروم رہا۔

جواب: بعد میں زوائد مکمل کرے چنانچہ علامہ عبدالرحمٰن مبارک پوری فرماتے ہیں:

جنازہ کی نماز پوری نہ ملے تو دیگر نمازوں کی مثل جس قدر امام کے ساتھ ملے، اس کو امام کے ساتھ پڑھ لے اور جس قدر فوت ہوگئی ہو، اس کو امام کے سلام پھیرنے کے بعد پوری کر لے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: « فَمَا

---

❶ سنن أبي داؤد، بَابُ الْإِمَامِ يُحْدِثُ بَعْدَ مَا يَرْفَعُ رَأْسَهُ مِنْ آخِرِ الرَّكْعَةِ، رقم:٦١٨

أَدرَكتُم فَصَلُّوا وَمَا فَاتَكُم فَأَتِمُّوا.» ❶

یعنی جو امام کے ساتھ پاؤ اس کو پڑھ لو اور جو فوت ہو اس کو پوری کرلو۔

سو آپ کا یہ حکم نمازِ جنازہ کو بھی شامل ہے۔''موطا'' امام مالک میں ہے۔امام مالک نے زہری سے پوچھا کہ کوئی شخص نمازِ جنازہ کی بعض تکبیروں کو پالے اور بعض تکبیریں فوت ہو جائیں تو کیا کرے۔انہوں نے فرمایا: کہ جو تکبیر فوت ہو جائے اس کو قضاء کرلے۔ (کتاب الجنائز،ص:٦٢)

نماز جنازہ کا مسبوق کیا کرے؟

سوال : نماز جنازہ کا مسبوق کیا کرے کیوں کہ پہلی تکبیر کے بعد ''سورۂ فاتحہ''، دوسری کے بعد درود اور تیسری کے بعد دعا ہوتی ہے۔امام کی اقتداء میں امام جو چیز پڑھ رہا ہو وہ پڑھے یا اپنی ترتیب جاری رکھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ امام کی اقتداء اس پر لازم ہے،امام کے سلام پھیرنے کے بعد وہ ابتدائی نماز یعنی پہلے ''سورۂ فاتحہ'' پڑھے پھر درود اور جو امام کے ساتھ پڑھ چکا ہوا سے نہ دہرائے۔

عموماً مقتدی نے فاتحہ نہیں پڑھی ہوتی امام درود شروع کر دیتا ہے۔مقتدی فاتحہ فاتحہ کو چھوڑ کر درود پڑھے یا فاتحہ مکمل کرنے کے بعد درود پڑھے لیکن اس حال میں ممکن ہے مقتدی کے درود مکمل کرنے تک امام میت کے لیے دعا کرنے لگے۔مقتدی کی امام کی اقتداء میں جو چیز مکمل نہ ہو وہ چھوڑ دے یا اپنی ترتیب مکمل کرے؟

(وقار علی ۔لاہور) (١٧جنوری ١٩٩٧ء)

جواب : صحیح بات یہ ہے کہ مسبوق کی نماز پہلی ہوگی کیونکہ حدیث میں لفظ اِتمام وارد ہے۔اس کا تقاضا یہی ہے اور نمازِ جنازہ کی جو تکبیر فوت ہو جائے اسے بعد میں مکمل کیا جائے۔

عموم حدیث «وَمَا فَاتَكُم فَأَتِمُّوا» ❷ اسی بات کا متقاضی ہے اس سے امام کی اقتداء متاثر نہیں ہوتی۔کیونکہ اس کا عموماً تعلق ظواہر سے ہے۔

(جنازہ کے متعلق بعض مسائل)

نماز جنازہ کے بعد میت کے لئے دعا مانگنا شرعاً کیسا ہے؟

سوال : نماز جنازہ سے فارغ ہوچکنے کے بعد میت کے لئے دعا مانگنا شرعاً کیسا ہے؟ کیا حدیث إِذَا صَلَّيْتُمْ

❶ صحيح البخاري، بَابُ قَولِ الرَّجُلِ: فَاتَتنَا الصَّلاةُ، رقم:٦٣٥

❷ سابقه حواله.

عَلَى الْمَيِّتِ فَأَخْلِصُوْا لَهُ الدُّعَاءَ (جب تم میت کی نماز جنازہ پڑھو تو اس کے لئے خصوصی طور پر دعائیں کرو) اور ابن ابی شیبہ کی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کہ ''انہوں نے نماز جنازہ پڑھی پھر میت کے لئے دعا کی'' سے اس کا جواز نکلتا ہے؟

جواب: بحث طلب مسئلہ یہ ہے کہ آیا نماز جنازہ سے فارغ ہوچکنے کے فوراً بعد میت کے لئے دعا کا جواز ہے یا نہیں؟...... نمازِ جنازہ کے بعد دعا مانگنے کی دلیل کے طور پر، سوال میں مذکور دو روایات پیش کی جاتی ہیں لیکن درست بات یہ ہے کہ میت کے لئے دعا نماز جنازہ کے دوران مانگی جائے۔ پہلی حدیث کی تشریح بقول علامہ مناوی رحمہ اللہ یوں ہے:

''میت کیلئے اخلاص کے ساتھ دعا کرو کیونکہ اس نماز سے مقصود صرف میت کیلئے سفارش کرنا ہے جب دعا میں اِخلاص اور عاجزی ہوگی تو اسکے قبول ہونے کی امید ہے''[1]

اور مستدرک حاکم میں حضرت ابوامامہ کی روایت میں ہے: وَيُخْلِصُ الصَّلَاةَ فِي التَّكْبِيرَاتِ الثَّلَاثِ یعنی ''جنازہ کی تین تکبیروں کے دوران اِخلاص سے دعا کرے۔''[2] مستدرک حاکم کی اس حدیث سے اس امر کی وضاحت ہوگئی کہ دعا کا تعلق خالصۃً حالتِ نماز کے ساتھ ہے نہ کہ بعد از نماز سے۔

اصولِ فقہ کا معروف قاعدہ ہے کہ اَلْأَحَادِيْثُ يُفَسِّرُ بَعْضُهَا بَعْضًا 'احادیث ایک دوسرے کی تفسیر کرتی ہیں''، اس بنا پر اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جب تم نمازِ جنازہ پڑھنا چاہو تو میت کے لئے خلوص کے ساتھ دعا کرو۔ یہ إقامة المسبب مقام السبب (سبب بول کر مسبّب مراد لینا) کی قبیل سے ہے، ارادہ سبب اور نماز مسبّب ہے۔ حدیث کے الفاظ فَأَخْلِصُوْا میں ''فاء'' کے ترتیب وتعقیب بلامہلت ہونے کا یہی مطلب ہے...... اگر مقصود یہاں نماز جنازہ سے فراغت کے بعد دعا ہوتی تو پھر فاء کی بجائے لفظ ثُمَّ ہونا چاہئے تھا جو عام حالات میں ترتیب اور تراخی کا فائدہ دیتا ہے۔ احناف کی یہ توجیہ غلط ہے کہ فاء تعقیب کا یہ مطلب ہے کہ نماز کے بعد دعا کی جائے۔

علاوہ ازیں یہ حدیث سنن ابوداود اور سنن ابن ماجہ وغیرہ میں ہے اور امام ابوداود نے اس حدیث کو جنازہ کے دوران دعا پڑھنے کے ضمن میں ذکر کیا ہے انہوں نے اس پر عنوان یوں قائم کیا ہے: باب الدعا للمیت اور اس حدیث پر امام ابن ماجہ کی تبویب بھی ملاحظہ فرمائیں اور بار بار غور سے پڑھیں:

''بَابُ مَا جَاءَ فِي الدُّعَاءِ فِي الصَّلَاةِ عَلَى الْجَنَازَةِ'' یعنی نمازِ جنازہ میں دعا کے بارے میں جو کچھ آیا ہے، اس کا بیان...... اس سے معلوم ہوا کہ محدثین اور احناف کے فہم میں زمین وآسمان کا فرق ہے لہٰذا اس تحریف پر

[1] عون المعبود:۳/ ۱۸۸

[2] المستدرك على الصحيحين، كِتَابُ الْجَنَائِزِ، رقم ۱۳۳۱

انہیں ندامت کا اظہار کرکے حق کی طرف رجوع کی فکر کرنی چاہیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے "مُرَاجَعَةُ الْحَقِّ خَيْرٌ مِنَ التَّمَادِيْ فِي الْبَاطِلِ" باطل پر اصرار سے بہتر ہے کہ آدمی حق کی طرف رجوع کرلے۔ ❶

اس کی مثال یوں سمجھیں جیسے قرآنِ مجید میں ہے ﴿فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ﴾ (النحل:٩٨) "جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو۔"

ائمہ لغت زجاج وغیرہ نے اس کا معنی یوں بیان کیا ہے: إِذَا اَرَدْتَ اَنْ تَقْرَأَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ وَلَيْسَ معناه استعاذ بعد ان تقرا القرآن "جب آپ قرآن کی تلاوت کا ارادہ کریں تو اللہ سے پناہ مانگ لیا کریں، اس کا یہ معنی نہیں کہ تلاوتِ قرآن کے بعد اعوذ باللہ پڑھا کرو۔"

اسی کی مثل قائل کا قول ہے: إذا اكلت فقل بسم الله یعنی جب تو کھانے کا ارادہ کرے تو بسم اللہ پڑھ، اس کا قطعاً یہ معنی نہیں کہ کھانے سے فراغت کے بعد بسم اللہ پڑھنی چاہیے"...... امام واحدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "فقہاء کرام کا اس بات پر اجماع ہے کہ استعاذہ قراءت سے پہلے ہے"۔ ❷

بلاشبہ شرع میں دعا کی بالعموم تاکید ہے۔ غالباً اس بنا پر فقہاء حنفیہ نے جنازہ میں قراءت سے استغنائی پہلو اختیار کرکے اس کا نام دعاء وثناء وغیرہ رکھا ہے۔ مؤطا امام محمد میں ہے: لا قراءة على الجنازة وهو قول ابى حنيفة اور یہ قول المبسوط للسرخسی رحمہ اللہ میں بھی ہے (٦٤/٢)... البتہ محقق ابن الہمام فتح القدیر (٤٨٩/١) میں فرماتے ہیں:

"فاتحہ نہ پڑھے تاہم بہ نیتِ ثنا پڑھی جاسکتی ہے۔ کیونکہ قراءت رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں"

علامہ ابن الہمام جیسے محقق کی یہ بات انتہائی مضحکہ خیز ہے، اس لئے کہ فاتحہ کی قراءت کا اثبات تو صحیح بخاری میں موجود ہے: باب قراءة فاتحة الكتاب على الجنازة۔ تو پھر کیا یہ بات معقول ہے کہ اثناء جنازہ میں اخلاصِ دعا کی تاکید تو نہ ہو، لیکن سلام پھیرنے کے بعد کہا جائے کہ اب اِخلاص سے دعا کرو۔ غالباً اس دھوکہ کے پیشِ نظر حنفی بھائی نمازِ جنازہ کا توجھٹکا کرتے ہیں، بعد میں لمبی لمبی دعائیں کی جاتی ہیں جس کی شریعت میں کوئی اصل نہیں۔

اصولِ فقہ کا قاعدہ معروف ہے کہ "عبادات میں اصل حظر (ممانعت) ہے، جواز کے لئے دلیل کی ضرورت ہوتی ہے"۔ عہدِ نبوت میں کتنے جنازے پڑھے گئے، کسی ایک موقع پر بھی ثابت نہیں ہے کہ نبی ﷺ نے نماز جنازہ کے بعد دعا کی ہو۔

---

❶ السنن الكبرى للبيهقي: ١١٩/١٠.

❷ تفسير فتح القدير: ١٩٣/٣

صحیح بخاری میں حدیث ہے: «مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هَذَا مَا لَيْسَ فِيهِ، فَهُوَ رَدٌّ » ❶

''جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے۔''

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: عَلَيْكَ بِالْأَثَرِ وَطَرِيْقَةِ السَّلَفِ وَإِيَّاكَ وَكُلَّ مُحْدَثَةٍ فَإِنَّهَا بِدْعَةٌ ''آثار اور طریقہ سلف کو لازم پکڑو، اپنے آپ کو دین میں اضافہ سے بچاؤ وہ بدعت ہے۔'' ❷

ابن الماجشون نے کہا کہ میں نے امام مالک سے سنا، وہ فرماتے تھے:

''جو دین میں بدعت ایجاد کرکے، اسے اچھا سمجھے تو گویا وہ یہ باور کراتا ہے کہ محمد ﷺ نے رسالت میں خیانت کی ہے،اس لئے کہ اللہ کا فرمان ہے ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ جو شے اس وقت دین نہیں تھی، وہ آج بھی دین نہیں بن سکتی''

امام شافعی فرماتے ہیں: ''جس نے بدعت کو اچھا سمجھا اُسنے نئی شریعت بنالی'' (السنن والمبتدعات)

رہا حضرت علی رضی اللہ عنہ کا آثر (فعل صحابی) تو اس کا تعلق نمازِ جنازہ کے متصل بعد سے نہیں بلکہ اس کا تعلق دفن میت کے بعد سے ہے کیونکہ مصنف نے اس اثر پر جوعنوان قائم کیا ہے اور اس کے تحت مذکورہ جملہ آثار اسی بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اس دعا کا تعلق تدفین میت کے بعد سے ہے،عنوان کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے: «...فِي الدُّعَاءِ لِلْمَيِّتِ بَعْدَ مَا يُدْفَنُ وَيُسَوِّى عَلَيْهِ» قبر پرمٹی برابر کرکے میت کے لئے دعا کرنے کا بیان۔ اور تدفین کے بعد میت کے لئے دعا کرنا ثابت شدہ امر ہے جس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے:

''میں نے رسول اللہ ﷺ کو عبداللہ ذی نجادین کی قبر پر دیکھا، جب دفن سے فارغ ہوئے تو قبلہ رُخ ہاتھ اٹھا کر دعا کی'' ❸

تمام خیر سنت نبوی کی پیروی میں ہے، اور بدعت میں شر ہی شر ہے۔ اللہ رب العزت جملہ مسلمانوں کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق بخشے۔ آمین!

نمازِ جنازہ کے بعد میت کے پاس اکٹھے ہو کر دعا کرنا:

سوال: نمازِ جنازہ کے بعد جمع ہو کر دعا کرنے کا کیا حکم ہے؟

جواب: کتاب وسنت سے ثابت نہیں لہٰذا بدعت ہے۔

❶ صحيح البخاری، بَابُ إِذَا اصْطَلَحُوا عَلَى صُلْحِ جَوْرٍ فَالصُّلْحُ مَرْدُودٌ، رقم:٢٥٩٧

❷ ذمّ التاویل از ابن قدامه : ١/ ٣٣.

❸ اخرجه ابوعوانة فی صحیحه، فتح الباری، ١١/ ١٤٤

رسول اللہ ﷺ کی نمازِ جنازہ بطریقِ معروف کیوں نہیں پڑھی گئی؟

سوال : رسول اللہ ﷺ کی نمازِ جنازہ بطریقِ معروف کیوں نہیں پڑھی گئی؟ اس کی بجائے کیا طریق اختیار کیا گیا تھا؟

جواب : کائنات کے امام پر امامت کا مسئلہ مشکل امر ہے۔ غالباً اس لیے اس طریق کو اختیار کیا گیا کہ صرف گروہوں کی صورت میں حجرہ شریفہ میں درود پر اکتفا کیا گیا۔ سیرت الرسول ﷺ (ص:۴۷۱) میں ہے:

«وَلَمْ يَؤُمَّ النَّاسَ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَحَدٌ.» [1]

بے نماز کا نمازِ جنازہ:

سوال : پچھلے ہفتہ ہماری مسجد رحمانیہ اہلِ حدیث محمد حسین گوٹھ عرفات ٹاؤن میں ایک واقعہ ظہور پذیر ہوا جس سے طبیعت بہت الجھ گئی ہے۔ چونکہ میں نے الحمدللہ سعودی عرب میں بھی کچھ وقت گزارا۔ لیکن وہاں پر بھی ایسا نہیں ہوا۔ ہوا یہ کہ ہماری مسجد میں ایک جنازہ لایا گیا جس کی نمازِ جنازہ امام صاحب نے یہ کہہ کر پڑھانے سے انکار کردیا کہ یہ شخص بے نمازی تھا۔ امام صاحب عالم دین ہیں لیکن ایک خلجان جو پیدا ہوگیا قرآن وسنت کی روشنی میں اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب : بے نماز کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھنی چاہیے۔ آپ کے امام صاحب نے بصورتِ انکار درست موقف اختیار کیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے:« مَن تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَد كَفَر» [2]

یعنی ''جو شخص دیدہ دانستہ نماز چھوڑ دے وہ کافر ہے۔'' جملہ تفاصیل کے لیے ملاحظہ ہو! ہمارے شیخ محدث روپڑی رحمہ اللہ کا ''فتاویٰ اہل حدیث'' (۲/ ۳۸ تا ۵۷)

بے عمل و بے نماز والدین کی نمازِ جنازہ کا حکم

سوال : بے عمل اور بے نماز والدین کا جنازہ پڑھایا جائے گا یا کہ نہیں۔

(عبدالرزاق اختر، محمدی چوک، حبیب کالونی گلی نمبر۱۲، رحیم یار خان) (مارچ ۲۰۰۵)

جواب : بے عمل اور بے نماز افراد کا جنازہ نہیں پڑھانا چاہیے، چاہے وہ قریبی عزیز ہی کیوں نہ ہوں۔ ملاحظہ ہو امام ابن قیم رحمہ اللہ کی کتاب ''حکم تارك الصلاة ''

سوال : قرآن و حدیث کے واضح دلائل ہیں کہ بے نماز کافر ہے اور امام ابن قیم رحمہ اللہ نے بے نماز کے کافر

---

[1] سنن ابن ماجه، بَابُ ذِكْرِ وَفَاتِهِ وَدَفْنِهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، رقم۱۶۲۸

[2] المعجم الأوسط، رقم: ۳۳۴۸، صحيح مسلم، كتاب الصلاة، بَابُ بَيَانِ إِطْلَاقِ اسْمِ الْكُفْرِ عَلَى مَنْ تَرَكَ الصَّلَاةَ، رقم:۸۲

ہونے پر صحابہ کا اجماع بھی نقل کیا ہے۔سوال یہ ہے کہ اگر بے نماز کافر ہے تو کیا اس کی نماز جنازہ پڑھنی جائز ہے کہ نہیں جب کہ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو منافق پر نمازِ جنازہ پڑھنے سے روکا ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ بے نماز کا نکاح پڑھنا درست ہے کہ نہیں جب کہ قرآن نے روکا ہے کہ مومن مرد مشرک عورت سے نکاح نہ کرے اور نہ مومنہ عورت کا نکاح مشرک مرد سے کیا جائے اور جب کہ اللہ تعالیٰ نے نماز چھوڑنا مشرکوں کا فعل قرار دیا ہے۔کیا بے نماز کا نکاح پڑھنے والا گناہگار ہوگا؟ براہ کرم ان سوالوں کا قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔

جواب: دلائل کی رُو سے صحیح بات یہی ہے، کہ بے نماز کافر ہے۔چنانچہ حدیث میں ہے:«مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ » [1] یعنی''جو شخص دیدہ دانستہ نماز چھوڑ دے وہ کافر ہے۔'' جب اس کا کفر ثابت ہوگیا تو اس سے معلوم ہوا، کہ بے نماز کا جنازہ اور نکاح بھی نہیں پڑھنا چاہیے اور اگر کوئی شخص (واضح) نصوص کی خلاف ورزی کر کے بے نماز کا جنازہ یا نکاح وغیرہ پڑھا دے، تو وہ بنظرِ شرع مجرم ٹھہرتا ہے۔

مسئلہ ہذا پر بسط و تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو!''فتاویٰ اہل حدیث'' (۲/۲۹تا۵۷) لشیخنا محدث روپڑی رحمہ اللہ

کلمہ گو مشرک کا جنازہ پڑھنا کیسا ہے؟

سوال: کلمہ گو مشرک کا جنازہ پڑھنا صحیح ہے؟ جب کہ آخری وقت اس کی زبان پر کلمہ بھی جاری ہو۔ (سائل) (۷/ اپریل ۲۰۰۰ء)

جواب: آخری وقت میں کلمہ پڑھنے والے مشرک آدمی کی نمازِ جنازہ پڑھ لینی چاہیے کیونکہ نطق کلمہ اس کے گناہوں سے درگزر اور معافی کی علامت ہے۔

دیوانی بالغ لڑکی کی نمازِ جنازہ کا حکم

سوال: ہمارے گاؤں میں ایک دیوانی لڑکی فوت ہوگئی۔یہ لڑکی بالغ تھی لیکن جنازہ پڑھانے والے مولوی صاحب نے کہا کہ اس کی نمازِ جنازہ نابالغ بچوں کی طرح ادا کریں کیونکہ یہ دیوانی ہے اور اس کی مثال بچوں کی طرح ہے۔ قرآن وسنت کی روشنی میں اس کی وضاحت کر دیں۔ (محمد ظہور۔بالا گڑھی۔مردان) (یکم اکتوبر ۱۹۹۹ء)

جواب: ظاہر ہے کہ دیوانہ بالغ کے جنازہ میں بالغ عاقل جیسی دعاؤں کو پڑھا جائے۔کیونکہ یہ بالغ ہے۔اگرچہ عاقل نہیں، اسے نابالغ بچوں کے ساتھ ملحق کرنے کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔

---

[1] مصنف ابن ابی شیبه، رقم:۳۰۴۳۸، مسند البزار، رقم:٤١٤٨، معجم الاوسط، رقم:٣٣٤٨

استطاعت کے باوجود شادی نہ کرنے والے کی نمازِ جنازہ

سوال : استطاعت کے باوجود شادی نہ کرنے والے کی نمازِ جنازہ پڑھنی چاہیے یا نہیں؟

(عبدالرزاق اختر، محمدی چوک، حبیب کالونی گلی نمبر۱۲، رحیم یار خان) (مارچ ۲۰۰۵)

جواب : شادی نہ کرنے کے باوجود اگر کسی کی طہارت و پاکیزگی معروف ہو تو اس کی نماز جنازہ پڑھنی چاہیے ویسے بھی عام حالات میں شادی کرنا مستحب ہے، واجب نہیں، ہاں البتہ کسی کو اگر زنا کاری کا ڈر ہو تو پھر شادی کرنا واجب ہے، ملاحظہ ہو: المغنی لابن قدامه ۔

بعض علماء نے ان محدثین کے بارے میں مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں، جنھوں نے ساری زندگی شادی نہیں کی۔

ناقص الخلقت بچے کی نمازِ جنازہ پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

سوال : علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ اپنی مایہ ناز کتاب ''مختصر احکام الجنائز'' (مترجم: شبیر بن نور، نظر ثانی سید بدیع الدین راشدی رحمہ اللہ) کے ص: ۱۲۶، پر حضرت زید بن خالد الجہنی رضی اللہ عنہ کی روایت ذکر کرتے ہیں کہ خیبر کے دن ایک صحابی وفات پا گیا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تذکرہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «صَلُّوا عَلٰی صَاحِبِکُم» یہ سن کر لوگوں کے چہرے اتر گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «اِنَّ صَاحِبَکُم غَلَّ فِی سَبِیلِ اللّٰهِ» جب اس کے سامان کی تلاشی لی گئی تو اس کے سامان سے ایک موتی نکلا جس کی قیمت دو درہم تھی۔ [1]

اس حدیث سے نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اس حکم سے دو طرح کے آدمی مستثنیٰ ہیں۔ ان کی نمازِ جنازہ ادا کرنا فرض نہیں۔

① ...... نابالغ بچہ: اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فرزند ابراہیم کی نمازِ جنازہ ادا نہیں کی جب کہ ان کی عمر اٹھارہ ماہ تھی۔ [2]

ابراہیم بن محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کون سی خیانت کی تھی جس بناء پر جنازہ نہ پڑھایا گیا حالانکہ اس حدیث کے ذیل میں حضرت وائل بن داؤد کی روایت میں ہے کہ

« لَمَّا مَاتَ اِبرٰهِیمُ بنُ النَّبِیِّ صَلّٰی عَلَیهِ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فِی المَقَاعِدِ. الحدیثِ» [3]

② ...... سنن ابن ماجہ میں بروایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فرزند ابراہیم کا جنازہ پڑھایا اور فرمایا:

---

[1] موطا امام مالك، كتاب الجهاد، باب ما جاء فی الغلول، ص: ۲۷۰۔ سنن نسائی: كتاب الجنائز، باب الصلوة علی من غسل، رقم: ۱۹۵۹.

[2] سنن أبی داؤد، كتاب الجنائز باب فی الصلوة علی الطفل، رقم: ۳۱۹۰.

[3] حواله مذكور

« اِنَّ لَهُ مُرضِعًا فِي الجَنَّةِ وَ لَو عَاشَ لَكَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا » ❶

پھر ص: ۱۲۷، پر رقم فرماتے ہیں کہ حسب ذیل افراد کی نمازِ جنازہ ادا کرنا شرعاً ثابت ہے۔

بچہ اگر چہ اس کی ناتمام ولادت ہوئی ہو اس کی نمازِ جنازہ ادا کی جائے گی۔ ❷

ناتمام وہ بچہ ہے جس کے چار ماہ مکمل ہو چکے ہوں اور اس میں روح پھونکی گئی ہو پھر وفات پائے۔ پھر اس کی وضاحت اور تائید کے لیے تخلیق انسانی کے مدارج کی حدیث (کہ انسان اپنی ماں کے پیٹ میں چالیس دن تک نطفے کی شکل میں رہتا ہے، پھر اتنے ہی دن لوتھڑے کی شکل میں، پھر اتنے ہی دن بوٹی کی طرح رہتا ہے، پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔) الحدیث رقم فرماتے ہیں۔ ❸

حالاں کہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« اِذَا استَهَلَّ الصَّبِيُّ صُلِّيَ عَلَيهِ » ❹

اور سنن الترمذی میں بروایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« اَلطِّفلُ لَا يُصَلّٰى عَلَيهِ وَ لَا يَرِثُ وَ لَا يُورَثُ حَتّٰى يَستَهِلَّ » ❺

اور صحیح بخاری میں ہے:

« اِذَا استَهَلَّ صَارِخًا صُلِّيَ عَلَيهِ وَ لَا يُصَلّٰى عَلٰى مَن لَا يَستَهِلُّ مِن اَجلِ أَنَّهُ سِقْطٌ » ❻

ان ہر دو مسائل میں تعارض ہے اقرب الی الصواب کون سی صورت ہے؟

جواب: واضح ہو کہ علامہ البانی رحمہ اللہ کا مقصود محض نمازِ جنازہ کے حکم سے استثناء ہے، نہ کہ ان کی طرف کسی خیانت کی نسبت ہے۔ حاشا وکلا نہیں۔

اور جن روایات میں یہ ہے، کہ آپ نے اپنے صاحبزادے ابراہیم کی نمازِ جنازہ پڑھی ہے، ان میں کلام ہے یہ مقال سے خالی نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کا جنازہ نہ پڑھنا محض جواز بیان کرنے کے لیے تھا، ورنہ آپ سے بچے کی نمازِ

---

❶ سنن ابن ماجه، كتاب الجنائز، باب ما جاء في الصلوة على ابن رسول الله ﷺ وذكر وفاته، رقم: ١٥١١.

❷ سنن أبي داؤد كتاب الجنائز، باب المشي امام الجنازة، رقم: ٣١٨٢ـ وسنن ابن ماجه، كتاب الجنائز، باب ما جاء في الصلوٰة على الطفل، رقم: ١٥٠٧.

❸ صحيح البخاري، كتاب القدر، رقم: ٣٢٠٨ـ صحيح مسلم، كتاب القدر، رقم: ٢٦٤٣.

❹ سنن ابن ماجه، كتاب الجنائز، باب ما جاء في الصلوة على الطفل، رقم: ١٥٠٨

❺ سنن الترمذي، كتاب الجنائز، باب ترك الصلوة على الطفل حتى يستهل، رقم: ١٠٣٢

❻ صحيح البخاري، كتاب الجنائز، باب اذا اسلم الصبي، رقم: ١٣٥٨

جنازہ پڑھنا بحق ثابت ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

« اُتِیَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ بِصَبِيٍّ مِن صِبْیَانِ الاَنْصَارِ، فَصَلّٰی عَلَیهِ ...... » ❶

پھر وہ بچہ جس کی تخلیق مکمل ہو چکی ہو اور ماں کے شکم میں وفات پا جائے، اس کی نمازِ جنازہ مشروع ہے جیسا کہ علامہ موصوف کا کہنا ہے اور شیخ ابن باز ''فتح الباری'' کے حاشیہ پر رقم طراز ہیں:

« اَلقَولُ بِعَدَمِ الصَّلَاةِ عَلَی السِّقْطِ ضَعِیفٌ. وَالصَّوَابُ شَرعِیَّةُ الصَّلَاةِ عَلَیهِ اِذَا سَقَطَ بَعدَ نَفخِ الرُّوحِ فِیهِ. وَ کَانَ مَحکُومًا بِاِسلَامِهِ، لِاَنَّهُ مَیِّتٌ مُسلِمٌ فَشُرِعَتِ الصَّلَاةُ عَلَیهِ، کَسَائِرِ مَوتَی المُسلِمِینَ، وَ لِمَا رَوَی اَحمَدُ، وابوداؤد، والترمذی والنسائی، عن المغیرة بن شعبة اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ: وَالسِّقْطُ یُصَلّٰی عَلَیهِ، وَ یُدعٰی لِوَالِدَیهِ بِالمَغفِرَةِ، وَالرَّحمَةِ (واسناده حسن) (والله اعلم) » (۳/ ۲۰۱)

اس کے مقابلہ میں جابر کی روایت ضعیف ہے۔ ملاحظہ ہو! ''نصب الرایه" (۲/ ۲۷۷)، "تلخیص" (۵/ ۱۴۶، ۴۷)، "المجموع" (۵/ ۲۵۵) اور علامہ کی کتاب ''نقد التاج الجامع" (رقم: ۲۹۳) فرمایا: وَ اِنَّمَا صَحَّ الحَدِیثُ بِدُونِ ذِکرِ الصَّلَاةِ فِیهِ" جیسا کہ موصوف نے "إرواء الغلیل" (۱۷۰۴) میں اس امر کی تحقیق کی ہے۔

اور ''سنن ترمذی'' کی حدیث کی وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو! إرواء الغلیل (۶/ ۱۴۸) اور اخیر میں بخاری کے حوالہ سے جو عبارت نقل کی ہے، یہ زہری کا قول ہے۔ مرفوع روایت نہیں۔ یہاں محقق قول وہی ہے، جو پہلے گزر چکا۔ لہٰذا مرویات میں کوئی تعارض نہیں۔

بچہ اگر چند سانس لے کر فوت ہو جائے یا مردہ پیدا ہو تو اس کے جنازہ کا کیا حکم ہے؟

سوال: اگر کوئی بچہ پیدا ہو لیکن وہ فوت ہو جائے قبل اس کے کہ اُس کے کان میں اذان دی جائے۔ اس صورت میں کیا اس کا جنازہ عام طور کے مطابق پڑھا جائے گا یا بغیر جنازہ کے ہی دفن کر دیا جائے گا۔

ایک مولوی صاحب کہتے ہیں کہ اگر بچہ خواہ ایک ہی سانس کیوں نہ لے اُس کا جنازہ ضرور پڑھا جائے گا۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں جواب دیں۔ (جماعت اہل حدیث کڑیاں کلاں) (۳ جولائی ۱۹۹۲ء)

جواب: صورتِ مسئولہ میں بالاتفاق بچے کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی۔ ہاں البتہ اگر بچہ مرا ہوا پیدا ہو تو اس بارے

❶ صحیح مسلم، بَابُ مَعْنَی کُلِّ مَوْلُودٍ یُولَدُ عَلَی الْفِطْرَةِ وَحُکْمِ مَوْتِ ...الخ، رقم: ۲۶۶۲، سنن النسائی، الصَّلَاةُ عَلَی الصِّبْیَانِ، رقم: ۱۹۴۷

میں اختلاف ہے۔ جمہور علماء کا کہنا ہے اگر پیدائش کے بعد زندگی کی علامتیں ظاہر ہو جائیں تو اس صورت میں اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی ورنہ نہیں۔

علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے ''نیل الاوطار'' میں اسی مذہب کو ترجیح دی ہے اور شیخی المکرّم محدث روپڑی رحمہ اللہ نے بھی فتاویٰ اہل حدیث میں اسی مسلک کو اختیار کیا ہے۔اس بارے میں وارد جملہ احادیث ضعیف ہیں۔ تاہم ان کے طرق کو جمع کرکے استناد لینے کی سعی کی گئی ہے۔

اہل علم کا دوسرا گروہ اس بات کا قائل ہے کہ بچے میں جب روح پھونکی جا چکی ہو اور وہ مردہ پیدا ہو۔اس کے باوجود اس کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے اس مسلک کو امام احمد اور اسحاق بن راہویہ اور امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ صاحب المنتقی نے اختیار کیا ہے۔ محقق العصر شیخ ابن باز رحمہ اللہ بھی تعلیقات فتح الباری میں اسی بات کے قائل ہیں۔ محقق اور مؤید بالدلائل یہی مسلک معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ : وَالسِّقْطُ یُصَلّٰی عَلَیْهِ، وَیُدْعٰی لِوَالِدَیْهِ بِالْمَغْفِرَةِ وَالرَّحْمَةِ » [1]

''یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کچا بچہ جو پورے دنوں سے پہلے گر جائے اس پر نمازِ جنازہ پڑھی جائے اور اس کے والدین کے لیے بخشش ورحمت کی دعا کی جائے۔''

شیخ ابن باز رحمہ اللہ نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے جب کہ علامہ البانی نے ''ارواء الغلیل'' میں اس پر صحت کا حکم لگایا ہے۔ اور امام ترمذی فرماتے ہیں: « حَدِیْثٌ حَسَنٌ صَحِیْحٌ .»

اور ''حاکم'' کا کہنا ہے: « صَحِیْحٌ عَلٰی شَرْطِ الْبُخَارِیِّ » اور امام ذہبی نے اس کی موافقت کی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ ایک مسلمان کی میت ہے دیگر مسلمانوں کی طرح اس کی نمازِ جنازہ بھی مشروع ہونی چاہیے۔ تفریق کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔ یہ بھی یاد رہے کہ بچے کے کان میں اذان کا دیا جانا جنازہ کے لیے شرط نہیں ہے۔ (هٰذَا مَا عِنْدِیْ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.)

چار ماہ بعد حمل ساقط ہو جائے تو کیا اس کی نمازِ جنازہ پڑھنی چاہیے؟

سوال : چار ماہ پورے ہونے کے بعد اگر حمل ساقط ہو جائے تو کیا اس کی نمازِ جنازہ پڑھنی چاہیے؟ کیونکہ چار ماہ پورے ہونے کے بعد روح ڈال دی جاتی ہے۔ (شیخ عبداللہ۔ سنت نگر، لاہور) (۱۷ مئی ۲۰۰۲ء)

جواب : مسئلہ ہذا میں اختلاف ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ ایسی صورت میں نمازِ جنازہ پڑھنی چاہیے چنانچہ ''مسند احمد'' میں

[1] مسند احمد، رقم: ۱۸۱۷٤، سنده حسن۔ سنن ابیداؤد، بَابُ الْمَشْیِ أَمَامَ الْجَنَازَةِ، رقم: ۳۱۸۰

بسند حسن حدیث میں ہے: «اَلسِّقْطُ يُصَلّٰى عَلَيْهِ.» ''اسقاط والے بچے کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی۔''

دوسری بات یہ ہے کہ یہ مسلمان کی میت ہے۔ شیخ ابن باز رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«اَلْقَوْلُ بِعَدَمِ الصَّلَاةِ عَلَى السِّقْطِ ضَعِيْفٌ وَالصَّوَابُ شَرِعِيَة الصَّلَاة عَلَيْهِ اِذَا سقط بعد نَفخِ رُوْحٍ فِيْهِ وَ كَانَ مَحْكُوْمًا بِاِسْلَامِه لأنه مَيِّتٌ مُسْلِمٌ فَشُرِعَتِ الصَّلَاةُ عَلَيْهِ كَسَائِرِ مَوْتَى الْمُسْلِمِيْنَ.» (حاشیه فتح الباری:۳/۲۰۱)

''مولود قبل از وقت کی نمازِ جنازہ پڑھنے کا قول ضعیف ہے۔ درست بات یہ ہے کہ اس کی نمازِ جنازہ پڑھنا مشروع ہے۔ جب کہ وہ روح پھونکے جانے کے بعد پیدا ہوا ہے، وہ مسلمانوں کے ہاں مسلمان ہی پیدا ہوا ہے۔ لہٰذا دوسری مسلمان میتوں کی طرح اس پر بھی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی۔''

نمازِ جنازہ میں امیر اور غریب میں فرق کرنا

سوال: نمازِ جنازہ غائبانہ جمعہ کی نماز کے بعد ادا کی جاتی ہے لیکن عام اہل حدیث کی نہیں بلکہ خطیب، امیر، یا شوریٰ کے اراکین کے رشتہ داروں کی اور باقی کو کہتے ہیں کہ دعا کر لیتے ہیں۔ یہ فرق جائز یا ناجائز؟

(سائل: محمد عبدالکبیر) (۹ دسمبر ۱۹۹۴ء)

جواب: اصل یہ ہے کہ فوت شدہ سب حضرات کے لیے دعائے مغفرت کی جائے۔ غائبانہ جنازہ کا صرف جواز ہے اگر کوئی اس پر عمل کرنا چاہے تو پھر بلا امتیاز سب سے مساوی سلوک ہونا چاہیے کیونکہ دین اسلام مساوات کا درس دیتا ہے۔

عوام الناس میں مقبول سماجی و سیاسی شخصیت کے کسی عزیز کی فوتگی پر جنازہ میں شرکت

سوال: کچھ لوگ ایسے معروف ہوتے ہیں کہ سیاسی، سماجی حیثیت میں بہت مقبول ہوتے ہیں، ہر مسلک کے لوگوں سے ان کے تعلقات استوار ہوتے ہیں، ان کا کوئی عزیز مر جائے تو بلا تمیز مسلک وعقیدہ لوگ اس جنازہ میں صرف تعلقات نبھانے کی خاطر چلے جاتے ہیں اس طرح کے جنازے میں اہل علم وشعور کو شامل ہونا چاہیے یا نہیں؟

(عبدالرزاق اختر۔ رحیم یار خان) (۸ جون ۲۰۰۱ء)

جواب: امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرے تو شرکت میں کوئی حرج نہیں۔ بشرطیکہ بذاتِ خود ان کی شرکیات اور بدعات سے اجتناب کرے۔ اگر دینی فرض ادا نہیں کر سکتا تو پھر شریک نہیں ہونا چاہیے۔

کسی میت پر متعدد بار جنازہ پڑھنا

سوال: ایک عورت اپنے والدین کے ہاں ملتان میں فوت ہوگئی۔ جب کہ وہ قصور رہتی تھی۔ جب اس کے گھر والے اس کی نعش لینے گئے تو انھوں نے اس کا جنازہ وہیں پڑھ لیا۔ جب وہ اپنے گاؤں قصور میں آئے تو چند لوگوں نے دوبارہ

نمازِ جنازہ پڑھانے کے لیے کہا تو گاؤں کے بعض لوگوں نے اختلاف کیا۔ ایک حنفی مولوی صاحب سے یہ سوال پوچھا گیا تو انھوں نے جنازہ نہ پڑھانے کا فتویٰ دیا۔ چند اہل حدیث افراد کے اصرار کے باوجود انھوں نے جنازہ نہیں پڑھایا۔ مہربانی فرما کر قرآن و حدیث کی روشنی میں ہمیں آگاہ کریں۔ (سائل) (۱۶ جون ۲۰۰۰ء)

جواب: متعدد بار جنازہ پڑھنا جائز ہے۔ ''صحیح بخاری'' اور مسلم میں حدیث ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ایک میت کی قبر کے پاس سے ہوا۔ جسے رات ہی دفن کیا گیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دریافت کرنے پر صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا آج رات ہی فوت ہوئی ہے۔ فرمایا: مجھے کیوں نہ خبر دی؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا ہم نے اسے اندھیرے میں ہی دفن کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جگانا مناسب نہ سمجھا۔ پس آپ کھڑے ہوئے اور ہم نے بھی آپ کے پیچھے صف باندھی اس پر نمازِ جنازہ پڑھی۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے، ایک حبشی یا جوان مرد جو مسجد میں جھاڑو دیتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے نہ دیکھ کر اس کی بابت پوچھا۔ لوگوں نے کہا وہ مر گیا ہے۔ فرمایا: مجھے تم نے خبر کیوں نہ دی؟ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں لوگوں نے گویا اس کا معاملہ چھوٹا سمجھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے اس کی قبر بتاؤ۔ انھوں نے قبر بتائی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر پر جا کر نمازِ جنازہ ادا کی۔ پھر فرمایا: قبریں اندھیرے سے بھری ہوتی ہیں۔ میرے نمازِ جنازہ پڑھنے سے اللہ ان کو روشن کر دیتا ہے۔

یہ الفاظ ''مسلم'' کے ہیں: «بَابُ السِّرِ بِالْجَنَازَةِ»[1] جب قبر پر نمازِ جنازہ پڑھنا ثابت ہو گیا تو میت کے قبر سے باہر ہونے کی صورت میں دوبارہ جنازے کے جواز میں کیا شک رہ جاتا ہے؟ نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک ایسے شخص کی نمازِ جنازہ پڑھی جس پر پہلے نمازِ جنازہ پڑھی جا چکی تھی۔[2]

بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ دوبارہ جنازہ پڑھنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ ہے کیونکہ الفاظِ حدیث ہیں: ''فرمایا: میرے جنازہ پڑھنے کی وجہ سے اللہ ان کی قبریں منور کر دیتا ہے۔'' مگر یہ بات درست نہیں۔ یہ تو ایسا ہے، جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس میت پر چالیس اہل توحید جنازہ پڑھیں اللہ تعالیٰ ان کی سفارش قبول فرمالیتا ہے۔''[3]

کیا اس کا مفہوم یہ ہے کہ چالیس سے کم افراد جنازہ نہ پڑھیں۔ نیز زکوٰۃ کے بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:
﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً ''ان کے مالوں سے صدقہ لے۔'' تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ﴾ (التوبۃ:۱۰۳) ''تاکہ انکے صدقہ کے ذریعے تو ان کا ظاہر و باطن پاک کرے، اور ان کے لیے دعا کر، بے شک تیری دعا ان کے لیے تسلی ہے۔''

تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ لینا آپ ہی کا خاصہ ہے؟ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اُمت کے لیے باعثِ تسلی ہے۔ کسی دوسرے کی نہیں؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں جو لوگ منکر زکوٰۃ ہوئے۔ انھوں نے اسی آیت سے استدلال

[1] صحيح مسلم: ٩٥٦۔ صحيح بخاري: ٤٥٨. [2] كنز العمال: ١/ ٥٢٨ [3] سنن ابي داؤد: ٣١٧٢.

کیا کہ زکوۃ وصول کرنا صرف نبی ﷺ کا کام تھا۔ لہٰذا اب ہم ابوبکر رضی اللہ عنہ کو زکوۃ ادا نہیں کریں گے۔ اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے لڑائی کے لیے تلوار اٹھائی۔

بہرصورت اس قسم کے دلائل سے خاصہ ثابت نہیں ہوا کرتا۔ بلکہ کوئی واضح دلیل ہونی چاہیے۔ جو یہاں موجود نہیں۔ اس بناء پر علامہ زیلعی حنفی ''نصب الرایۃ'' (۱/ ۳۶۵) میں فرماتے ہیں۔ بعض علماء نے قبر پر نماز کو آنحضرت ﷺ کا خاصہ قرار دیا ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں کیونکہ حدیث میں ہے کہ آپ کے پیچھے لوگ صف باندھ کر کھڑے ہوگئے۔ لہٰذا اگر آپ ﷺ کا خاصا ہوتا تو آپ منع فرما دیتے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«اِنَّ الْاِخْتِصَاصَ لَا تَثْبُتُ اِلَّا بِدَلِیْل.»

''کہ کسی چیز کا خاصہ ہونا دلیل کے بغیر ثابت نہیں ہوسکتا۔''

گو بعض علمائے حنفیہ اور مالکیہ نے اسے اختصاص پر محمول کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر یہ بلا دلیل ہے۔

''فلاں میرے جنازے میں شریک نہ ہو'' وصیت کا کیا حکم ہے؟

سوال: سوال کا پس منظر: ہماری فیملی میں دو گروپ ہیں۔ دونوں ہم عقیدہ ہیں۔ ان دونوں میں بڑھتی ہوئی رنجش ہے۔ ان میں سے ایک بزرگ اپنی اولاد اور متاثرین سے کہتے ہیں۔ مرجاؤں تو فلاں شخص (جس کا تعلق مخالف گروہ سے ہے) نہ میرا جنازہ پڑھے، پڑھائے اور نہ جنازہ کے ساتھ آئے۔

سوال یہ ہے کہ آیا ایسی وصیت کرنا شرعاً درست ہے اور اس پر عمل کرنا ضروری ہوگا۔ جب کہ اس کے بہت گھناؤنے اثرات کا ظہور بہت مخدوش بلکہ یقینی ہے۔

نوٹ: یہ بھی وضاحت کردینی ضروری ہے کہ ان بزرگ کی اولاد میں سے بعض کہتے ہیں کہ یہ منکر وصیت ہے کیونکہ اس سے خاندان مزید ابتری کی طرف مائل ہوگا اور اصلاح کی ممکنہ صورتیں معدوم ہو جائیں گی اور یہ کہ کسی کو ایسی وصیت کرنی ہی نہیں چاہیے جس سے (بعد میں) لواحقین فتنہ کا شکار ہوں بلکہ بعد کی باتیں بعد والوں پر چھوڑ دینی چاہئیں تاکہ وہ وقت کی مناسبت اور نزاکت کو دیکھ کر معقول فیصلہ کر کے الجھاؤ سے بچ سکیں۔

موت کا وقت معلوم نہیں لہٰذا استدعاء ہے کہ فی الفور اس کا جواب مع شرعی دلائل الاعتصام میں شائع فرما کر مشکور فرمائیں۔ (ایک سائل۔ لاہور) (۳۰ اکتوبر ۱۹۹۲ء)

جواب: کسی بھی مسلم کے جنازہ میں شرکت چونکہ امورِ خیر میں سے ہے اس کے حصول کی شریعت نے متعدد نصوص میں تحضیض وترغیب دلائی ہے کہ اس کارِ خیر کا فاعل اتنے اتنے اجر وثواب کا مستحق ہوگا چونکہ یہ استحقاق بندہ کو اللہ کی طرف سے تفویض کردہ ہے۔ لہٰذا دنیاوی کدورتوں ونزاعات کی بناء پر اس میں کسی کو رکاوٹ بننے کا کوئی اختیار نہیں۔ موصی کی اس قسم کی وصیت کہ فلاں اور فلاں میرے جنازہ میں شریک نہ ہوں، ناقابل عمل اور اپنے اختیارات کی حدود سے تجاوز

کرنا ہے۔قرآن مجید میں ہے:

﴿فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾
(البقرة: ١٨٢)

''اگر کسی کو وصیت کرنے والے کی طرف سے (کسی وارث کی) طرفداری یا حق تلفی کا اندیشہ ہو تو اگر وہ (وصیت کو بدل کر) وارثوں میں صلح کرادے تو اس پر کچھ گناہ نہیں بے شک اللہ بخشنے والا (اور) رحم والا ہے۔''

لہٰذ جملہ ورثاء اور عام مسلمان بلاتر دد مرحوم کی نمازِ جنازہ میں شرکت کے حقدار ہیں۔

خوشی میں شریک نہ کرنے والے کی غمی میں شرکت

سوال: ایک دین دار شخص کو اُس کے رشتہ دار اپنی خوشیوں کی تقریبات میں اس لیے مدعو نہیں کرتے کہ اُن کی لغویات میں رکاوٹ ہوگی۔کیا اس دین دار شخص کو اپنے اُن رشتہ داروں کی غمیوں میں شامل ہونا چاہیے یا احتجاجاً نہ جائے کہ تمہیں خوشی میں اللہ یاد نہیں تھا اب غم میں کیوں فریاد کرتے ہو؟

(عبدالرزاق اختر، محمدی چوک، حبیب کالونی گلی نمبر١٢، رحیم یار خان) (مارچ ٢٠٠٥)

جواب: رشتہ داروں کی غمیوں میں شرکت کر کے ان کو وعظ و نصیحت کرنی چاہیے، اس طرح اصلاح کی صورت ہوسکتی ہے۔وَ مَاذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ.

مرزائی کی نمازِ جنازہ اور مسلم قبرستان میں دفن کا مسئلہ

سوال: ایک آدمی مرزائی مر گیا اور اسی حالت میں فوت ہوگیا۔بعض مسلمانوں نے اس کے جنازہ میں شرکت بھی کی اور اسے دفن بھی مسلمانوں کے قبرستان میں ہی کیا گیا۔

اس کے جنازہ میں شریک ہونے والے مسلمانوں کے بارے میں کیا حکم ہے اور کیا اسے مسلمانوں کے قبرستان میں ہی دفن رہنے دیا جائے یا اُسے نکال کر دوسرے قبرستان میں دفن کیا جائے؟ (عبیدالسلام۔سرگودھا) (٨مئی ١٩٩٢ء)

جواب: مرزائی بلاشبہ کافر ہیں۔ان سے مسلمانوں جیسا تعلق قائم کرنا بھی حرام ہے۔قرآن مجید میں ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ ﴾ (الممتحنة:١)

''مومنو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ۔تم تو ان کو دوستی کے پیغام بھیجتے ہو۔اور وہ (دین) حق سے جو تمہارے پاس آیا ہے، منکر ہیں۔''

لہٰذا جن مسلمانوں نے ایک مرزائی کے جنازہ میں شرکت کی وہ شدید ترین کبیرہ گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں۔انھیں

فوراً اپنے جرم پر نادم ہو کر رب کے حضور توبہ نصوحہ کرنی چاہیے۔ بصورتِ دیگر عقابِ الٰہی کے لیے تیار رہنا ہوگا۔ حدیث میں ہے: « اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ » ❶

''یعنی آدمی روزِ جزا اس کے ساتھ ہوگا جس سے اُسے پیار ہوگا۔''

مرزائیوں کے بارے میں نرم گوشہ اختیار کرکے ان کے جنازہ میں شرکت کرنا بھی محبت ہی کی ایک شکل ہے۔ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا۔ نیز مذکور شخص کی لاش کو مسلم قبرستان سے نکال کر اس کے مناسب حال جگہ میں دفن کردیا جائے۔ بسلسلۂ زیارتِ قبور دعاؤں میں مقابر کی اضافت صرف مسلمانوں کی طرف کرنا، اس امر کی واضح دلیل ہے۔ بعض الفاظِ نبوی ﷺ ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ «اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ دَارَ قَوْمٍ مُؤْمِنِيْنَ»۔ ❷

۲۔ «اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ» ❸

نیز شریعتِ اسلامی میں اموات مسلمین کی زیارت کا حکم ہے۔ جب کہ مشرکین کی قبور کے پاس کھڑا ہونے سے منع کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ﴾ (التوبة : ٨٤)

اور بعض روایات میں مشرکوں کی قبروں سے تیزی کے ساتھ گزر جانے کا امر بھی ہے۔ ''صحیح'' کے باب «بَابُ مَا جَاءَ فِي قَبْرِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَأَبِي بَكْرٍ، وَعُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا.» میں ہے:

« فَقُلْ : يَسْتَأْذِنُ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ، فَإِنْ أَذِنَتْ لِي فَأَدْخِلُونِي، وَإِنْ رَدَّتْنِي رُدُّونِي إِلَى مَقَابِرِ الْمُسْلِمِينَ ۔ انتهى »

علامہ عظیم آبادی فرماتے ہیں:

''اس روایت سے مقابر مسلمین کا علیحدہ ہونا ثابت ہوا۔ (فتاویٰ، ص:۱۳۲)

مزید آنکہ امت مسلمہ کا تعامل بھی اس بات کا مؤید ہے کہ ہمیشہ مسلمانوں کے قبرستان غیر مسلموں سے علیحدہ رہے ہیں۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو فتاویٰ شمس الحق عظیم آباد، ص: ۱۳۰ تا ۱۳۲)

---

❶ صحيح البخاري، بَابُ عَلَامَةِ حُبِّ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ، رقم:٦١٦٨

❷ صحيح مسلم، بَابُ اسْتِحْبَابِ إِطَالَةِ الْغُرَّةِ وَالتَّحْجِيلِ فِي الْوُضُوءِ، رقم:٢٤٩، سنن النسائي، اَلْأَمْرُ بِالِاسْتِغْفَارِ لِلْمُؤْمِنِينَ، رقم:٢٠٣٩

❸ صحيح مسلم(٧/ ٤٤)، بَابُ مَا يُقَالُ عِنْدَ دُخُولِ الْقُبُورِ وَالدُّعَاءِ لِأَهْلِهَا، رقم: ٩٧٤، سنن النسائي (٤/ ٩٢-٩٣)، اَلْأَمْرُ بِالِاسْتِغْفَارِ لِلْمُؤْمِنِينَ، رقم: ٢٠٣٧

(نمازِ جنازہ کہاں پڑھی جائے؟)

مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھی جا سکتی ہے؟

سوال: کیا مسجد میں نمازِ جنازہ پڑھی جا سکتی ہے؟ جواب: مطلقاً مکروہ ہے بعذر بارش مکروہ نہیں اور شارعِ عام اور دوسرے کی زمین پر بھی مکروہ ہے۔ (شامی کبیری)

جواب: نمازِ جنازہ مسجد میں پڑھی جا سکتی ہے۔ صحیح مسلم میں اس امر کی تصریح موجود ہے۔ [1] حنفی مفتی کا فتویٰ محل نظر ہے۔

میت کا جنازہ مسجد میں یا قبرستان میں

سوال: میت کا جنازہ مسجد میں ادا کیا جائے یا قبرستان میں، ان دونوں میں جو افضل ہو وہ تحریر کر دیں اور ساتھ ہی نبی پاک ﷺ کا عمل بھی اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا عمل بھی۔ (محمد نصر اللہ گوندلانوالہ، تحصیل وضلع گوجرانوالہ) (۶ نومبر ۱۹۹۲ء)

جواب: مسجد میں جنازہ پڑھنا جائز ہے۔ جس طرح کہ احادیث میں مصرح ہے لیکن عام معمول چونکہ نبی ﷺ کا جناز گاہ میں جنازہ پڑھنا تھا۔ لہٰذا افضل یہ ہے کہ باہر پڑھا جائے۔

کیا مسجد میں جنازہ پڑھنا جائز ہے؟

سوال: بہشتی زیور میں لکھا ہے کہ مسجد میں جنازہ پڑھنا مکروہ ہے، کیا یہ درست ہے کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔ (محمد اسحاق ضلع قصور) (۱۹ نومبر ۱۹۹۳ء)

جواب: مسجد کے اندر جنازہ پڑھنا جائز ہے اگرچہ نبی اکرم ﷺ کا غالب معمول یہ تھا کہ آپ جناز گاہ میں جنازہ ادا کرتے تھے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی ''صحیح'' میں بایں الفاظ تبویب قائم کی ہے:

« بَابُ الصَّلَاةِ عَلَى الْجَنَائِزِ بِالْمُصَلَّى وَالْمَسْجِدِ.»

''جناز گاہ اور مسجد میں جنازہ پڑھنے کا بیان۔''

پھر کئی احادیث سے اس کے اثبات کی سعی فرمائی ہے۔

اس بارے میں سب سے واضح دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے، فرمایا:

« وَاللهِ، لَقَدْ صَلَّى رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى ابْنَيْ بَيْضَاءَ فِي الْمَسْجِدِ سُهَيْلٍ وَأَخِيهِ.» [2]

---

[1] صحیح مسلم، بَابُ الصَّلَاةِ عَلَى الْجَنَازَةِ فِي الْمَسْجِدِ، رقم:۹۷۳

[2] صحیح مسلم، بَابُ الصَّلَاةِ عَلَى الْجَنَازَةِ فِي الْمَسْجِدِ، رقم:۹۷۳

''یعنی اللہ کی قسم رسول اللہ ﷺ نے بیضاء کے دونوں بیٹے سہیل اور اس کے بھائی کا جنازہ مسجد میں پڑھا تھا۔''

زیر حدیث امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَفِي هٰذَا الْحَدِيثِ دَلِيلٌ لِلشَّافِعِيِّ وَالْأَكْثَرِينَ فِي جَوَازِ الصَّلَاةِ عَلَى الْمَيِّتِ فِي الْمَسْجِدِ وممن قال به أحمد واسحاق .»

یعنی ''اس حدیث میں شافعی رحمہ اللہ اور اکثر اہل علم کی دلیل ہے کہ مسجد میں جنازہ پڑھنا جائز ہے اور جولوگ اس بات کے قائل ہیں ان میں سے امام احمد رحمہ اللہ اور اسحاق رحمہ اللہ بھی ہیں۔''

اسی طرح حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ابن ابی شیبہ سے بیان فرمایا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا جنازہ مسجد میں پڑھا تھا اور صہیب رضی اللہ عنہ نے عمر رضی اللہ عنہ کا جنازہ مسجد میں پڑھا اور ''ابن ابی شیبہ'' کی روایت میں یہ زیادتی بھی موجود ہے:

« وَوُضِعَتِ الْجِنَازَةُ فِي الْمَسْجِدِ تُجَاهَ الْمِنْبَرِ .»

یعنی ''جنازہ منبر کے سامنے مسجد میں رکھا گیا۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَهٰذَا يَقْتَضِي الْإِجْمَاع على جَوَاز ذٰلِك .» ❶

''یعنی امر ہٰذا اس بات کا متقاضی ہے کہ مسجد میں جنازہ کے جواز پر صحابہ کا اجماع تھا۔''

اور ابن قدامہ نے کہا:

« كَانَ هٰذَا بِمَحْضَرٍ مِنَ الصَّحَابَةِ فَلَمْ يُنْكَر فَكَانَ اِجْمَاعًا .»

اور جو لوگ عدمِ جواز کے قائل ہیں ان میں سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ بھی ہیں۔ ان کا استدلال ''سنن ابی داؤد'' کی ایک روایت سے ہے:

« مَنْ صَلَّى عَلَى جَنَازَةٍ فِي الْمَسْجِدِ، فَلَا شَيْءَ عَلَيْهِ (لَهُ) .» ❷

''یعنی جس نے مسجد میں جنازہ پڑھا اس کے لیے کوئی اجر وثواب نہیں۔''

اہل علم نے اس حدیث کے مختلف جوابات دیے ہیں۔

۱۔ یہ حدیث ضعیف ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« هٰذَا حَدِيْثٌ ضَعِيْفٌ تَفَرَّدَ بِهٖ صَالِحٌ مَوْلَى التَّوأَمَة »

❶ فتح الباری:۳/ ۱۹۹

❷ سنن ابی داؤد، بَابُ الصَّلَاةِ عَلَى الْجَنَازَةِ فِي الْمَسْجِدِ، رقم:۳۱۹۱

۲۔ ابوداؤد کے محقق اور مشہور و مسموع نسخوں میں یہ الفاظ یوں ہیں:

« وَ مَنْ صَلَّى عَلٰى جَنَازَةٍ فِي الْمَسْجِدِ فَلَا شَيْءَ عَلَيْهِ . » ❶

''یعنی جس نے مسجد میں جنازہ پڑھا اس پر کوئی شئے نہیں۔'' یعنی گناہ وغیرہ۔ تو اس صورت میں یہ حدیث ان لوگوں کی دلیل ہی نہیں بنتی بلکہ جواز ہی کی دلیل بنے گی۔

۳۔ اگر یہ حدیث ثابت ہو جائے تو اس کی تاویل فَلَا شَيْءَ لَهُ بمعنی فَلَا شَيْءَ عَلَيْهِ بمعنی ضروری ہے تا کہ مختلف احادیث کو جمع کیا جا سکے۔ اور قرآن میں بھی لَهُ بمعنی عَلَيْهِ وارد ہے۔ فرمایا:

﴿وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا﴾ (الإسراء:٧)

۴۔ یہ حدیث کمیٔ اجر پر محمول ہے یعنی کوئی مجرد جنازہ پڑھ کر واپس آ گیا قبرستان تک نہیں گیا تو اس سے اجر کم ہو جاتا ہے۔

علامہ ملا علی قاری حنفی نے کہا یہ بات زیادہ واضح ہے کہ اس حدیث کو نفی کمال پر محمول کیا جائے۔

ان دلائل سے معلوم ہوا کہ مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم کا ''بہشتی زیور'' میں جنازہ کو مسجد میں مکروہ قرار دینا مرجوح اور نا قابلِ التفات مسلک ہے۔ علامہ مبارکپوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَالْحَقُّ أَنَّهُ يَجُوْزُ الصَّلَاةُ عَلَى الْجَنَائِزِ فِي الْمَسْجِدِ مِنْ غَيْرِ كَرَاهَةٍ ، وَالْأَفْضَلُ الصَّلَاةُ عَلَيْهَا خَارِجَ الْمَسْجِدِ ؛ لِأَنَّ أَكْثَرَ صَلَاتِهِ ـ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ـ عَلَى الْجَنَائِزِ كَانَ فِي الْمُصَلَّى . » ❷

یعنی حق بات یہ ہے کہ بلا کراہت نمازِ جنازہ مسجد میں جائز ہے البتہ افضل یہ ہے کہ مسجد سے باہر ہو کیونکہ زیادہ جنازے آپ ﷺ جنازگاہ میں پڑھتے تھے۔''

قبروں کے درمیان جنازہ پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

سوال: آج ایک جنازے میں شریک ہوئے۔ جہاں قبرستان میں دفن سے قبل جنازہ رکھ کر نمازِ جنازہ ادا کی گئی اور صفیں قبروں کو درمیان میں لے کر بنائی گئیں۔ کیا یہ عمل جائز ہے؟ (عبدالکبیر گزدر عفی عنہ) (۱۹ ستمبر ۱۹۹۷ء)

جواب: قبروں کے درمیان نمازِ جنازہ پڑھنی منع ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

❶ سابقہ حوالہ۔

❷ مرعاة المفاتيح : ٥/ ٣٧٤

«أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: نَهَى أَنْ يُصَلَّى عَلَى الْجَنَائِزِ بَيْنَ الْقُبُورِ.» ❶

''نبی ﷺ نے قبروں کے درمیان جنازہ پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔''

دوسری روایت میں ہے: قبرستان اور حمام کے علاوہ تمام زمین مسجد ہے۔''

اور تیسری روایت میں ہے:

«اجْعَلُوا فِي بُيُوتِكُمْ مِنْ صَلَاتِكُمْ وَلَا تَتَّخِذُوهَا قُبُورًا.» ❷

قبر یا اس کے قریب نمازِ جنازہ پڑھنا

سوال: حضرت حافظ صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

جنازہ پڑھاتے وقت صف لمبی ہونے کی صورت میں سامنے آٹھ دس فٹ دور اگر قبریں ہوں تو کیا نمازِ جنازہ پڑھی جاسکتی ہے؟ ایک عالم فرمارہے تھے کہ نماز نہ پڑھی جائے۔ جواب کے طور پر ہم نے وہ حدیث پیش کی، جس میں آپ نے اس خادمہ کی قبر پر جا کر نماز پڑھی جو مسجد نبوی میں جھاڑو دیا کرتی تھی، تو وہ فرمانے لگے کہ فقہاء کے نزدیک یہ نبی ﷺ کا خاصہ ہے لہٰذا ہم نہیں پڑھ سکتے۔ آپ اس کے متعلق قرآن وسنت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں۔ (سائل: ابوطلحہ محمد خالد عزیز) (۹ فروری ۲۰۰۱ء)

جواب: مشارٌ الیہ حدیث کو آپ کا بطورِ دلیل پیش کرنا درست ہے، اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ بعض فقہائے حنفیہ اور مالکیہ نے اس واقعے کو نبی علیہ السلام کا خاصہ قرار دیا ہے چنانچہ علامہ علی القاری ''شرح مشکوٰۃ'' میں لکھتے ہیں کہ زیادہ درست یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسول اکرم ﷺ کے ساتھ خاص تھا اور دوسروں نے آپ کے بالتبع نماز پڑھی ہے اور یا ان لوگوں نے پڑھی جو پہلے نماز میں شامل نہیں ہو سکے تھے۔

امام شوکانی رحمہ اللہ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ ہم متعدد مرتبہ بیان کر چکے ہیں کہ رسولِ کریم ﷺ کے ساتھ کسی امر کا خاص ہونا بغیر دلیل کے ثابت نہیں ہوسکتا اور آپ کے اس فرمان سے کہ ''اللہ تعالیٰ میری نماز (جنازہ پڑھنے) سے قبر کو روشن کر دیتا ہے۔'' قبر پر نمازِ جنازہ کی مشروعیت کی نفی نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح امام زیلعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بعض علماء نے قبر پر نماز کو آپ کا خاصہ قرار دیا ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے پیچھے لوگ صف باندھ کر کھڑے ہو گئے لہٰذا اگر آپ کا خاصہ ہوتا تو آپ منع فرما دیتے۔

علاوہ ازیں امام بیہقی رحمہ اللہ نے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ غالب گمان یہ ہے کہ یہ زائد الفاظ

❶ رواه الطبراني في الاوسط، برقم: ٥٦٣١ واسناده حسن۔ (مجمع الزوائد: ٣/ ٣٦، بَابُ الصَّلَاةِ عَلَى الْجِنَازَةِ بَيْنَ الْقُبُورِ، رقم: ٤١٨٧

❷ صحيح البخاري، بَابُ كَرَاهِيَةِ الصَّلَاةِ فِي الْمَقَابِرِ، رقم: ٤٣٢

(کہ میری نماز سے اللہ قبر روشن کر دیتا ہے) ثابت کی مراسیل سے ہے؟ ''جب مسلمان کے جنازے میں چالیس آدمی توحید والے شریک ہو جائیں اللہ ان کی سفارش اس کے حق میں قبول کرے گا۔''❶

تو کیا اس حدیث کا یہ مطلب ہے کہ چالیس سے کم لوگ جنازہ نہ پڑھیں؟ نیز زکوٰۃ کے بارے میں قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ﴾ (التوبة:١٠٣)

''ان کے مالوں سے صدقہ لو، اس (صدقہ) کے ذریعے تو ان کا ظاہر و باطن پاک کرو اور ان کے لیے دعا کرو، بے شک تیری دعا ان کے لیے تسلی ہے۔''

تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ لینا، آپ کا ہی خاصہ ہے، کیونکہ آپ کی دعا ان کے لیے تسلی ہے، کسی اور کی نہیں سیدنا ابوبکر کی خلافت میں جو لوگ زکوٰۃ کے منکر ہو گئے تھے، انھوں نے بھی یہی آیت پیش کر کے کہا تھا کہ زکوٰۃ کا حکم رسول اللہ ﷺ کی حیات تک تھا، اب نہیں، اس پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تلوار اٹھائی۔ سو اس قسم کے دلائل سے خاصہ ثابت نہیں ہو سکتا، بلکہ کوئی واضح دلیل چاہیے، جس میں خاصہ ہونے کا ذکر ہو۔ پھر رسول اللہ ﷺ کے پیچھے صحابہ نے بھی نمازِ جنازہ پڑھی، اس سے بھی تائید ہوتی ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا خاصہ نہیں بلکہ عام ہے۔

(فتاویٰ اہل حدیث:٢/٤٦٢)

(غائبانہ نمازِ جنازہ)

شہید معرکہ کی نمازِ جنازہ

سوال: محترم یہ تین سوالات درپیش ہیں، جو صحیح تحقیق نہ ہونے کی وجہ سے میرے لیے بہت الجھ گئے ہیں، لہٰذا آپ ان کی شرع متین کے حوالے سے دلیل کے ساتھ ہر مسئلے کی صحیح صورت واضح فرمادیں۔

١۔ نبی کریم ﷺ یا خلفائے راشدین میں سے کسی نے شہید معرکہ کا جنازہ پڑھا ہے یا نہیں؟

٢۔ آپ نے اپنے شاگرد عزیز مولانا خالد سیف شہید کا جنازہ نہیں پڑھا تھا، نہ پڑھنے کی کیا وجہ تھی؟

٣۔ کسی کا غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھنے کی کون سی شرائط ہیں؟ نیز کسی شہید کے غائبانہ جنازہ کی اطلاع دینے کے لیے اشتہار چھپوانے، بینرز لگوانے اور وال چاکنگ کرنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

(مبشر علی، نائب خطیب، جامع مسجد ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، لاہور)

❶ صحيح مسلم، بَابُ مَنْ صَلَّى عَلَيْهِ أَرْبَعُونَ شُفِّعُوا فِيهِ، رقم:٩٤٨، سنن أبي داؤد، رقم: ٣١٧٠

جواب: سائل نے جو سوالات کیے ہیں ان کے بارے میں مندرجہ ذیل باتیں زیر غور رہیں تو مسئلہ کھل کر سامنے آجاتا ہے۔

۱۔ شہید معرکہ کی نمازِ جنازہ شریعت میں ہے یا نہیں؟

۲۔ آج کل کشمیر وغیرہ میں شہید ہونے والوں کی غائبانہ نمازِ جنازہ کے جو اعلانات اشتہارات وغیرہ کے ذریعہ سے کیے جاتے ہیں، کیا وہ شریعت کے منافی ہیں؟

۳۔ تحریک مجاہدین اسلام کے امیر مرحوم مولانا خالد سیف شہید کی نمازِ جنازہ کیوں نہ پڑھی گئی صرف دعاء پر اکتفاء کیوں کیا گیا تھا؟

سوال نمبر① کا جواب شہید معرکہ کے بارے میں نمازِ جنازہ اگرچہ اختلافی مسئلہ ہے لیکن اس بارے میں وارد تمام احادیث جمع کر کے دیکھا جائے تو راجح رائے یہی ہے کہ رسولِ کریم ﷺ نے شہید معرکہ کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھی۔ مختصر طور پر احادیث درجہ ذیل ہیں:

عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، قَالَ :كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَجْمَعُ بَيْنَ الرَّجُلَيْنِ مِنْ قَتْلَى أُحُدٍ فِي ثَوْبٍ وَاحِدٍ، ثُمَّ يَقُولُ :أَيُّهُمْ أَكْثَرُ أَخْذًا لِلْقُرْآنِ، فَإِذَا أُشِيرَ لَهُ إِلَى أَحَدِهِمَا قَدَّمَهُ فِي اللَّحْدِ، وَقَالَ :أَنَا شَهِيدٌ عَلَى هَؤُلاَءِ يَوْمَ القِيَامَةِ، وَأَمَرَ بِدَفْنِهِمْ فِي دِمَائِهِمْ، وَلَمْ يُغَسَّلُوا، وَلَمْ يُصَلَّ عَلَيْهِمْ» ❶

’’نبی اکرم ﷺ شہداء احد کی تکفین کے لیے دو دو آدمیوں کو ایک کپڑے میں جمع کرتے تھے پھر پوچھتے کہ ان میں سے کس کو قرآن زیادہ آتا تھا پھر جس کے بارے میں بتایا جاتا، اسے لحد میں آگے رکھتے اور کہتے کہ قیامت کے دن میں ان لوگوں پر گواہ ہوں گا۔ اسی طرح آپ ﷺ نے ان کی تدفین خون میں لتھڑے ہوئے کرنے کا حکم صادر فرمایا، نا انھیں غسل دیا گیا اور نہ ان کی نمازِ جنازہ پڑھی گئی۔‘‘

اس کی تائید حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے بیان سے بھی ہوتی ہے کہ شہداء احد کو بغیر غسل خون میں لتھڑے ہوئے دفن کیا گیا تھا اور ان کی نماز جنازہ نہیں پڑھی گئی تھی۔ (احمد، ابوداود، ترمذی) شہداء احد کے بارے میں نمازِ جنازہ کی عدم ادائیگی پر دلالت کرنے والی احادیث اتنی زیادہ ہیں کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے انھیں متواتر قرار دیا ہے۔ ❷

خلافتِ راشدہ اور بعد کے ادوار میں شہدائے معرکہ کی نمازِ جنازہ کا رواج نہیں ہوا۔ کجا یہ کہ غائبانہ جنازہ ہو۔ امام

❶ فتح الباری، ج:۳، ص:۲۰۹، صحیح البخاری، بَابُ الصَّلاَةِ عَلَى الشَّهِيدِ، رقم: ۱۳۴۳

❷ فتح الباری، ج:۳، ص:۲۱۰، بحوالہ کتاب الام للشافعی

ابن قیم فرماتے ہیں کہ ''رسولِ کریم ﷺ نے احد کے شہداء پر نمازِ جنازہ نہیں پڑھی اور یہ بھی معروف نہیں کہ آپ ﷺ نے دیگر غزوات میں اپنے کسی ساتھی شہید ہونے والے کی نمازِ جنازہ پڑھی ہو۔ اسی طرح بعد ازاں خلفائے راشدین اور ان کے ماتحت حکام کا طرزِ عمل رہا ہے۔'' ❶

حاصل یہ ہے کہ مسلمانوں کو سنت رسول ﷺ اور خلفائے راشدین کو ہی اپنا رواج بنانا چاہیے۔ حنفیہ اور بعض حنابلہ جو شہید معرکہ کی نمازِ جنازہ کی مشروعیت کے قائل ہیں، ان کے دلائل کا جائزہ سطور ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

(۱) عَنْ شَدَّادِ بْنِ الْهَادِ، أَنَّ رَجُلًا مِنَ الْأَعْرَابِ جَاءَ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَآمَنَ بِهِ وَاتَّبَعَهُ، ثُمَّ قَالَ :أُهَاجِرُ مَعَكَ، فَأَوْصَى بِهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْضَ أَصْحَابِهِ، فَلَمَّا كَانَتْ غَزْوَةٌ غَنِمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَبْيًا، فَقَسَمَ وَقَسَمَ لَهُ، فَأَعْطَى أَصْحَابَهُ مَا قَسَمَ لَهُ، وَكَانَ يَرْعَى ظَهْرَهُمْ، فَلَمَّا جَاءَ دَفَعُوهُ إِلَيْهِ، فَقَالَ :مَا هَذَا؟، قَالُوا :قِسْمٌ قَسَمَهُ لَكَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَأَخَذَهُ فَجَاءَ بِهِ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ :مَا هَذَا؟ قَالَ :قَسَمْتُهُ لَكَ، قَالَ :مَا عَلَى هَذَا اتَّبَعْتُكَ، وَلَكِنِّي اتَّبَعْتُكَ عَلَى أَنْ أُرْمَى إِلَى هَاهُنَا، وَأَشَارَ إِلَى حَلْقِهِ بِسَهْمٍ، فَأَمُوتَ فَأَدْخُلَ الْجَنَّةَ فَقَالَ :إِنْ تَصْدُقِ اللَّهَ يَصْدُقْكَ، فَلَبِثُوا قَلِيلًا ثُمَّ نَهَضُوا فِي قِتَالِ الْعَدُوِّ، فَأُتِيَ بِهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُحْمَلُ قَدْ أَصَابَهُ سَهْمٌ حَيْثُ أَشَارَ، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :أَهُوَ هُوَ؟ قَالُوا :نَعَمْ، قَالَ :صَدَقَ اللَّهَ فَصَدَقَهُ، ثُمَّ كَفَّنَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي جُبَّةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، ثُمَّ قَدَّمَهُ فَصَلَّى عَلَيْهِ، فَكَانَ فِيمَا ظَهَرَ مِنْ صَلَاتِهِ :اللَّهُمَّ هَذَا عَبْدُكَ خَرَجَ مُهَاجِرًا فِي سَبِيلِكَ فَقُتِلَ شَهِيدًا أَنَا شَهِيدٌ عَلَى ذَلِكَ.» ❷

''شداد بن ہاد سے روایت ہے کہ ایک دیہاتی آدمی نبی اکرم ﷺ کے پاس حاضر ہو کر ایمان لایا اور آپ ﷺ کا پیروکار بن گیا، پھر کہا کہ میں آپ ﷺ کے ساتھ ہجرت کرتا ہوں۔ آپ ﷺ نے اس کے بارے میں دھیان رکھنے کا ارشاد فرمایا پھر جب وہ معرکہ پیش آیا جس میں نبی اکرم ﷺ کو مالِ غنیمت حاصل ہوا تو آپ ﷺ نے اس کا حصہ اس کے ساتھیوں کے ہاتھ دیا، کیونکہ وہ ان کے جانور چرایا کرتا تھا جب صحابہ اسے غنیمت میں حصہ دینے کے لیے آئے تو اس نے پوچھا یہ کیسا مال ہے؟ انھوں نے جواب دیا

❶ زاد المعاد، ج:۲، ص:۹۸

❷ سنن النسائی، الصَّلَاةُ عَلَى الشُّهَدَاءِ، رقم:۱۹۵۳ (مترجم، ج:۱، ص:۲۲۳۔۲۲۴

کہ نبی اکرم ﷺ نے تجھے بھی مالِ غنیمت سے حصہ دیا ہے۔ چنانچہ وہ اسی حصہ کو لیے ہوئے اللہ کے رسول ﷺ کے پاس آیا، کہنے لگا کہ یہ مال کیسا ہے؟ آپ ﷺ نے مالِ غنیمت میں سے حصہ دینے کی بات کہی تو کہنے لگا کہ میں اس بنا پر آپ ﷺ کی پیروی نہیں کر رہا۔ بلکہ میں چاہتا ہوں کہ مجھے حلق میں تیر لگے اور موت آئے تو جنت میں داخل ہو جاؤں، آپ ﷺ نے فرمایا اگر تو اللہ سے مخلص ہے تو اللہ اسے سچ کر دے گا۔ صحابہ تھوڑی دیر ٹھہرے پھر دشمن سے لڑنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے، کچھ دیر بعد اس شخص کو اٹھائے ہوئے نبی اکرم ﷺ کے پاس حاضر ہوئے کہ اسے حلق میں ہی تیر لگا ہوا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا یہ وہی شخص ہے۔ صحابہ نے ہاں میں جواب دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا وہ اللہ سے مخلص تھا اور اللہ نے سچ کر دیا۔ پھر آپ ﷺ نے اسے اپنے چوغے میں کفن دیا اور آگے رکھ کر نمازِ جنازہ پڑھی جس میں یہ الفاظ بھی کہے: اے اللہ یہ تیرا بندہ تیرے رستے میں ہجرت کرتے ہوئے نکلا، پھر شہادت حاصل کی، میں اس پر گواہ ہوں۔"

جواب: امام بیہقی نے صحیح متواتر احادیث کے بالمقابل اس دیہاتی کی نمازِ جنازہ کے بارے میں مروی حدیث کے بارے میں یہ احتمال پیش کیا ہے کہ اس کی وفات معرکہ کے بعد ہوئی تھی، اسی لیے، اس کی نمازِ جنازہ پڑھی گئی۔ [1]

اس کی تائید اس قرینہ سے بھی ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ معرکہ کے بعد مالِ غنیمت بھی تقسیم کر چکے تھے، پھر اس کی شہادت ہوئی ہے۔

«عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ: أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ يَوْمًا، فَصَلَّى عَلَى أَهْلِ أُحُدٍ صَلَاتَهُ عَلَى الْمَيِّتِ، ثُمَّ انْصَرَفَ إِلَى الْمِنْبَرِ، فَقَالَ: إِنِّي فَرَطٌ لَكُمْ، وَأَنَا شَهِيدٌ عَلَيْكُمْ، وَإِنِّي وَاللَّهِ لَأَنْظُرُ إِلَى حَوْضِي الْآنَ، وَإِنِّي أُعْطِيتُ مَفَاتِيحَ خَزَائِنِ الْأَرْضِ .أَوْ مَفَاتِيحَ الْأَرْضِ . وَإِنِّي وَاللَّهِ مَا أَخَافُ عَلَيْكُمْ أَنْ تُشْرِكُوا بَعْدِي، وَلَكِنْ أَخَافُ عَلَيْكُمْ أَنْ تَنَافَسُوا فِيهَا» [2]

"عقبہ بن عامر سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ ایک دن باہر آئے اور آپ نے احد میں شہید ہونے والوں پر وہی نماز پڑھی جو میت پر پڑھی جاتی ہے پھر آپ نے منبر کی طرف رخ کیا...... الخ

یہاں حنفیہ کی رائے کے مطابق اگرچہ ترجمہ "شہداء احد پر نمازِ جنازہ پڑھنے" کا کیا گیا ہے لیکن "صلاۃ علی" کا مفہوم صرف نمازِ جنازہ نہیں ہوتا بلکہ دعاء بھی ہوتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: ﴿ وَصَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلٰوتَكَ

[1] مرعاة، ج:٢، ص:٤٨٦

[2] صحيح البخاري، رقم:١٣٤٤، فتح الباري، ج:٣، ص:٢٠٩

سَكَنٌ لَّهُمْ﴾ (التوبة:۱۰۳) ''یعنی نبی اکرم ﷺ کو صدقہ دینے والوں پر دعاء خیر کی تلقین کی گئی ہے اس آیت میں وارد ''صَلِّ عَلَيْهِمْ'' کے الفاظ سے کسی کے نزدیک بھی نمازِ جنازہ مراد نہیں لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ ''صلاۃ علیٰ'' کی اصطلاح نمازِ جنازہ کے لیے مخصوص ہو گئی ہے۔

واضح رہے کہ مذکورہ حدیث میں جس نماز یا دعاء کا ذکر ہے وہ واقعہ متفقہ طور پر جنگِ احد کے تقریباً آٹھ سال بعد کا ہے، اس لیے وہاں مراد نمازِ جنازہ نہیں بلکہ وہی الفاظ دعا ہیں جو عموماً نمازِ جنازہ میں پڑھے جاتے ہیں، اس کی تائید حدیث مذکورہ میں واردان الفاظ سے بھی ہوتی ہے کہ اس دعاء کے بعد رسول اللہ ﷺ نے منبر کا رُخ کیا جو اس بات کی دلیل ہے کہ واقعہ مسجد نبوی کا ہے نہ کہ مقامِ احد پر جا کر نماز پڑھنے کا۔

(۳) ان صحیح احادیث کے علاوہ بعض دیگر روایات حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بہتر (۷۲) مرتبہ نماز جنازہ کا پڑھنے کے بارے میں ذکر کی جاتی ہیں جن کے ساتھ ان روایات کو ملایا جائے جن میں شہداء احد کی نمازِ جنازہ میں نو نو یا دس دس اکٹھے شہداء کی نمازِ جنازہ کا ذکر ہے تو بات یہی کھلتی ہے کہ حضرت حمزہ کی بہتر (۷۲) مرتبہ نمازِ جنازہ والی روایت درست نہیں کیونکہ کل شہداء احد ہی بہتر (۷۲) تھے حالانکہ اس طرح لازم آئے گا کہ شہداء احد سینکڑوں کی تعداد میں ہوں۔ نیز جو لوگ عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی صحیح بخاری والی روایت سے آٹھ سال بعد نمازِ جنازہ ثابت کرتے ہیں، ان کو غور کرنا چاہیے کہ شہدائے احد کی معرکہ سے متصل نمازِ جنازہ والی روایات کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟ اہل مدینہ، امام شافعی، اور بیہقی نے ایسے تمام معارضات نقل کر کے شہید کی نمازِ جنازہ کی بجائے دعائے خیر کا مسلک اختیار کیا ہے اور وہی راجح ہے۔

اہل حدیث کو تمام احادیث جمع کر کے صحیح مسلک اختیار کرنا چاہیے۔ احادیث کا ٹکراؤ پیدا کر کے اپنا مطلب نکالنا درست نہیں۔

سوال نمبر (۲) کا جواب: آج کل بعض جماعتیں اپنے مخصوص گروہی مقاصد کے لیے کشمیر وغیرہ میں شہید ہونے والوں کی غائبانہ نمازِ جنازہ کے لیے وہ تمام اشتہاری وسائل اختیار کرتی ہیں جو سیاستدان انتخابی سیاست میں استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ کسی کی موت پر یہ انداز اعلان اس جاہلیت کی مذموم نعی (موت کا اشتہار دینا) میں شامل ہے جس کی ممانعت احادیث میں صراحتاً آئی ہے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اسی احتیاط کے پیش نظر موت کی اطلاع اقرباء تک کو بھی نہ دیتے تھے کہ کہیں نعی نہ بن جائے۔ کسی کی موت کی خبر کی حد تک اس کے رشتے داروں اور قریبی احباب کو اطلاع دینے کا جواز تو موجود ہے لیکن اس طرح کی اشتہار بازی شریعت میں سخت ناپسندیدہ ہے۔ غائبانہ نمازِ جنازہ کے بارے میں اگرچہ دلائل کا رجحان جواز کی طرف ہی ہے لیکن اگر نعی کی مذکورہ بالا صورت دیکھی جائے تو ایسے غائبانہ نماز جنازہ کی بھی حوصلہ شکنی ہونی چاہیے۔ شریعت کے مسائل میں مقاصد شریعت کی بڑی اہمیت ہے۔ فتویٰ ان کی روشنی میں ہی دیا جانا چاہیے۔

سوال نمبر (۳) کا جواب: مرحوم مولانا خالد سیف شہید کی شہادت قابلِ رشک تھی، ان کی میت بھی جامعہ رحمانیہ

لاہور میں پہنچ گئی تھی۔ اس موقع پر ہائی کورٹ کے کئی جج اور دیگر اہم شخصیات موجود تھیں۔ سنت کے مطابق ان کو نہ تو غسل دیا گیا اور نہ ان کی نمازِ جنازہ پڑھی گئی۔ احباب کے اکٹھے ہونے کی بناء پر دعا کر لی گئی تھی۔

انسان کی موت برحق ہے اور شہادت ایک اعزاز بھی تاہم رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کی شہادت پر کبھی خوشی نہیں منائی بلکہ جعفر طیار رضی اللہ عنہ کے حادثہ کے بعد ایک عرصہ تک آپ کے چہرے پر غمی کے آثار نمایاں رہے۔ جو لوگ شہداء کی موت پر خوشیاں مناتے ہیں، انھیں غور کرنا چاہیے کہ آج اگر کسی دوسرے کا بھائی بیٹا شہید ہوا تو کل یہی واقعہ ان کے ساتھ بھی پیش آسکتا ہے، ان کا ایمان نبی ﷺ اور ان کے صحابہ سے زیادہ نہیں ہے کیونکہ موت کا صدمہ ایک فطری امر ہے۔ «اِنَّمَا یَرْحَمُ اللّٰهِ مِنْ عِبَادِهِ الرُّحَمَاءَ» ۔ مذکور بالا نکات کی روشنی میں ہمارا طرزِ عمل درست سمت نہیں جا رہا، اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائے۔ آمین

کیا شہید فی المعرکہ کی نمازِ جنازہ ہے؟

سوال : شہید کی غائبانہ نمازِ جنازہ کے بارے میں محدثین کرام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور آپ ﷺ کے زمانہ میں کیا عمل تھا۔ کیا شہداء کی غائبانہ نمازِ جنازہ جس طرح آج پڑھائی جا رہی ہے اور اس کو سنت قرار دیا جاتا ہے کیا یہ ٹھیک ہے یا نہیں؟ وضاحت فرمائیں اور جنگ اُحد کا جو حوالہ دیا جاتا ہے اس کی بھی وضاحت فرمائیں۔

جواب : راجح مسلک کے مطابق ''شہید فی المعرکہ'' کی نمازِ جنازہ نہیں۔ صحیح بخاری میں حضرت جابر اور انس رضی اللہ عنہما کی روایات میں اس امر کی تصریح موجود ہے۔ موضوع ہذا پر میرا تفصیلی فتویٰ الاعتصام وغیرہ میں شائع شدہ ہے۔ اس کی طرف مراجعت فرمائیں! امید ہے کہ باعث اطمینان وتشفی ثابت ہو گا۔ مذکورہ بالا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی روایات میں شہدائے احد کی نمازِ جنازہ کی نفی ہے۔

غائبانہ نمازِ جنازہ کے لیے اشتہاری مہم

سوال : آج کل شہید کی غائبانہ نمازِ جنازہ باقاعدہ اشتہاری مہم کے ذریعہ تشہیر کے بعد پڑھی جاتی ہے۔ رکشوں پر اعلانات کر کے دھوم دھام سے اپنی جہادی کارکردگی کو مبالغہ آمیز انداز سے بیان کیا جاتا ہے، لوگوں میں اپنا حلقہ وسیع اور اثر ورسوخ پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سوال صرف اتنا ہے کہ تعزیت مسنون کی بجائے غائبانہ نمازِ جنازہ اور وہ بھی شہید کا اس فعل کی شرعی حیثیت کیا ہوگی؟

جواب : راجح مسلک کے مطابق ''شہید فی المعرکہ'' کی نمازِ جنازہ نہیں۔ پھر اس مہم جوئی کا رکشوں وغیرہ پر اعلان کرنا جاہلی رُسوم کا حصہ ہے۔ اس بُری رسم سے احتراز کرنا ضروری ہے۔

شہید کی نمازِ جنازہ کے لیے پوسٹرز وغیرہ سے تشہیر کرنا

سوال: آج کل کئی لوگ شہید کی نمازِ جنازہ پڑھاتے ہیں باقاعدہ پوسٹرز لگائے جاتے ہیں۔ اعلانات کروائے جاتے ہیں اور پھر نمازِ جنازہ وہ بھی غائبانہ ادا کی جاتی ہے کیا یہ درست ہے۔ ایک خطیب صاحب نے خطبہ جمعہ میں کہا کہ جو شہید ہے۔ اس کی غائبانہ نمازِ جنازہ بلکہ نمازِ جنازہ نہیں ہے۔ جواب جلد تحریر شائع کردیں۔ تاکہ غلط فہمی دور ہوسکے۔

(مرزا آفتاب اقبال (ابوطلحہ) خورد ضلع جہلم) (۲۸ اگست ۱۹۹۸ء)

جواب: راجح مسلک کے مطابق «شَهِيْد فِي الْمَعْرِكة» کی نمازِ جنازہ نہیں۔ معترضین کے جوابات کے ساتھ ملاحظہ ہو: الاعتصام ۲۴ تا ۳۰ جولائی ۱۹۹۸ء شمارہ:۲۸.

شہید کی نمازِ غائبانہ کی بذریعہ اشتہارات اور لاؤڈ سپیکر تشہیر کرنا، سنت ہے یا بدعت؟

سوال: غائبانہ نمازِ جنازہ خاص کر شہید کا جو آج کل بذریعہ اشتہارات لاؤڈ سپیکر پر اعلانات گلی کوچوں میں منادی کے ذریعے یہ دعوت دی جاتی ہے کہ فلاں شہید کا غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھا جائے گا؟ آیا یہ بدعت ہے یا سنت۔ اگر سنت ہے تو آپ حدیث سے دلیل دے کر جواب دیں۔ اگر بدعت ہے تو پھر اہل حدیث اپنے آپ کو حدیث پر عامل ہونے کا دعویدار بھی کہتے ہیں اور خود ہی بدعت پر عمل کررہے ہیں۔ براہِ مہربانی قرآن وسنت کی روشنی میں جواب دے کر مستفید فرمائیں۔ (حاجی محمد عارف۔ چیچہ وطنی) (۹ اپریل ۱۹۹۹ء)

جواب: سنت میں مجھے اس کا کوئی اصل معلوم نہیں ہوسکا۔ بلکہ دلائل اس کے خلاف ہیں۔ راجح مسلک یہ ہے کہ شہید فی المعرکہ کی نمازِ جنازہ نہیں۔ اس بارے میں ''الاعتصام'' میں متعدد دفعہ تفصیل شائع ہوچکی ہے۔ اس کی طرف رجوع فرمائیں۔

شہید کی غائبانہ نمازِ جنازہ سنت سے ثابت ہے؟

سوال: کیا شہید کی غائبانہ نمازِ جنازہ آپ ﷺ نے پڑھی؟ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں کبھی کوئی ایسا صحیح ثبوت ملتا ہے؟ (زاہد لطیف، باغبانپورہ لاہور) (۲۶ جنوری ۱۹۹۶ء)

جواب: میری نظر سے نہیں گزرا کہ نبی ﷺ نے بطورِ خاص کسی شہید کی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی ہو جب کہ یہ بات معروف ہے اس عہد میں حروب وقتال میں شرکت مستمر تھا۔ عمومِ بلویٰ (عام پیش آنے والی چیز) کا تقاضا ہے کہ اگر اس کا کوئی اصل ہوتا تو ضرور نقل ہوتا۔ عدمِ نقل عدمِ وجود کو مستلزم ہے پھر عام حالات میں شہید کے جنازہ میں اہل علم کا سخت اختلاف ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ شہداء پر نمازِ جنازہ نہیں۔ چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ اور انس رضی اللہ عنہ کی روایات میں تصریح موجود ہے کہ آپ ﷺ نے شہداء احد کو نہ غسل دیا اور نہ ان کی نمازِ جنازہ پڑھی مگر اس کے برعکس کئی ایک روایات میں نمازِ جنازہ کا اثبات ہے۔ علماء نے ان کی تطبیق میں مختلف آراء کا اظہار کیا ہے۔

صاحب "المنتقیٰ" فرماتے ہیں: جن روایات میں نمازِ جنازہ کا ذکر ہے۔ سند کے اعتبار سے ان میں سے ایک بھی صحیح نہیں ہے۔ اہل مدینہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کا یہی مسلک ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: نمازِ جنازہ کی نفی کے بارے میں بہت سی احادیث مروی ہیں جو اسانید جیدہ کے ساتھ مروی ہیں اور جس حدیث میں یہ آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شہداء احد پر نمازِ جنازہ پڑھی اور حضرت حمزہ پر ستر تکبیریں کہیں وہ روایت صحیح نہیں۔ لیکن علامہ البانی صاحب نے اس قسم کی بعض روایات کو صحیح یا حسن قرار دیا ہے۔ اس کے برعکس علمائے کوفہ جن میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ بھی شامل ہیں۔ شہید پر نمازِ جنازہ کے قائل ہیں۔ ان کا استدلال بعض ان روایات سے ہے۔ جن میں شہید پر جنازہ کا ثبوت ملتا ہے۔

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ ''تہذیب السنن'' میں رقمطراز ہیں۔ اصل یہ ہے کہ نمازِ جنازہ میں امام کو اختیار ہے کیونکہ دونوں طرف آثار موجود ہیں۔

لیکن مسئلہ ہذا میں میرا رجحان شہید معرکہ کے عدمِ جنازہ کی طرف ہے کیونکہ اس بارے میں وارد روایات اصح ہیں۔ بنسبت ان روایات کے جن میں اثبات کا ذکر ہے۔ شیخنا محدث روپڑی رحمہ اللہ نے بھی فتاویٰ اہل حدیث میں اسی مسلک کو اختیار کیا ہے۔

کسی شخصیت کی مختلف شہروں میں غائبانہ نمازِ جنازہ ادا کرنا

سوال: میرے مشاہدے میں یہ بات آئی ہے کہ بعض دفعہ جب کوئی بااثر شخص فوت ہوجاتا ہے تو اس کی میت پر نمازِ جنازہ پڑھی جانے کے بعد مختلف شہروں میں اس کی غائبانہ نمازِ جنازہ بھی پڑھی جاتی ہے۔ کیا حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما جیسی بزرگ ہستیوں کے لیے بھی کسی شہر میں ایسی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی گئی تھی؟ اور اگر نہیں پڑھی گئی تھی تو کیوں نہیں پڑھی گئی؟

براہِ مہربانی ایسی غائبانہ نمازِ جنازہ کے بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طرزِ عمل کی وضاحت فرمائیں۔ یعنی سوال یہ ہے کہ کیا کوئی ایک بھی ایسی مثال موجود ہے جس سے ثابت ہوتا ہو کہ کسی وفات یافتہ کی میت پر نمازِ جنازہ پڑھی جانے کے بعد دوسرے شہر یا گاؤں میں کسی صحابی نے اس کی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھائی ہو؟

جواب: اسلامی تاریخ میں واقعی اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ خلفائے راشدین، مشاہیر صحابہ وغیرہم فوت ہوئے، لیکن کسی مسلمان نے ان پر غائبانہ نمازِ جنازہ ادا نہیں کی۔ کیونکہ اگر کسی نے ادا کی ہوتی تو ان سے تواتر کے ساتھ منقول ہوتا، بلکہ علامہ ناصر الدین البانی تو اس رواج کو بدعت سے تعبیر کرتے ہیں۔ چنانچہ احکام الجنائز میں اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

« إِنَّهَا مِنَ البِدَعِ الَّتِي لَا يَمْتَرِي فِيهَا عَالِمٌ بِسُنَّتِهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَذْهَبِ

السَّلَفِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنهُم.»❶

یعنی''یہ وہ بدعت ہے جس میں سنت اور مذہب سلف صالحین سے باخبر کوئی عالم بھی شبہ نہیں کر سکتا۔''

حافظ ابن قیم رحمہ اللہ نے''زاد المعاد'' میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی رائے یوں نقل کی ہے، کہ غائب میت اگر ایسی سر زمین میں فوت ہوئی جس پر نمازِ جنازہ نہ پڑھی گئی ہو تو اس پر غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی جائے جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے نجاشی پر غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی۔ اگر نمازِ جنازہ پڑھی جا چکی ہو تو اس پر غائبانہ نمازِ جنازہ نہ پڑھی جائے۔❷

میت کی آمد سے قبل جنازہ ادا کرنا:

سوال: جنازہ کراچی سے نتھیا گلی کے لیے بذریعہ جہاز روانہ ہوا۔ لوگ نتھیا گلی جمع ہوئے قبر تیار ہوئی اطلاع ملی کہ جہاز بوجہ خرابی موسم واپس کراچی مع جنازہ چلا گیا ہے اور واپسی لیٹ ہوگی۔ کیا وہاں جمع لوگ جنازہ پڑھ سکتے ہیں۔ جب کہ میت ابھی دوران سفر میں ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ میت دوسرے دن یا رات آبائی گاؤں پہنچے گی۔ کیا اس طرح غائبانہ نمازِ جنازہ جائز ہے۔

جواب: غائبانہ جنازہ کا جواز تو ہے۔ نجاشی کے بارے میں نبی ﷺ نے فرمایا تھا:

« اِنَّ اَخَاكُم قَد مَاتَ بِغَيرِ اَرضِكُم ، فَقُومُوا فَصَلُّوا عَلَيهِ»❸ ''تمہارا بھائی غیر زمین میں فوت ہوگیا۔ اٹھو، اس کی نمازِ جنازہ پڑھو۔'' اور صحیح بخاری و صحیح مسلم میں ہے: «قَد تُوُفِّيَ اليَومَ»❹ آج فوت ہوا ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میت پر نمازِ جنازہ اس کے لیے دعا ہے اور یہ میت کے کفن میں ملفوف ہونے کی صورت میں جائز ہے تو غائبانہ یا قبر پر اس کے لیے کیوں جائز نہیں۔ (فتح الباری ۳/ ۳۱)

اور شوکانی رحمہ اللہ "الدرر البھیة" میں فرماتے ہیں: کہ صلوۃِ جنازہ قبر پر پڑھی جائے اور غائب میت پر بھی۔ یہ بھی یاد رہے کہ میت کے دفن یا عدمِ دفن سے اصل مسئلہ کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا معاملہ دونوں کا ایک جیسا ہے۔ قصۂ نجاشی عموم کی دلیل ہے۔ لیکن موجودہ صورت میں میت کی آمد کا انتظار کرنا چاہیے کیونکہ اس کی آمد متوقع ہے۔

ہڈیوں یا غیر حاضر میت پر جنازہ کا کیا حکم ہے؟

سوال: ہمارا بھائی گزشتہ ۲ سال سے لاپتہ تھا۔ جس کی عمر ۳۲ سال تھی۔ اب اچانک پتہ چلا کہ ۲ آدمیوں نے اسے قتل

❶ احکام الجنائز ، لشیخنا مفتی محمد عبدہ، ص:٤٧

❷ احکام الجنائز ، لشیخنا مفتی محمد عبدہ، ص:٤٧

❸ سنن ابن ماجه، بَابُ مَا جَاءَ فِي الصَّلَاةِ عَلَى النَّجَاشِيِّ، رقم: ١٥٣٧ ، ١٥٣٦ ، مسند ابی داؤد الطیالسی، رقم:١١٦٤

❹ صحیح البخاری، بَابُ الصُّفُوفِ عَلَى الجِنَازَةِ ، رقم ١٣٢٠

کر ڈالا۔ آدمیوں نے خود پولیس کے روبرو اقرار کیا جب کہ بھائی کی مدفون جگہ سے صرف چند ہڈیاں برآمد ہوئی ہیں۔ اس کے جنازہ اور فاتحہ وغیرہ کے لیے کیا احکام ہیں؟ ابھی تک مدفون کے لیے ہڈیاں بھی نہیں ملیں اور نہ ہی ملنے کی امید ہے۔مہربانی فرما کر راہنمائی فرمائیں۔ (ایک سائل) (۹ جون ۱۹۹۵ء)

جواب: صورتِ مرقومہ میں اگر میت کی ہڈیاں پولیس سے دستیاب ہو جائیں تو ان پر نمازِ جنازہ پڑھی جائے۔ امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں، ابوایوب رضی اللہ عنہ نے پاؤں پر نمازِ جنازہ پڑھی تھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ملک شام میں ہڈیوں پر جنازہ پڑھا تھا۔ اور ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے سروں کا جنازہ پڑھا۔ اسی طرح اہل مکہ نے عبدالرحمٰن بن عتاب بن اسید کے ہاتھ کا جنازہ۔صحابہ کرام کی موجودگی میں پڑھا تھا۔ کسی نے انکار نہ کیا۔ [1]

اور اگر ہڈیاں پولیس سے نہ مل سکیں تو غائبانہ جنازہ ادا کرلیں۔ اس کے لیے قصہ نجاشی سے استدلال ہوسکتا ہے۔ حدیث میں ہے:

«اِنَّ اَخَاکُم قَد مَاتَ بِغَیرِ اَرضِکُم ، فَقُومُوا فَصَلُّوا عَلَیهِ .» [2]

''یعنی تمہارا بھائی تمہاری غیر زمین میں مرگیا۔ اٹھو اس کی نمازِ جنازہ پڑھو۔''

(قبر کے متعلقہ مسائل)

کیا ہر مسلمان کو قبر میں دفنانا ضروری ہے؟

سوال: ہر مسلمان کو قبر میں دفنانا ضروری ہے لیکن جو میت پانی میں ختم ہو جائے یا کوئی درندہ کھا جائے یا آگ میں جل جائے تو اس سے قبر کا سوال، جواب یا عذاب، ثواب اور قیامت کو قبروں سے اٹھنا کیسے ہوگا؟

(محمد حسین تابانی ورحمت اللہ حقانی راجووال) (۱۶ جنوری ۱۹۹۸ء)

جواب: جو شخص پانی میں غرق ہو جائے یا درندہ کھا جائے یا آگ وغیرہ میں جل جائے اس سے بھی قبر کا سوال و جواب ہوگا۔ کیونکہ اس کی قبر وہی ہے جہاں یہ پہنچ چکا ہے۔

قبر زمین کی سطح سے کس قدر بلند ہو؟

سوال: قبر زمین سے کتنی اونچی ہونی چاہیے؟ (محمد جہانگیر، ولد محمد اکرم ضلع میرپور) (۸ مئی ۱۹۹۸ء)

---

[1] المغنی:۲/ ۴۰۷ مع الشرح الکبیر

[2] مسند ابوداؤد الطیالسی، رقم:۱۱۶۴، سنن ابن ماجه، بَابُ مَا جَاءَ فِی الصَّلَاةِ عَلَی النَّجَاشِیِّ، رقم:۱۵۳۶، ۱۵۳۷

جواب: قبر زمین کی سطح سے قریباً ایک بالشت بلند ہونی چاہیے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں اس امر کی تصریح موجود ہے۔ ❶

کیا قبر پست ہونے کی وجہ سے مردے کو عذاب ہوتا ہے؟

سوال: قبر پر زیادہ مٹی (بوجہ حضور ﷺ کا فرمان قبروں کو اونچا نہ کرو۔ (مفہوم) نہ ڈالی جائے۔ اور شدید بارش سے پانی کے بہاؤ میں پانی قبر کے اندر چلا جائے اور قبر بیٹھ جائے اتنی کہ مٹی زمین کے بالکل برابر یا ایک فٹ نیچے ہو جائے اور قبر پر جہاں پہلے مٹی کی سطح تھی۔ ایک غلاف سارہ جائے تو کیا یہ مردہ کے لیے عذاب ہوگا؟ (ایک سائل) (۹ جنوری ۱۹۹۸ء)

جواب: شریعت میں قبر کا مفہوم صرف اس گڑھے کا نہیں جس میں میت کو دفن کر دیا جاتا ہے۔ بے شمار ایسے لوگ بھی ہیں جو جنگل کے درندوں کی خوراک بن جاتے ہیں۔ یا سمندری گہرائی میں مچھلیوں کی خوراک بنتے ہیں یا ان کے ذرات ہوا میں بکھر جاتے ہیں۔ بظاہر ان کے لیے کسی قبر کا سامان نہیں لیکن درحقیقت ان کے لیے بھی حسب اعمال نعمتیں یا عذاب ہے۔ کیوں کہ شریعت میں قبر کا مفہوم، برزخی ساری زندگی کو محیط ہے اس لیے قبر کے ظاہری تغیرات کے بارے میں مت سوچیں جمیع معاملات اللہ کے سپرد کر دیں اور عاجزی وانکساری سے اس کے سامنے ہر وقت جھکے رہنے کا نام ہی عبودیت ہے جو بندہ سے مطلوب ہے۔ لہٰذا قبر کے بیٹھنے یا نہ بیٹھنے سے میت کی اصل کیفیت میں قطعاً کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر کوئی نیک ہے تو ہر حالت میں اس کی نیکی اس کے ساتھ ہے۔ اور اگر کوئی برا ہے تو اُس کی برائی بھی اس سے جدا نہیں ہوتی۔ اللہ عزوجل ہم سب کو عذابِ قبر سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

قبر کا زمین کے برابر ہونا اور عذاب قبر؟

سوال: اگر قبر کسی وجہ سے زمین کے برابر ہو جاوے تو عذابِ قبر ختم ہو جاتا ہے یا نہیں؟ (سائل) (۲۱ ستمبر ۲۰۰۱ء)

جواب: بلاشبہ کتاب وسنت کی متعدد نصوص عذابِ قبر کا اثبات کرتی ہیں، جو برحق ہے۔ مثلاً امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی ''صحیح'' میں «بَابُ مَا جَاءَ فِي عَذَابِ الْقَبْرِ.» عنوان قائم کر کے قرآنی آیات اور احادیث سے مسئلہ ہذا پر فقیہانہ انداز میں استدلال کیا ہے۔

پھر شارح حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ان کی شرح و بسط کا خوب حق ادا کیا ہے۔ لوگوں کے شکوک و شبہات وارد کر کے عقلی اور نقلی دلائل سے ان کا خوب محاکمہ کیا ہے جو لائق مطالعہ ہے۔ اس کے ضمن میں وہ فرماتے ہیں:

« وَإِنَّمَا أُضِيفَ الْعَذَابُ إِلَى الْقَبْرِ لِكَوْنِ مُعْظَمِهِ يَقَعُ فِيهِ وَلِكَوْنِ الْغَالِبِ عَلَى

---

❶ صحيح ابن حبان، ذِكْرُ وَصْفِ قَبْرِ الْمُصْطَفَى ﷺ وَقَدْرِ ارْتِفَاعِهِ مِنَ الْأَرْضِ، رقم:٦٦٣٥، سنن كبرى، رقم:٦٧٣٦

الْمَوْتَی أَنْ یُقْبَرُوا وَإِلَّا فَالْكَافِرُ وَمَنْ شَاءَ اللَّهُ .» ❶

''قبر کی طرف عذاب کی نسبت اس لیے ہے کہ اکثر و بیشتر عذاب اسی میں ہوتا ہے اور اس لیے بھی کہ اکثر مُردوں کو قبروں میں دفن کیا جاتا ہے۔ ورنہ کافر اور نافرمان جن کو اللہ عذاب میں مبتلا کرنا چاہتا ہے انھیں موت کے بعد عذاب میں مبتلا کیا جاتا ہے، خواہ وہ دفن نہ بھی ہوں، لیکن یہ مخلوق سے پردے میں ہوتا ہے۔ اظہار وہاں ہوتا ہے جہاں اس کی مرضی ہو۔''

حقیقت یہ ہے کہ قبر کے ہموار ہونے سے عذابِ قبر میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کیونکہ اس کا تعلق قبر کی بجائے تمام تر برزخی زندگی سے ہے۔ اب چاہے کوئی سمندر میں غرق ہو یا کسی کی راکھ کو ہوا میں اڑا دیا جائے، یا اسے جنگلی درندے کھا پی جائیں پھر بھی برزخی محاسبے سے بچ نہیں سکتا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: شرح عقیدة طحاویه اور التذکرہ (امام قرطبی)

قبر پر پتھر، سیمنٹ وغیرہ استعمال کرنا

سوال : قبر کی مضبوطی کے لیے اکیلی ایک ''پوہڑی'' پتھر لگا کر درجوں میں سیمنٹ بھرنا جائز ہے یا نہیں؟

(محمد یعقوب منڈیاں) (۹ فروری ۱۹۹۶ء)

جواب : قبر پر آگ سے پکی ہوئی شئے استعمال کرنے سے احتراز کرنا چاہیے۔ قرآن میں ہے:

﴿مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَ فِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى﴾ (طٰهٰ:۵۵)

''یعنی ہم نے مٹی سے تمھیں پیدا کیا اور اس میں تمھیں لوٹائیں گے۔ اور اسی سے تمھیں دوبارہ نکالیں گے۔''

پھر برزخی معاملات میں قبر کی مضبوطی کو کوئی خاص اہمیت نہیں۔ یہ محض طفل تسلی ہے۔

قبر میں پکی اینٹوں وغیرہ کا استعمال کرنا

سوال : کیا آگ سے پکی چیز کو قبر میں استعمال کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ جیسے سیمنٹ کی سلیں وغیرہ۔

(سائل) (۱۹ مارچ ۲۰۰۴ء)

جواب : جس چیز کو آگ نے چھوا ہو، اس کو قبر میں استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ چنانچہ ''صحیح مسلم'' میں حدیث ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص نے مرض الموت میں فرمایا:

«اِلْحَدُوا لِی لَحْدًا، وَانْصِبُوا عَلَیَّ اللَّبِنَ نَصْبًا، كَمَا صُنِعَ بِرَسُولِ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ» ❷

---

❶ فتح الباری:۳/ ۲۳۳

❷ صحیح مسلم، بَابٌ فِي اللَّحْدِ وَنَصْبِ اللَّبِنِ عَلَى الْمَيِّتِ، رقم:۹۶٦

''میری قبر بغلی بنانا اور اس پر کچی اینٹیں لگانا جس طرح رسول اللہ ﷺ کی قبر پر کچی اینٹیں لگائی گئی تھیں۔''

شارح مسلم امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: «وَ قَدْ نقلوا اَن عدد لبناته صلی الله علیه وسلم تسع»
''اہل علم نے نقل کیا ہے کہ نبی ﷺ کی (قبر مبارک کی) کچی اینٹوں کی تعداد نو (۹) تھی۔''

اللبن کی وضاحت اہل علم نے یوں بیان کی ہے: «اَلْمَضروب منَ الطِّیْنِ مُربعًا لِلْبِنَاءِ قَبْل الطَّبخ فَاِذَا طُبِخَ فَهُوَ الْآجُرُّ» ❶ ''مربع شکل میں پکنے سے پہلے عمارتی اینٹ کا نام ''اللبن'' ہے اور جب پک جائے تو وہ الآجر سے موسوم ہے۔

مختصر الخرقی میں ہے: « وَلَا يُدْخِلُ الْقَبْرَ آجُرًّا و لا خَشباً و لا شَيْئًا مَسَّتْهُ النَّارُ» ❷
''قبر میں پکی اینٹ اور لکڑی استعمال نہ کی جائے اور ہر وہ شے جس کو آگ لگی ہو۔''

فقیہ ابن قدامہ فرماتے ہیں کچی اینٹ اور کانے کا استعمال مستحب ہے جب کہ امام احمد نے لکڑی کو مکروہ کہا ہے۔
ابراہیم نخعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سلف صالحین کچی اینٹ کو مستحب کہتے اور لکڑی کے استعمال کو مکروہ سمجھتے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قبر کو بند کرنے کے لیے اصل کچی اینٹ ہے۔ عامۃ الناس میں آج کل جو سلیں لگانے کا رواج ہے یہ غیر درست فعل ہے، اس سے احتراز ہونا چاہیے۔

قبریں پختہ کرنا اور ان پر نام آویزاں کرنا

سوال: قبروں پر جو نام لکھے جاتے ہیں، یا انھیں پختہ کیا جاتا ہے، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اگر نام لکھنا ناجائز ہے تو اس پر کیا نشانی رکھنی چاہیے؟ (محمد بلال کمبوہ آف کچا پکا) (۱۶ فروری ۲۰۰۱ء)

جواب: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:
« نَهَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَنْ يُجَصَّصَ الْقَبْرُ وَأَنْ يُقْعَدَ عَلَيْهِ وَأَنْ يُبْنَى عَلَيْهِ» ❸
''نبی ﷺ نے قبر کو پختہ کرنے، اس پر بیٹھنے، عمارت بنانے اور زائد مٹی ڈالنے اور اس پر کچھ لکھنے سے منع فرمایا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ قبروں پر لکھنا اور انھیں پختہ بنانا ناجائز ہے۔
امام محمد ''الآثار'' میں لکھتے ہیں کہ ''قبر پر لکھنا یا کتبہ لگانا مکروہ ہے۔''
ہاں البتہ نشانی رکھنی جائز ہے۔ نبی ﷺ نے عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی قبر پر پتھر رکھتے ہوئے فرمایا کہ: ''اس سے

---

❶ بحوالہ اتحاف الکرام، ص: ۱۶۰
❷ مع المغنی والشرح الکبیر: / ۳۸۴
❸ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، بَاب النَّهْيِ عَنْ تَجْصِيصِ الْقَبْرِ وَالْبِنَاءِ عَلَيْهِ، رقم: ۱۶۱۰

میں اپنے بھائی کی قبر کو پہچان لوں گا اور ہمارے اہل سے جو فوت ہوگا اسے اس کے قریب دفن کروں گا۔“ ❶

قبر کیسی بنانی چاہیے؟ کیا اس کی مرمت کرنی چاہیے؟

سوال : قبر کیسی بنانی چاہیے؟ کیا اس کی مرمت کرنی چاہیے؟ حوالہ کے ساتھ جواب دیں۔

جواب : قبر کو گہرا اور فراخ اور اچھا بنانا چاہیے۔ حدیث میں ہے:

«احْفِرُوا، وَأَوْسِعُوا، وَأَحْسِنُوا.» ❷

نیز قبر کو بغلی یا صندوقچی کی صورت میں دونوں طرح بنانا جائز ہے۔ لیکن افضل یہ ہے کہ بغلی بنائی جائے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے لیے بغلی بنی تھی۔ (رواہ فی شرح السنۃ)

بحوالہ مشکوٰۃ دوسری روایت میں ہے:

«اللَّحْدُ لَنَا، وَالشَّقُّ لِغَيْرِنَا.» ❸

”یعنی لحد ہمارے لیے ہے اور شق یعنی صندوقچی قبر ہمارے غیر کے لیے ہے۔“

”فتح الباری“ میں ہے:

«وَهُوَ يُؤَيِّدُ فَضِيلَةَ اللَّحْدِ عَلَى الشَّقِّ وَاللَّهُ أَعْلَمُ.» ❹

”بحر الرائق“ میں ہے کہ قبر ایک بالشت یا چار انگل کوہان نما ہو اور صحیح میں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس قبر کو بلند دیکھو برابر کردو۔“ ❺

اس سے مراد وہ قبر ہے جو ایک بالشت سے زائد ہو۔ اور ”النہر الفائق“ میں ہے کہ کوہان نما ہو یعنی بلند ہو۔ بعض کہتے ہیں: چار انگل کے برابر ہو کیونکہ بخاری میں سفیان سے ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی قبر کوہان نما تھی۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ، مالک رحمہ اللہ، احمد رحمہ اللہ، مزنی رحمہ اللہ اور بہت سارے شوافع کا مسلک یہی ہے کہ قبر کوہان نما ہونی چاہیے۔ لیکن امام بیہقی نے کہا ہے کہ سفیان تمار کے قول میں حجت نہیں کیونکہ یہ کبار اتباع تابعین سے ہے۔ اس نے صحابہ رضی اللہ عنہم

---

❶ سنن ابی داؤد، بَابُ فِي جَمْعِ الْمَوْتَى فِي قَبْرٍ وَالْقَبْرُ يُعَلَّمُ، رقم:٣٢٠٦

❷ سنن ابن ماجه ، بَابُ مَا جَاءَ فِي حَفْرِ الْقَبْرِ ، رقم:١٥٦٠ والترمذی:رقم:١٧١٣ ، وابوداؤد:رقم:٣٢١٥، سنن النسائی:٢٠١٦.

❸ سنن ابن ماجه ، بَابُ مَا جَاءَ فِي اسْتِحْبَابِ اللَّحْدِ ، رقم:١٥٥٤ ، سنن الترمذی ، بَابُ مَا جَاءَ فِي قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ اللَّحْدُ لَنَا، وَالشَّقُّ لِغَيْرِنَا ، رقم:١٠٥٤

❹ فتح الباری: ٣/ ٢١٨

❺ صحیح مسلم ، بَابُ الْأَمْرِ بِتَسْوِيَةِ الْقَبْرِ ، رقم:٩٦٩

کے عہد کو پایا ہے لیکن کسی سے روایت نہیں۔)

احتمال ہے کہ ابتدائی امر میں قبر کوہان کی صورت میں ہو۔ پھر انھوں نے قاسم بن محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ سے ''سنن ابی داؤد'' اور ''حاکم'' میں مروی قصہ سے تائید لی ہے اور دیگر شواہد بھی پیش کیے ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«ثُمَّ الِاخْتِلَافُ فِي ذَلِكَ فِي أَيِّهِمَا أَفْضَلُ لَا فِي أَصْلِ الْجَوَازِ.»

''یعنی کوہان نما قبر یا سطح برابر کی قبر بنانا دونوں طرح جائز ہے۔ اختلاف صرف اس میں ہے کہ دونوں صورتوں میں سے بہتر کونسی ہے۔''

مزنی اور ابن قدامہ نے کوہان نما کو ترجیح دی ہے۔ لیکن ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سطح برابر قبر فضالہ بن عبید کی حدیث جو ''صحیح مسلم'' میں ہے، کی بناء پر قابلِ ترجیح ہے:

«أَنَّهُ أَمَرَ بِقَبْرٍ فَسُوِّيَ ثُمَّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَأْمُرُ بِتَسْوِيَتِهَا.» ❶

قبروں کو پختہ کرنے کی شرعی حیثیت

سوال: ہمارے ہاں اکثر لوگ قبروں کو پختہ کرتے ہیں۔ کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

(محمد یوسف۔ ضلع ایبٹ آباد) (۹ جولائی ۱۹۹۹ء)

جواب: قبروں کو پختہ بنانا منع ہے۔ ''صحیح مسلم'' میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ قبر کو پکا کیا جائے اور اس پر مجاور بن کر بیٹھا جائے اور اس پر عمارت (قبہ وغیرہ) بنائی جائے۔'' ❷ اور ترمذی (ابواب الجنائز باب ما جاء فی کراھیة تجصیص القبور) میں بسند صحیح یہ اضافہ ہے کہ ''اس پر کچھ لکھنا بھی منع ہے۔'' ❸

میت پختہ قبر بنانے کی وصیت کرے تو کیا حکم ہے؟

سوال: کیا پختہ قبر بنوائی جا سکتی ہے یا نہیں؟ اگر کوئی شخص مرنے سے پہلے وصیت کر گیا ہو کہ اس کی قبر پختہ بنوائی جائے تو کیا اس کی اس وصیت کو پورا کرنا اس کے ورثاء کا فرض ہے؟

(آصف احسان ملک ستیانہ روڈ۔ فیصل آباد۔ ۱۱ اپریل ۱۹۹۷ء)

جواب: ''صحیح مسلم'' وغیرہ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں تصریح موجود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ

❶ فتح الباری: ۳/ ۲۵۷

❷ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب النھی عن تجصیص القبر، رقم: ۹۷۰

❸ سنن النسائی، بَابُ الزِّيَادَةُ عَلَى الْقَبْرِ، رقم: ۲۰۲۷۔ سنن الترمذی: ۱۰۵۲.

قبر کو چونا گچ کیا جائے۔ [1] امام محمد رحمہ اللہ نے بھی اس کی کراہت کی تصریح کی ہے چنانچہ کتاب "الآثار" میں لکھتے ہیں، ہمارے نزدیک قبر کو چونا گچ کرنا یا مٹی سے لپائی کرنا مکروہ ہے۔ خلافِ شرع وصیت کی اصلاح ورثاء کے ذمہ ضروری ہے بصورتِ دیگر وہ بھی مجرم ٹھہریں گے۔

جن قبروں کی پوجا پاٹ کا خطرہ ہو انھیں مسمار کرنے کا شریعت میں کیا حکم ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ میں کہ ہمارے آباؤ اجداد کی قبریں ہم نے اپنے گھر میں بنوائی تھیں اور لوگ اب ان کی پوجا و پرستش کا ارادہ رکھتے ہیں۔ جس کی وجہ سے کئی دفعہ ہمارا لوگوں سے جھگڑا بھی ہو چکا ہے۔ اب ہم یہ چاہتے ہیں کہ ان قبروں کا یہاں سے نام ونشان ہی مٹا دیا جائے تاکہ شرک کا خطرہ باقی نہ رہے۔ کیا شریعت محمدی ﷺ میں ایسا کرنا جائز ہے؟

جواب: توحید وسنت کے احیاء کی خاطر اور جذبۂ ایمانی کے تقاضوں کے مطابق آپ لوگوں پر فرض عائد ہوتا ہے کہ اپنی جدی پشتی قبروں کو زمینی سطح کے ہموار کر دیں تاکہ کسی بھی قبر پرست اور غیر اللہ کے پجاری کی نگاہ ان کی طرف اٹھنے نہ پائے۔ چنانچہ صحیح حدیث میں وارد ہے:

ابو الہیاج اسدی کا بیان ہے، مجھے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کیا میں تجھے اس کام پر مقرر نہ کروں جس پر مجھے رسولِ اکرم ﷺ نے مقرر کیا تھا؟

۱۔ جو تصویر نظر آئے اسے مٹا کر دم لو۔

۲۔ ہر وہ قبر جو بلند ہو اسے زمین کے برابر کر دو۔ [2]

اسی طرح دوسری حدیث میں ہے، ثمامہ بن شفی کہتے ہیں کہ ہم فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ کے ساتھ سرزمین روم میں سفر کر رہے تھے کہ رُوْدَس کے مقام پر ہمارا ایک ساتھی فوت ہو گیا۔ فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ کے حکم کے مطابق اس کی قبر زمین کے برابر کر دی گئی۔ پھر فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ کہنے لگے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ آپ ﷺ قبر کو زمین کے برابر کرنے کا حکم دیا کرتے تھے۔ [3]

اسی طرح کتب تاریخ و سیر میں یہ قصہ معروف ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں جب تُستر میں ہرمز کے مخزن سے دانیال علیہ السلام کی لاش برآمد ہوئی تو مختلف مقامات پر تیرہ قبریں کھود کر ان کو دفن کر کے رات کی تاریکی میں مٹی

---

[1] صحيح مسلم، كتاب الجنائز، باب النهى عن تجصيص القبر، رقم:۹۷۰

[2] صحيح مسلم كتاب الجنائز، باب الأمر بتسوية القبر، رقم:۲۲۴۳

[3] صحيح مسلم، كتاب الجنائز، باب جعل القطيفة فى القبر، رقم ۹۶۸۔ سنن ابى داؤد : ۳۲۲۱.

کے برابر کر کے قبروں کا نام ونشان مٹا دیا گیا تا کہ عامۃ الناس اور جہلاء کے لیے فتنہ کا سبب نہ بنے۔ ❶

پھر حدیبیہ کے مقام پر جس درخت کے زیر سایہ ''بیعت الرضوان'' کا انعقاد ہوا تھا جب اس کے بارے میں خلیفہ راشد عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا کہ لوگ اسے متبرک سمجھ کر اس کی زیارت کے لیے اہتمام کرتے ہیں تو اس کو جڑ سے کٹوا پھینکا باوجودیکہ اس شجرۂ عظیم کا تذکرہ کتاب الٰہی میں بھی مصرح ہے۔ جو اس کی عظمت پر دال ہے۔

مزید آنکہ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بحالت سفر ساتھیوں کو صبح کی نماز پڑھائی۔ پھر دیکھا کہ لوگ ادھر اُدھر جا رہے ہیں۔ دریافت کیا کہ یہ کہاں جاتے ہیں؟ کہا گیا: اے امیر المؤمنین! ایک مسجد ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی تھی یہ اسی میں نماز پڑھتے ہیں۔ فرمایا: پہلی امتیں اسی وجہ سے ہلاک ہوگئیں کہ انھوں نے انبیاء علیہم السلام کے آثار کی پیروی میں ان جگہوں میں عبادت خانے اور گرجے بنا لیے۔ جس شخص کو ان مسجدوں میں نماز کا وقت آ جائے نماز پڑھے ورنہ گزر جائے۔ ❷

پھر سب سے بیّن اور واضح بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو فتنے سے بچانے کی غرض سے ہی ''مسجد ضرار'' کو منہدم کر دیا تھا۔ یہاں قابل توجہ پہلو یہ ہے کہ شریعت کی نگاہ میں گھروں میں قبریں بنانا مذموم فعل اور منکر کام ہے۔ ''صحیح مسلم'' میں حدیث ہے: «لَا تَجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ مَقَابِرَ» ❸

شارح بخاری شریف حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« فَإِنَّ ظَاهِرَهٗ يَقْتَضِي النَّهْيَ عَنِ الدَّفْنِ فِي الْبُيُوْتِ مُطْلَقًا » وَاللّٰهُ اَعْلَمُ ❹

یعنی ''مذکور حدیث کا ظاہر اس بات کا متقاضی ہے کہ گھروں میں قبریں بنانا مطلقاً ممنوع ہے۔''

بنابریں گھروں میں قبروں کے آثار باقی رکھنا بھی ممنوع ٹھہرا، لازم ہے کہ فعل منکر کو تبدیل کیا جائے، اس کی صورت یوں ہوسکتی ہے۔ اگر تو یہ قبریں گزرگاہ سے الگ ہیں تو ان کو زمین کے برابر کر دیا جائے۔ اور اگر راستہ میں پڑتی ہیں تو ہڈیاں نکال کر مسلمانوں کے عمومی قبرستان میں دفن کر دی جائیں۔ البتہ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ مشرکین اور گور پرستوں کو جائے دفن کا علم نہ ہونے پائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ پھر کسی وقت یہاں شرک و بدعت کا اڈا قائم کر لیں۔ لہٰذا آپ بھی اس کارِ خیر میں مساہمت اور مسابقت کے جذبہ کا اظہار فرمائیں۔ وَالتَّوْفِيْقُ بِيَدِ اللّٰهِ

❶ البداية والنهاية: ٢/ ٣٧، ٣٨

❷ مصنف ابن ابي شيبة، كتاب الصلوات، باب في الصلاة عند قبر النبي ﷺ و إتيانه، رقم الباب: ٦٦١، (٢/ ١٥٣)، رقم: ٧٥٤٩

❸ صحيح مسلم، كتاب صلاة المسافرين، باب استحباب صلاة النافلة في بيته......رقم: ١٨٢٤

❹ فتح الباري: ١/ ٥٣٠

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: اِغَاثَةُ اللَّهْفَانِ مِنْ مَصَايِدِ الشَّيْطَانِ لِلْحَافِظِ ابْنِ قَيِّم (ص: ۲۲۲تا ۲۳۱، اور فتاویٰ أهل حديث :۴۴۱/۳ تا ۴۴۵)

قبر کے ساتھ سیٹ پر نام وفات، عمر، پتہ لکھنا یا قبر پر نشاندہی لگانا کیسا ہے؟

سوال: قبر کے ساتھ سیٹ پر نام وفات، عمر، پتہ لکھنا جائز ہے یا نہیں؟ یا قبر پر نشانی لگانا کیسا ہے؟ مثلاً پتھر لگا دینا یا برتن گاڑ دینا؟ یا لکڑی گاڑ دینا؟ نام لکھنا وغیرہ؟ (محمد عرفان محمدی، ضلع وہاڑی) (۳۰ اگست ۱۹۹۶ء)

جواب: قبر پر لکھنے کی ممانعت وارد ہے۔ تحریر کی جونسی صورت بھی ہو سب ممنوع ہے۔ چنانچہ جامع ترمذی وغیرہ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے کہا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ قبر کو چونا گچ کیا جائے۔ اس پر بیٹھا جائے۔ اس پر عمارت بنائی جائے یا اس پر کچھ لکھا جائے۔ [1]

مباح شئے کے ساتھ قبر پر نشانی رکھنے کا کوئی حرج نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی قبر پر پتھر رکھتے ہوئے فرمایا کہ اس سے میں اپنے بھائی کی قبر پہچان لوں گا اور ہمارے اہل میں سے جو فوت ہوگا اس کے قریب ہی دفن کروں گا۔[2] البتہ حدیث اَوْ یُکْتَبُ عَلَیْهِ کی بناء پر قبر پر کتبہ لگانا حرام ہے۔ [3]

امام محمد ''آلاثار'' میں لکھتے ہیں: ''قبر پر لکھنا یا کتبہ لگانا مکروہ (حرام) ہے۔''

قبر پر نشانی لگانا کیسا ہے؟

سوال: قبر پر نشانی لگانا کیسا ہے؟ مثلاً پتھر لگا دینا یا برتن گاڑ دینا؟ یا لکڑی گاڑ دینا؟ نام لکھنا وغیرہ؟ (سائل) (۲۷ مئی ۲۰۱۱ء)

جواب: مباح چیز کے ساتھ قبر پر نشانی رکھنے کا کوئی حرج نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی قبر پر پتھر رکھتے ہوئے فرمایا: ''اس سے میں اپنے بھائی کی قبر پہچان لوں گا اور ہمارے اہل میں سے جو فوت ہوگا اس کے قریب ہی دفن کروں گا۔'' [4]

البتہ حدیث «اَوْ یُکْتَبَ عَلَیْهِ» (الحاكم:۳۷۰/۱) کی بناء پر قبر پر کتبہ لگانا حرام ہے۔ امام محمد رحمہ اللہ ''الآثار'' میں لکھتے ہیں: ''قبر پر لکھنا یا کتبہ لگانا مکروہ (حرام) ہے۔'' [5]

---

[1] سنن ابی داؤد، بَابٌ فِی الْبِنَاءِ عَلَی الْقَبْرِ، رقم:۳۲۲۵، ۳۲۲۶

[2] سنن ابی داؤد، بَابٌ فِی جَمْعِ الْمَوْتٰی فِی قَبْرٍ وَالْقَبْرُ یُعَلَّمُ، رقم:۳۲۰۶

[3] سنن النسائی، بَابُ الزِّيَادَةِ عَلَی الْقَبْرِ، رقم:۲۰۲۷

[4] سنن ابی داؤد، بَابٌ فِی جَمْعِ الْمَوْتٰی فِی قَبْرٍ وَالْقَبْرُ یُعَلَّمُ، رقم:۳۲۰۶

[5] کتاب الآثار، باب تسنيم القبور وتخصيصها: ۲۵۶

قبر پر نام وسنہ وغیرہ کا کتبہ آویزاں کرنے کا حکم؟

سوال : میت کا نام، ولدیت، اور تاریخ وفات وغیرہ لکھ کر کتبہ کی صورت میں قبر پر آویزاں کرنا سنت سے ثابت ہے یا نہیں؟ (سائل) (۱۳ جون ۲۰۰۳ء)

جواب : قبر پر نام، ولدیت اور تاریخ وغیرہ کا کتبہ لگانا درست نہیں۔ ''جامع ترمذی'' وغیرہ میں حدیث ہے:

''رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا کہ قبر کو چونا گچ کیا جائے، اس پر بیٹھا جائے۔ اس پر عمارت بنائی جائے۔ یا اس پر کچھ لکھا جائے۔''

امام محمد ''الآثار'' میں لکھتے ہیں کہ قبر پر لکھنا یا کتبہ لگانا مکروہ (حرام ہے) ہے، ہاں البتہ قبر کو امتیازی شکل دینے کے لیے اس پر پتھر وغیرہ رکھا جا سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے عثمان بن مظعون کی قبر پر پتھر رکھتے ہوئے فرمایا:

«أَتَعَلَّمُ بِهَا قَبْرَ أَخِي، وَأَدْفِنُ إِلَيْهِ مَنْ مَاتَ مِنْ أَهْلِي.» ❶

''اس سے میں اپنے بھائی کی قبر کو پہچان لوں گا اور ہمارے اہل سے جو فوت ہوگا میں اسے اس کے قریب دفن کروں گا۔''

قبروں پر پھول چڑھانے اور چراغ جلانے کا کیا حکم:

سوال : قبر پر پھولوں کی چادر چڑھانا یا دیے جلانا کیسا ہے؟ (سائل: قاری محمد لیسین یزدانی۔ عارف والا) (۹ جولائی ۱۹۹۹ء)

جواب : قبروں پر پھولوں کی چادر چڑھانا کتاب وسنت سے ثابت نہیں۔ نبی ﷺ کا فرمان ہے:

« مَنْ اَحْدَثَ فِيْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ »❷

''یعنی جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے۔''

اہل مغرب کی تقلید میں یہ قبیح رسم مسلمانوں میں داخل ہوئی۔ (اَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهَا) اس کا مرتکب دین سے بے بہرہ جاہل اور غبی ہے اور قبروں پر دیے جلانے والا شریعت کی نگاہ میں لعنت کا مستحق ہے۔ ایک حدیث میں ہے۔ قبروں پر چراغ جلانے والے پر رسول اللہ ﷺ نے لعنت کی ہے۔ ❸

اس حدیث کی تشریح میں صاحب ''المرعاۃ'' فرماتے ہیں:

---

❶ سنن أبي داؤد، بَابٌ فِي جَمْعِ الْمَوْتَى فِي قَبْرٍ وَالْقَبْرُ يُعَلَّمُ، رقم:۳۲۰۶، السنن الكبرىٰ للبيهقي، بَابُ إِعْلَامِ الْقَبْرِ بِصَخْرَةٍ أَوْ عَلَامَةٍ مَا كَانَتْ، رقم: ۶۷۴۴

❷ صحيح البخاري، بَابُ إِذَا اصْطَلَحُوا عَلَى صُلْحِ جَوْرٍ فَالصُّلْحُ مَرْدُودٌ، رقم:۲۶۹۷

❸ سنن ابي داؤد، بَابٌ فِي زِيَارَةِ النِّسَاءِ الْقُبُورَ، رقم:۳۲۳۶، سنن الترمذي، بَابُ مَا جَاءَ فِي كَرَاهِيَةِ أَنْ يَتَّخِذَ عَلَى الْقَبْرِ مَسْجِدًا، رقم: ۳۲۰، سنن النسائي، رقم:۲۰۴۳

« وَفِيْهِ رَدٌّ صَرِيْحٌ عَلَى الْقُبُوْرِيِّيْنَ الَّذِيْنَ يَبْنُوْنَ الْقُبَّابَ عَلَى الْقُبُوْرِ وَ يَسْجُدُوْنَ إِلَيْهَا، وَ يَسْرِجُوْنَ عَلَيْهَا وَ يَضَعُوْنَ الزهُوْرَ وَالرَّيَاحِيْن عَلَيْهَا تَكْرِيْمًا وَ تَعْظِيْمًا لِأَصْحَابِهَا.» ❶

''اس حدیث میں واضح تردید ہے ان قبوریوں کی جو قبروں پر قبے بناتے، ان کی طرف سجدے کرتے، ان پر چراغ جلاتے اور ان پر تعظیم واحترام کی خاطر پھول اور خوشبو رکھتے ہیں۔''

کیا قبروں پر پھول ڈالنا اور پھولوں کی چادر چڑھانا جائز ہے؟

سوال: قبر پر پھول ڈالنا از روئے قرآن و سنت کیسا ہے؟ ایک مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے جو ٹہنی قبر پر لگائی تھی وہ پھولوں والی تھی۔ (سائل) (۱۶ جنوری ۲۰۰۴ء)

جواب: قبر پر پھول وغیرہ رکھنا کتاب و سنت سے ثابت نہیں اللہ کے نبی ﷺ نے دو قبروں پر جو شاخیں رکھیں تھیں، حدیث بخاری وغیرہ میں اس کا سبب یہ بیان ہوا ہے کہ بعض گناہوں کی وجہ سے ان کو عذاب ہو رہا تھا، جب تک خشک نہیں ہو پاتیں عذاب رفع رہے گا۔

امام خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« هُوَ مَحْمُوْلٌ عَلٰى أَنَّهٗ دَعَا لَهُمَا بِالتَّخْفِيْفِ مُدَّة بَقَاءِ النَّدَاوَةِ ، لَا أَنَّ فِي الْجَرِيْدَةِ مَعْنًى يَخُصُّهٗ ، وَ لَا أَنَّ فِي الرَّطْبِ مَعْنًى لَيْسَ فِي الْيَابِسِ » ❷

''یہ محمول ہے اس پر کہ شاخوں کے تر رہنے تک کے لیے آپ ﷺ نے ان کے لیے تخفیف کی دعا کی تھی۔ ٹہنی میں کوئی خاصہ موجود نہیں تھا اور نہ تر چھڑی میں ہی ایسی خاصیت ہے جو خشک میں نہیں۔''

''اولیاء اللہ کی قبروں پر پھول چڑھانا سنت ہے۔'' کیا یہ روایت صحیح ہے؟

سوال: فضیلۃ الشیخ حافظ صاحب! درج ذیل ارشادات کی صحت وحقیقت کے متعلق آگاہ فرمائیں۔

۱۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے: «وَضْعُ الرَّيْحَانِ وَالْجَرِيدِ سُنَّةٌ » (طحطاوی علی مراقی الفلاح، ص:۳٦٤) ''اولیاء اللہ کی قبروں پر پھول چڑھانا سنت ہے۔''

۲۔ «تَرْكُ وَوَضْعُ السُّتُوْرِ وَالْعَمَائِمِ وَالثِّيَابِ عَلٰى قُبُوْرِهِمْ اَمْرٌ جَائِزٌ اِذَا كَانَ الْقَصْدُ بِذٰلِكَ التَّعْظِيْمَ فِيْ اَعْيُنِ النَّاسِ حَتّٰى لَا يَحْتَقِرُوا صَاحِبَ هٰذَا الْقَبرِ » (روح البیان)

---

❶ المرعاة : ۱/ ٤٨٦

❷ فتح الباری: ۱/ ۳۲۰

''پس گنبد بنانا علماء، اولیاء، صلحاء کی قبروں پر اور پردے لٹکانا، پگڑی باندھنا، کپڑے ڈالنا یہ تمام کام جائز ہیں، جب کہ مقصود لوگوں کی نظر میں تعظیم کرانا ہو کہ لوگ صاحب قبر کو حقیر نہ سمجھیں۔'' (سائل امیر علی نقشبندی) (۲ مارچ ۲۰۰۱ء)

جواب : مذکورہ تمام روایات بے بنیاد اور بے اصل ہیں۔ بزرگانِ دین کی عزت اور احترام کا ذریعہ قبروں کو چونا گچ کرنا اور ان کی پکی دیواریں بنانا نہیں ہے بلکہ ان کی زندگی میں ان کی دعاؤں کے اثرات ہی خیر و برکت کا موجب بنتے ہیں۔

کیا قبروں پر پھول چڑھانا، قبر کو سجدہ کرنا وغیرہ شرک نہیں؟ (ایک تقریر پر استفسار)

سوال : آپ کی خدمت میں جناب پروفیسر حافظ محمد سعید صاحب (امیر مرکز الدعوۃ والارشاد) کی ایک تقریر کا کچھ حصہ ارسال ہے۔ جس میں انھوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ قبروں پر پھول چڑھانا، قبر کو سجدہ کرنا وغیرہ شرک نہیں؟ متن ساتھ منسلک ہے آپ سے استفسار ہے کہ:

① کیا یہ موقف درست ہے؟ قرآن کی اصطلاح کی روشنی میں جو شرک کی تعریف کی گئی ہے کیا یہ تعریف درست ہے؟

② کیا اہل کتاب مشرک نہیں ہیں؟

③ کیا پھول چڑھانا اور قبروں کو سجدہ کرنا کسی صورت میں بھی شرک نہیں ہے؟

تقریر کا متن: ﴿ وَ مِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا...... ﴾ اور مشرکین سے کون لوگ مراد ہیں؟ مشرکین کی باقاعدہ اصطلاح قرآن کی اصطلاح ہے اور اس اصطلاح سے کون کون مراد ہیں؟ اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو اللہ کی شریعتوں کو نہیں مانتے تھے۔ نہ وہ تورات کو، نہ وہ انجیل کو، نہ وہ ان نبیوں کو اور نہ آخرت کو مانیں، نہ شریعت، نہ کتاب، نہ نبوت، نہ آخرت، جو ان کو سرے سے مانتے ہی نہیں تھے۔ ان کو قرآن مجید نے کیا کہا؟ مشرکین! یہ ہے مشرکین کی اصطلاح...... یہاں میں ایک بات اور بھی واضح کر دوں۔ بعض ہمارے بھائیوں کو ہو گی تو تکلیف! لیکن نئی بات کچھ پریشان کن بھی ہوتی ہے لیکن بات سمجھنے کی ہے ہمارے ہاں آج کل مشرکین کی اصطلاح کس کے لیے استعمال ہوتی ہے؟ کلمہ گو مسلمان جو قبروں کے اوپر پھول چڑھانے لگ جائیں یا ایسے وہاں جناب! دیئے جلانے لگ جائیں کوئی غلط کوئی سجدہ کر دے ان کو کیا کہتے ہیں؟ کہ ہم عام طور پر کہتے ہیں کہ جی یہ مشرکین ہیں۔ میرے بھائی! یہ مشرکین کی اصطلاح میں قرآن مجید کے اعتبار سے نہیں آئے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے عقیدوں میں خرابیاں ہیں ان کے لیے قرآن مجید میں اصطلاح فاسق کی موجود ہے۔ ان کے لیے اور مختلف قسم کی اصطلاحات قرآنِ مجید کے اندر موجود ہیں۔ قرآن میں مشرکین ان کو کہا گیا ہے جو نہ نبوت کو مانتے تھے نہ آخرت کو مانتے تھے نہ شریعت کو مانتے تھے۔ ان کو اہل کتاب کے مقابلے میں مشرکین کہا گیا ہے۔ اور اس آیت میں بھی ان دونوں کا ذکر ہے۔ فرمایا:

﴿وَ لَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَ مِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا اَذًی کَثِیْرًا﴾

(آل عمران: ١٧٦)

جواب : سوالات کے مشترکہ جواب بالاختصار ملاحظہ فرمائیں:

یہ اصطلاح غیر درست ہے کیونکہ قرآن نے یہود و نصاریٰ کی طرف بھی ان اعمال مذکورہ کی نسبت کی ہے اور انھیں مشرک بھی کہا ہے۔ بطورِ مثال ملاحظہ ہو: (التوبۃ: ۲۹، ۳۰، ۳۱ اور المائدۃ: ۷۲، ۷۳)

لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ عام مشرکوں کی نسبت بعض مسائل میں قرآن کریم نے ان سے امتیازی سلوک کیا ہے۔ اس بناء پر قرآن کے کئی ایک مقامات میں ان کو عام مشرکوں کے مقابلہ میں کتابی نسبت سے یاد کیا گیا ہے۔ تاہم صرف کتابی نسبت سے اس دھوکہ میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ یہ مشرک نہیں۔ بلاشبہ یہ بھی مشرک ہیں، جس طرح قرآنی آیات میں مصرح ہے۔ غالباً اسی وجہ سے میرے عزیز تلمیذ پروفیسر حافظ محمد سعید حفظہ اللہ کو غلطی لگ گئی کہ وہ مسلمان جن کی نسبت قرآن و اسلام کی طرف ہے وہ بھی مشرک نہیں ہو سکتے چاہے جتنے مرضی اعمال شرکیہ کے مرتکب ہوں۔ شاید اسی نظریے کی بناء پر جہادِ کشمیر میں وہ ایک قبوری تنظیم سے متعاون ہیں جس کا سلفی تنظیم سے ذہنی بُعد ہے۔

بھلا کون نہیں جانتا کہ غیر اللہ کے نام نذر و نیاز اور قبروں پر سجدہ ریز ہونا شرک ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُكِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَ بِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝﴾ (الانعام: ۱۶۲، ۱۶۳)

''آپ کہہ دیجیے! کہ میری نماز، میری قربانی اور میرا جینا، مرنا سب اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی بات کا حکم ملا ہے اور میں سب سے اوّل فرمانبردار ہوں۔''

یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ سجدہ اور ذبح عبادت ہے اور یہ حق غیر اللہ کو دینا شرک ہے حدیث میں ہے:

«لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ زَائِرَاتِ الْقُبُوْرِ وَالْمُتَّخِذِیْنَ عَلَیْهَا الْمَسَاجِدَ وَالسُّرُجَ» [1]

مرعاۃ المفاتیح (۱/ ۴۹۸) میں ہے:

«وَ فِیْهِ رَدٌّ صَرِیْحٌ عَلَی الْقُبُوْرِیِّیْنَ الَّذِیْنَ یَبْنُوْنَ الْقُبَابَ عَلَی الْقُبُوْرِ وَ یَسْجُدُوْنَ اِلَیْهَا وَ یَسْرُجُوْنَ وَ یَضَعُوْنَ الزُّهُوْرَ وَ الرِّیَا حِیْنَ عَلَیْهَا تَكْرِیْمًا وَ تَعْظِیْمًا لِاَصْحَابِهَا»

''یعنی اس حدیث میں صریح ردّ ہے ان قبوریوں کا جو قبروں پر قبے تعمیر کرتے، انھیں سجدہ کرتے ان پر چراغاں کرتے، اور اصحابِ قبور کی تعظیم و تکریم کرتے ہوئے ان پر پھول چڑھاتے ہیں۔''

[1] سنن ابی داؤد، بَابُ فِی زِیَارَةِ النِّسَاءِ الْقُبُوْرَ، رقم: ۳۲۳۶، سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِی كَرَاهِیَةِ أَنْ یَتَّخِذَ عَلَی الْقَبْرِ مَسْجِدًا، رقم: ۳۲۰، سنن النسائی، رقم: ۲۰۴۳

المرعاۃ (۱/۲۲۴) میں ہے:

''اور یہ قبوری لوگ جو قبروں پر پھول ڈالتے ہیں اور درخت لگاتے ہیں اور غلاف چڑھاتے ہیں پھر ان پر خوشبو بکھیرتے ہیں اور ان پر چراغ جلاتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بدعت اور گمراہی کے کام ہیں۔''

لہٰذا موصوف کو میرا مشورہ ہے کہ اپنے غلط موقف پر دلائل دینے اور اس کی توجیہ و تاویل کرنے کی بجائے اس سے رجوع کریں۔ اسی میں آپ کی عظمت و شان ہے۔ ان شاء اللہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مشہور مقولہ ہے:

« مَرَاجَعَةُ الْحَقِّ خَيْرٌ مِّنَ التَّمَادِي فِي الْبَاطِلِ » ❶

''باطل پر اصرار سے بہتر ہے کہ انسان حق کی طرف رجوع کرے۔''

اللہ رب العزت سب کو اخلاص کی توفیق بخشے۔ آمین

نذرانوں کی رقوم اور محکمہ اوقاف کے اداروں سے استفادہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟

سوال: اولیائے کرام کے مزاروں پر چڑھائے جانے والے نذرانے محکمہ اوقاف میں جمع ہوتے ہیں۔ محکمہ اوقاف کے کسی فلاحی شعبے مثلاً ہسپتال وغیرہ سے استفادہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ (سائل: محمد علی شاہ، لاہور) (۳۱ مئی ۲۰۰۲ء)

جواب: جس شعبے کے بارے میں یقین ہو کہ یہاں خالصتاً مزاروں کے نذرانے صرف ہو رہے ہیں، وہاں سے استفادے سے بچنا چاہیے بصورتِ دیگر کراہت کے ساتھ جواز ہے۔

قبر پر پودے لگائے جائے سکتے ہیں یا نہیں؟

سوال: قبر پر پودے لگائے جا سکتے ہیں یا نہیں؟

جواب: قبر پر پودے لگانے کا واضح کوئی ثبوت موجود نہیں۔

قبر پر اذان دینا بدعت ہے؟ اور کیا بعد از موت بندے پر شیطانی تسلط کا ڈر نہیں رہتا؟

سوال: میت کو قبر میں دفن کرنے کے بعد قبر پر اذان دینا کیسا ہے؟ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں قبر پر اذان دی گئی جو کہ باعثِ نزاع بنی ہوئی ہے اور قبر پر اذان دینے کے جواز میں مشکوٰۃ المصابیح کی یہ حدیث پیش کی جاتی ہے:

حدیث: «عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ الْأَنْصَارِيِّ، قَالَ: خَرَجْنَا مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا إِلَى سَعْدِ بْنِ مُعَاذٍ حِينَ تُوُفِّيَ، قَالَ: فَلَمَّا صَلَّى عَلَيْهِ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَوُضِعَ فِي قَبْرِهِ وَسُوِّيَ عَلَيْهِ، سَبَّحَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَسَبَّحْنَا طَوِيلًا، ثُمَّ كَبَّرَ فَكَبَّرْنَا، فَقِيلَ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ، لِمَ سَبَّحْتَ؟ ثُمَّ كَبَّرْتَ؟ قَالَ: لَقَدْ تَضَايَقَ عَلَى هَذَا الْعَبْدِ الصَّالِحِ قَبْرُهُ حَتَّى

❶ اعلام الموقعین: ۱/ ٦٨۔ السنن الکبری للبیهقی: ۱۰/ ۱۱۹.

فَرَّجَهُ اللّٰهُ عَنْهُ» ❶

۲۔ کیا شیطان (ابلیس) قبر میں میت کے پاس آتا ہے یا نہیں؟

۳۔ کیا شیطان قبر میں سوال و جواب کے وقت میت کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے؟

قبر پر اذان دینے سے شیطان بھاگ جاتا ہے اور میت کو جواب دینے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ یہ دلیل بھی پیش کرتے ہیں۔

۞ محمد فیض احمد صاحب اویسی مصنف کتاب ''قبر پر اذان'' نے اذان دینے کو ثابت کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمادیں اور حدیثِ بالا کی بھی وضاحت کریں۔

(احقر العباد، محمد ادریس بھوجیانی۔ٹوبہ ٹیک سنگھ) (۹ جولائی ۱۹۹۳ء)

جواب : قبر پر اذان دینا بدعت ہے کتاب وسنت اور سلف صالحین کے عمل سے اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ نبی ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

«مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَیْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ» ❷

''یعنی جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے۔''

اور سوال میں ذکر کردہ حدیث کا زیرِ حدیث مسئلہ سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس سے مستدل کا قبر پر اذان دینے کے جواز پر استدلال کرنا اس کی جہالت اور لاعلمی کا مظہر ہے۔ اس میں تو صحابی جلیل پر قبر تنگ ہونے کی بناء پر آپ ﷺ کا محض تسبیح وتکبیر میں سُبْحَانَ اللّٰهَ اور اَللّٰهُ اَکْبَر کہنے کا ذکر ہے۔ اس کے سبب اللہ رب العزت نے اس کی قبر کو فراخ کردیا تھا۔ پھر یہ کہاں ہے کہ مسنون ومشروع اذان بھی اس موقع پر کہی گئی۔ ﴿هَاتُوْا بُرْهَانَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صَادِقِیْنَ﴾ حدیث ہذا ''مسند احمد'' کے علاوہ ''طبرانی کبیر'' میں بھی موجود ہے۔ لیکن متکلم فیہ ہے۔ چنانچہ صاحب ''مجمع الزوائد'' فرماتے ہیں:

«وَ فِیْهِ مَحْمُوْدُ بْنُ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْجَمُوْحِ...... قَالَ الْحُسَیْنِیُّ فِیْهِ نَظْرٌ»

اس کے بعد والے جملہ سوالوں کا جواب یہ ہے کہ موت کے بعد والا گھر دارالجزاء ہے۔ دارالعمل نہیں ہے کہ شیطان کا آدمی کو ورغلانے یا غلبے کا موقع میسر آسکے۔ شیطانی بھاگ دوڑ صرف دنیا تک محدود ہے۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

❶ رواہ احمد: ۳/ ۳۶۰۔ مشکوٰۃ باب اثبات القبر فصل ثالث، ص:۲۶.

❷ صحیح البخاری، بَابُ إِذَا اصْطَلَحُوا عَلَى صُلْحِ جَوْرٍ فَالصُّلْحُ مَرْدُودٌ، رقم:۲۶۹۷

«اِنَّ الشَّیْطَانَ قَالَ وَ عِزَّتِكَ یَا رَبِّ لَا اَبْرَحُ اُغْوِی عِبَادَكَ مَا دَامَتْ اَرْوَاحُھُمْ فِی اَجْسَادِھِمْ فَقَالَ الرَّبُّ عَزَّوَجَلَّ وَ عِزَّتِیْ وَ جَلَالِیْ وَ اِرْتِفَاعِ مَکَانِیْ لَا اَزَالُ اَغْفِرُ لَھُم مَا اسْتَغْفَرُوْنِی» ❶

''تحقیق شیطان نے پروردگار سے عرض کیا اے میرے پروردگار تیری عزت کی قسم میں تیرے بندوں کو ہمیشہ گمراہ کرتا رہوں گا جب تک کہ ان کے ارواح ان کے بدنوں میں ہوں گے۔ پس پروردگار نے فرمایا مجھے اپنی بزرگی دعزت اور بلند مرتبہ کی قسم ہے کہ میں ان کو ہمیشہ بخشتا رہوں گا جب تک کہ مجھ سے بخشش مانگتے رہیں گے۔''

لہٰذا بعد از موت شیطانی تسلّط یا بذریعہ اذان اس کو اس موقعہ پر بھگانے کا نظریہ بالکل فضول اور بے کار ہے۔ تارِ عنکبوت سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ ﴿وَاللّٰہُ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَاءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ﴾ (البقرۃ: ۲۱۳)
واضح ہو کہ اہل بدعت کا ہمیشہ سے یہ شیوہ ہے کہ وہ اپنے خودساختہ نظریات وعقائد کی ترویج کے لیے کتاب وسنت کی قطع وبرید میں لگے رہتے ہیں۔ شاید کہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل جائے۔ دراصل فعلِ ہذا دین ودنیا کے اعتبار سے انتہائی خطرناک کھیل ہے۔ ﴿فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُھُمْ وَ مَا کَانُوْا مُھْتَدِیْنَ﴾ (البقرۃ:۱٦) اللہ رب العزت جملہ مسلمانوں کو رجوع الی الحق کی توفیق بخشے۔ آمین

قبر پر قبلہ رخ ہو کر دعا کرنا

سوال: کیا دعا قبر کی بجائے قبلہ کی طرف منہ کر کے کرنی چاہیے؟

جواب: اصل یہی ہے کہ دعا کے وقت قبروں کی طرف متوجہ نہ ہوا جائے، بلکہ قبلہ رو کھڑے ہو کر دعا کی جائے۔ اس لیے کہ نبی ﷺ نے قبر کی طرف متوجہ ہو کر نماز سے منع فرمایا ہے اور دعا ہی نماز کا لب لباب ہے۔ لہٰذا دعا بھی قبلہ رُخ ہو کر کی جائے۔ اس بناء پر علماء محققین کا یہ فیصلہ ہے کہ دعا کے وقت بھی اس جانب متوجہ ہونا مستحب ہے جس جانب نماز ادا کی جاتی ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! اقتضاء الصراط المستقیم لابن تیمیۃ۔

بعد از جنازہ اور قبر پر دعا کا شرعی حکم (ایک حنفی فتوے پر تعاقب)

سوال: مکرمی ومخدومی مفتی صاحب۔ میں نے گزشتہ دنوں بصیر پور کے مفتی محمد محبّ اللہ نوری صاحب سے ''دعا بعد نمازِ جنازہ'' کے جواز اور عدمِ جواز کے بارے میں استفسار کیا تھا تو انھوں نے مجھے جو جواب ارسال فرمایا، وہ میں آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں۔ آپ ازراہِ کرم کتاب وسنت کی روشنی میں اس فتوے کا جائزہ لیں اور

❶ مسند احمد، رقم: ۱۱۲۳۷، ۳/ ۲۹، ۷٦۔ صحیح الجامع: ۱٦۵۰.

اصل مسئلہ پر بھی روشنی ڈالیں۔نوری صاحب موصوف کا جواب درج ذیل ہے۔

(محمد اسلم رانا ایڈیٹر ماہنامہ ''المذاہب'' لاہور) (۱۵دسمبر۲۰۰۰ء)

مکرم ومحترم جناب پروفیسر محمد اسلم رانا صاحب۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ......مزاجِ گرامی!

مکتوب گرامی باصرہ افروز ہوا، یادفرمائی کا شکریہ......گزشتہ کئی روز مسلسل سفر میں رہا، جواب میں تاخیر پر معذرت خواہ ہوں......

''دعا بعد نمازِ جنازہ'' کے حوالے سے آپ نے اپنے تاثرات کا اظہار فرمایا، جواباً عرض ہے کہ حضرت فقیہ اعظم عَلَیہِ الرَّحمَۃ نے دعا کی اہمیت پر احادیث نقل کیں...... جب دعا کی اس قدر تاکید ہے تو نمازِ جنازہ کے بعد بھی کی جانی چاہیے۔جب کہ کسی حدیث میں اس سے منع نہیں کیا گیا۔جب دعا مطلقاً جائز ہے تو جنازہ کے بعد ناجائز کیوں؟

حدیث مبارک «اِذَا صَلَّیْتُمْ عَلَی الْمَیِّتِ فَاَخْلِصُوا لَهُ الدُّعَاء» [1] کا ترجمہ ''جب میت پر نماز پڑھ چکو تو اخلاص کے ساتھ اس کے لیے دعا کرو'' ازروئے قواعد درست ہے، کیونکہ ''فاءِ تعقیب'' کا یہی مفاد ہے۔

آپ نے شاید توجہ نہیں فرمائی۔مضمون میں خاص دعا بعد نمازِ جنازہ کے حوالے سے کئی احادیث ہیں۔مثلاً یہ کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے جنازہ پڑھایا پھر بعد از فراغت دعا فرمائی۔یہ حدیث ''ابن ابی شیبہ'' میں ہے۔

یہ جان کر اطمینان ہوا کہ ماہنامہ نور الحبیب باقاعدہ آپ کو مل رہا ہے۔(والسلام)

(صاحبزادہ) محمد محب اللہ نوری مہتمم دارالعلوم حنفیہ فریدیہ بصیر پور شریف۔(اوکاڑہ)

جواب: فتویٰ میں مذکور حدیث کی تشریح بقول علامہ مناوی رحمہ اللہ یوں ہے کہ

''میت کے لیے اخلاص کے ساتھ دعا کرو کیوں کہ اس نمازِ (جنازہ) سے مقصود میت کے لیے صرف سفارش کرنا ہے جب دعا میں اخلاص اور عاجزی ہوگی تو اس کے قبول ہونے کی امید ہے۔ [2]

''مستدرک حاکم'' میں حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

« وَيُخْلِصُ الصَّلَاةَ فِي التَّكْبِيرَاتِ الثَّلَاثِ .» [3]

''یعنی جنازہ کی تین تکبیروں کے دوران اخلاص سے دعا کرے۔''

حدیث ہذا میں اس امر کی وضاحت ہوگئی کہ دعا کا تعلق صرف حالتِ نماز کے ساتھ ہے۔اصولی قاعدہ معروف ہے

[1] سنن ابن ماجه، بَابُ مَا جَاءَ فِي الدُّعَاءِ فِي الصَّلَاةِ عَلَى الْجِنَازَةِ، رقم:۱۴۹۷

[2] عون المعبود:۳/ ۱۸۸

[3] المستدرك للحاكم، كِتَابُ الْجَنَائِزِ، رقم:۱۳۳۱

کہ: «اَلْاَحَادِیْثُ یُفَسِّرُ بَعْضُھَا بَعْضًا» ''احادیث ایک دوسری کی تفسیر ہوتی ہیں۔'' بنابریں محولہ حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جب تم نمازِ جنازہ پڑھنا چاہو تو میت کے لیے خلوص کے ساتھ دعا کرو۔

یہ اقامۃ المسبب مقام السبب کی قبیل سے ہے۔ ارادہ سبب اور نماز مسبب ہے۔ فاء کی ترتیب وتعقیب بلا مہلت ہونے کا یہی مطلب ہے اگر مقصود یہاں دعا بعد الصلوٰۃ ہوتی تو پھر ''فاء'' کی بجائے لفظ ''ثُمَّ'' ہونا چاہیے تھا۔ یعنی «فَاَخْلِصُوْا» کی بجائے «ثُمَّ اَخْلِصُوْا» ہونا چاہیے تھا۔ جو عام حالات میں ترتیب اور تراخی (وقفے) کا فائدہ دیتا ہے۔ لہٰذا مفتی صاحب موصوف کی توجیہ غلط ہے کہ فاء تعقیب کا یہی مفاد ہے۔

پھر یہ حدیث سنن ابی داؤد اور سنن ابن ماجہ وغیرہ میں ہے۔ امام ابوداؤد نے یہ حدیث جنازے کے دوران دعائیں پڑھنے کے ضمن میں ذکر کی ہے۔ انھوں نے اس پر تبویب یوں قائم کی ہے: «بَابُ الدُّعَاءِ لِلْمَیِّتِ» ''میت کے لیے دعا کا بیان۔''

اس حدیث پر امام ابن ماجہ کی تبویب بھی ملاحظہ فرمائیں۔ اور بار بار غور سے پڑھیں۔ وہ فرماتے ہیں: «بَابُ مَا جَاءَ فِی الدُّعَاءِ فِی الصَّلٰوۃِ عَلَی الْجَنَازَۃِ» ''نمازِ جنازہ میں دعا کے بارے میں جو کچھ وارد ہوا ہے۔ اس کا بیان)

اس سے معلوم ہوا کہ محدثین اور مفتی صاحب کے فہم میں بُعد المشرقین ہے، لہٰذا تحریف ہذا پر انھیں ندامت کا اظہار کر کے حق کی طرف رجوع کی فکر کرنی چاہیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

« وَمُرَاجَعَۃُ الْحَقِّ خَیْرٌ مِنَ التَّمَادِی فِی الْبَاطِلِ»❶

''باطل پر اصرار سے بہتر ہے کہ آدمی حق کی طرف رجوع کر لے۔''

اگر مفتی صاحب کا مذکورہ قاعدہ تسلیم کر لیا جائے تو بہت سی قرآنی آیات میں بھی معنوی تحریف ہو جائے گی۔ مثال کے لیے یہ آیت ملاحظہ فرمائیں۔ قرآنِ مجید میں ہے:

﴿ فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ﴾ (النحل:۹۸)

''جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو۔''

ائمہ لغت ''زجاج'' وغیرہ نے اس کے معنی یوں بیان کیے ہیں:

«اِذَا اَرَدْتَّ اَنْ تَقْرَاَ الْقُرْاٰنَ اِسْتَعِذْ بِاللّٰهِ وَ لَیْسَ مَعْنَاہُ بَعْدَ اَنْ تَقْرَاَ الْقُرْاٰنَ.»

''یعنی'' جب تم قرآن کی تلاوت کا ارادہ کرو تو اللہ سے پناہ مانگ لیا کرو۔ یہ معنی نہیں کہ تلاوتِ قرآن کے بعد اعوذ باللہ پڑھا کرو۔''

❶ اعلام الموقعین:۱/ ۶۸

اسی کی مثل قائل کا یہ قول بھی ہے کہ: «اِذَا اَکَلْتَ فَقُلْ بِسْمِ اللّٰهِ.» ''یعنی جب تم کھانے کا ارادہ کرو تو بسم اللہ پڑھو۔'' اس کے قطعاً یہ معنی نہیں کہ کھانے سے فراغت کے بعد بسم اللہ پڑھنی چاہیے۔''

امام واحدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، فقہائے کرام کا اس بات پر اجماع ہے کہ استعاذہ قراءت سے پہلے ہے۔ ❶

اس میں شبہ نہیں کہ شرع میں عمومی دعا کی تاکید و تلقین اور فضیلت وارد ہوئی ہے اور غالباً اسی بناء پر فقہائے حنفیہ نے جنازے میں قراءت سے استغناء اختیار کرکے اس کا نام دعا و ثناء وغیرہ رکھا ہے۔ ''موطا امام محمد رحمہ اللہ'' میں ہے:

«لَا قِرَاءَةَ عَلَى الْجَنَازَةِ وَ هُوَ قَوْلُ اَبِیْ حَنِیْفَةَ.»

اور یہ قول ''المبسوط'' سرخسی میں بھی ہے۔ (۲/۶۴)

البتہ محقق ابن الہمام ''فتح القدیر'' (۱/۴۹۸) میں فرماتے ہیں کہ فاتحہ نہ پڑھے تاہم بہ نیت ثناء پڑھی جاسکتی ہے کیونکہ قراءت رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں۔ علامہ ابن الہمام جیسے محقق کی یہ بات انتہائی مضحکہ خیز ہے۔ اس لیے کہ فاتحہ کی قراءت کا اثبات تو ''صحیح بخاری'' میں موجود ہے۔

«بَابُ یَقْرَأُ فَاتِحَةَ الْکِتَابِ عَلَی الْجَنَازَةِ.»

تو پھر کیا یہ بات معقول ہے کہ اثنائے جنازہ میں اخلاصِ دعا کی تاکید تو نہ ہو لیکن سلام پھیرنے کے بعد کہا جائے کہ اب اخلاص سے دعا کرو۔ غالباً اس دھوکہ کے پیش نظر نمازِ جنازہ کا تو جھٹکا کرتے ہیں بعد میں لمبی لمبی دعائیں کی جاتی ہیں۔ جس کی شریعت میں کوئی اصل نہیں۔

واضح ہو کہ ''اصولِ فقہ'' کا قاعدہ معروف ہے کہ عبادات میں اصل ممانعت ہے جواز کے لیے دلیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ (یعنی دعا سمیت ہر دعا کے لیے دلیل کی ضرورت ہے) عہدِ نبوت میں کتنے جنازے پڑھے گئے کسی ایک موقع پر بھی ثابت نہیں ہو سکا کہ نبی ﷺ نے بعداز جنازہ دعا کی ہو۔ صحیح حدیث میں ہے:

« مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَیْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ » ❷

''یعنی جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے۔''

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«عَلَیْكَ بِالْاٰثَرِ وَ طَرِیْقَةِ السَّلْفِ وَ اِیَّاكَ وَ کُلَّ مُحْدَثَةٍ فَاِنَّهَا بِدْعَةٌ.» ❸

''آثار اور طریقہ سلف کو لازم پکڑو۔ اپنے آپ کو دین میں اضافہ سے بچاؤ کیوں کہ وہ بدعت ہے۔''

---

❶ تفسیر فتح القدیر: ۳/ ۱۹۳

❷ صحیح البخاری، بَابُ إِذَا اصْطَلَحُوا عَلَی صُلْحِ جَوْرٍ فَالصُّلْحُ مَرْدُودٌ، رقم: ۲۶۹۷

❸ ذم التأویل ابن قدامه: ۱/ ۳۳.

ابن الماجشون نے کہا کہ میں نے امام مالک رحمہ اللہ سے سنا، وہ فرماتے تھے:

''جو دین میں بدعت ایجاد کر کے اسے اچھی سمجھے تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے رسالت میں خیانت کی ہے کیونکہ اللہ کا فرمان ہے: ﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ .... ﴾ (المائدۃ:۳) جو چیز اُس وقت دین نہیں تھی وہ آج بھی دین نہیں ہو سکتی۔''

اور امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جس نے بدعت کو اچھا سمجھا، اس نے نئی شریعت بنالی۔''

(السنن والمبتدعات)

نیز یہ بھی یاد رہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول اثر کا تعلق جنازے کے متصل بعد کی دعا سے نہیں بلکہ دفنِ میت سے ہے۔ جیسا کہ یہاں منقول جملہ آثار اس بات پر دال ہیں۔ اس اثر پر مصنف نے جو عنوان قائم کیا ہے۔ اس کے الفاظ یوں ہیں:

«فِي الدُّعَاءِ لِلْمَيِّتِ بَعْدَ مَا يُدْفِنُ وَ يُسَوَّىٰ عَلَيْهِ»

''قبر پر مٹی برابر کر کے میت کے لیے دعا کرنے کا بیان۔''

اس میں تو کسی کو کلام نہیں، یہ ثابت شدہ امر ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عبداللہ ذوالبجادین کی قبر پر دیکھا، جب دفن سے فارغ ہوئے تو قبلہ رُخ ہاتھ اٹھا کر دعا کی۔ [1]

اَلْخَيْرُ كُلُّ الْخَيْرِ فِي الْاِتِّبَاعِ وَالشَّرُّ كُلُّ الشَّرِّ فِي الْاِبْتِدَاعِ۔

اللہ رب العزت جملہ مسلمانوں کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق بخشے۔ آمین

قبر پر قرآن خوانی درست ہے؟

سوال : کیا قبر پر قرآن پڑھنا زبانی یا ناظرہ درست ہے؟ نیز یہ بتائیں کہ ایصالِ ثواب کا کیا طریقہ ہے؟

(محمد زکریا، متعلّم جامعہ کمالیہ دارالحدیث راجووال) (۱۶ جنوری ۱۹۹۸ء)

جواب : کسی صحیح حدیث میں قبر پر قرآن مجید زبانی یا ناظرہ پڑھنا ثابت نہیں۔ ایصالِ ثواب کا طریقۂ کار یہ ہے کہ مثلاً میت کے لیے دعا کی جائے۔ قرآن میں ہے:

﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ ﴾ (الحشر:۱۰)

یا صدقہ خیرات کر دیا جائے۔ حدیث میں ہے: صدقہ جاریہ یا علمی انتفاع مثلاً شاگردی یا مفید تالیفات وغیرہ یا نیک اولاد جو والدین کے لیے دعا گو ہیں۔ اسی طرح میت کی طرف سے قربانی کرنا یا اس کی طرف سے حج کرنا۔ مسجد بنوا

[1] المجمع : ۹/ ۳۵۸۔ فتح الباری:۱۱/ ۱۴۴ .

دینا یا مدارس میں غریب طلبہ کی خدمت کرنا یا خیراتی تعمیر میں حصہ دار بننا وغیرہ وغیرہ۔

قبر پر دعا کرنے کے حکم

سوال: میت کو دفنانے کے بعد قبر پر دعا کرنا کیا رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے؟ بعض حضرات کہتے ہیں کہ قبر پر کھڑے ہو کر جو دعا کی جاتی ہے یہ نبی کریم ﷺ سے ثابت نہیں۔ نیز سعودی عرب میں قبر پر کھڑے ہو کر ایسے دعا نہیں کی جاتی۔ (وَاللّٰهُ تَعَالٰى اَعْلَمُ .) وضاحت فرمادیں کہ صحیح کیا ہے؟

جواب: میت کو دفن کرنے کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔ ابو عوانہ نے اپنی ''صحیح'' میں حدیث بیان کی ہے:

« فَلَمَّا فَرَغَ مِنْ دَفْنِهِ اِسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ رَافِعًا يَدَيْهِ .»[1]

''یعنی رسول اللہ ﷺ جب عبداللہ ذی النجادین کو دفن کرکے فارغ ہوئے تو آپ نے قبلہ رُخ ہو کر ہاتھ اٹھا کر اس کے لیے دعائے مغفرت کی۔''

سعودی عرب میں فتوے کی دائمی کمیٹی نے اپنے ایک فتویٰ میں کہا ہے کہ میت کو دفن کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ سے دعاء و استغفار ثابت ہے۔ رسول اللہ ﷺ میت کے دفن سے فارغ ہوئے تو کھڑے ہو کر فرمایا: اپنے بھائی کے لیے بخشش کی دعا اور ثابت قدمی کا سوال کرو ابھی ابھی اس سے سوال ہوگا۔[2]

قبروں پر ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا کیسا ہے؟

سوال: قبروں پر ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا کیسا ہے؟ (ابوعبداللہ نذیر احمد جونیجو، سندھ) (۷ مئی ۱۹۹۹ء)

جواب: قبرستان میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا جائز ہے۔ چنانچہ ''مسند احمد'' وغیرہ میں حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ رات کے وقت بقیع میں تشریف لے گئے۔ وہاں جا کر کھڑے ہوگئے۔ پھر آپ نے ہاتھ اٹھائے (اور دعا کی) پھر واپس چلے آئے۔ نیز ''صحیح مسلم'' اور ''مسند احمد'' میں حضرت عائشہ سے ایک دوسرے قصہ میں مروی ہے کہ آپ ﷺ اہل بقیع کے پاس تشریف لے گئے۔ اور وہاں تین مرتبہ ہاتھ اٹھا کر دعا کی لیکن داعی بوقت دعا، قبروں کی طرف متوجہ نہ ہو بلکہ قبلہ رو کھڑے ہو کر دعا کرے۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے قبر کی طرف متوجہ ہو کر نماز سے منع فرمایا ہے۔ اور دعا ہی نماز کا لب لباب ہے۔ لہٰذا دعا بھی قبلہ رُخ ہو کر ہی کی جائے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ دعا ہے کہ دعا کے کرنے والے کے لیے اس جانب متوجہ ہونا مستحب ہے جس

[1] بحواله فتح الباری: ۱۱/ ۱٤٤

[2] سنن ابی داؤد، بَابُ الِاسْتِغْفَارِ عِنْدَ الْقَبْرِ لِلْمَيِّتِ فِي وَقْتِ الِانْصِرَافِ، رقم ۳۲۲۱) فتاویٰ اسلامیہ: (۲/ ۳۰)

جانب کہ وہ نماز میں متوجہ ہوتا ہے۔ ❶

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دعاء کے وقت قبلہ کی جانب متوجہ ہونا ضروری ہے۔ خواہ دعا کرنے والا روضۃ الرسول کے جوار (پاس) میں کیوں نہ ہو۔ یہی مسلک ائمہ شوافع کا بھی ہے جس طرح کہ "شرح المهذب" نووی میں ہے۔ امام ابوحنیفہ کا بھی مسلک ہے جس کی تصریح ''القاعدة الجليله'' میں موجود ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک پر سلام کے وقت بھی توجہ الی القبلہ ضروری قرار دیتے ہیں۔ جیسا کہ دعا میں ضروری ہے البتہ عام حالات میں امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی ''صحیح'' میں قبلہ رُخ اور غیر قبلہ رُخ دونوں طرح دعا کو جائز قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

« بَابُ الدُّعَاءِ غَيْرِ مُسْتَقْبِلِ الْقِبْلَةَ . »

خطبہ جمعہ میں آنحضرت ﷺ کی دعا: « اللَّهُمَّ حَوَالَيْنَا وَلَا عَلَيْنَا » ❷ سے ان کا استدلال ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«وَوَجْهُ أَخْذِهُ مِنَ التَّرْجَمَةِ مِنْ جِهَةِ أَنَّ الْخَطِيبَ مِنْ شَأْنِهِ أَنْ يَسْتَدْبِرَ الْقِبْلَةَ وَأَنَّهُ لَمْ يُنْقَلْ أَنَّهُ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا دَعَا فِي الْمَرَّتَيْنِ اسْتَدَارَ وَقَدْ تَقَدَّمَ فِي الِاسْتِسْقَاءِ مِنْ طَرِيقِ إِسْحَاقَ بْنِ أَبِي طَلْحَةَ عَنْ أَنَسٍ فِي هَذِهِ الْقِصَّةِ فِي آخِرِهِ وَلَمْ يَذْكُرْ أَنَّهُ حَوَّلَ رِدَاءَهُ وَلَا اسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ.» ❸

اور دوسری تبویب یوں ہے: بَابُ الدُّعَاءِ مُسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةِ پھر حدیث الاستسقاء کے الفاظ سے استدلال ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« فَأَشَارَ كَعَادَتِهِ إِلَى مَا وَرَدَ فِي بَعْضِ طُرُقِ الْحَدِيثِ وَقَدْ مَضَى فِي الِاسْتِسْقَاءِ مِنْ هَذَا الْوَجْهِ بِلَفْظٍ وَإِنَّهُ لَمَّا أَرَادَ أَنْ يَدْعُوَ اسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ وَحَوَّلَ رِدَاءَهُ.»

اس بارے میں متعدد احادیث وارد ہیں۔ جن میں قبلہ رُخ کا تعین ہے۔ صاحب ''فتح الباری'' نے ان کی نشاندہی کی ہے۔ پھر بحث کے اختتام پر فرماتے ہیں: ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے، میں نے رسول اللہ ﷺ کو عبداللہ ذی النجادین کی قبر پر دیکھا...... الحدیث۔

اس میں یہ الفاظ بھی ہیں:

❶ اقتضاء الصراط المستقيم، ص:١٧٥

❷ صحيح البخاري، بَابُ الِاسْتِسْقَاءِ فِي الْمَسْجِدِ الْجَامِعِ، رقم:١٠١٣

❸ فتح الباري:١١/ ١٤٣

«فَلَمَّا فَرَغَ مِنْ دَفْنِهِ اِسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ رَافِعًا يَدَيْهِ اَخْرَجَهُ عَوَانَةُ فِي صَحِيْحِهِ.» ❶

''یعنی جب آپ ﷺ عبداللہ ذی نجادین کے دفن سے فارغ ہوئے تو قبلہ رُخ ہوکر آپ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے۔''

قبرستان میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا

سوال : قبرستان میں جا کر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا کیسا ہے؟ (السائل ثناء اللہ محمد سموں منگیریہ ضلع بدین سندھ) (۱۱ستمبر۱۹۹۲ء)

جواب : قبرستان میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا جائز ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«حَتَّى جَاءَ الْبَقِيعَ فَقَامَ، فَأَطَالَ الْقِيَامَ، ثُمَّ رَفَعَ يَدَيْهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ انْحَرَفَ فَانْحَرَفْتُ.» ❷

مزاروں پر اور فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا

سوال : مزاروں پر اور فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کا سلسلہ کب شروع ہوا؟ (سائل) (۲۷مئی ۲۰۱۱ء)

جواب : قبرستان میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا سنت سے ثابت ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«فَوَقَفَ فِي اَدْنَى الْبَقِيْعِ ثُمَّ رَفَعَ يَدَيْهِ.» ❸

''نبی ﷺ بقیع کے پاس کھڑے ہوگئے پھر آپ نے ہاتھ اٹھائے (اور دعا کی) پھر واپس چلے آئے۔''

اور ''صحیح مسلم'' و ''مسند احمد'' میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ایک دوسرے قصہ میں مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ اہل بقیع کے پاس تشریف لے گئے اور وہاں تین مرتبہ ہاتھ اٹھا کر دعا کی اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے میں نے رسول اللہ ﷺ کو عبداللہ ذی النجادین کی قبر پر دیکھا:

«فَلَمَّا فَرَغَ مِنْ دَفْنِهِ اسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ رَافِعًا يَدَيْهِ.» ❹

''جب آپ ﷺ اس کے دفن سے فارغ ہوئے تو قبلہ رخ ہوکر دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کی۔''

❶ بحواله فتح الباری: ۱۱/ ۱٤٤

❷ سنن النسائی، بَابُ الامر بالاستغفار للمؤمنین، رقم: ۲۰۳۷، صحیح مسلم، بَابُ مَا يُقَالُ عِنْدَ دُخُولِ الْقُبُورِ وَالدُّعَاءِ لِأَهْلِهَا، رقم: ۹۷٤ (ج: ۱، ص: ۳۱۳)

❸ موطأ امام مالك، رقم: ۵۵، مسند احمد، رقم: ۲٤٦۱۲، اسناده حسن، سنن النسائی، اَلْأَمْرُ بِالِاسْتِغْفَارِ لِلْمُؤْمِنِينَ، رقم: ۲۰۳۸

❹ ابوعوانة فی صحیحه بَابُ دَعْوَةِ النَّبِيِّ ﷺ لِخَادِمِهِ بِطُولِ الْعُمُرِ وَبِكَثْرَةِ مَالِهِ، بحواله فتح الباری: ۱۱/ ۱٤٤

میت کو قبر میں دفن کرنے کے بعد قبر پر کھڑے ہو کر ''سورۃ بقرۃ'' کی آیات تلاوت کرنا

سوال : میت کو قبر میں دفن کرنے کے بعد قبر پر ''سورہ بقرہ'' کے ابتدائی اور آخری رکوع کی تلاوت کرنا اور اسمائے الٰہی پڑھنا کیسا ہے؟ کیا میت کی بخشش کے لیے اس موقع پر جنازے والی دعائیں پڑھی جاسکتی ہیں؟

(محمد یحییٰ عزیز۔قصور) (۴مئی ۲۰۰۰ء)

جواب : قبر پر کھڑے ہو کر ''سورہ بقرہ'' کی آیات کی تلاوت والی حدیث امام بیہقی رحمہ اللہ نے ''شعب الایمان'' میں ذکر کی ہے لیکن اُسے ضعیف قرار دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ درست بات یہ ہے کہ یہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ اسمائے الٰہی کا وِرد بھی ثابت نہیں۔ البتہ دعاء کرنا جزء رفع الیدین ونسائی وغیرہ میں ثابت ہے اور دعائیں جونسی چاہے پڑھ لے۔

قبر پر میت کے سرہانے ''سورۃ البقرۃ'' کی تلاوت کرنا

سوال : میت کو دفنانے کے بعد قبر کے سرہانے اور پاؤں کی طرف کھڑے ہو کر ''سورہ البقرۃ'' کی ابتدائی اور آخری آیات اور قل وغیرہ کی تلاوت کے بارے میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی جو روایت پیش کی جاتی ہے کیا وہ سنداً صحیح ہے اور کیا یہ عمل مسنون ہے؟ (سائل) (۲۴ اگست ۲۰۰۱ء)

جواب : یہ روایت مرفوع اور موقوف دونوں طرح ثابت نہیں۔ مرفوع میں راوی یحییٰ بن عبداللہ الضار البابلتی ضعیف ہے۔ ابو حاتم وغیرہ نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے اور ازدی نے کہا متروک ہے۔ اور موقوف کی سند میں عبدالرحمٰن بن العلاء بن اللجاج مجہول ہے۔ ملاحظہ ہو حاشیہ مشکوٰۃ علامہ البانی: (۱/ ۵۳۸)

قبرستان میں بیٹھ کر قرآن مجید کی تلاوت کرنا

سوال : کیا قرآن مجید قبرستان میں لے جا کر قبر پر بیٹھ کر پڑھنا یا زبانی قبر کے پاس پڑھنا جائز ہے یا کہ نہیں؟ دونوں طرح کے دلائل دیں! (سائل: محمد حامد عاصم آلہ آبادی آرائیانوالہ) (۲۴ اکتوبر ۱۹۹۷ء)

جواب : قبرستان میں قرآن مجید پڑھنا کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔

قبرستان میں مرحومین کی بخشش کے لیے کون سی دعائیں پڑھنا مسنون ہیں؟

سوال : قبرستان میں جا کر مرحومین کی بخشش کے لیے کون کون سی دعائیں پڑھنا مسنون ہیں؟ اور قبر کے کس حصے پر کھڑے ہو کر دعائیں پڑھیں؟ (سائل محمد یحییٰ عزیز کوٹ رادھا کشن) (۱۱۴ اگست ۱۹۹۸ء)

جواب : قبرستان میں میت کے لیے ہر وہ دعا پڑھی جاسکتی ہے جس میں اس کے لیے مغفرت کی دعا ہو۔ مثلاً ﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ﴾ (الحشر: ۱۰) اور عائشہ رضی اللہ عنہا کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا بھی سکھائی تھی۔

«اَلسَّلَامُ عَلٰی اَھْلِ الدِّیَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُسْلِمِیْنَ وَ یَرْحَمُ اللّٰہُ الْمُسْتَقْدِمِیْنَ مِنَّا وَالْمُسْتَأْخِرِیْنَ وَ اِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰہُ بِکُمْ لَلَاحِقُوْنَ» ❶

مزید اس موضوع پر مؤلفہ کتابوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے کچھ دعاؤں کا ذکر''صحیح مسلم'' میں ہے۔قبروں سے پیچھے ہٹ کر قبلہ رُخ ہو کر دعا کرنی چاہیے۔

جانوروں سے حفاظت کے لیے قبر کے گرد لکڑی کا جنگلا لگانے کا حکم؟

سوال : قبر کی حرمت کو جانوروں سے پامال ہونے سے بچانے کے لیے ہمارے ہاں لکڑی کا جنگلا قبروں کے چاروں اطراف لگایا جاتا ہے۔کیا یہ کام درست ہے؟ (سائل) (۱۳ جون ۲۰۰۳ء)

جواب : قبر کی حفاظت کی خاطر جنگلا نہیں لگانا چاہیے، یہ فعل سنت سے ثابت نہیں۔تاہم جانوروں پر کنٹرول کرنے کی مقدور بھر کوشش کرنی چاہیے، جس سے قبر کی حفاظت ہو جائے۔

نئی قبر پر درندوں کے خوف کی وجہ سے لالٹین جلانا

سوال : نئی قبر پر درندوں کے خوف کی وجہ سے لالٹین جلانا یا ویسے آگ جلانا کہ روشنی کی وجہ سے قبر کو درندے نقصان نہ پہنچائیں، جائز ہے؟ (محمد یعقوب منڈریاں) (۹ فروری ۱۹۹۶ء)

جواب : قبر پر چراغ یا آگ جلانا منع ہے۔قبر کی حفاظت کے لیے خاردار لکڑیاں رکھی جا سکتی ہیں یا کوئی اور مباح قسم کا انتظام کر لینا چاہیے یا پھر لالٹین یا آگ کو قبر سے ہٹ کر دور رکھ دیا جائے تو بظاہر کوئی حرج نہیں۔

«اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ» ❷

قبر میت پر گر جائے تو اسے دوبارہ درست کرنا؟

سوال : میرے والد صاحب تقریباً ڈیڑھ دو ماہ پہلے فوت ہوئے تھے۔ان کی قبر اندر کی طرف گر گئی تھی۔اور پکی سلیں میت کے اوپر گئی تھیں۔ہم نے اسی طرح قبر صحیح حالت میں کر دی۔یہ تقریباً پندرہ روز پہلے کی بات ہے۔آپ سے سوال یہ ہے کہ کیا قبر کو دوبارہ کھود کر ان کے اوپر سے وزن اٹھا کر پھر دوبارہ قبر بنا دی جائے یا ایسے ہی رہنے دیا جائے؟

دوسری بات یہ ہے کہ کیا مٹی ڈالنے سے پہلے قبر پر سلیں یا پھٹے ڈالنا ضروری ہیں یا اسی طرح میت پر مٹی ڈال دی جائے؟

جواب : آپ کے والد صاحب مرحوم کی قبر جس حالت میں ہے۔اسی میں رہنے دیں۔تجدید کی ضرورت نہیں۔معاملہ

---

❶ صحیح مسلم(۷/ ٤٤)، بَابُ مَا یُقَالُ عِنْدَ دُخُولِ الْقُبُورِ وَالدُّعَاءِ لِأَھْلِھَا، رقم: ۹۷٤، سنن النسائی (٤/ ۹۲-۹۳)، بَابُ الْأَمْرُ بِالِاسْتِغْفَارِ لِلْمُؤْمِنِینَ، رقم: ۲۰۳۷

❷ صحیح البخاری، کَیْفَ کَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ إِلَی رَسُولِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ؟، رقم: ۱

اللہ کے سپرد کریں۔ اس کے ہاں نیکی وتقویٰ کی بنیاد پر بہت ہی آسانی وکشادگی موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی قبر منور فرمائے۔ آمین۔

مٹی اور میت کے درمیان کوئی شے حائل ہونی چاہئے۔ اسی طرح مٹی ڈالنا احترامِ میت کے منافی ہے۔ عمرو بن حزم فرماتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے مجھے ایک قبر پر ٹیک لگائے دیکھا، فرمایا: ''اس قبر والے کو ایذا نہ دو۔''[1]

نیز فرمایا: نبی اکرم ﷺ نے میت کی ہڈی توڑنا زندہ کی ہڈی توڑنے کی طرح ہے۔ ان روایات سے معلوم ہوا احترامِ میت کے منافی کوئی فعل نہیں ہونا چاہیے۔ احادیث میں وارد لفظ شق (سامی) لحد (بغلی قبر) کا تقاضا بھی یہی ہے کہ درمیان میں آڑ ہو۔ عوارضات کی بناء پر بعض میتوں کی نقل مکانی کے واقعات جو احادیث میں موجود ہیں اسی امر کے مؤید ہیں۔

(تدفین اور بعض دیگر مسائل)

مسجد کے اردگرد جائے مدفن بنانا

سوال: ہمارے علاقے میں ایک عام دستور یہ ہے کہ جو آدمی مسجد کے لیے زمین دیتا ہے تو مسجد کی تعمیر کے بعد اس سے ملحق زمین کو اپنے خاندان کے لیے مدفن کے طور پر استعمال کرنے لگتا ہے۔ اس لیے اکثر مسجدیں ہمارے یہاں ایسی ہیں جن کے اردگرد قبریں ہیں۔ یہاں تک کہ قبلے کی سمت میں بھی قبریں ہیں تو قبروں کے بیچ ان مسجدوں میں نماز پڑھنا کیسا ہے؟ (حاجی عبدالرحمن السّلفی چترال) (۱۵ جنوری ۱۹۹۹ء)

جواب: موجودہ شکل کو تبدیل کرنا چاہیے۔ جائے مدفن قبرستان ہے نہ کہ مسجد کا قرب و جوار، ایسی مسجد میں نماز پڑھنے سے احتراز کرنا چاہیے۔

- نبی ﷺ نے قبروں پر بیٹھنے اور ان کی طرف نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔[2]
- اور قبروں پر مسجدیں بنانے سے بھی منع فرمایا ہے۔[3]

اور صحیحین میں ہے آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ یہود پر لعنت کرے۔ انھوں نے انبیاء علیہم السلام کی قبروں کو مسجدیں بنالیا۔[4]

---

[1] المستدرك للحاكم، ذِكْرُ عُمَارَةَ بْنِ حَزْمِ الْأَنْصَارِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، رقم:٦٥٠٢

[2] صحيح مسلم، بَابُ النَّهْيِ عَنِ الْجُلُوسِ عَلَى الْقَبْرِ وَالصَّلَاةِ عَلَيْهِ، رقم: ٩٧٢، سنن ابى داؤد، بَابٌ فِي كَرَاهِيَةِ الْقُعُودِ عَلَى الْقَبْرِ، رقم:٣٢٢٩

[3] سنن الترمذى، بَابُ مَا جَاءَ فِي كَرَاهِيَةِ أَنْ يَتَّخِذَ عَلَى الْقَبْرِ مَسْجِدًا، رقم: ٣٢٠، سنن النسائى، رقم:٢٠٤٣

[4] صحيح البخارى، بَابُ مَا يُكْرَهُ مِنَ اتِّخَاذِ الْمَسَاجِدِ عَلَى الْقُبُورِ، رقم:١٣٣٠، صحيح مسلم، بَابُ النَّهْيِ عَنْ بِنَاءِ الْمَسَاجِدِ، عَلَى الْقُبُورِ......الخ، رقم:٥٢٩

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ اسلام میں قبر اور مسجد کو جمع کرنے کا قصور مفقود ہے۔ البتہ خصائص کی بناء پر مسجد نبوی کا حکم اس سے مستثنیٰ ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: کتاب تحذیر الساجد۔ مولف علامہ البانی رحمہ اللہ۔

مسجد کے قریب قبر بنانا

سوال: درج ذیل سوال کے متعلق مفصل جواب قرآن وحدیث کی روشنی میں عنایت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

مسجد کے قریب قبر بنانا کیسا ہے؟ یا قبر کے نزدیک مسجد بنانا جائز ہے؟ جب کہ قبر نبوی ﷺ آج کل مسجد کے اندر ہی موجود ہے۔ اردگرد مسجد ہے۔ لوگ نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ اگر یہ استثناء ہے تو کس دلیل سے؟ (یہاں پر تین قبریں ہیں) (انجینئر محمد بلال کوٹ ادو، ضلع مظفر گڑھ) (۱۰ مئی ۱۹۹۶ء)

جواب: مسجد کے نزدیک قبر بنانا یا قبر کے نزدیک مسجد تعمیر کرنا دونوں طرح ناجائز ہے۔ کیونکہ اسلام میں مسجد اور قبر کا اجتماع ممنوع ہے۔ حدیث میں ہے:

« اجْعَلُوا فِي بُيُوتِكُمْ مِنْ صَلَاتِكُمْ وَلَا تَتَّخِذُوهَا قُبُورًا.» ❶

''یعنی گھروں میں بھی نماز پڑھا کرو انھیں قبریں مت بناؤ۔''

اور دوسری روایت میں ہے:

« الْأَرْضُ كُلُّهَا مَسْجِدٌ، إِلَّا الْمَقْبَرَةَ وَالْحَمَّامَ.» ❷

یعنی'' قبرستان اور حمام کے علاوہ تمام زمین مسجد ہے۔''

اوّل الذکر روایت سے اکثر اہل علم نے استدلال کیا ہے کہ قبرستان محل نماز نہیں ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے حدیث ہذا میں بَابُ كَرَاهِيَةِ الصَّلَاةِ فِي الْمَقَابِرِ کا ترجمہ قائم کیا ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ جس نے قبرستان میں یا کسی قبر کی جانب رُخ کر کے نماز پڑھی وہ اس کا اعادہ کرے اور جہاں تک مسجد نبوی کا تعلق ہے۔ سو وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہے کیونکہ اس کی فضیلت خصوصی حیثیت سے ہے۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے۔ میری اس مسجد میں نماز کا ثواب دوسری مساجد کے مقابلہ میں ہزار نماز سے زیادہ ہے۔ ما سوائے مسجد الحرام کے کہ وہ اس سے افضل ہے۔ ❸

---

❶ صحيح البخاری، بَابُ كَرَاهِيَةِ الصَّلَاةِ فِي الْمَقَابِرِ، رقم: ٤٣٢

❷ سنن ابن ماجه، بَابُ الْمَوَاضِعِ الَّتِي تُكْرَهُ فِيهَا الصَّلَاةُ، رقم: ٧٤٥، سنن ابی داؤد، بَابٌ فِي الْمَوَاضِعِ الَّتِي لَا تَجُوزُ فِيهَا الصَّلَاةُ، رقم: ٤٩٢

❸ صحيح البخاری، كتاب فضل الصلاة فی مسجد مكة والمدينة، بَابُ فَضْلِ الصَّلَاةِ فِي مَسْجِدِ مَكَّةَ وَالْمَدِينَةِ، رقم: ١١٩٠

اور دوسری روایت میں ہے کہ میرے بیت یعنی حجرہ اور منبر کے درمیان کا قطعہ جنت کے باغات سے ہے۔ ❶
لہٰذا اگر مسجد نبوی میں نماز کی کراہت کا فتویٰ دیا جائے تو اس کی حیثیت دوسری مساجد کے برابر ہو جائے گی۔ اور ان فضائل کی نفی لازم آئے گی۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی معروف کتاب ''الجواب الکافی''

بوقت دفن قبرستان میں مخصوص آیات کی تلاوت کرنا

سوال: نمازِ جنازہ کے بعد قبر تیار ہونے کے بعد اکثر دیوبندی علماء حضرات (اور بعض چھوٹی چھوٹی نماز کی کتب اہل حدیث میں بھی نظر سے گزرا ہے) قبر کی سرہاندی پر کھڑے ہو کر ﴿الٓمّٓ o ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ....هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ o﴾ (البقرۃ:۲) اور ٹانگوں کی طرف ﴿هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ....وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ (الحشر:۵۹) پڑھنے کے بعد ایک بار ''سورۂ فاتحہ'' اور گیارہ بار ''سورۃ اخلاص'' پڑھتے ہیں۔ کیا یہ طریقہ جائز ہے۔ کتاب وسنت کی روشنی میں مطلع فرمادیں۔ (صوبیدار محمد بشیر) (۱۶ جولائی ۱۹۹۳ء)

جواب: مذکورہ آیات کا قبرستان میں وِرد و وظیفہ کرنا بسند صحیح رسول اللہ ﷺ سے قطعاً ثابت نہیں ہے۔ صحیح حدیث میں ہے:

« مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ » ❷

یعنی ''جس نے دین میں اضافہ کیا وہ مردود ہے۔''

دفن کرتے وقت مردے کے سینے پر قرآن مجید رکھنا

سوال: کیا مردے کو دفناتے وقت اس کے سینے پر قرآن مجید رکھ کر دفنایا جا سکتا ہے؟

(آفتاب اقبال (ابوطلحہ) جہلم) (یکم مئی ۱۹۹۸ء)

جواب: میت کو دفن کے وقت اس کے سینے پر قرآن مجید نہیں رکھنا چاہیے۔ یہ عمل کتاب وسنت سے ثابت نہیں۔ لہٰذا بدعت ہے۔ حدیث میں ہے:

« مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ » ❸

یعنی ''جس نے دین میں اضافہ کیا وہ مردود ہے۔''

---

❶ صحيح البخاری، بَابُ فَضْلِ مَا بَيْنَ الْقَبْرِ وَالْمِنْبَرِ، رقم:۱۱۹۵
❷ صحيح البخاری، بَابُ إِذَا اصْطَلَحُوا عَلَى صُلْحِ جَوْرٍ فَالصُّلْحُ مَرْدُودٌ، رقم:۲۶۹۷
❸ صحيح البخاری، بَابُ إِذَا اصْطَلَحُوا عَلَى صُلْحِ جَوْرٍ فَالصُّلْحُ مَرْدُودٌ، رقم:۲۶۹۷

قبر میں مردے کے ساتھ قرآن مجید بھی دفن کرنا

سوال: ایک گھرانے نے اپنی بہو کی وفات کے وقت بطورِ ثواب قبر میں عورت کے سینے پر قرآن مجید رکھ کر دفنا دیا ہے کیا اسلام میں جائز ہے؟ اور کیا اب قبر کو اکھاڑ کر قرآن مجید نکالنے کی اجازت ہے یا کہ نہیں؟

(آفتاب اقبال (ابوطلحہ) جہلم) (یکم مئی ۱۹۹۸ء)

جواب: میت کے ساتھ قرآن کو دفنانے کی صورت میں اب قبر کو اکھاڑنا نہیں چاہیے کیونکہ یہ فعل اکرامِ میت کے منافی ہے۔

بوقت دفن دعا «مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ» کی سند کی تحقیق

سوال: دفن کے وقت دعا مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ کی سند کی تحقیق۔ (یقین شاہ اورکزئی ابوظبی) (۲۵ اکتوبر ۱۹۹۶ء)

جواب: یہ حدیث ''مسند احمد'' اور ''سنن الکبریٰ بیہقی'' میں ہے لیکن اس کی سند سخت ضعیف ہے کیونکہ اس میں یکے بعد دیگر تین راوی ضعیف ہیں۔

تدفین کے وقت قبر کے اندر رشتہ داروں کا تھوڑی سے مٹی جمع کر کے رکھنا

سوال: تدفین کے وقت قبر کے اندر رشتہ داروں کا ذرہ ذرہ مٹی جمع کر کے تھوڑی سی رکھنا کیسا ہے؟

(ابوعبداللہ نذیر احمد جونیجو، سندھ) (۷ مئی ۱۹۹۹ء)

جواب: بوقت دفن رشتہ داروں کا قبر کے اندر مٹی رکھنا محض رسم و رواج ہے۔ اس سے اجتناب ضروری ہے۔ حدیث میں ہے:

«مَنْ اَحْدَثَ فِيْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ »[1]

''یعنی جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے۔''

تدفین کے بعد کیا قبر پر پانی چھڑکا جا سکتا ہے؟

سوال: میت کو دفن کرنے کے بعد قبر پر پانی چھڑکنا کیا صحیح احادیث سے ثابت ہے؟ (سائل) (۳۰ مئی ۲۰۰۳ء)

جواب: میت کو دفن کرنے کے بعد قبر پر پانی چھڑکنے والی بعض روایات میں کلام ہے۔ البتہ عبدالعزیز دراوردی عن جعفر بن محمد عن ابیہ کے طریق کو علامہ البانی رحمہ اللہ نے ''ارواء الغلیل'' (۳/۲۰۶) میں سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیا ہے۔ اور جعفر بن محمد عن ابیہ سے دوسرے طریق کے بارے میں فرماتے

[1] صحيح البخاری، بَابُ إِذَا اصْطَلَحُوا عَلَى صُلْحِ جَوْرٍ فَالصُّلْحُ مَرْدُوْدٌ، رقم:۲۶۹۷

ہیں کہ ''یہ سند مرسل صحیح ہے۔'' یہ دونوں طریق ''سنن کبریٰ بیہقی'' میں ہیں جو عمل ہذا کے جواز پر دلالت کرتے ہیں۔

تدفین کے بعد قبر سے ستر قدم پر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا چاہیے یا نہیں؟

سوال : جنازہ پڑھ کر اور میت کو دفن کر کے ستر قدم پر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا چاہیے یا نہیں؟

(محمد عرفان محمدی، ضلع وہاڑی) (۳۰ اگست ۱۹۹۶ء)

جواب : میت کو دفن کرنے کے بعد ستر قدم پر ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا کتاب وسنت سے ثابت نہیں۔ اس کا مرتکب اہل بدعت سے شمار ہوگا۔

دفن میت کے بعد قبر پر اجتماعی دعا کا حکم

سوال : جنازہ کو دفنانے کے بعد اجتماعی دعا کا کیا حکم ہے؟ (السائل ثناء اللہ محمد سموں منگریہ ضلع بدین سندھ) (۱۱ ستمبر ۱۹۹۲ء)

جواب : دفن کے بعد میت کے لیے دعاء مغفرت کرنا اسوۂ رسول ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل سے ثابت ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا فَرَغَ مِنْ دَفْنِ الْمَيِّتِ وَقَفَ عَلَيْهِ فَقَالَ اِسْتَغْفِرُوا لِاَخِيْكُمْ ثُمَّ سَلُوا لَهُ بِالتَّثْبِيْتِ فَإِنَّهُ الْآنَ يُسْأَلُ » [1]

''یعنی نبی ﷺ دفنِ میت سے فارغ ہو کر قبر پر کھڑے ہوتے اور فرماتے اپنے بھائی کے لیے دعاءِ بخشش کرو۔ پھر اس کے لیے اللہ کے حضور ثابت قدمی کی درخواست کرو وہ اس وقت سوال کیا جاتا ہے۔''

حدیث ہذا محتمل ہے کہ دعائے استغفار انفرادی ہو یا اجتماعی ہاتھ اٹھا کر ہو یا بلا ہاتھ اٹھانے کے۔ البتہ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ انفرادی طریقہ کو اپنایا جائے اور ہاتھ اٹھانا بھی ضروری نہیں۔ اس کے بغیر بھی ہو سکتی ہے اگرچہ ہاتھ اٹھانا جائز ہے۔ کما سبق

دفن کے بعد اہل میت کے ہاں اجتماع میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا:

سوال : دفن کے بعد قبر پر تو نبی ﷺ نے مردے کے لیے استقامت کی دعا کی ہے۔ کیا بعد میں بھی ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کا کوئی ثبوت ہے؟ خصوصاً یہ کہ جب ہر آنے والا مطالبہ کرتا ہے کہ دعاء کرو یا فاتحہ پڑھو۔ تو اس حالت میں کیا دعا کرنا جائز ہے؟ آپ ﷺ یا صحابہ رضی اللہ عنہم سے کیا طریقہ ثابت ہے؟ کچھ لوگ اس طرح دعا کرنے کو بدعت کہتے ہیں۔ کچھ جائز سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دعا کرنے میں کیا حرج ہے؟ (شاہ جہاں ملک۔ میانوالی) (۲۷ مارچ ۱۹۹۸ء)

جواب : میت کے لیے ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کا جواز ہے۔ ''صحیح بخاری'' باب غزوۂ اوطاس کے تحت اس امر کی تصریح

[1] سنن ابی داؤد، بَابُ الاِسْتِغْفَارِ عِنْدَ الْقَبْرِ لِلْمَيِّتِ فِي وَقْتِ الاِنْصِرَافِ، رقم: ۳۲۲۱.

موجود ہے۔ لیکن ہمارے ہاں بیٹھنے کی موجودہ کیفیت محل نظر ہے۔ حضرت جریر کی روایت میں ہے کہ اہل میت کے ہاں اجتماع کو ہم نوحہ (بین) شمار کرتے تھے۔

دوسرا دعا کے آداب میں سے ہے کہ آدمی باوضوء ہو۔ بیٹھنے والے تو حقے کا دَور چلا کر اِدھر ادھر کی باتیں ہانک رہے ہوتے ہیں۔ اہل میت کا حزن وغم ہلکا کرنے کے بجائے اس میں اضافہ کے موجب بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ اسی حالت میں یکے بعد دیگرے فاتحہ پڑھنے کے آوازے آنے لگتے ہیں۔ بظاہر یہ منظر روحِ دعا کے منافی ہے۔ لہٰذا بایں حالت اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔

تعزیت کے موقعے پر میت کے لیے ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کا حکم

سوال : میت والے گھر جا کر ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا قرآن وسنت کی رُو سے درست ہے یا نہیں؟

(حافظ محمد مسعود سلفی۔ سیالکوٹ) (۱۶ جنوری ۲۰۰۴ء)

جواب : اصلاً میت کے لیے ہاتھ اٹھا کر (یا ہاتھ اٹھائے بغیر) دعا کرنا ثابت ہے لیکن میت والے گھر کی مخصوص مجلس میں اور مخصوص حالت میں دعا کرنا ثابت نہیں۔ [1]

تدفین کے بعد کے ایام میں تعزیت کے وقت دعائے مغفرت کا مسنون طریقہ کیا ہے؟

سوال : مردہ بھائی کے لیے اس کی تدفین کے بعد کے ایام میں دعائے مغفرت کا مسنون طریقہ کیا ہے؟ کیا اس کے لیے دعا کرتے وقت کسی وقت ہاتھ اٹھانے کا جواز ہے؟

جواب : بلاتعیین وقت اور مکان کے میت کے لیے ہر وقت مغفرت کی دعا ہو سکتی ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ﴾ (الحشر:۱۰)

''اے پروردگار! ہمارے اور ہمارے بھائیوں کے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں، گناہ معاف فرما۔''

نیز میت کے لیے ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا جائز ہے۔ حدیث میں ہے:

« فَدَعَا بِمَاءٍ فَتَوَضَّأَ ثُمَّ رَفَعَ یَدَیْهِ فَقَالَ: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِعُبَیْدٍ أَبِیْ عَامِرٍ وَرَأَیْتُ بَیَاضَ إِبْطَیْهِ. ثُمَّ قَالَ: اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ فَوْقَ کَثِیْرٍ مِّنْ خَلْقِكَ مِنَ النَّاسِ.» [2]

---

[1] مفتی صاحب کا اشارہ غالباً اس طریقے کی طرف ہے جو ہمارے ہاں رائج ہو گیا ہے کہ ہر شخص مجلس میں آتے ہی سب سے دعا کرنے کا تقاضا کرتا ہے کہ ''دعا کرو جی'' پھر سب لوگ گپیں ہانکتے ہانکتے اور بعض سگریٹ کے کش لگاتے لگاتے ہاتھ اٹھا کر دعا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ طریقہ بذاتِ خود دعا کی توہین اور اُس کے آداب کی خلاف ورزی ہے۔ ورنہ کتاب وسنت کے مطابق تمام آداب اور تقاضوں کا لحاظ رکھتے ہوئے دعا کرنے کا انکار کیسے کیا جا سکتا ہے۔ (حافظ عبدالوحید)

[2] صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب غزوة أوطاس، رقم: ٤٣٢٣، ٦٣٨٣.

''یعنی نبی ﷺ نے پانی منگوایا، پھر ہاتھ اٹھا کر دعا کی فرمایا: اے اللہ! عبید ابو عامر کو معاف کردے۔ راوی کا بیان ہے کہ میں نے آپ ﷺ کی بغلوں کی سفیدی دیکھی، یعنی اس قدر ہاتھ بلند کیے۔ پھر فرمایا اے اللہ! قیامت کے دن اسے اپنی مخلوق میں سے بہت پر فائق فرما۔''

رسول اللہ ﷺ کو وفات کے تین دن بعد دفنانے میں کیا حکمت تھی؟

سوال: رسول اللہ ﷺ کو وفات کے تین دن بعد دفنانے کا کیا جواز تھا؟ حالانکہ حدیث میں میت کو جلدی دفنانے کا حکم موجود ہے؟

جواب: بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے مخصوص حالات کی وجہ سے آپ کے جنازہ میں تاخیر ہوئی۔ مثلاً آپ کو دفن کہاں کیا جائے، اور غسل کا طریقہ کار کیا ہونا چاہیے۔ کپڑے اتار کر دیا جائے یا کپڑوں سمیت وغیرہ وغیرہ۔ مکمل اطمینان کے بعد آخری مرحلہ کی تکمیل ہوئی۔

میت کی خواہش کے مطابق قبرستان سے علیحدہ رہائشی جگہ کے صحن میں دفن کرنا؟

سوال: کیا میت کو حسبِ خواہش قبرستان سے علیحدہ رہائشی جگہ کے صحن میں دفن کیا جا سکتا ہے؟

(عبدالرزاق اختر، محمدی چوک، حبیب کالونی گلی نمبر ۱۲، رحیم یار خان) (مارچ ۲۰۰۵)

جواب: میت کو رہائشی جگہ میں دفن نہیں کرنا چاہیے، ''صحیح بخاری'' میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

« فَإِنْ أَذِنَتْ لِيْ فَادْفِنُوْنِيْ وَإِلَّا فَرُدُّوْنِيْ إِلٰى مَقَابِرِ الْمُسْلِمِيْنَ » ❶

یعنی ''اگر ام المومنین رضی اللہ عنہا مجھے آنحضرت ﷺ کے ساتھ دفن کرنے کی اجازت دے دیں تو ٹھیک ہے ورنہ مجھے مسلمانوں کے عام قبرستان میں دفن کر دینا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ دفن کا اصل مقام قبرستان ہے۔ ''صحیح مسلم'' میں حدیث ہے:

« لَا تَجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ مَقَابِرَ » ❷

''اپنے گھروں کو قبرستان مت بناؤ۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس حدیث کے تحت رقم طراز ہیں:

« فَإِنَّ ظَاهِرَهٗ يَقْتَضِي النَّهْيَ عَنِ الدَّفْنِ فِي الْبُيُوْتِ مُطْلَقًا.» ❸

---

❶ صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب ماجاء فی قبر النبی ﷺ، رقم: ۱۳۹۲

❷ صحیح مسلم، بَابُ اسْتِحْبَابِ صَلَاةِ النَّافِلَةِ فِي بَيْتِهِ، وَجَوَازِهَا فِي الْمَسْجِدِ، رقم: ۷۸۰

❸ فتح الباری: ۱/ ۵۳۰

’’حدیث کا ظاہر اس بات کا متقاضی ہے کہ گھروں میں دفن کرنا منع ہے۔‘‘

میت کو ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل کرنے کے واسطے بطورِ امانت دفن کرنا

سوال: میت کو ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل کرنے کے واسطے امانت کے طور پر دفن کردینا، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کونسی مجبوریوں کے تحت ایسا کیا جاسکتا ہے؟ اور اس امانت کا زیادہ سے زیادہ وقت کتنا ہوسکتا ہے؟

(رانا محمد اقبال۔ ساہیوال) (۲۷ جون ۱۹۹۷ء)

جواب: اصل یہ ہے کہ جہاں کوئی فوت ہو وہیں دفن کردیا جائے۔ ترمذی میں حدیث ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بھائی عبدالرحمٰن کی بعد از وفات نقل مکانی پر فرمایا تھا:

« وَاللّٰهِ لَوْ حَضَرْتُكَ مَا دُفِنْتَ إِلَّا حَيْثُ مُتَّ. » ❶

ہاں البتہ جگہ کی فضیلت کی بناء پر بعض اہل علم جواز نقل کے قائل ہیں۔ ❷

جب کہ دوسری طرف مؤطا امام مالک رحمہ اللہ کے جَامِعُ الْقَضَاءِ وَكَرَاهِيَتُهُ میں ہے۔

ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے حضرت سلمان کو لکھا سرزمین پاک شام میں تشریف لے آیئے۔ جواباً انھوں نے کہا: ’’زمین کسی کو پاک اور مقدس نہیں بناتی۔ اصل میں انسان کے اعمال ہی اس کو پاک بناتے ہیں۔‘‘

پھر بطورِ امانت کسی کو دفن کرنے کا شریعت میں کوئی تصور نہیں۔ لہٰذا تعیین ایام کا سوال بے محل ہے۔

ولادت کے بعد فوت شدہ جڑواں بچوں کا جنازہ اور دفن کا طریقہ:

سوال: ولادت کے بعد فوت شدہ جڑواں بچوں کا جنازہ اور دفن کا طریقہ کیا ہے؟ (سائل) (۱۳ اپریل ۱۹۹۸ء)

جواب: بیک وقت پیدا ہونے والے دو بچے وفات کی صورت میں ان کا جنازہ پڑھا جائے اور علیحدہ علیحدہ قبروں میں دفن کرنا چاہیے کیونکہ اصل یہی ہے۔ فرمایا:

﴿ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ﴾ (عبس:۲۱) ’’پھر اس کو موت دی پھر قبر میں دفن کرایا۔‘‘

جڑواں بچے اکٹھے ہوں تو کیا ان کی تدفین کے لیے ایک ہی قبر بنائی جائے؟

سوال: دو بچے اکھٹے پیدا ہوئے ہیں اور اکٹھے ہی فوت ہوگئے ہیں کیا دونوں کو الگ الگ دفن کریں یا ایک ہی قبر میں دفن کیا جائے؟ (ابو حنظلہ محمد محمود علوی) (۱۳ جون ۱۹۹۷ء)

جواب: اصلاً چونکہ ہر انسان کے لیے قبر جداگانہ ہے۔ لہٰذا ان دونوں بچوں کو علیحدہ دفن کیا جائے۔ قرآن میں ہے:

---

❶ سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي الرُّخْصَةِ فِي زِيَارَةِ القبور، رقم:۱۰۵۵

❷ فتح الباری:۳/ ۲۰۷

﴿ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ﴾ (عبس:۲۱)

مردے کی تدفین کے بعد میت والے گھر میں لوگوں کو کھانا کھلانا اور ٹینٹ لگانا

سوال: مردے کی تجہیز و تکفین کے بعد میت والے گھر میں جو ٹینٹ وغیرہ لگتے ہیں اور پھر وہاں پر موجود لوگوں کو کھانا وغیرہ ملتا ہے۔ کیا اس کا قرآن و حدیث سے کوئی ثبوت وغیرہ موجود ہے؟

(آصف احسان ملک ستیانہ روڈ۔ فیصل آباد۔ ۱۱ اپریل ۱۹۹۷ء)

جواب: مردے کی تجہیز و تکفین کے بعد اہلِ میت کے ہاں اجتماع کا شرع میں کوئی ثبوت نہیں بلکہ حدیث جریر میں اس کو نوحہ کی قبیل سے شمار کیا گیا ہے۔

اہل میت کے گھر میں کھانا

سوال: مردے کی تجہیز و تکفین کے بعد میت والے گھر میں جو ٹینٹ وغیرہ لگتے ہیں اور پھر وہاں پر موجود لوگوں کو کھانا وغیرہ ملتا ہے کیا اس کا قرآن و حدیث سے کوئی ثبوت موجود ہے۔

جواب: مردے کی تجہیز و تکفین کے بعد اہلِ میت کے ہاں اجتماع کا شرع میں کوئی ثبوت نہیں۔ بلکہ حدیث جریر میں اس کو نوحہ کی قبیل سے شمار کیا گیا ہے۔

میت کی تدفین کے بعد لوگوں کو کھانے کی دعوت دینا؟

سوال: آدمی کے فوت ہونے سے تقریباً ایک ہفتہ بعد لواحقین، اہل محلہ اور گاؤں کے عام لوگوں کو کھانے کی دعوت دیتے ہیں۔ قرآن و حدیث میں اس کا کیا حکم ہے؟ (محمود الحسن سلیم، سکردو بلتستان) (۱۱ جون ۱۹۹۹ء)

جواب: کھانے کی ایسی مجالس میں شرکت نہیں کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ یہ طریقِ کار سنت نبوی سے ثابت نہیں۔

حدیث میں ہے:

« مَنْ اَحْدَثَ فِی اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَیْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ »[1]

''یعنی جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے۔''

یاد رہے سوئم، دسواں بیسواں، چالیسواں، چھ ماہی، برسی وغیرہ سب بدعات کے زمرہ میں شامل ہیں۔

''شرح المنہاج'' نووی اور حنفی فقہ کی کتابوں میں ہے۔

«اِتِّخَاذُ الطَّعَامِ فِی الْیَوْمِ الثَّالِثِ وَالسَّادِسِ وَالعَاشِرِ وَالعِشْرِیْنَ وَغَیْرِهَا بِدْعَةٌ مُسْتَقْبِحَةٌ.»

---

[1] صحیح البخاری، بَابُ إِذَا اصْطَلَحُوا عَلَی صُلْحِ جَوْرٍ فَالصُّلْحُ مَرْدُودٌ، رقم:۲٦۹۷

یعنی مذکورہ امور قبیح بدعت ہیں۔

گھر میں میت کی موجودگی میں کھانا کھایا جا سکتا ہے؟

سوال: کیا گھر میں میت موجود ہو تو کھانا کھایا جا سکتا ہے جب کہ رمضان المبارک میں افطاری کا وقت ہے۔

(قاری عبدالغفار سلفی، نشتر ٹاؤن لاہور) (۲۲ مئی ۱۹۹۸ء)

جواب: گھر میں میت کی موجودگی میں کھانا کھایا جا سکتا ہے اور سحری و افطاری وغیرہ کا اہتمام بھی جائز ہے کیونکہ اصلاً اکل و شرب کی اباحت ہے ممانعت کی کوئی دلیل نہیں۔

کسی عزیز کے فوت ہونے پر تین دن تک کھانا کھلانا:

سوال: بعض لوگ کسی کے فوت ہو جانے پر تین دن تک تمام رشتہ داروں کو جو تعزیت کے لیے آئے ہوتے ہیں، کھانا دیتے ہیں، صرف اس لیے کہ یہ خاندان میں رسم ہے کہ جب کوئی فوت ہو جائے تو تین دن تک خاندان والے باری باری میت والے گھر کو اور تمام رشتہ داروں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ پھر اس میں یہ خیال بھی رکھا جاتا ہے کہ صرف مرغی ہی پکے۔ کھانے کے بعد چائے بھی ضروری قرار دی جاتی ہے۔ غرض یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ یہ میت والا گھر ہے۔ گھر کی عورت چولہے کے آگے کھڑی ہوتی ہے، کھانے اور چائے کے ساتھ ساتھ دنیا جہان کی باتیں زیر بحث ہوتی ہیں۔ کیا یہ بدعت میں نہیں آتا جب کہ ہمیں نبی ﷺ کے زمانے میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ ان تمام مسائل سے آگاہ کیا جائے۔

(طیبہ نسرین، اسلام آباد) (۲۵ جون ۲۰۰۴ء)

جواب: صرف میت کے گھر والوں کو وقتی طور پر کھانا کھلانے کا جواز ہے۔ حدیث میں ہے جب حضرت جعفر کی شہادت کی خبر آئی تو نبی ﷺ نے فرمایا:

«اِصْنَعُوْا لِاٰلِ جَعْفَرَ طَعَامًا فَقَدْ اَتَاهُمْ مَا يُشْغِلُهُمْ .»[1]

''سبل السلام'' میں ہے:

«وَ اَمَّا الْاِحْسَانُ اِلَيْهِمْ بِحَمْلِ الطَّعَامِ لَهُمْ فَلَا بَأْسَ بِهٖ وَ هُوَ الَّذِيْ اَفَادَهُ حَدِيْثُ جَعْفَرٍ.»[2]

''اہل میت کو بطورِ احسان کھانا پہنچانے میں کوئی حرج نہیں، حدیث جعفر سے یہی بات مستفاد ہے۔''

ہاں البتہ اہل میت کے ساتھ شرکائے تدفین کا کھانا تیار کرنا ناجائز ہے۔ حدیث جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ میں ہے:

---

[1] سنن أبی داؤد، بَابُ صَنْعَةِ الطَّعَامِ لِأَهْلِ الْمَيِّتِ، رقم:۳۱۳۲، امام ترمذی (۹۹۸) نے فرمایا حسن صحیحٌ۔ ابن ماجه، رقم ۱۶۱۰

[2] سبل السلام: ۳/ ۳۳۱

«كُنَّا نَعُدُّ الْاِجْتِمَاعَ اِلٰى اَهْلِ الْمَيِّتِ وَصُنْعَةَ الطَّعَامِ بَعْدَ دَفْنِهٖ مِنَ النِّيَاحَةِ.» [1] اس کی سند صحیح ہے۔

''میت کی تدفین کے بعد اہل میت کے ہاں جمع رہنا اور کھانا تیار کرنا بھی ہمارے (صحابہ کے) نزدیک نوحہ میں سے ہے (جس سے حدیث میں منع کیا گیا ہے۔)''

کیا مسلمانوں کے قبرستان میں کسی غیر مسلم کو دفن کیا جا سکتا ہے؟

سوال: نور پور لاہور۔ (۲۰ اگست ۲۰۰۲ء) ''میں لاہور کے ایک گاؤں ''نور پور'' کا رہائشی ہوں۔ پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہوں اور اپنے گاؤں کے قریب ہی ایک قصبے ''ہڈیارہ'' میں پریکٹس کرتا ہوں۔ گزشتہ دنوں سے ہمارے علاقے میں ایک مسئلہ پیدا ہو گیا ہے جس نے لوگوں کو بہت پریشان کر رکھا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے گاؤں کی ایک عمر رسیدہ عیسائی عورت وفات پا گئی۔ ہمارا گاؤں تقریباً ایک ہزار گھروں پر مشتمل ہے جب کہ عیسائیوں کا صرف ایک کنبہ رہائش پذیر ہے جو پندرہ افراد پر مشتمل ہے۔ یہ افراد گاؤں کے لوگوں کی خدمت کر کے گزر اوقات کرتے ہیں جس میں بھینسوں کا گوبر اٹھانا اور گھروں کی صفائی وغیرہ شامل ہے۔ مذکورہ عورت بھی گزشتہ پچاس سال سے گاؤں کے لوگوں کی خدمت کر رہی تھی۔ ہمارے گاؤں میں چونکہ عیسائیوں کا کوئی قبرستان نہیں ہے اور نہ ہی اتنی استطاعت رکھتے ہیں کہ اپنے مردے دفن کرنے کے لیے اپنی جیب سے کوئی جگہ خرید سکیں۔

اس لیے اس عورت کی تدفین ایک مشکل مسئلہ بن گیا۔ عیسائی حضرات نے مسلمانوں کے سرکردہ افراد سے رابطہ کر کے اپنا مسئلہ پیش کیا تو چند سرکردہ افراد نے انھیں اجازت دے دی کہ وہ مسلمانوں کے بڑے قبرستان کے ایک کونے میں اسے دفن کر دیں۔ یوں وہ عیسائی عورت مسلمانوں کے قبرستان کے ایک کونے میں دفن ہو گئی۔

اس واقعے پر ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ اب چند لوگوں نے یہ مسئلہ اٹھایا ہے کہ عیسائی عورت مسلم قبرستان میں دفن نہیں ہو سکتی۔ اگر اس کی قبر کو نہ اکھاڑا گیا تو اہل علاقہ، (بستی والوں) اور مسلمان اہل قبور پر عذاب نازل ہوتا رہے گا۔ کچھ لوگ اس بارے میں یہ رائے دیتے ہیں کہ عیسائی عورت کی قبر قبرستان کے ایک کونے میں واقع ہے لہٰذا اس کے اردگرد چار دیواری کر دی جائے تو یوں وہ مسلم قبرستان سے الگ ہو جائے گی۔ کچھ لوگ معرکہ بویب کا حوالہ دیتے ہیں جس میں مسلمانوں اور عیسائیوں نے مل کر ایرانیوں کا مقابلہ کیا تھا۔ مسلمان اور عیسائیوں کی مشترکہ فوج کے سپہ سالار حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ تھے۔ عیسائیوں نے مسلمانوں کے شانہ بشانہ جنگ لڑی اور جرأت و بہادری کے جوہر دکھائے۔ جب جنگ ختم ہو گئی تو کئی عیسائی بھی اس جنگ میں کام آئے۔ ایک عیسائی سردار کی لاش سے حضرت مثنیٰ رضی اللہ عنہ لپٹ گئے۔ اس کے ماتھے کو چومتے رہے اور خود اپنے ہاتھوں سے اس کی تدفین کی اور کہا کہ انھوں نے جان دے کر اپنے گناہوں کا کفارہ

[1] مسند احمد (۲/ ۲۰٤) رقم: ٦٩٠٥

ادا کر دیا ہے۔

آپ قرآن وسنت کی روشنی میں ہماری رہنمائی فرمائیں تاکہ امن وامان بھی برقرار رہے اور مسئلہ بھی حل ہو جائے۔

امید ہے کہ آپ فتویٰ جاری فرماتے ہوئے مندرجہ ذیل باتوں کو مدنظر رکھیں گے۔

۱۔ عیسائی عورت کو زبردستی دفن نہیں کیا گیا بلکہ اس میں مسلمانوں کی مرضی شامل تھی۔

۲۔ عیسائی عورت قبرستان کے ایک کونے میں دفن ہے اور اس کو آسانی سے الگ کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ قبر کو اکھاڑنا ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔

۴۔ لاش نکال کر کسی اور جگہ دفن کرنے کا فی الحال کوئی خاص انتظام نہیں ہے کیونکہ کوئی مسلمان جگہ دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔

۵۔ کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ اسلام محبت ورواداری اور صلح وامن کا حکم دیتا ہے، اس لیے قبر کو نہ اکھاڑا جائے کیونکہ یہ دورِ جاہلیت کی نشانی ہے اور عیسائیوں سے اظہارِ ہمدردی کیا جائے کیونکہ وہ اہل کتاب ہیں۔ (سائل: ڈاکٹر جاوید اقبال۔نور پور، تھانہ ہڈیارہ تحصیل کینٹ، ضلع لاہور،) (۱۰ جنوری ۲۰۰۳ء)

جواب : مسلمانوں کے قبرستان میں مشرکین اور کفار کو دفن کرنا ناجائز اور حرام ہے۔ کیونکہ اس میں اہل اسلام کے مردوں کی بے حرمتی ہے۔ جو شخص ایسے فعل کا مرتکب ہوا ہے اس نے کبیرہ گناہ کیا ہے، اس کے لیے توبہ کرنا لازمی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مسلمان اہل قبور کی زیارت کا (یعنی قبروں کی زیارت اور قبرستان جانے کا) حکم دیا ہے اور ان کے پاس کھڑے ہو کر دعا کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ جب کہ مشرک کی قبر کے پاس کھڑا ہونا ممنوع ہے بلکہ اس کے برعکس وہاں سے جلدی گزر جانے کا حکم دیا ہے۔ جس طرح کے قصہ دیارِ ثمود کی وضاحت موجود ہے۔ چنانچہ قرآنِ مجید میں ارشاد ہے:

﴿وَ لَا تُصَلِّ عَلٰۤی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّ لَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِهٖ﴾ (التوبة: ٨٤)

"اور (اے نبی) ان میں سے کوئی مر جائے تو کبھی اس (کے جنازے) پر نماز نہ پڑھنا اور نہ اس کی قبر پر (جا کر) کھڑے ہونا۔"

"جامع الترمذی" میں حدیث ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے کسی منافق میت کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھائی اور نہ اس کی قبر پر کھڑے ہوئے۔ عہد نبوی سے لے کر اسلامی دستور اور عمل یہی رہا ہے کہ مسلمانوں کا قبرستان کفار سے ہمیشہ جدا رہا ہے۔ چنانچہ "صحیح بخاری" میں قصہ عمر رضی اللہ عنہ میں ہے:

«وَإِلَّا فَرُدُّونِی إِلَی مَقَابِرِ الْمُسْلِمِينَ.» [1]

---

[1] صحیح البخاری، بَابُ مَا جَاءَ فِی قَبْرِ النَّبِیِّ صَلَّی اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَأَبِی بَكْرٍ، وَعُمَرَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا، رقم:۱۳۹۲

''کہ مجھے اگر قبر نبوی کے پاس دفن ہونے کی اجازت نہ ملی تو پھر مسلمانوں کے قبرستان میں مجھے دفن کردینا۔''

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی ''صحیح'' میں ان الفاظ سے باب قائم کیا ہے:

«بَابٌ : هَلْ تُنْبَشُ قُبُورُ مُشْرِكِي الجَاهِلِيَّةِ، وَيُتَّخَذُ مَكَانُهَا مَسَاجِدَ.»

''یعنی کیا مشرکین جاہلیت کی قبریں اکھاڑ کر ان کی جگہ مساجد تعمیر کی جاسکتی ہیں؟''

پھر اس کے تحت مسجد نبوی کی تعمیر کا قصہ لائے ہیں، جس کا آخری جملہ یہ ہے:

« فَقَالَ أَنَسٌ : فَكَانَ فِيهِ مَا أَقُولُ لَكُمْ قُبُورُ المُشْرِكِينَ، وَفِيهِ خَرِبٌ وَفِيهِ نَخْلٌ، فَأَمَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِقُبُورِ المُشْرِكِينَ، فَنُبِشَتْ، ثُمَّ بِالخَرِبِ فَسُوِّيَتْ .» ❶

اس حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ کفار و مشرکین کی قبریں قابلِ احترام نہیں بلکہ ضرورت کی بناء پر ان کو اکھاڑ کر زمین کے برابر کرنا جائز ہے۔

موجودہ صورت میں اصل یہ ہے کہ کافر میت کو کسی دوسری جگہ منتقل کردیا جائے۔ اگر یہ ناممکن نظر آئے یا فتنے کا ڈر ہو تو کم از کم قبر کے امتیازی نشان کو مٹا کر زمین کے برابر کردیا جائے۔ صرف قبرستان کے ایک طرف لکیر کھینچ دینا کافی نہیں ہے کیونکہ ایسا حادثہ آئندہ بھی پیش آسکتا ہے جس کا مستقل سد باب ہونا چاہیے۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ گاؤں والے ہمت کرکے غیر مسلم مردوں کے لیے کوئی جگہ مخصوص کردیں تاکہ مستقبل میں مسلمانوں کو کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

یہ بھی واضح ہو کہ شرعی احکام و مسائل کی واضح نشان دہی کے بعد کسی مسلمان کے لیے جائز اور لائق نہیں کہ ٹال مٹول سے کام لے۔

آج لاعلمی اور جہالت کی وجہ سے کسی جگہ مسلم غیر مسلم قبرستان اکٹھے ہوں تو فوراً ان کو جدا کردینا چاہیے۔ حضرت مثنی والا قصہ محض ایک تاریخی واقعہ ہے۔ واضح احادیث اور احکام کے مقابلے میں اس پر اعتماد کرنا مشکل امر ہے کیونکہ محض جان قربان کرنا گناہوں کا کفارہ نہیں بنتا۔ جب تک شہادتین (کلمہ توحید و رسالت) کا اقرار نہ کیا جائے۔ اہل کتاب سے امتیازی سلوک صرف ان امور میں ہے جہاں واضح شرعی احکام موجود ہوں جب کہ موجودہ مسئلہ ان میں شامل نہیں۔

تدفین کے بعد کتابِ تعزیت کا رکھنا، اور سوگواران سے معاونت

سوال : ہمارے علاقہ میں بعض رواج ایسے ہیں جو کہ ہندوانہ رسومات کے مشابہ ہوتے ہیں کہ مرنے والے کے لواحقین

❶ صحيح البخاري ، بَابٌ: هَلْ تُنْبَشُ قُبُورُ مُشْرِكِي الجَاهِلِيَّةِ ، وَيُتَّخَذُ مَكَانُهَا مَسَاجِدَ، رقم:٤٢٨

میت کے دفنانے کے بعد ایک رجسٹر رکھ دیتے ہیں اورتعزیت (عرف دعاء) کے لیے لوگ آتے ہیں۔ اپنی طاقت کے مطابق سوگوار کو پیسے دے کر رجسٹر پر درج کرا دیتے ہیں۔ کیا ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اور سوگوار کے پاس ہر آنے والا دعا کے لیے کہتا ہے۔ پھر لگا تار ہر آنے والا اسی طرح کرتا ہے۔ کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ نیز ہاتھ اٹھا کر بار بار دعا کرنا مسنون ہے یا نہیں؟ (ایک سائل۔ تحصیل ایبٹ آباد)

جواب : کتاب تعزیت کا رکھنا پھر دستخط کنندگان کا حسب استطاعت سوگواران کی اس موقع پر بالخصوص مالی معاونت کرنا شریعت میں اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ حدیث میں ہے:

«مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هَذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ، فَهُوَ رَدٌّ» ❶

''یعنی جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے۔''

نیز اس موقع پر جلسۂ دعائیہ کا قیام بھی اسی زمرہ میں داخل ہے۔ اس وقت میت کے لیے انفرادی دعا چاہے ہاتھ اٹھا کر ہو مشروع ہے۔ لیکن اجتماعی دعا بہیئتِ مخصوصہ کے ساتھ اس کا کوئی ثبوت نہیں۔

مسئلہ ''اسقاطِ میت'' کی شرعی حیثیت؟

سوال : اس علاقہ میں جب کوئی موت واقع ہوتی ہے تو غریب یا متوسط طبقہ سے ہو، کفنی پر شہادتین لکھ کر میت کے سینہ پر رکھ کر دفن کرتے ہیں۔ پھر اسقاط کے نام پر کچھ رقم بعض علاقوں میں توشہ کے نام سے غلہ، نمک، چھوہارے وغیرہ قبر پر لوگوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اچھی گزران والے لوگ حفاظ قبر پر چند دن بٹھاتے ہیں اور میت کے ورثاء ایک کاپی رکھ دیتے ہیں آنے والے لوگ اپنے نام لکھا کر حسب توفیق ۱۰۔۲۰ یا زیادہ روپے دے کر جاتے ہیں۔

اسی دن یا دوسرے دن قبر پر روشنی آگ یا لالٹین جلا کر ۴۰ دن رکھتے ہیں۔ پھر ختم قرآن کا سلسلہ ہر جمعرات سے جاری ہو کر کوئی پکے چالیس کوئی کچے یعنی جس دن جمعرات ہو چالیسواں کرتے ہیں۔ ان تمام امور میں ہم رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ مگر اکثریت پر اثر نہیں ہوتا۔ کیا ان کاموں سے روکنے کے باوجود جو نہ رکے یا میت کا ہفتہ وار ختم ہو اور صورت اس طرح ہو کہ آپ میت کے گھر دعوت کھائیں گے۔ اس صورت میں بغیر ختم پڑھے گاؤں کے رواج کے مطابق وہ کھانا کھانا جائز ہے یا نہیں؟

پوری تفصیل سے جواب عنایت فرمائیں۔ (محمد یعقوب) (یکم دسمبر ۱۹۹۵ء)

جواب : سوال میں مذکور امور بعض وجوہات کی بناء پر ناجائز ہیں۔

۱۔ عہد نبوت ﷺ اور عہد صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ و تبع تابعین رحمہم اللہ میں ان کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔ اگر اس طریق

❶ صحيح البخاري، بَابُ إِذَا اصْطَلَحُوا عَلَى صُلْحِ جَوْرٍ فَالصُّلْحُ مَرْدُودٌ، رقم: ٢٦٩٧

سے گناہ معاف ہوتے تو کیا ان کو گناہ کی معافی کی ضرورت نہ تھی۔؟ یا وہ میت سے خیر خواہ نہ تھے؟ یا ان کو نیک کاموں کا شوق نہ تھا؟ جب یہ سب باتیں تھیں بلکہ ہم سے بڑھ کر وہ ایسی باتوں کا خیال رکھتے تھے، تو پھر کیا وجہ ہے خیر القرون میں اس کا ثبوت نہیں ملتا؟ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے اسقاط سے میت کے گناہ معاف نہیں ہوتے۔

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

«مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا، فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ.» ❶

''یعنی، جو مجھ پر جھوٹ بولے وہ اپنا ٹھکانہ آگ میں بنائے۔''

۲۔ جس کام کی رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ضرورت ہو اور اس کے کرنے سے کوئی شئے مانع بھی نہ ہو پھر اس کو کوئی نہ کرے تو وہ قطعی بدعت ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

« مَنْ اَحْدَثَ فِيْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ » ❷

یعنی ہمارے دین میں جو نئی بات نکالے وہ مردود ہے۔''

اور ایک روایت میں ہے کہ ایسا شخص لعنتی ہے، بلکہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر نیا کام دین میں مردود ہے۔ خواہ اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ پس اسقاط کرنے والوں کو چاہیے کہ یا تو خیر القرون سے اس کا ثبوت دیں یا اللہ سے ڈریں اور ایسے کاموں سے باز آجائیں۔ جو بجائے ثواب کے اللہ کی ناراضگی کا باعث ہیں۔ (ماخوذ از رسالہ ردِ بدعات لشیخنا محدث روپڑی رحمہ اللہ)

ایسی مجالس میں شرکت سے ہرصورت احتراز کرنا چاہیے۔ قرآن میں ہے:

﴿وَ قَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَ يُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖۤ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ﴾ (النساء:١٤٠)

''اور اللہ نے تم مومنوں پر اپنی کتاب میں (یہ حکم) نازل فرمایا ہے کہ جب تم (کہیں) سنو کہ اللہ کی آیتوں سے انکار ہو رہا ہے اور ان کی ہنسی اڑائی جاتی ہے تو جب تک وہ لوگ اور باتیں (نہ) کرنے لگیں ان کے پاس مت بیٹھو ورنہ تم بھی انہی جیسے ہو جاؤ گے۔''

میت پر رونے پیٹنے اور بال نوچنے کی شرعی حیثیت

سوال: میت پر رونے، پیٹنے اور بال نوچنے کے متعلق قرآنِ مجید اور احادیثِ مبارکہ سے وضاحت کریں۔

(ایک سائل) (۳۱ مارچ ۲۰۰۰ء)

❶ صحيح البخاری، بَابُ مَا يُكْرَهُ مِنَ النِّيَاحَةِ عَلَى الْمَيِّتِ، رقم:١٢٩١

❷ صحيح البخاری، بَابُ إِذَا اصْطَلَحُوا عَلَى صُلْحِ جَوْرٍ فَالصُّلْحُ مَرْدُودٌ، رقم:٢٦٩٧

جواب : میت پر چلا کر رونا پیٹنا، گریبان پھاڑنا اور بین کرنا، سب امور حرام ہیں۔ ''صحیح بخاری'' اور ''صحیح مسلم'' میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

''وہ شخص ہم میں سے نہیں (یعنی ہمارے طریقے پر نہیں) جو اپنے رخسار پیٹے۔ گریبان پھاڑے اور جاہلیت کی پکار پکارے یعنی نوحہ اور واویلا کرے۔ ❶

اور ''سنن ابی داؤد'' میں حدیث ہے:

''لعنت کی رسول اللہ ﷺ نے نوحہ کرنے والی عورت کو اور نوحہ سننے والی عورت کو۔'' ❷

نیز صحیح ''بخاری'' اور ''صحیح مسلم'' میں ہے:

''میں بیزار ہوں اس سے جو (موت کی مصیبت میں) سر کے بال منڈائے اور چلّا کر روئے اور اپنے کپڑے پھاڑے۔'' ❸

اور ایک ''حدیث قدسی'' میں ہے:

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''میرے (اس) مومن بندے کے لیے بہشت ہے جس کے پیارے کو میں اہل دنیا سے قبض کرتا ہوں اور وہ (اس کی موت پر) صبر کرے۔ ❹

(عالمِ برزخ اور عذابِ قبر کے متعلقہ مسائل)

عالم برزخ کے کیا معنی ہیں؟

سوال : عالم برزخ کے کیا معنی ہیں؟ اور کون سے مقام کو عالم برزخ کہا جاتا ہے؟ کیا نیک اور بدلوگوں کی روح عالم برزخ میں ہی جاتی ہے؟ (قاری مشتاق احمد، مدرس جامع تفہیم القرآن والحدیث ایبٹ آباد ہزارہ) (۲۹ اگست ۱۹۹۷ء)

جواب : دو چیزوں کے درمیان جو چیز اٹکاؤ کی طرح ہو اس کو برزخ کہتے ہیں۔ انسان کا قبر میں رہنے کا زمانہ دنیا اور عقبیٰ کے مابین میں ایک اٹکاؤ کا زمانہ ہے۔ اس لیے اس کو برزخ کہا جاتا ہے۔ (تفسیر احسن التفاسیر: ۴/۳۲۳) نیک و بد قیامت تک اسی کے اندر رہیں گے۔

---

❶ صحیح البخاری، بَابٌ: لَیْسَ مِنَّا مَنْ شَقَّ الْجُیُوبَ، رقم:۱۲۴۹

❷ سنن ابی داؤد، بَابٌ فِی النَّوْحِ، رقم:۳۱۲۸

❸ صحیح البخاری، بَابُ مَا یُنْهَی مِنَ الْحَلْقِ عِنْدَ الْمُصِیبَةِ، رقم:۱۲۹۶

❹ صحیح البخاری، بَابُ فَضْلِ مَنْ ذَهَبَ بَصَرُهُ، رقم:۵۶۵۳، صحیح ابن حبان، ذِكْرُ بِنَاءِ اللَّهِ جَلَّ وَعَلَا بَیْتَ الْحَمْدِ فِی الْجَنَّةِ، لِمَنِ اسْتَرْجَعَ وَحَمِدَ اللَّهَ عِنْدَ فَقْدِ وَلَدِهِ، رقم:۲۹۴۸

قبر میں میت کے تین مشہور سوالات کی تحقیق

سوال: قبر میں میت سے تین مشہور سوال «مَنْ رَبُّكَ۔ مَا دِيْنُكَ۔ مَنْ نَبِيُّكَ» کا پوچھا جانا صحیح حدیث سے ثابت ہے؟ (سائل) (۱۸ جون ۱۹۹۹ء)

جواب: ہاں یہ تینوں سوالات صحیح احادیث سے ثابت ہیں۔

کیا نبی کریم ﷺ قبر میں ایک بادل کی صورت ظاہر ہوں گے؟

سوال: اسی حدیث کے آخر میں ہے کہ نبی کریم نے اوپر بادل سا دیکھا۔ فرشتے کہنے لگے کہ یہ تمہارا یعنی نبی کریم کا مقام ہے۔ ابھی تمہاری دنیا میں رہنے کی کچھ عمر باقی ہے۔ اگر وہ پوری کر چکے ہوتے تو تم اس مقام میں آ جاتے۔

اس حدیث سے وہ لوگ یہ ثابت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اپنی دنیاوی قبر میں نہیں بلکہ مقام الوسیلہ میں ہیں، جس کا ذکر مذکورہ حدیث میں ملتا ہے۔ (والسلام: حافظ عبدالصمد، مین بازار سراج پارک، شاہدرہ) (۸ فروری ۲۰۰۸ء)

جواب: نبی ﷺ کا اس مقام بالا پر ہونا برزخی زندگی کے اعتبار سے ہے ورنہ جسد عنصری صحیح سلامت اصلی حالت میں قبر مبارک میں مدفون ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے:

«وَأَوَّلُ مَنْ يَنْشَقُّ عَنْهُ الْقَبْرُ.» ❶

''قیامت کے روز سب سے پہلے میں قبر سے باہر آؤں گا۔'' اور مکمل داخلہ قیامت کے روز ہوگا۔

کیا قبر میں سوالات عصر کے وقت ہوں گے؟

سوال: یہ جو عام طور پر مشہور ہے کہ جب مردے کو دفن کرنے کے بعد فرشتے سوال پوچھنے کے لیے آتے ہیں تو آدمی کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے سورج غروب ہو رہا ہو۔ اور اگر نمازی ہو تو کہتا ہے کہ مجھے چھوڑ دو نماز پڑھنے دو۔ کیا یہ کسی حدیث میں ہے۔ (محمد ابراہیم نجیب فیصل آباد) (۵ ستمبر ۱۹۹۷ء)

جواب: اس موضوع کی روایت مشکوٰۃ باب اثبات عذاب القبر میں بحوالہ ابن ماجہ روایت جابر رضی اللہ عنہ مرفوعاً موجود ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

« إِذَا دَخَلَ الْمَيِّتُ الْقَبْرَ مُثِّلَتْ لَهُ الشَّمْسُ عِنْدَ غُرُوبِهَا فَيَقُولُ دَعُونِي أُصَلِّي.» ❷

''جب انسان قبر میں داخل کیا جاتا ہے تو اس کے سامنے قریب الغروب سورج کی تصویر پیش کی جاتی ہے۔

❶ صحیح مسلم، بَابُ تَفْضِيلِ نَبِيِّنَا صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى جَمِيعِ الْخَلَائِقِ، رقم: ۲۲۷۸

❷ صحیح ابن حبان، ذِكْرُ الْإِخْبَارِ بِأَنَّ الْمُسْلِمَ فِي قَبْرِهِ عِنْدَ السُّؤَالِ يُمَثَّلُ لَهُ النَّهَارُ عِنْدَ مُغَيْرِبَانِ الشَّمْسِ، رقم: ۳۱۱۶

وہ بیٹھ کر اپنی آنکھیں ملنے لگتا ہے۔ کہتا ہے مجھے چھوڑ دو نماز پڑھ لینے دو۔''

قریباً یہ حسن درجہ کی روایت ہے۔ اس موضوع پر ایک دوسری روایت ''صحیح ابن حبان'' اور ''طبرانی اوسط'' میں بروایت ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ وارد ہے۔

ثواب وعذاب قبر اور برزخی زندگی کے متعلق سوالات اور ان کے جوابات

سوال: ہمارے علاقے سراج پارک شاہدرہ میں بعض لوگوں نے کچھ عرصے سے فتنہ بپا کر رکھا ہے۔ یہ لوگ اس بات کی تبلیغ کر رہے ہیں کہ ''مرنے والے ہر نیک و بد آدمی کو ایک نیا برزخی جسم دیا جاتا ہے اور اس برزخی جسم پر ہی عذاب قبر یا راحت قبر کی کیفیات واحوال گزرتے ہیں۔ دنیاوی بدن کا موت کے بعد روح سے کوئی تعلق نہیں رہتا اور یہ دنیاوی بدن تباہ ہو جاتا ہے۔'' جو شخص برزخی جسم کے عقیدے کا انکار کر دے، اسے یہ لوگ کافر قرار دیتے ہیں۔ اسی بنا پر یہ لوگ اہل سنت اور اہل حدیث کو کافر گردانتے ہوئے ان سے نکاح حرام ہونے اور اِن کی نماز جنازہ میں شمولیت کے ناجائز وحرام ہونے کا چرچا کرتے ہیں۔

برزخی جسم کے قائلین برزخی جسم کے ثبوت میں صحیح بخاری (کتاب الجنائز، پارہ:٦) کی حدیث ۴٦٨ پیش کرتے ہیں جس میں ہے حضرت سمرہ بن جندب فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا خواب بیان فرمایا...... جب ہم کہتے ہیں کہ یہ تو خواب کا واقعہ ہے تو وہ لوگ کہتے ہیں کہ نبی کا خواب سچ ہوتا ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ اس حدیث میں قرآن پر عمل نہ کرنے والے پر عذاب ہونے کا ذکر بھی ہے اور عہد رسالت میں تمام مسلمان عامل قرآن تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن سے پہلی آسمانی کتابوں کو بھی قرآن کہا گیا ہے جیسا کہ حضرت داؤد کے خوش الحانی سے قرآن پڑھنے کی حدیث ہے۔

ہم کہتے ہیں کہ قیامت کے بعد کے عذاب کا احوال بیان ہوا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ حدیث میں ہے:

« يُفْعَلُ بِهِ إِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ »

''قیامت تک اس کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا رہے گا۔''

لہٰذا ثابت ہوا کہ یہ قیامت سے پہلے کے عذاب کا بیان ہے، قیامت کے بعد کا نہیں۔

ان سے جب کہا جاتا ہے کہ کسی ایک حدیث میں بھی یہ بیان نہیں ہوا کہ مرنے والے کو نیا برزخی جسم دیا جاتا ہے تو جواب میں کہتے ہیں کہ دیکھو اس حدیث میں ہے:

(ا) فرشتہ ایک (جھوٹے) آدمی کا منہ چیرتے ہوئے گدی تک جسم چیر دیتا ہے۔ بعد میں وہ جسم پہلے کی طرح بھلا چنگا ہو جاتا ہے تو فرشتہ اُسے پھر اُسی تکلیف میں مبتلا کر دیتا ہے۔

(ب) قرآن پر عمل نہ کرنے والے کے سر پر بھاری پتھر مارا جاتا، جس سے اس کا سر کچلا جاتا، بعد میں جسم پھر صحیح

ہو جاتا، فرشتہ پھر اس کے سر پر پتھر مار کر سر کچل دیتا۔

(ھ) سود خور نہر سے نکلنے کی کوشش کرتا تو اس کے منہ پر پتھر مارا جاتا۔ فرشتہ پتھر پکڑنے جاتا ہے تو منہ پھر صحیح سلامت ہو جاتا ہے۔

ان تمام واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد ایک نیا جسم دیا جاتا ہے جو تباہ ہونے کے بعد پھر پہلے جیسا بھلا چنگا ہو جاتا ہے۔ پھر انھیں عذاب دیا جاتا ہے، بدن تباہ ہو جاتا ہے لیکن وہ بدن پھر صحیح ہو جاتا ہے اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ لیکن دنیاوی بدن میں یہ خاصیت نہیں کہ تباہ ہونے کے بعد صحیح سلامت اور پہلے کی طرح بھلا چنگا ہو جائے۔

(د) دنیا میں زانی اور زانیات مختلف علاقے، شہروں اور ملکوں میں دفن کیے جاتے ہیں۔ لیکن اس حدیث میں ذکر ہے کہ ان سب کو ایک تنور میں جمع کر کے آگ بھڑکا دی جاتی ہے۔ ثابت ہوا کہ یہ عذاب قبر میں نہیں بلکہ کسی اور جگہ دیا جاتا ہے۔

ان گمراہ لوگوں کے خود ساختہ عقائد ونظریات اور خود ساختہ دین کا تار و پود بکھیرنے کے لیے ہمیں مندرجہ سوالوں کے جوابات دیجیے۔ جزاک اللہ خیراً (والسلام: حافظ عبدالصمد، مین بازار سراج پارک، شاہدرہ) (۸ فروری ۲۰۰۸ء)

جواب: سوال میں مذکور/ مشارٌ الیہ حدیث الرؤیا (صحیح البخاری، کتاب الجنائز) میں مختصراً ذکر ہوئی ہے جب کہ تفصیلاً ''صحیح بخاری'' کی کتاب الرؤیا کے اخیر میں «بَابُ تَعْبِيرِ الرُّؤْيَا بَعْدَ صَلَاةِ الصُّبْحِ» کے تحت بیان ہوئی ہے۔ اس میں کوئی قاعدہ کلیہ کی وضاحت نہیں کہ ہر مرنے والے کے ساتھ یہی سلوک ہوتا ہے یہ تو محض مجلس کی مناسبت سے آپ ﷺ نے اپنی خواب کی توجیہ فرمائی ہے تاکہ ہمارے لیے سامانِ عبرت ہو اور آخرت کی ہولناکیوں سے بچ سکیں۔ نصوص شرع سے یہ بات عیاں ہے کہ ماوراء العقل برزخی اور غیبی امور میں توقف کرنا اور بلا اجتہاد ان پر ایمان لانا ہی سلامتی کی راہ ہے۔ اپنی طرف سے لب کشائی کرنا ضلالت وگمراہی کا دروازہ کھولنا ہے جو خطرناک کھیل ہے۔ معتزلہ ودیگر گمراہ فرقوں کی گمراہی کا سبب یہی تھا کہ وہ اپنی عقل کو حَکم بنا کر اس کی پیروی میں لگے رہے۔ اس بنا پر انھوں نے معجزات وکرامات اور عذابِ قبر وغیرہ ماوراء الحس اشیاء سے متعلق نصوص قاطعہ کا انکار کر دیا۔ حالاں کہ چاہیے یہ تھا کہ عقل کے ساتھ نبوت کی روشنی حاصل کرتے اس کے بغیر عقل کا صراطِ مستقیم پر قائم رہنا قطعاً ممکن نہیں ہے۔ کیوں کہ عقل بذاتہ ناقص ہے اشیاء کی حقیقت اور کنہ کے ادراک سے قاصر ہے۔

مثلاً گنا میٹھا کیوں ہے؟ اور اندرائن کڑوی کیوں ہے؟ جب کہ اُگنے کی زمین اور پانی ایک جیسا ہے تو یہ فرق کیوں ہے؟ اس کا جواب عقل کی بجائے وحی کے ذریعہ ملے گا کہ خالق ومالک نے قدرتِ تامہ کے اظہار کے لیے اور حکمت کاملہ کی بنا پر مختلف رنگ اور ذائقے پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ان میں مختلف تاثیر پیدا فرما دی ہے۔ اسی طرح برزخی امور جو کتاب وسنت میں ثابت ہیں ان پر بھی یقین رکھنا جزوِ ایمان ہے۔ دنیا میں آدمی جس بدن، ہاتھ، پاؤں وغیرہ کے ساتھ

اعمال کا مرتکب ہوتا ہے، جزا وسزا کا تعلق بھی انھی سے ہے، مرنے کے بعد اور بروزِ قیامت یہی شہادتی بنیں گے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ اعمال خیر وشر دنیا کے بدن سے ہوں، جزا وسزا دوسرے بدن کو ملے۔ یہ تو سراسر بے انصافی ہے جس کا ذات باری تعالیٰ سے تصور کرنا بھی محال ہے، اور جو مناظر رسول اللہ ﷺ نے بحالت خواب دیکھے ان کا تعلق بھی اسی بدن سے ہے۔ 'برزخی جسم' کی اصطلاح خودساختہ ہے جس کا شرع میں کوئی اصل نہیں، صحابہ وتابعین، تبع تابعین اور بعد کے سلف صالحین میں سے کسی نے بھی یہ بات نہیں کہی۔ پھر یہ کہنا کہ ''دنیاوی بدن کا موت کے بعد روح سے کوئی تعلق باقی نہیں رہتا اور یہ دنیاوی بدن تباہ ہوجاتا ہے'' غلط دعویٰ ہے۔ ''صحیح بخاری'' میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

« إِذَا وُضِعَتِ الْجِنَازَةُ، فَاحْتَمَلَهَا الرِّجَالُ عَلَى أَعْنَاقِهِمْ، فَإِنْ كَانَتْ صَالِحَةً قَالَتْ :قَدِّمُونِي، وَإِنْ كَانَتْ غَيْرَ صَالِحَةٍ قَالَتْ لِأَهْلِهَا :يَا وَيْلَهَا أَيْنَ يَذْهَبُونَ بِهَا؟، يَسْمَعُ صَوْتَهَا كُلُّ شَيْءٍ إِلَّا الإِنْسَانَ، وَلَوْ سَمِعَ الإِنْسَانُ لَصَعِقَ .»[1]

''جب میت کو چارپائی پر رکھا جاتا ہے اور لوگ اسے اپنی گردنوں پر اٹھا لیتے ہیں، اگر وہ نیک ہے تو کہتا ہے مجھے آگے لے چلو اور اگر وہ برا ہے تو پکارتا ہے اے شامت مجھے کدھر لے چلے ہو؟! اس آواز کو انسان کے علاوہ ہر چیز سنتی ہے۔ اور اگر انسان اس کو سن لے تو بیہوش ہوکر گر پڑے۔''

اس حدیث پر امام بخاری رحمہ اللہ نے بایں الفاظ تبویب قائم کی ہے:

« بَابُ قَوْلِ الْمَيِّتِ وَهُوَ عَلَى الْجِنَازَةِ : قَدِّمُونِي.»

حدیث ہذا اس امر کی واضح دلیل ہے کہ موت کے بعد بھی بدن اور روح کا رابطہ قائم رہتا ہے اور بدن کا بوسیدہ ہونا صرف ہماری رؤیت کے اعتبار سے ہے ورنہ خالق ومالک کے لیے دونوں حالتیں برابر ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴾ (الملك: ١٤)

''بھلا جس نے پیدا کیا وہ بے خبر ہے وہ تو پوشیدہ باتوں کو جاننے والا اور ہر چیز سے آگاہ ہے۔''

ان لوگوں کا یہ زعم کہ دنیاوی بدن میں دوبارہ صحیح ہونے کی خاصیت نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جس ہستی نے پہلے اس کو پیدا کیا وہ اسی کو دوبارہ لوٹانے پر بھی قادر ہے۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ کے یہی معنی ہیں۔ اللہ رب العزت نے اس حقیقت کی وضاحت یوں فرمائی ہے:

﴿ وَ ضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّ نَسِيَ خَلْقَهٗ ؕ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَ هِيَ رَمِيْمٌ ۝ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ وَ هُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ﴾ (يس: ٧٨، ٧٩)

''اور اس نے ہمارے لیے مثال بیان کی اور اپنی پیدائش کو بھول گیا، کہنے لگا ان ہڈیوں کو کون زندہ کرسکتا ہے

[1] صحيح البخاري، بَابُ قَوْلِ الْمَيِّتِ وَهُوَ عَلَى الْجِنَازَةِ: قَدِّمُونِي، رقم: ١٣١٦

جب کہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہوں۔ آپ جواب دیجیے! کہ انھیں وہ زندہ کرے گا جس نے انہیں اول مرتبہ پیدا کیا ہے جو سب طرح کی پیدائش کا بخوبی جاننے والا ہے۔''

قرآنی وضاحت سے بھی ثابت ہوا کہ دوبارہ زندگی دنیاوی بدن سے ہی ہوگی ورنہ تو ''کرے کوئی اور بھرے کوئی'' کا مصداق ہوگا۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴾ (ق:٢٩)

''اور ہم بندوں پر ظلم نہیں کیا کرتے۔''

یاد رہے شرع میں قبر کا مفہوم عالم برزخ کو شامل ہے۔ چاہے کسی کو دفن کیا جائے یا نہ کیا جائے، درند پرند کھا جائیں یا اس کی راکھ ہوا میں اڑا دی جائے سب کو محیط ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے خواب میں جو ہولناک تنور دیکھا تھا وہ بھی دراصل قبر ہی کا حصہ ہے، علیحدہ کوئی شے نہیں۔ بقیہ مزید سوالات کے جوابات بالاختصار ملاحظہ فرمائیں۔

کیا انسانی جسم کو بار بار عذاب دینے کے لیے دوبارہ صحیح سلامت کیا جاتا ہے؟

سوال: وہ لوگ کہتے ہیں کہ گناہ گاروں کے جسم بار بار خراب ہونے کے بعد بار بار صحیح سلامت ہونے سے ثابت ہوتا ہے کہ انھیں کوئی نیا بدن دیا جاتا ہے۔ ورنہ دنیاوی بدن تو تباہ ہونے کے بعد صحیح نہیں ہوسکتا۔

(والسلام: حافظ عبدالصمد، مین بازار سراج پارک، شاہدرہ) (۸ فروری ۲۰۰۸ء)

جواب: گناہگاروں کے دنیاوی بدن دوبارہ سہ بارہ اسی شکل میں لائے جاتے ہیں جس طرح بار بار ایک ہی پانی کی برف جمائی جاسکتی ہے۔ اسی طرح جسم بھی دنیاوی حالت میں ڈھل جاتا ہے کیوں کہ جزا وسزا کا تعلق اسی بدن سے ہے۔

کیا قیامت قائم ہونے تک قبر میں عذاب ہوتا رہے گا؟

سوال: اگر ہم اسے قیامت کے بعد کا واقعہ قرار دیں تو اس حدیث میں ہے کہ قیامت تک ان کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا رہے گا۔ یعنی یہ عذاب قیامت سے پہلے شروع ہو چکا ہے اور قیامت تک یہی عذاب دیا جاتا رہے گا۔ اس بات کا کیا جواب ہے؟ (والسلام: حافظ عبدالصمد، مین بازار سراج پارک، شاہدرہ) (۸ فروری ۲۰۰۸ء)

جواب: یہ واقعہ عالم برزخ کا ہے لیکن مناظر وہی ہیں جو روزِ جزا پیش آنے والے ہیں۔

زناکاروں کو قبر میں ایک تنور میں کیسے اکٹھا کیا جاسکتا ہے؟

سوال: زناکاروں کو ایک ہی جگہ تنور میں عذاب دیے جانے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قبر کے سوا کوئی اور جگہ تھی ورنہ زناکار تو مختلف جگہوں پر دفن کیے جارہے ہیں مگر انھیں اکٹھا کر کے ایک ہی جگہ تنور میں عذاب دینے کا ذکر ملتا ہے۔

(والسلام: حافظ عبدالصمد، مین بازار سراج پارک، شاہدرہ) (۸ فروری ۲۰۰۸ء)

جواب: سارے عالم برزخ پر قبر کا اطلاق ہے ظاہری پیمائش مراد نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔

کیا قبر میں گناہ گار آدمی کو عذاب ہوتا ہے؟

سوال: کیا قبر میں گناہ گار آدمی کو عذاب ہوتا ہے؟ کیا قبر میں سوالات ہوں گے؟ قرآن اور حدیث کی روشنی میں جواب مطلوب ہے۔ (شوکت حیات نسیم، ٹوبہ ٹیک سنگھ) (۱۵۔اگست ۲۰۰۸ء)

جواب: امام بخاری رحمہ اللہ نے ''صحیح بخاری'' میں باب باندھ کر قرآنی آیات اور احادیث سے عذابِ قبر ثابت کیا ہے اور یہ بھی ذکر کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم قریباً ہر نماز میں عذابِ قبر سے پناہ مانگتے تھے۔ (ملاحظہ ہو صحیح بخاری، کتاب الجنائز، تفصیلی بحث الاعتصام میں کئی دفعہ شائع ہوچکی ہے۔)

قبر میں اچھے اور برے انسان کو جزا اور سزا دی جاتی ہے؟

سوال: قبر میں اچھے انسان اور برے انسان کو سزا اور جزا دی جاتی ہے؟ میں نے خصوصاً قبر کے حوالے سے دریافت کیا ہے۔ (شوکت حیات نسیم، ٹوبہ ٹیک سنگھ) (۱۵۔اگست ۲۰۰۸ء)

جواب: قبر میں جزا و سزا برحق ہے۔ جملہ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مشکوٰۃ باب اثبات عذاب القبر۔ مسئلہ ہذا پر تفصیلی گفتگو کئی دفعہ الاعتصام میں شائع ہوچکی ہے۔

کیا قبر کی مٹی انسان کا تمام جسم کھا جاتی ہے؟

سوال: وہ کہتے ہیں کہ صحیح حدیث میں ہے: «عَجْبُ الذَّنَبِ.» (ریڑھ کی ہڈی کا آخری حصہ) کے سوا انسان کا تمام بدن تباہ ہوجاتا ہے اور اسی سے جسم انسانی کو دوبارہ بنایا جائے گا۔ (باب: جس دن صور پھونکا جائے گا، تم لوگ فوج درفوج آؤ گے) وہ لوگ اس حدیث سے ثابت کرتے ہیں کہ تمام بدن تو تباہ ہوجاتا ہے پھر دنیاوی بدن کو عذاب کیسے دیا جاتا ہے۔ (والسلام: حافظ عبدالصمد، مین بازار سراج پارک، شاہدرہ) (۸فروری ۲۰۰۸ء)

جواب: اس سوال کا تفصیلی جواب پہلے گزر چکا ہے۔

کیا انسانی جسم کھا جانے والی حدیث کا اطلاق انبیاء کے اجساد پر ہوتا ہے؟

سوال: وہ کہتے ہیں کہ «عَجْبُ الذَّنَبِ.» والی حدیث سے انبیاء کے جسم سلامت رہنے والی موضوع روایت ٹکراتی ہے۔ لہٰذا ثانی الذکر روایت قابل ردّ ہے۔

عجب الذنب والی حدیث میں کسی انسان کے بدن کو مستثنیٰ قرار نہیں دیا گیا بلکہ فطرت کا قانون بیان کیا گیا ہے کہ ہر انسان خواہ نیک ہو یا بد، عام آدمی ہو یا نبی، ہر آدمی کے بدن کو مٹی کھا لیتی ہے۔ صرف عجب الذنب ہی بچتی ہے۔

(والسلام: حافظ عبدالصمد، مین بازار سراج پارک، شاہدرہ) (۸فروری ۲۰۰۸ء)

جواب: انبیاء علیہم السلام کے اجساد سلامت رہنے والی حدیث کے متعلق علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« قُلْتُ : وَ هٰذَا إِسْنَادٌ صَحِيْحٌ عَلٰى شَرْطِ مُسْلِمٍ .» ❶

''یہ سند صحیح ہے مسلم کی شرط پر ہے۔''

اس سے معلوم ہوا حدیث «عَجْبُ الذَّنَبِ.» کے عموم سے یہ روایت مخصوص ہے۔اصحابِ شرع کے ہاں یہ قاعدہ مسلمہ ہے اس کا کوئی بھی انکاری نہیں۔وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَشَاءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ.

قبر میں روح اور جسم کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟

سوال: دفنانے کے بعد روح اپنا وقت آسمان پر گزارتی ہے یا قبر میں یا دونوں جگہ؟

(سائل محمد اسلم عظیم منصوری، چونیاں) (۳ نومبر ۱۹۸۹ء)

جواب: قبر میں بعد از سوال مومن کی روح علیین میں اور کافر کی سجین میں چلی جاتی ہے۔لیکن ہر روح کا مستقر سے معنوی اتصال بدستور قائم رہتا ہے اور یہ اتصال دنیاوی زندگی کے مشابہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے قریب تر حالت سوئے ہوئے انسان کی ہے۔بظاہر اس کی روح انفصالی شکل میں کئی جگہ گھومتی پھرتی ہے اور بعض علماء نے اس کو سورج کی شعاؤں سے بھی تشبیہ دی ہے جو دُور دُور تک پھیل جاتی ہے۔چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ اپنے مطبوعہ فتاویٰ میں فرماتے ہیں:

« إِنَّ اَرْوَاحَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْ عِلِّيِّيْنَ وَ اَرْوَاحُ الْكُفَّارِ فِي سِجِّيْنَ وَلِكُلِّ رُوْحٍ اِتِّصَالٌ وَهُوَ اِتِّصَالٌ مَعْنَوِيٌّ لَا يُشْبِهُ الْاِتِّصَالَ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا بَلْ اَشْبَهُ شَيْءٍ بِهٖ حَالُ النَّائِمِ اِنْفِصَالًا وَ شَبَّهَهٗ بَعْضُهُمْ بِالشَّمْسِ اَيْ بِشُعَاعِ الشَّمْسِ وَ هٰذَا مَجْمَعُ مَا افْتَرَقَ مِنَ الْاَخْبَارِ اَنَّ مَحَلَّ الْاَرْوَاحِ فِيْ عِلِّيِّيْنَ وَفِيْ سِجِّيْنَ وَ مِنْ كَوْنِ اَفْنِيَةِ الْاَرْوَاحِ عِنْدَ اَفْنِيَةِ قُبُوْرِهِمْ كَمَا نَقَلَهٗ ابْنُ عَبْدِالْبَرِّ عَنِ الْجَمْهُوْرِ .» ❷

اور شیخ ابن باز رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ابن عبد البر کا قول یعنی روحوں کا عالم قبور میں ہونا اور مالک کا قول یعنی روحیں جہاں چاہتی ہیں کھاتی پیتی ہیں۔یہ اقوال ضعیف ہیں کیونکہ قرآن کے ظاہر کے مخالف ہیں۔قرآن کا ظاہر دلالت کرتا ہے کہ ارواح اللہ کے ہاں ممسک (تھمی) ہیں۔انھیں نعمتیں اور عذاب اللہ کی مشیت کے تحت پہنچتا رہتا ہے۔اس میں کوئی مانع (رکاوٹ) نہیں کہ ان پر عذاب اور نعمتیں پیش ہوں۔پھر سب بدن یا اس کے بعض اجزاء کو اس کا احساس بھی ہو اور مشارٌ الیہ دلیل اللہ کا ارشاد ہے: ﴿ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا﴾...... حاشیہ فتح الباری، ج:۳،ص:۲۲۳)

---

❶ صحیح سنن ابی داؤد: باب فضل یوم الجمعة ولیلة الجمعة (٤/ ٢١٤)، رقم الحدیث: ١٠٤٧

❷ فتاوی الحافظ ابن الحجر العسقلانی : ٤/ ٤٠ .

نیز ایک صحیح حدیث میں ہے: «اِنْ اَمْسَکْتَ نَفْسِیْ فَارْحَمْهَا وَ اِنْ اَرْسَلْتَهَا فَاحْفَظْهَا» ❶

(مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، شرح العقیدۃ الطحاویۃ،ص:۳۸۹، اورص:۳۹۱۔۳۹۲، فتح الباری، ج:۴، ص:۲۴۳، حاشیہ شیخ ابن باز رحمہ اللہ۔

کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کا آپ کے جسم سے ادنیٰ سا تعلق بھی نہیں ہے؟

سوال : نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح کا آپ کے بدن سے ادنیٰ سا تعلق بھی باقی نہیں رہ گیا۔ بدن مبارک سے کسی قسم کا دنیاوی یا برزخی تعلق ماننے والا کافر ہے۔ آپ کی روح مقام ''الوسیلہ'' یعنی جنت میں ہے۔

جواب : نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی برزخی زندگی نصوص شریعت سے ثابت ہے چناں چہ ''مسند امام احمد'' اور ''سنن ابی داؤد'' وغیرہ میں بسند حسن حدیث ہے:

«مَا مِنْ اَحَدٌ یُسَلِّمُ عَلَیَّ اِلَّا رَدَّ اللّٰهُ عَلَیَّ رُوْحِیْ حَتّٰی اَرُدَّ عَلَیهِ السَّلَام » ❷

'جب کوئی مجھ پر سلام کہتا ہے تو اللہ مجھ پر میری روح کو لوٹا دیتا ہے یہاں تک کہ میں سلام کا جواب دیتا ہوں۔''

واضح شرعی دلائل کا انکار الحاد اور زندقہ ہے۔

﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰی فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِیْنَ﴾ (البقرة:١٦)''

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مرعاۃ المفاتیح(١/٦٨٤ تا ٦٩٠) الصارم المنکی، اقتضاء الصراط المستقیم، صیانۃ الانسان۔

کیا عذابِ قبر جسم اور روح دونوں کو ہوتا ہے؟

سوال : عذابِ قبر روح کو یا میت کو یا دونوں کو ہوتا ہے؟ (سائل) (۱۸ جون ۱۹۹۹ء)

جواب : نصوص سے ظاہر یہ ہے کہ عذابِ قبر کا تعلق جسم اور روح دونوں سے ہے۔

کیا مرنے کے بعد برزخ میں روح کو ایک نیا بدن ملتا ہے؟

سوال : قرآن کے مطابق ہر مرنے والے کو قبر ملتی ہے جب کہ بعض لوگ جل جاتے ہیں، بعض کو درندے کھا لیتے ہیں، بظاہر انھیں کوئی قبر نہیں ملتی۔ دراصل برزخ نامی جگہ پر ہر مرنے والے کی روح کو ایک نیا بدن دیا جاتا ہے۔ اس نیا بدن

❶ صحیح البخاری، بَابُ التَّعَوُّذِ وَالقِرَاءَةِ عِنْدَ المَنَامِ، رقم: ٦٣٢٠، صحیح مسلم، بَابُ مَا یَقُولُ عِنْدَ النَّوْمِ وَأَخْذِ الْمَضْجَعِ، رقم:٢٧١٤

❷ سنن ابی داؤد، بَابُ زِیَارَةِ الْقُبُورِ، رقم: ٢٠٤١،

دیے جانے ہی کو شریعت نے قبر کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ نئے بدن میں روح ڈال کر اسے حساب کتاب ہوتا ہے اور راحت یا عذاب کا معاملہ ہوتا ہے جو شخص کہے کہ دنیاوی قبر میں راحت یا عذاب یا حساب کتاب ہوتا ہے یا روح کا بدن سے تعلق قائم کر دیا جاتا ہے، وہ کافر اور ابدی جہنمی ہے۔

جواب: واضح ہو کہ قبر کا اطلاق اہل شرع کے ہاں صرف مٹی کے گڑھے پر نہیں بلکہ برزخی ساری زندگی کو محیط ہے۔ چاہے کوئی سمندر کی نظر ہو جائے یا اس کی راکھ کو ہوا میں اڑا دیا جائے یا درندے وغیرہ کھا جائیں۔

ہر ایک کے ساتھ حسب اعمال برزخی زندگی میں معاملہ برحق ہے، جس طرح کہ کتاب و سنت کی بے شمار نصوص میں صراحت کی گئی ہے، مرنے والا قیامت تک کن کن مراحل سے گزرتا ہے اس کا تفصیلی علم اللہ کے علاوہ کسی کو نہیں اور عذاب وثواب کی جملہ کیفیات کا علم صرف اس کو ہے۔ دنیا میں یہ انسان ہر روز مرتا ہے اور اس کی روح جسم سے مفارقت اختیار کرتی ہے بیدار ہونے پر دوبارہ روح کو جسم میں لوٹا دیا جاتا ہے جس طرح کہ قرآن حکیم اور صحیح احادیث میں اس کا واضح ثبوت موجود ہے۔ جب دنیا میں روح جسم میں کئی دفعہ لوٹتی ہے اس سے کوئی شخص عقلی اور نقلی طور پر کئی زندگیاں ثابت نہیں کرتا تو مرنے کے بعد روح کے قبر کی طرف لوٹنے سے کئی زندگیاں کس طرح ثابت ہو جائیں گی۔ قرآن کا نزول نبی ﷺ پر ہوا ہے، آپ ﷺ دو زندگیوں اور دو موتوں سے خوب واقف تھے ہم سوچ بھی نہیں سکتے کہ نبی ﷺ قرآن کے خلاف کوئی بات کریں۔ جملہ محدثین نے اپنی اپنی تالیفات کے ابواب وتراجم میں مسئلہ ہذا کو خوب نکھار کر پیش کیا ہے۔

اگر امام احمد اس مسئلے کے اثبات کی بنا پر ان کی نگاہ میں مجرم ٹھہرے ہیں تو یہی بات الفقہ الاکبر میں امام ابوحنیفہ سے بھی ثابت ہے، اس سے صرف نظر کیوں ہو رہی ہے۔ ہمارے نزدیک دونوں اماموں کا عقیدہ عین شریعت کے مطابق ہے۔ یہ عقیدہ صحیح حدیث براء بن عازب میں بہ صراحت موجود ہے۔ مسند احمد (۴/ ۲۸۷، ۲۹۵، ۲۹۶) ابوداؤد (۴۷۵۳) مزید ملاحظہ ہو، بخاری (۱۳۳۸) (۱۳۷۴) مسلم (۲۸۷) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، مہذب شرح العقیدہ الطحاویۃ (ص: ۳۱۵۔۳۲۱)

کیا قبر میں عذاب جسم کو ہوتا ہے؟ حالانکہ روح عالم برزخ میں (علیین یا سجّین میں) ہوتی ہے؟

سوال: عذابِ قبر کی کیفیت کیسی ہوتی ہے حالانکہ روح تو علیین یا سجّین میں ہوتی ہے اور جسم قبر میں ہوتا ہے کیا عذابِ قبر ایک نئے برزخی جسم کے ساتھ آسمان پر نہیں ہوتا؟ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے معراج کی رات کچھ لوگوں کو عذاب میں مبتلا دیکھا تھا۔ حالانکہ قیامت سے پہلے تو عذاب نہیں ہوسکتا اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ غزوۂ بدر کے شہیدوں کی روحوں کو سبز رنگ کے پرندوں کے جسم میں منتقل کر دیا گیا ہے اور وہ جنت میں اڑتے پھرتے ہیں۔ جواب تفصیل سے دیجیے۔ (خالد مصطفیٰ ایس ایس ٹی گورنمنٹ تعلیم ہائی سکول حاصلانوالہ تحصیل پھالیہ ضلع گجرات) (۴۔ستمبر۱۹۹۲ء)

جواب: قبر میں جزاء سزا برزخی معاملہ برحق ہے لیکن انسانی عقول حقیقت کے ادراک سے قاصر ہیں اس پر ایمان لانا

واجب ہے اور انکار کرنا الحاد ہے۔ اس موضوع پر میرے قلم سے تفصیلی فتویٰ الاعتصام ۱۹۹۱ء، جلد: ۴۳، شمارہ: ۳۴) میں شائع ہو چکا ہے۔

علیین اور سجین میں اعمال نامے کا تعلق روح سے ہے؟

سوال: علیین و سجین میں اعمال نامے اور روح دونوں رکھے جاتے ہیں یا کوئی ایک؟ (سائل) (۱۸ جون ۱۹۹۹ء)

جواب: علیین اور سجین سے اعمالنامے اور روح دونوں کا تعلق ہوتا ہے؟ (فتاویٰ عزیزی)

کیا دنیاوی قبر کا تعلق بھی برزخ سے ہے؟

سوال: ایک آدمی دنیاوی قبر کے عذاب کا منکر ہے۔ کہتا ہے کہ برزخی قبر میں عذاب ہوتا ہے اسی طرح مومن کی برزخی قبر کشادہ ہوتی ہے دنیاوی قبر نہیں۔ یہ عقیدہ اسلام کی نظر میں کیسا ہے؟ (سائل) (۱۸ جون ۱۹۹۹ء)

جواب: دنیاوی قبر کا تعلق بھی اصلاً برزخ سے ہے۔ لہٰذا اس تفریق کی کوئی ضرورت نہیں۔ عذابِ قبر ہر دو صورت میں برحق ہے۔ تاویل یا انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔

''عذابِ قبر'' کے منکر لوگوں کے بارے میں فتویٰ

سوال: جو لوگ خود کو مسلمان کہتے ہیں مگر اس کے باوجود عقیدۂ عذابِ قبر کے کلی طور پر منکر ہیں، اور اس بارے میں نبی ﷺ سے ثابت شدہ تمام صحیح احادیث کو (نعوذ باللہ) جھوٹا اور من گھڑت قرار دیتے ہیں؟ اُن کے بارے میں علمائے سلف کا کیا موقف ہے؟ کیا ایسے لوگ دائرۂ اسلام سے خارج ہیں؟ کیا ایسے لوگوں کو کافر کہا جا سکتا ہے؟ کتاب و سنت کی روشنی میں ہمیں اپنی رائے سے آگاہ فرمائیں۔ جزاک اللہ احسن الجزاء (محمد ارشد کمال) (۱۷ فروری ۲۰۰۶ء)

جواب: صحیح احادیث سے ثابت شدہ عقائد کے منکر لوگوں سے بہرصورت اجتناب ضروری ہے، ان کا انجام کار بلا شبہ کفر پر ہے، ایسے لوگوں کی ہدایت کے لیے دعا بھی کرنی چاہیے۔

﴿ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحۡدِثُ بَعۡدَ ذٰلِكَ اَمۡرًا ﴾ (الطلاق:۱)

زندگی میں کفن و قبر تیار کرانے کا حکم

سوال: ۱۔ اپنی زندگی میں اپنا کفن تیار کر کے رکھنا۔

۲۔ اپنی زندگی میں اپنی قبر کے لیے جگہ کا انتخاب کرنا۔

۳۔ کچی قبر تیار کر کے اس کے سرہانے کی طرف تقریباً دو فٹ کے فاصلہ پر تختی نصب کرنا۔

مہربانی کر کے حدیث کی روشنی میں بتائیں کہ ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟

(سائل محمد شفیق ساکن منڈھیالی شیخوپورہ) (۱۸ جولائی ۱۹۹۷ء)

جواب : ا۔ زندگی میں کفن تیار کرنے کا جواز ہے۔ ''صحیح بخاری'' میں حدیث سہیل اس امر کی واضح دلیل ہے۔ ملاحظہ ہو :بَابُ مَنِ اسْتَعَدَّ الْكَفَنَ فِي زَمَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمْ يُنْكَرْ عَلَيْهِ

۲۔ بعض سلف صالحین کے عمل سے ثابت ہے لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے عملِ ہذا ثابت نہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«وَقَالَ ابن بَطَّالٍ فِيهِ جَوَازُ إِعْدَادِ الشَّيْءِ قَبْلَ وَقْتِ الْحَاجَةِ إِلَيْهِ قَالَ وَقَدْ حَفَرَ جَمَاعَةٌ مِنَ الصَّالِحِينَ قُبُورَهُمْ قَبْلَ الْمَوْتِ وَتَعَقَّبَهُ الزَّيْنُ ابْنُ الْمُنِيرِ بِأَنَّ ذٰلِكَ لَمْ يَقَعْ مِنْ أَحَدٍ مِنَ الصَّحَابَةِ قَالَ وَلَوْ كَانَ مُسْتَحَبًّا لَكَثُرَ فِيهِمْ.» [1]

۳۔ قبر پر تختی نصب کرنا ناجائز ہے۔ اگر چہ کچھ فاصلہ پر ہو۔ ''صحیح مسلم'' وغیرہ میں حدیث جابر رضی اللہ عنہ میں ہے: أَوْ يُكْتَبُ عَلَيْهِ یا اس پر کچھ لکھا جائے۔ [2] امام محمد رحمہ اللہ الآ ثار میں لکھتے ہیں: قبر پر لکھنا یا کتبہ لگانا مکروہ (حرام) ہے۔

کیا عذابِ قبر حق ہے؟

سوال : بعض ملحدین عذاب قبر کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قبر میں عذاب نہیں ہوگا۔ کیونکہ قبر میں انسان کا صرف جسم ہوگا۔ اس کی روح آسمان پر ہوگی اور یہ سارے عذاب قیامت کے دن دیے جائیں گے۔ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ فرعون اور آل فرعون کو ہر روز صبح و شام عذاب دیا جاتا ہے جب کہ فرعون کی لاش تو مصر یا پھر فرانس میں رکھی ہے اور جو سیلاب میں بہہ گیا یا جو جل گیا، جیسے ہندو جلاتے ہیں یا کہ اس کے جسم کی راکھ بن گئی اس کے بارے میں کیا کہا جائے گا؟

جواب : ''عذابِ قبر'' کا مسئلہ کتاب و سنت کی بے شمار نصوص میں ثابت شدہ ہے۔ کسی مومن کے لائق نہیں کہ اس کا انکار کرے اور جہاں تک عذاب کی کیفیت کا تعلق ہے سو یہ برزخی معاملہ ہے جس کا دنیا میں فیصلہ کرنا انسانی استطاعت سے ماوراء ہے۔ اکٹھے دو سوئے ہوئے آدمی بحالت خواب مختلف مناظر میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ایک نعمتوں میں اور دوسرا عذاب میں، کسی کو دوسرے کی حالت کا شعور نہیں ہونے پاتا، حالانکہ وہ ایک ہی جگہ آرام فرما ہیں۔ سو برزخی معاملہ تو بہت وسیع ہے۔ جس کا ادراک انسانی دائرہ اختیار سے خارج ہے۔ بس اس پر ایمان لانا واجب ہے۔ روح قبض ہونے کے ساتھ ہی حقیقت حال منکشف ہو جاتی ہے۔

یاد رہے نصوص شریعت میں کیڑے نکالنا الحاد کے علمبرداروں کا امتیازی نشان ہے۔ ورنہ کون نہیں جانتا کہ محدثین کرام کی خدمات نصف النہار کی طرح عیاں ہیں کھرے اور کھوٹے سکے کا بازار علیحدہ علیحدہ جما دیا ہے۔ ﴿فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ ہزاروں افراد کے حالاتِ زندگی کو معیارِ حق کی کسوٹی پر پرکھنا ان کا عظیم کارنامہ ہے جن کی مثال پیش کرنے سے تاریخ عالم قاصر ہے۔ اللہ رب العزت ان کی مساعی جمیلہ قبول فرما کر اعلیٰ علیین میں مقام

---

[1] فتح الباري:۳/ ۱٤٤

[2] سنن ابن ماجه، بَابُ مَا جَاءَ فِي النَّهْيِ عَنِ الْبِنَاءِ عَلَى الْقُبُورِ، وَتَجْصِيصِهَا، وَالْكِتَابَةِ عَلَيْهَا، رقم:۱٥٦۳

عنایت فرمائے۔ اور ہمیں شکر گزاری کی توفیق بخشے! احسان فراموش ہونا اپنے کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔

ملحدین کو قائل کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ حسب استطاعت پہلے اپنے کو ضروری علم سے مسلح کریں پھر علی وجہ البصیرت ان کو اللہ کے دین کی طرف دعوت دیں۔ تو امید ہے کہ دعوت نتیجہ خیز ثابت ہو گی اور اشکالات کی صورت میں پختہ کار اہل علم کی طرف رجوع کریں۔ اور ایک عام آدمی کے لیے بھی یہ ہے کہ اپنی زبان میں موضوع سے متعلق صحیح العقیدہ علماء کی کتابوں کو پڑھ کر کما حقہ واقفیت حاصل کر کے ٹھوس دلائل کی روشنی میں عقل ونقل سے ان کو قائل کرنے کی سعی کرے۔ (وَالتَّوْفِيْقُ بِيَدِ اللّٰهِ)

(قبرستان کے متعلقہ مسائل)

جوتوں سمیت قبرستان میں جانا

سوال: کیا جوتے قبرستان کے باہر اتارنے چاہئیں؟

جواب: راجح مسلک یہ ہے کہ قبروں میں جوتے مطلقاً اتار دیئے جائیں۔ ہاں البتہ چلنے میں کانٹوں وغیرہ سے بچاؤ کی خاطر پہنا جاسکتا ہے۔ ملاحظہ ہو! ''تہذیب السنن'' ابن قیم اور ''فتاویٰ لجنۃ دائمہ'' (۹/۱۲۳)

''النہایہ'' میں ہے:

«اِنَّمَا اَمَرَهُ بِالْخَلْعِ اِحتَرَامًا لِلْمَقَابِرِ، لِاَنَّهُ كَانَ يَمشِي بَيْنَهَا.»

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو! (احکام الجنائز مولانا محمد عبدہ رحمہ اللہ)

قبرستان کی جگہ میں کھیتی باڑی یا مکان کی تعمیر کا حکم:

سوال: قبرستان مسمار کر کے اس میں کھیتی باڑی کرنا، فروٹ کے درخت لگانا یا مکان بنانا کیسا ہے؟ اس کھیت کی آمدن اور مکان میں قرآن پڑھنے یا نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ (محمود الحسن سلیم، سکردو بلتستان) (۱۱ جون ۱۹۹۹ء)

جواب: اہل اسلام کے قبرستان کو مسمار کر کے اس کی جگہ کھیتی باڑی یا فروٹ کے درخت لگانا یا مکان تعمیر کرنا ناجائز ہے۔ کیونکہ اس میں مسلمانوں کی توہین اور اکرامِ مسلم کے منافی فعل ہے۔ ہاں البتہ مشرکین کی قبروں کو اکھاڑا جا سکتا ہے۔ چنانچہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی ''صحیح'' میں بایں الفاظ باب منعقد کیا ہے:

«بَابٌ :هَلْ تُنْبَشُ قُبُورُ مُشْرِكِي الْجَاهِلِيَّةِ، وَيُتَّخَذُ مَكَانُهَا مَسَاجِدَ .»

''جس سے مقصود یہ ہے کہ مشرکوں کی قبریں مسمار کر کے وہاں مسجد تعمیر کرنا جائز ہے۔''

پھر اس واقعہ سے استدلال کیا ہے جس میں ہے کہ مسجد نبوی کو مشرکوں کی قبور کی جگہ بنایا گیا تھا۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ

فرماتے ہیں:

«أَيْ دُونَ غَيْرِهَا مِنْ قُبُورِ الْأَنْبِيَاءِ وَأَتْبَاعِهِمْ لِمَا فِي ذَلِكَ مِنَ الْإِهَانَةِ لَهُمْ بِخِلَافِ الْمُشْرِكِينَ فَإِنَّهُمْ لَا حُرْمَةَ لَهُمْ.» (۲۴/۱ھ)

''یعنی مشرکوں کی قبروں کو مسمار کرنا جائز ہے اس لیے کہ ان کی کوئی عزت نہیں لیکن انبیاء علیہم السلام اور ان کے پیروکاروں کی قبریں مسمار کرنا ناجائز ہے کیونکہ اس میں ان کی توہین ہے۔ حنفی فقہ میں ہے:

«سئل القاضی الامام شمس الائمة محمود الاوزجندی عن المقبرة فی القری اذا اندرست و لم یبق فیها اثر الموتی لا العظم و لا غیره هل یجوز زرعها قابل واستغلالها قال لا ولها کم المقبرة کذا فی المحیط فلو کان فیها حشیش یحش و یرسل الدوابُّ فیها کذا فی البحر الرائق ۔(عالمگیری) .»

ماحصل اس کا یہ ہے کہ بے نشان قبرستان میں کھیتی باڑی کرنا ناجائز ہے کیونکہ یہ قبرستان کے حکم میں ہے۔ کوشش کرنی چاہیے کہ ایسی جگہ کو اپنی اصلی حالت میں بدل دیا جائے اور اگر کوئی ایسی صورت پیدا نہ ہو سکے پھر اس کی آمدنی اوقاف میں صرف کردی جائے۔

قبرستان ہموار کر کے رہائش یا برائے ضرورت مکان تعمیر کرنا کیسا ہے؟

سوال: قبرستان ہموار کر کے رہائش یا برائے ضرورت مکان تعمیر کرنا کیسا ہے؟ یا قبرستان والی جگہ پر تعمیر شدہ مکان خرید لیا جائے جس کا علم بعد میں ہو تو کیا کرنا چاہیے؟ (سائل) (۲۔نومبر ۲۰۰۱ء)

جواب: قبرستان کو ہموار نہیں کرنا چاہیے اور نہ وہاں رہائش کا سوچنا چاہیے ہاں البتہ اگر نشانات مٹ چکے ہوں یعنی قبریں بہت پرانی ہو چکی ہوں کہ نشانات بھی نہ رہیں تو وہاں رہائش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ قبرستان میں خریدا ہوا مکان اگر بے نشان جگہ پر ہے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں اور اگر وہاں آثار موجود ہیں تو پھر وہاں رہائش اختیار کرنا درست نہیں۔

مسلمانوں کے قبرستان کی بے حرمتی (قبر کھودنا) گناہ ہے یا نہیں؟

سوال: میرے ایک دوست کی والدہ کی قبر کسی بدبخت نے تین فٹ گہرائی تک ٹریکٹر سے جان بوجھ کر کھود دی ہے اور اس طرح ہل چلایا ہے کہ اوپر کی مٹی نیچے اور نیچے کی اوپر آ گئی ہے۔ ہمارا دل چاہتا ہے کہ اسے فوراً موت کے گھاٹ اتار دیں۔ براہِ کرم رہنمائی فرمائیں کہ ہم شرعی لحاظ سے اسے کسی حد تک سزا دے سکتے ہیں یا نہیں؟ نیز درج ذیل سوالات کے جوابات بھی عنایت فرمائیں:

۱۔ مسلمانوں کے قبرستان کی بے حرمتی گناہ ہے یا نہیں؟

۲۔ اگر کوئی شخص کسی مسلمان کی بلاوجہ یا بر بنائے دشمنی و انتقام قبر کھود ڈالے تو ایسے شخص کی شریعت اسلامیہ میں کیا سزا ہے؟

۳۔ اگر کوئی شخص کسی شخص کو اپنی والدہ کی قبر کھودتے ہوئے دیکھے تو وہ اس شخص سے کیا سلوک کر سکتا ہے؟ کہاں تک اسے بدلہ یا سزا کا حق ہے اس سے قطع تعلق کرنا یا اس کو دل سے برا جاننا اور سزا دینا، انتقام لینا ان میں کیا بہتر ہے؟ (سید محمد اخلاق، کراچی) (۱۱ جون ۱۹۹۹ء)

جواب: محترم اپنے سوال کا جواب ملاحظہ فرمائیں۔ بلاشبہ شریعت اسلامیہ میں اکرامِ مسلم کو بڑی اہمیت حاصل ہے خواہ وہ زندہ ہو یا مردہ۔ عمرو بن حزم کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے مجھے ایک قبر پر ٹیک لگائے ہوئے دیکھا تو فرمایا: اس قبر والے کو ایذا نہ دے۔

ور دوسری روایت میں ہے میت کی ہڈی توڑنا زندہ کی ہڈی توڑنے کی طرح ہے۔ [1]

اور ''صحیح مسلم'' میں ابومرثد غنوی سے مرفوعاً مروی ہے:

«لَا تَجْلِسُوا عَلَى الْقُبُورِ، وَلَا تُصَلُّوا إِلَيْهَا.» [2]

یعنی ''قبروں پر مت بیٹھو اور نہ ان کی طرف اور نہ ان کے اوپر نماز پڑھو۔''

ان نصوص سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کی عزت و احترام ہر حالت میں واجب ہے۔ اس کی اہانت کرنے والے کے ساتھ وہی کچھ ہونا چاہیے جس کے وہ لائق ہے۔ حکومت کا فرض ہے کہ اس کے لیے مناسب طریقہ سزا و تادیب تجویز کرے جس سے عام لوگوں کو عبرت ہو تاکہ آئندہ ایسے فعلِ شنیع کا اعادہ نہ ہونے پائے لیکن اس کے بدلہ میں کسی کو موت کے گھاٹ اتارنا بہر صورت ناجائز ہے۔

۱۔ قبروں کی بے حرمتی کرنا بلاشبہ گناہ ہے لیکن اس کے مباح الدم ہونے کی شریعت میں کوئی دلیل نہیں۔

۲۔ حکومت جو مناسب سمجھے بطورِ تعزیر سزا دے سکتی ہے۔

۳۔ ایسے شخص سے ہر ممکن طریقہ سے نفرت کا اظہار ہونا چاہیے اور اگر وہ تائب ہو جائے تو پھر رنجش دل سے نکال دینی چاہیے۔

---

[1] سنن ابن ماجه، بَابٌ فِي النَّهْيِ عَنْ كَسْرِ عِظَامِ الْمَيِّتِ، رقم:١٦١٦، سنن ابی داؤد، بَابٌ فِي الْحَفَّارِ يَجِدُ الْعَظْمَ هَلْ يَتَنَكَّبُ ذَلِكَ الْمَكَانَ؟، رقم:٣٢٠٧

[2] صحيح مسلم، بَابُ النَّهْيِ عَنِ الْجُلُوسِ عَلَى الْقَبْرِ وَالصَّلَاةِ عَلَيْهِ، رقم: ٩٧٢

قبرستان کی جگہ پر ذاتی مکان بنانا

سوال : جناب مفتی صاحب!

گزارش ہے کہ ایک آدمی نے تقریباً ایک مرلہ زمین خریدی، جس کے ساتھ ہی قبرستان ہے۔ قبروں پر مٹی نہ ڈالنے اور بارشوں کی وجہ سے مٹی بہہ جانے سے قبروں کا نشان مٹ چکا ہے۔ مذکورہ آدمی نے علم ہونے کے باوجود قبرستان کی جگہ میں سے تقریباً ۳ مرلے ساتھ ملالی ہے اور اس پر عمارت بنا کر گندم پیسنے والی چکی اور دھان چھڑنے والی مشین نصب کردی ہے۔ اسی طرح شخص مذکور نے اپنی رہائش کے لیے تقریباً ۴ مرلے جگہ خرید کر اس کے ساتھ بھی قبرستان کی تقریباً چار مرلے جگہ ملا کر مکان بنالیا ہے اور اس میں رہائش پذیر ہے۔

کیا ایسی جگہ (قبرستان) پر رہائش رکھنا اور کاروبار کرنا جائز ہے؟ نیز قبروں پر عمارت بنانے کا کیا گناہ اور قیامت کو کیا سزا ہوگی؟ (سائل: مولوی عتیق الرحمن ولد حافظ محمد عبداللہ، تحصیل وضلع گوجرانوالہ) (۲۴ دسمبر ۱۹۹۹ء)

جواب : قبروں کی بے نشان زمین کو اپنے ذاتی استعمال میں لانے کا کوئی حرج نہیں۔ بشرطیکہ وہ قطعۂ ارضی وقف نہ ہو بایں صورت یہ جگہ قبرستان کے حکم میں نہیں رہتی۔ علامہ ملا علی قاری نے ''مرقاۃ'' (۱/۴۵۶) میں اس امر کی تصریح کی ہے۔ ہمارے شیخ محمد عبدہ الفلاح رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ''بہرحال نزاع اس قبر میں ہے جو ظاہر ہو ورنہ بطنِ ارض میں نامعلوم کتنی قبریں ہیں۔ جن پر ہم چلتے پھرتے ہیں۔ پس قبر مندرس (بے نشان) اور قبر ظاہر کو ایک حکم نہیں دے سکتے۔ (احکام جنائز،ص:۲۵۶) نیز ہمارے شیخ محدث روپڑی رحمہ اللہ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں: جب قبرستان کا نام و نشان نہ رہے تو اس کا حکم قبر کا نہیں رہتا۔''

(فتاویٰ اہل حدیث:۱/۳۴۴)

قبرستان میں جو درخت ہوں انھیں اپنے استعمال میں لایا جاسکتا یا نہیں؟

سوال : قبرستان میں جو درخت ہوں انھیں اپنے استعمال میں لایا جاسکتا یا نہیں۔ خصوصاً جو متبرک سمجھے جاتے ہوں؟ (محمد یعقوب منڈڑیاں) (۹ فروری ۱۹۹۶ء)

جواب : قبر پر واقع درخت کو اپنے استعمال میں لانے میں کوئی حرج نہیں کسی درخت کی کوئی خصوصیت نہیں۔ سب برابر ہیں۔

(آدابِ زیارتِ قبور)

عورتوں کے لیے زیارتِ قبور کا حکم؟

سوال : کیا عورتوں کا قبرستان میں جانا جائز ہے۔ (از سائلہ قصور) (۳۰ اگست ۱۹۹۱ء)

جواب : عورتوں کو زیارتِ قبور کی گاہے بہ گاہے اجازت ہے بشرطیکہ وہاں جزع وفزع ، بے صبری ، بے قراری اور چیخنے چلانے کا مظاہرہ نہ کیا جائے۔ جواز پر دال چند ایک احادیث ملاحظہ ہوں۔

۱۔ رسولِ کریم ﷺ کا گزر ایک عورت کے پاس سے ہوا جو قبر کے قریب بیٹھے رو رہی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«اِتَّقِی اللّٰہَ وَاصْبِرِیْ»❶

حدیثِ ہٰذا سے وجہ استدلال یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس عورت کو صرف اللہ کے ڈر اور صبر کی تلقین کی ہے۔ زیارتِ قبور سے منع نہیں فرمایا۔ اگر یہ ناجائز ہوتا تو روک دیتے۔ اصولِ فقہ میں قاعدہ معروف ہے۔

« تَأْخِیْرُ الْبَیَانِ عَنْ وَقْتِ الْحَاجَةِ لَا یَجُوْزُ »

۲۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی کہ جب میں قبرستان جاؤں تو کیا کہوں تو فرمایا کہ:

« اَلسَّلَامُ عَلٰی اَھْلِ الدِّیَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُسْلِمِیْنَ وَ یَرْحَمُ اللّٰہُ الْمُسْتَقْدِمِیْنَ مِنَّا وَالْمُسْتَأْخِرِیْنَ وَ اِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰہُ بِکُمْ لَلَاحِقُوْنَ»❷

۳۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے بھائی عبدالرحمٰن کی قبر کی زیارت سے واپس آ رہی تھیں۔ عبداللہ بن ابی ملیکہ نے کہا کیا رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کو قبروں کی زیارت سے منع نہیں کیا۔ فرمایا منع تو کیا تھا لیکن بعد میں اجازت مرحمت فرما دی تھی۔ حافظ عراقی نے کہا اس کی سند جید ہے۔❸

نیز امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر جو لعنت وارد ہے یہ بطورِ مبالغہ ہے اور قبرستان میں اکثر و بیشتر جانے والی عورتوں کے متعلق ہے کیوں کہ اس سے خاوندوں کے حقوق ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔ بے پردگی ہوتی ہے بعض دفعہ نوحہ وغیرہ کرنے لگتی ہیں۔ اگر یہ کوتاہی نہ ہو تو پھر جائز ہے کیونکہ موت کی یاد کے لیے جیسے مرد محتاج ہے۔ ایسے ہی عورتیں بھی محتاج ہیں۔ امام شوکانی ''نیل الاوطار'' میں اس عبارت کے اختتام پر فرماتے ہیں:

---

❶ صحیح البخاری ، بَابُ قَوْلِ الرَّجُلِ لِلْمَرْأَةِ عِنْدَ الْقَبْرِ: اصْبِرِی ، رقم:۱۲۵۲ ، صحیح مسلم(۶/ ۲۲۷-۲۲۸)

❷ صحیح مسلم(۷/ ۴۴) ، بَابُ مَا یُقَالُ عِنْدَ دُخُولِ الْقُبُورِ وَالدُّعَاءِ لِأَهْلِهَا ، رقم: ۹۷۴ ، سنن النسائی (۴/ ۹۲-۹۳) ، الْأَمْرُ بِالِاسْتِغْفَارِ لِلْمُؤْمِنِینَ ، رقم: ۲۰۳۷

❸ تخریج احیاء علوم الدین:۴/ ۵۲۱

«وَ هٰذَا الْكَلَامُ هُوَ الَّذِيْ يَنْبَغِيْ اِعْتِمَاده فِي الْجمع بَيْنَ الْاَحَادِيْثِ الْمُتَعَارِضَة فِي الظَّاهِرِ.»

''یعنی قرطبی کا یہ کلام قابلِ اعتماد ہے جس سے بظاہر متعارض احادیث میں تطبیق ہو جاتی ہے۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ فتح الباری: ۳/ ۱۴۸۔

۴۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ سے دریافت کیا کہ جب قبرستان جاؤں تو کیا دعا پڑھوں تو جواباً آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پڑھو:

«اَلسَّلَامُ عَلٰى اَهْلِ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ وَ يَرْحَمُ اللّٰهُ الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنَّا وَالْمُسْتَأْخِرِيْنَ وَ اِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَلَاحِقُوْنَ» ❶

اور جو لوگ عورتوں کو زیارتِ قبور سے منع کرتے ہیں ان کا استدلال اس روایت سے ہے کہ:

«لَعَنَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ زَائِرَاتِ الْقُبُورِ.» ❷

یعنی ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت کی ہے۔''

اور بعض الفاظ میں یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کثرت سے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت کی ہے۔ مسند طیالسی (۱/ ۱۷۱) ابن ماجہ (۱۵۷۵) علامہ ملا علی قاری حنفی فرماتے ہیں: ''ممکن ہے مراد اس سے وہ عورتیں ہوں جو کثرت سے زیارتِ قبور کرتی ہیں۔''

اور علامہ قرطبی فرماتے ہیں: ''بعض اہل علم نے ترمذی کی روایات میں وارد لعنت کو کثرتِ زیارت پر محمول کیا ہے کیونکہ زوّارات مبالغہ کا صیغہ ہے۔ ❸

نیز امام موصوف فرماتے ہیں: '' اگر عورت قبرستان میں زیادہ نہ جائے نوحہ نہ کرے مرد کے حقوق ضائع نہ کرے تو اس کو جانا جائز ہے۔ ورنہ نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو زیارت کرنے والی عورتوں کو لعنت کی ہے۔ یہ رخصت سے پہلے تھی جب رخصت ہوئی تو عورتوں مردوں سب کو ہوگئی اور عورتوں کیلیے جو زیادہ مکروہ ہے وہ صرف بے قراری اور بے صبری کی وجہ سے ہے۔ اور علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے اس کو اعتماد کے قابل و لائق بتایا ہے۔ بلاشبہ مختلف احادیث کو تطبیق دینے کی یہ ایک بہترین صورت ہے۔ (وَاللّٰهُ تَعَالٰى اَعْلَمُ.)

---

❶ صحيح مسلم (۷/ ٤٤)، بَابُ مَا يُقَالُ عِنْدَ دُخُولِ الْقُبُورِ وَالدُّعَاءِ لِأَهْلِهَا، رقم: ۹۷٤، سنن النسائی (٤/ ۹۲-۹۳)، الْأَمْرُ بِالِاسْتِغْفَارِ لِلْمُؤْمِنِينَ، رقم: ۲۰۳۷

❷ سنن ابی داؤد، بَابٌ فِي زِيَارَةِ النِّسَاءِ الْقُبُورَ، رقم: ۳۲۳٦، سنن النسائی، التَّغْلِيظُ فِي اتِّخَاذِ ...... الخ، رقم: ۲۰٤۳

❸ المرعاة: ۲/ ۲۵۲

عورتیں اگر قبرستان جا کر واویلا وغیرہ نہ کریں تو ان کا قبرستان میں جانا جائز ہے؟

سوال : بعض علماء کہتے ہیں کہ اگر عورتیں قبرستان میں جا کر شرک اور واویلا نہ کریں تو ان کا قبرستان میں جانا جائز ہے۔اور بعض کہتے ہیں کہ قبرستان جانے والی عورتوں پر خدا کی لعنت ہوتی ہے۔ان میں کونسی بات صحیح ہے؟

جواب : عورتوں کے لیے زیارتِ قبور جائز ہے۔اس سلسلہ میں وارد چند ایک احادیث ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ رسولِ اکرم ﷺ کا گزر ایک قبر کے پاس سے ہوا، دیکھا کہ وہاں ایک عورت رو رہی ہے۔فرمایا:«اِتَّقِی اللّٰہَ وَاصْبِرِیْ»[1] ''اللہ سے ڈر اور صبر کر۔''

وجہ استدلال یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اس کو اللہ سے ڈر اور صبر کی تلقین کی ہے۔اگر عورت کے لیے زیارتِ قبور ناجائز ہوتی تو اسے منع فرمادیتے۔اصولِ فقہ کا قاعدہ معروف ہے:

«تَأْخِیْرُ الْبَیَانِ عَنْ وَقْتِ الْحَاجَةِ لَا یَجُوْزُ»

۲۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:«کُنْتُ نَهَیْتُکُمْ عَنْ زِیَارَةِ الْقُبُوْرِ فَزُوْرُوْهَا»[2]

''میں نے تم کو قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا،سوتم قبروں کی زیارت کرو۔''

حدیث ہذا میں عمومی رخصت مرد و زن سب کو شامل ہے۔

۳۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے بھائی عبدالرحمٰن کی قبر کی زیارت کی تو عبداللہ بن ابی ملیکہ نے ان سے دریافت کیا۔کیا رسول اللہ ﷺ نے عورتوں کو زیارتِ قبور سے منع نہیں فرمایا تھا؟ کہا ہاں مگر بعد میں آپ ﷺ نے ان کو زیارتِ قبور کی اجازت فرمادی۔[3]

حاکم نے اس پر سکوت کیا ہے اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے اور حافظ عراقی نے تخریج ''اِحیاء علوم الدین'' میں اس کی سند کو جید قرار دیا ہے۔(۵۲۱/۴)

۴۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ سے دریافت کیا کہ جب قبرستان جاؤں تو کیا دعا پڑھوں؟ تو جواباً آپ ﷺ نے فرمایا: پڑھو:

«اَلسَّلَامُ عَلٰی اَهْلِ الدِّیَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُسْلِمِیْنَ وَ یَرْحَمُ اللّٰهُ الْمُسْتَقْدِمِیْنَ مِنَّا وَالْمُسْتَأْخِرِیْنَ وَ اِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِکُمْ لَلَاحِقُوْنَ»[4]

---

[1] صحیح البخاری ، بَابُ قَوْلِ الرَّجُلِ لِلْمَرْأَةِ عِنْدَ الْقَبْرِ: اصْبِرِی ، رقم:۱۲۵۲ ، صحیح مسلم(۶/ ۲۷۔۲۲۸

[2] صحیح مسلم ، کتاب الجنائز ، باب استِئْذَان النَّبِی ﷺ رَبّه عزوجل فِی زِیَارَةِ قَبر امّه ، رقم: ۲۲۶۰ ، ۲۲۶۱

[3] مستدرك للحاكم ، کتاب الجنائز ، رقم: ۱۳۹۲ ، السنن الکبریٰ للبیهقی ، بَابُ مَا وَرَدَ فِی .....الخ ، رقم:۷۲۰۷

[4] صحیح مسلم(۷/ ٤٤) ، بَابُ مَا یُقَالُ عِنْدَ دُخُولِ الْقُبُورِ وَالدُّعَاءِ لِأَهْلِهَا ، رقم: ۹۷٤ ، سنن النسائی (٤/ ۹۲۔ ۹۳) ، اَلْأَمْرُ بِالِاسْتِغْفَارِ لِلْمُؤْمِنِیْنَ ، رقم: ۲۰۳۷

اور جولوگ عورتوں کو زیارتِ قبور سے منع کرتے ہیں ان کا استدلال اس روایت سے ہے کہ:

«لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ زَائِرَاتِ الْقُبُوْرِ.» ❶

''یعنی رسول اللہ ﷺ نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت کی ہے۔'' اور بعض الفاظ میں یہ ہے کہ آپ ﷺ نے کثرت سے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت کی ہے۔ ❷

علامہ ملاعلی قاری حنفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ممکن ہے مراد اس سے وہ عورتیں ہوں جو کثرت سے زیارت قبور کرتی ہیں۔'' اور علامہ قرطبی فرماتے ہیں: ''بعض اہل علم نے ترمذی کی روایات میں واردلعنت کو کثرت زیارت پر محمول کیا ہے کیونکہ زوارات مبالغہ کا صیغہ ہے۔'' ❸

نیز امام موصوف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اگر عورت قبرستان میں زیادہ نہ جائے، نوحہ نہ کرے، مرد کے حقوق ضائع نہ کرے تو اس کو جانا جائز ہے۔ ورنہ نہیں، رسول اللہ ﷺ نے جو زیارت کرنے والی عورتوں کو لعنت کی ہے یہ رخصت سے پہلے تھی، جب رخصت ہوئی تو عورتوں مردوں سب کو ہوگئی اور عورتوں کے لیے جو زیادہ مکروہ ہے وہ صرف بے قراری اور بے صبری کی وجہ سے ہے۔''

اور علامہ شوکانی نے اس کو اعتماد کے قابل و لائق بتایا ہے۔ بلاشبہ مختلف احادیث کو تطبیق دینے کی یہ ایک بہترین صورت ہے۔ (واللہ اعلم)

خواتین کے لیے زیارتِ قبور کا حکم

سوال: آپ نے ''الاعتصام'' جلد ۴۸ شمارہ ۴۲ میں عورتوں کے قبرستان جانے کے جواز کا فتویٰ دیا ہے جب کہ مشکوٰۃ کی ایک روایت میں رسول اللہ ﷺ نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے۔ کجا لعنت اور کجا جواز۔ براہِ مہربانی مذکورہ روایت اور آپ کی بیان کردہ بخاری و مسلم کی روایات میں تطبیق فرمائیے؟

(عبدالوحید۔راولپنڈی) (۲۰ دسمبر ۱۹۹۶ء)

جواب: سوال میں مشارٌ الیہ روایت کے اہل علم نے کئی ایک جوابات دیے ہیں۔ اس روایت کی سند میں ابوصالح مولی ام ہانی ضعیف مدلس راوی ہے لیکن صاحب المرعاۃ نے (۱/۴۸۶) میں اس علت کا جواب دینے کی سعی فرمائی ہے جب

❶ سنن ابی داؤد، بَابٌ فِي زِيَارَةِ النِّسَاءِ الْقُبُورَ، رقم:۳۲۳۶، سنن النسائی، التَّغْلِيظُ فِي اتِّخَاذِ......الخ، رقم:۲۰۴۳

❷ مسند الطیالسی:۱/ ۱۷۱، سنن ابن ماجہ، ابواب الجنائز، باب ما جاء فی النھی عن زیارۃ النساء القبور، رقم: ۱۲۸۱، المشکاۃ، رقم:۱۷۷۰

❸ المرعاۃ:۲/ ۲۵۲

کہ اس حدیث کے بعض دیگر طرق قابلِ اعتماد بھی ہیں۔ بہرصورت روایتِ ہذا کی صلاحیت کے باوجود قائلین جواز نے اس کے مختلف جوابات دیے ہیں۔ ممانعت پہلے تھی بعد میں حدیث کے عموم فَـزُوْرُوْهَـا کی بناء پر مرد و زن سب کو اجازت مل گئی یا ممانعت صرف ان عورتوں کے لیے ہے جو وہاں جا کر جزع و فزع کا اظہار کریں۔

اس حدیث کے بعض طرق میں لفظ زَوَّارَاتِ الْقُبُوْرِ بھی وارد ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ عورتوں کے لیے قبروں کی زیارتِ کثرت ممنوع ہے۔ وقتاً فوقتاً جائز ہے جس طرح کہ صحیح روایات میں جواز کی تصریح موجود ہے۔ مسئلہ ہذا کی تفصیل ''الاعتصام'' میں عرصہ قبل شائع ہو چکی ہے۔

کیا عورت قبرستان میں جا سکتی ہے؟

سوال: کیا عورت قبرستان میں جا سکتی ہے؟

جواب: عورت قبرستان جا سکتی ہے۔ بشرطیکہ جزع و فزع کا اظہار نہ کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک عورت کو قبر کے پاس بیٹھی دیکھا کہ رو رہی تھی، فرمایا:

«اِتَّقِی اللّٰهَ وَاصْبِرِیْ» [1] ''اللہ سے ڈر اور صبر کر۔''

زیارتِ قبور کے شرعی احکامات کیا ہیں؟ کیا والدین کی قبروں کی زیارت کرنی چاہیے یا نہیں؟

سوال: قبور پر جانے کے متعلق جو احکاماتِ شرعی ہیں وہ کیا ہیں کیا کبھی اپنے والدین کی قبور پر جانا چاہیے کہ نہیں اگر جانا چاہیے تو کیا کرنا چاہیے؟

عام قبرستان سے گزرتے ہوئے کیا کرنا چاہیے؟ میرے علم کے مطابق عورتوں کا قبور پر جانا منع ہے اہل بدعت یہ تاویل کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اپنے خاوند اور اپنے والد کے روضۂ مبارک پر جاتی تھیں اس مسئلہ کے متعلق ارشاد فرمائیں۔ (خادم، قمر آصف شاہ) (۱۹ مارچ ۱۹۹۳ء)

جواب: قبروں کی زیارت کرنا مشروع ہے۔ اس سے آخرت یاد آتی ہے اور دنیا سے بے رغبتی پیدا ہوتی ہے۔ بعض روایات میں موجود ہے کہ میں نے تمھیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا مگر اب زیارت کرو کیونکہ اس سے موت یاد آتی ہے اور باعث عبرت بھی ہے۔ [2]

شریعت میں مسلمانوں کی قبروں کی زیارت کا چونکہ عمومی اِذن موجود ہے اس میں والدین بھی شامل ہیں لہٰذا ان کی قبروں پر جا کر بھی دعاءِ رحمت و استغفار ہونی چاہیے بشرطیکہ وہ اہل توحید ہوں ورنہ نہیں۔ نیز راجح مسلک کے مطابق

---

[1] صحیح البخاری، بَابُ قَوْلِ الرَّجُلِ لِلْمَرْأَةِ عِنْدَ الْقَبْرِ: اصْبِرِی، رقم:۱۲۵۲، صحیح مسلم، رقم:۹۲۶

[2] سنن ابن ماجه، بَابُ مَا جَاءَ فِی زِيَارَةِ قُبُورِ الْمُشْرِكِينَ، رقم:۱۵۷۲

عورتوں کو بھی زیارتِ قبور کی اجازت ہے بشرطیکہ وہاں جزع وفزع کا اظہار نہ کریں۔ چند روایات ملاحظہ فرمائیں:

ا۔ نبی ﷺ کا گزر ایک عورت کے پاس ہوا جو قبر پر بیٹھی رو رہی تھی تو آپ نے فرمایا:

«اِتَّقِي اللّٰهَ وَاصْبِرِيْ»[1] ''اللہ سے ڈر اور صبر اختیار کر۔''

وجہ استدلال یہ ہے کہ آپ ﷺ کا اس عورت کو قبر پر بیٹھنے سے نہ روکنا جواز کی دلیل ہے۔ (بخاری ومسلم)

۲۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی جب میں قبرستان جاؤں تو کیا دعا پڑھوں، فرمایا پڑھ:

« اَلسَّلَامُ عَلٰی اَهْلِ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ وَ يَرْحَمُ اللّٰهُ الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنَّا وَالْمُسْتَأْخِرِيْنَ وَ اِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَلَاحِقُوْنَ»[2]

۳۔ عبداللہ بن ابی ملیکہ فرماتے ہیں ایک روز حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی آمد قبرستان کی طرف ہوئی، میں نے دریافت کیا کہاں سے آئی ہو، کہا میں اپنے بھائی عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کی قبر سے آئی ہوں، کہا کیا رسول اللہ ﷺ نے قبروں کی زیارت سے منع نہیں فرمایا۔ کہا پہلے کیا تھا۔ بعد میں اجازت دے دی تھی۔ ''حاکم'' نے روایت ہذا پر سکوت کیا ہے اور ذہبی نے اس کو صحیح کہا ہے۔ اور حافظ عراقی نے اس کی سند کو جید کہا ہے۔[3]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے خاوند رسولِ اکرم ﷺ اور والد گرامی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان کے گھر ہی میں مدفون ہیں جو ہر وقت کا مشاہدہ تھا۔ آمدورفت کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مسئلہ ہذا پر الاعتصام میں تفصیلی گفتگو پہلے بھی شائع ہو چکی ہے۔

کیا آپ ﷺ کی بیویوں یا بیٹیوں میں سے کوئی قبر مبارک پر جا کر رویا کرتی تھیں؟

سوال: آپ ﷺ کی وفات کے بعد آپ ﷺ کی قبر پر جا کر آپ ﷺ کی بیویوں میں یا بیٹیوں میں سے کوئی روتی رہی ہیں یا نہیں؟ (ابواسامہ اظہر ریاض) (۲۶ جون ۱۹۹۸ء)

جواب: آپ ﷺ کی قبر مبارک پر اہل بیت میں سے کسی کا رونا ثابت نہیں۔

حائضہ عورت کا قبرستان جانا

سوال: کیا حائضہ عورت قبرستان جاسکتی ہے؟ برائے مہربانی مفصل جواب دیں۔

(ایک سائلہ۔اوکاڑہ) (٦ جولائی ٢٠٠١ء)

---

[1] صحیح البخاری، بَابُ قَوْلِ الرَّجُلِ لِلْمَرْأَةِ عِنْدَ القَبْرِ: اصْبِرِي، رقم:١٢٥٢، صحیح مسلم، رقم:٩٢٦

[2] صحیح مسلم، بَابُ مَا يُقَالُ عِنْدَ دُخُولِ الْقُبُورِ وَالدُّعَاءِ لِأَهْلِهَا، رقم: ٩٧٤، سنن النسائی، الْأَمْرُ بِالِاسْتِغْفَارِ لِلْمُؤْمِنِينَ، رقم: ٢٠٣٧

[3] تخریج احیاء علوم الدین، ج:٤، ص:٥٢١

جواب: اصلاً عورت کے قبرستان جانے کی اجازت کے متعلق اہل علم کا اختلاف ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اس کی اجازت ہے۔ بشرطیکہ وہاں جزع فزع کا اظہار نہ کرے اور کثرت سے نہ جائے۔

صحیح بخاری وغیرہ میں حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا گزر ایک ایسی عورت کے پاس سے ہوا جو قبر پر بیٹھی رو رہی تھی۔ آپ ﷺ نے اسے اللہ سے ڈرنے اور صبر کرنے کی تلقین کی۔ ❶

اگر عورت کے لیے یہاں آنا ناجائز ہوتا تو آپ ﷺ اس کو روک دیتے۔ نہ روکنا جواز ہی کی دلیل ہے۔

نیز ''صحیح مسلم'' میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ جب قبرستان میں جاؤں تو کون سی دعاء پڑھوں؟ تو آپ ﷺ نے دعا کی تعلیم دی۔ ❷ اس میں بھی جانے کے جواز کی دلیل ہے، حائضہ اور طاہرہ کا کوئی فرق نہیں۔

کیا قبروں والے «اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ ...... الخ» سنتے ہیں؟

سوال: کیا قبروں والے سنتے ہیں؟ اگر نہیں سنتے اور جواب نہیں دیتے تو ہم ''اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا اَهْلَ الْقُبُوْرِ'' کیوں کہتے ہیں؟ ''علیکم'' اور ''یا'' کیوں استعمال کرتے ہیں؟ (سائل) (۱۲ اپریل ۲۰۰۲ء)

جواب: واضح ہو کہ خطاب کی کئی صورتیں ہوتی ہیں:

کبھی پاس موجود شخص کو اشارۃً مسئلہ بتلانا مقصود ہوتا ہے جیسے حضرت عائشہ نے اپنے فوت شدہ بھائی کو خطاب کر کے کہا کہ ''میں تمھارے پاس ہوتی تو تم وہیں دفن ہوتے اور میں تمہاری زیارت کو نہ آتی۔'' اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حجر اسود سے خطاب کرنا بھی اسی قسم سے ہے۔ کبھی توکل کا اظہار مقصود ہوتا ہے جیسے چاند اور زمین کی دعائیں ہیں۔

کبھی حکایت (بیان) کی حالت کو قائم رکھنے کے لیے خطاب کرتے ہیں۔ جیسے ''التحیات'' میں حکایت کے طور پر اور معراج کی یادگار کو قائم رکھنے کے لیے السَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ کہتے ہیں۔

مردوں کو مخاطب کر کے قبرستان میں سلام کہنا بھی اسی قسم سے ہے کیونکہ قبرستان دیکھنے سے ان کی زندگی کے دن یاد آجاتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ سامنے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا اپنے بھائی کو مخاطب کرنا اس قسم سے بھی ہو سکتا ہے اسی طرح جب میت سامنے ہو جیسے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا تھا:

«بِأَبِی أَنْتَ يَا نَبِیَّ اللّٰهِ، لَا يَجْمَعُ اللّٰهُ عَلَيْكَ مَوْتَتَيْنِ.» ❸

---

❶ صحيح البخاری، بَابُ قَوْلِ الرَّجُلِ لِلْمَرْأَةِ عِنْدَ الْقَبْرِ: اصْبِرِی، رقم:۱۲۵۲
❷ صحيح مسلم(۷/ ٤٤)، بَابُ مَا يُقَالُ عِنْدَ دُخُولِ الْقُبُورِ وَالدُّعَاءِ لِأَهْلِهَا، رقم: ۹۷٤
❸ صحيح البخاری، بَابُ مَرَضِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَوَفَاتِهِ، رقم:٤٤٥۲

''میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، اے اللہ کے نبی! اللہ آپ پر دو موتیں جمع نہیں کرے گا۔''

اس سے حضرت عمر وغیرہ کی تردید کرنا مقصود تھا جن کا خیال تھا کہ رسول اللہ ﷺ اگر فوت ہو بھی گئے ہوں تو پھر زندہ ہو کر فتوحات کریں گے۔

کبھی مشرکوں کے اعتقاد کے لحاظ سے اس چیز کو عاقل کے قائم مقام قرار دے کر خطاب کرتے ہیں، جس سے مقصود توحید کا اظہار اور اثبات ہوتا ہے۔ جیسے چاند وغیرہ کے خطاب میں ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حجر اسود سے خطاب کرنا بھی ممکن ہے، اس قسم میں داخل ہو۔ ❶

مسئلہ ہذا کی تحقیق کے لیے ملاحظہ ہو، کتاب ''سماع موتی'' لشیخنا محدث روپڑی رحمہ اللہ۔

کیا قبروں والے «اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا اَهْلَ الْقُبُوْرِ......» سنتے ہیں؟

سوال: کیا قبروں والے «اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا اَهْلَ الْقُبُوْرِ......» سنتے ہیں اور جواب دیتے ہیں؟ اگر نہیں سنتے تو «عَلَيْكُمْ» اور «يَا اَهْلَ ......» کا کیا مطلب ہوگا؟ اور حدیث میں ہے کہ مدفون اپنے دفنانے والوں کے قدموں کی آواز سنتا ہے۔ اس کا کیا مفہوم ہے؟ (ظفر اقبال۔ وزیر آباد) (۵ جولائی ۲۰۰۲ء)

جواب: اہل قبور کو سلام کہنا ایک شرعی حکم ہے جس کی تعمیل ضروری ہے۔ یہ ایک اصولی مسئلہ ہے کہ جو بات خلافِ قیاس ہو وہ اپنے مورد میں ہی بند رہتی ہے۔ یعنی جس موقع و محل کے لیے وارد ہوئی ہے اس کے سوا دوسرے موقع و محل میں جاری نہیں کی جائے گی۔ مثلاً نبی ﷺ کے ہاتھ پر کوئی معجزہ ظاہر ہو تو اس سے یہ نہیں نکلتا کہ اب نبی کو کلی اختیار ہے، جس وقت چاہے کوئی بات ظاہر کر لے بلکہ جس وقت جو بات اللہ نے نبی کے ہاتھ پر اس قسم کی ظاہر کی وہ اسی محل میں سمجھی جائے گی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جو شخص گہری نیند سو جائے وہ نہیں سنتا حالانکہ اس میں روح موجود ہوتی ہے۔ تو پھر مردہ کس طرح سن سکتا ہے؟ اگر مان لیا جائے کہ روح کو بدن کے ساتھ کچھ تعلق رہتا ہے تو بھی مردے کا سماع خلافِ قیاس ہے جس طرح کہ سوال میں مذکور حدیث میں ہے۔ اس حدیث پر عام قیاس کرنا ممنوع ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خطاب کی کئی صورتیں اور وجوہ ہوتی ہیں۔ کبھی تو خطاب کر کے پاس والے کو اشارۃً مسئلہ بتلانا مقصود ہوتا ہے۔ جیسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے متوفی بھائی کو مخاطب کر کے کہا کہ میں تمہارے پاس ہوتی تو تم وہیں دفن ہوتے اور میں تمہاری زیارت کو نہ آتی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حجر اسود کو خطاب کرنا بھی اسی قسم سے ہے۔ ❷

کبھی توکل کا اظہار مقصود ہوتا ہے جیسے چاند اور زمین کی دعائیں ہیں۔ کبھی حکایت کی حالت کی یادگار قائم رکھنے

---

❶ صحيح مسلم، كتاب الحج، باب استحباب تقبيل الحجر الاسود فى الطواف:٣٠٦٧

❷ أيضًا

کے لیے خطاب کرتے ہیں۔ مردے کو مخاطب کرکے قبرستان میں سلام کہنا اسی قسم سے ہے کیونکہ قبرستان کے دیکھنے سے ان کی زندگی کے دن یاد آجاتے ہیں۔ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ سامنے ہیں۔ (ملخص از سماع موتی، لشیخنا محدث روپڑی)

(سماعِ موتی کے مسائل)

کیا مردے سلام سنتے اور جواب دیتے ہیں؟

سوال : جب مُردوں کو سلام کہا جائے تو کیا وہ سنتے ہیں، اگر سنتے ہیں تو جواب دیتے ہیں یا نہیں؟

(محمد اسماعیل عابد، موضع ڈاہر تحصیل دیپالپور ضلع اوکاڑا) (۲۵ ستمبر ۱۹۹۲ء)

جواب : کسی صحیح حدیث میں بوقتِ سلام، اموات کے سماع اور پھر جواب دینے کی تصریح موجود نہیں ہے بلکہ قرآنِ مجید میں نفی مصرح ہے۔

﴿وَ مَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ﴾ (الفاطر:۲۲)

''اور تم ان کو جو قبروں میں مدفون ہیں نہیں سنا سکتے۔''

دوسری جگہ ہے:

﴿لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى﴾ (النمل:۸۰)

''کچھ شک نہیں کہ تم مردوں کو (بات) نہیں سنا سکتے۔''

نیز فرمایا:

﴿وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ﴾ (الاحقاف:۵)

''اور اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہوسکتا ہے جو اللہ کے سوا ایسے کو پکارے جو قیامت تک اسے جواب نہ دے سکے۔''

اگر کوئی کہے دعائیہ کلمات میں صیغۂ تخاطب ونداء کا تقاضا ہے کہ مُردوں کو سماعت حاصل ہو، سو اس اشکال کا جواب یوں ہے کہ عربی زبان کا اسلوب ہے کہ مَا لَا يَعْقِلُ سے بسا اوقات معاملہ ذوی العقول جیسا کیا جاتا ہے جس طرح کہ ھلالی دعاء میں ہے:

« يَا هِلَالُ رَبِّيْ وَ رَبُّكَ اللّٰهُ »

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حجرِ اسود سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا:

« اِنِّی لَاَعْلَمُ اَنَّكَ حَجَرٌ »[1]

اسی طرح یہاں بھی سمجھ لیں۔ فقہاء حنفیہ نے بے شمار نصوص میں مردوں کے عدم سماع کی تصریح کی ہے۔ بطورِ امثلہ چند ایک نمونے ملاحظہ فرمائیں۔ علامہ ابن الہمام ''فتح القدیر'' کتاب الجنائز میں فرماتے ہیں:

« هُنَا عِنْدَ أَكْثَرِ مَشَايِخِنَا هُوَ أَنَّ الْمَيِّتَ لَا يَسْمَعُ عِنْدَهُمْ عَلَى مَا صَرَّحُوا بِهِ فِي كِتَابِ الْأَيْمَانِ فِي بَابِ الْيَمِينِ بِالضَّرْبِ .لَوْ حَلَفَ لَا يُكَلِّمُهُ فَكَلَّمَهُ مَيِّتًا لَا يَحْنَثُ ؛ لِأَنَّهَا تَنْعَقِدُ عَلَى مَا يُفْهَمُ، وَالْمَيِّتُ لَيْسَ كَذٰلِكَ لِعَدَمِ السَّمَاعِ .
(قَوْلُهُ وَكَذَا الْكَلَامُ) يَعْنِي إِذَا حَلَفَ لَا يُكَلِّمُهُ اقْتَصَرَ عَلَى الْحَيَاةِ، فَلَوْ كَلَّمَهُ بَعْدَ مَوْتِهِ لَا يَحْنَثُ لِأَنَّ الْمَقْصُودَ مِنْهُ الْإِفْهَامُ وَالْمَوْتُ يُنَافِيهِ؛ لِأَنَّهُ لَا يَسْمَعُ فَلَا يَفْهَمُ . انتهى

اور ''فصول فی علم الاصول'' میں ہے:

« لَوْ حَلَفَ لَا يُكَلِّمُ فُلَانًا وَ كَلَّمَهُ بَعْدَ الْمَوْتِ اَوْضَرَبَهُ بَعْدَ الْمَوْتِ لَا يَحْنثُ لِعَدَمِ مَعْنَى الْاِفْهَامِ وَالْاِيْلَامِ »

اور اصول الشاشی میں ہے:

« مَنْ حَلَفَ لَا يُكَلِّمُ فُلَانًا فَكَلَّمَهُ بَعْدَ الْمَوْتِ لَا يَحْنث لِعَدَمِ الْاِسْمَاعِ »

اور تفسیر ''جامع البیان'' میں زیر آیت ﴿وَ الْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ﴾ ہے:

« اَیِ الْكُفَّارِ الَّذِيْنَ كَالْمَوْتٰى لَا يَسْمَعُوْنَ »

اور تفسیر ''جلالین'' میں ہے:

« اَیِ الْكُفَّارِ شَبَّهَهُمْ بِهِمْ فِیْ عَدَمِ السِّمَاعِ»

اور بدر کے مقتولین سے نبی ﷺ نے جو خطاب فرمایا تھا اس کا جواب بعض حنفیہ نے یوں دیا ہے:

« وَ لَئِنْ ثَبَتَ فَهُوَ مُخْتَصٌّ بِالنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَ يَجُوْزُ اَنْ يَّكُوْنَ ذٰلِكَ لِوَعْظِ الْاَحْيَاءِ لَا عَلٰى سَبِيْلِ الْخِطَابِ لِلْمَوْتٰى »

''یعنی اگر یہ قصہ ثابت ہوجائے تو نبی ﷺ کے ساتھ مخصوص ہوگا اور یہ بھی جائز ہے کہ مقصود اس سے زندہ لوگوں کو وعظ ونصیحت کرنا ہو مردوں کے لیے خطاب نہیں۔'' (فتاویٰ حدیث، ج:۵،ص:۴۴۴)

[1] صحیح مسلم، کتاب الحج، باب استحباب تقبیل الحجر الاسود فی الطواف:۳۰۶۷

کیا مردے سلام سنتے اور جواب دیتے ہیں؟

سوال: قبرستان جا کر «اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ» پکارنا جب کہ مردے بھی نہیں سنتے ، جائز ہے؟

(سید محمد بشیر، قاسم پور تحصیل وضلع فیصل آباد) (۱۳ نومبر ۱۹۹۲ء)

جواب: قبرستان میں جا کر سلام کہنا صرف شرعی حکم کی تعمیل ہے۔ مردوں کے سننے کی کسی صحیح حدیث میں تصریح موجود نہیں ہے۔

سماع موتی کی حقیقت کیا ہے

سوال: بعض حضرات کہتے ہیں کہ مردے سنتے ہیں اور ہر طرح کا ثواب اُن کو پہنچتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ یہ واقعہ سناتے ہیں کہ نبی ﷺ نے غزوۂ بدر کے بعد ابوجہل کی لاش کنویں میں پھینکوا کر باہر کھڑے ہو کر درس دیا کہ تم اگر اسلام کی مخالفت نہ کرتے تو شاید تمہارا یہ انجام نہ ہوتا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے تعجب کیا کہ پیارے آقا کیا یہ آپ کی بات سن رہا ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ بے شک یہ تم سے زیادہ سن رہا ہے۔ کیا یہ واقعہ درست ہے یا من گھڑت؟ تفصیل سے اس سوال کا جواب دیں۔ (سائل) (۲۴ اپریل ۲۰۰۹ء)

جواب: سماع موتی کا مشار الیہ قصہ ''صحیح بخاری'' مع فتح الباری (۷/ ۳۰۱) میں ہے لیکن یہ سماع خرق عادت تھا عام حالات میں مردے نہیں سنتے کیوں کہ مردہ بے جان کو کہتے ہیں اور بے جان میں سننے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ قرآنِ مجید میں ہے: ﴿ اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی﴾ آپ مردوں کو نہیں سنا سکتے۔

علامہ ابن ہمام حنفی لکھتے ہیں:

« ھٰذَا عِنْدَ اَکْثَرِ مَشَائِخِنَا وَ ھُوَ اَنَّ الْمَیِّتَ لَا یَسْمَعُ عِنْدَھُمْ .» (فتح القدیر، کتاب الجنائز)

''یعنی ہمارے اکثر مشائخ کا یہی موقف ہے کہ میت نہیں سنتی۔''

اور ''کافی شرح وافی'' باب ''بیان احکام الیمین'' میں ہے:

« وَالْمَقْصُوْدُ مِنَ الْکَلَامِ الْاِفْھَامُ وَ ذَا بِالْاِسْتِمَاعِ وَ ذَا لَا یَتَحَقَّقُ بَعْدَ الْمَوْتِ.»

''یعنی مقصود کلام سے اپنا مافی الضمیر بتلانا سمجھانا ہے اور یہ سننے سے ہی ہوتا ہے جب کہ مرنے کے بعد سننا نہ ثابت اور نہ ممکن۔''

موت کے بعد میت کے لیے دعا اور صدقہ یقیناً مفید ہے لیکن دعا اور صدقہ کے لیے شرعاً کوئی وقت مقرر نہیں۔

ہمارے شیخ محدث روپڑی رحمہ اللہ کی کتاب ''سماع موتی'' اس موضوع پر انتہائی مفید ہے۔

کیا مردے سنتے ہیں؟ سماع موتیٰ کا عقیدہ رکھنا کیا حکم رکھتا ہے؟

سوال : کیا یہ بات درست ہے کہ کبار فقہائے حنابلہ اور حنابلہ کے جمہور علماء کے نزدیک مردہ اپنی قبر کے اردگرد کی آوازیں اسی طرح سن لیتا ہے جس طرح اپنی زندگی میں سن لیتا تھا؟ (ماسٹر ظفر عالم) (۲۵ نومبر ۲۰۰۵ء)

جواب : یہ بات درست نہیں، سعودی عرب کی اللجنة الدائمة کے فتاویٰ میں ہے:

« اَلْأَصْلُ عَدَمُ سِمَاعِ الْأَمْوَاتِ إِلَّا مَا وَرَدَ فِيْهِ النَّصُّ لِقَوْلِ اللّٰهِ سُبْحَانَهٗ يُخَاطِبُ نَبِيَّهٗ صلى الله عليه وسلم ﴿ فَإِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى ﴾ الآية (سورة الروم:٥٢)، و قوله سبحانه ﴿ وَ مَا أَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴾ (سورة فاطر:٢٢) [1]

یعنی اصل یہ ہے کہ مردے نہیں سنتے ماسوائے اس مقام کے جہاں نص وارد ہے۔ اللہ سبحانہ نے اپنے نبی ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا ہے: ''تو مردوں کو نہیں سنا سکتا۔'' نیز فرمایا: تو قبروں والوں کو نہیں سنا سکتا۔''

گاڑی میں سوار مسافر کا قبرستان پر نظر پڑتے ہی ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا:

سوال : بعض لوگوں کو دیکھا ہے کہ جب وہ ریل گاڑی یا کار وغیرہ پر سفر کر رہے ہوتے ہیں تو جب ان کی نظر قبرستان پر پڑتی ہے تو فوراً ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا شروع کر دیتے ہیں۔ کیا اس طرح مرحومین کے لیے دعا کی جا سکتی ہے؟ (سائل محمد یحییٰ عزیز کوٹ رادھا کشن) (۱۴ اگست ۱۹۹۸ء)

جواب : میت کے لیے دعا کرنا تو ہر وقت جائز ہے چاہے ہاتھ اٹھا کر ہو یا اس کے بغیر لیکن قبرستان کو دیکھ کر بالخصوص دعا کرنا سنت سے ثابت نہیں۔

(تعزیت اور اس کے مسائل)

آدابِ تعزیت کیا ہیں؟

سوال : اگر کوئی آدمی فوت ہو جائے تو پھر جب کوئی اس کا افسوس اور تعزیت کرنے آئے تو کیا میت کے لیے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا درست ہے یا نہیں؟ (محمد یحییٰ عزیز کوٹ رادھا کشن، قصور) (۱۵ جولائی ۱۹۹۴ء)

جواب : شریعت میں مروجہ فاتحہ خوانی کا کوئی ثبوت نہیں حقہ کی مجلس بجی ہو۔ لوگ اِدھر اُدھر کی باتیں ہانک رہے ہوں۔ ہر آنے والا التماس کرتا ہے۔ پڑھو فاتحہ، منٹوں سیکنڈوں میں فارغ کر کے بلا وقفہ حقے کا دور جاری رکھا جاتا ہے۔

احادیث سے تو معلوم ہوتا ہے جس منہ سے پیاز وغیرہ کی بدبو آ رہی ہو، فرشتے قریب نہیں پھٹکتے پھر کیا خیال ہے

[1] فتاویٰ اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والافتاء :۹/ ۸۲۔

ایسی بدبودار مجلس میں رحمت کے فرشتوں کی آمد ممکن ہے۔ جواب یقیناً نفی میں ہے۔

پھر اصل اختلاف موجود مجلس کی ہیئت ترکیبی پر ہے۔ کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے کسی عزیز کی وفات پر تین دن کا جلسہ دعائیہ جما کر بیٹھا کرتے تھے۔ جب کہ بعض روایات میں اس کو نوحہ قرار دیا گیا ہے۔ جہاں تک میت کے لیے دعائے مغفرت کا تعلق ہے۔ سو یہ غیر متنازع امر ہے۔

سبھی اس بات کے قائل ہیں کہ دعاء ہونی چاہیے جس طرح کہ کئی ایک احادیث اور قرآنی آیت ﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ﴾ (الحشر: ۱۰) میں مصرح ہے اور تعزیت بھی مسنون ہے جس کے لیے جگہ اور وقت کی کوئی حد بندی نہیں۔ لیکن محل نظر صرف مروجہ طریقہ ہے جو درست نہیں۔

تعزیت کے آداب ودعاء بتائیں

سوال: تعزیت کے آداب ودعاء بتائیں۔ (عبدالغنی عاصم۔لسبیلا) (۵مئی ۲۰۰۰ء)

جواب: تعزیت کرنا سنت ہے کیونکہ اس سے پریشان حال کی دلجوئی ہوتی ہے۔ اور اس کے لیے بھلائی کی دعاء بھی ہونی چاہیے۔ اس میں کوئی فرق نہیں مرنے والا چھوٹا ہو یا بڑا اور نہ تعزیت کے لیے کوئی مخصوص الفاظ ہیں۔ بلکہ مناسب آسان جو بھی الفاظ ہوں، ان سے تعزیت ہو سکتی ہے اور نہ اس کے لیے کوئی وقت یا دن مقرر ہے۔ تعزیت کے لیے مخصوص ہیئت میں مخصوص دن بیٹھے رہنا سنت سے ثابت نہیں۔ اس سے اجتناب ضروری ہے۔ صحیح حدیث میں ہے: ''جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے۔''

کسی کی وفات پر پھول پیش کرنا کیسا ہے؟ تعزیت اور اظہارِ افسوس کے لیے کیا جائے؟

سوال: میرے خاوند کے ساتھ ترکی کا ایک عالم آدمی کام کرتا ہے۔ آج صبح وہ کام پر نہ آیا، اور اس نے ہمیں اطلاع دی کہ اس کا بڑا بیٹا فوت ہو گیا ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ اس کا بیٹا وفات پا گیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اسے کچھ پھول وغیرہ بھیجیں۔ لیکن ہمیں معلوم نہیں کہ اس حالت میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ کیونکہ اسلام کے بارے میں ہماری معلومات محدود ہیں۔ اس موقع پر اس سے اور اس کے گھر والوں سے تعزیت اور اظہارِ افسوس کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ (مغربی مسلمانوں کے روزمرہ مسائل)

جواب: سب سے پہلے تو میں آپ کے نیک جذبات پر آپ کی تحسین کرنا چاہتا ہوں۔ آپ اس سے فون پر رابطہ کر سکتے ہیں اور اسے اچھے الفاظ کے ساتھ تسلی تشفی دیتے ہوئے صبر کی تلقین کر سکتے ہیں۔ اور اس کے بیٹے کے لیے بخشش اور جنت کی دعا کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کی دلجوئی کے لیے کچھ رقم بھیجنے میں کوئی حرج نہیں۔ اگر وہ کسی قریبی مقام پر رہتے ہیں تو اس کے لیے اور اس کے گھر والوں کے لیے کھانا بھیج سکتے ہیں، کیونکہ مرحوم کے گھر والے جنازہ وغیرہ میں مشغول

ہونے کی وجہ سے کھانا تیار نہیں کر سکتے۔ اس لیے اسلام کا یہ طریقہ ہے کہ اس حال میں ان کے لیے کھانا تیار کیا جائے۔

تعزیت کا مسنون طریقہ کیا ہے

سوال: تعزیت کا مسنون طریقہ کیا ہے۔ مطلب یہ کہ کوئی دوست فوت ہو جائے تو دس دن بعد یا مہینہ یا سال بعد اس کے رشتہ داروں کے پاس تعزیت یا فاتحہ خوانی کے لیے جانا، جائز ہے یا نہیں؟

(علی محمد سموں حفاظ گروپ نوری آباد) (۲۹ مارچ ۱۹۹۶ء)

جواب: تعزیت سے مقصود صرف اہل میت کو تسلی دینا ہوتا ہے وہ کسی وقت بھی ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے شرع میں کوئی حد بندی نہیں ہے۔

میت کے لیے دعا یا تعزیت کی مجلس کا حکم

سوال: عام رواج پا چکا ہے کہ مرنے والے کے لیے اجتماعی دعا بار بار کی جاتی ہے جو بھی تعزیت کے لیے آتا ہے کچھ دیر بیٹھنے کے بعد کہتا ہے کہ دعا کیجیے اور تمام حاضرین ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے ہیں ایسا کرنا شرعاً جائز ہے؟ حرام ہے؟ بدعت ہے؟ وضاحت فرمادیں۔ (سائل) (۲۴ اگست ۲۰۰۱ء)

جواب: میت کے لیے دعا کرنا بلاشبہ ثابت ہے لیکن ہمارے ہاں موجودہ طریقہ کار ثابت نہیں۔ یعنی دعاء کے لیے مجلس یا تعزیت وغیرہ کے لیے مجلس قائم کرنا بھی ثابت نہیں لہٰذا اس سے اجتناب ضروری ہے۔

تین دن کے بعد تعزیت کا حکم:

سوال: فوت شدہ آدمی کے گھر تین دن کے بعد تعزیت کی خاطر جانا درست ہے یا نہیں؟ (السائل ثناء اللہ محمد سموں منگیر یہ ضلع بدین سندھ) (۱۱ ستمبر ۱۹۹۲ء)

جواب: تعزیت کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں ممکنہ حد تک قریب ترین فرصت میں اظہارِ تعزیت ہونا چاہیے۔ جس طرح کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹی کے بچے کی وفات پر بایں الفاظ تعزیت فرمائی:

« إِنَّ لِلَّهِ مَا أَخَذَ وَلَهُ مَا أَعْطَى، وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِأَجَلٍ مُسَمًّى »[1]

مزید علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« تَعْزِيَةُ أَهْلِ الْمَيِّتِ، وَلَمْ يَكُنْ مِنْ هَدْيِهِ أَنْ يَجْتَمِعَ لِلْعَزَاءِ، وَيَقْرَأَ لَهُ الْقُرْآنَ، لَا عِنْدَ قَبْرِهِ وَلَا غَيْرِهِ، وَكُلُّ هَذَا بِدْعَةٌ حَادِثَةٌ مَكْرُوهَةٌ.

وَكَانَ مِنْ هَدْيِهِ: السُّكُونُ وَالرِّضَى بِقَضَاءِ اللَّهِ، وَالْحَمْدُ لِلَّهِ، وَالِاسْتِرْجَاعُ، وَيَبْرَأُ

[1] صحيح البخاري، بَابُ قَوْلِ اللَّهِ تَبَارَكَ وَتَعَالَى: (قُلِ ادْعُوا اللَّهَ أَوِ ادْعُوا الرَّحْمَنَ ...... الخ، رقم: ۷۳۷۷

مِمَّنْ خَرَقَ لِأَجْلِ الْمُصِيبَةِ ثِيَابَهُ، أَوْ رَفَعَ صَوْتَهُ بِالنَّدْبِ وَالنِّيَاحَةِ، أَوْ حَلَقَ لَهَا شَعْرَهُ.
وَكَانَ مِنْ هَدْيِهِ ـ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ـ أَنَّ أَهْلَ الْمَيِّتِ لَا يَتَكَلَّفُونَ الطَّعَامَ لِلنَّاسِ، بَلْ أَمَرَ أَنْ يَصْنَعَ النَّاسُ لَهُمْ طَعَامًا يُرْسِلُونَهُ إِلَيْهِمْ، وَهٰذَا مِنْ أَعْظَمِ مَكَارِمِ الْأَخْلَاقِ وَالشِّيَمِ، وَالْحَمْلِ عَنْ أَهْلِ الْمَيِّتِ، فَإِنَّهُمْ فِي شُغْلٍ بِمُصَابِهِمْ عَنْ إِطْعَامِ النَّاسِ.
وَكَانَ مِنْ هَدْيِهِ ـ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ـ تَرْكُ نَعْيِ الْمَيِّتِ، بَلْ كَانَ يَنْهَى عَنْهُ وَيَقُولُ: (هُوَ مِنْ عَمَلِ الْجَاهِلِيَّةِ)، وَقَدْ كَرِهَ حذيفة أَنْ يُعْلِمَ بِهِ أَهْلُهُ النَّاسَ إِذَا مَاتَ، وَقَالَ: (أَخَافُ أَنْ يَكُونَ مِنَ النَّعْيِ). ❶

یعنی ''تعزیت کے لیے اہل میت کے ہاں جمع ہونا رسول اللہ ﷺ کا طریقہ نہیں تھا اور نہ میت کے لیے قرآن خوانی کرنا قبر کے پاس اور نہ اس کے علاوہ۔ یہ جملہ امورِ خود ساختہ بدعات مکروہ میں شامل ہیں۔ آپ ﷺ کا طریقہ کار یہ تھا کہ ایسے موقع پر خاموشی اختیار کرتے اور اللہ کی قضا وقدر کے ساتھ رضاء کا اظہار فرماتے۔ اللہ کی حمد وثنا کرتے۔ ''اِنَّا لِلّٰــــہ'' پڑھتے۔ جو آدمی مصیبت کے موقع پر کپڑے پھاڑتا یا نوحہ کرتا یا سر منڈاتا اس سے بیزاری کا اظہار کرتے اور آپ ﷺ کی سنت میں سے یہ بھی ہے کہ اہل میت لوگوں کو کھانا کھلانے کی تکلیف نہ کریں۔ بلکہ لوگ کھانا تیار کرکے ان کے پاس بھیجیں۔ یہ بات آپ کے عظیم اخلاق کی نشاندہی کرتی ہے۔ اہل میت کی پریشانی کی بنا پر لوگوں کو کھانا کھلانے کا بوجھ ان سے ہلکا کر دیا ہے۔ اور پھر آپ ﷺ کا طریقہ یہ بھی تھا کہ کسی کی موت پر واویلا اور تشہیر عام کرنے سے روکتے، فرماتے یہ جاہلیت کے امور سے ہے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے مکروہ سمجھا کہ ان کے اہل خانہ ان کی وفات کی کسی کو اطلاع کریں۔ کہا مجھے اس بات کا خوف ہے کہ کہیں یہ ''نعی'' (موت کی تشہیر) میں شمار نہ ہو۔''

کافر کی موت پر اظہارِ افسوس کا حکم؟

سوال : راجیو گاندھی کے قتل کی خبر سن کر ایک تعلیم یافتہ شخص کے منہ سے بے ساختہ ''اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ'' نکلا۔ خبر سنانے والے نے اعتراض کیا کسی غیر مسلم کی موت پر یہ قرآنی جملہ نہیں پڑھنا چاہیے۔ محلے کے خطیب سے یہ مسئلہ دریافت کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن میری تسلی نہیں ہوئی۔ کیوں کہ قرآن پاک میں جہاں یہ جملہ آیا ہے۔ اس کے سیاق وسباق میں صابروں، اور ہدایت یافتہ لوگوں کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے کہ صبر اور ہدایت یافتگی ایک مسلم ہی کا شعار ہوسکتا ہے۔ بہر حال آپ جواب دیتے وقت صرف منطقی اور قرآنی دلائل ہی نہ دیں بلکہ

❶ زاد المعاد، الجزء الاوّل، ص:١٤٦

یہ بھی فرمائیں کہ ہمارے ہادیٔ برحق اور دیگر اسلاف گرامی کی اس سلسلے میں کیا روش تھی؟

جواب: ایک کافر، مشرک کی موت پر ''اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ '' ، یا افسوس کا اظہار نہیں ہونا چاہیے تھا۔ سبقت لسانی سے خطا ہوگئی ہے۔ تو استغفر اللہ پڑھنا چاہیے۔ محلّہ کے خطیب صاحب سے سہو ہوا ہے۔ قرآن مجید نے فرعون اور اس کی قوم کی ہلاکت کے تناظر میں بیان فرمایا ہے:

﴿ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ ﴾ (الدخان:۲۹)

''پھر ان پر نہ تو آسمان اور زمین کو رونا آیا اور نہ ان کو مہلت ہی دی گئی۔''

پھر مومن کے لیے لائق ہے کہ کافر کی موت پر افسوس کا اظہار کرے۔ ہرگز نہیں۔ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا:

« قَالَ أَبُو لَهَبٍ عَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : تَبًّا لَكَ سَائِرَ الْيَوْمِ فَنَزَلَتْ: ﴿تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ﴾'

''یعنی ابولہب نے اس پر اللہ کی لعنت ہو، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا تھا: تَبًّا لَكَ سَائِرَ الْيَوْمِ ''

اس سے معلوم ہوا کافر کے فقدان پر افسوس کی بجائے اظہار ناراضی ہونا چاہیے۔ دوسری روایت میں ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی آپ کا گمراہ چچا ابو طالب مر گیا۔ فرمایا جا اسے دفن کر دے۔ کوئی نیا کام مت کرنا۔ حتی کہ تو میرے پاس آئے۔ پس میں گیا۔ اس کو دفن کر کے واپس آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے غسل کا حکم دیا اور میرے لیے دعا کی۔ ❶

اگر کافر کی موت پر اظہارِ افسوس روا ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خواہ ادنیٰ سے ادنیٰ الفاظ میں کرتے۔ یہاں ضرور کرتے کیونکہ ابوطالب نے دنیاوی زندگی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھرپور ساتھ دیا۔ ابو طالب ہی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا تھا۔

فَاصْدَعْ بِأَمْرِكَ مَا عَلَيْكَ غَضَاضَةٌ
حَتّٰى أُوَسَّدَ فِي التُّرَابِ دَفِيْنَا

یعنی جب تک قبر کی مٹی میرا تکیہ نہیں بن جاتی لوگوں تک اپنا پیغام دل کھول کر پہنچا دیجیے۔''

اس وقت کلمہ خیر کے نطق سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل خاموشی عدم جواز کی دلیل ہے۔ واللہ ولی التوفیق

کسی کی وفات پر کتنے دن سوگ کیا جا سکتا ہے؟

سوال: کسی شخص کی وفات پر شرعاً کتنے دن سوگ منایا جا سکتا ہے؟ ہمارے ہاں دیہات میں عام طور پر وفات کے

❶ سنن ابی داؤد، بَابُ الرَّجُلِ يَمُوتُ لَهُ قَرَابَةٌ مُشْرِكٌ ، رقم:۳۲۱٤

تیسرے دن ظہر کی نماز کے بعد دعا کی جاتی ہے، اس میں دیگر اقرباء واعزہ کی شرکت لازمی ہوتی ہے۔ بعد از خصوصی دعا سوگ ختم کر دیا جاتا ہے۔ کیا ایسی دعا جو خاص طور پر ہو، تیسرے دن ہو، ظہر کی نماز کے بعد ہو، اس میں شرکتِ اقرباء لازمی ہو، کا تعین قرآن وسنت سے ثابت ہے؟ (سائل محمد بلال، محمد عیسیٰ کمبوہ) (۲۸ ستمبر ۲۰۰۱ء)

جواب: سوگ کا تعلق صرف عورتوں سے ہے جس عورت کا شوہر فوت ہو جائے اس کی عدت چار ماہ دس دن ہے اور باقی اعزہ واقارب کا سوگ صرف تین دن ہے لیکن مردوں کے لیے ترکِ زینت کی کوئی پابندی نہیں اظہارِ افسوس اور تعزیت کے لیے بھی کوئی وقت مقرر نہیں کسی وقت بھی ہو سکتی ہے۔ تین دن کے لیے اہل میت کے ہاں جمع ہو کر بیٹھے رہنے کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں، بلکہ حضرت جریر بن عبداللہ فرماتے ہیں، اہل میت کے ہاں اجتماع کو ہم بین (نوحہ) شمار کرتے تھے (جو شرعاً ممنوع ہے) میت کے لیے دعا کسی جگہ اور کسی وقت بھی ہو سکتی ہے اس کے لیے کوئی تعین نہیں۔ سوال میں جن امور کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یہ سب رسومات ہیں ہر صورت اس سے اجتناب ضروری ہے۔

سوگ اور ماتم مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے ہے یا صرف عورتوں کے لیے؟

سوال: سوگ کے بارے میں حافظ عبدالمنان نور پوری صاحب (حفظہ اللہ) نے اپنی کتاب ''احکام ومسائل'' کے صفحہ ۲۶۸۔۲۷۰ پر لکھا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ (از راقم) ''سوگ عورتوں کے لیے ہے (مردوں کے لیے نہیں)'' یعنی میت کی ورثاء عورتیں (عام عورتیں) میت پر تین دن تک سوگ کر سکتی ہیں جب کہ بیوی اپنے خاوند کی وفات پر عدت کی تکمیل تک سوگ اور ماتم کرے۔ تو سوال یہ ہے کہ کیا واقعی سوگ صرف عورتوں کے لیے ہے۔ مردوں کے لیے (ورثاء میت کے لیے) تین دن تک یہ نہیں ہے؟ (سائل) (۵/ستمبر ۲۰۰۳ء)

جواب: حقیقت یہی ہے کہ سوگ کا تعلق میت کی قریبی عورتوں سے ہے، مردوں کے لیے سوگ نہیں۔ مثلاً بیوی کی وفات کے فوری بعد شوہر نکاح جدید کرنا چاہے تو کر سکتا ہے، اس میں کوئی شرعی ممانعت نہیں۔ محترم حافظ صاحب (حفظہ اللہ) نے بالکل درست لکھا ہے۔

فوت شدہ کی تعزیت اور طریقہ دعا

سوال: کسی بھی آدمی کے فوت ہو جانے پر تین دن تک افسوس کے لیے بیٹھا جاتا ہے اگر کوئی آدمی وہاں آ کر دعا مانگنے کو کہتا ہے اور ہاتھ اٹھا کر جو دعا مانگی جاتی ہے اس بارے میں رسولِ اکرم ﷺ کا طریقہ کار بتائیں۔ کیا ہاتھ اٹھا کر دعا جائز ہے یا نہیں؟ (محمد زبیر بھٹی جھبراں) (۱۳ مارچ ۱۹۹۲ء)

جواب: فوت شدہ آدمی کی پس ماندگان سے تعزیت کرنا مسنون ومستحب ہے لیکن اس امر کے لیے حُقہ لگا کر بیٹھے رہنے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ بلکہ حدیث جریر بن عبداللہ میں اہل میت کے ہاں اجتماع کو نوحہ قرار دیا گیا ہے:

«كُنَّا نَعُدُّ الِاجْتِمَاعَ إِلَى أَهْلِ الْمَيِّتِ وَصَنِيعَةَ الطَّعَامِ بَعْدَ دَفْنِهِ مِنَ النِّيَاحَةِ» [1]

علامہ شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث جریر: اَخْرَجَهُ اَيْضًا ابْنُ مَاجَه وَ اِسْنَادُهُ صَحِيْحٌ ۔ [2]

بسلسلۂ دعاء مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

''موت کے بعد میت کے لیے دعا اور صدقہ یقیناً مفید ہیں۔ جنازہ خود میت کے لیے دعاء ہے لیکن صدقہ اور دعا کے لیے کسی وقت کا تعین شرعاً ثابت نہیں۔ موت کے بعد میت کے گھر بیٹھ کر عموماً دعاؤں کا تانتا بندھ جاتا ہے۔ ہر آنے والا دعا کے لیے اس انداز سے درخواست کرتا ہے گویا وہ اپنی حاضری نوٹ کرا رہا ہے۔ ایک سیکنڈ میں دعا ختم ہو جاتی ہے۔ اور حقہ اور گپوں کا دَور شروع ہو جاتا ہے۔ اور دعا کے وقت بھی دل حاضر نہیں ہوتا۔ حالانکہ دل کی توجہ دعاء کے لیے ازبس ضروری ہے۔

« أَنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَجِيبُ دُعَاءً مِنْ قَلْبٍ غَافِلٍ لَاهٍ.» [3]

''اللہ تعالیٰ غافل دل کی دعا قبول نہیں کرتا۔'' میت کے لیے دعاء ہر وقت بلاتخصیص کی جا سکتی ہے۔ اور زندوں کی طرف سے یہی بہترین صلہ ہے جو میت کو دیا جاتا ہے۔ بشرطیکہ سنت کے مطابق ہو۔ تعزیت کا مطلب گھر والوں کی تسکین ہے۔ دعا اگر مجلس کی بجائے انفراداً کی جائے تو دعا کا مقصود پورا ہو سکتا ہے۔ غرض یہ تین دن کا جلسۂ دعائیہ سنت سے ثابت نہیں۔ ان مجالس میں حقہ اور بھی ان کے مقصد کو برباد کر دیتا ہے۔

(الاعتصام گوجرانوالہ، ۲۸ دسمبر ۱۹۵۱ء)

مردے کے لیے باوضو دعا کرنا کیا بدعت ہے؟

سوال: ہمارے ہاں ایک مولوی صاحب کی والدہ وفات پا گئیں۔ وہ مسجد میں نماز ادا کرنے آئے۔ نماز کے بعد چند نمازیوں نے مولوی صاحب سے پوچھ کر مغفرت کی دعا کی۔ بعض لوگوں نے اعتراض کیا کہ یہ بدعت ہے۔ جواب دیں کہ ایسا کرنا منع ہے۔ مردے کے لیے باوضوء چند حضرات دعا کریں تو کیا گناہ ہے؟

(محمد یحییٰ عزیز کوٹ رادھا کشن قصور) (۶ دسمبر ۱۹۹۶ء)

جواب: میت کے لیے باوضوء دعا کرنا رسول اللہ ﷺ کے عمل سے ثابت ہے۔ [4]

[1] مسند احمد، رقم:٦٩٠٥

[2] نیل الاوطار، ج:٤، ص:١٠٤

[3] سنن الترمذی، رقم:٣٤٧٩

[4] صحیح البخاری، باب غزاة اوس، رقم:٤٣٢٣

میت کو ایصالِ ثواب کے مشروع اور غیر مشروع طریقے

میت کے گھر میں عورتوں کے لیے درسِ قرآن کا اہتمام کرنا

سوال: ہمارے یہاں ایک نئی رسم چل نکلی ہے کہ کسی آدمی یا عورت کا انتقال ہوتا ہے تو دوسرے دن اس گھر عورتوں کا درسِ قرآن ہوتا ہے اور قرآن بھی پڑھا جاتا ہے۔ کیا یہ از روئے کتاب وسنت صحیح ہے؟

(سائل عبدالرشید عراقی) (۱۷ جولائی ۱۹۹۸ء)

جواب: مردے کے لیے قرآن خوانی کرانا کتاب وسنت سے ثابت نہیں۔ صحیح حدیث ہے:

« مَنْ اَحْدَثَ فِيْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ » [1]

''یعنی جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے۔''

میت کو ثواب پہنچانے کے مشروع طریقے

سوال: ۱۔ کیا قرآن خوانی کا ثواب مردوں کو پہنچتا ہے؟

۲۔ میت کو ثواب پہنچانے کے مشروع طریقے کونسے ہیں؟

۳۔ بعض لوگ دفن کے بعد اور چار یا سات دن کے بعد میت کے گھر جمع ہو کر کھانا کھاتے ہیں اس کے متعلق کیا حکم ہے؟

۴۔ میت کی وفات کے بعد پہلی یا شب براءت وغیرہ کو خاص طور پر غم منانا میت کے گھر افسوس کے لیے جانا بدعت ہے لیکن یہ بدعت کب سے شروع ہوئی؟ (محمد جہانگیر۔ میر پور) (۱۹ اگست ۱۹۹۴ء)

جواب: ۱۔ مردوں کے لیے قرآنی خوانی کتاب وسنت سے ثابت نہیں بلکہ حنفی فقہاء نے اس کو بدعت قرار دیا ہے۔ علی متقی صاحب ''کنز العمال'' فرماتے ہیں:

« اَلاِجْتِمَاعُ لِلْقِرَاءَةِ بِالْقُرْاٰنِ عَلَى الْمَيِّتِ بِالتَّخْصِيْصِ فِى الْمَقْبَرَةِ اَوِ الْمَسْجِدِ اَوِ الْبَيْتِ بِدْعَةٌ مَذْمُوْمَةٌ .»

۲۔ میت کے لیے دعاء استغفار کرنا، حج کرنا، قربانی دینا اور بلا تعیین کے صدقہ خیرات کرنا وغیرہ سب مشروع امور ہیں۔

۳۔ شریعت میں تیجے، ساتویں اور چالیسویں وغیرہ کا کوئی ثبوت نہیں۔ حدیث میں ہے:

---

[1] صحيح البخارى، بَابُ إِذَا اصْطَلَحُوا عَلَى صُلْحِ جَوْرٍ فَالصُّلْحُ مَرْدُودٌ، رقم:٢٦٩٧

« مَنْ اَحْدَثَ فِيْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ » [1]

یعنی ''جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے۔''

دراصل یہ ہندوانہ رسوم ہیں ان کا تذکرہ منوسمرتی میں موجود ہے۔

۴۔ یہ غلط قسم کی رسمیں ہیں۔شریعت مطہرہ میں ان کا کوئی ثبوت نہیں۔ بدعت عام طور پر ماحول اور معاشرہ کی ایجاد ہوتی ہے۔اس میں تاریخ کا تعین مشکل امر ہے۔

جنازہ کے فوراً بعد اعلان کرنا ''قل والے دن تیجہ ساتواں، دسواں سب اکٹھا ہی ہوگا''

سوال : جنازے پر اعلان کرنا کہ تیسرے دن (قل والے دن) ۱۰ بجے تیجہ، ساتواں، دسواں وغیرہ سب کچھ اکٹھا ہی ہوگا۔سب حضرات وقت پر پہنچ جائیں۔کیا یہ اعلان کرنا درست ہے؟ جب تیجے والے دن وقت مقرر پر سب لوگ اکٹھے ہو جائیں تو لوگوں کے سامنے کھانا وغیرہ کچھ نہ کچھ رکھا جائے۔اک دو مولوی کھڑے ہوں۔قرآنِ مجید کی ایک دو سورتیں پڑھیں اور اجتماعی دعا کروادی۔کیا صورتِ ثانی مسنون ہے یا غیر مسنون ہے اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

(قاری ظفر اقبال ظفر۔گوجرانوالہ) (۲۰ اکتوبر ۲۰۰۰ء)

جواب : مذکورہ بالا چیزوں اور اعلاناتِ خصوصی کا شریعت میں وجود نہیں۔ ان سے اجتناب ضروری ہے۔صحیح حدیث میں ہے جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے۔ [2]

غیر شرعی اجتماعات میں شرکت بھی نہیں کرنی چاہیے۔

قرآنِ مجید کی تلاوت کا ثواب فوت شدہ خاوند کو ایصال کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

سوال : میرے خاوند اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں، وہ بہت اچھے آدمی تھے۔ میں قرآن مجید پڑھ کر انھیں قرآن کا ثواب بخشنا چاہتی ہوں، اس کا طریقہ بتادیں۔ (امۃ المحبوب، موہنی روڈ لاہور) (۲۳ ستمبر ۲۰۰۵ء)

جواب : قرآنِ مجید پڑھ کر کسی فوت شدہ کو بخشنا کتاب وسنت سے ثابت نہیں۔ اپنے مرحوم شوہر کو اپنی نیک دعاؤں میں یاد رکھیں، حسب توفیق صدقہ کریں، حج بدل اور قربانی بھی ہوسکتی ہے۔

کھانے پینے کی چیز کسی کے ایصالِ ثواب کے لیے تقسیم کرنا درست ہے یا نہیں؟

سوال : کھانے پینے کی چیز کسی کے ایصالِ ثواب کے لیے تقسیم کرنا درست ہے یا نہیں؟ اور عام متوسط لوگوں کے لیے اس کا کھانا جائز ہے یا نہیں؟ (سائل: محمد علی شاہ، لاہور) ۳۱ مئی ۲۰۰۲ء)

[1] صحيح البخاري، بَابُ إِذَا اصْطَلَحُوا عَلَى صُلْحِ جَوْرٍ فَالصُّلْحُ مَرْدُودٌ، رقم:٢٦٩٧

[2] ایضاً

جواب : کسی بھی چیز کو میت کی طرف سے صدقہ کیا جا سکتا ہے۔عمومی صدقے سے یہ لوگ کھا پی سکتے ہیں۔لیکن واجب صدقے سے ان کا کھانا پینا درست نہیں۔مثلاً میت نے کوئی نذر مانی تھی یا اس کے ذمے کوئی قرض یا کفارہ تھا۔

اولیاءِ کرام کے ایصالِ ثواب کے لیے کچھ اللہ کی راہ میں دینا درست ہے یا نہیں؟

سوال : اولیاءِ کرام کے ایصالِ ثواب کے لیے کچھ اللہ کی راہ میں دینا درست ہے یا نہیں؟

(سائل: محمد علی شاہ، لاہور) (۳۱ مئی ۲۰۰۲ء)

جواب : ایصالِ ثواب کے لیے عمومی صدقہ کرنا فی الجملہ ثابت ہے اور مخصوص شخصیات کی طرف سے صدقہ خیرات سے مقصود عوام کا ان سے تقرب حاصل کرنا ہوتا ہے جو درست عمل نہیں۔

اولیاء اللہ کے لقب کا اطلاق کن لوگوں پر ہو سکتا ہے؟

سوال : شیخ عبد القادر جیلانی، شیخ علی ہجویری رحمہ اللہ اور دیگر مشہور ترین بزرگوں (جنھیں ہمارے ہاں اولیاء اللہ کہا جاتا ہے) کے متعلق ڈاکٹر مسعود الدین عثمانی کے پیروکار کہتے ہیں کہ ان کی کتابوں میں شرکیہ عبارات پائی جاتی ہیں، لہٰذا جب تک ان بزرگوں کے کافر ہونے کا اظہار نہ کیا جائے ہمارا ایمان بے کار ہے۔اس بارے میں صحیح بات کیا ہے؟

(شیخ عبد المجید، توحید روڈ، ناصر پارک، لاہور) (۱۷ فروری ۲۰۰۶ء)

جواب : جن لوگوں کی زندگی کتاب وسنت کے مطابق گزری ہے ان پر اولیاء اللہ کا اطلاق ہو سکتا ہے، اگر کسی سے کوئی لغزش ہوئی ہے تو رب کریم سے ان کے لیے معافی کی درخواست کرنی چاہیے اور شرکیہ کلمات سے براءت کا اظہار کیا جائے، نیز ہر ایک پر کفر وشرک کے فتوے لگانے سے اجتناب ضروری ہے۔ واللّٰہ یتولی السرائر

چہلم وغیرہ کا کھانا حرام ہے یا مکروہ؟

سوال : ہم سوم چہلم وغیرہ میں شرکت نہیں کرتے۔بعض اوقات ان رسومات پر تقسیم شدہ کھانا گھر میں آتا ہے۔کیا اسے پھینک دیں یا کھا سکتے ہیں؟ اس کا کھانا حرام ہے یا مکروہ؟ اس صورت میں کہ ایسی محافل کی حوصلہ افزائی کا کسی قسم کا شائبہ تک موجود نہ ہو۔ (سائل: محمد علی شاہ، لاہور) (۳۱ مئی ۲۰۰۲ء)

جواب : ایسا کھانا جانوروں کو کھلا دیا جائے۔اس کا خود کھانا کراہت سے خالی نہیں۔

وفات کے تیسرے دن تیجہ، جمعرات کو ختم رسم چہلم کے انعقاد کا شرعی حکم:

سوال : ہمارے علاقے میں یہ رسم عام ہے کہ اگر کوئی فوت ہو جائے تو تیسرے دن قل اور اس کے بعد ہر جمعرات کو ختم پڑھایا جاتا ہے اور آخر میں رسم چہلم ادا کر کے سال تک مرنے والا بھلا دیا جاتا ہے۔آپ بتائیں ایسی محفل میں جانا کیسا ہے؟ اور یہ رسم حدیث میں بھی موجود ہے یا نہیں؟ (محمد یوسف۔ضلع ایبٹ آباد) (۹ جولائی ۱۹۹۹ء)

جواب : وفات کے تیسرے دن اور پھر ہر جمعرات کو ختم اور اخیر میں رسمِ چہلم کے انعقاد کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں۔ بلکہ عیار لوگوں نے کھانے پینے کا ڈھب بنا رکھا ہے۔ ہندوؤں کی پیروی میں یہ رسومات ایجاد ہوئی ہیں۔ منوسمرتی میں ان رسموں کا ذکر ملتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

« مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَیْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ »❶

''یعنی جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے۔''

جب ان مجالس کا منعقد کرنا خلافِ شرع ہے تو ان میں شرکت کرنا بھی ناجائز ہے۔

مروجہ معاشرتی رسموں کی شرعی حیثیت

سوال : کیا شریعت میں گیارہویں اور رسمِ چالیسواں یا اس قسم کی دوسری رسموں کا ذکر آیا ہے؟ اگر نہیں تو یہ ہمارے اسلامی نظام کا حصہ کیسے ہیں؟

جواب : مذکورہ رسمیں بدعت ہیں، ان سے بچنا انتہائی ضروری ہے۔ صحیح حدیث میں ہے:

« مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَیْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ »❷

''یعنی جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے۔''

کیا چالیسویں، تیجے کی حدیث صحیح ہے؟

سوال : کتاب ''جاء الحق'' کے مصنف مفتی احمد یار نعیمی نے (ص:۲۶۲) فاتحہ کے ثبوت میں فاتحہ، تیجے، دسویں، چالیسویں کے باب میں حدیث ذکر کی ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت امیر حمزہ کے لیے تیسرے اور ساتویں اور چالیسویں دن اور چھٹے ماہ اور سال بھر کے بعد صدقہ دیا یہ تیجہ ششماہی اور برسی کی اصل ہے۔

بحوالہ ''انوار ساطعہ'' (ص:۱۴۵) اور حاشیہ خزانۃ الروایات میں ہے یہ کتابیں کس مصنف کی ہیں یہ کون ہے اور کس صدی کا ہے؟ اور یہ کتابیں کس پائے کی ہیں۔ بالتفصیل وضاحت سے آگاہ فرمائیں۔ (محمد اسماعیل خان ذبیح اٹھیل پوری) (۲۶ اپریل ۲۰۰۲ء)

جواب : مذکور روایت موضوع من گھڑت اور جن کتابوں کا حوالہ دیا گیا وہ قابل استناد نہیں اور معروف ذخیرہ حدیث میں اس کا کوئی نام ونشان نہیں اور اگر کوئی اس کی صحت کا دعویدار ہے تو اس کے ذمے ہے کہ محدثین کے اصول کے مطابق اس کو صحیح ثابت کرے ورنہ اس کی حیثیت تارِ عنکبوت سے بھی کم تر ہے جو قابلِ التفات نہیں۔

---

❶ صحیح البخاری، بَابُ إِذَا اصْطَلَحُوا عَلَى صُلْحِ جَوْرٍ فَالصُّلْحُ مَرْدُودٌ، رقم:۲۶۹۷

❷ ایضًا

مروّجہ فاتحہ خوانی کی شرعی حیثیت

سوال : اہل میت کے گھر مروّجہ فاتحہ خوانی کی شرعی حیثیت کیا ہے، بالدلائل تحریر کریں۔ نیز مسلم شریف جلد دوم کتاب الجنائز میں حضرت ام سلمہ بیان کرتی ہیں کہ آپ ﷺ حضرت ام سلمہ کے گھر تشریف لائے تو آپ ﷺ نے مردے کی آنکھیں بند کیں تو فرمایا جب روح نکلتی ہے تو آنکھیں پیچھا کرتی ہیں۔ گھر والوں نے رونا شروع کیا، آپ ﷺ نے فرمایا، دعا کرو فرشتے آمین کہتے ہیں۔ پھر آپ ﷺ نے دعا کی۔ دوسری روایت مسلم شریف جلد دوم ص:۳۰۳ پر ہے کہ نبی ﷺ نے پانی منگوا کر وضو کیا پھر ہاتھ اٹھا کر دعا کی:

«اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِعُبَيْدٍ اَبِيْ عَامِرٍ حَتّٰى رَأَيْتُ بَيَاضَ اِبْطَيْهِ ثُمَّ قَالَ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَوْقَ كَثِيْرٍ مِّنْ خَلْقِكَ »[1]

کیا ان دونوں روایتوں سے فاتحہ خوانی کا ثبوت ملتا ہے یا نہیں؟ (ایک سائل) (۱۴ مئی ۱۹۹۳ء)

جواب : سوال میں ذکر کردہ احادیث میں مروّجہ فاتحہ خوانی کا نام ونشان تک موجود نہیں۔

حقہ کی مجلس سجی ہو لوگ اِدھر اُدھر کی باتیں ہانک رہے ہوں ۔ ہر آنے والا التماس کرتا ہے پڑھو فاتحہ۔ منٹوں سیکنڈوں میں سب کو فارغ کر کے بلا انقطاع حقے کا دَور جاری رکھا جاتا ہے۔ احادیث سے تو معلوم ہوتا ہے جس منہ سے پیاز وغیرہ کی بدبو آرہی ہو، فرشتے قریب نہیں پھٹکتے پھر کیا خیال ہے ایسی بدبودار مجلس میں رحمت کے فرشتوں کی آمد ممکن ہے۔ جواب یقیناً نفی میں ہے۔ پھر اصل اِختلاف موجود مجلس کی ہیئت ترکیبی پر ہے۔ کیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے کسی عزیز کی وفات پر تین دن کا جلسہ دعائیہ جما کر بیٹھا کرتے تھے۔

جب کہ بعض روایات میں اس کو نوحہ قرار دیا گیا ہے۔ جہاں تک میت کے لیے دعائے مغفرت کا تعلق ہے۔ سو یہ غیر متنازع امر ہے۔ سبھی اس بات کے قائل ہیں کہ دعاء ہونی چاہیے جس طرح کہ کئی ایک احادیث اور قرآنی آیت ﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ ﴾ (الحشر:۱۰) میں مصرّح ہے اور تعزیت بھی مسنون ہے جس کے لیے جگہ اور وقت کی کوئی حد بندی نہیں۔ لیکن محل نظر صرف مروّجہ طریقہ ہے جو درست نہیں۔

میت کے لیے قرآن خوانی کا حکم

سوال : مُردہ کے لیے قرآن خوانی کی جاتی ہے۔ قرآن خوانی کا ثواب مر جانے والے کے نام کر دیا جاتا ہے یعنی قرآن پڑھ کر اُسے بخش دیا جاتا ہے۔ ایصالِ ثواب کا یہ طریقہ صحیح ہے؟ (محمد ندیم ساجد) (۱۱۔اکتوبر ۱۹۹۱ء)

جواب : میت کے لیے قرآن خوانی کرانا چونکہ کتاب وسنت اور سلف صالحین کے عمل سے ثابت نہیں اس لیے فعل ہذا

---

[1] صحيح مسلم ، بَابُ مِنْ فَضَائِلِ أَبِي مُوسَى وَأَبِي عَامِرٍ الْأَشْعَرِيَّيْنِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا ، رقم:۲۴۹۸

سے اجتناب ضروری ہے۔ حدیث میں ہے:

« مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَیْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ »[1]

یعنی ''جس نے دین میں اضافہ کیا وہ مردود ہے۔''

بلا معاوضہ یا بغیر ریا کاری کے میت کے لیے قرآن خوانی کا اہتمام کرنا:

سوال: ایک مفتی صاحب کا ارشاد ہے کہ ''یہ توصحیح ہے نبی کریم ﷺ یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے ایصالِ ثواب کے لیے قرآن خوانی کا موجودہ طریقہ نہیں اپنایا لیکن وہ لوگ عامل قرآن تھے۔ اور کثرت سے تلاوت کا اہتمام کرتے تھے اور یوں اپنے مرحومین کو ایصالِ ثواب کر دیا کرتے تھے۔ لیکن موجودہ دور کے مسلمان قرآن سے دُور ہیں اور الا ماشاء اللہ تلاوت کا اہتمام کرتے ہیں لہٰذا اگر وہ (۱) بلا معاوضہ (۲) بغیر ریا کاری کے قرآن خوانی کا اہتمام کریں تو جائز ہے؟ آپ کی رائے درکار ہے۔ (محمد رافع بن جمیل۔ شرف آباد) (۲۸ مارچ ۱۹۹۷ء)

جواب: قرآن خوانی کی صورت میں ایصالِ ثواب کا موجودہ طریق کار بدعت ہے۔ کتاب و سنت اور سلف صالحین کے عمل سے قطعاً ثابت نہیں۔

«اَلْخَیْرُ کُلَّ الْخَیْرِ فِی الاتِّبَاعِ وَالشَّرُّ کُلَّ الشَّرِ فِی الْاِبْتِدَاعِ»

''ساری بھلائی پیروی میں ہے اور ساری برائی بدعت کی ایجاد میں ہے۔''

دین اسلام ہماری فکر اور سوچ کا محتاج نہیں بلکہ ہمیں خود اپنے قلوب و اذہان کو اس کے تابع کرنا ہوگا۔ امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں جو شئے عہدِ رسالت میں دین تھی وہ آج بھی دین ہے اور جو اُس وقت دین نہیں تھی وہ آج بھی دین نہیں بن سکتی اور جو شخص بدعت کا موجب ہے وہ گویا یہ سمجھتا ہے کہ محمد ﷺ نے (نعوذ باللہ) پیغام رسانی میں خیانت کی ہے۔ جب کہ اللہ کا ارشاد ہے: ﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ...... ﴾ (المائدۃ:۳) لہٰذا مولوی صاحب کا خیال محض توہم پرستی ہے۔ اس سے اجتناب ضروری ہے۔

آپ ﷺ نے بیٹے ابراہیم علیہ السلام کی وفات پر تیسرے دن کھجوریں تقسیم کیں؟

سوال: آپ ﷺ کے بیٹے ابراہیم علیہ السلام جب فوت ہوئے تو آپ ﷺ نے تیسرے دن کھجوریں تقسیم کیں۔

۱۔ ایک صحابی کا باپ فوت ہوا تو اس نے کھجوریں تقسیم کیں۔ آپ ﷺ نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ اس صحابی کے باپ کے ایصالِ ثواب کے لیے ہیں۔ پھر آپ ﷺ نے کھائیں اور صحابہ رضی اللہ عنہم میں تقسیم کی تھیں۔

۲۔ کیا یہ سب کچھ صحیح ہے یا غلط؟ (سائل: حاجی مشتاق احمد محمدی چک ...... بہاولپور) (۱۲ دسمبر ۱۹۹۷ء)

---

[1] صحیح البخاری، بَابُ إِذَا اصْطَلَحُوا عَلٰی صُلْحِ جَوْرٍ فَالصُّلْحُ مَرْدُوْدٌ، رقم:۲۶۹۷

جواب: مذکورہ دونوں واقعات من گھڑت ہیں۔ شریعت میں ان کا کوئی ثبوت نہیں۔

میت کے لیے قرآن خوانی کا کیا حکم ہے؟

سوال: اگر گھر بیٹھ کر میت کے لیے قرآن خوانی کی جائے تو کیا میت کو اس کا ثواب ملے گا (بعض لوگ گھروں میں سیپارے تقسیم کرتے ہیں کہ قرآن خوانی کی جائے میت کو ثواب پہنچانے کے لیے کیا یہ جائز ہے۔ قرآن وسنت کی روشنی میں واضح کرکے بتائیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ (ایک سائل از لاہور) (۱۱ جون ۱۹۹۹ء)

جواب: میت کی طرف سے قرآن خوانی کرنے یا کرانے کا کوئی ثبوت نہیں بلکہ میت کے لیے دعائے خیر کرنی چاہیے۔ جس کی تعلیم قرآن میں بایں الفاظ دی گئی ہے۔

﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّکَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ﴾ (الحشر:۱۰)

کیا مردوں کو قرآن پاک کا ثواب پہنچتا ہے؟

سوال: کیا مُردوں کو قرآن پاک کا ثواب پہنچتا ہے یا نہیں اگر میں اپنے دادا، چچا، تایا یا کسی رشتہ دار کے لیے ماں باپ کے علاوہ قرآن پڑھوں تو کیا ان کو ثواب پہنچے گا یا نہیں؟ (سائل اصغر محمود) (۷ اکتوبر ۱۹۹۴ء)

جواب: اس کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں۔ شیخ علی متقی حنفی صاحبِ ''کنز العمال'' فرماتے ہیں:

« اَلْاِجْتِمَاعُ لِلْقِرَاءَۃِ بِالْقُرْاٰنِ عَلَی الْمَیِّتِ بِالتَّخْصِیْصِ فِی الْمَقْبَرَۃِ اَوِ الْمَسْجِدِ اَوِ الْبَیْتِ بِدْعَۃٌ مَذْمُوْمَۃٌ .»

یعنی میت پر قرآن خوانی کے لیے جمع ہونا بالخصوص قبرستان یا مسجد یا گھر میں مذموم بدعت ہے۔''

اور صاحبِ ''سفر السعادۃ'' کا کہنا ہے:

« وَ لَمْ تَکُنِ الْعَادَۃُ اَنْ یَّجْتَمِعُوْا لِلْمَیِّتِ وَ یَقرؤا لَہُ الْقُرْاٰن .»

یعنی ''سلف کی عادت نہیں تھی کہ جمع ہو کر میت کے لیے قرآنی خوانی کرتے ہوں۔''

ایصالِ ثواب کے لیے کوئی دن مقرر کرنا شرع میں ثابت نہیں:

سوال: آج کل بعض اہل حدیث بھی فوت ہونے کے بعد وارثانِ میت ایک دن مقرر کرکے عوام کو اطلاع دے کر بلا کر دیگیں وغیرہ پکا کر ایصالِ ثواب کر لیا کرتے ہیں کیا یہ وہی بدعتی ٹولہ کے عمل کے مطابق نہیں جو چالیسواں وغیرہ کہہ کر کرتے ہیں؟ بَیِّنُوْا بِالدَّلِیْلِ تُوجَرُوْا مِنَ اللّٰہِ الْجَلِیْلِ (احقر عبدالغفور وٹو، شیخوپورہ) (یکم اکتوبر ۱۹۹۳ء)

جواب : میت کو ایصالِ ثواب کا یہ طریقہ درست نہیں ہے اس لیے کہ کتاب وسنت اور سلف صالحین کے عمل سے اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

« مَنْ اَحْدَثَ فِيْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ » ❶

یعنی ''جس نے دین میں اضافہ کیا وہ مردود ہے۔''

میت کے وارث کا جمعرات وغیرہ کا ختم دینا جائز ہے؟

سوال : میت کے وارث جمعرات وغیرہ کا ختم دیتے ہیں، دعوت اس طرح دی جائے کہ بغیر کچھ پڑھے۔ آپ نے کھانا کھانا ہے، جائز ہے یا نہیں؟ (محمد یعقوب منڈریاں) (۹ فروری ۱۹۹۶ء)

جواب : بدعی مجالس میں شرکت کرنا ناجائز ہے۔

برائے ایصالِ ثواب مروّجہ قرآن خوانی کی شرعی حیثیت:

سوال : برائے ایصالِ ثواب قرآن خوانی کرانے کا شریعت میں کیا حکم ہے؟ (سید توصیف الرحمٰن زیدی) (۲۰ ستمبر ۱۹۹۱ء)

جواب : برائے ایصالِ ثواب قرآن خوانی کرانے کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں۔ لہٰذا یہ بدعت ہے۔ صحیح حدیث میں ہے:

«مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هَذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ ، فَهُوَ رَدٌّ» ❷

یعنی ''جس نے دین میں اضافہ کیا وہ مردود ہے۔''

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے بھی ''زاد المعاد'' میں اس کو ناجائز کہا ہے۔ صاحب ''المرعاۃ'' فرماتے ہیں:

''اہدائے ثواب قرآن علیت میرے نزدیک صراحۃً کسی مرفوع صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔ نیز صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین رحمہم اللہ سے بھی ثابت نہیں۔ اس لیے مجھے اس کی مشروعیت میں تأمل ہے۔'' (فتاویٰ ثنائیہ: ۱/۵۳۲)

اور علامہ علی المتقی صاحب ''کنز العمال'' فرماتے ہیں:

« الْاِجْتِمَاعُ لِلْقِرَاءَةِ بِالْقُرْاٰنِ عَلَى الْمَيِّتِ بِالتَّخْصِيْصِ فِي الْمَقْبَرَةِ اَوِ الْمَسْجِدِ اَوِ الْمَيِّتِ بِدْعَةٌ مَذْمُوْمَةٌ » ❸

''یعنی میت کے لیے قرآن خوانی بالخصوص قبرستان، مسجد، گھر میں مذموم بدعت ہے۔''

۲۔ بطورِ برکت گھر میں بچوں کو جمع کرکے قرآن پڑھانا بھی شریعتِ مطہرہ سے ثابت نہیں۔ لہٰذا فعل ہذا سے بھی

---

❶ صحيح البخاری، بَابُ إِذَا اصْطَلَحُوا عَلَى صُلْحِ جَوْرٍ فَالصُّلْحُ مَرْدُودٌ، رقم: ۲۶۹۷

❷ صحيح البخاری، بَابُ إِذَا اصْطَلَحُوا عَلَى صُلْحِ جَوْرٍ فَالصُّلْحُ مَرْدُودٌ، رقم: ۲۶۹۷

❸ فتاویٰ علمائے حدیث: ۵/ ۳۵۲

احتراز ضروری ہے۔

اکیلے آدمی کا گھر میں ایصالِ ثواب کی نیت سے قرآن پڑھنا

سوال: اگر مروجہ طریقے سے قرآنی خوانی نہ کی بجائے بلکہ کوئی شخص اپنے گھر میں اکیلا ہی قرآن کا کچھ حصہ پڑھ کر ایصالِ ثواب کرنا چاہے یا روزانہ چند سورتیں پڑھ کر ایصالِ ثواب کا معمول بنا لے تو اس کا یہ عمل شرعی اعتبار سے کیسا ہے؟ (سائل، جمیل احمد، کراچی) (۱۸ستمبر ۱۹۹۸ء)

جواب: قرآن خوانی کی صورت میں ایصالِ ثواب کا طریقہ کتاب وسنت سے ثابت نہیں بلکہ میت کے لیے دعا کرنی چاہیے جس کی تاکید قرآن میں بایں الفاظ ہے:

﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ﴾ (الحشر:۱۰)

کیا نبی کریم ﷺ سے میت کے لیے قرآن خوانی ثابت ہے؟

سوال: میں عرصہ ۲ سال قبل اہل حدیث ہوا تھا۔ اللہ کی توفیق سے سیدھے راستے پر گامزن ہوں۔ لیکن چند مسائل میرے اہل حدیث ہونے کے بعد پیدا ہوئے اور ہوتے رہتے ہیں۔ اللہ تمام مسائل کو حل فرمائے۔ آمین۔

مروجہ قرآن خوانی کے بارے میں تفصیل سے فرمائیں کہ کیا نبی ﷺ سے اس طرح قرآن ختم کرنا ثابت ہے اور لوگ چندہ اکٹھا کر کے مٹھائی وغیرہ منگوا کر ختم پڑھتے ہیں۔ کیا یہ درست ہے؟

(سائل محمد خالد نیو عاقل کینٹ) (۱۹ اگست ۱۹۹۶ء)

جواب: مروجہ قرآن خوانی کا کوئی ثبوت نہیں۔ لہٰذا یہ بدعت ہے۔ حدیث میں ہے:

« مَنْ اَحْدَثَ فِيْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ »[1]

''یعنی جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے۔''

میت کے لیے قرآن خوانی کا کیا حکم ہے؟

سوال: کیا جو لوگ قرآن مجید کے پارے گھروں میں تقسیم کر دیتے ہیں اور پڑھنے کے بدلے میں پڑھنے والوں کو چاول کی ایک پلیٹ یا چنے وغیرہ تقسیم کر دیتے ہیں۔ یہ پڑھنا اور ثواب ان کے نام کرنا جائز ہے؟

قرآن وحدیث کی روشنی میں بتا دیجیے کہ یہ پڑھنا اور ثواب کسی کے نام کرنا کس طرح اور کیسے کرنا جائز ہے۔ اس کا طریقہ ذرا تفصیل سے بتا دیجیے یہ بھی سنا ہے کہ دنیا سے کوچ کر جانے والے انسان کو قرآن کا پڑھا پڑھایا وغیرہ پہنچتا ہے۔ اور اس کی بخشش کا ذریعہ بنتا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟ (بابر حسین ڈاکخانہ سندھو والہ ضلع سیالکوٹ) (۸ جنوری ۱۹۹۳ء)

[1] صحیح البخاری، بَابُ إِذَا اصْطَلَحُوا عَلَى صُلْحِ جَوْرٍ فَالصُّلْحُ مَرْدُودٌ، رقم:۲۶۹۷

جواب : قرآن مجید کو پڑھوا کر ایصالِ ثواب کا طریقہ کار کتاب وسنت اور سلف صالحین کے عمل سے ثابت نہیں ہے۔
نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

« مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا ھٰذَا مَا لَیْسَ مِنْهُ فَھُوَ رَدٌّ »[1]

یعنی جس کسی نے دینِ اسلام میں اضافہ کیا وہ مردود ہے۔''

فقہاء شافعیہ اور حنفیہ نے بھی عمل ہذا کو مکروہ و بدعت لکھا ہے۔ مولانا عبدالحق حنفی دہلوی فرماتے ہیں:

''وعادت نبود کہ برائے میت شوند قرآن خوانند وختمات خوانند نہ برسر گور نہ غیراں ایں مجموعہ بدعت است۔''

'' (سلف کی) یہ عادت نہ تھی کہ وہ میت کے لیے قرآنی اور دیگر ختموں کا اہتمام کریں، نہ قبر پر نہ کسی اور جگہ۔ یہ تمام چیزیں بدعت ہیں۔ (مدارج النبوۃ)

اور الشیخ علی المتقی حنفی صاحب ''کنزالعمال'' نے کہا ہے:

« اَلاجْتِمَاعُ لِلْقِرَاءَۃِ بِالْقُرْاٰنِ عَلَی الْمَیِّتِ بِالتَّخْصِیْصِ فِی الْمَقْبَرَۃِ اَوِ الْمَسْجِدِ اَوِ الْبَیْتِ بِدْعَةٌ مَذْمُوْمَةٌ .»

''یعنی میت پر قرآن خوانی کے لیے بالخصوص قبرستان مسجد یا گھر میں اجتماع قابلِ مذمت بدعت ہے۔''

المجد نے ''سفر السعادۃ'' میں کہا ہے:

« وَ لَمْ تَکُنِ الْعَادَۃُ اَنْ یَّجْتَمِعُوا لِلْمَیِّتِ وَ یَقْرؤا لَهُ الْقُرْاٰن . وَ یَخْتَمُوْهُ عِنْدَ قَبْرِهٖ وَ لَا فِیْ مَکَانٍ اُخَرٍ وَ ھٰذَا الْمَجْمُوْعُ بِدْعَةٌ مَکْرُوْھَةٌ »

''یعنی سلف کی عادت نہیں تھی کہ جمع ہو کر میت کے لیے قرآن خوانی کر کے قرآن ختم کرتے ہوں، نہ قبر کے پاس اور نہ کسی دوسری جگہ بلکہ یہ اجتماع مکروہ بدعت ہے۔''

---

[1] صحیح البخاری، بَابُ إِذَا اصْطَلَحُوا عَلَی صُلْحِ جَوْرٍ فَالصُّلْحُ مَرْدُودٌ، رقم:٢٦٩٧

کتاب الصوم

کیا عید یا رمضان کے روزوں کے لیے ہلال دیکھنا ضروری ہے؟

سوال: آج کل سائنسی ترقی کی وجہ سے چاند کو ہلال بننے سے پہلے بھی دیکھا جا سکتا ہے کیا عید یا رمضان کے روزوں کے لیے ضروری ہے کہ ہلال کو دیکھا جائے؟ (ایک سائل) (۵ جون ۱۹۹۸ء)

جواب: احادیث میں رؤیت کو ہلال کے ساتھ مقید کیا گیا ہے۔ عید اور رمضان اس اعتبار سے ہوں گے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

« إِذَا رَأَيْتُمُ الْهِلَالَ فَصُومُوا، وَإِذَا رَأَيْتُمُوهُ فَأَفْطِرُوا. » ❶

رؤیت ہلال کتنے فاصلہ پر معتبر ہے؟

سوال: چاند کا دیکھنا کتنے فاصلے تک معتبر ہے۔ جس میں شک نہ ہو؟ کیونکہ سنا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شک کا روزہ رکھتا ہے وہ میرا نافرمان ہے۔ اس لیے آپ وہ صورت بیان فرمائیں جس میں یقین ہو، شبہ نہ ہو۔

(سائل) (۱۳ جنوری ۱۹۹۵)

جواب: باعتبار مسافت لوگوں کے مختلف اقوال ہیں۔ ۴۸۔۷۲۔۴۸۰ میل۔ صحیح بات یہ ہے۔ طے شدہ مسافت یا میلوں کے حساب سے چاند کی رؤیت کا اعتبار کرنا کتاب و سنت سے ثابت نہیں۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: « صُومُوا لِرُؤْيَتِهِ وَافْطِرُوا لِرُؤْيَتِهِ » ❷ ''چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور دیکھ کر افطار کرو۔''

دوسری روایت میں ہے کہ چاند اگر پوشیدہ رہے یعنی بادل یا غبار کی وجہ سے نظر نہ آ سکے تو پھر شعبان کی گنتی تیس روز

❶ صحیح مسلم، بَابُ وُجُوبِ صَوْمِ رَمَضَانَ لِرُؤْيَةِ الْهِلَالِ، وَالْفِطْرِ لِرُؤْيَةِ الْهِلَالِ...... الخ، رقم: ۱۰۸۱

❷ صحیح البخاری، بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ إِذَا رَأَيْتُمُ الهِلَالَ ...... الخ، رقم: ۱۹۰۹، صحیح مسلم، رقم: ۱۰۸۱

پورے کرلو۔اس حدیث کا مفہوم یہ نہیں کہ سب کا دیکھنا ضروری ہے بلکہ اعرابی کے قصہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بعض کا دیکھنا ہی کافی ہے۔اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے، مقامی لوگوں کی رؤیت ضروری نہیں بلکہ بیرونی اندرونِ ملک رؤیت بھی کافی ہوسکتی ہے غالباً اس بناء پر ابن عباس رضی اللہ عنہما نے معاویہ کی شامی رؤیت کو ناقابلِ اعتبار سمجھا ہے جب کہ مطلع کے حساب سے مدینہ اور دمشق کا بہت کم فرق ہے، امام شوکانی نے ''نیل الاوطار'' میں اس بات کو ترجیح دی ہے۔اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا ممکن ہے کہ اندرونِ ملک شہادتوں پر اعتماد کرکے روزہ رکھنا شکی روزہ نہ ہوگا۔رہا سرحدوں کا معاملہ تو بسبب قرب کے وہ ایک ہی شمار ہوگا۔جب کہ مقام دوسرے مقام سے اتنے بعد میں واقع ہو کہ رؤیت ہلال میں فرق پڑ سکتا ہو، ایسی صورت میں ایک جگہ کی رؤیت دوسری جگہ قابل اعتبار نہ ہوگی۔دراصل اس امر کی بنیاد مدارِ شمس وقمر پر ہے۔اسی بناء پر بعض ایک دوسرے سے دُور دو شہروں میں مطلع کا فرق کم ہوتا ہے اور قریبی میں زیادہ اہل علم نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ اہل مشرق کی رؤیت اہل مغرب کے لیے معتبر ہے جب کہ اس کا معکوس، ناقابلِ اعتبار ہے۔بطورِ مثال دو بھائیوں میں سے ایک مشرق میں ہے، دوسرا مغرب میں۔دونوں زوال کے وقت فوت ہوتے ہیں۔اندریں صورت مغربی، مشرقی کا وارث ہوگا اس لیے کہ اس کے علاقہ کا زوال بعد میں ہوا ہے۔اسی طرح یہ بھی بدیہی امر ہے کہ مکہ اور مدینہ اور یہاں کے اعتبار سے نمازوں کے اوقات، ایام حج، عید الفطر اور عید الاضحیٰ کا تفاوت اسی فرق پر مبنی ہے۔

میری ناقص رائے میں مطلع کے فرق میں اگر قریب دو نمازوں مثلاً ظہر، عصر، اور مغرب کے اوقات کا لحاظ کرکے مطلع کا فرق کرلیا جائے تو اُمی امت کے لیے انسب اور قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے کیونکہ نمازوں کے وقتوں کی بناء اختلافِ مطالع پر ہے۔

دور دراز علاقوں میں رہنے والے لوگ جہاں ریڈیو بھی نہ ہو، کیا کریں؟

سوال : ہمارے علاقے میں بعض ایسے مقامات ہیں جو دور دراز ہیں۔ریڈیو بھی نہیں۔یعنی ایسے ہی حالات ہیں، جیسے رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تھے۔اب وہ لوگ کیا کریں؟

جواب : دور دراز علاقوں میں آباد لوگ اپنے ذرائع اور وسائل کے مطابق عمل کریں۔قرآن میں ہے: ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (التغابن : ١٦) ''سو جہاں تک ہوسکے اللہ سے ڈرو۔''

ریڈیو خبر کی حد اور عدمِ ذرائع کی صورت میں کیا حکم ہے؟

سوال : ریڈیو پر دی گئی چاند کی اطلاع کتنے فاصلے تک قابلِ عمل ہے۔مہربانی فرما کر ہمارے اس مسئلہ کا حل فرمائیں۔رسول اللہ ﷺ سے جو ثابت ہو اس سے آگاہ فرمائیں۔براہِ کرم عید سے پہلے پہلے ہمیں جواب روانہ فرمادیں تاکہ عید کے چاند کا صحیح طور پر فیصلہ ہوسکے۔جزاک اللہ تعالیٰ، والسلام (سائل)(۱۳ جنوری ۱۹۹۵)

جواب : جہاں تک ہو سکے مطلع کا واضح فرق نہ پڑے۔ وضاحت پہلے ہو چکی ہے۔

اس مضمون کی ایک چٹھی بہاولنگر سے جناب محمد عبداللہ ناطق صاحب کی طرف سے بھی آئی ہے۔ اس جواب کو اس سوال کا جواب بھی سمجھا جائے۔

چاند نکلنے کی شہادت کیسے شخص کی قبول کی جائے گی؟

سوال : رؤیت ہلال کے بارے نجومی کی بات کا اعتبار نہیں۔ تقریباً دس سال پہلے ماہرین فلکیات کے مطابق ابھی نیا چاند پیدا نہیں ہوا تھا، لہٰذا اس کا نظر آنا ممکن نہیں تھا۔ ایک ملک میں چند لوگوں نے چاند دیکھنے کی گواہی دی۔ دنیا کے اکثر ممالک میں تیسرے دن چاند نظر آیا۔ سوال یہ ہے کہ اگر جدید سائنسی ماہرین کے مطابق نیا چاند نظر آنا ممکن نہ ہو اور چند لوگ چاند دیکھنے کی گواہی دے دیں تو اس صورت میں گواہی معتبر ہے یا نہیں؟ اگر لوگوں کی ایسی بڑی تعداد چاند دیکھ لے کہ ان کا جھوٹ پر جمع ہونا ممکن نہ ہو تو اور بات ہے۔ مذکورہ بالا حالات میں صرف چند لوگوں کی گواہی کا اعتبار کیا جائے گا یا نہیں؟ (شیخ عبداللہ، سنت نگر، لاہور) (۱۷ مئی ۲۰۰۲ء)

جواب : شریعت کا پابند اور متقی آدمی چاند نکلنے کی شہادت دے دے تو وہ شرعاً قابلِ اعتبار ہو گی۔ ایک اعرابی کی گواہی پر رسول اللہ ﷺ نے روزہ رکھنے کا حکم دیا تھا۔ ''سنن ابی داؤد''، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ وغیرہ......

رؤیت ہلال کمیٹی سے اختلاف کر کے علیحدہ کمیٹی تشکیل دینا:

سوال : عرصہ دراز سے پشاور کی تین اہل حدیث مساجد ① مرکزی جامع مسجد اہل حدیث پشاور صدر ② جامع مسجد اہل حدیث شاہ اسماعیل شہید کوٹلہ فیلبانان پشاور شہر ③ جامع مسجد اہل حدیث اندرون سرکی گیٹ پشاور شہر۔

مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی کے اعلان کے مطابق عیدیں مناتی آرہی ہیں۔ جیسا کہ پاکستان کے دیگر مسلمانوں کے ساتھ ساتھ صوبہ سرحد کے کئی اضلاع مثلاً مانسہرہ، ڈیرہ اسماعیل خان، نوشہرہ، مردان، مالاکنڈ ایجنسی وغیرہ کے رہائشی عامۃ المسلمین مناتے ہیں۔ جب کہ گزشتہ کچھ عرصہ سے پشاور شہر کے گرد و نواح میں چند اہل حدیث علماء مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی کے اعلان اور فیصلے کے خلاف ایک یا دو دن پہلے ہی عید منا لیتے ہیں۔

مزید برآں ایک اخباری خبر کے مطابق ان علمائے کرام نے ضلع پشاور کی سطح پر اہل حدیث کی ایک مقامی رؤیت ہلال کمیٹی تشکیل دی ہے۔

آپ سے گزارش ہے کہ اس کمیٹی کی شرعی حیثیت از روئے قرآن وسنت بیان فرمائیں۔ کیوں کہ متذکرہ بالا مساجد اہل حدیث کے زیر انتظام دو عید گاہوں میں نماز عید ادا کی جاتی ہے جن میں اندازاً آٹھ سے دس ہزار افراد نمازِ عید ادا کرتے ہیں۔ مسئلے کی اہمیت کے پیش نظر آپ سے استدعا ہے کہ جلد از جلد جواب دے کر عنداللہ ماجور ہوں، شکریہ۔
(سائل) (۱۸ جنوری ۲۰۰۸ء)

جواب: رؤیت ہلال میں مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی سے اختلاف کر کے علیحدہ کمیٹی تشکیل نہیں دینی چاہیے۔ کیوں کہ رسولِ اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

« اَلْفِطْرُ یَوْمَ یُفْطِرُ النَّاسُ وَالْاَضْحٰی یَوْمَ یُضَحِّی النَّاسُ .» ❶

''جس روز لوگ روزے پورے کر کے آخری افطار کرتے ہیں اس دن عید ہے اور عید الاضحیٰ اس روز ہے جس دن لوگ قربانیاں کرتے ہیں۔''

اس بناء پر علیحدہ کمیٹی کے وجود کو کالعدم قرار دینا چاہیے۔

جرمنی میں روزہ کیسے رکھا جائے؟

سوال: جرمنی کے دورہ پر جانے کا اتفاق ہوا۔ شام کو نماز پڑھی۔ یعنی مغرب کی نماز رات گئے انتظار کرتے رہے مگر شام کی لالی ختم نہ ہوئی بلکہ صبح کی پو پھوٹ گئی۔ ایسی صورت میں عشاء کا وقت نہ ملا۔ نمازِ عشاء کیسے پڑھی جائے؟ یا ساقط ہو جائے گی اور اگر روزہ ہو تو کیسے رکھا جائے؟

جواب: ایسی صورت میں نماز روزہ کا حساب عام معمول کے مطابق ہوگا۔ نماز روزہ ساقط نہیں ہوں گے۔ اس امر کی واضح دلیل ''صحیح مسلم'' میں قصہ دجال میں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کا ایک دن سال کی طرح ہوگا۔ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: کیا ہمیں اس میں ایک دن کی نماز کافی ہوگی؟ فرمایا نہیں:

« أُقْدُرُوْا لَهٗ قَدْرًا . » ❷ ''بلکہ اندازہ کرنا۔'' یعنی گھنٹوں کے حساب سے۔

کیا رمضان میں نیک عمل کا ثواب اور برے عمل کا گناہ ستر درجے بڑھ جاتا ہے؟

سوال: رمضان المبارک میں نیک عمل کا ثواب ستر درجے بڑھ جاتا ہے۔ کیا اسی طرح گناہ میں بھی اضافہ ہوتا ہے؟ اگر ہوتا ہے تو کیا یہ اس کی شانِ کریمی کے خلاف نہیں؟ اور رمضان کی برکات پر حرف نہیں آئے گا۔ مدلل تحریر فرمایا جائے۔ (ایک سائل) (۷ فروری ۱۹۹۷ء)

جواب: رمضان میں نیکی کا اجر و ثواب ستر گناہ بڑھنے والی روایت سنداً اگرچہ ضعیف ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ رمضان میں نیکی بلا حساب تک جا پہنچی ہے۔ قرآنِ مجید میں ہے:

﴿ اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ﴾ (الزمر:۱)

اہلِ تاویل و تفسیر نے صابرون کی تشریح روزہ داروں سے کی ہے۔ اور صحیح حدیث میں ہے:

---

❶ سنن الترمذی بَابُ مَا جَاءَ فِی الفِطْرِ وَالأَضْحَی مَتَی یَكُونُ؟، رقم: ۸۰۲.

❷ صحیح مسلم، بَابُ ذِكْرِ الدَّجَّالِ وَصِفَتِهِ وَمَا مَعَهُ، رقم:۲۹۳۷

« إِلَّا الصَّوْمَ، فَإِنَّهُ لِي وَأَنَا أَجْزِي بِهِ » ❶

اور جہاں تک برائی کا تعلق ہے سو اس کے ارتکاب سے رمضان غیر رمضان میں اضافہ نہیں ہوتا ہے۔ حدیث میں ہے: « فَإِنْ هُوَ هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا كَتَبَهَا اللَّهُ لَهُ سَيِّئَةً وَاحِدَةً » ❷

''یعنی بندہ اگر گناہ کا قصد کر کے برائی کر گزرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے صرف ایک برائی درج کرتا ہے۔''

اور قرآنِ کریم میں ہے: ﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ﴾ (الانعام: ۱٦)

'' جو کوئی (اللہ کے حضور) نیکی لے کر آئے گا اس کو بیس دس نیکیاں ملیں گی اور جو برائی لائے گا اسے سزا ویسی ہی ملے گی۔''

اور الاعرج کی روایت میں ہے: «فَاكْتُبُوهَا لَهُ بِمِثْلِهَا» ❸

اور صحیح مسلم میں ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے: «فَجَزَاؤُهُ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا أَوْ أَغْفِرُ .» ❹

اور ''صحیح مسلم'' ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت کے اخیر میں الفاظ یوں ہیں: «أَوْ يَمْحُوهَا» مفہوم اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم یا توبہ و استغفار یا اچھا عمل کرنے سے برائی کو مٹا دیتا ہے لیکن پہلا معنی حدیث ابوذر رضی اللہ عنہ کے قریب تر ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَيُسْتَفَادُ مِنَ التَّأْكِيدِ بِقَوْلِهِ وَاحِدَةً أَنَّ السَّيِّئَةَ لَا تُضَاعَفُ كَمَا تُضَاعَفُ الْحَسَنَةُ وَهُوَ عَلَى وَفْقِ قَوْلِهِ تَعَالَى فَلَا يُجْزَى إِلَّا مِثْلَهَا.» ❺

''یعنی سَيِّئَة کے ساتھ واحدة کی تاکید سے یہ بات مستفاد ہے کہ برائی میں اضافہ نہیں ہوتا جس طرح کہ نیکی میں کئی گناہ اضافہ ہوتا ہے اور یہ اللہ کے فرمان ﴿فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا﴾ کے عین مطابق ہے۔''

ابن عبد السلام نے اپنی ''امالی'' میں کہا: تاکید کا فائدہ یہ ہے کہ یہاں اس شخص کا وہم رفع کرنا مقصود ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ انسان جب برائی کرتا ہے تو برا عمل اس پر لکھ دیا جاتا ہے اور قصدِ برائی کا بدی میں مزید اضافہ کا موجب ہوگا۔

---

❶ صحیح مسلم، بَابُ فَضْلِ الصِّيَامِ، رقم: ۱۱۵۱

❷ صحیح البخاری، بَابُ مَنْ هَمَّ بِحَسَنَةٍ أَوْ بِسَيِّئَةٍ، رقم: ٦٤٩١

❸ صحیح مسلم، بَابُ إِذَا هَمَّ الْعَبْدُ بِحَسَنَةٍ كُتِبَتْ، وَإِذَا هَمَّ بِسَيِّئَةٍ لَمْ تُكْتَبْ، رقم: ۱۲۹

❹ صحیح مسلم، بَابُ فَضْلِ الذِّكْرِ وَالدُّعَاءِ وَالتَّقَرُّبِ إِلَى اللهِ تَعَالَى، رقم: ۲٦۸۷

❺ فتح الباری، ج: ۱۱، ص: ۳۲۸

درآں حالیکہ معاملہ اس طرح نہیں برائی صرف ایک ہی لکھی جاتی ہے۔ ہاں البتہ بعض اہلِ علم نے حرم مکی میں برائی کے ارتکاب کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔

اسحاق بن منصور نے کہا میں نے امام احمد رحمہ اللہ سے دریافت کیا۔

«هَلْ وَرَدَ فِي شَيْءٍ مِنَ الْحَدِيثِ أَنَّ السَّيِّئَةَ تُكْتَبُ بِأَكْثَرَ مِنْ وَاحِدَةٍ قَالَ لَا مَا سَمِعْتُ إِلَّا بِمَكَّةَ لِتَعْظِيمِ.» ❶

''کیا کسی حدیث میں وارد ہے کہ برائی بھی ایک سے زیادہ لکھی جاتی ہے۔ جواباً فرمایا: میں نے یہ بات کسی سے نہیں سنی۔ ہاں البتہ حرم کی تعظیم واحترام کی خاطر مکہ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔''

تاہم جمہور زمان ومکان کے اعتبار سے تعمیم کے قائل ہیں۔لیکن بعض دفعہ بڑھائی میں تفاوت پایا جاتا ہے۔اس پر یہ اعتراض وارد نہیں ہوسکتا کہ قرآن میں ازواج مطہرات کے بارے میں تو تضعیفِ عذاب کی نص موجود ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ﴾ (الاحزاب: ٣)

''تم سے جو کوئی صریح ناشائستہ الفاظ کہہ کر رسول ﷺ کو ایذا دینے کی حرکت کرے گی اس کو دگنی سزا دی جائے گی۔''

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ نبی ﷺ کے حق کی عظمت کی بناء پر ہے۔ کیونکہ ازواج مطہرات سے فحش گوئی وقوع ایک زائد سمت کا متقاضی ہے وہ ہے نبی ﷺ کی ذاتِ گرامی کو اذیّت دینا۔ ❷

اس ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ برائی صرف ایک ہی برائی رہتی ہے اس میں اضافہ نہیں ہوتا۔ چاہے موسم رمضان ہو یا غیر، لیکن ایامِ مبارکہ میں اس کے وقوع سے اس کی شناعت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اس پر سختی سے نکیر کی گئی ہے «وَيَا بَاغِيَ الشَّرِّ أَقْصِرْ» ❸ میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔« وَ قَالَ التِّرْمَذِيُّ هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ» دوسری حدیث میں ہے:

«مَنْ لَمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّورِ وَالْعَمَلَ بِهِ، فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِي أَنْ يَدَعَ طَعَامَهُ

❶ فتح الباری، ج:١١، ص:٣٢٩

❷ فتح الباری: ١١/ ٣٢٨۔٣٢٩

❸ سنن ابن ماجه، بَابُ مَا جَاءَ فِي فَضْلِ شَهْرِ رَمَضَانَ، رقم:١٦٤٢، سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي فَضْلِ شَهْرِ رَمَضَانَ، رقم:٦٨٢

وَشَرَابَهُ.»❶

اُمتِ مرحومہ پر اللہ رب العزت کا عظیم احسان ہے کہ ایک ایک نیکی میں بے پناہ اضافہ کر دیا۔ جب کہ بدی میں تعدد کے بجائے اسے اپنی جگہ پر رکھ کر توبہ وانابت کی دعوتِ عام دی تا کہ گنہگار سیاہ کار بندے اس کے آغوش رحمت میں داخل ہو کر بہشت کے وارث بن سکیں۔ اسی بناء پر ترغیب دی گئی ہے کہ

« مَنْ قَامَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ إِيمَانًا وَاحْتِسَابًا، غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ، وَمَنْ صَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ .»❷

اور جب اس کی مرضی ہو تو حقوق العباد کو بھی معاف فرما کر ظالم و مظلوم اور قاتل و مقتول دونوں کو خوش کر دیتا ہے۔

﴿لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْئَلُوْنَ﴾ (الانبیاء: ۲۳)

﴿إِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا﴾ (الزمر: ۵۳)

لہٰذا یہ اعتقاد رکھنا کہ رمضان المبارک میں نیکی کی طرح برائی میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ مذکورہ بالا شرعی نصوص کے منافی نظریہ ہے۔

اللہ رب العزت جملہ مسلمانوں کو برکاتِ رمضان سے مستفید ہونے کی توفیق بخشے۔ (آمین)

دودھ پلانے والی عورت یا حاملہ عورت روزہ نہ رکھے؟

سوال: کیا دودھ پلانے والی عورت اور حاملہ عورت روزے نہ رکھے تو کیا وہ ٹھیک ہے یا کہ نہیں؟

(ام طلحہ۔ جہلم) (۱۲ فروری ۱۹۹۹ء)

جواب: حاملہ اور مرضعہ تکلیف کی وجہ سے روزے فاطر (چھوڑنا) کرسکتی ہیں۔ جامع ترمذی میں حدیث ہے:

«إِنَّ اللّٰهَ تَعَالَى وَضَعَ عَنِ الْمُسَافِرِ الصَّوْمَ، وَشَطْرَ الصَّلَاةِ، وَعَنِ الحَامِلِ أَوِ الْمُرْضِعِ الصَّوْمَ أَوِ الصِّيَامَ.»❸

علامہ مبارکپوری رقمطراز ہیں:

«وَلَا خِلَافَ فِي جَوَازِ الْإِفْطَارِ لِلْحَامِلِ وَالْمُرْضِعَةِ إِذَا خَافَتِ الْمُرْضِعَةُ عَلَى الرَّضِيعِ وَالْحَامِلُ عَلَى الْجَنِينِ.»❹

❶ صحيح البخاری ، بَابُ مَنْ لَمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّورِ ، وَالعَمَلَ بِهِ فِي الصَّوْمِ ، رقم:۱۹۰۳

❷ صحيح البخاری كتاب الصيام ، بَابُ مَنْ صَامَ رَمَضَانَ إِيمَانًا وَاحْتِسَابًا وَنِيَّةً ، رقم: ۱۹۰۱

❸ سنن الترمذی ، بَابُ مَا جَاءَ فِي الرُّخْصَةِ فِي الإِفْطَارِ لِلْحُبْلَى وَالمُرْضِعِ ، رقم:۷۱۵

❹ تحفة الاحوذی:٤/ ٤٠٢

''یعنی حاملہ اور مرضعہ کے لیے بلا اختلاف روزہ افطار کرنا جائز ہے جب کہ دودھ پیتے بچہ اور پیٹ میں بچہ کو تکلیف کا اندیشہ ہو۔''

اور آیت کریمہ ﴿وَ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ﴾ (البقرۃ:۱۸٤) کے معنی «يُطَوَّقُوْنَهٗ» کے کیے جائیں یعنی جن کے لیے روزہ رکھنا گلے کا طوق اور مصیبت ہے تو اس صورت میں یہ آیت مرضعہ اور حاملہ کو بھی شامل ہوگی۔

سفر میں روزہ نہ رکھنا کیسا ہے؟

سوال : ایک آدمی بسلسلہ ملازمت روزانہ ۷۰ میل کا سفر کرتا ہے اور وہ رمضان کے روزے نہیں رکھتا۔ چھٹی کے روز روزہ رکھتا ہے اور کہتا ہے کہ سفر میں روزہ رکھنا جائز نہیں۔ اور جو روزے اُس نے نہیں رکھے اور چھٹی کے روز روزہ رکھ کر وہ پورے کر رہا ہے کیا اس کا ایسا کرنا از روئے کتاب و سنت درست ہے یا نہیں؟

(سائل عبدالرشید عراقی) (۱۷ جولائی ۱۹۹۸ء)

جواب : سفر میں روزہ نہ رکھنے کا صرف جواز ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

«فَالْحَاصِلُ أَنَّ الصَّوْمَ لِمَنْ قَوِيَ عَلَيْهِ أَفْضَلُ مِنَ الْفِطْرِ وَالْفِطْرُ لِمَنْ شَقَّ عَلَيْهِ الصَّوْمُ أَوْ أَعْرَضَ عَنْ قُبُولِ الرُّخْصَةِ أَفْضَلُ مِنَ الصَّوْمِ وَأَنَّ مَنْ لَمْ يَتَحَقَّقِ الْمَشَقَّةَ يُخَيَّرُ بَيْنَ الصَّوْمِ وَالْفِطْرِ.»[1]

''جملہ دلائل کا حاصل یہ ہے کہ بحالتِ سفر جس میں روزہ کی طاقت ہو اس کے لیے روزہ رکھنا افضل ہے۔ اور جسے تکلیف ہو یا رخصت قبول کرنے سے منہ پھیرے اسے افطار کرنا چاہیے اور عدمِ تکلیف کی صورت میں دونوں طرح اختیار ہے۔''

موصوف کا موقف درست نہیں۔ بحالتِ سفر نبی ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے روزہ رکھنا ثابت ہے۔ فرمایا:

« وَمَا فِينَا صَائِمٌ إِلَّا مَا كَانَ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَابْنِ رَوَاحَةَ.»[2]

«كُنَّا نُسَافِرُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فَلَمْ يَعِبِ الصَّائِمُ عَلَى الْمُفْطِرِ، وَلَا الْمُفْطِرُ عَلَى الصَّائِمِ.»[3]

کیا ستر سالہ بوڑھے کو روزے معاف ہیں؟

سوال : ایک آدمی کی عمر ۷۰ سال ہے بیمار بھی رہتا ہے مگر چلتا پھرتا ہے اس نے اس سال روزے بھی نہیں رکھے اور نہ

---

[1] فتح الباری: ٤/ ١٨٣

[2] صحیح البخاری، بَابُ إِذَا صَامَ أَيَّامًا مِنْ رَمَضَانَ ثُمَّ سَافَرَ، رقم:١٩٤٥

[3] صحیح البخاری، بَابٌ: لَمْ يَعِبْ أَصْحَابُ النَّبِيِّ ﷺ بَعْضُهُمْ بَعْضًا فِي الصَّوْمِ وَالإِفْطَارِ، رقم:١٩٤٧

ہی کفارہ ادا کیا ہے اور کہتا ہے کہ میری عمر کے لوگوں کو معافی ہے کیا یہ صحیح ہے؟

(سائل عبدالرشید عراقی) (۱۷ جولائی ۱۹۹۸ء)

جواب: ستر سالہ بوڑھا طاقت اور ہمت کی صورت میں روزہ رکھے۔ اور عدمِ استطاعت کی شکل میں کفارہ ادا کرے۔ دونوں امروں سے رخصت نہیں۔ ایک کو درجہ بدرجہ کرنا ہوگا۔ صحیح بخاری کے ترجمۃ الباب میں ہے:

«وَأَمَّا الشَّيْخُ الكَبِيرُ إِذَا لَمْ يُطِقِ الصِّيَامَ فَقَدْ أَطْعَمَ أَنَسٌ بَعْدَ مَا كَبِرَ عَامًا أَوْ عَامَيْنِ، كُلَّ يَوْمٍ مِسْكِينًا، خُبْزًا وَلَحْمًا، وَأَفْطَرَ.» ❶

''عمر رسیدہ آدمی اگر روزہ نہ رکھ سکے تو اس کے لیے افطار کی اجازت ہے البتہ کھانا کھلانا ہوگا۔) کبر سنی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ایک یا دو رمضان ہر روز ایک مسکین کو روٹی گوشت کھلایا اور خود روزہ نہ رکھا۔''

میت کی طرف سے روزہ رکھنا

سوال: ایسے ہی روزے کا مسئلہ ہے کہ میت کی طرف سے روزے رکھے جا سکتے ہیں یا کہ نہیں۔ یہ بات یاد رہے کہ اس نے وصیت نہیں کی۔ (محمد نصر اللہ گوندلانوالہ تحصیل وضلع گوجرانوالہ) (۶ نومبر ۱۹۹۲ء)

جواب: میت کی طرف سے روزے رکھے جا سکتے ہیں۔ حدیث میں ہے:

« مَنْ مَاتَ وَ عَلَيْهِ صِيَامٌ صَامَ عَنْهُ وَلِيُّهُ » ❷

''یعنی جو شخص فوت ہو جائے، اس کے ذمہ روزے ہوں تو اس کی طرف سے اس کا ولی روزے رکھے۔''

دوسری روایت میں ہے: « صُوْمِيْ عَنْهَا » ❸

جس عورت کی عادت اور تمیز مفقود ہو وہ نماز روزہ کس طرح ادا کرے؟

سوال: ایک عورت جسے حیض کا خون تقریباً ایک سال سے جاری ہے اور اُسے گزشتہ عادت بھی یاد نہیں، گویا متحیّرہ ہے۔ وہ مہینہ میں کتنے دن نماز چھوڑے؟ غسل کرے یا صرف وضوء کرے؟ وہ رمضان کے سارے روزے رکھے یا کچھ چھوڑ دے؟ (محمد طاہر، لاہور) (۷ جنوری ۲۰۰۰ء)

جواب: واضح ہو کہ ایامِ عادت کے اعتبار سے عورتوں کی متعدد اقسام ہیں:

---

❶ صحيح البخاری، كتاب التفسير، بَابُ قَوْلِهِ: ﴿أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا ......الخ﴾

❷ متفق عليه، صحيح البخاری، بَابُ مَنْ مَاتَ وَعَلَيْهِ صَوْمٌ، رقم:۱۹۵۲، صحيح مسلم، بَابُ قَضَاءِ الصِّيَامِ عَنِ الْمَيِّتِ، رقم:۱۱٤۷

❸ صحيح مسلم، بَابُ قَضَاءِ الصِّيَامِ عَنِ الْمَيِّتِ، رقم:۱۱٤۹

۱۔ مستحاضہ: ماہواری کی عادت والی، خون کی پہچان کرسکتی ہو یا نہ کرسکتی ہو۔اس کو معروف عادت کی طرف لوٹایا جائے گا چنانچہ ''صحیح مسلم'' میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے۔

«اُمْكُثِيْ قَدْرَ مَا كَانَتْ تَحْبِسُكِ حَيْضَتُكِ.» ❶

''ایام حیض کے بعد انتظار کرو۔''

۲۔ وہ عورت جو ابتداء ہی میں خون کی پہچان کرلے، وہ پہچان کے مطابق عمل کرے گی حدیث میں ہے:

«اِذَا كَانَ دَمُ الْحَيْضَةِ فَاِنَّهٗ اَسْوَدُ يُعْرَفُ.» ❷

''جب حیض کا خون آئے تو وہ سیاہ، بدبودار ہوتا ہے اور پہچانا جاتا ہے۔''

۳۔ اور وہ عورت جس کی عادت اور پہچان دونوں مفقود ہوں، اس کے ایام ماہواری غالب عورتوں کی عادت کی بناء پر چھ سات دن شمار ہوں گے۔ دلیل اس کی حسنہ کی حدیث ہے جو ''سنن ابی داؤد'' وغیرہ میں موجود ہے۔ ❸

مرقومہ عورت کا تعلق چونکہ تیسری قسم سے ہے، لہٰذا یہ عورت ہر ماہ چھ یا سات دن نماز چھوڑ کر غسل کے بعد نماز پڑھنی شروع کردیا کرے، اور جن دنوں میں نماز چھوڑے گی ان میں روزہ بھی نہیں رکھے گی کیونکہ یہ دن حیض کے شمار ہوں گے۔

ایک روزہ چھوڑنے کے بدلے ایک وقت کا کھانا کھلانا ہے یا کہ دو وقت کا؟

سوال: ﴿وَ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ﴾ میں آیا ہر روزہ کے بدلہ ایک وقت کا کھانا کھلانا ہے یا کہ دو وقت کا؟ دلیل؟

کیا کسی مسکین کو اکٹھی رقم بھی ان کھانوں کے بدلے میں دی جاسکتی ہے؟ (۲۶ جولائی ۱۹۹۶ء)

جواب: یومیہ فدیے کا اندازہ کل ایک مُدّ غلہ یعنی چوتھائی صاع ہے۔ اور صاع تقریباً پونے تین سیر ہوتا ہے۔امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«مُدٌّ بِمُدِّ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ كُلِّ يَوْمٍ أَفْطَرَهُ، وَبِهِ قَالَ الشَّافِعِيُّ .وَقَالَ أَبُو حَنِيفَةَ :كَفَّارَةُ كُلِّ يَوْمٍ صَاعُ تَمْرٍ أَوْ نِصْفُ صَاعِ بُرٍّ.» ❷

---

❶ صحیح مسلم، بَابُ الْمُسْتَحَاضَةِ وَغَسْلِهَا وَصَلَاتِهَا، رقم:۳۳٤

❷ سنن ابی داؤد، بَابُ مَنْ قَالَ إِذَا أَقْبَلَتِ الْحَيْضَةُ تَدَعُ الصَّلَاةَ، رقم:۲۸٦

❸ عون المعبود:۱/ ۱۱۷

❹ تفسیر قرطبی:۲/ ۲۸۹

''یعنی ہر روزے کے بدلے ایک مد نبی ﷺ کے مد کے مطابق غلہ دیا جائے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کھجور کا ایک صاع اور گندم کا نصف صاع دیا جائے۔''

رقم کے بجائے غلہ دینا افضل ہے۔

روزہ کی طاقت نہ رکھنے والا فدیہ کی طاقت بھی نہ رکھے تو......؟

سوال : ایک شخص جو نہ تو روزہ رکھنے کی طاقت رکھتا ہے اور نہ ہی فدیہ ادا کرنے کی تو اس کے لیے کیا حکم ہے؟ (محمد جہانگیر پوٹھ شیرڈ ڈیال میرپور کے۔اے) (۲۶ دسمبر ۱۹۹۷ء)

جواب : جو شخص نہ روزہ رکھ سکے اور نہ فدیہ دینے کی اس میں استطاعت ہو، اسے بہ نیت انتظار کرنا چاہیے۔حتیٰ کہ اللہ عزوجل کی طرف سے وسعت اور فراخی ہو، قصہ واقع نہار رمضان اس امر کی واضح دلیل ہے۔ملاحظہ ہو ''صحیح بخاری'' وغیرہ۔

کیا دانستہ چھوڑے ہوئے روزے کا کفارہ ہے؟

سوال : بعض علماء کہتے ہیں کہ وظیفہ زوجیت کی وجہ سے رمضان کا روزہ ٹوٹنے کی صورت میں کفارہ واجب ہے لیکن رمضان کے روزے کے دوران دانستہ کھا پی لیا تو قضاء واجب ہے، کفارے کا ذکر اس صورت میں حدیث میں نہیں ملتا۔ کیا کفارہ واجب نہیں؟ (سائل: محمد علی شاہ، لاہور) ۳۱ مئی ۲۰۰۲ء)

جواب : مسئلہ ہذا میں اہل علم کا اختلاف ہے جمہور کا مسلک یہ ہے کہ اس میں کفارہ نہیں۔''نیل الاوطار'' میں ہے:

« وَقَالُوا : لَا كَفَّارَةَ إِلَّا فِي الْجِمَاعِ.»❶

''جمہور کہتے ہیں کفارہ صرف جماع میں ہے نہ کہ کھانے پینے میں۔''

غلبۂ شہوت کا علاج روزہ ہے۔آج کل لونڈیوں کا وجود نہیں ہے:

سوال : (۱) ایک شخص جو کہ شادی شدہ ہے اس کی بیوی ماہواری سے ہوتی ہے یا ڈلیوری سے فراغت کے بعد سوا مہینہ یا چالیس دن تک وہ اپنی بیوی سے صحبت نہیں کرسکتا۔ یا بیمار ہوتی ہے یا شہر سے باہر گئی ہوئی ہوتی ہے۔ان دنوں میں آدمی کو اگر بہت زیادہ خواہش ہو تو وہ اس سلسلہ میں کیا کرے؟ صرف شرعی لحاظ سے مسئلہ کا اگر کوئی حل ہے تو بتادیں۔ سائل دو بیویوں کا خرچہ برداشت نہیں کرسکتا۔

(۲) شروع کے زمانہ اسلام میں لونڈی رکھنے کا رواج تھا لیکن آج کے معاشرتی ماحول میں کیا لونڈی رکھی جاسکتی ہے؟ اس کا طریقہ کار کیا ہوگا۔ (محمد فوز الکبیر) (۲۵ اگست ۱۹۹۵ء)

جواب : (۱) ایسے شخص کو چاہیے کہ کثرت سے روزے رکھے۔حدیث میں ہے:

❶ نیل الاوطار: ۴/ ۲۵۵

« يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ، فَلْيَتَزَوَّجْ، فَإِنَّهُ أَغَضُّ لِلْبَصَرِ، وَأَحْصَنُ لِلْفَرْجِ، وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ، فَإِنَّ الصَّوْمَ لَهُ وِجَاءٌ. »[1]

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے نوجوانوں کے گروہ جو کوئی تم میں سے طاقت رکھتا ہو اُسے چاہیے کہ نکاح کرلے کیونکہ نکاح کرنا نظر نیچی رکھنے کا اور ستر کی حفاظت (بدکاری سے بچنے) کا بہترین ذریعہ ہے۔'' اور جو طاقت نہ رکھے پس اس کو روزے رکھنے چاہئیں۔ کیوں کہ روزہ رکھنا (گویا) اس کے لیے خصی کرنا ہے۔''
یعنی جس طرح خصی کرنے سے شہوت جاتی رہتی ہے اسی طرح روزہ رکھنے سے بھی کمی آجاتی ہے۔''

(۲) شرعی اصطلاح میں لونڈیوں کا اطلاق غالباً کفار کی ان عورتوں پر ہوتا ہے جو دورانِ لڑائی مسلمانوں کے ہاتھ لگتی ہیں۔ آج کے دور میں منظّم جہاد کے فقدان کی بناء پر یہ شئے مفقود ہے۔

دن کو کھانے پینے کے بعد نفلی روزہ کی نیت کرنا:

سوال: کیا نفلی روزہ دن میں کسی بھی وقت رکھا جا سکتا ہے تو کیا اس کے لیے یہ شرط ہے کہ اس نے صبح (سحری) سے کوئی چیز نہ کھائی ہو نہ پانی کا گھونٹ نہ کوئی اور چھوٹی موٹی چیز کھائی ہو۔ یہاں ایک آدمی نے کہا کہ دن میں نفلی روزہ رکھنے والے کے لیے یہ شرط ہے کہ اس نے سحری سے لے کر اس وقت تک (جس سے روزہ رکھ رہا ہے) کچھ نہ کھایا پیا ہو۔ جب کہ میں نے اُسے کہا کہ یہ شرط نہیں ہے۔ میں نے اُسے بخاری و مسلم کی حدیث پیش کی جس میں حضرت ربیع بنت معوذ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے عاشوراء کی صبح انصار کی بستیوں کی طرف پیغام بھجوایا کہ جس شخص نے روزہ نہیں رکھا ہوا تھا تو وہ اپنا بقیہ دن مکمل کرلے۔ اب جنھوں نے روزہ سحری کے وقت رکھ لیا ہے۔ وہ تو صحیح ہوا۔ اور جنھوں نے نہیں رکھا۔ ان میں یہ احتمال ہے کہ انھوں نے کچھ چیز کھالی ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ آپ ﷺ کے حکم ملنے تک کچھ نہ کھایا پیا ہو۔

سوال یہ ہے کہ آیا دن میں نفلی روزہ رکھنے کی یہ شرط ہے کہ اس نے سحری سے کوئی چیز نہ کھائی ہو۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں اور اگر اس نے کوئی چیز کھالی ہے تو اس کا روزہ نہیں۔ بَيِّنُوْا تُوجَرُوْا۔

(تلمیذکم اعجاز احمد خطیب جامع مسجد اہل حدیث کدھر تحصیل بھلوال ضلع گجرات) (۲۳ اکتوبر ۱۹۹۲ء)

جواب: روزہ کی تعریف میں یہ بات شامل ہے کہ انسان طلوع صبح صادق سے لے کر غروب شمس تک مفطرات سے رک جائے۔ اس تعریف کا اطلاق عام ہے روزہ چاہے فرضی ہو۔ یا نفلی، البتہ نفلی روزے کے لیے شریعت میں اتنی

---

[1] صحيح البخاري، بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ صلى الله عليه و سلم مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ ......الخ، رقم: ٥٠٦٦، صحيح مسلم، بَابُ اسْتِحْبَابِ النِّكَاحِ لِمَنْ تَاقَتْ نَفْسُهُ إِلَيْهِ......الخ، رقم: ١٤٠٠

رخصت موجود ہے کہ اس کی نیت دن کے وقت بھی ہو سکتی ہے لیکن اس کے لیے بھی فرض روزے کی طرح ضروری ہے کہ صبح سے کچھ نہ کھایا پیا ہو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

« أَنَّهُ كَانَ يُصْبِحُ حَتَّى يُظْهِرَ ثُمَّ يَقُولُ وَاللَّهِ لَقَدْ أَصْبَحْتُ وَمَا أُرِيدُ الصَّوْمَ وَمَا أَكَلْتُ مِنْ طَعَامٍ وَلَا شَرَابٍ مُنْذُ الْيَوْمِ وَلَأَصُومَنَّ يَوْمِي هَذَا. »❶

اور جہاں تک تعلق ہے بعض روایات کا جن میں دن کے بقیہ حصے پر روزے کا اطلاق ہوا ہے۔ سو یہ مجازی امر ہے۔ یعنی محض صورۃً اس کو روزہ قرار دیا گیا ہے، امر واقعہ اس طرح نہیں۔

فقیہ ابن قدامہ فرماتے ہیں:

«وَإِمْسَاكُ بَقِيَّةِ الْيَوْمِ بَعْدَ الْأَكْلِ لَيْسَ بِصِيَامٍ شَرْعِيٍّ، وَإِنَّمَا سَمَّاهُ صِيَامًا تَجَوُّزًا»❷

اور اگر کوئی شخص کھانے پینے کے بعد دن کے بعض حصے کا روزہ رکھ لے تو وہ اپنی نیت کے اعتبار سے ماجور ضرور ہے لیکن تکمیلی اجر کا مساہم نہیں ہوگا۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، فتح الباری ، بَابُ اِذَا نَوَی بِالنَّهَارِ صَوْمًا :ج:٤ ، ص:١٤١۔ اور المغنی:ج:٣، ص:٢٣۔٢٤)

رمضان کے روزے سے کیا کفارۂ قسم بھی معاف ہو جاتا ہے؟

سوال: اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جو شخص رمضان کے روزے رکھتا ہے۔ اس کے اللہ تعالیٰ پچھلے گناہ معاف کر دیتا ہے۔ کیا قسم کا کفارہ بھی رمضان کے روزے رکھنے سے معاف ہو جائے گا۔ یا کفارہ الگ ادا کرنا ہوگا۔

(نذیر احمد۔ اقبال ٹاؤن لاہور)

جواب: اہل علم اس بات پر متفق ہیں کہ فضائل سے جو گناہ معاف ہوتے ہیں، صغائر ہیں کبائر نہیں۔ لہٰذا کبیرہ گناہ کے لیے علیحدہ معافی اور توبہ ضروری ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ نُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا﴾ .

(النساء:٣١)

''اگر تم بڑے بڑے گناہوں سے جن سے تم کو منع کیا جاتا ہے اجتناب رکھو گے تو ہم تمہارے (چھوٹے چھوٹے) گناہ معاف کر دیں گے اور تمھیں عزت کے مکانوں میں داخل کریں گے۔''

❶ فتح الباری، ج:٤ ، ص:١٤١

❷ المغنی، ج:٣، ص:٢٣

اسی طرح ایک صحیح روایت میں ہے ایک جمعہ ادا کرنے سے گیارہ دن کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں بشرطیکہ انسان کبائر سے اجتناب کرے۔ بنا بریں شریعتِ اسلامیہ میں قسم کے کفارہ کی انواع سورۃ المائدۃ میں مستقل طور پر متعین ہیں لہٰذا جب تک اس انداز سے کفارہ کی ادائیگی نہیں ہوگی ادا نہیں سمجھا جائے گا۔ (هٰذَا مَا عِنْدِيْ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.)

رمضان کے آخری ایام میں قطر جانے والا عید اہل قطر کے ساتھ کرے گا؟

سوال: اس سال رمضان المبارک کا آغاز ہوا تو زید پاکستان میں مقیم تھا۔ چنانچہ اس نے رؤیتِ ہلال کمیٹی کے اعلان کے مطابق روزے رکھنے شروع کیے جو کہ دو فروری سے شروع ہوئے۔ ۲۵ فروری کو زید اپنے والدین کے پاس قطر چلا گیا۔ قطر میں روزے ۳۱ جنوری سے شروع ہوئے تھے۔ اور اس طرح یکم مارچ کو عید ہوئی۔ یوں جب قطر میں عید ہوئی تو زید کے کل روزے ۲۸ ہوئے تھے۔ جب کہ قطر میں کل روزے ۳۰ ہوئے اور پاکستان میں ۲۹ ہوئے۔ اب اس مسئلہ میں زید کے لیے کیا حکم ہے کہ قطر کے مطابق ۲ روزے مزید رکھے یا پاکستان کے مطابق ایک روزہ مزید رکھے یا پھر کوئی بھی روزہ نہ رکھے۔ (سائل) (۱۷ جنوری ۱۹۹۶ء)

جواب: رمضان کے اخیر میں پاکستان سے قطر جانے والا انسان بلا ریب عید اہل قطر کے ساتھ کرے گا۔ بعد ازاں دو روزوں کی قضا بھی اہل قطر کے حساب سے دے تاکہ مقامی حضرات سے اختتامِ رمضان کی حسابی موافقت مکمل طور پر ہو سکے۔

کیا فرضی روزوں کی قضا ماہِ شوال میں درست ہے؟

سوال: کیا فرضی روزوں کی قضا ماہِ شوال میں درست ہے یا منع ہے؟ (محمد صدیق تلیاں، ایبٹ آباد) (۱۸ جون ۱۹۹۹ء)

جواب: فرضی روزوں کی قضا ماہِ شوال میں درست ہے ممانعت کی کوئی وجہ نہیں۔

یومِ عاشورہ کا روزہ نو اور دس تاریخ کو ہی رکھا جائے؟

سوال: یومِ عاشورہ کا روزہ نو اور دس تاریخ ہی کا ضروری ہے یا دس اور گیارہ تاریخ کا بھی رکھ سکتے ہیں یا کہ صرف دس تاریخ کا بھی روزہ رکھ سکتے ہیں۔ اس کی بھی وضاحت فرمائیں۔ اگر کوئی نو، دس کا نہ رکھ سکے تو گیارہ تاریخ کی وضاحت کریں۔ (ایک سائل) (۲۶ ستمبر ۱۹۹۷ء)

جواب: کوشش کرنی چاہیے کہ دسویں محرم کے روزے کے ساتھ نویں یا گیارہویں کو ملا لیا جائے۔ اگر کسی وقت نہ بھی مل سکے تو پھر بھی جواز ہے۔ لیکن اکیلے گیارہ تاریخ کا روزہ ثابت نہیں۔

عاشورہ کا روزہ کس تاریخ کو رکھا جائے؟ نیز عاشورہ کا روزہ ایک ہے یا دو؟

سوال: یومِ عاشورہ کے روزے کے بارے میں صراحت فرمائیں کہ یہ روزہ دو دن کا ہے یا ایک دن کا؟ اور اگر دو دن کا ہے تو کونسے دو دن کا؟ نیز زید کی دلیل ہے کہ دس کو تو یہود رکھتے تھے، اس لیے دس تو بالکل منسوخ ہے۔ البتہ نو اور

گیارہ محرم میں اختیار ہے۔ یعنی زید کے نزدیک روزہ ایک ہے دو نہیں۔ کیا حدیث کے الفاظ یہ ثابت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں دس محرم کے ساتھ ایک اور روزہ رکھوں گا یا پھر صرف دوسرے روزے کا ذکر کیا تھا؟

(عزیز الرحمٰن اسلام آباد) (۳۰ اگست ۱۹۹۶ء)

جواب: مسئلہ ہذا میں اہل علم کا سخت اختلاف ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ مکی زندگی اور مدنی زندگی کے بیشتر حصہ میں نبی ﷺ صرف دسویں محرم کا روزہ رکھتے تھے۔ بعد ازاں یہود کی مخالفت پر کمربستہ ہوئے تو فرمایا: آئندہ سال اگر زندگی نے ساتھ دیا تو نویں محرم کا روزہ رکھوں گا لیکن محرم کی عملی تکمیل سے پہلے آپ ﷺ وفات پا گئے۔ یہاں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ دسویں کا روزہ نویں تاریخ کی طرف منتقل سمجھا جائے۔ دوسرا یہ کہ نویں تاریخ کو دسویں کے ساتھ ملا کر دو روزے رکھے جائیں۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس امر کی وضاحت سے قبل آپ کا انتقال ہو گیا۔ احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ دو روزے رکھے جائیں۔ اس بناء پر عاشوراء کے روزے کی تین صورتیں ہوئیں، (۱) صرف دسویں کا روزہ رکھا جائے۔ (۲) دسویں کے ساتھ نویں کو ملایا جائے۔ (۳) نویں اور گیارہویں کا روزہ رکھا جائے۔

میرے خیال میں دسویں کے روزے کو کلیۃً منسوخ قرار دینا درست فعل نہیں کیوں کہ بنیادی طور پر مقصود تو یہود کی مخالفت ہے سو وہ نویں یا گیارہویں کا روزہ ساتھ ملانے سے حاصل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس کی تائید ''مسند احمد'' کی روایت سے ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عاشورا کا روزہ رکھو اور ایک روزہ اس سے پہلے یا بعد رکھ کر یہود کی مخالفت بھی کرو۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَهَذَا كَانَ فِي آخِرِ الْأَمْرِ .»

یعنی ''یہ آپ ﷺ کا آخری حکم ہے۔'' نیز فرماتے ہیں:

«بَلْ تَأَكُّدُ اسْتِحْبَابِهِ بَاقٍ وَلَا سِيَّمَا مَعَ اسْتِمْرَارِ الِاهْتِمَامِ بِهِ حَتَّى فِي عَامِ وَفَاتِهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَيْثُ يَقُولُ لَئِنْ عِشْتُ لَأَصُومَنَّ التَّاسِعَ وَالْعَاشِرَ وَلِتَرْغِيبِهِ فِي صَوْمِهِ وَأَنَّهُ يُكَفِّرُ سَنَةً وَأَيُّ تَأْكِيدٍ أَبْلَغُ مِنْ هَذَا .»[1]

امام شافعی رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب احمد رحمہ اللہ، اسحاق رحمہ اللہ اور دیگر کئی ایک اہل علم اس بات کے قائل ہیں:

«يُسْتَحَبُّ صَوْمُ التَّاسِعِ وَالْعَاشِرِ جَمِيعًا .»[2]

[1] فتح الباري :٤/ ٢٤٧

[2] شرح النووی:٧/ ١٢

''یعنی مستحب یہ ہے کہ نویں اور دسویں تاریخ کا اکٹھا روزہ رکھا جائے۔''

چند سطور بعد رقم طراز ہیں:

« قَالَ بَعْضُ الْعُلَمَاءِ وَلَعَلَّ السَّبَبَ فِی صَوْمِ التَّاسِعِ مَعَ الْعَاشِرِ أَنْ لَا یَتَشَبَّهَ بِالْیَهُودِ فِی إِفْرَادِ الْعَاشِرِ.»

یعنی ''بعض علماء نے کہا ممکن ہے دسویں کے ساتھ نویں کا روزہ رکھنے کا سبب یہ ہو کہ اکیلا دسویں کا روزہ رکھنے سے یہود سے مشابہت پیدا نہ ہو جائے۔''

باقی نو اور گیارہویں میں سے ایک تاریخ کا تعین کرنا کسی روایت سے واضح نہیں جب کہ دسویں تاریخ کی اہمیت اپنی جگہ مسلمہ ہے اس کو کسی صورت ترک نہیں کیا جا سکتا۔ نیز دو روزے رکھنے کی تصریح پہلے ہو چکی اور جن احادیث میں اس کے لیے لفظ ترک استعمال ہوا ہے۔ اس سے مقصود صرف وجوب کا ترک ہے۔ استحباب کا نہیں۔ اور پھر دو روزے رکھنے کی تصریح ''مسند احمد'' کی سابقہ روایت کے علاوہ طحاوی اور بیہقی میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ماثور ہے:

«صُومُوا التَّاسِعَ وَالْعَاشِرَ وَخَالِفُوا الْیَهُودَ.»[1]

یعنی ''یہود کی مخالفت کرو۔ نویں اور دسویں کا روزہ رکھو۔''

صاحب ''المرعاۃ'' فرماتے ہیں: اس سے ''صحیح مسلم'' میں وارد ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ اس جواب کی طرف بیہقی کا رجحان ہے۔ (۲۷۱/۳)

پھر علامہ ابن قیم رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہیں۔ صرف نویں کا روزہ رکھنے کا وہ قائل ہے جس کا فہم آثار کو سمجھنے اور الفاظِ حدیث اور اس کے طرق کا تتبع کرنے سے قاصر ہے۔ یہ بات لغت اور شرع کے اعتبار سے بعید ہے۔[2]

پھر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

« وَ عِنْدِی مَرَاتِبُ صَوْمِ عَاشُوْرَاءَ الثَّلَاث هٰکَذَا أَدْنَاهَا أَن یَّصُوْمَ الْعَاشِرَ فَقَطْ، وَ فَوْقَه أَن یَّصُوْمَ الحَادِی عَشَرَ مَعَهُ وَفَوْقَهُ أَن یَّصُومَ التَّاسِعَ وَالعَاشِرَ، وَإِنَّمَا جَعَلْتُ هٰذِهِ فَوْقَ الْمَوْتَیْتَیْنِ الْاَوْلَیَیْنِ لِکَثْرَةِ الْاَحَادِیْثِ فِیْهَا وَاللّٰهُ تَعَالٰی أَعْلَمُ.» (۲۷۳/۳)

مزید تفصیل کے لیے مرعاۃ المفاتیح کے مشارٌ الیہ مقام کو ملاحظہ فرمائیں۔

---

[1] سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ عَاشُورَاءُ أَیُّ یَوْمٍ، رقم:۷۵۵، السنن الکبریٰ للبیهقی، بَابُ صَوْمِ یَوْمِ التَّاسِعِ، رقم:۸۴۰۴

[2] المرعاۃ:۳/ ۲۷۲

یوم عاشورہ کے روزے والی حدیث پر وارد اشکال کا جواب

سوال : عاشورہ کے روزے کے بارے میں جو روایت وارد ہوئی ہے اس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ جب ہجرت کرکے مدینہ آئے تو یہود کو روزہ رکھتے ہوئے دیکھا......الخ

آخر میں یہ ہے کہ حضور ﷺ نے آئندہ سال نئے عزم کا اظہار فرمایا مگر زندگی نے ساتھ نہ دیا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہود نے حضور ﷺ کی مدینہ آمد کے کافی سال بعد یہ روزے رکھنے شروع کیے تھے؟ اور اگر وہ پہلے سے رکھتے تھے تو حضور ﷺ تو مدینہ میں کئی سال زندہ رہے پھر آئندہ سال تک زندہ نہ رہنے سے کیا مراد ہے؟ اس ترتیب کو واضح فرمائیں؟ (عزیز الرحمٰن اسلام آباد) (۳۰ اگست ۱۹۹۶ء)

جواب : صورتِ سوال میں مشارٌ الیہ روایت ایک نہیں بلکہ دو ہیں۔ پہلی کا تعلق مدنی ابتدائی دَور سے ہے اور دوسری کا آخری دَور سے ہے۔ پہلی کے الفاظ یوں ہیں:

«قَدِمَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَدِينَةَ، فَوَجَدَ الْيَهُودَ يَصُومُونَ يَوْمَ عَاشُورَاءَ فَسُئِلُوا عَنْ ذَلِكَ؟ فَقَالُوا :هَذَا الْيَوْمُ الَّذِي أَظْهَرَ اللهُ فِيهِ مُوسَى، وَبَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَى فِرْعَوْنَ، فَنَحْنُ نَصُومُهُ تَعْظِيمًا لَهُ، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :نَحْنُ أَوْلَى بِمُوسَى مِنْكُمْ فَأَمَرَ بِصَوْمِهِ.»[1]

اور دوسری کے الفاظ یوں ہیں:

« حِينَ صَامَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمَ عَاشُورَاءَ وَأَمَرَ بِصِيَامِهِ قَالُوا: يَا رَسُولَ اللهِ إِنَّهُ يَوْمٌ تُعَظِّمُهُ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَى فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :فَإِذَا كَانَ الْعَامُ الْمُقْبِلُ إِنْ شَاءَ اللهُ صُمْنَا الْيَوْمَ التَّاسِعَ قَالَ :فَلَمْ يَأْتِ الْعَامُ الْمُقْبِلُ، حَتَّى تُوُفِّيَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.»[2]

لہٰذا اس تفریق سے وارد اشکال خود بخود رفع ہو گیا۔

عرفہ کا روزہ کس دن کا رکھنا چاہیے؟

سوال : عرفہ کا روزہ کس دن کا رکھنا چاہیے؟ جب کہ نو ذوالحجہ کو سعودیہ میں دس ذی الحجہ کا دن ہوتا ہے۔ (ابوطاہر نذیر احمد، عبدالرشید۔ کراچی) (۲۳ فروری ۲۰۰۱ء)

---

[1] صحيح مسلم، بَابُ صَوْمِ يَوْمِ عَاشُورَاءَ، رقم:١١٣٠

[2] صحيح مسلم، بَابُ أَيِّ يَوْمٍ يُصَامُ فِي عَاشُورَاءَ، رقم:١١٣٤

جواب : روزہ عرفہ کے دن ہی رکھنا چاہیے جب سعودیہ میں یومِ عرفہ (یومِ حج) ہو، کیونکہ ساری اہمیت اُس دن کی ہے، تاریخ کی نہیں۔

ایک فتوے کے متعلق استفسار

سوال : ''الاعتصام'' کی جلد نمبر ۵۳ کے شمارہ نمبر ۷ (۲۳ فروری تا یکم مارچ ۲۰۰۱ء) کے ص:۱۱ پر قربانی کے ضروری مسائل: سوال ہے کہ عرفہ کا روزہ کس دن رکھنا چاہیے؟ تو آپ نے سعودیہ کے یوم حج کو معتبر قرار دیا ہے۔ اس پر گزارش ہے کہ:

یہ بات تب ممکن ہے کہ پوری امت مسلمہ کی رؤیت ہلال ایک ہی ہو۔ عام حالات میں ہمارا یکم رمضان المبارک ہمارا یوم النحر (عید قربان) رمضان المبارک کی طاق راتیں (شب قدر) آخری عشرہ (اعتکاف) عید الفطر، عید الاضحیٰ طرح کی تمام تر عبادات جو تاریخ (مہینہ و دن) یا وقت کے اعتبار سے مقرر ہیں ہر صورت سعودیہ سے مختلف ہیں تو اس میں کیا حرج ہے؟ کیا ان میں مطابقت ضروری نہیں ہے؟ یوم عرفہ میں مطابقت کیونکر ضروری ہے؟ اگر ضروری ہے تو دوسری عبادات میں مطابقت کو مقدم کیوں نہیں سمجھا جاتا؟ (حافظ محمد اسحاق۔ خانقاہ ڈوگراں، شیخوپورہ) (۲۸ ستمبر ۲۰۰۱ء)

جواب : اصل بات یہ ہے کہ یوم عرفہ کے روزے کا تعلق وقت اور جگہ دونوں سے ہے۔ اس بناء پر اعتبار ان اوقات کا ہو گا جن میں حاجی عرفات میں وقوف کرتا ہے۔ اگر چہ حاجی کے لیے روزہ رکھنا غیر درست ہے اور جہاں تک سوال میں ذکر کردہ دیگر عبادات و معاملات کا تعلق ہے سو یہ صرف زمانے کے متعلق ہیں۔ لیل ونہار کی گردش سے ان کے اوقات بدلتے رہتے ہیں، مثلاً سورج کھڑا ہو تو کوئی نہیں کہتا مغرب کا وقت ہو گیا لیکن جس مقام پر بالفعل غروب ہو چکا ہے وہاں نماز کی ادائیگی ضروری ہے۔ اس طرح کبھی کسی نے یہ نہیں کہا سعودی عرب میں حج گزشتہ روز ہو چکا مگر ہمارا حج کل ہے کیونکہ ہمارے ہاں ذوالحجہ کی نو تاریخ کل ہے سب یہی کہیں گے حج ہماری آٹھویں اور سعودیہ کی نویں تاریخ کو ہو چکا ہے۔ لہٰذا اعتبار سعودیہ کی نو تاریخ کا ہوا کیونکہ یہ واقعہ کے مطابق ہے جب کہ ہماری نویں تاریخ حقائق کے منافی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دیگر امور کو حج پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔

سحری وافطاری سے متعلق مسائل

روزہ کی نیت کے الفاظ اور افطاری کی مشارٌ الیہ دعائیں ثابت ہیں یا نہیں؟

سوال : روزہ رکھنے کی نیت دعا «وَ بِصَوْمِ غَدٍ نَوَيْتُ مِنْ شَهْرِ رَمَضَانَ » اور اسی طرح روزہ افطار کرتے وقت پڑھی جانے والی معروف دعا۔ «اَللّٰهُمَّ لَكَ صُمْتُ وَ بِكَ آمَنْتُ وَ عَلَيْكَ تَوَكَّلْتُ وَ عَلٰى رِزْقِكَ

اَفْطَرْتُ» کسی حدیث صحیح سے ثابت ہے یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔ والسلام

(سائل حافظ محمد منیر جاوید، وڈانہ) (۹ فروری ۱۹۹۶ء)

جواب : اوّل الذکر دونوں دعاؤں کے بارے میں علامہ ملا علی قاری حنفی نے ''المرقاۃ'' میں اس بات کی تصریح کی ہے کہ:

''شرع میں ان کا کوئی اصل نہیں اگرچہ معنی اس کا درست ہے۔ اسی طرح «وَ عَلَيْكَ تَوَكَّلْتُ لِصَوْمِ غَدٍ نَوَيْتُ» زبانی نیت کرنا بدعت حسنہ ہے۔''

مذکور عبارت پر نقد کرتے ہوئے صاحب ''المرعاۃ'' رقمطراز ہیں:

''نماز روزہ کے لیے زبانی نیت کرنے کا کتاب وسنت اور کسی صحابی سے اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ یہ محض رائے اور بدعتِ سیّئہ ہے جس کا ترک ضروری ہے۔'' (۳/۲۲۶)

اور روزہ کی افطاری کے وقت آخر الذکر دعاء یعنی «اَللّٰهُمَّ لَكَ صُمْتُ...... الخ» ''سنن ابو داؤد'' اور ''المراسیل'' میں موجود ہے۔

صاحب ''المرعاۃ'' نے روایت ہذا کو فی الجملہ قابلِ تمسّک سمجھا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«وَ هُوَ مَعَ اِرْسَالِهٖ حُجَّةٌ فِيْ مِثْلِ ذٰلِكَ.»

البتہ علامہ البانی نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ ارواء الغلیل (۴/ ۳۸۔۳۹) واضح ہو کہ ''سنن ابی داؤد'' وغیرہ میں افطاری کے وقت پڑھنے کی ایک اور دعاء بھی مرقوم ہے جس کے الفاظ یوں ہیں:

« ذَهَبَ الظَّمَأُ وَابْتَلَّتِ الْعُرُوْقُ وَ ثَبَتَ الْاَجْرُ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ .»❶

علامہ موصوف نے حدیث ہذا کو حسن قرار دیا ہے۔ (ارواء الغلیل:۴/۳۹)

''منار السبیل'' اور ''الکلم الطیب'' وغیرہ میں مزید دعائیں بھی ابن عمر رضی اللہ عنہما اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایات میں موجود ہیں لیکن سندوں کے اعتبار سے وہ بھی ضعیف ہیں۔ علامہ البانی ''الکلم الطیب'' کے حواشی پر فرماتے ہیں:

«وَالثَّابِتُ فِيْ هٰذَا الْبَابِ ذَهَبَ الظَّمَأُ وَابْتَلَّتِ الْعُرُوْقُ وَ ثَبَتَ الْاَجْرُ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى .» (ص: ۹۲)

یعنی اس بیان میں جو شئے ثابت ہے وہ یہ دعا ہے: «ذَهَبَ الظَّمَأُ وَابْتَلَّتِ الْعُرُوْقُ وَ ثَبَتَ الْاَجْرُ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ تَعَالٰى .»❷ یعنی پیاس جاتی رہی اور رگیں تر ہو گئیں اور اجر وثواب یقیناً ثابت شدہ ہے۔'' ان شاء اللہ تعالیٰ

❶ سنن الدارقطنی، بَابُ الْقُبْلَةِ لِلصَّائِمِ، رقم:۲۲۷۹، سنن أبی داؤد، بَابُ الْقَوْلِ عِنْدَ الْإِفْطَارِ، رقم: ۲۳۵۷

❷ السنن الکبرٰی للنسائی، بَابُ مَا يَقُولُ إِذَا أَفْطَرَ، رقم:۳۳۱۵، سنن الدارقطنی، بَابُ الْقُبْلَةِ لِلصَّائِمِ، رقم: ۲۲۷۹

افطاری کی دعا والی حدیث کی استنادی حیثیت کیا ہے؟

سوال : افطاری کی دعا «اَللّٰھُمَّ لَکَ صُمْتُ وَ عَلٰی رِزْقِكَ اَفْطَرْتُ» کی استنادی حیثیت کیا ہے؟ بعض کتابچوں میں الفاظ «وَ بِكَ اٰمَنْتُ وَ عَلَیْكَ تَوَکَّلْتُ بِمَا قَدَّمْتُ وَ اَخَّرْتُ» بھی لکھے ہوتے ہیں۔ کیا یہ کسی حدیث کی کتاب میں ہیں؟ اگر نہیں ہیں تو کیوں لکھے جاتے ہیں؟ (صبغت اللہ صابر بلوچ، کراچی) (افروری ۲۰۰۲ء)

جواب : اصلاً یہ روایت ''سنن ابی داؤد'' میں مرسل ہے لیکن شواہد کی بناء پر اس کو تقویت حاصل ہے۔[1] اور «وَ بِكَ اٰمَنْتُ......الخ» کے الفاظ بے اصل ہیں، جہالت اور لاعلمی کی بناء پر لوگ یہ لکھتے ہیں۔

''الاعتصام'' کے ایک فتوے پر نظر (از عبداللہ محمدی کھیرا):

گزشتہ دنوں ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں ایک فتویٰ شائع ہوا جس کا عنوان یہ تھا تحقیق روایت «اَللّٰھُمَّ لَکَ صُمْتُ وَ عَلٰی رِزْقِكَ اَفْطَرْتُ»۔

فتویٰ یہ دیا گیا کہ دراصل یہ روایت ''سنن ابی داؤد'' میں مرسل ہے۔ لیکن شواہد کی بناء پر اس کو تقویت حاصل ہے۔

یہ بات ممکن ہے کہ اس فتوے کی بنیاد شیخ البانی رحمہ اللہ کی تحقیق پر ہو، کیونکہ شیخ البانی رحمہ اللہ نے صاحب ''مشکوٰۃ'' کے اسی قول پر «رَوَاهُ اَبُودَاؤدَ مُرْسَلًا» (ابوداؤد نے اس کو مرسل بیان کیا ہے) حاشیہ لگاتے ہوئے کہا ہے: «لٰكِنْ لَهُ شَوَاهِدُ یَقْوٰی بِهَا»

''لیکن اس کے شواہد ہیں جو اس کو تقویت پہنچاتے ہیں۔''

لیکن اس کے جو شاہد ہی سخت ضعیف ہیں اس وجہ سے اس کو تقویت نہیں ملتی۔

اب اس حدیث کی مفصل تخریج اور اس کے شواہد کی تفصیل ملاحظہ ہو۔ تاکہ آپ کو افطار کی اس دعا کا صحیح علم ہو۔ یہ روایت ''سنن ابی داؤد'' (رقم الحدیث: ۲۳۵۸) مراسیل ابی داؤد (ص:۱۰۸) کتاب الزہد (رقم نمبر: ۱۴۱۰) ''مسند ابن ابی شیبہ'' (ج:۳،ص۱۰۰) اور ''سنن بیہقی'' (ج:۴،ص:۲۳۹) میں حصین بن عبدالرحمٰن کے واسطے سے معاذ بن زہرہ سے مروی ہے۔ یہ روایت مندرجہ ذیل علتوں کی وجہ سے ضعیف ہے۔''

۱۔ **معاذ زھرہ**: ان کو معاذ ابوزہرہ بھی کہا گیا ہے۔ تابعی ہیں، بعض نے ان کو صحابہ میں شمار کیا ہے مگر یہ وہم ہے، دیکھئے ''تہذیب التہذیب'' (ج:۱۰،ص:۱۷۲) اور ''تقریب التہذیب'' (ج:۲،ص:۲۵۶)

تنبیہ : ''تقریب'' کے ایک نسخے میں کتابت کی غلطی کی وجہ سے معاذ بن زہیرہ چھپ گیا ہے۔ دراصل معاذ بن زہرہ ہے اور تابعی ہے، اس وجہ سے ان کی روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بلا واسطہ مرسل کہلائے گی اور مرسل روایت

[1] المشكاة المصابيح للالبانی(۱/ ٦٣) الفصل الثانی، رقم: ١٩٩٤

محدثین کے نزدیک ضعیف ہے۔

۲۔ معاذ کی ''ابن حبان'' کے علاوہ کسی اور نے توثیق نہیں کی اور ان سے صرف حصین بن عبدالرحمٰن نے روایت کی ہے۔ لہٰذا یہ مجہول (غیر معروف) راویوں کے زمرے میں آتے ہیں۔

۳۔ اس کی سند اور متن میں اختلاف ہے۔ سند میں اختلاف اس طرح ہے کہ ایک جماعت نے (جو ہشیم، ابن المبارک، مبشر بن قاسم اور محمد بن فضیل) پر مشتمل ہے۔ اسے حصین عن معاذ روایت کیا ہے، جب کہ سفیان ثوری نے اس کو حصین سے روایت کرتے ہوئے حصین اور معاذ کے درمیان ایک نامعلوم شخص کا واسطہ ذکر کیا ہے۔ ثوری کے طریق سے اس کو ابن السنی (۴۷۹) نے اور خطیب بغدادی نے ''تاریخ بغداد (۱۲/ ۹۵) میں روایت کیا۔

ثوری نے اس کو ان الفاظ میں روایت کیا ہے: «اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ أَعَانَنِی فَصُمْتُ، وَ رَزَقَنِیْ فَأَفْطَرْتُ.» اور یہ متن میں اختلاف ہوا۔

''تاریخ بغداد'' میں ان معاذ کو معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کہا گیا ہے جب کہ ابن السنی کے دو نسخوں (بتحقیق عبدالقادر عطاء وتحقیق سالم سلفی) میں صرف معاذ ہے ولدیت مذکور نہیں، مگر سلفی کے نسخے میں ''رضی اللہ عنہ'' بھی لکھا گیا ہے۔ گویا ان سے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ہی سمجھا گیا۔ ابن السنی کے تیسرے نسخے میں (جو بشیر محمد عیون کی تحقیق سے چھپا ہے) معاذ کے بعد بریکٹوں میں بن زہرہ لکھا ہوا ہے اور یہی صحیح ہے کیونکہ یہ معاذ، معاذ بن زھرہ تابعی ہے۔ معاذ بن جبل صحابی نہیں۔

امام نووی رحمہ اللہ نے ''الاذکار'' میں اس حدیث کو ''ابن السنی'' کے حوالے سے معاذ بن زھرہ ہی کے نام سے ذکر کیا ہے۔ ابن صاعد کہتے ہیں کہ یہ معاذ بن جبل نہیں بلکہ معاذ بن ابوزہرہ ہیں۔ اسی طرح حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "النکت الظراف" میں کہا ہے کہ بعض نے ان کو معاذ بن جبل سمجھا ہے، جو درست نہیں۔ اس حدیث کو عبدالعزیز بن مسلم القسملی نے بھی حصین بن عبدالرحمٰن سے روایت کیا ہے اور انھوں نے معاذ کی بجائے محمد بن معاذ کہا ہے اور یہ حدیث اسی طریق سے امام بخاری رحمہ اللہ نے ''التاریخ الکبیر'' (ج:۱ص:۲۲۷) میں روایت کی ہے۔ معاذ کی بجائے محمد بن معاذ کہنا عبدالعزیز کا وہم ہے۔ ان کے بارے حافظ ابن حبان کہتے ہیں کہ بعض اوقات ان کو وہم ہوتا ہے اور بہت بڑی غلطی کر جاتے ہیں۔ دیکھئے: ''تہذیب التہذیب'' (ج:۶ص:۳۱۸)

تنبیہ: ''ابن ابی شیبہ'' کے دو نسخوں میں اس حدیث کے راوی کا نام معاذ بن زھرہ کے بجائے ابوہریرہ ہے جو صحیح نہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اسی حدیث کو "النکت الظراف" میں ''ابن ابی شیبہ'' سے معاذ ہی کے نام سے ذکر کیا ہے۔ ''ابن ابی شیبہ'' طبع ہند میں جو غلطیاں ہیں وہی ''دار التاج بیروت'' کی طبع میں بھی ہیں۔

حاصل کلام: یہ حدیث معاذ بن زہرہ سے ہے اور ضعیف ہے۔ یہ دعا حدیث انس رضی اللہ عنہ اور حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔

حدیث انس رضی اللہ عنہ کو ''طبرانی'' نے المعجم الصغیر (ج:۲،ص:۵۱،۵۲)اور''الدعاء'' (ص نمبر:۹۱۸) میں روایت کیا ہے۔صغیر میں اس کے شروع میں بسم اللہ کا اور آخر میں ان الفاظ کا اضافہ بھی ہے:

«تَقَبَّلْ مِنِّیْ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْم»

مگر اس کی سند سخت ضعیف ہے۔اس میں دو علتیں ہیں:

۱۔ اسماعیل بن عمرو البجلی: یہ ضعیف ہے۔ اس کو ''ابو حاتم ابن عدی'' اور ''دارقطنی'' وغیرہ نے ضعیف کہا ہے۔ ملاحظہ ہو:میزان الاعتدال (ج:۱،ص:۲۳۹) ، دیوان الضعفاء(ج:۱،ص:۸۸)اور المغنی فی الضعفاء (ج:۱،ص:۸۵)

۲۔ اس حدیث میں اسماعیل بن عمرو کا استاد داؤد الزبرقان ہے۔ ذہبی رحمہ اللہ نے اس کے بارے میں ''الکاشف'' میں کہا ہے کہ «ضَعَّفُوْہ» یعنی یہ سخت ضعیف ہے۔کیونکہ « وَاہ بِمَرَّۃٍ لَیْسَ بِشَیْءٍ ضَعِیْفٌ جِدًّا »اور«ضَعَّفُوْہُ » وغیرہ سب ایک ہی درجے کے الفاظ ہیں۔دیکھئے''مقدمۃ میزان الاعتدال'' (ج:۱،ص:۴)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ راوی متروک ہے اور ازدی نے ان کو کذاب کہا ہے۔دیکھئے،تقریب،ص:۹۵۔

حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما کو طبرانی نے ''المعجم الکبیر'' (ج:۱۲،ص:۱۴) میں ''ابن السنی'' نے (۴۸۰) اور ''دارقطنی'' (ج:۲،ص:۱۸۵) نے روایت کیا ہے۔اور اس کی سند بھی سخت ضعیف ہے بلکہ موضوع ہے۔کیونکہ اس کی سند میں ایک راوی عبدالملک بن ہارون ہے۔یحییٰ بن معین نے اس کو''کذاب''ابو حاتم نے«متروك الحدیث ، ذَاهِب الحدیث» اور جوزجانی نے ''دجال کذاب'' کہا ہے۔سعدی نے ''دجال'' کہا ہے۔دیکھئے:الجرح والتعدیل (ج:۵،ص:۳۷٤) احوال الرجال لجوزجانی(ص:۷۷) اور دیوان الضعفاء للذهبی(ج:۲،ص:۱۲۸) اور ابن حبان نے کہا ہے کہ یہ حدیثیں گھڑنے والوں میں سے ہے۔[1]

ذہبی رحمہ اللہ نے ''میزان الاعتدال'' (ج:۴،ص:۲۸۵) میں اس کے باپ ہارون کے تذکرے میں اس کے بارے میں کہا ہے کہ:«اَمَّا اِبْنُہٗ عَبْدُالْمَلِكِ فَمَتْرُوْكٌ یَكْذِبُ.»''یعنی وہ متروک ہے اور جھوٹ بولتا تھا۔''

''الکاشف'' (ج:۳،ص:۱۸۹) میں ہارون کے ترجمہ میں کہا ہے:''اس کا بیٹا عبدالملک ہالک ہے۔''احمد، یحییٰ بن معین، ابو حاتم،ابن حبان اور دارقطنی نے ان پر سخت جرح کی ہے جیسا کہ ''میزان (ج:۲،ص:۶۶۶) میں ہے۔

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ اس کی سند سخت ضعیف ہے۔حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''نتائج الافکار'' میں اس کی سند کے بارے میں کہا ہے کہ «وَسَنَدُہٗ وَاہٍ جِدًّا.»اس کی سند انتہائی ضعیف ہے۔

ملاحظہ ہو:الفتوحات الربانیہ(ج:٤،ص:۳٤۱)

---

[1] المجروحین،ج:۲، ص:۱۳۳

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ان دونوں حدیثوں کی سندیں سخت ضعیف ہیں، اس وجہ سے شواہد بننے کے قابل نہیں۔ لہٰذا مذکورہ حدیث ضعیف ہے۔

تنبیہ: ''ابن السنی'' کے محقق بشیر محمد عیون نے ''معاذ بن زہرۃ'' کی حدیث کی تخریج میں مرسل کہنے کے بعد کہا ہے: ''مگر شواہد ہیں، جن کی بناء پر حدیث قوی ہو جاتی ہے۔ دیکھئے: ارواء الغلیل (نمبر: ۹۱۹) اس کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نے ''ارواء'' میں شواہد کی بناء پر اس حدیث کو قوی کہا ہے حالانکہ انھوں نے اس حدیث کو بھی ضعیف کہا ہے۔

(شکریہ از مفتی صاحب) (۱۵ اپریل ۲۰۰۲ء)

سوال: حالیہ جلد (۵۴) کے شمارہ نمبر ۵ کے صفحہ نمبر ۱۰ پر دعائے افطار «اَللّٰھُمَّ لَكَ صُمْتُ وَ عَلٰی رِزْقِكَ اَفْطَرْتُ» کو ''مشکوٰۃ بتحقیق الالبانی رحمہ اللہ'' (۱/۶۳) کے حوالے سے قوی قرار (ذکر) فرمایا۔ یعنی شواہد کی بناء پر (الاعتصام جلد ۵۴، شمارہ ۱۰ مجریہ یکم فروری ۲۰۰۲ء) مگر آپ کے شاگرد رشید حافظ عبدالرؤف سندھو صاحب نے اپنی تالیف ''القول المقبول فی تخریج وتعلیق صلوٰۃ الرسول'' (ص: ۶۷۷) میں مذکورہ بالا حدیث کے شواہد نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ حدیث مذکور ضعیف ہی ہے۔ شواہد بھی ایسے ہیں کہ روایت قوی نہیں بن سکتی۔ آپ مزید واضح فرمائیں۔

(آپ کا مخلص محمد صدیق، ایبٹ آباد) (۱۴ جون ۲۰۰۲ء)

جواب: واقعی یہ حدیث ضعیف ہے۔ الاعتصام میں عزیزم حافظ عبدالرؤف حفظہ اللہ سے منقول ایک ''تعاقب'' بھی شائع ہو چکا ہے جس کی بندہ نے تحسین وتائید کی ہے۔

افطاری کی دعا «ذَهَبَ الظَّمَأُ......الخ» افطاری سے پہلے پڑھی جائے یا بعد میں؟

سوال: افطاری کی دعا: «ذَهَبَ الظَّمَأُ وَابْتَلَّتِ الْعُرُوْقُ ......الحدیث» جس کو اہل علم نے حسن کہا ہے۔ یہ دعا کس وقت پڑھی جائے گی؟ یعنی معانی پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ افطاری کے بعد پڑھی جائے۔ مگر عموماً کہا جاتا ہے کہ یہ دعا افطاری سے پہلے پڑھی جائے۔ صحیح صورت سے آگاہ فرمائیں۔ شکریہ

(آپ کا مخلص محمد صدیق، ایبٹ آباد) (۱۴ جون ۲۰۰۲ء)

جواب: ہاں ظاہر یہی ہے کہ یہ دعا افطاری کے بعد پڑھی جائے، پھر دعائیہ کلمات بھی اس امر کی واضح دلیل ہے۔

کیا غروبِ آفتاب کے بعد افطار میں احتیاطاً کچھ تاخیر کی جا سکتی ہے؟

سوال: سحر وافطار کے مختلف کیلنڈروں میں ایک دو منٹ کا فرق پایا جاتا ہے۔ اگر غروب آفتاب کا ''صحیح ترین وقت'' معلوم ہو تو عین وقت پر روزہ افطار کر لیا جائے یا غروبِ آفتاب کے بعد چند منٹ ''احتیاط'' کی جائے۔ ایک دو منٹ کی ''احتیاط'' کیا وہم کے مترادف نہیں ہے؟ (والسلام عبدالحق، سنت نگر، لاہور) (۱۶ نومبر ۲۰۰۷ء)

جواب : غروب آفتاب کا یقین ہو جائے تو فوراً روزہ افطار کر لینا چاہیے، احتیاطاً ایک دو منٹ کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔ حدیث میں ہے:

« إِذَا أَقْبَلَ اللَّيْلُ مِنْ هَا هُنَا، وَأَدْبَرَ النَّهَارُ مِنْ هَا هُنَا، وَغَرَبَتِ الشَّمْسُ فَقَدْ أَفْطَرَ الصَّائِمُ »❶

روزے کی ابتداء کب ہوتی ہے؟ کیا رات غروبِ شمس کے ساتھ ہی شروع ہو جاتی ہے؟

سوال : ہمارے ساتھ ایک لڑکا رہتا ہے وہ کہتا ہے کہ قرآن میں ''سورۃ بقرہ'' میں ایک آیت ہے کہ ''روزہ پورا کرو رات تک'' جب کہ حدیث میں آتا ہے کہ سورج غروب ہوتے ہی روزہ افطار کرلو۔ لہٰذا ہم قرآن سے دلیل لیتے ہیں اور آپ لوگ سورج غروب ہوتے ہی روزہ افطار کر لیتے ہیں جو سراسر خلافِ قرآن ہے۔ اگر سورج غروب ہونے کو ہی رات کہتے ہیں تو پھر عشاء کی نماز سورج غروب ہوتے ہی کیوں نہیں پڑھتے؟ (او۔ سی۔ یو نجیب کیلانی) (۴ جولائی ۱۹۹۷ء)

جواب : غروبِ شمس کے ساتھ ہی رات شروع ہو جاتی ہے جس طرح کہ قرآنی نص سے واضح ہے اور حدیث نے اس امر کی وضاحت کر دی کہ رات کے آغاز میں روزہ افطار کرنا باعثِ فضیلت ہے اور جہاں تک عشاء کی نماز کا تعلق ہے۔ سو اس کا ٹائم غروبِ شفق سے لے کر آدھی رات تک اختیاری ہے۔ اس میں کمی وبیشی کرنا انسانی اختیار میں نہیں ایک مومن کے لیے از بس ضروری ہے کہ ہر لحہ شریعت کی سمع وطاعت میں رہے۔ جملہ خیرات کا منبع یہی ہے۔

« اَلْخَيْرُ فِي الاتِّبَاعِ وَالشَّرُّ كُلّ الشَّر فِي الْاِبْتِدَاعِ »

فقیہ ابن رشد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« فَإِنَّهُمُ اتَّفَقُوا عَلَى أَنَّ آخِرَهُ غَيْبُوبَةُ الشَّمْسِ لِقَوْلِهِ تَعَالَى ﴿ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ﴾ (البقرة:١٨٧) »❷

''یعنی اہل علم اس بات پر متفق ہیں کہ دن کا اخیر غروب شمس ہے۔ اللہ کے اس فرمان کی بناء پر کہ ''پھر روزہ (رکھ کر) رات تک پورا کرو۔''

روزہ کی افطاری غروبِ آفتاب پر یا رات ہونے پر کی جائے؟

سوال : ہمارے یہاں بعض لوگوں نے مخصوص لوگوں میں پمفلٹ تقسیم کیے جس میں یہ تحریر ہے:

''قرآن میں غروبِ آفتاب پر روزہ کھولنے کا حکم نہیں بلکہ رات ہونے پر کھولنے کا حکم ہے۔ غروب آفتاب

❶ متفق عليه، صحيح البخاري، بَابٌ: مَتَى يَحِلُّ فِطْرُ الصَّائِمِ، رقم:١٩٥٤، صحيح مسلم، بَابُ بَيَانِ وَقْتِ انْقِضَاءِ الصَّوْمِ وَخُرُوجِ النَّهَارِ، رقم:١١٠٠

❷ بداية المجتهد:١/ ٢٨٨

دن کے بارہویں حصے کا نام ہے۔ غروب آفتاب پر روزہ افطار کرنے کا مطلب، دن کے آخری حصے میں روزہ کھولنا ہے۔

«لیل» «غسق» سے شروع ہوتی ہے۔ جب مشرق کی جانب سرخی جاتی رہے اور سیاہی ادھر سے پھیل کر سر کے اوپر سے گزر جائے تو روزہ افطار کرلو۔'' مندرجہ بالا تحریر کا جائزہ لیجیے۔

(سائل: قاری عبدالرحمٰن صدیقی، لاہور) (۲۱ ستمبر ۲۰۰۷ء)

جواب: مدعی کا دعویٰ بڑا عجیب سا ہے آج تک کسی کو اس بے تکے فلسفہ کی موشگافی کی جرأت نہیں ہوسکی۔ ذوی العقول جانتے ہیں کہ سورج کے مغرب میں غروب ہوجانے کا نام غروبِ آفتاب ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ ﴾ (الکهف:۸٦)

''تو نے اسے پایا کہ ایک کیچڑ کی ندی میں ڈوب رہا تھا۔''

قرآنی آیت ﴿ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ﴾ کا مفہوم بھی یہی ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'' قرآن کی آیت اس بات کی متقاضی ہے کہ غروبِ شمس پر روزہ افطار کرنا شرعی حکم ہے جس طرح صحیحین کی حدیث میں ہے:

«إِذَا أَقْبَلَ اللَّيْلُ مِنْ هَا هُنَا، وَأَدْبَرَ النَّهَارُ مِنْ هَا هُنَا، وَغَرَبَتِ الشَّمْسُ فَقَدْ أَفْطَرَ الصَّائِمُ» ❶

''یعنی جب مشرق میں رات چھا جائے اور ادھر دن غروب ہو جائے تو روزے دار کی افطاری کا وقت ہوگیا۔''

اور ''حاکم'' وغیرہ میں ہے:

« لَا تَزَالُ أُمَّتِي عَلَى سُنَّتِي مَا لَمْ تَنْتَظِرْ بِفِطْرِهَا النُّجُومَ.» ❷

''میری امت ہمیشہ میری سنت پر قائم رہے گی جب تک اپنی افطاری میں ستاروں کے نکلنے کا انتظار نہ کرے۔''

یہ نصوص اور دیگر روایات اس بات پر دال ہیں کہ روزہ جلدی افطار کرنا چاہیے اور یہ کہنا کہ ''لیل'' ''غسق'' سے شروع ہوتی ہے محض ادعاء ہے حالانکہ غسق مطلق رات کے اندھیرے کو کہا جاتا ہے۔ جس میں وقت کی تخصیص نہیں ہاں البتہ عمر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں غسق کا ذکر ہے تاہم کثیر روایات کے مقابلہ میں یہ مرجوح ہے۔

❶ متفق علیه، صحیح البخاری، بَابٌ: مَتَى يَحِلُّ فِطْرُ الصَّائِمِ، رقم:۱۹۵٤، صحیح مسلم، بَابُ بَيَانِ وَقْتِ انْقِضَاءِ الصَّوْمِ وَخُرُوجِ النَّهَارِ، رقم:۱۱۰۰

❷ المستدرك على الصحيحن للحاكم، رقم:۱۵۸٤، نيل الاوطار، ج:٤، ص:۲٦۰

''غروبِ آفتاب کے آٹھ منٹ بعد سورج غروب ہوتا ہے'' کیا یہ بات درست ہے؟

سوال : سائنسی نقطہ نظر سے سورج کی پہلی کرن زمین پر آٹھ منٹ میں پہنچتی ہے۔ اسی لحاظ سے سورج کی آخری کرن غروبِ آفتاب کے بعد آٹھ منٹ ہی میں واپس ہو جاتی ہے۔ اخبار میں تحریر شدہ غروبِ آفتاب کے آٹھ منٹ بعد سورج غروب ہوتا ہے۔ کیا یہ بات درست ہے؟ (سائل: قاری عبدالرحمن صدیقی، لاہور) (۲۱ ستمبر ۲۰۰۷ء)

جواب : واضح ہو کہ امت مسلمہ صرف ظاہر کی مکلّف ہے۔ اس کے طریقہ تعلیم کی وضاحت انگلیوں اور پوروں پر بیان ہوتی ہے۔ مَاوَرَاءُ الْحِسّ امور کی یہ مکلّف نہیں عہد نبوت سے لے کر قرونِ مفضل اور بعد والے ادوار میں جملہ معاملات کو سادگی سے حل کیا گیا وہ لوگ ان الجھنوں سے مبرا تھے جس میں آج ہم پھنسے ہوئے ہیں ساری کی ساری خیر و برکت طریقہ سلف صالحین کی پیروی میں ہے اس سے ہٹ کر سوچ دین سے دوری کا باعث ہے۔ دین میں نئے نئے مسائل کھڑے کرنا تفرقہ بازی کا باعث ہے جس سے شریعت نے سختی سے روکا ہے۔ اَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهَا

مباحات و ممنوعاتِ روزہ

روزے کی حالت میں مسواک کرنا جائز ہے

سوال : کیا رمضان کے دنوں میں نماز ظہر کے بعد مسواک ناجائز ہے۔ (سائل) (۱۲ جون ۲۰۰۹ء)

جواب : رمضان میں مسواک ہر وقت کرنی جائز ہے ظہر سے پہلے ہو یا بعد۔ حدیث میں ہے، عقبہ بن عامر فرماتے ہیں:

« رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا لَا أُحْصِي يَتَسَوَّكُ وَهُوَ صَائِمٌ. » [1]

یعنی ''میں نے نبی ﷺ کو دیکھا کہ روزہ کی حالت میں کثرت سے مسواک کرتے۔''

یہ حدیث اپنے عموم کے اعتبار سے سب اوقات کو شامل ہے۔

گیلی یا خشک مسواک سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے؟

سوال : مسواک کرنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا کیا گیلی اور سوکھی مسواک دونوں کا ایک ہی حکم ہے؟

(محمد جہانگیر، ولد محمد اکرم ضلع میرپور) (۸ مئی ۱۹۹۸ء)

جواب : مسواک گیلی ہو یا خشک ہر دو طرح بحالتِ روزہ کرنی جائز ہے۔ عامر بن عقبہ کا بیان ہے، میں نے رسول اللہ ﷺ کو بے شمار دفعہ روزے کی حالت میں مسواک کرتے دیکھا ہے۔ [2]

---

[1] سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي السِّوَاكِ لِلصَّائِمِ، رقم: ۷۲۵

[2] مسند احمد و سنن أبی داؤد، بَابُ السِّوَاكِ لِلصَّائِمِ، رقم: ۲۳۶۴، و سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي السِّوَاكِ لِلصَّائِمِ، رقم: ۷۲۵، و قال حدیث حسن.

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی حدیثِ ہذا کو حسن قرار دیا ہے۔ یہ حدیث عموم کے اعتبار سے مسواک کی ہر حالت کو شامل ہے چاہے خشک ہو یا تر۔

اور ''صحیح بخاری'' کے ترجمۃ الباب میں ہے۔ ابن سیرین نے کہا: ''(روزے کی حالت میں) تر مسواک کا کوئی حرج نہیں۔ کہا گیا اس کا تو ذائقہ ہے۔ جواباً فرمایا: پانی کا ذائقہ بھی تو ذائقہ ہے۔ آپ اس سے کلی کرتے ہیں۔''❶

کیا ٹوتھ پیسٹ کے استعمال سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے؟

سوال: کیا ٹوتھ پیسٹ استعمال کرنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے؟ وضاحت سے بیان کریں۔

(آفتاب اقبال (ابوطلحہ) جہلم) (یکم مئی ۱۹۹۸ء)

جواب: روزہ نہیں ٹوٹتا۔ جب لکڑی کی ہر قسم کی مسواک سے خشک ہو یا تر، روزہ میں فرق نہیں آتا تو اس سے بھی روزہ نہیں ٹوٹتا بلکہ روزے کی حالت میں ہانڈی وغیرہ چکھی جاسکتی ہے بشرطیکہ بعد میں تھوک دیا جائے۔

صحیح بخاری، کتاب الصیام کے ترجمۃ الباب میں ہے:

«لَا بَأْسَ أَنْ يَتَطَعَّمَ الْقِدْرَ أَوِ الشَّيْءَ .»❷

روزے کی حالت میں دمہ کے مریض کے لیے سانس والے سپرے کا حکم

سوال: آج کل دَمہ کے مریض منہ میں ''اِن ہیلر'' کے ذریعے سپرے کرتے ہیں جس سے گیس منہ سے اندر جاتی ہے۔ اور سانس میں آسانی آجاتی ہے۔ آیا ایسے سپرے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے یا کہ نہیں؟

(محمد مسعود صابر خورشید کالونی۔ گجرات) (۱۹ جولائی ۱۹۹۶ء)

جواب: دمہ کے مریض کے لیے اضطراری حالت میں سپرے کا جواز ہے۔ اور اختیاری حالت میں پرہیز ضروری ہے۔ ﴿ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ﴾ (التغابن:١٦)

روزہ کی حالت میں ناجائز امور

کیا انجکشن لگوانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے؟

سوال: کیا انجکشن لگوانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے؟ اگر روزہ نہیں ٹوٹتا تو اس کی دلیل کیا ہے؟

(محمد جہانگیر پوٹھ شیرڈ یال میرپور کے۔اے) (۲۶ دسمبر ۱۹۹۷ء)

❶ صحيح البخاري، بَابُ اغْتِسَالِ الصَّائِمِ، قبل رقم: ١٩٣٠

❷ صحيح البخاري، بَابُ اغْتِسَالِ الصَّائِمِ، قبل رقم: ١٩٣٠

جواب : احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ روزہ کی حالت میں مطلقاً انجکشن نہ لگوایا جائے۔ کیونکہ حدیث میں ہے:

«وَبَالِغْ فِی الِاسْتِنْشَاقِ، إِلَّا أَنْ تَكُونَ صَائِمًا »[1]

''یعنی بحالتِ وضو ناک میں پانی چڑھانے میں مبالغہ کر، الّا یہ کہ تو روزہ دار ہو۔''

اس کی وجہ یہ ہے کہ خطرہ ہے پانی ناک کے راستہ حلق میں اتر جائے۔ حالانکہ عرفاً یہ کھانا پینا نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی طرح کوئی چیز معدہ میں چلی جائے اس سے روزہ کو نقصان پہنچ جاتا ہے۔ ٹیکہ میں دواء کے لطیف اجزاء کے متعلق خطرہ ہے کہ وہ مساموں کے راستہ سے معدہ میں آجائیں اور روزہ خطرہ میں پڑ جائے۔

(فتاویٰ اہلحدیث: ۲/۵۶۳)

البتہ اس بارے میں سعودی عرب کے ممتاز عالمِ دین شیخ عثیمین رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ بحالتِ روزہ صرف غذائی ٹیکہ نہیں لگوانا چاہیے، دوسرے کا کوئی حرج نہیں۔

روزے کی حالت میں ٹیکہ لگوایا جا سکتا ہے؟

سوال : کیا مریض روزہ کی حالت میں انجکشن (ٹیکہ) لگوا سکتا ہے؟ (سائل عبدالرزاق عام۔ پڈعیدن)

جواب : احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ روزہ کی حالت میں انجکشن نہ لگوایا جائے البتہ بحالت اضطراری غیر غذائی ٹیکہ کی گنجائش ہے۔

روزے کی حالت میں بطورِ دوا بھاپ ناک میں چڑھانا:

سوال : روزہ کی حالت میں بھاپ کی شکل میں ناک میں دوائی چڑھانے کا کیا حکم ہے؟

جواب : مسئلہ ہذا میں اہل علم کا اختلاف ہے میرے نزدیک راجح قول یہ ہے کہ بایں صورت روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ کیوں کہ دوا غیر طبعی طور پر معدہ میں سرایت کر جاتی ہے۔ حدیث میں جو کھانے پینے سے منع کیا گیا ہے اس سے مراد صرف عرفی کھانا پینا نہیں بلکہ ہر وہ شے جس سے معدہ متاثر ہو لہٰذا وہ ممنوع ہے۔

چناں چہ ایک حدیث میں بحالت روزہ وضو کے وقت ناک میں پانی ڈالنے میں مبالغہ کرنا منع آیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ خطرہ ہے کہ پانی ناک کے راستہ حلق میں اتر جائے۔ حالاں کہ یہ عرفاً پینا نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی طرح کوئی چیز معدہ میں چلی جائے اس سے روزہ متاثر ہو جاتا ہے۔ بھاپ کی صورت میں دوا کے لطیف اجزا کے متعلق خطرہ ہے کہ وہ مساموں کے ذریعہ معدہ میں آجائیں اور روزہ خطرہ میں پڑ جائے۔

---

[1] سنن ابن ماجه، الْمُبَالَغَةُ فِی الِاسْتِنْشَاقِ وَالِاسْتِنْثَارِ، رقم:٤٠٧

روزے کی حالت میں بیوی کا بوسہ لینا اور شرمگاہ سے رطوبت خارج ہونا

سوال: اگر کوئی آدمی روزے کی حالت میں اپنی بیوی کا بوسہ لے لے اور شدتِ جذبات کی وجہ سے دورانِ گفتگو شرمگاہ سے رطوبت خارج ہو جائے تو کیا روزہ کی قضا دینی پڑے گی؟ (عبدالباسط۔ نارنگ منڈی) (۱۶ جون ۲۰۰۰ء)

جواب: اہل علم کا صحیح ترین قول یہ ہے کہ مذی کے خارج ہونے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ اس کا خروج چاہے بیوی کے بوسہ کی وجہ سے ہو، یا دورانِ گفتگو شدتِ شہوت کی بناء پر ہر دو صورت میں روزہ نہیں ٹوٹتا۔

روزے کی حالت میں بیوی کے ساتھ لیٹنا اور انزال ہو جانے کی صورت میں کیا حکم ہے؟

سوال: اگر کوئی روزے کی حالت میں بیوی کے ساتھ لیٹ گیا محض لیٹنے اور مَس ہونے کی وجہ سے انزال ہو گیا تو کیا روزہ ٹوٹنے کی اس صورت میں قضا کے ساتھ کفارہ بھی ادا کرنا پڑے گا یا صرف قضا ہے۔

(عبدالباسط۔ نارنگ منڈی) (۱۶ جون ۲۰۰۰ء)

جواب: بحالتِ روزہ بیوی کے ساتھ کھیل کود کی صورت میں اگر منی خارج ہو جائے تو روزہ ٹوٹ جائے گا اور اس کی قضا دینا ہوگی۔ بایں صورت کفارہ نہیں دینا پڑے گا۔ اس کی ادائیگی صرف مجامعت کی شکل میں ہے تاہم اگر بحالتِ خواب احتلام ہو جائے یا غور وفکر کی وجہ سے منی خارج ہو جائے تو روزہ بھی نہیں ٹوٹے گا۔

روزہ کی حالت میں وظیفۂ زوجیت اور اس کا کفارہ

سوال: دونوں میاں بیوی روزہ سے ہوں اور خاوند اپنی بیوی پر واقع ہو جائے تو کفارہ کیا ہوگا؟

جواب: کفارہ ایک غلام آزاد کرنا ہے یہ نہ ہو تو دو ماہ کے پے در پے روزے رکھے جائیں۔ یہ بھی نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دیا جائے۔ [1]

کیا زخم پر دوائی لگانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے:

سوال: میرے پاؤں پر ریڑھے کا پہیہ چڑھ گیا تھا۔ میں نے روزے کی حالت میں زخم پر ٹنکچر لگایا۔ قریبی مولوی صاحب نے کہا کہ کوئی حرج نہیں۔ سنا ہے کہ روزے کی حالت میں ٹیکہ بھی نہیں لگوانا چاہیے۔ اس لیے دل میں وسوسہ پیدا ہوا کہ اس سے روزہ برقرار رہا یا نہیں؟ آپ کتاب وسنت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں۔ (سائل) (۱۰ مئی ۲۰۰۲ء)

جواب: آپ کا روزہ درست ہے، دوبارہ رکھنے کی ضرورت نہیں۔ سعودی عرب کے شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ کا خیال ہے روزے کی حالت میں صرف غذائی ٹیکہ منع ہے جب کہ دوسرا جائز ہے۔

---

[1] صحیح البخاری، بَابُ إِذَا جَامَعَ فِي رَمَضَانَ، وَلَمْ يَكُنْ لَهُ شَيْءٌ، فَتُصُدِّقَ عَلَيْهِ فَلْيُكَفِّرْ، رقم:۱۹۳۶

سحری کا کھانا شروع کرتے ہی اگر اذان ہو جائے تو......؟

سوال : کھانا شروع ہی کیا تھا کہ اذانِ فجر سنائی دی۔ صرف ایک دو لقمے کھانے کی اجازت ہے یا ایسے وقت میں بھی پیٹ بھر کر کھانا کھانے کی اجازت ہے؟ (والسلام عبدالحق، سنت نگر، لاہور) (۱۶ نومبر ۲۰۰۷ء)

جواب : روزہ رکھنے والا ایسے عذر کی صورت میں اپنی حاجت پوری کرسکتا ہے، حدیث میں ہے:

«إِذَا سَمِعَ أَحَدُكُمُ النِّدَاءَ وَالْإِنَاءُ عَلَى يَدِهِ، فَلَا يَضَعْهُ حَتَّى يَقْضِيَ حَاجَتَهُ مِنْهُ»[1]

بواسیر کا علاج کرانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے؟

سوال : گیلے ہاتھ سے بواسیر کے مسح پر کانچ چڑھانے سے روزہ تو خراب نہ ہوگا؟ (ایک سائل) (۳۰ اپریل ۱۹۹۹ء)

جواب : اس فعل سے روزہ میں کمی واقع نہیں ہوتی۔

اعتکاف

کیا اعتکاف مسجد حرام اور مسجد نبوی سے خاص ہے؟

سوال : کیا اعتکاف کرنا صرف مسجدِ حرام اور مسجد نبوی کے ساتھ خاص ہے یا ہر مسجد میں کیا جا سکتا ہے؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اعتکاف صرف مسجد حرام اور مسجد نبوی میں ہی ہوسکتا ہے اور وہ ﴿وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ﴾ (البقرۃ:۱۸۷) سے مراد بھی یہی دو مساجد لیتے ہیں اور تثنیہ پر جمع کا اطلاق جائز سمجھتے ہیں۔

(محمد یونس، خوشاب) (۱۰ مئی ۲۰۰۲ء)

جواب : اعتکاف مسجد حرام اور مسجد نبوی کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ آیت ﴿وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ﴾ (البقرۃ:۱۸۷) کے عموم کی بناء پر (مساجد) کے لفظ کا دو پر اطلاق کرنا بلادلیل ہے۔ ''صحیح بخاری'' میں امام بخاری رحمہ اللہ کا فہم یہی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

« بَابُ الِاعْتِكَافِ فِي الْعَشْرِ الْأَوَاخِرِ، وَالِاعْتِكَافِ فِي الْمَسَاجِدِ كُلِّهَا لِقَوْلِهِ تَعَالَى :(وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ، ......الخ.»

''یعنی اللہ کے اس فرمان کی بنا پر جملہ مسجدوں میں اعتکاف کرنا جائز ہے۔''

''تفسیر کشاف'' میں آیتِ مذکورہ کے تحت مرقوم ہے کہ:

« فِيْهِ دَلِيْلٌ عَلٰى أَنَّ الِاعْتِكَافَ لَايَكُوْنُ اِلَّا فِي مَسْجِدٍ وَ أَنَّهُ لَا يَخْتَصُّ بِه مَسْجِدٌ

[1] سنن أبی داؤد، بَابٌ فِي الرَّجُلِ يَسْمَعُ النِّدَاءَ وَالْإِنَاءُ عَلَى يَدِهِ ، رقم:۲۳۵۰

دُوْنَ مَسْجِدٍ .»

''اس میں اس امر کی دلیل ہے کہ مسجد کے بغیر اعتکاف ناجائز ہے اور پھر کسی ایک مسجد کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ سب مسجدوں میں جائز ہے۔''

امام قرطبی رحمہ اللہ نے یہ بات سلف کی ایک جماعت سے نقل کی ہے۔ ❶

فقیہ ابن رشد نے کہا ہے:

«فَمَنْ رَجَّحَ الْعُمُوْمَ قَالَ فِی کُلِّ مَسْجِدٍ عَلٰی ظَاهِرِ الْاٰیَةِ.» ❷

''جس نے عموم کو ترجیح دی اس نے کہا کہ آیت کے ظاہری مفہوم پر ہر مسجد میں اعتکاف کا جواز ہے۔''

کیا اعتکاف مساجد ثلاثہ سے مخصوص ہے؟

سوال: بعض سلفی بھائیوں سے سنا ہے کہ اعتکاف ہر مسجد میں نہیں ہے۔ صرف تین مساجد میں اعتکاف سنت بتاتے ہیں اور بیہقی اور طحاوی کا حوالہ دیتے ہیں کہ لَا اِعْتِکَافَ اِلَّا فِی ثَلٰثَةِ مَسَاجِدَ اور کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ حدیث مذکورہ کے حوالہ سے قرآن کے عام حکم کو خاص کرتے ہیں۔

(فیض محمد بن مولا داد، کوٹ اسماعیل زئی گڑھی کپورہ تحصیل وضلع مردان) (۱۲ مارچ ۱۹۹۳ء)

جواب: سوال میں مذکور روایت ''سنن کبریٰ بیہقی'' (ص:۳۱۶، ج:۴) میں بایں الفاظ ہے:

« لَا اعْتِکَافَ إِلَّا فِی الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ » أَوْ قَالَ : إِلَّا فِی الْمَسَاجِدِ الثَّلَاثَةِ » ❸

یعنی ''اعتکاف صرف مسجد الحرام میں ہے یا یوں فرمایا صرف تین مسجدوں میں ہے۔''

اور منتقی الاخبار میں بحوالہ ''سنن سعید بن منصور'' روایت کے الفاظ یوں ہیں:

«لَا اِعْتِکَافَ اِلَّا فِی الْمَسَاجِدِ الثَّلَاثَة اَو قَالَ فِی مَسْجِدِ جَمَاعَةٍ »

''اعتکاف صرف تین مسجدوں میں ہے یا فرمایا اعتکاف اس مسجد میں ہے جہاں نماز باجماعت کا اہتمام ہو۔''

امام شوکانی ''نیل الاوطار'' (ص:۲۸۴، جزء:۴) میں فرماتے ہیں لیکن ''ابن ابی شیبہ'' نے روایت ہذا کا مرفوع حصہ بیان نہیں کیا۔ صرف حذیفہ رضی اللہ عنہ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی گفتگو پر اکتفا کیا ہے۔ اس کے الفاظ یوں ہیں:

« إِنَّ حُذَیْفَةَ جَاءَ إِلَی عَبْدِ اللّٰهِ فَقَالَ : أَلَا أُعْجِبُكَ مِنْ قَوْمٍ عُکُوفٌ بَیْنَ دَارِكَ وَ دَارِ الْأَشْعَرِیِّ، یَعْنِی الْمَسْجِدَ، قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ : فَلَعَلَّهُمْ أَصَابُوا وَأَخْطَأْتَ.» ❹

❶ تفسیر قرطبی: ۲/ ۳۳۳ ❷ بدایة المجتهد: ۱/ ۳۱۳

❸ السنن الکبریٰ للبیهقی، بَابُ الِاعْتِکَافِ فِی الْمَسْجِدِ، رقم: ۸۵۷٤

❹ نیل الاوطار، رقم: ۱۷٦۸

''یعنی حذیفہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آیا کہا کیا میں تجھے تعجب والی بات نہ بتاؤں، کچھ لوگ تیرے اور اشعری کے گھر کے درمیان یعنی مسجد میں اعتکاف بیٹھے ہیں جواباً عبد اللہ نے کہا ممکن ہے ان کا فعل درست ہو (روکنے میں) تجھ سے غلطی سرزد ہوئی ہو۔''

پھر علامہ موصوف رقمطراز ہیں:

« فَهٰذَا يَدُلُّ عَلَى أَنَّهُ لَمْ يَسْتَدِلَّ عَلَى ذٰلِكَ بِحَدِيثٍ عَنِ النَّبِيِّ -صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ -وَعَلَى أَنَّ عَبْدَ اللَّهِ يُخَالِفُهُ وَيَجُوزُ الِاعْتِكَافُ فِي كُلِّ مَسْجِدٍ، وَلَوْ كَانَ ثَمَّ حَدِيثٌ عَنِ النَّبِيِّ -صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ -مَا خَالَفَهُ، وَأَيْضًا الشَّكُّ الْوَاقِعُ فِي الْحَدِيثِ مِمَّا يُضْعِفُ الِاحْتِجَاجَ أَحَدَ شِقَّيْهِ.»

یعنی ''اس سے معلوم ہوا کہ حذیفہ کا استدلال حدیث رسول ﷺ پر مبنی نہیں تھا۔ اور اسی بناء پر بھی کہ عبد اللہ ان کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اور ہر مسجد میں اعتکاف کے جواز کے قائل ہیں اور اگر کوئی مرفوع حدیث نبی ﷺ سے موجود ہوتی تو عبداللہ مخالفت نہ کرتے۔ اور اسی طرح حدیث میں واقع شک بھی ایک طرف استدلال کو کمزور کرتا ہے۔''

نیز حافظ ابن حجر رحمہ اللہ جیسے عظیم محدث نے ''فتح الباری'' (ج:۴،ص:۲۷۲) میں حذیفہ کا قول نقل کیا ہے کہ اعتکاف تین مساجد سے مخصوص ہے لیکن بطورِ استدلال یہ روایت نقل نہیں کی حالانکہ مقام کا تقاضا تھا اس کو بیان کیا جاتا ایسے موقع پر مستدل کی موجودگی کے باوجود ذکر نہ کرنا۔ محدثین کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا بالخصوص جب کہ امیر المومنین فی الحدیث بخاری نے اپنی ''صحیح'' میں بایں الفاظ تبویب قائم کی ہو۔

« بَابُ الِاعْتِكَافِ فِي الْعَشْرِ الْأَوَاخِرِ، وَالِاعْتِكَافِ فِي الْمَسَاجِدِ كُلِّهَا . لِقَوْلِهِ تَعَالَى ﴿ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ﴾ (البقرة:۱۸۷) .»

یہ امر تو مزید اہتمام کا متقاضی تھا کہ روایت ہذا کو مقامِ بحث میں ذکر کیا جاتا اِذْ لَيْسَ فَلَيْسَ۔ بنا بریں اس روایت سے قرآن کے عموم ﴿وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ﴾ کی تخصیص کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جامع مسجد میں اعتکاف بیٹھنا مسنون عمل ہے؟

سوال : جامع مسجد میں اعتکاف پر بیٹھنا مسنون عمل ہے۔ آیا جامع مسجد سے مراد وہ مسجد ہے جس میں باقاعدہ جمعہ ہوتا ہو تو ایسی مسجد جس میں جمعہ نہ ہو کیا اس میں اعتکاف ہوسکتا ہے۔ (سائل) (۱۶ مارچ ۲۰۰۱ء)

جواب : جامع اس مسجد کو کہا جاتا ہے جس میں جمعہ ہوتا ہو امام بخاری اس بات کے قائل ہیں کہ اعتکاف ہر مسجد میں ہو

سکتا ہے۔

''صحیح بخاری'' کی تبویب میں رقمطراز ہیں:

« بَابُ الِاعْتِكَافِ فِي الْعَشْرِ الْأَوَاخِرِ، وَالِاعْتِكَافِ فِي الْمَسَاجِدِ كُلِّهَا. لِقَوْلِهِ تَعَالَى: ﴿وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ، ......الخ﴾.»

یعنی اعتکاف سب مسجدوں میں جائز ہے کیونکہ اللہ نے قرآنی آیت میں کسی مسجد کی تخصیص نہیں کی ظاہر یہی ہے۔
اور جس حدیث میں جامع کے الفاظ ہیں اس میں راوی لیث بن ابی سلیم ضعیف ہے۔ ملاحظہ ہو: نیل الاوطار (۲۸۱/۴)

اعتکاف کے لیے مسجد کا ہال ضروری ہے؟

سوال: مسجد کا ہال ضروری ہے کہ اس میں مختص جگہ ہو یا دوسری چھت یا برآمدہ یا ملحقہ کمرہ جو مسجد سے بالکل ملا ہو جہاں اقامت اور اذان کی آواز باقاعدہ آتی ہو، وضاحت طلب ہے۔ (سائل) (۱۶ مارچ ۲۰۰۱ء)

جواب: وہ سارا ہال مسجد کہلاتا ہے جو اس کی وقفیت میں شامل ہو لیکن اعتکاف صرف مسجد کے اندر ہی ہوگا جہاں نماز ادا کی جاتی ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ﴾ (البقرۃ:۱۸۷)

کیا عورت گھر اعتکاف بیٹھ سکتی ہے؟

سوال: عورت کے اعتکاف کے لیے کیا حکم ہے؟ گھر میں اعتکاف بیٹھے یا نہ؟

(السائل ثناء اللہ محمد سموں منگیر یہ ضلع بدین سندھ) (۱۱ ستمبر ۱۹۹۲ء)

جواب: بلاتفریق مرد وزن اعتکاف کا محل ومقام صرف مسجد ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ﴾ (البقرۃ:۱۸۷)

نیز ازواجِ مطہرات کا اعتکاف بھی مسجد میں ہی ہوا کرتا تھا۔ (ملاحظہ ہو: کتاب الاعتکاف صحیح بخاری)

عورت اعتکاف کہاں بیٹھے مسجد میں یا گھر؟ (چند اعتراضات کا جائزہ)

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین کہ عورت کا گھر میں اعتکاف بیٹھنا جائز ہے یا نہیں؟ ایک دو جید علماء کی طرف سے یہ فتویٰ صادر ہوا ہے کہ عورت گھر میں اعتکاف نہیں کرسکتی۔ اس فتویٰ کی بناء پر کچھ کم علم لوگ یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ گھر میں عورت کا اعتکاف بیٹھنا گناہ اور بدعت ہے۔ اس ضمن میں مجھے خیال آیا کہ پوری تحقیق کرنا ضروری ہے کیونکہ اکثر عورتیں گھر میں اعتکاف کرتی آئی ہیں اور اب بھی کرتی ہیں۔ میرا علم چونکہ ناقص ہے۔ اس لیے ﴿فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (النحل:۴۳) کے تحت عرض کرتا ہوں۔

(۱) اللہ پاک نے قرآن پاک میں روزہ کے احکام بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ﴿وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ﴾ (البقرۃ:۱۸۷) ''اگر تم مسجدوں میں اعتکاف کرنے والے ہو تو رات کو بھی اپنی بیویوں سے مباشرت نہ کرو۔'' یہ حکم کہ مسجدوں میں ہی اعتکاف کرو! موجود نہیں ہے۔ جس میں ہم عورتوں اور مردوں کو برابر کا شامل کر سکیں۔ برعکس اس کے قرآن پاک میں فرض نماز کو باجماعت ادا کرنے کا حکم ﴿وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ﴾ (البقرۃ:۴۳) موجود ہے۔ جس میں مرد اور عورت دونوں شامل تھیں۔ مگر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ عورت کی نماز گھر میں بہتر ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہاں حضرت کا فرمان موجود ہے تو میرا مقصد بھی یہی ہے کہ فرضی نماز کے متعلق تو حکم ہوا کہ عورت کی نماز گھر میں بہتر ہے۔ مگر اعتکاف جو کہ نفلی عبادت ہے اس کے لیے عورت کو مسجد کی پابندی کا حکم کیوں؟ اور کس دلیل سے؟ یعنی قرآن پاک کی کس آیت کے ماتحت یا کس حدیث کے ماتحت۔

۱۔ ﴿وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ﴾ حکم نہیں ہے۔

۲۔ عورتوں کا مسجد میں ہی اعتکاف کرنا ذکر نہیں۔

۳۔ فرضی عبادت عورت کی گھر میں بہتر ہے۔ نفلی عبادت اعتکاف کے متعلق مسجد کی پابندی کیسے ہے؟ وضاحت فرمادیں۔

(۲) علاوہ ازیں میرے ذہن میں چند ایک سوالات آتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کے جوابات ملنے سے یہ مسئلہ واضح ہوسکتا ہے۔ اور حل ہوسکتا ہے۔

۱۔ امہات المومنین کا اپنے خاوند نبی اکرم ﷺ کے ساتھ مسجد میں اعتکاف کرنا صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ امہات المومنین کے علاوہ کتنی صحابیات مسجد میں اعتکاف کرتی رہیں۔ ان کی فہرست مل جاوے تو یہ مسئلہ ثابت ہو جائے گا کہ امہات المومین کی سنت پر کتنی صحابیات نے عمل کیا۔ اور یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ امہات المومنین کی سنت جاریہ سار یہ رہی۔

۲۔ حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ کی بیبیاں آپ کی وفات کے بعد بھی اعتکاف کرتی رہیں۔ اگر اس کی وضاحت مل جاوے کہ وہ آپ ﷺ کی وفات کے بعد بھی مسجد میں ہی کرتی رہیں تو بھی مسئلہ صاف ہوسکتا ہے۔ باوجود اس کے کہ وہ تو امہات المومنین تھیں۔

۳۔ نبی کریم ﷺ کا اگر فرمان مل جاوے کہ عورتیں بھی مسجد میں ہی اعتکاف کیا کریں؟

۴۔ اگر یہ کہا جائے کہ جس طرح نبی کریم ﷺ کی بیویاں اپنے خاوند کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ اگر کسی عورت کا خاوند مسجد میں معتکف ہو تو وہ اپنے خاوند کے ساتھ مسجد میں اعتکاف کرسکتی ہے ورنہ نہیں تو ہر عورت کو مسجد میں اعتکاف کرنے پر ہم کس دلیل سے پابندی لگا سکتے ہیں۔ کسی صحابیہ نے خاوند کے بغیر مسجد میں اعتکاف کیا؟

۵۔ جب کہ عورت کی آواز غیر محرم نہ سنے، کے تحت نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اگر امام بھول جاوے تو عورت لفظ سُبْحَانَ اللہ نہ کہے بلکہ اُلٹے ہاتھ سے تالی لگائے تاکہ غیر محرم اُس کی آواز نہ سنے۔

۶۔ پردہ کی پابندی کے سلسلہ میں فرمایا کہ ان کی چادریں لٹکتی جائیں تاکہ کسی آدمی کی نظر ان کی ایڑیوں پر بھی نہ پڑے۔

۷۔ کیا اس مسئلہ میں ہمارے پاس قرآن پاک کا واضح حکم یا نبی کریم ﷺ کی واضح حدیث موجود ہے؟

(۳) علامہ وحید الزمان رحمہ اللہ جنھوں نے کتب احادیث کا ترجمہ اور تشریح کی ہے اور ہمارے اہل حدیث بھی اُس کو پسند کرتے ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا قول جو کہ ''سنن ابی داوٗد'' مترجم علامہ وحید الزمان جلد:۲، ص:۲۷۸ میں ہے۔ امام ابوداوٗد رحمہ اللہ نے لکھا ہے: '' جامع مسجد کی شرط کا راوی عبدالرحمٰن بن اسحاق کے علاوہ کوئی بھی قائل نہیں ہے۔''

۲۔ ''سنن ابی داوٗد'' مترجم علامہ وحید الزمان (جلد:۲، ص:۲۷۵) اعتکاف کے باب کی پہلی حدیث جس کے آخری الفاظ یہ ہیں: «ثُمَّ اعْتَكَفَ اَزْوَاجُهُ مِنْ بَعْدِهٖ» ❶

اس پر علامہ صاحب فائدہ میں لکھتے ہیں۔ (پھر اعتکاف کیا حضرت کی بیبیوں نے یعنی اپنے گھروں میں، اس لیے کہ فقہاء نے کہا ہے کہ مستحب ہے عورتوں کو کہ اعتکاف کریں مسجد البیت میں اور اگر مسجد البیت نہ ہو تو ایک جگہ کو گھر میں مسجد ٹھہرا کر اُس میں اعتکاف کریں۔ پس وہ ان کے حق میں حکم مسجد کا رکھتی ہے۔ بلاضرورت اُس میں سے نہ نکلیں۔

۳۔ بخاری شریف مترجم علامہ وحید الزمان جلد:۲ صفحہ ۳۴۲، باب اعتکاف النساء پر نمبر ۳ دے کر حاشیہ میں لکھا ہے (امام شافعی رحمہ اللہ نے ان مسجدوں میں جہاں جماعت ہوتی ہو۔ عورت کے لیے اعتکاف کرنا مکروہ جانا ہے۔ البتہ اگر اس کا خاوند بھی وہاں اعتکاف کرے تو اس کے ساتھ مکروہ نہیں۔ امام احمد رحمہ اللہ سے بھی ایسی ہی روایت ہے۔ اور اپنے گھر کی مسجد میں ہر طرح عورت کو اعتکاف کرنا درست ہے۔)

۴۔ بخاری شریف مذکور کے صفحہ ۳۴۰ پر حاشیہ نمبر ۲ میں علامہ صاحب نے محمد بن عمر مالکی کا حوالہ دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اعتکاف کے لیے مسجد شرط نہیں ہے۔

عرض: مندرجہ بالا حوالہ جات میں نے اس لیے تحریر نہیں کیے کہ یہ فیصلہ کن ہیں۔ صرف اس لیے تحریر کر دیے ہیں کہ ان کو بھی مدنظر رکھتے ہوئے آپ مدلل اور باحوالہ فتویٰ صادر فرمادیں۔

---

❶ صحيح البخاري، بَابُ الِاعْتِكَافِ فِي الْعَشْرِ الْأَوَاخِرِ، وَالِاعْتِكَافِ فِي الْمَسَاجِدِ كُلِّهَا، رقم:٢٠٢٦، سنن أبي داؤد، بَابُ الِاعْتِكَافِ، رقم:٢٤٦٢

نوٹ: حوالہ دیتے وقت کتاب کا نام اور باب اور صفحہ درج فرمادیں تا کہ آسانی سے تلاش کیا جا سکے نوازش ہو گی۔ منجانب (ماسٹر احمد دین۔کوٹ رادھا کشن) (۲۲ مارچ ۱۹۹۶ء)

جواب: سب سے پہلے اہل شرع کے ہاں اعتکاف کی تعریف ملاحظہ فرمائیں تا کہ اصل مسئلہ سمجھنے میں آسانی رہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

« اَلْمَقَامُ فِي الْمَسْجِدِ مِنْ شَخْصٍ مَخْصُوصٍ عَلَى صِفَةٍ مَخْصُوصَةٍ .»

''یعنی مخصوص شخص کا مخصوص صفت پر مسجد میں ٹھہرے رہنے کا نام اعتکاف ہے۔''

اس تعریف سے معلوم ہوا کہ شرعی اعتکاف صرف اس صورت میں اعتکاف قرار پائے گا جب وہ مصطلح حقیقی مسجد میں ہو مجازی جائے نماز کو مطلقاً اس سے کوئی عمل دخل نہیں۔اس طرح تو چند مخصوص مقامات کے علاوہ روئے زمین کو بعض احادیث میں جائے نماز قرار دیا گیا ہے۔ارشاد ہے:

« جُعِلَتْ لِيَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَ طَهُوْرًا .»

''بایں وجہ تو کیا ساری زمین پر اعتکاف کا جواز ہے؟ ہرگز نہیں۔''

اسی طرح محلِ نزاع میں سمجھ لینا چاہیے کہ کتاب وسنت کی نصوص میں جس مسجد کا ذکر ہے وہ اصطلاحی مسجد ہے جس کے اپنے احکام ومسائل وآداب ہیں،جن کی صراحت کتب احادیث کی ورق گردانی سے مل سکتی ہے۔وہاں جنبی آدمی اور حائضہ کو داخل ہونا ممنوع ہے۔دوسری طرف عورت کی گھر میں نماز کی افضلیت پر قیاس کرتے ہوئے اس کے لیے گھر میں اعتکاف کا جواز پیدا کرنا بھی غیر معقول بات ہے تو کیا خیال ہے۔مرد کی نفلی نماز بھی تو گھر میں افضل ہے جب کہ اعتکاف بھی غیر واجب ہے۔پھر تو مردوں کے لیے بھی گھر میں اعتکاف بیٹھنے کا جواز ہونا چاہیے شاید کہ اس بناء پر فقیہ محمد بن عمر بن لبابہ مالکی اس بات کے قائل ہو گئے کہ اعتکاف کے لیے مسجد کا وجود شرط نہیں۔

اس بارے میں یقیناً آپ کا جواب بھی نفی میں ہوگا تو اس مذہب کو محض نقل کر دینا آپ کے لیے فائدہ مند ثابت نہ ہوا اور حنفیوں کے نزدیک چونکہ عورت کا طریقہ عبادت گھر کی چاردیواری تک محصور ہے اس بناء پر ان کا مذہب کہ عورت مسجد البیت (گھر کی مسجد) میں اعتکاف کرے معقول ہے۔

اس کے باوجود بعض فقہاء حنفیہ اس بات کے قائل ہیں کہ عورت کا اعتکاف مسجد میں بھی درست ہے۔چنانچہ ''منیة المفتی'' میں ہے:

« لَوْ اِعْتَكَفَتْ فِي الْمَسْجِدِ جَازَ .»

اور ''البدائع'' میں ہے:

« لَهَا اَنْ تَعْتَكِفَ فِي مَسْجِدِ الْجَمَاعَةِ .»

تعجب ہے علامہ وحید الزمان جیسی فاضل شخصیت سے آخری دورِ حیات میں تقلیدی جمود سے آزاد ہونے کے باوجود وہ بلا استناد مسلک کے کس طرح قائل ہوگئے۔ « ثُمَّ اعْتَكَفَ اَزْوَاجُهُ مِنْ بَعْدِهٖ » کی تشریح یہ کرنا کہ ''پھر اعتکاف کیا حضرت کی بیبیوں نے یعنی اپنے گھروں میں'' سراسر نصِ حدیث سے زیادتی ہے جس کا کوئی اصل نہیں۔ دراصل اس کی بناء محض بعض فقہاء کے مذہب پر ہے جس کا کوئی اصل نہیں۔

صاحب ''المرعاۃ'' اس کی تفسیر میں رقمطراز ہیں:

« اَیْ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهٖ اِحیَاءً لِسُنَّتِهٖ وَ اِبْقَاءً لِطَرِیْقَتِهٖ .» (۳/۳۱۰)

یعنی ازواجِ مطہرات نے آپ ﷺ کی وفات کے بعد اعتکاف آپ ﷺ کی سنت اور طریقہ کو زندہ اور باقی رکھنے کے لیے کیا ہے۔ اب ہر فرد غور وفکر کرسکتا ہے کہ اعتکاف میں آپ ﷺ کی سنت اور طریقہ کار کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ جملہ امور کا تعلق مسجد سے ہے نہ کہ گھر سے۔

لہٰذا ازواجِ مطہرات کے فعل کو گھر پر محمول کرنا سراسر باطل ہے۔

کیا ازواج النبی ﷺ نے آپ ﷺ کی زندگی میں اعتکاف بیٹھنے کا عزم مسجد میں کیا تھا۔ یا گھر میں؟ ''صحیح بخاری'' وغیرہ کی احادیث واقعاتی طور پر اس امر پر شاہد ہیں کہ اس سارے قصے کا تعلق مسجد سے ہے۔ تو پھر آپ ﷺ نے اس فعل پر نکیر فرمائی؟ ہرگز نہیں۔ سو یہی روایت عورت کے لیے مسجد میں اعتکاف بیٹھنے کے جواز کی واضح دلیل ہے۔

''فتح الباری'' میں ہے:

« أَنَّ الْمَرْأَةَ إِذَا اعْتَكَفَتْ فِي الْمَسْجِدِ اسْتُحِبَّ لَهَا أَنْ تَجْعَلَ لَهَا مَا يَسْتُرُهَا وَيُشْتَرَطُ أَنْ تَكُونَ إِقَامَتُهَا فِي مَوْضِعٍ لَا يُضَيِّقُ عَلَى الْمُصَلِّينَ .» (۴/۲۷۷)

البتہ اس سال کسی دوسرے سبب سے آپ ﷺ نے اعتکاف ترک کردیا تھا جس کا متنازعہ فیہ مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اور جن لوگوں نے عورت کے مسجد میں اعتکاف کے لیے خاوند کے وجود کی شرط لگائی ہے۔ یہ بھی کمزور مسلک ہے۔ اس لیے کہ جب یہ امر مسلّمہ ہے کہ ازواجِ مطہرات نے آپ ﷺ کی وفات کے بعد بھی اعتکاف کیا ہے اور قرآن میں ان کے بارے میں یہ حکم بھی موجود ہے:

﴿وَ لَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا﴾ (الاحزاب: ۵۳)

''اور نہ یہ کہ ان کی بیویوں سے کبھی ان کے بعد نکاح کرو۔''

تو اس سے معلوم ہوا عورت اکیلی بھی بلا وجودِ خاوند اعتکاف کرسکتی ہے۔

یہ بھی یاد رہے عہدِ نبوت میں کئی ایک صحابیات مسجد نبوی ﷺ میں رہائش پذیر تھیں۔ ملاحظہ ہو ''صحیح بخاری'' وغیرہ اس سے بھی اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ عورت کا قیام مسجد میں ممکن ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ عورت پردہ ہے۔ بلاشبہ وہ

پردہ ہے لیکن جہاں تک اس کی آواز کے پردہ ہونے کا تعلق ہے، سو یہ محل نظر ہے کیونکہ بہت ساری صحابیات وقتاً فوقتاً آپ ﷺ سے مسائل دریافت کرنے آتی تھیں۔ کبھی آپ ﷺ نے انکار نہیں فرمایا کہ عورت کی آواز تو پردہ ہے۔

قرآن میں بھی ازواجِ مطہرات کو غیروں سے گفتگو اور مکالمہ کی بایں الفاظ اجازت مرحمت کی گئی ہے: ﴿فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ﴾ (الاحزاب:۳۲) (کسی اجنبی شخص سے نرم نرم باتیں نہ کریں) نیز فرمایا: ﴿فَسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ﴾ (الاحزاب:۵۳) اور جہاں تک اس روایت کا تعلق ہے جس سے موصوف نے عورت کی آواز کے پردہ ہونے کی دلیل لی ہے۔ (وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ.)

دراصل مرد و زن میں یہ تفریق نسوانیت کے کمزور پہلو کی بناء پر ہے کہ بسا اوقات اچانک زبان سے بولنا عورت کے لیے گراں ہوتا ہے۔ اس بناء پر اس کی تالی کو مرد کے بولنے کے قائم مقام قرار دیا گیا ہے۔ قرآن میں ہے: ﴿وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ﴾ (الزخرف:۱۸)

نیز احتمال ہے کہ یہ تفریق تعبدی (عقل سے بالاتر حکم) ہو۔ باقی رہا صاحب موصوف کا یہ دعویٰ کہ قرآن میں مسجدوں میں اعتکاف کا حکم موجود نہیں، یہ امام بخاری رحمہ اللہ اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے فہم کے خلاف ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ آیت ہذا سے امام بخاری رحمہ اللہ کے استدلال کی تشریح یوں فرماتے ہیں:

« وَوَجْهُ الدَّلَالَةِ مِنَ الْآيَةِ أَنَّهُ لَوْ صَحَّ فِي غَيْرِ الْمَسْجِدِ لَمْ يَخْتَصَّ تَحْرِيمُ الْمُبَاشَرَةِ بِهِ لِأَنَّ الْجِمَاعَ مُنَافٍ لِلاعْتِكَافِ بِالْإِجْمَاعِ فَعُلِمَ مِنْ ذِكْرِ الْمَسَاجِدِ أَنَّ الْمُرَادَ أَنَّ الِاعْتِكَافَ لَا يكون الا فِيهَا .»

یعنی آیت ہذا سے وجہ دلالت یہ ہے کہ اعتکاف اگر مسجد کے علاوہ بھی درست ہو تو پھر اس کو مباشرت کی حرمت سے مخصوص کرنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ جماع بالاجماع اعتکاف کے منافی ہے تو مساجد کے ذکر سے معلوم ہوا مراد اس سے یہ ہے کہ اعتکاف مسجدوں سے مخصوص ہے۔"

اس بناء پر ابن حجر رحمہ اللہ شارح بخاری رقمطراز ہیں:

«وَاتَّفَقَ الْعُلَمَاءُ عَلَى مَشْرُوطِيَّةِ الْمَسْجِدِ لِلِاعْتِكَافِ .» [1]

یعنی ابن لبابہ کے ماسوا علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اعتکاف کے لیے مسجد کا وجود شرط ہے۔"

وَأَجَازَ الْحَنَفِيَّةُ لِلْمَرْأَةِ أَنْ تَعْتَكِفَ فِي مَسْجِدِ بَيْتِهَا وَهُوَ الْمَكَانُ الْمُعَدُّ لِلصَّلَاةِ فِيهِ وَفِيهِ قَوْلُ الشَّافِعِي قديم .»

[1] فتح الباری:٤/ ٢٧٢

پھر صفحہ: ۲۷۷ پر فرماتے ہیں

«وَفِيهِ أَنَّ الْمَسْجِدَ شَرْطٌ لِلاعْتِكَافِ لِأَنَّ النِّسَاءَ شُرِعَ لَهُنَّ الاحْتِجَابُ فِي الْبُيُوتِ فَلَوْ لَمْ يَكُنِ الْمَسْجِدُ شَرْطًا مَا وَقَعَ مَا ذُكِرَ مِنَ الْإِذْنِ وَالْمَنْعِ وَلَاكْتُفِيَ لَهُنَّ بِالِاعْتِكَافِ فِي مَسَاجِدِ بُيُوتِهِنَّ .»

نیز حدیث «اِذَا اعْتَكَفَ اَدْنٰى اِلَيَّ رَأْسَهٗ وَ هُوَ فِي الْمَسْجِدِ » میں بھی اس امر کی دلیل ہے کہ اعتکاف مسجد کے ماسوا غیر درست ہے۔ چنانچہ ''المرعاۃ'' (۳/۳۱۳) میں ہے:

«وَ فِيْهِ اَنَّ الْاِعْتِكَافَ لَا يَصِحُّ فِيْ غَيْرِ الْمَسْجِدِ وَ اِلَّا لَكَانَ لَهٗ اَنْ يَّخْرُجَ مِنْهُ لِتَرْجِيْلِ الرَّأْسِ»

یعنی ''اس حدیث میں دلیل ہے کہ اعتکاف مسجد کے علاوہ غیر درست ہے ورنہ آپ ﷺ کے لیے ممکن تھا کہ سر مبارک کی کنگھی کے لیے باہر تشریف لے جاتے۔''

پھر قرآنی عموم کا تقاضا یہ ہے کہ ہر مسجد میں اعتکاف کا جواز ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا یہی مسلک ہے۔ ہاں البتہ عبدالرحمٰن بن اسحاق (جس کی توثیق ابن معین نے کی ہے) اس کی روایت کی بناء پر بعض اہل علم کا کہنا ہے۔ ''اولیٰ یہ ہے کہ اعتکاف جامع مسجد میں ہو۔''

اور بعض دیگر نے واجب قرار دیا ہے۔ علامہ البانی رحمہ اللہ نے ''الارواء'' میں روایت ہذا کو صحیح کہا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: المرعاۃ: ۳/۳۲۹۔

یاد رہے فتنہ وفساد کے ڈر سے اگر عورت اعتکاف مطلقاً چھوڑ دے تو پھر بھی درست فعل ہے۔ تاہم اعتقادِ جواز بہر صورت قائم رہنا چاہیے۔ عمل کی نوبت نہ بھی آئے تو کوئی حرج نہیں۔ موجودہ دَور میں الحمد للہ (جملہ تحفظات کے ساتھ مسلک اہل حدیث کی کتنی مساجد میں عورتوں کے اعتکاف کا سلسلہ سالہا سال سے جاری وساری ہے۔ اس کی واضح مثال ہماری مسجد واقع قصبہ سرہالی کلاں ضلع قصور ہے۔ یہاں عورتوں کی ایک معقول تعداد ہر سال اعتکاف بیٹھتی ہیں۔ اخیر میں یہ بھی یاد رہے کہ کسی مسئلہ کے اثبات کے لیے کتاب وسنت کی نصوص ہی اہم ہوتی ہیں۔ اس کے مطابق بعد میں افراد امت کا عمل مل جائے تو سونے پر سہاگہ ہے۔ اور اگر نہ بھی دستیاب ہو تو اسی کو حرزِ جان سمجھ کر عمل جاری رہنا چاہیے۔

صاحب ''المرعاۃ'' رقمطراز ہیں:

«وَ لَا يَخْفٰى اَنَّ النَّاسَ اِذَا تَرَكُوْا الْعَمَلَ بِسُنَّتِهٖ ثَابِتَةٌ لَمْ يَكُنْ تَرْكُهُمْ دَلِيْلًا تُرَدُّ بِهِ السُّنَّةَ قَالَ النَّوَوِيُّ اِذَا ثَبَتَت السُّنَّة لَا تترك لِتَرْكِ عَملِ بَعْض النَّاسِ اَو اَكْثَرِهِمْ اَوْ كُلِّهِمْ .» (۳/۳۷۹)

لہٰذا ازواجِ مطہرات کے بعد عامل صحابیات کی فہرست اگر نہ بھی میسر آئے تب بھی اصل مسئلہ پر زد نہیں پڑتی جس طرح صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ نبی ﷺ نے بلا سفر مدینہ میں جمع بین الصلوتین پر عمل کیا تھا۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے کتاب ''العلل'' میں فرمایا: جتنی احادیث کو میں نے اپنی سنن میں جمع کیا ہے۔ سب پر امت میں سے کسی نہ کسی کا عمل ہے۔ ماسوائے دو حدیثوں کے جن میں سے ایک مشارٌ الیہ روایت ہے اس کے باوجود بعد میں کئی ایک محققین وقتاً فوقتاً اس پر عمل کے قائل ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ حدیث صحیح ہے اور نسخ وغیرہ ثابت نہیں ہو سکا۔

اللہ عزوجل جملہ مسلمانوں کو کما حقہ کتاب وسنت کا فہم نصیب فرما کر خیر الوریٰ احمد مجتبیٰ ﷺ کے طریقہ مسلوکہ کے مطابق عمل کی توفیق بخشے۔ آمین

کیا عورتیں مسجد میں مردوں کے برابر ہال کمرے میں اعتکاف بیٹھیں؟

سوال : عورتیں مسجد میں اعتکاف بیٹھیں۔ کیا مسجد کے ہال میں مردوں کے برابر یا ملحقہ کمرے میں جہاں ان کے لیے جمعہ جماعت کا بندوبست ہوتا ہے؟ (شاہ جہاں ملک۔ میانوالی) (۲۷ مارچ ۱۹۹۸ء)

جواب : مسجد کی حدود میں جہاں عورتوں کے لیے جمعہ وجماعت کا بندوبست ہوتا ہے عورتیں وہاں اعتکاف کریں۔

کیا نبی ﷺ کی کسی بیوی نے بالفعل آپ کے ساتھ مسجد میں اعتکاف کیا ہے؟

سوال : روایات میں یہ بات تو معرف ہے کہ ایک دفعہ ازواج مطہرات نے نبی ﷺ کے ہمراہ اعتکاف کرنا چاہا لیکن ان کی منافست کی بناء پر اس سال اعتکاف ترک کر دیا گیا۔ کیا اس واقعہ کے علاوہ بھی مسجد میں عورتوں کے اعتکاف بیٹھنے کا کہیں ذکر ہے۔ (سائل عبداللہ، لاہور) (۷ مئی ۱۹۹۹ء)

جواب : ہاں ''صحیح بخاری'' کے «بَابُ اعْتِكَافِ الْمُسْتَحَاضَةِ» کے تحت مصنف کی سند کے ساتھ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اعْتَكَفَ مَعَهُ بَعْضُ نِسَائِهِ وَهِيَ مُسْتَحَاضَةٌ تَرَى الدَّمَ.» ❶

یعنی ''نبی اکرم ﷺ کی بعض بیویوں نے آپ ﷺ کے ساتھ بحالتِ استحاضہ اعتکاف کیا۔''

ظاہر یہ ہے کہ روایت ہذا میں بیان کردہ قصہ علیحدہ ہے۔ کیونکہ یہاں فعلی واقعہ کا بیان ہے جب کہ سوال میں مشارٌ الیہ قصہ کا بالفعل وقوع ہوا ہی نہیں۔ اس میں بذاتِ خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی شریک تھی۔ ❷

---

❶ صحيح البخاري، بَابُ اعْتِكَافِ الْمُسْتَحَاضَةِ، رقم:٣٠٩

❷ فتح الباري:٤/ ٢٧٦

لیکن اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا امر ہذا میں اس عورت (ام سلمہ رضی اللہ عنہا) کی انفرادیت بیان کرنا چاہتی ہیں۔

پھر جب اس عورت کا اعتکاف آپ ﷺ کے ساتھ تھا تو ظاہر یہی ہے کہ مسجد میں تھا کیونکہ شریعت میں اعتکاف کے لیے مسجد کا وجود شرط ہے۔قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَ لَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ ﴾ (البقرۃ:۱۸۷)

اعتکاف کب بیٹھنا چاہیے؟

سوال: اعتکاب کب بیٹھنا چاہیے؟ (سائل) (۹ جون ۲۰۰۶ء)

جواب: بیس رمضان کو فجر کے بعد اعتکاف بیٹھنا چاہیے۔[1] ''سنن ابی داؤد'' اور ''ابن ماجہ'' میں حدیث ہے:

« كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ إِذَا أَرَادَ أَنْ يَّعْتَكِفَ صَلَّى الْفَجْرَ ثُمَّ دَخَلَ فِيْ مُعْتَكِفِه »[2]

''رسول اللہ ﷺ جب اعتکاف کا ارادہ فرماتے تو فجر کی نماز کے بعد اپنے معتکف میں داخل ہوتے۔''

ظاہر ہے کہ ارادہ وقت سے پہلے ہوگا نہ کہ وقت کے بعد۔

اعتکاف کی تاریخ پر تعاقب ابوجابر دامانوی

اعتکاف کا آغاز اکیسویں شب سے ہی صحیح ہے: (از مولانا ابوجابر عبداللہ دامانوی۔کراچی)

آخری عشرہ کا اعتکاف اکیسویں شب کے آغاز اور بیسویں روزہ کے اختتام پر شروع ہوتا ہے اور جس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے معتکف مسجد میں اعتکاف کی نیت سے داخل ہو جائے اور رات مسجد میں گزار کر صبح اپنے معتکف میں داخل ہو کیونکہ آخری عشرہ کی ابتداء سورج غروب ہونے کے ساتھ ساتھ ہو جاتی ہے اور اس کی وضاحت ابن خزیمہ کی ان دو احادیث سے ہوتی ہے۔

« عَنْ أَبِي سَعِيدِ الْخُدْرِيِّ قَالَ :اعْتَكَفْنَا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْعَشْرَ الْوَسَطَ مِنْ شَهْرِ رَمَضَانَ، فَلَمَّا أَصْبَحَ صَبِيحَةَ عِشْرِينَ وَرَجَعْنَا فَنَام فَأُرِيَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ ثُمَّ أُنْسِيهَا، فَلَمَّا كَانَ الْعَشِيُّ جَلَسَ عَلَى الْمِنْبَرِ، فَخَطَبَ النَّاسَ فَذَكَرَ

[1] صحيح البخاری، باب الاعتكاف وخروج النبی صبيحة عشرين

[2] صحيح مسلم، بَابُ مَتَى يَدْخُلُ مَنْ أَرَادَ الِاعْتِكَافَ فِي مُعْتَكَفِهِ، رقم: ١١٧٢، سنن أبی داؤد، بَابُ الِاعْتِكَافِ، رقم:٢٤٦٤

الْحَدِيثَ قَالَ :وَمَنْ كَانَ اعْتَكَفَ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلْيَرْجِعْ إِلَى مُعْتَكَفِهِ » ❶

''ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ہم نے نبی ﷺ کے ساتھ درمیانی عشرہ کا رمضان کے مہینے میں اعتکاف کیا، پھر جب بیسویں کی صبح ہوئی تو ہم اپنے گھروں کو چلے گئے۔ بس نبی ﷺ سوئے (اور خواب میں لیلۃ القدر کو دیکھا اور فرمایا) پس مجھے لیلۃ القدر دکھائی گئی ہے پھر بھلا دیا گیا۔ پس جب شام ہوئی تو منبر پر تشریف فرما ہوئے اور لوگوں کو خطبہ دیا...... اور فرمایا جو شخص رسول اللہ ﷺ کے ساتھ (آخری عشرہ کا) اعتکاف کرنا چاہے وہ اپنے معتکف میں واپس آجائے۔''

دوسری روایت میں ہے:

« عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ، أَنَّهُ قَالَ :كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعْتَكِفُ فِي الْعَشْرِ الْوَسَطِ مِنْ رَمَضَانَ، فَاعْتَكَفَ عَامًا، حَتَّى إِذَا كَانَ لَيْلَةُ إِحْدَى وَعِشْرِينَ وَهِيَ اللَّيْلَةُ الَّتِي يَخْرُجُ مِنْ صَبِيحَتِهَا مِنَ اعْتِكَافِهِ قَالَ :مَنِ اعْتَكَفَ مَعَنَا فَلْيَعْتَكِفْ فِي الْعَشْرِ الْأَوَاخِرِ وَذَكَرَ الْحَدِيثَ بِطُولِهِ » ❷

''ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے رمضان کے درمیانی عشرہ کا اعتکاف فرمایا...... یہاں تک کہ جب اکیسویں شب آئی اور یہ وہ شب تھی کہ جس کی صبح کو آپ ﷺ اعتکاف سے نکل آئے تھے۔ فرمایا کہ جو شخص ہمارے ساتھ اعتکاف کرنا چاہے تو وہ آخری عشرہ کا اعتکاف کرے۔''

پس ثابت ہوا کہ جو اعتکاف اکیسویں رات سے شروع ہوگا وہی آخری عشرہ کا اعتکاف ہوگا اور جس روایت میں صبح کے وقت معتکف میں داخل ہونے کا ذکر ہے وہ اکیسویں تاریخ ہی کی صبح ہے جیسا کہ صحیح بخاری و صحیح مسلم کی روایات کے عموم سے معلوم ہوتا ہے۔

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا، قَالَتْ :كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، يَعْتَكِفُ فِي الْعَشْرِ الْأَوَاخِرِ مِنْ رَمَضَانَ، فَكُنْتُ أَضْرِبُ لَهُ خِبَاءً فَيُصَلِّي الصُّبْحَ ثُمَّ يَدْخُلُهُ » ❸

---

❶ صحیح ابن خزیمہ ، بَابُ الِاقْتِصَارِ فِي الِاعْتِكَافِ عَلَى الْعَشْرِ الْأَوْسَطِ ، وَالْعَشْرِ الْأَوَاخِرِ ......الخ (ج:۳، ص: ۳۴۴) رقم: ۲۲۲۰ ، طبع بیروت و اسنادہ حسن

❷ صحیح ابن خزیمہ ، بَابُ وَقْتِ خُرُوجِ الْمُعْتَكِفِ مِنْ مُعْتَكَفِهِ ، ......الخ ، (جلد: ۳ ، ص: ۳۵۳) رقم: ۲۲۴۳

❸ صحیح البخاری ، بَابُ اعْتِكَافِ النِّسَاءِ ، رقم: ۲۰۳۳

''عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف کیا کرتے تھے پس میں آپ کے لیے مسجد میں ایک خیمہ لگا دیتی اور جب آپ صبح کی نماز پڑھتے تو اس میں داخل ہو جاتے۔''

(ابو جابر عبداللہ دامانوی۔۶۱۴/۳۶، ۳۴، کیاڑی کراچی: ۷،کوڈ: ۵۶۳۰) (الاعتصام ۱۸مئی ۱۹۹۰ء)

رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف کے آغاز کا صحیح وقت کون سا ہے؟

(از حافظ ثناء اللہ مدنی حفظہ اللہ)

ماہنامہ ''دعوت اہل حدیث'' اشاعت رمضان المبارک ۱۴۳۱ھ اگست ۲۰۱۰ء میں محترم جناب ڈاکٹر ابو جابر دامانوی کا مقالہ بہ عنوان ''اعتکاف کب شروع کرنا چاہیے'' شائع ہوا اس میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ اعتکاف کا آغاز رمضان کی اکیسویں رات سے ہے۔ پھر جو اہل علم بیسیویں کی صبح کے بعد سے اعتکاف کے قائل ہیں ان کے تعاقب کی ناکام سعی فرمائی ہے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کے الفاظ:

« كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ اِذَا اَرَادَ اَنْ يَّعْتَكِفَ صَلَّى الْفَجْرَ ثُمَّ دَخَلَ فِیْ مُعْتَكَفِهٖ »

کو مختصر کہہ کر جان چھڑائی ہے۔ حالاں کہ یہ الفاظ موضوع ہیں۔ کیوں کہ ارادہ فعل سے پہلے ہوتا ہے نہ کہ بعد میں۔ اگر یہ صبح اکیسویں رات کی صبح قرار دی جائے تو واقعہ کے خلاف ہے۔ کیوں کہ عمل تو رات کو شروع ہو چکا ہے اب ارادہ کا چہ معنی دارد۔ فتاویٰ ثنائیہ جلد اول ص: ۶۴۹ میں مولانا شرف الدین دھلوی رحمہ اللہ نے بھی حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا سے استدلال کیا ہے کہ اعتکاف کا آغاز بیسویں کی صبح کو ہونا چاہیے۔

اور موصوف نے جس مفصل حدیث کی طرف احالہ کیا ہے اس میں مجرد صبح کا ذکر ہے۔ جو موضوع پر نص نہیں بلکہ احتمال غالب ہے کہ یہ بیسویں کی صبح ہو خیمے گاڑنے کی تیاری بھی اس بات کی متقاضی ہے پھر ازواجِ مطہرات کے فعل کو ناپسند کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اعتکاف کا ارادہ بھی ترک کر دیا یہ بھی اسی امر کی دلیل ہے کہ یہ بیسویں کی صبح ہے۔ ہاں البتہ ''مسند ابوعوانہ'' کے حوالہ سے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے جو روایت نقل کی ہے:

« كَانَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَعْتَكِفُ فِیْ كُلِّ شَهْرِ رَمَضَانَ فَاِذَا صَلَّى الْغَدَاةَ جَلَسَ فِیْ مَكَانِهِ الَّذِیْ اِعْتَكَفَ بِلَيْلٍ.»

مضمون نگار کے موقف کی موید ہے لیکن یہ روایت سخت ضعیف ناقابلِ اعتبار ہے۔ اس میں مصنف کا شیخ العطاری احمد بن عبدالجبار کے بارے میں ذہبی نے ''میزان'' میں کہا ہے: «ضَعَّفَهٗ غَيْرُ وَاحِدٍ» ''اس کو کئی ایک نے ضعیف کہا

ہے۔" اور حافظ ابن حجر نے "تقریب" میں کہا "یہ راوی ضعیف ہے۔" مزید وضاحت کے لیے مفصل کتابیں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔ اختصار کے پیش نظر ہم نے اسی پر اکتفا کی ہے۔

پھر موصوف نے بحث کے اختتام پر ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے جو بخاری اور مسلم میں بایں الفاظ ہے:

« اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ کَانَ یَعْتَکِفُ فِی الْعَشْرِ الْاَوْسَطِ مِنْ رَمضَانَ فَاعْتَکَفَ عَامًا حَتّٰی اِذَا کَانَ لَیْلَةَ اِحْدٰی وَ عِشْرِیْنَ وَ هِیَ لَیْلَةُ الَّتِی یَخْرُجُ مِنْ صَبِیْحَتِهَا من اعْتِکَافِه قَالَ مَن کَانَ اِعْتَکَفَ مَعِی فَلْیَعْتَکِفِ الْعَشْرَ الْاَوَاخِرِ »

اس کا ترجمہ مضمون نگار کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

"ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ رمضان کے درمیانی عشرہ کا اعتکاف کیا کرتے تھے۔ پس ایک سال آپ ﷺ نے اعتکاف فرمایا یہاں تک کہ جب اکیسویں رات آئی اور یہ وہ رات تھی کہ جس کی صبح کو آپ ﷺ اپنے اعتکاف سے اٹھتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا جو شخص میرے ساتھ اعتکاف کرنا چاہتا ہے تو وہ آخری عشرہ کا اعتکاف کرے۔"

پھر فرماتے ہیں اس سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ آخری عشرہ کا آغاز اکیسویں سے ہوتا ہے اور بیسویں کی صبح کو اعتکاف بیٹھنا مفروضے پر مبنی ہے۔ تعجب ہے صاحب موصوف اس حدیث کو نہیں سمجھ پائے ان کے ترجمہ کے مطابق حدیث کا مفہوم یہ ہوگا کہ اکیسویں رات کی صبح کو اعتکاف ترک کر دیا جائے دراں حالیکہ اہل علم سے کوئی اس بات کا قائل نہیں یہاں تک کہ خود آپ بھی اس بات کے قائل نظر نہیں آتے۔

اب اس روایت کو ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی دوسری روایت کی روشنی میں سمجھنا چاہیے۔

اس کے الفاظ یوں ہیں، فرمایا: ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے:

« اعْتَکَفْنَا مَعَ النَّبِیِّ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ العَشْرَ الْأَوْسَطَ مِنْ رَمَضَانَ، فَخَرَجَ صَبِیحَةَ عِشْرِینَ فَخَطَبَنَا، وَقَالَ :إِنِّی أُرِیتُ لَیْلَةَ القَدْرِ...... الخ»

اس حدیث پر امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی "صحیح" میں یوں تبویب قائم کی ہے:

«بَابُ الِاعْتِکَافِ وَخَرَجَ النَّبِیُّ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ صَبِیحَةَ عِشْرِینَ .»

اس سے معلوم ہوا یہ واقعہ بیس کی صبح کا ہے نہ کہ اکیسویں کی صبح کا۔ اس ترجمہ سے مصنف کا مقصود مالک کی سابقہ حدیث جو مالک کے واسطہ سے ابوسعید خدری سے مروی ہے، اس کی تشریح کرنی چاہتے ہیں کہ اس روایت میں بھی مراد بیسویں کی صبح ہے نہ کہ اکیسویں کی صبح۔

قاعدہ معروف « اَلْأَحَادِیْثُ یُفَسِّرُ بَعْضُهَا بَعْضَهَا وَ هِیَ اللَّیْلَةُ الَّتِیْ یَخْرُجُ مِنْ اِعْتِکَافِهٖ

صَبِیْحَتَهَا» ''ھا'' ضمیر کا مرجع بیسویں رات کی صبح ہے نہ کہ اکیسویں رات کی صبح۔ اس کی مثال قرآنِ مجید میں ہے:

﴿لَمْ یَلْبَثُوْا اِلَّا عَشِیَّةً اَوْ ضُحٰهَا﴾ (النازعات:٤٦)

کہ صرف دن کا آخری حصہ یا اوّل حصہ (دنیا میں) رہے اس آیت کریمہ میں دن کے اوّل حصہ کی اضافت آخری حصہ کی طرف ہے حالاں کہ وہ اس سے پہلے ہے۔ شارح بخاری ابن بطال نے کہا ہر وہ شخص جو دوسری شئے کے متصل ہو چاہے پہلے ہو یا بعد اس کی طرف اضافت کا جواز ہے۔ ❶

نیز بیسویں کی صبح کو رسول اللہ ﷺ نے خطبہ کے پس منظر میں ارشاد فرمایا لیلۃ القدر جس کی تلاش میں ہم نے رمضان کے درمیانی عشرہ کا اعتکاف کیا ہے وہ آخری عشرہ میں ہے جو میرے ساتھ اعتکاف میں ہے وہ اسی حالت میں رہے اور جو گھروں کو جا چکے ہیں وہ واپس آجائیں جانے والے مسجد میں آگئے اور اگر بالفرض آخری دھاگہ کے اعتکاف کا آغاز اکیسویں رات کو ہے تو آپ فرماتے، رات کو واپس آجانا جب کہ واقعہ اس بات پر شاہد ہے کہ آپ کے ساتھی آخری عشرہ کے لیے بیسویں کی صبح کو اعتکاف میں رہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا آخری عشرہ کے اعتکاف کا آغاز بیسویں کی صبح سے ہے یہ عملی دلیل ہے جس سے انکار کی گنجائش نہیں۔ واللہ ولی التوفیق۔

باقی رہا عدد کی کمی بیشی کا مسئلہ سو اس میں ہم شریعت کے تابع ہیں۔ قرآنی الفاظ ﴿فَاتَّبِعُوْنِیْ﴾ میں اسی بات کا درس دیا گیا ہے۔

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب: ۲۱)

مسئلہ ہذا پر تفصیلی گفتگو مرعاۃ المفاتیح میں بھی ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ (۱۰دسمبر ۲۰۱۰ء)

اعتکاف کرنے کی تاریخ اور وقت

سوال: رمضان میں اعتکاف کے لیے کس تاریخ کو اور کس وقت بیٹھنا چاہیے؟ جب کہ بروایت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اعتکاف صبح کی نماز کے بعد بیٹھنا سنتِ رسول ﷺ ہے۔

اگر اکیسویں روزے کی صبح کو معتکف اعتکاف میں داخل ہوتا ہے تو اکیسویں طاق رات ضائع ہو جاتی ہے اگر بیس کی صبح کو معتکف اعتکاف میں داخل ہو تو پھر طاق رات شامل ہوتی ہے۔ جیسا کہ مولانا عبدالسلام بستوی رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں۔ ہمارے ہاں رواجی طور پر اکیس کی رات کو معتکف تیاری کرتا ہے اور صبح کی نماز کے بعد اعتکاف میں داخل ہوتا ہے۔ بالتحقیق اصل صورت حال کیا ہے؟ (محمد طیب خلیق۔ چونیاں) (۲۰ اپریل ۲۰۰۱ء)

---

❶ بحوالہ فتح الباری: ٤/ ٣٥٦

جواب : اعتکاف بیسویں روزہ کی نمازِ فجر کے بعد بیٹھنا چاہیے ہمارے ہاں قصبہ سر ہالی کلاں ضلع قصور میں الحمد للہ اس پر عمل جاری وساری ہے عرصہ ہوا ''الاعتصام'' میں ایک مضمون اعتکاف کا صحیح وقت کونسا ہے؟ شائع ہوا تھا اس میں بدلائل میں نے اسی بات کو اختیار کیا ہے۔

ناگزیر وجہ سے اعتکاف توڑنا اور اس کے کفارے کا حکم

سوال : اگر اعتکاف کسی ناگزیر وجہ سے توڑنا پڑے تو اس صورت میں اس کا کفارہ ادا کرنا ہوگا یا نہیں؟

(ایک سائل، لاہور) (۱۲ فروری ۱۹۹۹ء)

جواب : بامرِ مجبوری اعتکاف توڑنے کی صورت میں مالی کوئی کفارہ نہیں۔ ہاں البتہ اگر ممکن ہو تو دیگر ایام میں کمی پوری کرے ورنہ توبہ واستغفار ہی کافی ہے۔

رمضان المبارک کے علاوہ اعتکاف کی قضائی دی جاسکتی ہے؟

سوال : ایک عورت نے رمضان المبارک میں اعتکاف کرنے کا ارادہ کیا لیکن بیماری کی وجہ سے اعتکاف نہ کرسکی اور اس نے یہ عہد کیا کہ رمضان المبارک کے بعد جب وہ تندرست ہوگی تو اعتکاف کرے گی؟ اب وہ کیا کرے؟ جب کہ اس کی صحت صحیح ہو چکی ہے۔ نیز اگر وہ اعتکاف کرے تو کیا مسجد میں کرے یا گھر میں؟

(محمد زکریا، متعلم جامعہ کمالیہ دار الحدیث راجووال) (۱۶ جنوری ۱۹۹۸ء)

جواب : صورتِ سوال سے ظاہر ہے کہ عورت ہذا کا ارادہ اعتکاف بارادۂ نذر ہے۔ لہٰذا اسے مسجد کے اندر اعتکاف بیٹھنا چاہیے۔ بذمہ ولی ہے کہ اس کے لیے تحفظ فراہم کرے۔ یاد رہے اعتکاف کے لیے مسجد کا وجود شرط ہے۔ گھر اعتکاف نہیں ہوسکتا۔ قرآن مجید میں یہ شرط موجود ہے۔ اور اعتکاف کی تعریف بھی اس بات کی متقاضی ہے۔ (نیز ازواجِ مطہرات کا اعتکاف بھی مسجد میں تھا۔)

اجتماعی اعتکاف کی کیا حیثیت ہے؟

سوال : اجتماعی اعتکاف کی کیا حیثیت ہے؟ (سائل) (۲۸ ستمبر ۲۰۰۷ء)

جواب : اجتماعی اعتکاف مسجد کے اندر درست ہے لیکن مسجد سے باہر درست نہیں، کیوں کہ اعتکاف کے لیے مسجد کا وجود شرط ہے، قرآن میں ہے: ﴿وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عَاكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ﴾ ''اور جب تم مسجدوں میں اعتکاف بیٹھے ہو تو ان سے مباشرت نہ کرو۔''

کیا غیر متعلقہ شخص اعتکاف والے خیمے میں داخل ہوسکتا ہے؟

سوال : کیا کوئی غیر متعلقہ شخص اعتکاف والے کے خیمے میں اجازت کے بغیر یا اجازت سے داخل ہوسکتا ہے یا سوسکتا

ہے؟ (سائل) (۹ جون ۲۰۰۶ء)

جواب : بلا معقول وجہ درست نہیں۔

(بحالت اعتکاف جائز و ناجائز امور)

کیا معتکف ووٹ ڈالنے کے لیے بحالتِ اعتکاف باہر جا سکتا ہے؟

سوال : ملکی سطح پر عنقریب قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے یوم موعود ۳ فروری ۱۹۹۷ء ۲۴ رمضان ۱۴۱۷ھ ایام اعتکاف میں واقع ہے۔ کیا معتکف ووٹ ڈالنے کے لیے بحالتِ اعتکاف باہر جا سکتا ہے۔

(سائل: عبد الرحمٰن۔ لاہور) (۲۴ جنوری ۱۹۹۷ء)

جواب : اعتکاف عام حالات میں بلاشبہ ایک سنت مؤکدہ ہے عبادت ہے جو قربِ الٰہی کا بہترین ذریعہ ہے۔ شریعت اسلامیہ میں اس کے کچھ آداب اور حدود و قیود ہیں۔ جن کے التزام سے تکمیلی و تحسینی پہلو تک رسائی ممکن ہے۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے: فرمایا:

« السُّنَّةُ عَلَى الْمُعْتَكِفِ :أَنْ لَا يَعُودَ مَرِيضًا، وَلَا يَشْهَدَ جَنَازَةً، وَلَا يَمَسَّ امْرَأَةً، وَلَا يُبَاشِرَهَا، وَلَا يَخْرُجَ لِحَاجَةٍ، إِلَّا لِمَا لَا بُدَّ مِنْهُ »[1]

''اعتکاف بیٹھنے والے کے لیے سنت طریقہ یہ ہے کہ بیمار کی عیادت نہ کرے۔ نہ جنازہ میں شریک ہو۔ نہ عورت کو چھوئے۔ نہ اس سے مباشرت کرے اور کسی ضروری امر کے بغیر جائے اعتکاف سے نہ نکلے۔''

اور ''صحیح بخاری'' میں ہے:

« وَكَانَ لَا يَدْخُلُ الْبَيْتَ إِلَّا لِحَاجَةٍ إِذَا كَانَ مُعْتَكِفًا .»[2]

اور ''صحیح مسلم'' میں ہے۔:« إِلَّا لِحَاجَةِ الْإِنْسَانِ .»[3]

اس کی تفسیر امام زہری رحمہ اللہ سے پیشاب اور پاخانہ منقول ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مالا بد منہ سے مقصود وہ امورِ ضروریہ اضطراریہ ہیں جن میں انسانی مرضی کو عمل دخل کم ہو اور جہاں تک معتکف کا کسی امیدوار کے لیے ووٹ ڈالنے کا تعلق ہے سو اس بارے میں عرض ہے، بلاشبہ اچھے امیدوار کو ووٹ ڈالنا گویا کہ اپنے کو برائی میں شریکِ کار بنانا ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ دین پسندوں کی ہر صورت حمایت کی

---

[1] سنن ابی داؤد، بَابُ الْمُعْتَكِفِ يَعُودُ، رقم:۲٤٧٣

[2] صحیح البخاری، بَابٌ: لَا يَدْخُلُ الْبَيْتَ إِلَّا لِحَاجَةٍ، رقم:۲۰۲۹

[3] صحیح مسلم، بَابُ جَوَازِ غُسْلِ الْحَائِضِ رَأْسَ زَوْجِهَا وَتَرْجِيلِهِ ...... الخ، رقم:۲۹۷

جائے تا کہ الحاد کا غلبہ نہ ہونے پائے لیکن دوسری طرف جس عظیم عبادت میں رب کے حضور مناجات ہیں شخص ہذا مصروفِ کار ہے۔اس کا تقاضا یہ ہے کہ فعلِ ہذا کو آغاز کے بعد ترک نہ کیا جائے۔اس سلسلہ میں میری رائے یہ ہے کہ جس حلقہ انتخاب میں امیدوار اچھی شہرت کا حامل ہو وہاں تکثیر افراد کے بجائے حتی المقدور تقلیل کو اختیار کیا جائے یعنی کم لوگ اعتکاف بیٹھیں اور بیٹھنے والے نصرتِ اسلام کے لیے دعاء گوہوں اور جس حلقہ میں لٹیرا یا لوٹا ازم کا حامی امیدوار ہو۔اس کی حمایت ونصرت کی بجائے کثرت سے لوگ اعتکاف کر کے فتنہ ہذا کے قلع قمع کے لیے رب کے حضور دعا گو ہوں۔لیکن عمل اعتکاف کو شروع کرنے کے بعد محض ووٹ ڈالنے کے لیے ترک نہ کیا جائے۔ایسا کرنے سے اعتکاف باطل ہو جائے گا۔

قرآنِ مجید میں ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَکُمْ﴾ (محمد: ۳۳)

بحالتِ اعتکاف سفر کا حکم

سوال: ایک آدمی لاہور میں رہائش پذیر ہے اور وہ لاہور کی کسی مسجد میں اعتکاف میں ہے۔کیا وہ آدمی اعتکاف کی حالت میں اُٹھ کر گوجرانوالہ جمعہ پڑھانے کے لیے جا سکتا ہے جب کہ وہ گوجرانوالہ میں خطیب ہے۔جواب دے کر عنداللہ ماجور ہوں۔ (عبدالقادر۔قصور) (۹ جولائی ۱۹۹۹ء)

جواب: اعتکاف سے نکل کر محض خطابت کے لیے دوسری جگہ کا سفر کرنا درست عمل نہیں۔اس طرح اعتکاف باقی نہیں رہتا۔کیونکہ یہ شرعاً قابلِ تسلیم وقبول عذروں سے نہیں۔

دورانِ اعتکاف ٹھنڈک کا غسل کرنا کیسا ہے؟

سوال: اعتکاف میں بیٹھنے والا مرد اعتکاف کے درمیان عام غسل کرسکتا ہے؟ سر دھونے کنگھی کرنے اور تیل لگانے کی روایت تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے، غسل کرنے کے لیے اس سے استدلال کیا جا سکتا ہے۔کیا غسل کرنے کی کوئی حدیث یا واقعہ بھی کہیں حدیث کی کتب میں موجود ہے۔ (فقط والسلام، ماسٹر غلام رسول، خانیوال) (۹ نومبر ۲۰۰۷ء)

جواب: مسجد کی حدود کے اندر معتکف کے لیے غسل ٹھنڈک کرنے میں کوئی حرج نہیں کیوں کہ اصل جواز ہے۔مشارٌ الیہ حدیثِ حالت اعتکاف میں نظافت وصفائی اختیار کرنے کی اہم دلیل ہے۔اس موضوع پر مفصل فتویٰ اس سے قبل الاعتصام میں شائع ہو چکا ہے۔اس کی طرف مراجعت مفید ہے، عملی واقعہ کا وجود نظر سے نہیں گزرا۔

معتکف کا غسلِ ٹھنڈک کے لیے حدودِ مسجد سے باہر نکلنا:

سوال: کیا معتکف اپنی میل کچیل دور کرنے کے لیے نہانے کی غرض سے روزانہ حدودِ مسجد سے باہر جا سکتا ہے؟

جواب: محض غسل طہارت و نظافت کی خاطر مسجد کی حدود سے باہر نکلنا اعتکاف کے منافی ہے البتہ مسجد کی حدود کے اندر غسل ٹھنڈک کا کوئی حرج نہیں۔ تفصیل الاعتصام کے کسی شمارے میں پہلے ہو چکی ہے اور غسل جنابت وغیرہ کے لیے مسجد سے باہر جانا بالاتفاق جائز اور درست ہے۔

اعتکاف کم از کم کتنے دنوں کا ہو سکتا ہے؟

سوال: (۱) اعتکاف کم از کم اور زیادہ سے زیادہ کتنے دنوں تک ہو سکتا ہے؟

(۲) کیا اعتکاف کے لیے مسجد ضروری ہے، اگر ضروری ہے تو کیا جامع مسجد ہونا ضروری ہے؟

(۳) کیا عورت بھی اعتکاف بیٹھ سکتی ہے اگر بیٹھ سکتی ہے تو گھر میں یا مسجد میں؟

(۴) اگر ایام ماہواری آ جائیں تو پھر اعتکاف کا کیا حکم ہے؟

(۵) اعتکاف رمضان کے سوا عام دنوں میں بھی ہو سکتا ہے؟

(۶) معتکف کے لیے شرائط کیا ہیں؟

جواب: الجواب بعون الوھاب: (۱) شریعت مطہرہ میں اعتکاف کے لیے وقت کی کوئی پابندی نہیں۔ البتہ رسولِ کریم ﷺ کی اقتداء میں مستحب یہ ہے کہ رمضان کے آخری عشرہ کا اعتکاف کیا جائے۔

امام عبدالرزاق نے یعلی بن امیہ رضی اللہ عنہ سے بسندہ بیان کیا ہے، وہ فرماتے ہیں، میں تھوڑے سے وقفہ کے لیے بہ نیت اعتکاف مسجد میں ٹھہر جاتا ہوں۔ (فتح الباری، ج:۴،ص:۲۷۳)

مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو: فقه السنة، ج:۱، ص:٤٧٦، سید سابق۔

(۲) ہاں اعتکاف کے لیے مسجد کا وجود ضروری ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَالِاعْتِكَافُ لُغَةً لُزُومُ الشَّيْءِ وَحَبْسُ النَّفْسِ عَلَيْهِ وَشَرْعًا الْمَقَامُ فِي الْمَسْجِدِ مِنْ شَخْصٍ مَخْصُوصٍ عَلَى صِفَةٍ مَخْصُوصَةٍ .» ❶

’’یعنی اعتکاف کا لغوی معنی کسی شئے کو لازم پکڑنا اور نفس کو اس پر بند رکھنا اور شرع میں مخصوص شخص کا مخصوص صفت کے ساتھ مسجد میں ٹھہرنے کا نام ہے۔‘‘

اس سے معلوم ہوا کہ اعتکاف کی تعریف میں مسجد کا وجود مضمر ہے اور قرآنِ مجید میں ہے:

﴿وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ﴾ (البقرۃ:۱۸۷)

’’جب تم مسجدوں میں اعتکاف بیٹھتے ہو تو عورتوں سے مباشرت مت کرو۔‘‘

❶ فتح الباری، ج:٤، ص:٢٧١

وجہ استدلال یہ ہے کہ اعتکاف اگر مسجدوں کے علاوہ بھی جائز ہوتا تو مباشرت کی حرمت مسجدوں کے ساتھ مخصوص کرنے کی سرے سے ضرورت ہی نہیں تھی۔ کیونکہ جماع بالا جماع اعتکاف کے منافی ہے۔ ❶

تاہم اولیٰ یہ ہے کہ اعتکاف جامع مسجد میں بیٹھا جائے تاکہ جمعہ کی ادائیگی کے لیے وہاں سے نکلنے کی نوبت پیش نہ آئے۔ علامہ مبارک پوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« هٰذا هُوَ الْمُخْتَارُ عِنْدِي وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ.» ❷

''یعنی میرے نزدیک پسندیدہ بات یہی ہے۔''

جب کہ امیر المومنین فی الحدیث امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک بلا تخصیص تمام مسجدوں میں اعتکاف بیٹھنا جائز ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی ''صحیح'' میں بایں الفاظ تبویب قائم کی ہے:

«بَابُ الِاعْتِكَافِ فِي الْعَشْرِ الْأَوَاخِرِ، وَالِاعْتِكَافِ فِي الْمَسَاجِدِ كُلِّهَا.» ❸

وجہ استدلال یہ ہے کہ قرآنی لفظ ﴿فِي الْمَسٰجِدِ﴾ غیر مخصص بلا قید ہے۔ لہٰذا جملہ مساجد میں اعتکاف جائز ہے بنا بریں اگر کوئی شخص غیر جامع میں اعتکاف بیٹھ جائے تو اس کے لیے دوسری جگہ جمعہ پڑھنے کے لیے نکلنا جائز ہوگا۔ کیوں کہ جمعہ فرض ہے اور اعتکاف عام حالات میں غیر واجب ہے۔ واجب غیر واجب پر بہر صورت مقدم ہے۔

(۳) عورت اعتکاف بیٹھ سکتی ہے۔ چنانچہ ''صحیح بخاری'' میں حدیث ہے:

«عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا: أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، ذَكَرَ أَنْ يَعْتَكِفَ الْعَشْرَ الْأَوَاخِرَ مِنْ رَمَضَانَ فَاسْتَأْذَنَتْهُ عَائِشَةُ، فَأَذِنَ لَهَا.» ❹

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف بیٹھنے کا ذکر کیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بھی اعتکاف بیٹھنے کی اجازت چاہی۔ آنحضرت ﷺ نے اجازت مرحمت فرما دی۔''

ہم نے اختصار کے پیش نظر باقی حصہ حذف کر دیا ہے۔ اصلاً پورے قصے کا تعلق مسجد میں اعتکاف بیٹھنے سے ہے۔ ''صحیح بخاری'' میں تفصیل ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ اسی واقعہ سے معلوم ہوا کہ عورت کے لیے بھی مقامِ اعتکاف صرف مسجد ہے گھر نہیں۔ نیز اعتکاف کی شرعی تعریف بھی اس پر دال ہے اور ظاہر واقعہ کی بنا پر بعض اہل علم نے عورت کے ساتھ شوہر کے اعتکاف کو ضروری قرار دیا ہے لیکن یہ نظریہ کمزور ہے اس لیے کہ ازواجِ مطہرات نے آپ کی وفات کے

❶ فتح الباری:٤، ص:٢٧٣

❷ تحفة الاحوذی، ج:٣، ص:٥٢٠، طبع مصری

❸ فتح الباری، ج:٤، ص:٢٧١

❹ صحيح البخاری، بَابُ مَنْ أَرَادَ أَنْ يَعْتَكِفَ، ثُمَّ بَدَا لَهُ أَنْ يَخْرُجَ، رقم:٢٠٤٥

بعد بھی اعتکاف کیا ہے۔ حدیث میں ہے:

«ثُمَّ اعْتَكَفَ أَزْوَاجُهُ مِنْ بَعْدِهِ .» (بخاری مع فتح الباری، ج:٤،ص:٢٧١) ❶

جب کہ ازواج مطہرات کے بارے میں یہ بات مسلم ہے کہ ان کے لیے کسی بھی دوسرے شخص سے آپ کے بعد نکاح کرنا حرام تھا۔

قرآن میں ہے: ﴿وَ لَاۤ اَنۡ تَنۡكِحُوۡۤا اَزۡوَاجَهٗ مِنۡۢ بَعۡدِهٖۤ اَبَدًا﴾ (الاحزاب:٥٣)

لامحالہ وہ اکیلی ہی اعتکاف بیٹھتی تھیں۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ مسجد میں اعتکاف کی صورت ہو۔ عورت کو مکمل تحفظ ہونا چاہیے اور اگر دورانِ اعتکاف عورت کو حیض شروع ہو جائے تو اعتکاف چھوڑ دے۔ اس حالت میں نماز روزہ جیسے اہم ارکان ساقط ہو جاتے ہیں تو اعتکاف کا ساقط ہونا معمولی بات ہے۔

(۴) اعتکاف رمضان کے علاوہ دوسرے دنوں میں بھی ہوسکتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جاہلیت میں نذر مانی تھی کہ میں ایک رات مسجد الحرام میں اعتکاف کروں گا۔ آپ نے فرمایا:

«أَوْفِ بِنَذْرِكَ.» ❷ ......''یعنی اپنی نذر پوری کر۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نذر اس وقت پوری کی تھی جب آپ سن آٹھ ہجری ماہ ذوالقعدہ میں حنین سے واپسی پر جعرانہ کے مقام پر تشریف فرما تھے۔ اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ غیر رمضان میں بھی اعتکاف ہوسکتا ہے۔

(۵) معتکف کے لیے شرائط یہ ہیں کہ وہ مسلمان ہو اور اگر وہ بچہ ہو تو ممیّز ہو۔ عورت حیض اور نفاس سے پاک ہو۔ ❸

یاد رہے استحاضہ کا خون اعتکاف سے مانع نہیں۔ اس حالت میں عورت شرعاً طاہرہ ہے۔ نماز، روزہ وغیرہ ادا کرے گی اور خاوند کے لیے مجامعت بھی جائز ہے۔ (وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ .) ❹

موسم سرما میں ''معتکف'' کا دھوپ کے لیے مسجد کے لیے صحن میں بیٹھنا

سوال: کیا اعتکاف والا سردی کے موسم میں مسجد کے صحن یعنی دھوپ میں بیٹھ کر عبادت کرسکتا ہے؟

(سائل) (۹ جون ۲۰۰۶ء)

---

❶ صحیح البخاری، بَابُ اِلاعْتِكَافِ فِي العَشْرِ الأَوَاخِرِ، ......الخ، رقم:٢٠٢٦، صحیح مسلم، بَابُ اعْتِكَافِ الْعَشْرِ الْأَوَاخِرِ مِنْ رَمَضَانَ، رقم:١١٧٢، سنن ابی داؤد، بَابُ اِلاعْتِكَافِ، رقم:٢٤٦٢

❷ صحیح البخاری، بَابُ إِذَا نَذَرَ فِي الجَاهِلِيَّةِ أَنْ يَعْتَكِفَ ثُمَّ أَسْلَمَ، رقم:٢٠٤٣

❸ فقه السنة، ج:١،ص:٤٧٧

❹ استحاضہ۔ حیض سے مختلف چیز ہے حیض ایام ماہواری کے خون کو کہا جاتا ہے، ان ایام میں عورت کو نماز معاف ہے۔ روزے بھی نہیں رکھ سکتی۔ تاہم روزوں کی بعد میں ادائیگی ضروری ہے۔ استحاضہ میں بھی عورت کو خون آتا ہے لیکن یہ ایک بیماری ہوتی ہے، جس کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے۔ اس میں عورت کے لیے نماز پڑھنا بھی ضروری ہے اور روزہ رکھنا بھی۔ جیسا کہ حضرت مفتی صاحب حفظہ اللہ نے فرمایا ہے۔ (ص۔ع)

جواب : بوقت ضرورت جواز ہے، ام المومنین صفیہ رضی اللہ عنہا کو الوداع کرنے کے لیے آپ ﷺ معتکف سے نکلے تھے۔ [1]

کیا اعتکاف والا خیمے میں یا مسجد میں مہمانوں سے مل سکتا ہے؟

سوال : کیا اعتکاف والا خیمے میں یا مسجد میں مہمانوں سے مل سکتا ہے؟ (سائل) (۹ جون ۲۰۰۶ء)

جواب : مل سکتا ہے سابقہ حدیث اس امر کی دلیل ہے۔

کیا ایک اعتکاف والا دوسرے اعتکاف والے کے خیمے میں جا سکتا ہے؟

سوال : کیا ایک اعتکاف والا دوسرے اعتکاف والے کے خیمے میں جا سکتا ہے؟ اور ایک دوسرے کی روٹی، پانی، افطاری وسحری میں مدد کر سکتا ہے؟ (سائل) (۹ جون ۲۰۰۶ء)

جواب : مسجد کے اندر عمل خیر میں اعانت میں کوئی حرج نہیں۔

کیا اعتکاف والا اذان اور اقامت کہہ سکتا ہے؟

سوال : کیا اعتکاف والا اذان اور اقامت کہہ سکتا ہے؟ اور مسجد کی لائٹ اور ٹونٹی وغیرہ درست کر سکتا ہے؟ اور بچوں کو مسجد میں شرارتوں سے منع کر سکتا ہے؟ نماز عید کا وقت مقرر کرنے کے لیے نمازیوں سے پوچھ سکتا ہے؟ (سائل) (۹ جون ۲۰۰۶ء)

جواب : مسجد کی حدود کے اندر اعمال خیر کر سکتا ہے۔

کیا اعتکاف والا نماز جمعہ کے لیے اپنا خیمہ اکھاڑ سکتا ہے؟

سوال : کیا اعتکاف والا نماز جمعہ کے لیے اپنا خیمہ اکھاڑ سکتا ہے؟ (سائل) (۹ جون ۲۰۰۶ء)

جواب : نمازیوں کی تنگی کے پیش نظر بوقت ضرورت خیمہ اکھاڑا جا سکتا ہے۔

کیا معتکف مسجد یا مدرسے کے لیے فطرانے اور چندے کی اپیل اور رسید دے سکتا ہے؟

سوال : کیا اعتکاف والا مسجد یا مدرسے کے لیے فطرانے اور چندے کی اپیل کر سکتا ہے؟ اور چندے کی رسید دے سکتا ہے؟ (سائل) (۹ جون ۲۰۰۶ء)

جواب : ہر عمل خیر کر سکتا ہے۔

معتکف بیمار ہونے پر گھر جا سکتا ہے؟

سوال : اگر اعتکاف والا بیمار ہو جائے اور بیٹھنے کے قابل نہ رہے اور وہ گھر چلا جائے تو کیا اُس کو کوئی کفارہ دینا ہوگا؟ (سائل) (۹ جون ۲۰۰۶ء)

---

[1] صحیح البخاری، بَابٌ: هَلْ يَخْرُجُ الْمُعْتَكِفُ لِحَوَائِجِهِ إِلَى بَابِ الْمَسْجِدِ، رقم: ۲۰۳۵

جواب: کوئی کفارہ نہیں۔

معتکف کے گھر میں فوتگی کی صورت میں اعتکاف ختم کیا جا سکتا ہے؟

سوال: اعتکاف والے کے گھر میں اگر کوئی فوت ہو جائے تو کیا وہ اعتکاف چھوڑ کر گھر جا سکتا ہے؟

(سائل) (۹ جون ۲۰۰۶ء)

جواب: بوقت ضرورت جا سکتا ہے۔

سوال: اگر کوئی شخص اعتکاف والے سے کاروباری مشورہ پوچھے تو کیا وہ مشورہ دے سکتا ہے؟

(سائل) (۹ جون ۲۰۰۶ء)

جواب: مشورے میں کوئی حرج نہیں، مسجد میں بیع وشراء کا ذکر ہو سکتا ہے۔ [1]

معتکف کے اپنے گھر والوں سے ٹیلی فونک رابطے

سوال: کیا اعتکاف والا موبائل ٹیلی فون، یا کارڈلیس پر گھر والوں یا کسی کاروباری یا رشتے دار سے بات کر سکتا ہے؟

(سائل) (۹ جون ۲۰۰۶ء)

جواب: کوئی شدید ضرورت نہ ہو تو احتراز کرنا چاہیے۔

معتکف ریڈیو پر خبریں سن سکتا ہے یا اخبار پڑھ سکتا ہے؟

سوال: کیا اعتکاف والا ریڈیو پر خبریں سن سکتا ہے۔ اور اخبار پڑھ سکتا ہے؟ (سائل) (۹ جون ۲۰۰۶ء)

جواب: بوقت ضرورت کوئی حرج نہیں۔

کیا معتکف مہندی لگوا سکتا ہے؟ نیز معتکف حجامت بنوا سکتا ہے؟

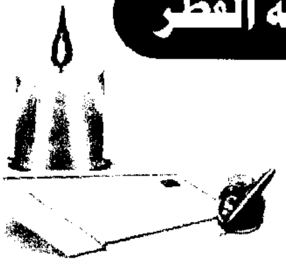
سوال: کیا اعتکاف والا مہندی لگوا سکتا ہے، حجامت بنوا سکتا ہے؟ (سائل) (۹ جون ۲۰۰۶ء)

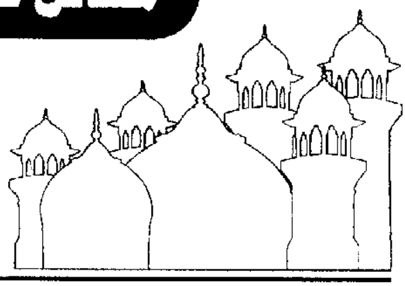
جواب: مسجد کی حدود کے اندر جائز ہے، اگر باہر نکلنا پڑے تو پھر درست نہیں بشرطیکہ مسجد میں نجاست پھیلنے کا خدشہ نہ ہو۔

---

[1] صحیح البخاری، بَابُ ذِكْرِ الْبَيْعِ وَالشِّرَاءِ عَلَى الْمِنْبَرِ فِي الْمَسْجِدِ، رقم:٤٥٦

مسائل عید الفطر و صدقة الفطر





مسائل عید الفطر

سوال: فطرانے کی رقم پورے رمضان میں کسی بھی وقت نکالی جاسکتی ہے یا صرف دو دن قبل یا عید سے قبل شرط لازم ہے، نیز فطرانے کی رقم یا زکوٰۃ کی رقم وہیں تقسیم کی جانی چاہیے۔ یا باہر بھیجی جاسکتی ہے۔ اس میں افضل کونسی چیز ہے؟

(ڈاکٹر حبیب الرحمٰن کیلانی) (۱۲ جون ۲۰۰۹ء)

جواب: بہتر ہے کہ فطرانہ ان جنسوں سے دیا جائے جو حدیث میں منصوص ہیں۔ بوقتِ ضرورت پیسے بھی دیے جاسکتے ہیں اس کے اخراج کا بہتر وقت نمازِ عید سے قبل ہے۔ صدقۃ الفطر میں لفظ الفطر اس بات کا متقاضی ہے۔ اس سے پہلے اخراج محلِ نظر ہے۔

پہلا حق مقامی لوگوں کا ہے۔ بوقتِ ضرورت دوسری جگہ نقل بھی جائز ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب الزکوٰۃ میں اس طرح ''باب'' قائم کیا ہے:

«بَابُ أَخْذِ الصَّدَقَةِ مِنَ الْأَغْنِيَاءِ وَتُرَدُّ فِي الْفُقَرَاءِ حَيْثُ كَانُوا» ❶

صدقہ فطر کے بعض مسائل

امریکہ میں مسلمانوں کے بعض علاقوں میں، اور ملک کے بعض دوسرے حصوں میں بعض اوقات وہ خوردنی اشیاء دستیاب نہیں ہوتی جن کا ذکر شرعی نصوص میں کیا گیا ہے۔ اسی طرح بعض اوقات بہت سے غریب مسکین مسلمانوں کو یہ

❶ صحیح البخاری مع فتح الباری، ج:۳، ص:۳۵۷

معلوم نہیں ہوتا کہ وہ ان اشیاء خوردنی سے کیسے استفادہ کر سکتے ہیں، اس صورتِ حال میں کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں:

صدقہ فطر میں معینہ غذائی جنس کی بجائے مالیت وغیرہ ادا کرنا

سوال : کیا ''طعام'' (غذائی اشیا) کے مفہوم میں وسعت پیدا کی جاسکتی ہے، تاکہ ہر وہ چیز اس حکم میں شامل ہو جائے جس کو ''طعام'' کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً تیل، سبزی، پھل، چاول، گوشت، مٹھائی وغیرہ یا ان میں سے بعض اشیاءِ خوردنی کا جواز صرف اس صورت میں ہوگا، جب یقینی طور پر معلوم ہو کہ ان فقراء و مساکین کیلئے طویل عرصے تک یہ غذائی اشیا استعمال کرنا مشکل ہے؟ (مغربی مسلمانوں کے روزمرہ مسائل)

جواب : صدقۂ فطر کے لئے حدیث میں جن غذائی اشیا کا نام لیا گیا ہے وہ یہ ہیں: کھجور، جَو، منقیٰ، پنیر اور گندم۔ ''صحیح بخاری'' میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا:

''اللہ کے رسول ﷺ نے مسلمانوں میں سے ہر غلام، آزاد، مرد، عورت، چھوٹے اور بڑے پر ایک صاع کھجور یا ایک صاع جو صدقہ فطر مقرر کیا ہے۔ اور حکم دیا ہے کہ وہ لوگوں کے نماز کی طرف نکلنے سے پہلے ادا کر دیا جائے۔'' ❶

''صحیح بخاری'' میں حضرت ابوسعید خدری کا یہ فرمان مروی ہے:

''ہم لوگ صدقہ فطر کے طور پر ایک صاع غلہ، یا ایک صاع جو یا ایک صاع کھجوریں، یا ایک صاع پنیر یا ایک صاع منقیٰ نکالتے تھے۔'' ❷

نبی علیہ السلام کے زمانہ میں یہی چیزیں زیادہ استعمال ہوتی تھیں۔ ابوسعید خدری کی ایک اور حدیث میں ہے:

''رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ہم لوگ صدقہ فطر میں ایک صاع کھانا دیا کرتے تھے۔'' ❸

ابوسعید خدری فرماتے ہیں:

''ہمارا کھانا جو، منقیٰ، پنیر اور کھجوریں ہوتا تھا۔'' ❹

علمائے کرام نے اس پر قیاس کر کے ہر اس چیز کو اس حکم میں شامل کیا ہے جسے لوگ خوراک کے طور پر استعمال کرنے لگیں مثلاً چاول، دالیں وغیرہ۔ وہ کہتے ہیں: صدقہ فطر ادا کرنے والے کو چاہئے کہ اس چیز کا ایک صاع ادا کرے جو علاقے کی عام غذا ہو۔

---

❶ صحیح البخاری، بَابُ: صَدَقَةُ الفِطْرِ عَلَى الحُرِّ وَالمَمْلُوكِ، رقم:۱۵۱۱، ۱۵۱۲

❷ صحیح البخاری، بَابُ صَاعٍ مِنْ زَبِيبٍ، رقم:۱۵۰۸

❸ صحیح البخاری، بَابُ الصَّدَقَةِ قَبْلَ العِيدِ، رقم:۱۵۰۹

❹ صحیح البخاری، بَابُ الصَّدَقَةِ قَبْلَ العِيدِ، رقم:۱۵۱۰

لیکن کیا غذائی اجناس کے بجائے ان کی قیمت درہم و دینار کی صورت میں ادا کی جاسکتی ہے؟ اس کے جواب میں علماء کی مختلف آراء ہیں۔ اکثر علمائے کرام اس کی اجازت نہیں دیتے۔ وہ کہتے ہیں کہ صدقہ فطر میں غذائی اجناس ادا کرنا ہی اصل مقصود ہے۔ بالخصوص اس لئے بھی کہ نقد رقم کا غلط استعمال کیا جاسکتا ہے۔ بعض غریب لوگ رقم کو حرام اخراجات میں خرچ کرسکتے ہیں۔ جبکہ احناف اور ان کی رائے سے اتفاق کرنے والے دیگر علماء مقصود کا لحاظ رکھتے ہیں، وہ کہتے ہیں: صدقہ فطر کا مقصد یہ ہے کہ محتاجوں کو اس دن سوال کرنے کی ضرورت نہ رہے۔ یہ مقصد جس طرح غلہ دینے سے حاصل ہوتا ہے، اسی طرح دوسری چیز سے بھی حاصل ہوجاتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات قیمت ادا کرنا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اس سے اس کی حاجت زیادہ پوری ہوتی ہے، اور وہ اس کے لئے زیادہ مفید ہوتا ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں: جو چیز غریب آدمی کے لئے زیادہ مفید، اور اس کی ضرورت کو بہتر طور پر پورا کرنے والی ہو، اس کا لحاظ رکھا جائے، وقت اور مقام کی تبدیلی سے یہ چیز بھی تبدیل ہوجاتی ہے۔ محمد بن سلمہ کہتے ہیں: ''خوشحالی کے ایام میں قیمت ادا کرنا مجھے زیادہ پسند ہے، اور سختی (غذائی قلت) کے ایام میں گندم ادا کرنا مجھے زیادہ پسند ہے۔''

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے: کہ بغیر حاجت کے اور بغیر راجح فائدہ کے قیمت (نقد رقم) ادا کرنا ممنوع ہے۔ لیکن ان کے نزدیک حاجت، فائدہ اور انصاف کو مدنظر رکھتے ہوئے قیمت ادا کرنا بھی جائز ہے۔

(دیکھئے مجموع الفتاویٰ)

اس لئے متاخرین میں سے اکثر علماء نے اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے قول کو ترجیح دی ہے کیونکہ نقد رقم سے ضرورت جس طرح پوری ہوتی ہے، دوسری اشیاء سے نہیں ہوتی، اور غریبوں کو صرف خوراک ہی کی ضرورت نہیں ہوتی، بعض اوقات انہیں کھانے پینے سے زیادہ لباس یا دوا کی ضرورت ہوسکتی ہے۔

صدقہ فطر کی جگہ غذائی اشیاء کے کوپن تقسیم کرنا؟

سوال : کیا غذائی اشیاء دینے کے بجائے یہ جائز ہے کہ اسلامی مرکز مسلمانوں سے ایک اندازے کے مطابق صدقہ فطر کی نقد رقم وصول کرلے۔ پھر غذائی اشیاء کے دکان داروں کے تعاون سے ایسے کارڈ یا کوپن جاری کرے جو غریبوں اور مسکینوں کو دے دیے جائیں، تاکہ وہ ان کے ذریعے جب چاہیں اپنی ضرورت کے مطابق غذائی اشیاء حاصل کرسکیں؟

(مغربی مسلمانوں کے روزمرہ مسائل)

جواب : اس تصور میں غالباً دو اجتہاد جمع ہوگئے ہیں جو اس مسئلہ میں وارد ہیں۔ اس سے یہ تسلی بھی ہوجاتی ہے کہ صدقہ فطر کی رقم صرف غذائی اشیاء پر صرف ہو جیسے اکثر فقہا کا قول ہے، اس کے ساتھ ساتھ غذائی اشیاء کے انتخاب کی اور ضرورت کے وقت میسر آنے کی سہولت بھی حاصل ہوجاتی ہے۔ بجائے اس کے کہ غریب آدمی کے پاس غلے کا ڈھیر لگ

جائے جس کی اس کو ضرورت نہ ہو، یا ضرورت ہو لیکن دوسری اشیاء سے کم ضرورت ہو، اور بجائے اس کے غریب آدمی کے پاس اتنا غلہ جمع ہو جائے جسے سنبھالنا اور سٹور کرنا اس کے لئے مشکل ہو، اس تصور سے یہ موقع ملتا ہے کہ غلہ اُٹھائے پھرنے کی بجائے وہ یہ کوپن لے لے جن سے وہ اپنی مرضی کے مطابق، اور ضرورت کے وقت کھانے پینے کی چیز حاصل کرسکتا ہے۔ اس طرح وہ نہ ان غذائی اشیاء کو وصول کرنے پر مجبور ہوتا ہے جن کی اسے ضرورت نہیں، نہ اس وقت وصول کرنے پر مجبور ہوتا ہے جب اسے ضرورت نہیں ہوتی۔ اور پھر غذائی اشیاء کے دائرہ سے باہر بھی نہیں نکلتا، جبکہ صدقہ فطر کے مسئلہ میں اکثر فقہا اس دائرہ تک محدود رہتے ہیں۔ اس طرح صدقہ فطر کا مقصود کامل ترین انداز سے پورا ہو جاتا ہے۔ اور کسی معاملہ میں جب شارع کا مقصود معلوم ہو، تو اس کو حاصل کرنے کے لئے وہ راستہ اختیار کرنا چاہئے جس سے اس کا حصول زیادہ ممکن ہو۔ (وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ .)

چندے کے ڈبوں میں صدقہ فطر کی رقم کی تقسیم؟

سوال: اسلامی مراکز صدقہ فطر کی اس رقم کا کیا کریں جو مسلمان، نمازِ عید سے پہلے چندے کے ڈبوں میں ڈال دیتے ہیں؟ (مغربی مسلمانوں کے روزمرہ مسائل)

جواب: اس رقم کو شرعی مصارف میں ہی خرچ کرنا چاہئے۔ صدقات کی تقسیم کے عام معروف اُصول وضوابط کے مطابق وہ رقم غریبوں اور مسکینوں کی ملکیت میں دی جائے، اور ان کی تقسیم عید کے دن سے موخر نہیں کرنی چاہئے، البتہ اس قدر تاخیر ہو سکتی ہے جس میں مستحقین تک رقم پہنچانے کا بندوبست کیا جاسکے۔

صدقہ فطر کے مال سے کپڑوں کی تقسیم کر دینا؟

سوال: کیا صدقہ فطر کی رقم سے کپڑے خرید کر ان افراد یا خاندانوں کو دیے جاسکتے ہیں جن کے پاس ضرورت کے مطابق لباس نہیں ہے؟ (مغربی مسلمانوں کے روزمرہ مسائل)

جواب: اگر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے ہم خیال علماء کا قول پیش نظر رکھا جائے، جو صدقہ فطر میں قیمت ادا کرنا جائز سمجھتے ہیں اور اس مقام پر اس اجتہاد کا اعتبار کیا جاسکتا ہے تو اس کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ غریب آدمی کو اس رقم کا مالک بنا دیا جائے اور وہ اپنی مرضی سے حسبِ ضرورت اسے خرچ کرے۔ سوائے اس صورت کے کہ یہ غریب لوگ یتیم بچے ہوں یا کم عقل ہوں اور صدقہ فطر کا منتظم ہی ان کا سرپرست ہو۔ لیکن یہ فرض کر لینا کہ تمام حاجت مند کم عقل ہیں، جن کے معاملات کے نگران اور ان کی طرف سے ان کے مال میں تصرف کرنے والے وہی ہیں جو صدقہ فطر ادا کرنے والے ہیں، تو یہ سوچ درست نہیں۔ (وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ.)

صدقہ فطر کو عید سے چند روز قبل تقسیم کرنا؟

سوال: کیا یہ جائز ہے کہ صدقہ فطر شریعت کی طرف سے مقرر کردہ وقت سے پہلے ہفتہ وار چھٹی کے دن تقسیم کر دیا جائے کیونکہ اس دن رضا کارانہ کام کرنے والے افراد زیادہ تعداد میں مل سکتے ہیں، جو کسی دوسرے وقت دستیاب نہیں ہوتے؟ (مغربی مسلمانوں کے روزمرہ مسائل)

جواب: صدقہ فطر کا اصل مقصد یہ ہے کہ عید کے دن غریبوں کو مانگنے کی ضرورت نہ رہے، لہٰذا یہ صدقہ ان تک اس انداز سے پہنچنا چاہئے کہ یہ مقصد حاصل ہو جائے۔ اسے نمازِ عید سے موخر کرنا جائز نہیں کیونکہ نبی ﷺ نے حکم دیا ہے کہ وہ نمازِ عید کے لئے نکلنے سے پہلے ضرور ادا کر دیا جائے اور فرمایا:

''جس نے اسے نماز سے پہلے ادا کیا تو یہ مقبول صدقہ ہے، اور جس نے نمازِ (عید) کے بعد ادا کیا، تو وہ صدقوں میں سے ایک (عام) صدقہ ہے۔''[1]

اس کی ادائیگی نمازِ عید سے متصل پہلے یعنی فجر کی نماز اور عید کی نماز کے درمیان بھی ہوسکتی ہے بلکہ عید کی رات کو بھی ہوسکتی ہے۔ اسے عید سے ایک دو دن پہلے بھی ادا کیا جاسکتا ہے جیسے ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور یہی عام فقہاء کی رائے ہے۔ بعض علماء کے قول کے مطابق آدھا مہینہ پہلے بلکہ مہینے (رمضان) کے شروع میں بھی درست ہے۔ میرے خیال میں اس امر کا تعلق صدقہ فطر کے شرعی مقصد سے ہے اور وہ مقصد ہے عید کے دن حاجت مندوں کو مانگنے کی ضرورت نہ رہنے دینا۔ چونکہ عید سے پہلے ادا کرنے سے بھی یہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے، اس لئے اس معاملے میں گنجائش ہے۔ (وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ)

جو شخص مکمل صدقہ فطر ادا نہ کرسکتا ہو......؟

سوال: جو شخص غربت کی وجہ سے ایک صاع صدقہ فطر نہ دے سکتا ہو، وہ کس قدر صدقہ فطر ادا کرے؟ نصف صاع یا بالکل ادا نہ کرے؟ (سائل) (۴ جولائی ۲۰۰۳ء)

جواب: لوگوں کو چاہیے کہ غریب آدمی کو صدقہ دیں پھر اس سے وہ اپنا صدقۃ الفطر ادا کرے کیونکہ صدقۃ الفطر واجب ہے۔ حدیث میں لفظ ''فرض'' استعمال ہوا ہے۔ صاحب ''مرعاۃ المصابیح'' کی رائے کے مطابق اگر پورا صاع ادا نہ کرسکتا ہو تو نصف صاع بھی کافی ہوسکتا ہے؟

جہاد کے نام پر صدقہ فطر

سوال: آج کل جہاد کے نام پر صدقہ فطر لیا جا رہا ہے حالانکہ احادیث میں واضح طور پر آیا ہے کہ عید کا چاند نظر آنے

[1] سنن ابن ماجه، بَابُ صَدَقَةِ الْفِطْرِ، رقم: ۱۸۲۷، سنن أبي داؤد، بَابُ زَكَاةِ الْفِطْرِ، رقم:۱۶۰۹

کے بعد سے لے کر نمازِ عید الفطر تک صدقہ فطر ادا کیا جائے تا کہ غریب لوگ بھی عید کی خوشیوں میں شامل ہو سکیں ، جب کہ جہاد کے نام پر لیا جانے والا صدقہ اتنی جلدی راتوں رات تو نہیں جا سکتا۔ اور ویسے بھی صدقہ غریبوں کے لیے خاص کیا گیا ہے۔ یہ واضح کریں کہ واقعی صدقہ فطر جہاد کے لیے دیا جا سکتا ہے۔ اگر چہ ان تک نہ ہی پہنچ سکے۔

(سائل: حاجی محمد اصغر الکافی، راجن پور) (۱۹ مارچ ۱۹۹۹ء)

جواب : مقامی فقراء ومساکین کا صدقہ الفطر میں اصل استحقاق ہے۔ ہر صورت ان کو ترجیح ہونی چاہیے۔ بلاشبہ اس کی ادائیگی چاند نظر آنے کے بعد ہونی چاہیے۔ اگر چہ دو تین روز پہلے دینے کا بھی جواز ہے۔ ہر کارِ خیر میں جہاد کے نام پر لقمۂ غریب چھیننا بہر صورت اچھی بات نہیں ہے۔

اصل فطرانہ کی مقدار و قیمت کیا ہے؟

سوال : حدیث کے مطابق اصل فطرانہ کی مقدار و قیمت کیا ہے؟

جواب : عام طور پر اہل علم نے صدقۃ الفطر کی مقدار دو سیر دس چھٹانک تین تولے چار ماشے بیان کی ہے۔ اجناس کے اعتبار سے قیمت میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ اس کی کوئی حد بندی نہیں۔

زکوٰۃ، عشر، صدقات

(نصاب کے مسائل)

قرض پر دی ہوئی رقم پر زکوٰۃ ادا کرنی چاہیے؟

سوال : ایک زمیندار کسانوں (ہاریوں) کو جنوری کے شروع میں چار پانچ لاکھ روپیہ قرضہ دیتا ہے۔ دسمبر میں ہاریوں سے روپیہ وصول کر لیتا ہے۔ ان میں کوئی ہاری سال کے بعد قرضہ واپس دے کر چلے جاتے ہیں اور کوئی بیٹھے رہتے ہیں۔ کیا جو ہاریوں سے روپیہ سال کے بعد وصول ہوتا ہے اس میں سے زکوٰۃ نکالنی چاہیے؟ (محمد قاسم اللہ ڈنوں سموں گوٹھ حاجی محمد سموں کنری سندھ) (۱۱۔ اپریل ۱۹۹۷ء)

جواب : قرض پر دی ہوئی رقم چونکہ مالک کی ملک ہوتی ہے لہٰذا اس کی زکوٰۃ ادا کرنی چاہیے۔ ہاں البتہ قرض کی ایسی رقم جس کے ملنے کی امید نہ ہو۔ اس کے دستیاب ہونے پر صرف ایک سال کی زکوٰۃ ہے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کا فیصلہ یہی ہے۔ ملاحظہ ہو موطا امام مالک مع زرقانی۔

قرض کی رقم پر زکوٰۃ کا حکم

سوال : میرے بھائی پر تقریباً ۲۵۰۰۰ روپے قرض ہے، جب کہ ۲۲۰۰۰ روپے انھوں نے ایک شخص کو قرض دے رکھا ہے تو کیا وہ اپنی دکان میں سے زکاۃ ادا کرے گا یا پہلے قرض ادا کرے گا۔ اور یہ یاد رہے کہ دکاندار (جس سے مال خریدتے ہیں) کے ۵۰۰۰ یا ۱۰۰۰۰ روپے اپنے پاس ضرور رکھتے ہیں تاکہ وہ سودا دیتا رہے۔ لیکن اُس ۲۵۰۰۰ روپے کی رقم سے ۱۶۰۰۰ روپے انھوں نے ایک آدمی کے دینے ہیں جو دکان دار نے صرف اس سے قرض لیا ہے۔

(سائل) (۱۲ مارچ ۲۰۰۴ء)

جواب : موجودہ صوت میں دکان کے مالِ تجارت کی زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی قرض دوسرے ذرائع سے ادا کرے۔

حکومتِ وقت کے بیت المال کو برائے قرض دینا

سوال: حکومتِ وقت کے بیت المال کو برائے قرض۔

۱۔ برائے تعلیم نادار طلباء، کتب، خوراک۔

۲۔ برائے علاج معالجہ غرباء و مساکین۔ (محمد الیاس۔ دوائی والا۔ کراچی) (۲۲ اگست ۱۹۹۷ء)

جواب: حکومت کو برائے قرض زکوٰۃ دینا صحیح نہیں۔ کیوں کہ اس سے حق داروں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ دوسرا ادائیگی قرض بمع بیاج ہے جو تعاون علی الاثم کے زمرے میں داخل ہے۔ تیسرا لفظ حکومت میں جو تفوق کا پہلو مضمر ہے اس کے بھی خلاف ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ عام الرماد کو انتہائی محتاجگی کے باوجود لوگوں کی طرف نگاہ نہیں اٹھائی بلکہ رب العزت سے اپنے تعلق کو مضبوط تر بنایا۔

نادار طلباء کی کتب اور خوراک کے علاوہ غرباء مساکین کے علاج معالجہ پر بھی مالِ زکوٰۃ صرف ہوسکتا ہے۔

قرض کی رقم پر کیئے گئے کاروبار سے حاصل ہونے والے نفع پر زکوٰۃ

سوال: ایک شخص کا کاروبار چالیس ہزار روپے کا ہے جس میں سے دس ہزار روپے قرض کے ہیں۔ کیا زکوٰۃ چالیس ہزار روپے کی نکالے یا کہ تیس ہزار روپے کی؟ (سائل عبدالرزاق عام۔ پڈعیدن)

جواب: مذکورہ صورت میں رأس المال اور منافع موجودہ کا حساب لگا کر زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی اور دس ہزار قرض کی زکوٰۃ اصل مالک کے ذمہ ہے وہ ادا کرے گا۔

کاروبار پر زکوٰۃ، اور جو قرض لینا ہے اس پر زکوٰۃ کا حکم

سوال: ایک آدمی جب وہ دکان کا کام شروع کرتا ہے تو اس وقت اصل رقم مبلغ ستتر (۷۷) ہزار روپے ہے۔ کچھ عرصہ کام چلتا رہا تو اصل رقم اس نے نکال لی اب لوگوں کی رقم سے کاروبار چل رہا ہے۔ اس صورت میں اب دکان میں ستتر (۷۷۰۰۰) ہزار کا مال ماجود ہے جب کہ اس نے جو سامان بطورِ قرض لوگوں کو دیا ہے اور لوگوں سے لینا بھی ہے وہ مبلغ ۶۷۰۰۰ ہزار ہے اور قرض بذمہ دکان مبلغ ایک لاکھ چھہتر ہزار (۱۷۶۰۰۰) روپے ہے تو اس صورت میں کتنی رقم کی زکوٰۃ ادا کرے گا۔ قرآن وسنت کے ساتھ اس کا حل بتائیں کہ زکوٰۃ کتنی بنتی ہے۔ (محمد حسن احسن) (۱۶ مارچ ۲۰۰۱ء)

جواب: سال گزرنے پر دکان کی طرف منسوب سارے مال کا حساب لگا کر اڑھائی روپے فیصد کے حساب سے زکوٰۃ ادا کی جائے۔ ''سنن ابی داؤد'' میں حضرت سمرۃ بن جندب سے روایت ہے، فرمایا:

« فَإِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَأْمُرُنَا أَنْ نُخْرِجَ الصَّدَقَةَ مِنَ الَّذِي

نُعِدُّ لِلْبَيْعِ.»❶

”رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا جو مال خرید و فروخت کے لیے ہو اس کی زکوٰۃ ادا کریں۔“

اور جو قرض لینا ہے اگر اس کے بروقت ملنے کی امید ہو تو اس کی زکوٰۃ ادا کرنی ہو گی اور جس قرضہ کے ملنے کی امید نہ ہو اگر وہ کئی سالوں کے بعد مل جائے تو اس صورت میں صرف ایک سال کی زکوٰۃ ادا کرنا ہو گی۔ (بحوالہ موطا امام مالک) اور دکان پر قرض کی صورت میں اگر اصحاب شرکاء کے ہاں وسعت ہے تو زکوٰۃ دینی پڑے گی ورنہ نہیں یہ بھی یاد رہے کہ مختلف اشخاص کی کسی شئے کا حکم مسئلہ زکاۃ میں ایک شخص کی شئے کا حکم ہے۔ چنانچہ بکریوں والی حدیث اس امر کی واضح دلیل ہے، شرکاء میں سے ہر ایک کی بکریاں نصاب تک نہیں پہنچتیں مگر اکٹھی ہونے کی صورت میں تکمیل نصاب سے زکوٰۃ پڑ جاتی ہے۔❷

شرکاء دکان کا معاملہ بھی اسی طرح ہے بقدر حصص سب پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔

کیا زکوٰۃ تھوڑی تھوڑی کر کے ماہانہ دی جا سکتی ہے؟

سوال: کیا زکوٰۃ تھوڑی تھوڑی کر کے ماہانہ دی جا سکتی ہے؟ یوں کہ حساب کر کے مالِ زکوٰۃ الگ کر لیا پھر اس میں سے تھوڑا تھوڑا کر کے ادا کرتے رہیں یا یکمشت ادا کرنا لازم ہے؟

جواب: زکوٰۃ وجوب کے بعد فوراً ادا کر دینی چاہیے۔ فرضیت کا تقاضا یہی ہے۔ پھر خیر القرون کا تعامل بھی اسی پر تھا۔ اور ایک حدیث میں ہے زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال میں حق ہے اور قرآنی آیت ﴿لَيْسَ الْبِرَّ﴾ اور دیگر آیات جن میں عام انفاق کی ترغیب ہے۔ ان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ بلا تاخیر ادا کر دینی چاہیے تاکہ بعد میں انفاق ہذا کا موقع میسر آ سکے۔

ہاں البتہ مستحقین کے فقدان یا کسی اور سبب سے تھوڑی بہت لیٹ ہو جائے تو بظاہر کوئی حرج نہیں۔ (وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ)

یتیم کے مال میں زکوٰۃ کا حکم

سوال: ایک نابالغ یتیم بچے کی ایک معقول رقم بینک میں ہے۔ اس رقم میں سے زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہے یا نہیں یعنی اس رقم میں زکوٰۃ ہو گی یا نہیں؟ بَيِّنُوْا تُوجَرُوْا۔ (ایک سائل)

جواب: الجواب بعون الوهاب۔ یتیم کے مال میں زکوٰۃ کے بارے میں اہل علم کے مشہور تین اقوال ہیں۔ جمہور علماء

❶ سنن أبی داؤد، بَابُ الْعُرُوضِ إِذَا كَانَتْ لِلتِّجَارَةِ، هَلْ فِيهَا مِنْ زَكَاةٍ، رقم: ١٥٦٢، اسناده حسن

❷ موطأ مالك، بَابُ الْعَمَلِ فِي صَدَقَةِ عَامَيْنِ إِذَا اجْتَمَعَا، رقم:٥٥، صحيح البخاری........................

وجوبِ زکوٰۃ کے قائل ہیں جب کہ معدودے (چند) نفی کے قائل ہیں۔

اور بعض کے ہاں صرف زرعی پیداوار میں عشر واجب ہے اس کے علاوہ کوئی شے واجب نہیں۔

چند عمومی اور بعض خصوصی دلائل پہلے موقف کے مؤید ہیں، چنانچہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی مشہور صحیح حدیث میں ہے:

« تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ فَتُرَدُّ عَلَى فُقَرَائِهِمْ.» (مختصر المنذری لسنن ابی داؤد ۲/۳۰۰)[1]

یعنی ''زکوٰۃ مالداروں سے لے کر محتاجوں میں تقسیم کی جائے۔''

حدیث ہٰذا میں لفظ اغنیاء غنی کی جمع ہے۔ لفظ غنی اپنے عموم کے اعتبار سے یتیم کو بھی شامل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یتیم کے مال میں زکوٰۃ واجب ہے۔ علاوہ ازیں زکوٰۃ کا تعلق من وجہ عین مال سے بھی ہے جو وجوب کی دلیل ہے۔

نیز کچھ مخصوص احادیث بھی پہلے قول کی مؤید ہیں۔ مثلاً ایک روایت میں ہے:

« أَلَا مَنْ وَلِيَ يَتِيمًا لَهُ مَالٌ فَلْيَتَّجِرْ فِيهِ، وَلَا يَتْرُكْهُ حَتَّى تَأْكُلَهُ الصَّدَقَةُ..»[2]

''یعنی جو مالدار یتیم کا نگران ہو چاہیے کہ وہ اس کے مال کو تجارت میں لگائے رکھے۔ کہیں اسے زکوٰۃ ہی ختم نہ کر ڈالے۔''

نیز طبرانی اوسط میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے:

«اتَّجِرُوا فِي أَمْوَالِ الْيَتَامَى، لَا تَأْكُلُهَا الزَّكَاةُ.»[3]

''یعنی یتیموں کے مال میں تجارت کرو کہیں اسے زکوٰۃ نہ کھا جائے۔''

اگرچہ مصرح روایات اسانید کے اعتبار سے کچھ کمزور ہیں لیکن عموماتِ شریعت اور آثارِ صحابہ صحیحہ اور اقوال ائمہ عظام سے پہلے مسلک کو مزید تائید و تقویت حاصل ہوتی ہے۔

اس لیے راجح بات یہی ہے کہ یتیم کی جمع شدہ رقم میں زکوٰۃ واجب ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: تحفۃ الاحوذی (۲/۲۹۶ تا ۳۰۰، طبع مصری)

یاد رہے اس بارے میں چند سال قبل ''تنظیم اہل حدیث'' لاہور میں میرا ایک تفصیلی فتویٰ بھی شائع ہو چکا ہے۔

(هٰذَا مَا عِنْدِيْ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ وَ عِلْمُهٗ اَتَمُّ.)

---

[1] صحیح البخاری، بَابُ أَخْذِ الصَّدَقَةِ مِنَ الأَغْنِيَاءِ وَتُرَدَّ فِي الفُقَرَاءِ حَيْثُ كَانُوا، رقم:١٤٩٦، صحیح مسلم، باب الدعاء إلى الشهادتين وشرائع الإسلام، رقم:١٩، سنن ابن ماجه، بَابُ فَرْضِ الزَّكَاةِ، رقم: ١٧٨٣، سنن أبي داؤد، بَابٌ فِي زَكَاةِ السَّائِمَةِ، رقم:١٥٨٤

[2] سنن الترمذي، بَابُ مَا جَاءَ فِي زَكَاةِ مَالِ الْيَتِيمِ، رقم:٦٤١

[3] المعجم الاوسط، للطبراني، رقم:٤١٥٢

کیا ظالمانہ ٹیکسوں سے بچنے کے لیے رشوت دی جا سکتی ہے؟

سوال : بعض لوگ کہتے ہیں حکومت زکوٰۃ کے علاوہ کسی قسم کا ٹیکس لینے کی مجاز نہیں اور حکومت کی طرف سے عائد کردہ تمام ٹیکس عوام پر ظلم و جبر ہیں۔ اگر محکمہ ٹیکس کے افراد کی "مٹھی گرم" کر کے ان ٹیکسوں سے بچا جا سکے تو کیا یہ جائز ہے؟

(سائل) (۱۶ جنوری ۲۰۰۴ء)

جواب : بعض اہل علم کے نزدیک اس طریقے سے ظالمانہ چٹی سے بچنے کا جواز ہے۔

گھر، پلاٹ، دکان وغیرہ کی زکاۃ کے مسائل

رہائشی پلاٹ کی نیت اگر تجارت کی ہو جائے تو زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟

سوال : ایک پلاٹ رہائش کے لیے خریدا گیا لیکن بعد میں رہائش نہیں ہوئی تو تجارت کی بنیاد پر رکھ لیا گیا۔ کیا اس پر زکوٰۃ ہوگی یا نہیں۔ اگر ہوگی تو کب سالانہ یا فروخت کرنے پر؟ اگر سالانہ ہو تو پہلی قیمت خرید پر یا موجود قیمت پر؟ جب کہ ابھی پلاٹ فروخت کرنا مقصود نہیں ہے۔ یعنی فروخت نہیں ہوا۔ (ڈاکٹر عبدالغفور۔ سانگڑھ) (۳ مارچ ۲۰۰۰ء)

جواب : مذکورہ پلاٹ کی جب سے آپ نے تجارت کی نیت کی ہے۔ اُس وقت سے لے کر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ زکوٰۃ ہر سال درمیانی قیمت کے حساب سے ادا کر دینی چاہیے۔ پلاٹ فوری فروخت کرنا مقصود ہو یا نہ ہو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اعتبار صرف نیت کا ہے۔

ماہانہ کرایہ مکان سے حاصل شدہ رقم کا نصابِ زکوٰۃ

سوال : مجھے ہر ماہ کرایہ ۳۰۰۰ ہزار روپے ملتا ہے اور اس میں سے کچھ نہ کچھ بچ جاتا ہے اور میری آمدنی کا کوئی اور ذریعہ بھی نہ ہے۔ اس رقم پر میں زکوٰۃ کیسے دوں نیز یہ کہ کس رقم کو پورا سال بناؤں، اس طرح تو جنوری، فروری، مارچ وغیرہ ہر ماہ میری رقم کا سال بنے گا۔ قرآن حدیث کی رُو سے جواب عنایت فرمایے گا۔

(خلیل الرحمٰن محمدی پلازہ سرکلر روڈ، راجن پور) (۱۶/ اگست، ۱۹۹۱ء)

جواب : جو رقم آپ کے خرچ سے بچ جائے اور سال بھر جمع رہے اور نصابِ زکوٰۃ یعنی ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کو پہنچ جائے تب اس میں چالیسواں حصہ زکوٰۃ، واجب ہے ورنہ نہیں اور اضافی رقم ساتھ ملاتے جائیں۔ هَلُمَّ جَرًّا

کرایۂ مکان میں زکوٰۃ واجب ہونے کی صورت کیا ہے؟

سوال : میرے ایک عزیز جو ریٹائر آرمی آفیسر ہیں۔ مندرجہ ذیل امور میں ذہنی خلفشار کا شکار ہیں۔ براہِ کرم قرآن اور حدیث کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں۔

۱۔ ان کو ایک فلیٹ حکومت کی طرف سے ریٹائرمنٹ پر بطور انعام ملا جو انھوں نے کرائے پر اٹھایا ہوا ہے ذاتی حیثیت میں ان کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی رہائشی مکان نہیں ہے۔ خود وہ آج کل اپنے والدین کے پاس رہتے ہیں۔ اس کرائے کی رقم میں سے ان پر زکوٰۃ واجب ہے؟

۲۔ اس فلیٹ کے علاوہ ان کی ملکیت میں ایک خالی پلاٹ ہے جو انھوں نے ابھی بغیر تعمیر کے کاروباری نیت کے لیے رکھ چھوڑا ہے کہ مستقبل میں یا تو اس پر اپنا مکان تعمیر کرلیں گے اور یا اسے بیچ دیں گے۔ کیا اس پلاٹ پر انھیں زکوٰۃ دینا پڑے گی۔ اگر دینا پڑے گی تو کس قیمت پر؟ قیمت خرید پر یا اس کی تخمیناتی حالیہ مارکیٹ قیمت پر؟

۳۔ انھوں نے اپنے پراویڈینٹ فنڈ کی حاصل شدہ رقم مبلغ ۵ لاکھ روپیہ اپنے بھائی کے چالو کاروبار میں بطور اپنا حصہ لگا دیا ہے جس میں ابھی منافع شروع نہیں ہوا۔ اس صورت میں اس راس المال (اصل زر) پر انھیں زکوٰۃ دینا ہوگی؟

۴۔ وہ زیور جو ان کی بیوی کو ان کے والدین نے شادی کے موقع پر پہنایا تھا، دورانِ ملازمت جب تنخواہ بالکل واجبی سی تھی، انھوں نے اپنی بیوی کے اس زیور پر زکوٰۃ حیثیت کے مطابق کبھی ادا کی اور کبھی اپنی بیوی ہی کو کہا کہ وہ اپنے زیور پر سے زکوٰۃ نکالے۔ خواہ کسی چیز کو بیچ کر ادا کرے۔ بعد ازاں بچے ہوئے پر انھوں نے تمام زیور بچوں کی نیت پر علیحدہ علیحدہ رکھ لیا کہ یہ ان کی شادیاں ہونے پر انھیں تحفتاً پہنایا جائے گا۔ کیا اس صورت میں بھی ان پر اس زیور کی زکوٰۃ واجب ہوگی؟ خود وہ اپنی تنخواہ سے بمشکل اپنے گھریلو اخراجات پورے کر رہے ہیں۔ براہِ کرم قرآن و حدیث کی روشنی میں رہنمائی کریں۔ (حافظ محمد عباس۔ ماڈل ٹاؤن ایکسٹنشن لاہور)

جواب : ا۔ مکان کے کرائے میں زکوٰۃ اس صورت میں واجب ہے کہ وہ حد نصاب کو پہنچ جائے اور اس پر سال گزر جائے اور اگر سال گزرنے سے پہلے خرچ ہو جائے تو زکوٰۃ نہیں۔

۲۔ زمین کا وہ قطعہ جو بیع کے لیے ہے اس میں زکوٰۃ واجب ہے اور جس میں تردد ہو کوئی بات طے نہ ہو کہ اس پر مکان تعمیر کرنا ہے یا فروخت، اس میں زکوٰۃ نہیں۔ اہل علم نے اس امر کی تصریح کی ہے۔ چنانچہ سنن ابی داؤد میں حدیث ہے حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ ہم ہر اس مال سے زکوٰۃ نکالیں جسے ہم فروختی مال شمار کرتے تھے۔''

۳۔ منافع پر لگے ہوئے پیسے میں زکوٰۃ تجارتی قیمت پر ہوتی ہے جب کہ اس پر سال کا عرصہ گزر جائے لیکن تنخواہ کی کٹوتی سے حاصل شدہ منافع استعمال میں لانا محلِ نظر ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: (ماہنامہ ''محدث'' لاہور۔ ''سود نمبر'')

۴۔ محفوظ زیور جو نصاب کو پہنچتا ہے۔ اور اولاد کی شادی کی نیت سے رکھا گیا ہے۔ اس میں سے زکوٰۃ ادا کرنی چاہیے۔ اگرچہ بعض جزء یا اس کی قیمت فروخت سے ادائیگی ہو۔ کیونکہ یہ زیور ملکیت آپ کی ہے۔ بالفرض اگر یہ

بچوں کا ہوتا تو پھر بھی زکوٰۃ واجب تھی۔ چھوٹے بچوں کے لیے راجح مسلک یہ ہے کہ ان کے مال میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ اس موضوع پر میرا ایک تفصیلی فتویٰ تنظیم اہلحدیث لاہور میں شائع شدہ ہے۔

ذاتی رہائشی مکان پر زکوٰۃ کا حکم

سوال: ہمارے ایک دوست نے کچھ رقم دے کر بھائیوں اور بہنوں سے ان کے حصے خرید کر مکان کرایہ پر دیا ہوا ہے جب کہ ان کی رہائش پہلے ہی ایک ذاتی مکان میں ہے۔ جواب طلب بات یہ ہے کہ اضافی مکان کے کرائے پر زکوٰۃ ہے یا اصل مالیت پر یا دونوں پر وضاحت فرمائیں۔ (منیر احمد رحیم یار خان) (۲۶ مارچ ۱۹۹۹ء)

جواب: ذاتی رہائشی مکان پر زکوٰۃ نہیں۔ تاہم دوسرے مکان کے کرایہ پر زکوٰۃ ہے جب کہ اس پر سال گزر جائے اور اس رقم کو خرچ نہ کیا ہو۔ نصاب کو پہنچنے کی صورت میں زکوٰۃ واجب ہے۔

مکانوں اور دکان کی مالیت پر زکاۃ ادا کریں یا کرائے کی آمدن پر؟

سوال: ایک آدمی کے پاس چار گھر اور دو دکانیں ہیں۔ ایک گھر میں وہ خود رہتا ہے اور ایک دکان میں کاروبار کرتا ہے باقی تین گھر اور ایک دکان کرائے پر دی ہوئی ہے۔ کیا ان تین مکانوں اور دکان کی مالیت پر زکوٰۃ ہوگی یا کرائے کی آمدن پر خرچ نکال کر ہوگی؟

جواب: سال بعد جمع شدہ کرائے کی آمدن پر زکوٰۃ ہوگی۔ آمدن کے ذرائع پر زکوٰۃ نہیں بلکہ جو کچھ ان سے حاصل ہوگا اس میں زکوٰۃ ہے۔

سوال: فیکٹریوں والے اکثر زکوٰۃ نکالتے وقت اپنی فیکٹری کی زمین، عمارت، مشینری اور ہر قسم کی فٹنگ جو فیکٹری میں نصب ہوتی ہے، اُس پر زکوٰۃ نہیں دیتے۔ کیا یہ صحیح طریقہ ہے؟ لینا دینا نکال کر جو نقد رقم اُن کے پاس بچتی ہے، اُس پر زکوٰۃ دیتے ہیں، کیا اس طرح زکوٰۃ کا حق ادا ہو جائے گا؟

جواب: مذکورہ طریقہ کار درست ہے۔

خریدی ہوئی جائداد پر زکوٰۃ ہوگی؟

سوال: ایک آدمی کے پاس لاکھوں روپے ہیں اور باقاعدگی سے زکوٰۃ ادا کرتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ وہ اُس رقم کی جائداد خرید لیتا ہے اور اُس پر فی الحال کوئی آمدن نہیں ہے۔ کیا وہ شخص زکوٰۃ دینے سے مستثنیٰ ہو گیا ہے یا نہیں؟

جواب: جائداد اگر ذاتی ملکیت کے لیے خریدی ہے تو اس میں زکوٰۃ نہیں اور اگر بہ نیت تجارت خرید کی ہے تو اس میں زکوٰۃ واجب ہے۔

ذاتی رہائش مکان پر زکوٰۃ اور مفلوک الحال شخص کو زکوٰۃ دینے کا حکم؟

سوال : ایک آدمی کے پاس اپنا گھر ہے جس کی مالیت تقریباً ۱۰ لاکھ روپے ہے، کسی وجہ سے اُس کا ذریعہ معاش ختم ہو گیا اور نوبت فاقہ کشی کرنے پر آ گئی، کیا ایسے آدمی کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے؟

جواب : ذاتی رہائشی مکان پر زکوٰۃ نہیں، فقر و فاقہ کی صورت میں ایسے شخص کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔

(عشر کے مسائل)

گندم کی زکوٰۃ خرچ نکال کر دیں یا بغیر خرچ دیں؟

سوال : ۸ بوری گندم کی زکوٰۃ خرچ نکال کر دیں یا بغیر خرچ دیں؟

۱۔ عشر خرچ نکال کر یا بغیر خرچ کے؟

۲۔ فی بوری ۴۲۵ روپے قیمت ہے۔ (سائل: حاجی مشتاق احمد محمدی چک...... بہاولپور) (۱۲ دسمبر ۱۹۹۷ء)

جواب : مزدوری وغیرہ کے اخراجات نکال کر عشر ادا کریں۔ البتہ نوکر یا آلات زرعی یا بیج وغیرہ کا خرچ الگ نہ کریں اور عشر اصل گندم سے ادا کریں۔ بارانی زمین کا دسواں حصہ ہے اور چاہی کا بیسواں حصہ ہے۔ بارانی نصاب دس من سے ایک من اور چاہی کا بیس من سے ایک من دینا ضروری ہے۔

فصل کی تیاری پر اخراجات کا خرچ ملا کر عشر ادا کیا جائے گا؟

سوال : فصل کی تیاری کے لیے جو کھاد، سپرے اور دوسری دوائی وغیرہ ڈالی جاتی ہے کیا ان سب چیزوں کا خرچ ملا کر عشر ادا کیا جائے گا؟ (سائل: خلیل الرحمٰن بصری) (۹ اگست ۲۰۰۲ء)

جواب : کھاد، سپرے اور دوائی وغیرہ کے اخراجات کو بوقت عشر علیحدہ نہ کیا جائے، اگرچہ بظاہر ایک طرف خرچ ہے لیکن دوسری طرف اضافہ بھی تو متوقع ہے۔

ٹھیکے والی زمین کا عشر کون ادا کرے مالک یا کاشتکار؟

سوال : جو لوگ زمین ٹھیکے (کرایہ) پر دیتے ہیں، اس کا عشر مالک زمین ادا کرے گا یا زمین کو کاشت کرنے والا؟
(عبدالستار خطیب جامع مسجد اہل حدیث سمبلہ خورد) (۱۰ جولائی ۱۹۹۲ء)

جواب : ٹھیکہ وضع کر کے باقی آمدن کا عشر زمین کاشت کرنے والا ادا کرے گا۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ﴾ (الانعام:۱٤۱)

''اور جس دن (پھل توڑو اور کھیتی) کاٹو تو اللہ کا حق بھی اس میں سے ادا کرو۔''

وجہ استدلال یہ ہے کہ آیت میں مذکور خطاب صرف کاشت کار کو ہے چاہے مالک ہو یا غیر۔

کیا ٹھیکے والی زمین کا عشر مالک اور زمیندار دونوں ادا کریں؟

سوال: جو زمین ٹھیکہ پر دی جائے اس کے بارے میں عشر کا کیا حکم ہوگا (مالک زمین عشر دے یا ٹھیکہ پر لینے والا یا دونوں مزید یہ کہ مالک زمین کس حساب سے عشر ادا کرے۔؟ کیا وصول شدہ رقم کا دسواں حصہ بطورِ عشر دے۔؟

جواب: جو زمین ٹھیکہ پر دی گئی ہو زراعت کی صورت میں عشر صرف مستأجر (زمین ٹھیکہ پر لینے والے) پر واجب ہے مؤجر (زمین ٹھیکہ پر دینے والے) پر نہیں اور مذکورہ رقم اگر مؤجر (مالک) کے پاس سال بھر پڑی رہتی ہے تو اس میں صرف زکوٰۃ اڑھائی روپے سینکڑہ کے حساب سے واجب ہے۔

مالک اور مزارع عشر کس طرح ادا کریں؟

سوال: بٹائی (حصہ) پر زمین دینے کی صورت میں عشر غلے کی تقسیم سے پہلے ادا ہوگا یا سب مالک زمین اور مزارع اپنے اپنے حصے کا عشر ادا کریں گے۔ فی زمانہ بعض لوگ عشر وغیرہ کے تصور سے ہی نا آشنا ہیں تو ایسی صورت میں کیا ہو گا۔ زمین کا مالک اور مزارع دونوں یا ان میں سے ایک عشر نہ دینا چاہے تو دوسرا فریق اکیلا سارا عشر ادا کرے گا یا صرف اپنے حصے کا۔ (عبدالستار خطیب جامع مسجد اہل حدیث سمبلہ خورد) (۱۰ جولائی ۱۹۹۲ء)

جواب: مالک اور مزارع آمدن کا حساب لگا کر اکٹھا عشر ادا کریں۔ جس طرح کہ بکریوں کی بابت احادیث میں تصریح موجود ہے اور اگر ایک تیار نہ ہو تو دوسرے کو اپنے حصے کے بقدر بہر صورت عشر ادا کرنا ہی ہوگا۔

عشر کی ادائیگی خرچہ نکال کر کی جائے یا پہلے

سوال: کیا کہتے ہیں علماء مسئلہ عشر کے بارے میں کہ:

۱۔ فصل پر جو خرچ کیا جاتا ہے کسان وہ خرچہ نکال کر بقایا مال سے عشر دے یا کہ مکمل مال پر؟

۲۔ اگر کسی آدمی نے فصل پر خرچہ قرض لے کر کیا ہو تو کیا وہ آدمی قرض نکال کر عشر دے گا یا کہ مکمل مال پر؟

۳۔ اگر کسی آدمی نے زمین پٹے پر حاصل کی ہو اور اس پر فصل کاشت کرتا ہے کیا وہ پٹے والی رقم نکال کر عشر نکالے گا؟

۴۔ اگر کوئی آدمی اپنی جنس سے ایک من پر ایک کلو مقرر کر کے مسجد کو دے دیتا ہے اور عشر مسکینوں کو نہیں دیتا۔ کیا وہ اس آدمی سے عشر کے بارے میں کفایت کر جائے گا۔ نیز وہ مال جو اس نے مسجد پر لگایا ہے کیا اس کا مسجد پر لگانا درست ہے۔ کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دے کر عنداللہ ماجور ہوں۔

مدلل جواب تحریر فرمائیں۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔ (حافظ خوشی محمد وحافظ عبدالرحمٰن ضلع اوکاڑہ) (۱۱۔ ستمبر ۱۹۹۸ء)

جواب: (۱) عشر کی ادائیگی خرچہ نکال کر ہوگی۔

۲۔ فصل کا قرض نکال کر عشر ادا کیا جائے۔

۳۔ پٹے والی رقم نکال کر عشر ادا کیا جائے۔

۴۔ عشر کی ادائیگی شرعی مقادیر کے مطابق اور مستحقین کو دیا جانا ضروری ہے اور جو مال اس شخص نے مسجد پر صرف کیا ہے اس کے اجر و ثواب سے محروم نہیں رہے گا۔ ان شاء اللہ۔

بارش اور چشموں سے پرورش پانے والی فصل کا عشر

سوال: عشر ۱۹ من دانے ہونے کے بعد ایک من ہے یا دانے کم ہونے کی صورت میں بھی ان کا بیسواں حصہ دینا پڑے گا۔ مثلاً دانے بیس کلو ہوں تو اس میں سے بھی ایک کلو دینا ہوں گے؟ وضاحت فرمائیں کھاد اور دوائی وغیرہ کا خرچہ منہا کر کے عشر نکالنا چاہیے یا نہیں؟ (سائل) (۷ اپریل ۲۰۰۰)

جواب: صحیح حدیث میں ہے جو جنس بارش یا چشموں وغیرہ سے پرورش پائے یا زمین سے اپنی جڑوں کے ساتھ پانی کھینچ لے اس میں عشر ہے۔ اور چاہی وغیرہ میں نصف عشر ہے چاہے زمین کا بیس من پختہ انگریزی وزن نصاب ہے۔ اگر اس سے کم ہو تو زکوٰۃ واجب نہیں۔ البتہ نفلی صدقہ و خیرات کر دینی چاہیے۔ اس میں خیر و برکت ہے اور بارانی زمین کا نصاب اس سے آدھا ہے۔ (۱۰ من) اس سے کم میں عشر واجب نہیں۔ تاہم نفلی صدقہ و خیرات کرنا چاہیے۔

کیا عشر خوردنی اجناس سے ادا کیا جائے گا یا دیگر سے؟

سوال: کیا عشر صرف خوردنی اجناس (از قسم گندم۔ جو۔ مکی۔ باجرہ۔ چاول) سے ادا کیا جائے گا یا دیگر سے بھی؟
(محمد ہاشم شاہ قریشی۔ جیل روڈ۔ لاہور) (یکم ستمبر ۲۰۰۰ء)

جواب: ہر وہ چیز جس میں غذائیت اور ذخیرہ ہونے کی صلاحیت ہو، اس میں عشر (دسواں حصہ) واجب ہے۔ مذکورہ اجناس اسی قسم سے ہیں۔

کیا چنوں پر بھی گندم کی طرح عشر ہو گا یا زکوٰۃ؟

سوال: کیا چنوں پر بھی گندم کی طرح عشر ہو گا یا زکوٰۃ؟ (محمد ہاشم شاہ قریشی۔ جیل روڈ۔ لاہور) (یکم ستمبر ۲۰۰۰ء)

جواب: سابقہ دو علّتوں کی بنا پر گندم کی طرح چنوں میں بھی عشر واجب ہے۔

گوارا، مونگ، ماش، مسور، مونگ پھلی، سبزیات اشیاء روزمرہ کی وجہ سے عشر سے مستثنیٰ ہیں؟

سوال: کیا گوارا۔ مونگ۔ ماش، مسور، کماد، مونگ پھلی، سبزیات عشر سے مستثنیٰ ہیں یا اس پر عشر یا زکوٰۃ ہو گی۔ یہ اشیاء روزمرہ کی خوراک میں شامل نہیں؟ (محمد ہاشم شاہ قریشی۔ جیل روڈ۔ لاہور) (یکم ستمبر ۲۰۰۰ء)

جواب: مذکورہ اشیاء میں عشر واجب ہے کیونکہ سابقہ دونوں علتیں ان میں موجود ہیں۔ البتہ کماد کا حساب اندازاً گڑ کے

ساتھ کیا جائے گا۔ یاد رہے عشر کے وجوب کے لیے چیز کا روزمرہ خوراک کی اشیاء سے ہونا ضروری نہیں۔ صرف دو سابقہ علّتوں کا پایا جانا ضروری ہے۔

گندم، چاول، مکئی، کماد عشر نکالنے سے پہلے ان کی قیمت نکالنا شرعاً جائز ہے؟

سوال: گندم، چاول، مکئی، کماد پر ولایتی کھاد (یوریا۔ ڈی۔ اے۔ پی) کافی ڈالی جاتی ہے۔ عشر نکالنے سے پہلے ان کی قیمت نکالنا شرعاً جائز ہے؟ (محمد ہاشم شاہ قریشی۔ جیل روڈ۔ لاہور) (یکم ستمبر ۲۰۰۰ء)

جواب: عشر دیتے وقت اضافی اخراجات وضع کیے جاسکتے ہیں جو فصل کی افزائش وغیرہ کا سبب بنے ہیں۔

زرعی ٹیکس عشر کی ادائیگی سے پہلے منہا ہوسکتا ہے؟

سوال: اب زرعی ٹیکس بھی مالیہ اور آبیانہ کے علاوہ دینا پڑتا ہے کیا اسے بھی عشر کی ادائیگی سے پہلے منہا کیا جاسکتا ہے؟ (محمد ہاشم شاہ قریشی۔ جیل روڈ۔ لاہور) (یکم ستمبر ۲۰۰۰ء)

جواب: زرعی ٹیکس اور مالیہ بھی وضع کیا جاسکتا ہے۔ البتہ آبیانہ نہ نکالا جائے بلکہ نہری پانی کو کنوئیں کے حکم میں سمجھنا چاہیے۔ یعنی عشر کی بجائے نصف عشر یعنی بیسواں حصہ ادا کرے۔

کھالوں پر اگائے گئے درختوں کو فروخت کرنے کے بعد عشر دیں یا زکوٰۃ؟

سوال: لوگ کھالوں پر درخت لگا دیتے ہیں۔ چند سال بعد آٹھ دس درخت بیچ دیئے جاتے ہیں۔ کیا ان پر عشر یا زکوٰۃ دینا پڑے گی؟ (محمد ہاشم شاہ قریشی۔ جیل روڈ۔ لاہور) (یکم ستمبر ۲۰۰۰ء)

جواب: ان درختوں کی قیمت پر زکوٰۃ واجب ہوگی بشرطیکہ گھر میں پڑے پڑے سال گزر جائے اور اس سے قبل استعمال میں آجائے تو کچھ بھی واجب نہیں۔

عشر ادا کرنے سے پہلے ٹیوب ویل کا خرچہ نکالنا چاہیے؟

سوال: ٹیوب ویل سے ۸۰ روپے گھنٹہ کے حساب سے کرائے پر پانی خریدا جاتا ہے۔ کیا یہ خرچہ بھی عشر کی ادائیگی سے قبل منہا کیا جاسکتا ہے؟ (محمد ہاشم شاہ قریشی۔ جیل روڈ۔ لاہور) (یکم ستمبر ۲۰۰۰ء)

جواب: ٹیوب ویل کا خرچہ نہیں نکالا جائے گا بلکہ عشر کی بجائے نصف العشر یعنی بیسواں حصہ ادا کیا جائے گا۔

مل کو دیے جانے والے کماد پر عشر ہوگا یا زکوٰۃ؟

سوال: کماد عموماً مل والے خریدتے ہیں ۵ یا ۶ ماہ کے اندر کل قیمت ادا کرتے ہیں۔ کیا اس فصل پر عشر ہوگا یا زکوٰۃ؟

کیا کٹائی، لدائی اور نقل وحمل وغیرہ۔ از ڈیرہ تا کنڈا یا مل، کل قیمت سے نکال کر عشر ادا کیا جائے؟

(محمد ہاشم شاہ قریشی۔ جیل روڈ۔ لاہور) (یکم ستمبر ۲۰۰۰ء)

جواب: کماد جو مل کو دیا جاتا ہے، اس کے گڑ کا حساب لگا کر عشر ادا کیا جائے یا اس حساب سے ادائیگی پر اس کی قیمت ادا کر دی جائے اور اس کے دیگر اخراجات بھی وضع کیے جا سکتے ہیں۔

گڑ پر عشر ہوگا یا زکوٰۃ؟

سوال: گڑ پر عشر ہوگا یا زکوٰۃ؟ (محمد ہاشم شاہ قریشی۔ جیل روڈ۔ لاہور) (یکم ستمبر ۲۰۰۰ء)

جواب: گڑ پر عشر ہوگا۔

کماد کی فصل کا عشر

سوال: کماد کی فصل کی درج ذیل شکلیں ہیں:

۱۔ عموماً مل میں فروخت ہوتا ہے۔ مل تک ڈھلائی وغیرہ کا خرچ مالک کماد کے ذمہ ہے۔ کیا بعد از منہائی خرچ زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی یا عشر۔ مل قسطوں میں قیمت نقد رقم کی صورت میں ادا کرتی ہے۔

۲۔ گڑ یا کھانڈ بنا کر فروخت کیا جاتا ہے۔ اس میں عشر ہوگا یا زکوٰۃ؟

۳۔ اپنے بیج کے لیے کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ کچھ حصہ بطورِ بیج فروخت کیا جاتا ہے کیا عشر یا زکوٰۃ دونوں صورتوں میں ادا کرنا ہوتی ہے؟

۴۔ چارہ کے لیے استعمال ہوتا ہے کیا اس پر عشر یا زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی؟

۵۔ پونڈا کماد ہے جو صرف چوسنے کے لیے استعمال ہوتا ہے کیا اس پر عشر یا زکوٰۃ ہوگی؟ کافی مہنگا بکتا ہے۔

جواب: (۱) کماد کے ضروری اخراجات نکال کر گڑ کی صورت میں اندازہ کر کے عشر ادا کیا جائے۔

۲۔ گڑ یا کھانڈ وغیرہ کا عشر بیس من سے ایک من ادا کرنا واجب ہے۔

۳۔ بیج کے لیے کماد کا گڑ کی صورت میں اندازہ کر کے عشر ادا کرنا ہوگا۔

۴۔ اگر کچا کاٹ لیا جائے تو اس صورت میں عشر نہیں۔

۵۔ اور اگر پکا ہوا کاٹا جاتا ہے تو پھر گڑ کا اندازہ کر کے عشر ادا کرنا ہوگا۔ پہلی صورت میں سبزی کے حکم میں ہوگا بخلاف دوسری صورت کے۔ (وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ.)

۶۔ پونڈا کماد سے چونکہ اصل مقصد چوسنا ہے اس لیے اس میں عشر نہیں سبزی کے حکم میں ہوگا۔ البتہ اگر کوئی اس کا گڑ وغیرہ بنا لے تو پھر ادائیگی عشر واجب ہے۔

گنا کی فصل میں عشر قیمت کے اعتبار سے یا وزن کے اعتبار سے نکالیں؟

سوال: کیا گنا کی فصل میں عشر قیمت کے اعتبار سے نکالا جائے گا یا وزن کا اعتبار ہی ضروری ہے؟ بَیِّنُوْا تُوجَرُوْا

(ایک سائل) (۲۴ اکتوبر ۱۹۹۷ء)

جواب: کماد کا عشر گڑ شکر کے وزن کا اندازہ کر کے نکالا جائے۔ مثلاً گڑ شکر کا اندازہ پانچ وسق (۲۰ من پختہ) ہے تو بیس من کی قیمت کا دسواں یا بیسواں حصہ دیا جائے۔ حسبِ تفاوت بارانی یا چاہی اس سے زائد جتنا ہوگا اسی حساب سے اس کا عشر بھی ادا کرنا ہوگا۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَاتَّفَقُوا عَلَى وُجُوبِ الزَّكَاةِ فِيمَا زَادَ عَلٰى خَمْسَةِ أَوْسُقٍ بِحِسَابِهِ وَلَا وَقْصَ فِيهَا.»[1]

تھریشر مشین کے ذریعے جمع شدہ گندم پر عشر؟

سوال: عمر نے ایک تھریشر مشین خریدی اور پھر علاقہ بھر کے زمینداروں کے کھلیانوں پر جا کر گندم کی گھائی (دانہ اور بھوسہ الگ الگ) کی۔ طے پایا تھا کہ ہر دس بوری گندم کی گھائی پر ایک بوری عمر لے گا۔ اس طرح عمر کے پاس ۱۰۰ بوری گندم اکٹھی ہوگئی۔ کیا عمر پر عشر واجب الاداء ہے یا نہیں؟

جواب: سبزیوں کے ماسوا عشر زمین کی پیداوار میں ہے۔ تھریشر مشین کے ذریعے جمع شدہ گندم چونکہ اس قبیل سے نہیں، اس لیے اس میں عشر بھی نہیں۔

پکے ہوئے باغ کو ٹھیکے پر دینے کی صورت میں عشر کس طرح ادا کریں؟

سوال: تین بھائیوں نے مل کر باغ لگایا۔ جب باغ بار آور ہوا اور پک کر تیار ہوگیا تو انھوں نے یہ باغ ایک لاکھ روپے کے عوض ٹھیکہ پر دے دیا۔ اس صورت میں وہ عشر کس طرح ادا کریں؟

جواب: اس صورت میں عشر اکٹھے ایک مالک کی ملکیت سمجھ کر ادا کیا جائے گا جس طرح کہ شریعت میں مختلف مالکوں کی اکٹھی بکریوں کی زکوۃ کا حکم ہے۔

البتہ یہ شئے جس کا عشر ادا کرنا ہے ایسی ہونی چاہیے کہ اس کا ذخیرہ بھی ہو سکے۔ بصورتِ دیگر اس میں عشر نہیں۔ نیز عشرِ موجود جنس سے باندازہ خشک اور تخفیف چوتھائی حصہ قریباً کی صورت میں لیا جائے گا۔ پھر اسی حساب سے رقم ٹھیکے سے مستاجر کو واپس کر دی جائے۔

---

[1] فتح الباری: ۳/ ۳۵۰

کیا زمین کا کرایہ دینے والا بھی عشر ادا کرے گا؟

سوال: ٹھیکیدار زمین کا کرایہ بھی ادا کرتا ہے اور حکومت کے واجبات بھی ادا کرتا ہے اور فصل کا خرچ بھی ادا کرتا ہے۔ کیا اُسے عشر دینا ہوگا۔ نیز گنے کی فصل سے عشر کا مسئلہ بھی بالتفصیل بتائیں۔

(اساتذہ جامعہ خادم القرآن الحدیث، جھوک دادو) (۲۰/ اگست ۲۰۰۴ء)

جواب: ٹھیکیدار زمین کا ٹھیکہ نکال کر عشر دے، جب کہ حکومت کے واجبات دو طرح کے ہیں۔ مالی معاملہ اور نہری معاملہ۔ مالی نکال کر باقی ماندہ غلے سے عشر ادا کرے اور نہری معاملہ نہ نکالے بلکہ نہری زمین کو کنوئیں کے حکم میں سمجھنا چاہیے یعنی اُس میں سے عشر کی بجائے نصف عشر یعنی بیسواں حصہ ادا کرے۔

فصل کا خرچ بھی دو طرح کا ہے: ایک وہ جو فصل کا لازمی جز سمجھا جاتا ہے، جیسے بجائی کا خرچہ اور کھاد وغیرہ بھی بالتبع اس میں داخل ہے اس کو نہ نکالے، دوسرا وہ خرچہ ہے جو مزدور کی مزدوری تصور ہوتا ہے اس کو کاٹ لے۔

گنے کا عشر گڑ کے حساب سے ادا کرنا ہوگا اور اگر زمین میں کھڑا ہی فروخت کردیا جائے تو پھر بھی گڑ کا اندازہ کرلیا جائے۔ بیس من سے ایک من کی ادائیگی کرنا ہوگی، یعنی اس کی قیمت لگا کر حساب بے باق کردیا جائے۔ البتہ اگر گنا مویشیوں کا چارا بن جائے تو پھر اس میں کچھ بھی واجب نہیں۔

مختلف اجناس پر عشر کی ادائیگی

سوال: علی کے پاس ایک مربع اراضی ہے جس پر بیک وقت مختلف قسم کے اجناس کاشت کیے گئے تھے۔ جب تمام فصل اٹھالی گئی تو کل ۳۰ من ہوئی۔ جس میں کچھ گندم، کچھ چنے، کچھ کپاس اور کچھ دالیں تھیں۔ تمام اجناس کی قیمتیں بھی مارکیٹ میں یکساں نہیں تھیں۔ کیا تمام اجناس میں سے عشر نکالنا ہوگا یا کسی ایک جنس میں سے ایک من بطورِ عشر دے دینا کافی رہے گا۔ (زمین چاہی تھی) (سائل: احسان الحق، یاروخیل، میانوالی۔ حالیہ سکونت لاہور)

جواب: ایک موسم کی تمام جنسوں کو ملا کر عشر ادا کرنا چاہیے لیکن نسبت ادائیگی ہر جنس سے علیحدہ علیحدہ اس کے اپنے حساب سے ہوگی۔

دس ایکڑ کپاس پر کتنا عشر ہوگا؟

سوال: ایک آدمی دس ایکڑ کپاس بوتا ہے ہر ایک ایکڑ پر دو ہزار روپے خرچ آتا ہے اور کل آمدن ۲۰ من ہوتی ہے، کیا اب اس پر عشر ہوگا اور اس پر کوئی قرض بھی نہیں؟ (سائل: خلیل الرحمٰن بصری) (۹ اگست ۲۰۰۲ء)

جواب: واضح ہو کہ فصل پر دو طرح کا خرچ آتا ہے ایک وہ ہے جو زمیندار کے لیے ضروری ہے جیسے بیل، ٹریکٹر یا لوہار اور ترکھان کی مزدوری۔ یہ اشیاء چونکہ کھیتی کے لوازمات میں داخل ہیں۔ لہٰذا عشر دینے کے وقت ان کی اجرت نہ کاٹی

جائے۔ البتہ مزدوری کی اجرت کاٹی جاسکتی ہے۔ اسی طرح ٹھیکہ اور مالیہ نکال کر عشر ادا کرے اور آبیانہ الگ نہ کرے کیونکہ نہری زمین کو کنوئیں کے حکم میں سمجھنا چاہیے یعنی عشر کی بجائے نصف عشر یعنی بیسواں حصہ ادا کرے۔ سوال میں مذکورہ مجمل خرچ کو اسی معیار پر پرکھنا چاہیے۔

زمین کا عشر ٹھیکیدار ادا کرے گا یا کاشتکار؟

سوال: جو زمین ٹھیکہ پر دی جائے اس کے بارے میں عشر کا کیا حکم ہوگا مالک زمین عشر دے یا ٹھیکہ پر لینے والا یا دونوں، مزید یہ کہ مالک زمین کس حساب سے عشر ادا کرے یا پھر وصول شدہ رقم کا دسواں حصہ عشر دے دے؟

(محمد یحییٰ عزیز کوٹ رادھا کشن، قصور) (۱۵ جولائی ۱۹۹۴ء)

جواب: زمین ٹھیکہ پر لینے والا آدمی پہلے ٹھیکہ وضع کرے پھر باقی آمدن پر عشر ادا کرے۔ مالک زمین پر عشر نہیں۔ وہ صرف حاصل شدہ رقم سے سال گزرنے پر زکوٰۃ ادا کرے گا بشرطیکہ وہ سال بھر جمع رہے۔

عشر کتنے من جنس پر واجب ہوتا ہے؟

سوال: کتنے مَن جنس پر عُشر واجب ہو جاتا ہے۔ نیز عشر کل پیداوار کا دیا جائے یا پھر جو اپنے حصے میں آئے صرف اُسی کا۔ اگر ساری پیداوار کا دینا ہے تو کیا صرف مالک زمین ہی دے یا مزارع بھی اپنے اپنے حصوں سے دیں۔

(خالد مصطفیٰ۔ ایس ایس ٹی گورنمنٹ نسیم ہائی سکول حاصلانوالہ تحصیل پھالیہ ضلع گجرات) (۱۷ جنوری ۱۹۹۲)

جواب: نہری زمین بیس من سے ایک من اور بارانی دس من سے ایک من عشر ادا کرنا واجب ہے۔ حدیث میں ہے:

« فِيْمَا سَقَتِ السَّمَاءُ وَالْعُيُونُ اَو كَانَ عَثَرِيًّا الْعشْرُ وَ مَا سُقِيَ بِالنَّضْحِ نِصْفُ الْعُشْرِ » ❶

”یعنی جس کھیتی کو آسمان یا چشمے پانی پلائیں یا خود زمین کی رگوں سے پانی پیے اس میں عشر ہے اور جس کو اونٹوں وغیرہ سے پانی پلایا جائے اس میں نصف عشر واجب ہے۔“

مالک اور مزارع دونوں اپنے حصص کی نسبت سے عشر ادا کریں۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَ مِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ﴾ (البقرة:٢٦٧)

”جو کچھ ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالا ہے اس سے خرچ کرو۔“

اور دوسری جگہ ہے:

❶ صحيح البخاري، بَابُ الْعُشْرِ فِيمَا يُسْقَى مِنْ مَاءِ السَّمَاءِ، وَبِالْمَاءِ الْجَارِي ...... الخ، رقم:١٤٨٣ (ج:١، ص:٢٠١)

﴿وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ﴾ (الانعام:۱٤۱)

''فصل کا حق واجب کٹائی کے دن ادا کرو۔''

ان آیات اور احادیث میں مالک اور مزارع سب کے لیے عشر کی ادائیگی کا عمومی حکم ہے جس کا تقاضا ہے کہ کل پیداوار میں عشر ہو خواہ علیحدہ علیحدہ حصہ نصاب سے کم ہو۔ حدیث میں بکریوں وغیرہ کے متعلق تصریح موجود ہے۔

(ملاحظہ ہو کتاب الزکاۃ صحیح بخاری، ج:۱ص: ۱۹۵)

(سونا چاندی کے مسائل)

سونے میں زکوٰۃ کا نصاب

سوال: سونے پر زکوٰۃ کی شرح کیا ہے۔ کتنا سونا ہو تو زکوٰۃ دینی واجب ہوتی ہے۔

(سائل حبیب الحق محلّہ جامع مسجد روہتاس ضلع جہلم)

جواب: علی الاقل سونے کا نصاب ساڑھے سات تولہ ہے اس میں چالیسواں حصہ زکوٰۃ واجب ہے یا موجود نرخ کے اعتبار سے اس کی قیمت نقدی کی صورت میں ادا کی جائے۔

ساڑھے چھ تولہ سونے پر زکاۃ ادا کرنے کا حکم

سوال: ایک صاحبِ نصاب شخص کے پاس ساڑھے چھ تولے یا اس سے زائد وزن کا سونا ہے اور اس پر سال گزر چکا ہے، وہ زکوٰۃ کس حساب سے ادا کرے گا؟ جب کہ ہمارے ملک میں سونے کے دو ریٹ یعنی قیمت خرید اور قیمتِ فروخت رائج ہیں۔ مثال کے طور پر ایک بندہ ۵۰،۰۰۰ روپے مالیت کا سونا خریدتا ہے اور کچھ عرصے بعد اسے بیچنے کا ارادہ کرے تو سنارا سے کبھی بھی ۵۰،۰۰۰ روپے میں نہیں خریدے گا، بلکہ لازماً اس کی قیمت کم کرے گا اور قسم قسم کے کاروباری حیلوں سے کام لے گا کہ اس میں اتنا میل ہے اور اتنی پالش۔ اگر بیچتے وقت اس سونے کی قیمت ۴۸،۰۰۰ روپے بنتی ہو تو اس صورت میں وہ بندہ کتنی مالیت کے سونے کا مالک ہے؟ ۵۰،۰۰۰ روپے کا یا ۴۸،۰۰۰ روپے کا؟ اور وہ زکوٰۃ قیمت خرید کے حساب سے ادا کرے گا یا قیمتِ فروخت کے حساب سے؟ (ابوعبداللہ۔ مردان) (۱۱ جنوری ۲۰۰۲ء)

جواب: مذکورہ بالا صورت میں زکوٰۃ تو خالص سونے پر ہی ہے۔ اگر وہ ڈلی کی صورت میں ہے تو اس میں کھوٹ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور اگر وہ زیور کی صورت میں ہے تو اس کی زکوٰۃ میں فقہائے امت کا اختلاف ہے۔ زیادہ احتیاط والا مسلک یہ ہے کہ خالص سونے کا حساب لگا کر زیور کی زکوٰۃ ادا کی جائے۔ زکوٰۃ کی ادائیگی میں حساب قیمتِ فروخت کا لگائیں کیونکہ زکوٰۃ دینے والے کی حیثیت زیور کے بائع جیسی ہے۔ اس کے عوض میں جو شئے اس نے اللہ سے

حاصل کرنی ہے، وہ جنت ہے۔قرآن مجید میں ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾ (التوبة:١١١)

''اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لیے ہیں، اس کے عوض میں کہ ان کے لیے بہشت (تیار کی) ہے۔''

اپنے کو کھوٹ کے شبہ سے پاک کر لینا چاہیے، حدیث میں ہے:

«دَعْ مَا يُرِيْبُكَ اِلٰى مَا لَا يُرِيْبُكَ» ❶

''شبہ والی شئے کو چھوڑ کر اس کو اختیار کیا جائے جس میں شبہ نہیں۔''

سلامتی اس میں ہے کہ اللہ سے کھرے مال کا سودا کیا جائے کیونکہ اس کا عوض کھرا ہے اور وہ جنت ہے، جس کے اوصاف کریمہ سے کتاب و سنت بھرپور ہیں۔اللہ رب العزت ہم سب کو جنت الفردوس کا وارث بنائے۔آمین۔

مستعمل زیورات میں زکوٰۃ کا حکم

سوال : آیا عورت جو سونا استعمال میں لاتی ہے اس کی زکوٰۃ بھی دینی ضروری ہوتی ہے یا نہیں؟ (سائل حبیب الحق محلہ جامع مسجد روہتاس ضلع جہلم)

جواب : باقی مستعمل زیور کی زکوٰۃ کے بارے میں اگرچہ اہل علم کا اختلاف ہے تاہم احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ سال بہ سال اس کی بھی زکوٰۃ ادا کی جائے۔

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو''تفسیر اضواء البیان'' (ج:٢) اور پہلی شق کی مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو، ''مرعاۃ'' (ج:٣)۔

بیوی کے زیورات کی زکوٰۃ کا طریقہ

سوال : زید اپنی بیوی کے زیورات کی زکوٰۃ ادا کرنا چاہتا ہے۔لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ زیور ملاوٹ شدہ ہوتا ہے اور موتیوں کا وزن بھی شامل کیا جاتا ہے۔اب زکوٰۃ کے لیے خالص سونے کا وزن نکالا جائے گا یا ملاوٹ شدہ زیور ہی کا وزن ہوگا؟ زیور جس قیمت میں فروخت ہو رہا ہو وہ قیمت لگا کر زکوٰۃ نکالی جائے گی یا جو ریٹ مارکیٹ میں سونے کا چل رہا ہے۔

یہ بات واضح رہے کہ فروخت کرنے کی صورت میں قیمت تھوڑی ملتی ہے۔(شیخ نصیر احمد۔ملتان) (٣٠مئی ٢٠٠٨ء)

---

❶ صحيح البخاري، بَابُ تَفْسِيرِ الْمُشَبَّهَاتِ، قبل رقم الحديث:٢٠٥٢، سنن الترمذي، رقم:٢٥١٨، سنن الدارمي، بَابُ: دَعْ مَا يَرِيبُكَ إِلَى مَا لَا يَرِيبُكَ، رقم:٢٥٧٤، سنن النسائي، رقم:٥٣٩٧

جواب : زکوٰۃ موجودہ مارکیٹ ریٹ سے خالص سونے کا حساب لگا کر ادا کی جائے گی موتی اور کھوٹ کسی شمار میں نہیں آئے گا۔

زیور کی زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟

سوال : زیورات کی زکوٰۃ کے بارے میں صحیح اور ارجح مذہب کیا ہے؟ مدلل جواب دیں۔

(نور زماں۔بنوں) (۱۹ جنوری ۱۹۹۶ء)

جواب : زیور کی زکوٰۃ کے بارے میں اہل علم کا سخت اختلاف ہے۔سلف کی ایک جماعت عدمِ وجوب کی قائل ہے جب کہ دوسری جماعت کے نزدیک زکوٰۃ واجب ہے۔ جانبین کے استدلالات کا تعلق بعض احادیث، آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم قیاس اور لغوی وضع سے ہے۔

ان کے دلائل کا تفصیلی جائزہ شیخنا محمد الامین الشنقیطی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر''اضواء البیان'' میں خوب پیش کیا ہے جو لائق مطالعہ ہے۔(ج:۲،ص: ۲۹۸ تا ۳۰۸)

بحث کے اختتام پر رقمطراز ہیں:

« وَ إِخْرَاجُ زَكَاةِ الْحُلِيِّ أَحْوَطُ : لِأَنَّ مَنِ اتَّقَى الشُّبُهَاتِ فَقَدِ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ وَعِرْضِهِ. دَعْ مَا يَرِيبُكَ إِلَى مَا لَا يَرِيبُكَ ، وَالْعِلْمُ عِنْدَ اللَّهِ تَعَالَى.»

''یعنی زیادہ احتیاط والا مسلک یہ ہے کہ زیور کی زکوٰۃ ادا کی جائے کیونکہ جو شبہات سے بچا اس نے اپنا دین اور عزت و آبرو کو محفوظ کر لیا۔مشتبہ امر کو چھوڑ کر غیر مشتبہ کو اختیار کر۔''

اور ہمارے مربی اول محدث روپڑی رحمہ اللہ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

'' زکوٰۃِ زیور کے متعلق چند احادیث آئی ہیں۔لیکن ان میں کچھ کلام ہے۔اس لیے زیور میں زکوٰۃ فرض نہیں کہی جاسکتی۔البتہ احتیاط دینے میں ہے تاکہ شک وشبہ نہ رہے۔ہاں جو زیور اکثر رکھا جاتا ہے اور شاذ و نادر پہنا جاتا ہے تو ایسے زیور کی زکوٰۃ ضرور دینی چاہیے کیونکہ وہ خزانہ کا حکم رکھتا ہے۔ایسے پہننے کا اعتبار نہیں۔ اگر اکثر پہنا جاتا ہے یا پہننا یا نہ پہننا دونوں کا قریباً برابر وقت ہے۔تو یہ پہننے میں شامل ہوسکتا ہے۔'' [1]

میری تحقیق بھی یہی ہے کہ زیورات کی زکوٰۃ ادا کرنی چاہیے۔احتیاطی مسلک یہی ہے۔ہاں البتہ زیادہ تر مستعمل کی زکوٰۃ اگر نہ بھی ادا کی جائے تو گنجائش ہے۔

قرآن مجید میں ہے:

﴿ اَوَمَنْ یُّنَشَّؤُا فِی الْحِلْیَةِ وَهُوَ فِی الْخِصَامِ غَیْرُ مُبِیْنٍ﴾ (الزخرف:۱۸)

[1] فتاویٰ اهل حدیث ، ج:۲ ، ص: ۵۲۷

''کیا جو زیور میں پرورش پائے اور جھگڑے کے وقت بات نہ کر سکے۔ (اللہ کی بیٹی ہو سکتی ہے؟)
آیت ہذا سے وجہ استدلال یہ ہے کہ جو زیور عورت کا لازمی لاحقہ بن جاتا ہے وہ بمنزلہ لباس کے قرار پاتا ہے جس طرح لباس میں زکوٰۃ نہیں اسی طرح مستعمل زیور میں بھی نہیں۔ (وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.)

زیور کتنے وزن کا ہو تو زکوٰۃ ادا کی جائے؟

سوال : زیور کے متعلق حدیث میں جو آیا ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنا چاہیے کیا مقدار کی کوئی حد ہے کتنا وزن ہونا چاہیے۔ ڈھائی تولہ کے زیور پر بھی زکوٰۃ پڑے گی؟ (ابوطلحہ، گوالہ کالونی) (۸ جنوری ۱۹۹۹ء)

جواب : احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ زیورات کی زکوٰۃ دی جائے۔ اگر وہ سونا ہے تو $7\frac{1}{2}$ تولے خالص کا حساب لگا کر چالیسواں حصہ زکوٰۃ ادا کرنی چاہیے۔ اس سے کم میں زکوٰۃ نہیں۔ محقق مسلک یہی ہے۔ ملاحظہ ہو ''سبل السلام''

زیورات پر زکوٰۃ کا حکم

سوال : زیورات پر زکوٰۃ کا حکم، کتاب مصنفہ عطاء اللہ ڈیروی صاحب نظر سے گزری۔ اس میں مصنف نے ثابت کیا ہے کہ زیورات پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ آپ براہِ مہربانی اس مسئلہ پر روشنی ڈالیں کہ آیا یہ تحقیق درست ہے کہ نہیں؟

(ایک سائل) (۱۹ فروری ۱۹۹۹ء)

جواب : اصل بات یہ ہے کہ مسئلہ ہذا میں اہل علم کا سخت اختلاف ہے۔ ہر ایک نے اپنے نظریہ پر دلائل قائم کرنے کی سعی فرمائی ہے لیکن میری نظر میں دلائل کے اعتبار سے زیادہ احتیاط والا مسلک یہ ہے کہ زیورات کی زکاۃ دینی چاہیے۔ صحیح حدیث میں ہے جو شبہات سے بچا۔ اس نے اپنا دین، عزت و آبرو کو محفوظ کر لیا۔
اور دوسری روایت میں ہے: «دَعْ مَا يُرِيْبُكَ اِلٰی مَا لَا يُرِيْبُكَ» ❶
''شبہ والی شئے کو چھوڑ کر اس چیز کو اختیار کرنا چاہیے جس میں کوئی شبہ نہیں۔''
تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: اضواء البیان:۲/۳۹۸ تا ۴۰۸۔

قیمتی پتھر ''ہیرا'' کی موجودگی میں اس پر زکوٰۃ کا حکم:

سوال : ہیرا (Diamond) قیمتی پتھر ہے۔ اگر کسی کے پاس زینت کے لیے موجود ہو تو کیا اس پر زکوٰۃ ادا کی جائے؟

(عبدالرزاق، اختر، محمدی پینٹرز، رحیم یار خان) (۲ اگست ۱۹۹۶ء)

جواب : ہیرے میں زکوٰۃ نہیں۔ ❷

❶ صحیح البخاری، بَابُ تَفْسِيرِ الْمُشَبَّهَاتِ، سنن الترمذی، رقم:۲۵۱۹، سنن الدارمی، بَابُ: دَعْ مَا يَرِيبُكَ إِلَى مَا لَا يَرِيبُكَ، رقم:۲۵۷٤ ❷ صحیح البخاری، بَابُ مَا يُسْتَخْرَجُ مِنَ الْبَحْرِ، قبل رقم:۱٤۹۸

سوال: فضیلۃ الشیخ حافظ ثناء اللہ صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

آج کل ہمارے ہاں اہل علم اور عوام کے درمیان زیورات کی زکوٰۃ کے بارے میں شدید اختلافات چل رہے ہیں۔ ایک فریق زیور کی زکوٰۃ کا قائل ہے اور دوسرا منکر ہے۔ جناب سے گزارش ہے کہ اس مسئلہ پر مدلل وضاحت فرمادیں تاکہ ہر خاص وعام مستفید ہو۔ (محمد عامر خان۔کراچی) (۷ جولائی ۲۰۰۰ء)

جواب: زیورات کی زکوٰۃ میں اہل علم کا شدید اختلاف ہے۔ ایک گروہ زکوٰۃ کے عدمِ وجوب کا قائل ہے۔ ان میں سے صحابہ، تابعین، تبع تابعین رحمہم اللہ کی ایک جماعت کے علاوہ امام مالک رحمہ اللہ، شافعی رحمہ اللہ اور صحیح ترین قول کے مطابق امام احمد رحمہ اللہ ہیں۔ جب کہ دوسرا گروہ مباح زیورات میں زکوٰۃ کے وجوب کا قائل ہے۔ ان میں سے صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین کی ایک معقول تعداد کے علاوہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ بھی شامل ہیں۔ فریقین کے دلائل اور مناقشہ طوالت کا متقاضی ہے۔ جس کے لیے لمبی مجلس درکار ہے۔ سرِ دست اس کی گنجائش نہیں تاہم بالاختصار دلائل ملاحظہ فرمائیں۔

عدمِ وجوب کے دلائل: جو لوگ مباح زیورات میں زکوٰۃ کے قائل نہیں ان کے دلائل چار امور میں منحصر ہیں۔

۱۔ ایک حدیث جو امام بیہقی رحمہ اللہ نے ''معرفۃ السنن والاثار'' میں عافیہ بن ایوب کے طریق سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً بیان کی ہے:

« لَا زَكَاةَ فِي الْحُلِيِّ » ''یعنی زیورات میں زکوٰۃ نہیں۔''

امام صاحب فرماتے ہیں: « هٰذَا الْحَدِيْثُ لَا اَصْلَ لَهٗ......الخ » ''اس حدیث کی کوئی اصل نہیں۔'' عافیہ بن ایوب مجہول ہے۔ اس راوی سے استناد لینے والا اپنے دین اسلام کے بارے میں دھوکہ میں ہے۔ ایسا شخص ان لوگوں میں شامل ہے جو جھوٹوں کی روایت سے دلیل لیتے ہیں۔

ہمارے شیخ علامہ محمد الامین شنقیطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اسے جھوٹوں کی روایت کی جنس سے دلیل قرار دینا محل نظر ہے، کیونکہ عافیہ کے بارے میں کسی نے نہیں کہا کہ یہ کذاب ہے۔ زیادہ سے زیادہ بیہقی کے خیال میں یہ مجہول ہیں۔ ان کو اس بات کا علم نہیں ہو سکا کہ وہ ثقہ ہیں۔ ابن ابی حاتم نے ابو زرعہ سے اس کی توثیق نقل کی ہے۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''تلخیص'' میں کہا: ''عافیہ بن ایوب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ضعیف ہے۔'' ابن الجوزی رحمہ اللہ نے کہا: ''مجھے اس میں جرح معلوم نہیں ہو سکی۔ بلاشبہ جس نے اسے ''ثقہ'' قرار دیا ہے اس کا قول اس سے مقدم ہے۔ جس نے اسے مجہول کہا ہے۔ اصول میں معروف ہے کہ اجمالی جرح پر مجمل تعدیل کو تقدیم حاصل ہے۔ خلاصہ یہ کہ توثیق کا قول بیہقی رحمہ اللہ کے قولِ مجہول سے اولیٰ ہے۔ اس بناء پر مذکور حدیث سے استدلال لینا ثابت ہو گیا۔ روایتِ ہذا محلِ نزاع میں نص ہوئی۔ اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ ابن الجوزی رحمہ اللہ نے کہا ہمیں اس

میں جرح معلوم نہیں ہو سکی۔

۲۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول آثار و اقوال ہیں۔ مثلاً مؤطا امام مالک رحمہ اللہ میں ہے: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی زیر کفالت ان کی بھتیجیاں تھیں۔ ان کے پاس زیورات تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ان کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتی تھیں۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں مروی ہے کہ وہ اپنی بیٹیوں اور لونڈیوں کو سونا پہناتے، پھر ان کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتے تھے۔

بیہقی میں ہے، انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے زیورات کی زکوٰۃ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے کہا اس میں زکوٰۃ نہیں۔ بیہقی رحمہ اللہ نے حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے بھی نفی نقل کی ہے۔

۳۔ اور تیسری دلیل قیاس ہے کہ زیورات مجرد استعمال کے لیے ہیں ان سے تجارت اور نمو (بڑھنا) مقصود نہیں ہوتا۔ لہٰذا انھیں دیگر نفیس پتھروں یعنی لؤلؤ و مرجان کے ساتھ ملحق کیا جائے گا۔ وصفِ جامع یہ ہے کہ دونوں استعمال کے لیے ہیں انھیں بڑھانا مقصود نہیں۔

۴۔ اور چوتھی دلیل لغوی استعمال ہے۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ سونے کی زکوٰۃ کے بارے میں جو الفاظ وارد ہیں، عربوں کی زبان میں وہ زیورات کو شامل نہیں۔

زکوٰۃ کے وجوب کے دلائل:

اور جو لوگ زیورات میں زکوٰۃ کے وجوب کے قائل ہیں۔ ان کے دلائل بھی چار قسموں میں منحصر ہیں۔

۱۔ وہ احادیث جن میں زیورات میں وجوبِ زکوٰۃ کا ذکر ہے۔ سنن ابی داؤد اور نسائی میں عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ سے مروی روایت میں ہے کہ ایک عورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی۔ اس کی بیٹی کے ہاتھ میں سونے کے دو کڑے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا: ''کیا ان کی زکوٰۃ ادا کرتی ہو؟'' وہ کہنے لگی، نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تجھے یہ پسند ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے عوض قیامت کے دن دو آگ کے کنگن پہنائے۔'' اس عورت نے وہ دونوں کڑے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے ڈال دیے اور کہا یہ دونوں اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہیں۔ روایتِ ہذا حسن درجہ کی ہے۔ اور ام سلمہ کی حدیث ہے کہ انھوں نے سونے کے پازیب پہنے ہوئے تھے وہ کہنے لگیں: اے اللہ کے رسول! (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا یہ کنز (خزانے) کے حکم میں ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر یہ زکوٰۃ کے نصاب کو پہنچ جائیں تو زکوٰۃ ادا کرو، پھر یہ کنز کے حکم میں نہ رہیں گے۔''

یہ حدیث ''سنن ابی داؤد'' اور ''سنن دارقطنی'' نے روایت کی اور ''حاکم'' نے اسے صحیح کہا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ام سلمہ کو یہ نہیں کہا کہ زیور میں زکوٰۃ نہیں ہوتی۔

علامہ ابن باز رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو روایت کی جاتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''زیور میں زکوٰۃ

نہیں۔'' تو یہ حدیث ضعیف ہے۔ لہٰذا اس کا اصل سے یا احادیث صحیحہ سے معارضہ کرنا جائز نہیں۔ پھر نبی ﷺ کا عمومی فرمان ہے کہ: '' جس شخص کے پاس سونا اور چاندی ہو اور اس کی زکوٰۃ ادا نہ کرتا ہو تو قیامت کے دن اس کے لیے آگ کی بڑی بڑی تختیاں تیار کی جائیں گی، جن سے اس کے پہلو اور اس کے ماتھے اور اس کی پشت کو داغا جائے گا۔''

۲۔ کئی ایک آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں بھی اس امر کی تصریح موجود ہے۔ چنانچہ ابن ابی شیبہ اور بیہقی میں شعیب بن یسار کے طریق سے ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابوموسیٰ کو چٹھی لکھی کہ ''مسلمان عورتیں اپنے زیورات کی زکوٰۃ دیں۔'' امام بیہقی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ روایت مرسل ہے۔ شعیب بن یسار نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نہیں پایا۔ حسن بصری نے کہا ہے کہ ہمیں معلوم نہیں ہو سکا کہ خلفاء میں سے کوئی زیورات میں زکوٰۃ کا قائل ہو۔

جب کہ طبرانی اور بیہقی میں ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی بیوی نے ان سے زیورات کی زکوٰۃ کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ '' جب وہ دو سو درہموں کو پہنچ جائیں تو ان میں زکوٰۃ ہے۔''

بیہقی رحمہ اللہ نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ روایت کیا ہے کہ وہ اپنے خازن سالم کو لکھتے ہیں کہ وہ اپنی بیٹیوں کے زیورات کی زکوٰۃ ہر سال ادا کریں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی ایسے ہی منقول ہے۔ ''تلخیص'' میں ہے کہ ابن المنذر اور بیہقی نے یہ بات ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے۔

۳۔ اور جہاں تک قیاس کا تعلق ہے تو انھوں نے زیورات کو ٹکڑیوں وغیرہ پر قیاس کیا ہے۔ اس جامع وصف کی بناء پر کہ یہ سب نقدی ہے۔

۴۔ اور لغوی وضع کے اعتبار سے لفظ رقّہ اور لفظ ''اُوقیہ'' جو صحیح حدیث میں وارد ہے۔ سونے کی جملہ اقسام کو شامل ہے خواہ وہ ٹکڑیوں میں ہو، یا زیورات کی شکل میں۔

نتیجہ: جو لوگ وجوبِ زکوٰۃ کے قائل ہیں ان کی بیان کردہ توضیحات میں سے یہ بھی ہے کہ کئی ایک صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہ بات نبی ﷺ سے نقل کی ہے جب کہ عدمِ وجوب کی حدیث صرف جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور یہ بات شک وشبہ سے بالا ہے کہ کسی روایت میں راویوں کا کثیر تعداد میں ہونا ترجیح کی ایک صورت ہے۔ نیز وجوبِ زکوٰۃ والی روایات عدمِ وجوب کی حدیث سے قوی تر ہیں۔ اور اصول معروف ہے کہ وجوب، اباحت (جواز) پر مقدم ہوتا ہے تاکہ احتیاطاً آدمی ذمہ داری سے فارغ ہو جائے۔ پھر صریح واضح نصوص میں اصل سونے اور چاندی میں وجوبِ زکوٰۃ کا ذکر درحقیقت امر کی دلیل ہے کہ زیورات بھی اس کی جزء ہیں اور جو لوگ عدمِ وجوب کے قائل ہیں، وہ کہتے ہیں کہ وجوب کی احادیث کا تعلق اس زمانہ سے ہے جب عورتوں پر سونا حرام تھا اور جب سونا پہننا ان کے لیے مباح ہو گیا تو زکوٰۃ بھی ساقط ہو گئی۔ لیکن صحیح اور تحقیقی بات یہ ہے کہ سابقہ نصوص کی بناء پر زیورات میں زکوٰۃ واجب ہے۔ (وَاللّٰہُ تَعَالٰی اَعْلَمُ)

جملہ تفاصیل کے لیے ملاحظہ ہو: تفسیر اضواء البیان: ۲/ ۳۹۸ تا ۴۰۸۔

(آمدنی پر زکوٰۃ)

سواریاں اور سامان لاد کر لے جانے والی گاڑی پر زکوٰۃ کا حکم

سوال: ابراہیم کے پاس اپنی گاڑی (سوزوکی) ہے۔ وہ اپنی اس گاڑی میں سواریاں بٹھاتا ہے۔ سامان لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتا ہے۔ اس طرح کرایہ لے کر گزر اوقات کرتا ہے۔ کیا اس گاڑی پر زکوٰۃ ہے؟ آپ کے شیخ ''محدث روپڑی صاحب'' کا فتویٰ ہے کہ فرض نہیں......

جواب: مستعمل گاڑی پر زکوٰۃ نہیں۔ البتہ اس کے کرایہ کی جمع شدہ رقم اگر نصاب کو پہنچ جائے اور اس پر سال گزر جائے تو اس میں زکوٰۃ واجب ہے۔ دلیل اس امر کی یہ ہے کہ قصہ خضر اور موسیٰ میں مساکین کے لیے کشتی کا اثبات ہے۔ جو مالیت کی ہوتی ہے جب کہ دوسری طرف مسکینوں کا شمار مصارف زکوٰۃ میں بھی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ذریعہ آمدنی ٹرک۔ گاڑی، مشینری وغیرہ پر زکوٰۃ نہیں۔ ہمارے شیخ ''محدث روپڑی رحمہ اللہ'' نے بھی اس واقعہ سے استدلال کیا ہے۔ ملاحظہ ہو فتاویٰ اہل حدیث: (۵۲۳/۲)

ٹریکٹر ٹرالی سے حاصل شدہ آمدنی کی زکوٰۃ کا حکم

سوال: میرا لڑکا پنشن پر آیا۔ اس کو جو رقم ملی۔ اس سے ۱۹۸۷ء میں ایک دکان ۷۰ ہزار روپے میں خرید کر کرائے پر دے دی۔ مختلف اوقات میں کرایہ مختلف تھا..... ۱۹۹۴ء میں، میں نے ایک شخص کے ساتھ شراکت کی۔ ہم نے ایک ٹریکٹر ٹرالی لیا۔ جس کو ایک سال بعد ۳۵ ہزار روپے نقصان پر بیچنا پڑ گیا۔ ۱۹۹۵ء میں ڈیڑھ لاکھ میں ذاتی طور پر ٹریکٹر ٹرالی لی ہے۔ جو کرایہ پر چل رہی ہے۔

میں نے ایک جگہ پڑھا ہے۔ کہ جو مکان، دکان یا گاڑی ذاتی استعمال میں ہو اس پر کوئی زکوٰۃ نہیں لیکن اگر کرایہ پر دی جائیں تو زکوٰۃ ہے۔ ان کی زکوٰۃ کس طرح ادا کی جائے گی جب کہ کرایہ ساتھ ہی ساتھ گھریلو اخراجات میں صرف ہو جاتا ہے۔ براہِ مہربانی پوری وضاحت فرمائیں۔ شکریہ۔ (شاہ جہاں ملک۔ میانوالی) (۱۴ اکتوبر ۱۹۹۶ء)

جواب: مکان، دکان یا گاڑی، ٹریکٹر ٹرالی وغیرہ کی آمدن میں زکوٰۃ صرف اس صورت میں واجب ہے۔ جب سال بھر رقم جمع رہے اور حد نصاب کو پہنچ جائے گھریلو اخراجات میں صرف ہونے کی صورت میں کوئی شے اس میں واجب نہیں۔

تجارتی آمدن میں زکوٰۃ کا طریقہ

سوال: ایک شخص کریانہ مرچنٹ ہے اور ہر سال چھ ماہ بعد دوکانیں اور مکان بنا کر کرایہ پر دیتا ہے۔ دوسرا شخص ٹرانسپورٹر ہے اور موقعہ بہ موقعہ نئی گاڑیاں خرید کر ٹرانسپورٹ میں اضافہ کرتا ہے۔ تیسرا شخص مویشیوں کا کاروبار کرتا ہے۔

کبھی اس کے پاس ۱۰۰ عدد بھینس ہوتی ہیں۔ کبھی ۲۰ عدد۔

کیا زکوٰۃ ہر سال کسی مخصوص ماہ میں ادا کرنی ہے۔ یا مختلف بھینسوں پر سال گزرنے پر۔ کیا مویشیوں کے علاوہ ٹرانسپورٹر اور دوسرے شخص پر بھی زکوٰۃ ہے یا نہیں، ہے تو کیسے؟ نہیں تو کیوں؟ (سائل محمد اکرم) (۲۶ اپریل ۱۹۹۶ء)

جواب: مذکورہ صورت میں جملہ افراد پر علیحدہ علیحدہ زکوٰۃ واجب ہے لیکن ان کی نوعیت مختلف ہے۔ مثلاً مالِ تجارت کا سال بعد حساب لگا کر چاہے جونسا مہینہ ہو، زکوٰۃ ادا کی جائے۔ مکانوں اور زمینوں اور دیگر ذرائع آمدن وغیرہ پر زکوٰۃ نہیں لیکن جو کچھ ان سے حاصل ہو اس پر زکوٰۃ ہے۔ ہاں البتہ اگر کسی شئے کو بہ نیت تجارت خرید کیا گیا ہو تو اس پر بھی زکوٰۃ ہے۔ حدیث میں ہے:

« فَإِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَأْمُرُنَا أَنْ نُخْرِجَ الصَّدَقَةَ مِنَ الَّذِي نُعِدُّ لِلْبَيْعِ. » [1]

اس کی ادائیگی کی صورت یہ ہے کہ ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت کو اصل قرار دے کر چالیسواں حصہ ادا کی جائے۔ البتہ بھینسوں کا نصاب تیس میں سے ایک سالہ بچہ ہے۔ جس طرح گائے کے نصاب میں ہے اور اگر یہ تجارت کے لیے ہے تو سال بعد قیمت کا حساب لگا کر زکوٰۃ ادا کی جائے۔ دلیل حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ کی سابقہ روایت ہے۔

چلتے ہوئے کاروبار کی شکل میں اگر رقم پاس جمع نہ رہے تو اس کی زکوٰۃ کا حکم

سوال: ایسا کاروبار جس میں رقم جمع نہیں ہوتی۔ رقم آتی ہے خرچ ہو جاتی ہے، مثلاً تاجر ایک چیز دس ہزار کی لے کر گیارہ ہزار کی بیچ دیتا ہے پھر اور چیز لے آتا ہے سال کے بعد زکوٰۃ کا حساب کیسے کیا جائے گا؟ کپڑے کی دکان یا کریانے کی دکان کا حساب سال کے بعد اندازے سے کیا جائے گا، یا تھانوں کی گنتی اور سامان کا وزن کر کے؟

(ظفر اقبال، گوجرانوالہ) (۳۱ جنوری ۲۰۰۳ء)

جواب: جو چیز سال بھر جمع نہ رہے خرچ ہو جائے اس میں زکاۃ نہیں۔ نیز جو اشیاء دکان میں موجود ہیں سال گزرنے پر ان کی مالیت کا حساب لگا کر زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی۔ ''سنن ابی داؤد'' میں بسند حسن حضرت سمرۃ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

« فَإِنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَأْمُرُنَا أَنْ نُخْرِجَ الصَّدَقَةَ مِنَ الَّذِي نُعِدُّ لِلْبَيْعِ. » [2]

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم فرمایا کہ تجارتی مال سے ہم زکوٰۃ ادا کریں۔''

---

[1] سنن أبی داود، بَابُ الْعُرُوضِ إِذَا كَانَتْ لِلتِّجَارَةِ، هَلْ فِيهَا مِنْ زَكَاةٍ، رقم: ١٥٦٢، اسناده حسن

[2] أيضًا

دوکاندار اپنی رقم سے زکوٰۃ نکالے یا سارے مالِ تجارت سے؟

سوال : ایک دوکاندار سال کے بعد صرف اپنی رقم سے زکوٰۃ نکالے یا سارے مالِ تجارت کی؟ وضاحت فرمائیں۔

(محمد ابراہیم نجیب۔فیصل آباد) (۲۹۔اگست ۱۹۹۷ء)

جواب : سال بعد مال کی تجارت سے زکوٰۃ دی جائے۔ چنانچہ سنن ابو داؤد میں حدیث ہے۔حضرت سمرہ بن جندب فرماتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہم ہر اس مال سے زکوٰۃ نکالیں۔ جسے ہم فروختنی مال شمار کرتے تھے۔ [1]

اور قرآن مجید میں ہے:

﴿يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ﴾ (البقرة: ٢٦٧)

''مومنو! جو پاکیزہ اور عمدہ مال تم کماتے ہو اور جو چیزیں ہم تمھارے لیے زمین سے نکالتے ہیں۔ان میں سے (فی سبیل اللہ) خرچ کرو۔''

اس میں دستکاری، بیع وشراء وغیرہ داخل ہے۔

گھر کے پلاٹ پر زکوٰۃ، اور سونے چاندی کا نصاب؟

سوال : کیا اپنے گھر کی جگہ پر کوئی پلاٹ وغیرہ خرید کیا گیا ہو اس پر یا دکان وغیرہ پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کتنی؟ تفصیل سے جواب دیں اور سونے اور چاندی کا نصاب بھی بتائیں۔

(سائل: جمعہ خان۔تالپوری،ضلع سانگھڑ،سندھ) (یکم ستمبر ۱۹۹۵ء)

جواب : رہائشی مکان پر زکوٰۃ نہیں۔اسی طرح وہ پلاٹ جو ذاتی استعمال کے لیے خرید کیا گیا ہے۔اس پر بھی زکوٰۃ نہیں اور اگر بغرض تجارت ہے تو پھر اس پر زکوٰۃ واجب ہے جس کی صورت یہ ہے کہ اس کی سالانہ قیمت کو ساڑھے باون تولہ چاندی کو معیار بنا کر سال بعد زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

اور دکان اگر کرایہ پر دی ہے تو اس کی آمدنی کا حساب چاندی کے سابقہ وزن کو معیار بنا کر زکوٰۃ ادا کی جائے۔اور اگر وہ ذاتی استعمال کے لیے ہے تو اس میں کوئی شے واجب نہیں۔

قرآن مجید ''سورۃ التوبہ'' میں مصارف زکوٰۃ میں سے ایک مساکین بھی بیان ہوا ہے۔جب کہ ''سورۃ الکھف'' میں قصۂ موسیٰ علیہ السلام اور خضر میں صفت مسکینی سے متصف لوگوں کے لیے کشتی کے وجود کو ثابت کیا گیا ہے۔جو ذی قیمت شئے تھی۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ذریعۂ آمدن اور ذریعہ پیداوار پر زکوٰۃ نہیں۔ چاندی اور سونے کا نصاب یوں ہے کہ اگر کسی کے پاس ساڑھے باون تولہ چاندی ہو تو اس میں چالیسواں حصہ واجب ہے۔اور ساڑھے سات تولے سونا

[1] سنن أبی داؤد، بَابُ الْعُرُوضِ إِذَا كَانَتْ لِلتِّجَارَةِ، هَلْ فِيهَا مِنْ زَكَاةٍ، رقم: ١٥٦٢ ، اسناده حسن

میں بھی چالیسواں حصہ واجب ہے۔

(نقدی پر زکوٰۃ)

کتنی نقدی ہو تو زکوٰۃ ادا کرنی چاہیے؟

سوال: اس زمانے میں کم از کم کتنے ہزار روپیہ نقدی ہو تو زکوٰۃ ادا کرنی فرض ہوگی؟

(محمد صدیق تلیاں، ایبٹ آباد) (۱۸ جون ۱۹۹۹ء)

جواب: ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت جو بھی موجودہ نرخ کے حساب سے ہو۔

کسی مسلمان کے پاس دو ہزار روپے ہیں کیا وہ بھی زکوٰۃ دے گا؟

سوال: کسی مسلمان کے پاس صرف ۲۰۰۰ (دو ہزار روپیہ) ہے کیا وہ بھی زکوٰۃ دے گا؟

(محمد صدیق تلیاں، ایبٹ آباد) (۱۸ جون ۱۹۹۹ء)

جواب: زکوٰۃ ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کی قیمت پر واجب ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ دو ہزار روپے آج کل اس کی قیمت سے کم ہیں لہٰذا اس میں زکوٰۃ واجب نہیں۔

زکوٰۃ کا نصاب نقدی رقوم میں چاندی کی بنیاد پر مقرر ہوگا

سوال: زکوٰۃ کا نصاب نقدی رقوم میں سونے کی یا چاندی کی بنیاد پر ہوگا؟

(محمد صدیق تلیاں، ایبٹ آباد) (۱۸ جون ۱۹۹۹ء)

جواب: نقدی رقم میں زکوٰۃ کا نصاب چاندی کی بنیاد پر ہوگا کیونکہ اصح ترین نص سے ثابت ہے۔

کم از کم کتنی نقدی ہو تو سال گزرنے پر زکوٰۃ فرض ہو جاتی ہے؟

سوال: نقدی (رقم) کی کم از کم کتنی مقدار پر سال کا عرصہ گزرے تو اس پر زکوٰۃ لاگو ہوتی ہے۔ کیونکہ چاندی پر تو سات تولے سے کم پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ (۲۶ جولائی ۱۹۹۶ء)

جواب: چاندی کا نصاب زکوٰۃ ساڑھے باون تولے ہے، سات تولے نہیں۔ اس میں چالیسواں حصہ واجب ہے۔ سال کے بعد اس کی قیمت کے مطابق رقم کا حساب لگا لیا جائے۔

ادھار دی ہوئی رقم پر زکوٰۃ کا حکم

سوال: کسی شخص نے کسی دوسرے کو رقم ادھار دے رکھی ہو تو کیا اس رقم کی زکوٰۃ ادا کی جائے گی جب کہ رقم یقین نہیں کہ کب تک واپس کی جائے گی؟ (عبدالرزاق اختر، رحیم یار خان) (۱۱ جنوری ۲۰۰۲ء)

جواب: کاروباری رقم اگر ڈوبی ہو تو ملنے پر ایک سال کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے۔ (موطأ امام مالک)

دورانِ ملازمت پنشن جو بنک میں جمع رہتی ہے اس پر زکوٰۃ نکالتے رہنا چاہیے؟

سوال: ہم سرکاری ملازمین کی جو رقم دورانِ ملازمت حکومت کے پاس جی پی فنڈ میں جمع رہتی ہے اور پنشن پانے کے بعد یکمشت ملتی ہے کیا اس پر دورانِ ملازمت سرکاری ملازم کو زکوٰۃ نکالتے رہنا چاہیے۔

(حاجی عبدالرحمٰن السلفی چترال) (۱۵ جنوری ۱۹۹۹ء)

جواب: جی پی فنڈ میں جمع شدہ رقم جب ملے تو صرف ایک سال کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے تو کافی ہے۔ یہ مال ضمار کے حکم میں ہے۔ مالِ ضمار اس کو کہا جاتا ہے جو آدمی کی مِلک ہو۔ لیکن اس پر قبضہ نہ ہو یعنی اس میں تصرف کی قدرت نہ ہو تو خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز کا یہی فیصلہ ہے۔ ملاحظہ ہو: موطأ امام مالک مع شرح زرقانی رحمہ اللہ۔

ویلفیئر کمیٹی کے پاس بچی ہوئی زکوٰۃ کی رقم

سوال: محترمی و مکرمی جناب مفتی ثناء اللہ مدنی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ! ہماری برادری کی ایک ویلفیئر کمیٹی ہے، جس کے ارکان، صاحبِ حیثیت افراد سے زکوٰۃ کی رقم وصول کر کے برادری کے مستحق افراد تک پہنچاتے ہیں۔ خرچ کی ترتیب درج ذیل ہے۔

(۱) ماہانہ وظائف۔ (۲) تعلیمی اخراجات۔ کتب، اسکول فیس وغیرہ۔ (۳) علاج معالجہ (۳) شادی وغیرہ

وصول کردہ زکوٰۃ پورا سال تواتر سے خرچ کرتے رہتے ہیں۔ سال گزر جانے کے بعد زکوٰۃ کی جو رقم بچ جاتی ہے اسی میں دوسرے سال کی زکوٰۃ جمع کر دیتے ہیں تاکہ اگر دوسرے سال کی زکوٰۃ کی رقم کم جمع ہو تو پہلے سال والی زکوٰۃ کی رقم مل کر پورا سال وظائف جاری رہ سکیں۔ مجھے مسئلہ یہ پوچھنا ہے کہ زکوٰۃ کی رقم کب تک رکھ سکتے ہیں۔ جس سال کی زکوٰۃ ہو کیا اسی سال خرچ کرنا ضروری ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں جواب دے کر عنداللہ ماجور ہوں۔

(محمد اسماعیل میارہ) (۱۸ مئی ۲۰۰۱ء)

جواب: صورتِ مسئولہ میں حاجت سے زائد زکوٰۃ کی رقم سال پورا ہو جانے کے بعد بھی پڑی رہے تو کوئی حرج نہیں کیونکہ اس میں صاحبِ زکوٰۃ کی انفرادی ملکیت کا تصور نہیں رہتا، بلکہ جملہ احباب کی طرف سے ادا شدہ ہے جو واپس نہیں ہوتی۔ تاہم بہتر یہ ہے کہ موجودہ کیفیت کو بیت المال کی شکل دی جائے، جس میں تمام قسم کے صدقات و خیرات جمع ہوں، پھر حسبِ ضرورت ان کو مستحقین میں بانٹ دیا جائے۔

سال بھر پڑی زکوٰۃ کی رقم میں زکوٰۃ کا حکم

سوال: سال بھر پڑی زکوٰۃ کی رقم میں زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟ (یقین شاہ اورکزئی ابوظہبی) (۲۵ اکتوبر ۱۹۹۶ء)

جواب : سال بھر پڑی ہوئی زکوٰۃ کی رقم پر زکوٰۃ نہیں کیونکہ یہ فقراء ومساکین وغیرہ کا حق ہے جو بذاتِ خود صدقہ ہے پس صدقہ میں صدقہ کے کچھ معنی نہیں اسی بناء پر بیت المال میں جمع شدہ مال پر بھی زکوٰۃ نہیں جس طرح کہ وقف شیئے میں بھی زکوٰۃ نہیں۔ اسی بناء پر آپ ﷺ نے خالد رضی اللہ عنہ کو زکوٰۃ کی ادائیگی سے معذور سمجھا۔ ملاحظہ ہو: صحیح بخاری کتاب الزکاۃ۔

ادا کی ہوئی زکوٰۃ پر زکوٰۃ کا حکم

سوال : ایک عورت نے اپنی زکوٰۃ (زیور وغیرہ) کی از خود ادا کر دی۔ بعد میں شوہر نے بیوی کو اسی زیور کی زکوٰۃ کی رقم دی کہ یہ تمہارے زیور کی زکوٰۃ ہے کسی ضرورت مند کو دے دیں کیا اب یہ رقم بیوی اپنے استعمال میں لائے ، کیونکہ وہ زیور کی اس عرصے کی زکوٰۃ دے چکی ہے یا دوبارہ وہ رقم زکوٰۃ کی مد میں خرچ کرے۔

(محمد الیاس دوائی والا۔ کراچی) (۱۲ مارچ ۱۹۹۹ء)

جواب : مذکورہ بالا صورت میں عورت کو چاہیے کہ وضاحت کر دے کہ میں زکوٰۃ پہلے ادا کر چکی ہوں۔ یہ رقم تم واپس لے لو۔ اگر وہ اس کو اس کے استعمال کی اجازت دے تو اپنی حاجات میں صرف کر سکتی ہے۔ اس لیے کہ اصلاً یہ مالِ زکوٰۃ نہیں زکوٰۃ تو پہلے ادا ہو چکی۔ اس رقم کو دوبارہ زکوٰۃ کی مد میں محفوظ رکھنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں البتہ پیشگی زکوٰۃ سمجھ کر اس کو زکوٰۃ کی مَد میں صَرف کر دیا جائے تو جواز ہے۔

(مصارفِ زکوٰۃ)

زکوٰۃ کے مصارف کتنے ہیں؟ اور کیا مدرّس کو زکوٰۃ سے تنخواہ دی جا سکتی ہے؟

سوال : کیا زکوٰۃ سے مدرس کو تنخواہ دی جا سکتی ہے؟ نیز اسے عمارت اور تعمیر پر خرچ کرنا کیسا ہے؟ قربانی کی کھالوں کا مصرف کیا ہے؟

جواب : قرآن مجید میں زکوٰۃ کے آٹھ مصارف بیان ہوئے ہیں۔ ان میں ایک ''فی سبیل اللہ'' بھی ہے۔ کئی ایک اہل علم نے اس کو وسعت دے کر جملہ امورِ خیر کو اس میں شامل کیا ہے لیکن یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی کیونکہ لفظ ''فی سبیل اللہ'' کو اگر اتنا عام تسلیم کر لیا جائے تو سات مصارف کی چنداں ضرورت نہیں باقی رہتی۔ اصل بات یہ ہے کہ لفظ ''فی سبیل اللہ'' دشمن کافر سے جنگ جہاد کے ساتھ مخصوص ہے بعض علماء کے نزدیک حج اور عمرہ بھی اس میں داخل ہے۔ جس طرح کہ بعض احادیث میں مصرح ہے۔ ان کے علاوہ دیگر امور کو اس میں شامل کرنا بلا دلیل نص قرآنی پر تحکم و زیادتی ہے۔

واضح ہو کہ مدرس کی تنخواہ چونکہ اس کی محنت کا معاوضہ ہوتی ہے جب کہ مالِ زکوٰۃ میں معاوضہ بننے کی صلاحیت نہیں اس لیے مدرس کو بطورِ تنخواہ زکوٰۃ نہیں دی جا سکتی۔ نیز مدرسہ کی عمارت اور تعمیر پر بھی زکوٰۃ کی رقم خرچ نہیں ہو سکتی۔

وجہ پہلے بیان ہو چکی۔

ہاں البتہ زکوٰۃ کی رقم غریب طلبہ پر صرف ہونی چاہیے کیونکہ یہ لوگ فقر اور مسکینی جیسی صفات سے متصف ہیں جو مصارفِ زکوٰۃ کے اجزاء ہیں۔

اسی طرح وہ مدرس جس کی تنخواہ کے باوجود گزر اوقات مشکل ہو،کسب کا کوئی اور ذریعہ نہیں۔ فاقہ غالب ہے۔ مال زکوٰۃ سے اس کی بھی اعانت ہو سکتی ہے۔لیکن اس حیثیت سے نہیں کہ یہ مدرس ہے بلکہ اس بناء پر کہ یہ محتاج حقدار ہے۔ اسی طرح قربانی کی کھالوں کا استحقاق بھی فقراء و مساکین کا ہے۔ حدیث میں ہے۔آپ ﷺ نے اسے فروخت کرنے سے منع فرمایا اور صدقہ کا حکم دیا ہے۔

ظاہر ہے صدقہ اس پر ہو گا جو اس کا حقدار ہے۔

صدقہ فطر اور کھالوں سے قاری صاحب کی تنخواہ کی ادائیگی؟

سوال : ہم نے اپنی مسجد میں مقامی بچوں کی تعلیم کے لیے ایک قاری صاحب رکھے ہوئے ہیں جو صبح و شام بچوں کو قرآنِ مجید کی تعلیم دیتے ہیں۔کیا ایسی شکل میں قاری صاحب کی تنخواہ (مسجد فنڈ کے علاوہ) صدقہ فطرانہ اور قربانی کی کھالوں سے دی جا سکتی ہے؟

(سائل حافظ عبدالرحمٰن صدیقی خطیب جامع مسجد محمدی اہل حدیث تلواڑہ راجپوتاں تحصیل ڈسکہ ضلع سیالکوٹ) (۲۵ دسمبر ۱۹۹۲ء)

جواب : صورتِ سوال سے ظاہر ہے کہ قاری صاحب جز وقتی اُستاد ہیں۔ بایں صورت اگر موصوف صاحبِ وسعت ہیں تو خدمتِ ہذا کو بلا معاوضہ سرانجام دینا چاہیے۔بصورتِ دیگر ان کی تنخواہ کا بندوبست ہونا چاہیے لیکن صدقہ فطرانہ اور قربانی کی کھالوں سے ان کو کچھ نہیں دیا جا سکتا کیونکہ یہ محض غرباء و مساکین وغیرہ کا استحقاق ہیں۔قرآن مجید میں ہے:

﴿لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ﴾ (البقرۃ:۲۷۳)

آیت ہذا سے پہلے صدقات کا ذکر کیا گیا ہے۔ پھر ارشاد ہے، یہ صدقات ان محتاجوں کے لیے ہیں جو اللہ کے راستے میں رُکے ہوئے ہیں۔ زمین میں سفر نہیں کر سکتے۔یعنی تجارت نہیں کر سکتے کیونکہ ایسا کرنے سے دینی کاموں میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔

احادیث میں قربانی کی کھالوں کو صدقہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور آیت ہذا میں صدقات کے مستحق وہ لوگ قرار دیے گئے ہیں جو ''فی سبیل اللہ'' میں محصور ہیں۔ اس میں اساتذہ کرام اور طلبہ سب شامل ہیں۔ لہٰذا قاری صاحب موصوف کو مذکور فنڈ سے تنخواہ دی جا سکتی ہے۔ تاہم اولیٰ یہ ہے کہ مسجد کے فنڈ کو مستقل طور پر بیت المال کی حیثیت دی جائے جہاں تمام قسموں کے صدقات و خیرات جمع ہوں پھر اسی سے جملہ مصارف کو پورا کیا جائے ،جس میں اخراجات لائبریری وغیرہ بھی شامل ہو سکتے ہیں۔(هٰذَا مَا عِنْدِيْ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.)

زکوٰۃ وصدقات کی رقم سے قاری صاحب کی تنخواہ

سوال : ایک جماعت کے افراد تھوڑے اور مالی لحاظ سے کمزور ہیں۔ وہ اپنی مسجد میں قاری صاحب کی تنخواہ دینے کی طاقت نہیں رکھتے۔ جب کہ اس کے بغیر مسجد کی آبادی ممکن نہیں۔ کیا دوسرے قریبی گاؤں والے اپنی زکوٰۃ وصدقات میں سے مذکورہ قاری صاحب کی تنخواہ میں تعاون کر سکتے ہیں۔ یاد رہے مذکورہ بالا مسجد میں صرف مقامی بچے قرآنِ پاک کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ (سائل: عبدالستار خطی، سمبلہ خورد) (۱۷ دسمبر ۱۹۹۹ء)

جواب : بچوں کو پڑھانے والے قاری صاحب کو زکوٰۃ وصدقات سے تنخواہ دی جا سکتی ہے۔ تعاون چاہے اہل قریہ سے ہو یا غیر سے، دونوں صورتیں یکساں ہیں۔ قرآن میں ہے:

﴿لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ﴾ (البقرۃ:۲۷۳)

اس آیت سے پہلے صدقات کا ذکر ہے۔ پھر فرمایا۔ یہ صدقات ان فقیروں کے لیے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں بند ہیں۔ زمین میں سفر نہیں کر سکتے۔ یعنی تجارت وغیرہ نہیں کر سکتے۔ (کیونکہ سفر کرنے سے دین کا کام رک جاتا ہے) ویسے اصل یہ ہے کہ گاؤں میں ایک بیت المال ہو جس میں عشر، زکوٰۃ، قربانی کی کھالیں اور دیگر صدقات وخیرات جمع ہوں اور اس بیت المال سے تعلیم پر نہ کہ امامت پر اس کی کچھ تنخواہ مقرر کر دی جائے تو اس طریق سے لینا شرعاً درست ہے، کیوں کہ یہ اجرت تعلیم ہے نہ کہ اجرتِ امامت۔ (ملخصاً فتاویٰ اہل حدیث)

زکوٰۃ کے مال سے مدرس کی تنخواہ

سوال : ہمارے موجودہ معاشرے میں زکوٰۃ کا کاروبار ایک مصرف دینی مدارس ہیں۔ کیا نبی اکرم ﷺ کے دَور میں یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دَور میں دینی مدارس کو زکوٰۃ دی جاتی تھی۔ اب ہمارے ان مدارس میں کچھ بچے ایسے بھی ہیں کہ جن کے والدین مالدار ہوتے ہیں۔ ان بچوں کے قیام وطعام کے اخراجات مدرسہ ہی برداشت کرتا ہے کیا ان بچوں پر زکوٰۃ کی رقم خرچ ہو سکتی ہے؟ اساتذہ کرام کی تنخواہیں بھی اسی فنڈ سے ادا کی جاتی ہیں۔ کیا یہ موجودہ مصرف جائز ہے؟

(محمد اشرف ضلع جہلم) (۵ جون ۱۹۹۸ء)

جواب : دینی مدارس میں زکوٰۃ کے مستحق امیر کے علاوہ صرف غریب طلبہ ہیں۔ زکوٰۃ کے مال سے مدرس کو بھی تنخواہ دی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر غنی ہو تو اُسے بچنا چاہیے۔ اس امر کی تائید قرآن کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے۔

﴿لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ﴾

(البقرۃ:۲۷۳)

یہ صدقات ان فقیروں کے لیے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں بند ہیں۔ زمین میں سفر نہیں کر سکتے یعنی تجارت

وغیرہ نہیں کر سکتے۔ (کیونکہ سفر کرنے سے دین کا کام بند ہو جاتا ہے)

زکوٰۃ سے امام مسجد کی تنخواہ

سوال : کیا زکوٰۃ کی رقم سے مسجد کے امام کو تنخواہ دی جا سکتی ہے۔ امام کی ڈیوٹی صرف نمازِ پنجگانہ کی امامت ہے۔

(عبدالرشید عراقی، سوہدرہ۔ ضلع گوجرانوالہ) (۱۰ جنوری ۱۹۹۲ء)

جواب : زکوٰۃ کے مصارف ''سورۃ توبہ'' (آیت: ۶۰) میں متعین ہیں۔ اگر مذکورہ امام کا شمار ان میں ہے تو کچھ لے سکتا ہے ورنہ نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جب حدیث میں اذان پر اُجرت لینی منع آئی ہے، امامت کا معاملہ تو اس سے زیادہ اہم ہے۔ اس پر اُجرت وصول کرنی بطریق اولیٰ ناجائز ہے۔ تاہم بعض علماء وقت کی پابندی کے پیش نظر مطلق تنخواہ کے تقرر اور جواز کے قائل ہیں۔

تحصیلِ زکوٰۃ / دیگر دینی خدمات پر تنخواہ کا حکم

سوال : ایک شخص نے تنخواہ کے جواز پر آیت ﴿إِنَّمَا الصَّدَقٰتُ......﴾ میں عاملین زکوٰۃ کے مصرفِ صدقہ ہونے سے استدلال کر کے یوں کہا کہ ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے عامل کو صدقہ کے مال سے تنخواہ دو'' دوسرے شخص نے کہا یہ خط کشیدہ حکم اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا جھوٹا ہے۔ پوچھنا یہ ہے کہ مذکورہ خط کشیدہ قول پر قرآن مجید میں کوئی دلیل موجود ہے؟

(۲) نیز اس کے قائل نے یہ بھی کہا ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے بھی دینی امور پر اجرت کے جواز کا فتویٰ ہے دوسرے شخص نے کہا کہ یہ بھی جھوٹ ہے متاخرین احناف سے جواز کا فتویٰ ہے۔ ان دونوں میں سے کس نے صحیح کہا ہے؟

(حافظ محمد بابر) (۱۶ جنوری ۲۰۰۴ء)

جواب : عامل (یعنی زکاۃ لانے والے) کو تحصیل زکوٰۃ کے سلسلہ میں جو کچھ ملتا ہے، اس کا نام ''حق الخدمت'' ہے، تنخواہ نہیں۔ تنخواہ تو ماہانہ وظیفے کا نام ہے جس کی مستقل حیثیت ہے جب کہ عامل کی کمائی ایک وقتی چیز ہے جو محض کام کا عوض ہے۔

(۲) امام ابو حنیفہ دینی امور پر اُجرت کے قائل نہیں تھے جب کہ متاخرین حنفیہ کا فتویٰ جواز کا ہے۔

مالِ زکوٰۃ سے اپنے لیے دینی کتب خریدنا

سوال : میں ایک دینی مدرسہ میں زیرِ تعلیم ہوں۔ میرا بھائی کام کرتا ہے، اس کے مال کی زکوٰۃ اور گھر والوں کی زکوٰۃ سے کیا میں کتابیں خرید سکتا ہوں؟ اگر میں اس سے کتب خرید سکتا ہوں تو کیا اس سے کسی ایسے شخص کو بھی کتاب لے کر دے سکتا ہوں جس پر زکوٰۃ نہیں لگتی؟ اگر میں نہیں خرید سکتا تو کیا ایسے شخص کو جو کسی جامعہ میں استاذ ہو اس کو کتاب خرید کر (زکوٰۃ کے مال سے) دے سکتا ہوں؟ (سائل) (۱۲ مارچ ۲۰۰۴ء)

جواب: موجودہ صورت میں مالِ زکوٰۃ سے کتابیں خریدنا درست نہیں۔ امام ابوحنیفہ اور دیگر ائمہ کا قول ہے کہ جنگ میں زکوٰۃ وہی شخص لے سکتا ہے جس کے پاس خرچ نہ ہو، پس جب جنگ میں غنی کی بابت اختلاف ہوا تو تعلیم و تعلم کا معاملہ تو اس سے زیادہ نازک ہے۔

مال زکوٰۃ میں اگر آپ کا حق تصرف واختیار ہوتا تو خرید کر دے سکتے تھے لیکن یہاں استحقاق نہیں جیسا کہ پہلے بیان ہوا ہے۔لہٰذا آپ مال زکوٰۃ کے مستحق کو دیں، وہ خود خرید لے گا۔

مسجد پر زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنا

سوال: کیا مسجد پر زکوٰۃ کا روپیہ لگایا جاسکتا ہے۔قرآن میں زکوٰۃ کے مصارف آٹھ ہیں۔''فی سبیل اللہ'' سے مراد مسجد لیا جاسکتا ہے؟

جواب: قرآن میں مصرف ''فی سبیل اللہ'' سے مراد جہاد وغیرہ ہے۔صحیح مسلک کے مطابق مسجد اس میں شامل نہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، فتاویٰ اہل حدیث: ۲/۴۸۳۔۴۹۴۔

زکوٰۃ کی رقم تعمیر مسجد پر صرف ہوسکتی ہے؟

سوال: کیا زکوٰۃ کی رقم مسجد کی تعمیر ومرمت یا دوسرے اخراجات پر لگائی جاسکتی ہے؟

(محمد احسان۔لاہور) (۱۲ دسمبر ۱۹۹۷ء)

جواب: زکوٰۃ کی رقم مسجد کی تعمیر و مرمت پر صرف نہیں ہونی چاہیے۔ کیونکہ یہ غرباء و مساکین وغیر کا حق ہے۔ اور لفظ فی سبیل اللہ میں اولیٰ مسلک کے مطابق مسجد داخل نہیں۔

زکوٰۃ کی رقم سے مسجد کی تعمیر کا حکم

سوال: مکرمی جناب شیخ الحدیث صاحب۔ السلام علیکم! کیا زکوٰۃ کی رقم مسجد کی تعمیر پر خرچ کی جاسکتی ہے؟ بعض علماء کا خیال ہے۔ مسجد کی تعمیر پر خرچ ہوسکتی ہے یہ بھی ''فی سبیل اللہ'' میں ہے۔لیکن بعض علماء کہتے ہیں کہ نہیں ہوسکتی ہے۔

(ڈاکٹر عبدالغفور۔سانگڑھ) (۳ مارچ ۲۰۰۰ء)

جواب: قرآنِ مجید میں زکوٰۃ کے آٹھ مصارف بیان ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک ''فی سبیل اللہ'' ہے۔ اس لفظ کے عموم کی بناء پر کئی ایک اہل علم کا خیال ہے کہ ہر کارِ خیر پر زکوٰۃ صَرف ہوسکتی ہے۔ اس میں مسجدیں بھی شامل ہیں۔ اگر کوئی شخص اس پر عمل کرے تو اس پر اعتراض تو نہیں ہوسکتا لیکن احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ مسجد کی تعمیر پر زکوٰۃ صرف نہ کی جائے ، کیونکہ زیادہ بہتر یہ ہے کہ ''سبیل اللہ'' سے مراد ''جہاد یا حج وعمرہ'' لیا جائے جس طرح کہ شرعی نصوص سے ثابت ہے۔ ''سنن ابی داؤد'' کے «بَابُ الْعُمْرَة» میں ہے:

«فَلْتَحُجَّ عَلَيْهِ، فَإِنَّهُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ.» ❶

اور ''منتقی الاخبار'' کے بَابُ الصَّرْف فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ میں بحوالہ ''مسند احمد'' حدیث ہے:

«اَلْحَجُّ وَالْعُمْرَةُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ» ❷

''یعنی حج اور عمرہ دونوں ''فی سبیل اللہ'' میں داخل ہیں۔''

امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«وَأَحَادِيثُ الْبَابِ تَدُلُّ عَلَى أَنَّ الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ مِنْ سَبِيلِ اللَّهِ.» ❸

''باب کی احادیث اس بات پر دال ہیں کہ حج اور عمرہ ''فی سبیل اللہ'' سے ہیں۔''

اور جہاد بالاتفاق مراد ہے۔ ''فی سبیل اللہ'' سے مراد اگر عام لیا جائے تو مصارفِ زکوٰۃ میں فقراء و مساکین کو ذکر کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کیونکہ ''فی سبیل اللہ'' میں وہ بھی داخل ہیں۔ ان کی علیحدہ تصریح سے معلوم ہوا ''فی سبیل اللہ'' سے مراد خاص ہے اور وہ جہاد اور حج عمرہ ہیں۔ لہٰذا مسجدوں پر زکوٰۃ خرچ نہیں کرنی چاہیے۔

مدرسہ کی جگہ کو مسجد میں تبدیل کرنا اور زکوٰۃ سے تیار کی گئی مسجد میں نماز کی ادائیگی

سوال: آج سے چند سال قبل باغبانپورہ گوجرانوالہ میں ایک وقف قطعہ زمین پر حکومت کی اجازت سے محلّہ کے بچوں کی دینی تعلیم کے لیے مدرسہ انوار التوحید کی عمارت تعمیر کی گئی۔ صبح و شام بچے قرآن پاک پڑھتے رہے۔ عمارت پر عطیات اور زکوٰۃ کی رقم خرچ ہوئی۔ اب اہل محلّہ نے مستقل طور پر اس مدرسہ کو مسجد کی شکل دے کر نماز باجماعت شروع کی ہے۔ ایک عالم دین نے اعتراض کیا ہے کہ اس عمارت پر زکوٰۃ بھی خرچ ہوئی ہے۔ لہٰذا یہاں نماز پڑھنا ناجائز ہے۔ آپ کتاب و سنت کی روشنی میں بیان فرمائیں کہ ہم کیا کریں۔ اگر ہم نے نماز باجماعت نہ شروع کی تو خدشہ ہے دوسرے لوگ اس پر قبضہ کر کے خلافِ شریعت کام کی ابتداء کر دیں گے۔ تمام حالات کو مدنظر رکھ کر جواب ارشاد فرمائیں۔ (محمد بشیر گوجرانوالہ) (۱۰ جولائی ۱۹۹۸ء)

جواب: اندریں حالات مدرسہ کی جگہ کو مسجد کی صورت میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ قرآن میں مصارف زکوٰۃ میں لفظ ''فی سبیل اللہ'' کو بعض اہل علم نے عموم پر محمول کیا ہے۔ تفسیر فتح البیان، تفسیر خازن اور تفسیر کبیر وغیرہ میں اس امر کی تصریح موجود ہے۔ چنانچہ تفسیر کبیر میں ہے یعنی اس بات کو جان لے کہ لفظ ''فی سبیل اللہ'' کا ظاہر عام ہے۔ غازیوں پر

---

❶ سنن ابی داؤد، بَابُ الْعُمْرَةِ، رقم:۱۹۸۸

❷ سنن الدارمی، بَابُ:إِذَا أَوْصَى بِشَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ، رقم: ۳۳٤۷

❸ نیل الاوطار:٤/ ۱۸٤

بند کرنے کو واجب نہیں کرتا۔ اس وجہ سے قفال نے اپنی تفسیر میں بعض فقہاء سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے تمام امورِ خیر میں صدقات کو صرف کرنا جائز رکھا ہے۔ جیسے مردوں کو کفنانا۔ قلعے، مسجدیں تعمیر کرنا۔

اگرچہ عام حالات میں ہمارے نزدیک اختیار مسلک یہ ہے کہ مالِ زکوٰۃ کو مسجدوں پر صرف نہ کیا جائے۔

زکوٰۃ کی رقم سے امام مسجد کے گھر کی بجلی اور پانی کا بل

سوال: کیا زکوٰۃ کی رقم سے امام مسجد کے گھر کی بجلی اور پانی کا بل ادا کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

(عبدالرشید) (۲۴ نومبر ۱۹۹۵ء)

جواب: مالِ زکوٰۃ کے آٹھ مصارف جو ''سورۃ التوبہ'' میں متعین ہیں زکوٰۃ کو صرف ان پر صرف کیا جائے امام مسجد کی بجلی اور پانی کا بل دیگر ذرائع سے ادا کیا جائے۔

مالِ زکوٰۃ سے مدرسے کی عمارت تعمیر کرنا

سوال: کیا صدقات اور زکاۃ سے دینی مدرسہ کے لیے جگہ خریدی جا سکتی ہے اور اسی طرح اس مال سے مدرسہ کی تعمیر کی جا سکتی ہے؟ (ابوعبداللہ محمد امین) (۱۳ اپریل ۲۰۰۱ء)

جواب: مالِ زکوٰۃ سے مدرسے کی جگہ خریدنا پھر اسی مال سے اس کو تعمیر کرنا دونوں کام غیر درست ہیں، کیونکہ عمل ہذا مصارفِ زکوٰۃ میں شامل نہیں۔

مدرسہ بند ہونے کے بعد موجود مال زکوٰۃ کہاں صرف ہو؟

سوال: ایک دینی مدرسہ کے اُستاد کی تنخواہ زکوٰۃ کی رقم سے ادا کی جاتی تھی اب مدرسہ بند ہو گیا ہے اور زکوٰۃ کی رقم کچھ باقی ہے۔ اس کے خرچ کرنے کی کوئی صورت بتائیں۔ کیا اُستاد کو ہر ماہ ادا کی جائے یا کسی اور مصرف میں لائی جائے۔ استاذ صاحب اب فارغ ہیں۔ (عبدالرشید) (۲۴ نومبر ۱۹۹۵ء)

جواب: مالِ زکوٰۃ سے موجود رقم آٹھ مصارف میں سے کسی پر بھی صرف ہو سکتی ہے۔ سابقہ مدرس کا تعلق اگر کسی مصرف سے ہے تو وہ بھی لے سکتا ہے۔

مالِ زکوٰۃ وغیرہ سے تعمیر شدہ مدرسہ گرا کر مسجد بن سکتی ہے؟

سوال: جنابِ آداب سے گزارش ہے کہ ایک پلاٹ رقبہ اس غرض سے خریدا تھا کہ یہاں مدرسہ بنے گا، بچے تعلیم حاصل کریں گے اور ضرورت پڑنے پر عید بھی پڑھی جائے گی اور جلسہ وغیرہ بھی ہو جائے گا۔ یہ پلاٹ زکوٰۃ کی رقم سے خریدا تھا جو اس پر عمارت تعمیر ہوئی اس پر بھی کثرت سے زکوٰۃ کی رقم صرف ہوئی۔ قربانی کی کھالوں کی رقم بھی اس پر لگی۔ اب اس کو گرا کر کیا مسجد تعمیر ہو سکتی ہے؟ اس کی قرآن و سنت کی رُو سے وضاحت کریں۔ یہ مدرسہ پاکستان میں

ہو یا بیرونِ ملک ہو، کیا سب کے لیے یکساں مسئلہ ہے؟ (مہتمم حاجی محمد ابراہیم۔ لاہور) (۲۸ اپریل ۱۹۹۵ء)

جواب: مذکورہ پلاٹ چونکہ مالِ زکوٰۃ وغیرہ سے خرید کیا گیا اور اس کی تعمیر بھی اسی مد سے ہوئی۔ اس لیے یہاں مسجد تعمیر نہیں کرنی چاہیے کیونکہ مسجد سے تو اغنیاء بھی مستفید ہوتے ہیں جو زکوٰۃ کے مستحق نہیں۔ اگرچہ بعض اہل علم اس کو مصارفِ زکوٰۃ میں سے ''فی سبیل اللہ'' میں داخل کر کے جواز کے قائل ہیں۔ لیکن یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی۔ ''فی سبیل اللہ'' کا مفہوم اگر اتنا عام ہوتا تو قرآن مجید میں دیگر مصارف بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔

سنن ابی داؤد وغیرہ میں چند مخصوص دلائل کی بناء پر علماء کے ایک گروہ نے مصرف ''فی سبیل اللہ'' کو جہاد اور حج عمرہ کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔ ہاں البتہ اگر اس مقام پر مسجد بنانی ناگزیر ہو تو اس عمارت کی قیمت لگا کر کسی اور جگہ خرید دی جائے یا اس رقم کو مستحقین زکوٰۃ پر تقسیم کر دیا جائے۔ اس قسم کی عمارت اندرونِ ملک ہو یا بیرونِ ملک سب کا حکم ایک جیسا ہے کیوں کہ مکان و زمان کی تبدیلی سے شریعت کے حکم میں تغیر پیدا نہیں ہوتا۔

تصدیق۔ حافظ ثناء اللہ صاحب کا فتویٰ صحیح ہے۔ (حافظ عبدالقادر روپڑی جامع مسجد قدس اہل حدیث چوک دالگراں)

زکوٰۃ کی مد سے مفید کتابوں کی اشاعت کا حکم

سوال: مد زکوٰۃ سے کتابوں کی اشاعت کا حکم؟ (یقین شاہ اورکزئی ابوظہبی) (۲۵ اکتوبر ۱۹۹۶ء)

جواب: مفید کتابوں کی اشاعت زکوٰۃ کی مد سے نہیں ہو سکتی۔ شیخنا محدث روپڑی رحمہ اللہ فرماتے ہیں زکوٰۃ کے مصارف میں ''فی سبیل اللہ'' سے مراد ''جہاد'' ہے اور حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حج و عمرہ بھی ''فی سبیل اللہ'' میں داخل ہے۔ صورت مسئولہ ''فی سبیل اللہ'' میں داخل نہیں کیونکہ اگر وہ کتاب بطورِ وقف اغنیاء کو دی جاتی ہے تو زکوٰۃ وقف کرنا ثابت نہیں اور اگر بطورِ ملک اغنیاء کو دی جاتی ہے تو غنی کو زکوٰۃ دینی جائز نہیں۔ بہر صورت صورت مسئولہ جائز نہیں۔

(فتاویٰ اہل حدیث: ۲/۵۲۵)

فقر کی صورت میں بیٹے اور داماد کو زکوٰۃ دینے کا کیا حکم ہے؟

سوال: کیا باپ اپنے ایسے بیٹے کو زکوٰۃ دے سکتا ہے جو ایک عرصے سے باپ سے علیحدہ ہے۔ اس کی کفالت میں نہیں۔ اس کی دینی حالت بھی اچھی نہیں۔ کبھی کبھار نماز میں غفلت کر جاتا ہے۔ وہ کافی عرصہ سے باپ سے علیحدگی اختیار کر چکا ہے۔ اور اس وقت اس کی مالی حیثیت انتہائی کمزور اور قابلِ رحم ہے؟

(۲) اسی طرح کیا باپ اپنے غریب مستحق داماد کو زکوٰۃ دے سکتا ہے یا نہیں۔ بَيِّنُوْا تُوجَرُوْا (۲۱ جولائی ۱۹۹۵ء)

جواب: باپ اپنے سے الگ رہنے والے محتاج بیٹے کو زکوٰۃ دے سکتا ہے۔ چنانچہ ''صحیح بخاری'' میں ہے ایک شخص نے صدقے کا مال مسجد میں رکھا تا کہ کسی مسکین کو دے دیا جائے۔ اتفاقاً اس کے بیٹے نے آ کر اٹھا لیا۔ باپ کو معلوم ہوا تو

کہا: «وَاللّٰهِ مَا إِيَّاكَ أَرَدْتُ» ''میں نے تجھے دینے کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ کے پاس معاملہ آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَكَ مَا نَوَيْتَ يَا يَزِيْد وَ لَكَ مَا أَخَذْتَ يَا مَعْنُ» [1]

''اے یزید تیرے لیے وہ کچھ ہے جو تو نے نیت کی یعنی تیرا صدقہ قبول ہے۔ اور اے معن تیرے لیے وہ کچھ ہے جو (محتاجگی کی صورت میں) تو نے لیا ہے، نماز کی غفلت دور کرنے کے لیے مسلسل اسے وعظ و نصیحت کرتے رہنا چاہیے۔

(۲) جب غربت کی صورت میں محتاج بیٹے کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے تو فقر کی صورت میں داماد کو بطریق اولیٰ دینی جائز ہے کیوں کہ وہ اصلاً اجنبی ہے۔ ان قرابت داروں سے نہیں جن کا خرچہ بذمہ سسر ہو بلکہ لڑکی کی شادی کی صورت میں باپ کے ذمہ اس کا خرچہ بھی نہیں رہا۔ اب کلی طور پر لڑکی کے نفقہ کا ذمہ دار شوہر ہے۔

دعوتی سرگرمیوں کے لیے مالِ زکوٰۃ کا استعمال؟

سوال: کیا امریکہ کے اسلامک سنٹرز کو زکوٰۃ دینا جائز ہے؟ تاکہ وہ اپنے قرض ادا کر سکیں جو زمین کی خریداری، تعمیرات، یا کسی عمارت میں ضروری توسیع کی وجہ سے ان کے ذمہ ہیں، یا دوسرے قرض یا اُدھار چیزیں لینے کی وجہ سے یا سنٹر کے ضروری اخراجات پورے کرنے کے لیے حاصل کیے جاتے ہیں، خواہ یہ (اخراجات) تنخواہوں کی صورت میں ہوں، یا ٹیکسوں کی ادائیگی کی صورت میں، یا مرمت وغیرہ کے لیے یا اسلامی پروگراموں کو جاری رکھنے کے لیے ان کی ضرورت پڑتی ہو؟ (مغربی مسلمانوں کے روزمرہ مسائل)

جواب: اس سوال کے جواب میں علماء کی مختلف آراء ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زکوٰۃ کے مصارف میں (فی سبیل اللہ) کا مقصود متعین کرنے میں علماء میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

- متقدمین میں سے اکثر علماء ''فی سبیل اللہ'' کو جہاد اور اس سے متعلق مصارف تک ہی محدود قرار دیتے ہیں۔ وہ اس میں مجاہدین کے علاوہ کسی اور کو شامل نہیں کرتے۔ کیونکہ جب یہ لفظ مطلق ہو تو اس سے مراد ''جہاد'' ہی ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اگر اس مصرف (فی سبیل اللہ) کے مفہوم کو عام کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ باقی مصارف کالعدم ہو جائیں گے، یا ان کا الگ سے ذکر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔
- متاخرین میں سے بہت سے علماء اس کو وسیع معنوں میں لیتے ہیں، اور اس میں عوامی بہبود کے تمام کاموں کو شامل کرتے ہیں۔

---

[1] صحيح البخاري، بَابُ إِذَا تَصَدَّقَ عَلَى ابْنِهِ وَهُوَ لَا يَشْعُرُ، رقم:۱۴۲۲

❁ ایک تیسرے فریق نے درمیانی راہ اختیار کی ہے وہ کہتے ہیں کہ اس مصرف سے صرف ''جہاد'' مراد ہے لیکن اسلام میں جہاد صرف قتال پر ہی نہیں بولا جاتا بلکہ اس میں زبانی جہاد اور اللہ کی طرف دعوت دینے کا جہاد بھی شامل ہے۔ یعنی ''جہاد'' صرف تلوار سے جنگ کرنے کا نام نہیں کیونکہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: مشرکین سے جہاد کرو، اپنے ہاتھوں کے ساتھ، اپنی زبانوں کے ساتھ اور اپنے مالوں کے ساتھ۔''

خصوصاً کافر ممالک میں، جہاں مسلمان جلا وطنی اور لادینیت کا شکار ہیں۔ رابطہ عالم اسلامی کے تحت کام کرنے والی فقہی مجلس نے بھی جہاد کے اس وسیع تر مفہوم کی باقاعدہ تائید کی ہے۔ اور انھوں نے جہاد کے مفہوم میں اس طرح کی تمام سرگرمیوں کو شامل کیا ہے کیونکہ موجودہ حالات میں اس نوعیت کے کام جہاد کی ہی صورتوں میں داخل ہیں۔

مندرجہ بالا امور کی روشنی میں ہمارے نزدیک اس مسئلہ میں راجح قول یہی ہے کہ اس مصرف میں غیر مسلم ممالک میں اسلام کی دعوت دینا بھی شامل ہے۔ اور ان ملکوں میں قائم ان دعوتی اور تعلیمی اداروں کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے جو ان ممالک میں مسلمانوں کو اسلام پر قائم رکھتے ہیں اور غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دیتے ہیں۔ واللہ اعلم

دعوتی سرگرمیوں میں کمی بیشی کی بناء پر زکوٰۃ دینے میں ترجیح؟

سوال: ایک اسلامک سنٹر میں اسلامی مدرسہ یا دعوت و تبلیغ کا مرکز قائم ہے۔ جب کہ دوسرے اسلامک سنٹر میں صرف مسجد ہے جس میں نماز ادا کی جاتی ہے اور مسلمان کمیونٹی کو درس دیے جاتے ہیں، کیا زکوٰۃ ادا کرنے کے لحاظ سے ان دونوں میں فرق ہے؟ (مغربی مسلمانوں کے روزمرہ مسائل)

جواب: میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان اسلامی مراکز کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے جن کو اس کی ضرورت ہو، خواہ وہ مرکز کو چلانے کے لیے ہو یا اس کا قرض ادا کرنے کے لیے۔ لیکن اگر اللہ نے اسے مستغنی کیا ہو مثلاً اس کو اوقاف سے اتنی آمدنی حاصل ہو جاتی ہو، جس سے اس کے اخراجات پورے ہو سکتے ہوں، یا کوئی حکومت یا ادارہ وغیرہ اس پر خرچ کرنے کی ذمہ داری اٹھائے ہوئے ہو، تو اس صورت میں مرکز کے لیے جائز نہیں کہ حاجت مندوں کے حق میں سے کچھ لے لے کیونکہ غنی آدمی کے لیے اور طاقتور صحت مند آدمی کے لیے صدقہ لینا حلال نہیں۔

انجینئرنگ کرنے والے طالب علم کو زکوٰۃ دینے کا حکم

سوال: ایک لڑکا غریب خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ عصری تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ ایم بی بی ایس ڈاکٹری کا کورس یا انجینئرنگ کا کورس کر رہا ہے اس کے پاس تعلیمی اخراجات کی گنجائش نہیں ہے۔ کیا زکوٰۃ کی مد سے اس کی مدد کی جاسکتی ہے؟ (مشتاق احمد سہو۔ کوٹ ادو) (۴ مئی ۲۰۰۰ء)

جواب: لڑکے کی دینی حالت اگر قابلِ تسلی ہے تو مالِ زکوٰۃ سے اس کی معاونت ہوسکتی ہے۔

سکول کے طلبہ اور عملے پر زکوٰۃ صرف کرنا

سوال : ایک سکول میں غریب نادار، بے سہارا اور معاشرے کے نظر انداز کیے گئے بچوں کو قرآن مجید ناظرہ، نمازِ جنازہ، مسنون دعائیں، کلمے، اور عملی دینی تربیت کے ساتھ ساتھ پرائمری تک مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ بچوں کو کتابیں، کاپیاں، یونیفارم اور بعض اوقات بیگ بھی مفت فراہم کیے جاتے ہیں۔ اس سکول میں اکثر ورکشاپوں اور کوٹھیوں میں کام کرنے والے ملازمین کے بچے تعلیم وتربیت حاصل کرتے ہیں۔ کیا ان بچوں اور اس انتظام میں مشغول عملے کے لیے زکوٰۃ جائز ہے؟ (سیکرٹری جامع شان اسلام، گلبرگ، لاہور) (۹ اگست ۲۰۰۲ء)

جواب : صورتِ مذکورہ میں فقراء مساکین بچوں پر مالِ زکوٰۃ صرف ہوسکتا ہے۔ کیونکہ وہ مستحق زکوٰۃ صفت سے متصف ہیں اور اس جگہ کام کرنے والا عملہ بھی اس سے مستفید ہوسکتا ہے۔ کیونکہ وہ عاملین کے زمرے میں شامل ہیں جو مصرفِ زکوٰۃ ہے۔

کیا شادی شدہ تنگدست بیٹی مصرفِ زکوٰۃ ہے؟

سوال : اگر کسی شخص نے اپنی لڑکی کی شادی کردی ہے اور وہ لڑکی اپنے گھر میں بڑی تنگدستی کی زندگی بسر کر رہی ہے، کیا اس کا باپ اسے زکوٰۃ دے سکتا ہے؟ (ایک سائل: مین بازار کامونکے) (۲۳ جون ۱۹۹۵ء)

جواب : فقر وفاقہ کی صورت میں والد اپنی شادی شدہ بیٹی کو زکوٰۃ کا مال دے سکتا ہے۔ ''صحیح بخاری'' میں ہے:

''ایک شخص یزید نے صدقہ کا مال مسجد میں رکھا تا کہ کسی حق دار کو دے دیا جائے۔ اتفاقاً بیٹے نے آکر اٹھا لیا۔ باپ کو پتہ لگا تو کہا «وَاللّٰهِ مَا اِيَّاكَ اَرَدْتُّ» ''اللہ کی قسم میں نے تجھے دینے کا ارادہ نہیں کیا۔'' جب رسول اللہ ﷺ کو اس بات کا علم ہوا تو فرمایا: «لَكَ مَا نَوَيْتَ يَا يَزِيْد وَ لَكَ مَا اَخَذْتَ يَا مَعْنُ» [1]

''یعنی یزید تیرے لیے وہ کچھ ہے جو تو نے نیت کی ہے اور اے معن حاصل کردہ مال کا حقدار تو ہے۔''

مذکورہ حدیث میں تصریح لڑکے کی ہے لیکن بحیثیت اولاد دونوں کا حکم یکساں ہے۔ بالخصوص اس صورت میں جب کہ خاوند کسب سے عاری ہو۔ یا لاپتہ ہو یا وفات پاچکا ہو وغیرہ وغیرہ۔

کیا بظاہر مفلوک الحال صاحبِ حیثیت پر زکوٰۃ واجب ہے؟

سوال : عرض حال یہ ہے کہ میرے پاس کوئی جائداد نہیں۔ رہائش کے لیے اپنا ملکیت مکان تک نہیں عارضی پرائیویٹ ملازمت کرکے گزر اوقات کرتا ہوں اور بیوی بچوں کا پیٹ پالتا ہوں۔ سب سے بڑا لڑکا مِل میں ملازمت کرتا ہے۔ غیر شادی شدہ ہے۔ بے نماز ہے، سگریٹ پیتا ہے۔ گھر میں پیسے نہ ہونے کے برابر دیتا ہے یعنی کبھی سال چھ مہینے کے بعد

[1] صحيح البخاري، بَابُ إِذَا تَصَدَّقَ عَلَى ابْنِهِ وَهُوَ لَا يَشْعُرُ، رقم:١٤٢٢

اگر دل میں آئی یا والدہ نے اصرار کیا۔ یا چھوٹے بھائی نے کسی چیز کا اصرار کیا تو کوئی چیز لے دی سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ اللہ تعالیٰ اسے ہدایت دے ان حالات میں میری بیوی نے کفایت شعاری کر کے کچھ رقم پچھلے سات آٹھ سال سے جمع کی ہے تاکہ جوان بیٹی کی کہیں شادی کر سکیں یا کوئی چھوٹا سا پلاٹ خرید کر گھر بنانے کی کوئی صورت بنا سکیں۔ جمع شدہ رقم تقریباً تیس ہزار کے قریب ہے جب کہ میں خود ۵۵ سال کی عمر کو پہنچ گیا ہوں کیا مندرجہ بالا کیفیت میں مجھ پر زکوٰۃ فرض ہے؟ یا کیا میں زکوٰۃ لینے کا حق دار ہوں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں مسئلہ بیان فرما کر شفقت فرمادیں۔

(سائل حشمت علی) (۱۱۔ اکتوبر ۱۹۹۶ء)

جواب: بالا صورت میں جمع شدہ رقم پر زکوٰۃ واجب ہے اور آپ زکوٰۃ لینے کے بھی حق دار نہیں کیونکہ آپ صاحبِ حیثیت ہیں اور اسلام نے جہیز وغیرہ کی کوئی پابندی نہیں لگائی۔ کسی متشرع آدمی کو دیکھ کر رسم ورواج کے بغیر ہی لڑکی کا نکاح کر کے سکون حاصل کریں۔ واللہ ولی التوفیق۔

مفلوک الحال شخص کے قرض کی ادائیگی کے لیے زکوٰۃ

سوال: ایک آدمی کے پاس (۳۔۴) ایکڑ ملکیتی زمین ہے۔ وہ دریائی ہے۔ کبھی سیلاب سے تباہ ہوگئی اور کبھی بچ گئی۔ اس کے پاس کوئی زیور بھی نہیں، اسے گھر کا خرچ چلانے کے لیے گاہے بہ گاہے قرضہ بھی لینا پڑتا ہے۔ اس لیے مقروض رہتا ہے کیا اسے قرضہ اتارنے کے لیے زکوٰۃ دی جاسکتی ہے؟ (سائل محمد ابراہیم، قصور) (۲۴ اپریل ۱۹۹۸ء)

جواب: ایسے مفلوک الحال کو قرض کی ادائیگی کے لیے زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔

کیا گھریلو خدمت گار عورت کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے؟

سوال: مولانا وحید الدین خاں صاحب نے لکھا ہے کہ خانہ دار عورت کو چاہیے کہ وہ اپنے گھر جیسی سہولتیں غریب مسکین خواتین کو بھی مہیا کرنے کی کوشش کرے تو کیا ہم اپنی گھریلو خدمت گار عورت کو زکوٰۃ فنڈ میں سے ایسی سہولت مہیا کر سکتے ہیں؟ جب کہ وہ مطالبہ بھی کرتی ہو مثلاً واشنگ مشین۔ پانی کی موٹر یا بجلی کا پنکھا وغیرہ۔

(کے۔ طاہر) (۷ مارچ ۱۹۹۷ء)

جواب: خدمت گار عورت کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ مستحق ہو اور اسے معاوضۂ خدمت شمار نہ کیا جائے اور اس کی خدمت کا صلہ حسب معمول علیحدہ ہونا چاہیے۔

کیا مستحقین زکوٰۃ کو ''زکوٰۃ'' سے آگاہ کرنا ضروری ہے

سوال: کیا شرعاً ضروری ہے کہ جس کو زکوٰۃ دی جائے اسے بتایا جائے کہ یہ میں تم کو زکوٰۃ دے رہا ہوں؟ مستحقین ''زکوٰۃ'' کا لفظ سن کر گریزاں ہوتے ہیں حالانکہ وہ صحیح مصرف اور حقیقی مستحق ہوتے ہیں۔ بغیر بتائے اگر زکوٰۃ

دے دی جائے تو اس میں کوئی شرعی قباحت ہے اور زکوٰۃ کی ادائیگی میں کوئی نقص تو نہیں ہوگا؟

جواب: مستحقین زکوٰۃ کو آگاہ کرنا ضروری نہیں کہ یہ مالِ زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ دینے والے کا فرض ہے کہ وہ مستحق کو منتخب کرے تا کہ زکوٰۃ صحیح مصرف پر لگ سکے۔ ہاں البتہ اگر کوئی خیراتی ادارہ ایسا ہو جو متعدد انواع کے اموال قبول کرتا ہو اس کے ذمہ داران کو ضرور مطلع کر دینا چاہیے کہ یہ مال زکوٰۃ ہے تا کہ یہ رقم زکوٰۃ کی مد میں خرچ ہو۔

کیا ایک ہی شخص کو زکوٰۃ کی مکمل یا زیادہ تر رقم دی جا سکتی ہے؟

سوال: زکوٰۃ کی رقم سے ایک ہی آدمی کو ہزار ہا روپے دے دینا کہ وہ اس سے اپنا کاروبار کرے اور کسی کا محتاج نہ رہے، کیسا ہے؟ (سائل) (۲۷ جون ۲۰۰۳ء)

جواب: اس مسئلے میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ بقدرِ نصاب ایک ہی شخص کو صدقہ نہیں دینا چاہیے امام بخاری رحمہ اللہ ''صحیح بخاری'' میں جواز کے قائل معلوم ہوتے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں: «بَابٌ: قَدْرُ كَمْ يُعْطَى مِنَ الزَّكَاةِ وَالصَّدَقَةِ، وَمَنْ أَعْطَى شَاةً» پھر نُسَیبہ انصاری کے قصے سے استدلال کیا ہے کہ نبی ﷺ نے انھیں ایک مکمل بکری عنایت فرمائی تھی جو بعد میں انھوں نے بطورِ ہدیہ حضرت عائشہ کو پیش کر دی، پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: «فَقَدْ بَلَغَتْ مَحِلَّهَا» [1]

''وہ اپنی اصل جگہ پہنچ گئی ہے۔''

امام محمد بن حسن الشیبانی (امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے شاگرد) بھی جواز کے قائل ہیں۔ ''صحیح بخاری'' کے ترجمۃ الباب میں حسن سے منقول ہے: «فِي أَيِّهَا أَعْطَيْتَ أَجْزَأَتْ» [2]

مصارفِ زکوٰۃ میں سے جس صنف کو زکوٰۃ دی گئی، ادا ہو جائے گی۔

حسن کے نزدیک ﴿لِلْفُقَرَاءِ﴾ کا لام مصرف کی وضاحت کے لیے ہے، لام تملیک نہیں۔ حضرت خالد کا اسلحہ تیار کرنے والا واقعہ بھی اس امر کی دلیل ہے کہ آٹھ مصارف میں سے کسی صنف کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے۔ یہی مسلک راجح ہے۔ (وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ.)

مقروض کا قرض زکوٰۃ میں شمار کرنے کا حکم

سوال: ایک غریب آدمی کسی سے ہزار دو ہزار روپے قرض لیتا ہے پھر کچھ عرصہ گزرنے کے بعد قرض دینے والا اس مقروض کو یہ کہتا ہے کہ میرے وہ روپے زکوٰۃ میں قبول کریں۔ کیا اس طرح زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

(یقین شاہ اورکزائی ابوظبی) (۳ مارچ ۲۰۰۰ء)

---

[1] صحيح البخاري، بَابٌ: قَدْرُ كَمْ يُعْطَى مِنَ الزَّكَاةِ وَالصَّدَقَةِ، وَمَنْ أَعْطَى شَاةً، رقم: ١٤٤٦

[2] صحيح البخاري، بَابُ قَوْلِ اللّٰهِ تَعَالَى: ﴿وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللّٰهِ﴾ (التوبة:٦٠)، قبل حديث ١٣٩٩.

جواب : قرض اگر زکوٰۃ میں شمار کر لیا جائے تو کوئی حرج نہیں کیونکہ مسکین زکوٰۃ کا مستحق ہے۔قرض معاف کر دینا بعینہٖ دے دینا ہے۔قرآنِ مجید میں ہے:

﴿ وَ اِنْ کَانَ ذُوْ عُسْرَۃٍ فَنَظِرَۃٌ اِلٰی مَیْسَرَۃٍ وَ اَنْ تَصَدَّقُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾

(البقرۃ:۲۸۰)

''یعنی مقروض اگر تنگ دست ہو تو آسانی تک ڈھیل دینا چاہیے اور صدقہ کر دینا یعنی قرض چھوڑ دینا یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔''

قرض چھوڑنے کو صدقہ فرمایا۔اس سے معلوم ہوا یہ بھی صدقہ دینے کی ایک صورت ہے۔لہٰذا زکوٰۃ کی ادائیگی میں کوئی شک نہیں۔

قرض اتارنے کے لیے زکوٰۃ کا حصول

سوال : ایک زمیندار (۱۵۔۲۰) ایکڑ زمین کا مالک ہے۔اس کے پاس ٹریکٹر بھی اپنا ہے،لیکن زمین کے اخراجات نکال کر زمین کی بچت سے اس کے گھر کا گزارا نہیں چلتا۔اس لیے وہ ہمیشہ مقروض رہتا ہے۔کیا اس صورت میں اسے قرضہ اتارنے کے لیے زکوٰۃ دی جا سکتی ہے؟ (سائل محمد ابراہیم،قصور) (۲۴ اپریل ۱۹۹۸ء)

جواب : اگر وہ فی الواقع تنگ دست ہے تو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے۔

قرآن میں قصہ خضر میں مسکینوں کے لیے کشتی کی ملکیت کا اثبات ہے جب کہ دوسری طرف انھیں مصارفِ زکوٰۃ میں شمار کیا گیا ہے۔اس سے معلوم ہوا بعض ملکیتیں مصارف میں ناکافی ہونے کی بناء پر آدمی زکوٰۃ کا مستحق بن سکتا ہے جس طرح کہ مذکورہ بالا صورت میں ہے۔

حاجت مند مقروض دوست کو زکوٰۃ دینے سے ادا ہو جائے گی

سوال : میرا ایک دوست مقروض ہے۔میں نے کہا کہ مجھ سے زکوٰۃ کی رقم لے کر اپنا قرض ادا کرو۔وہ لینے کو تیار ہے لیکن اس کی خواہش ہے کہ جب اس کے حالات بہتر ہو جائیں تو وہ یہ رقم کسی اور مستحق کو دے دے۔کیا ایسی صورت میں میری زکوٰۃ ادا ہو جائے گی؟ کہیں ایسا تو نہ ہوگا کہ یہ رقم قرضہ سمجھی جائے جو دوست مجھے تو نہیں لیکن کسی اور کو ادا کر دے گا،اور میرے ذمے زکوٰۃ باقی رہ جائے گی؟

جواب : حاجت مند مقروض کو زکوٰۃ دینے سے ادا ہو جائے گی اگرچہ بوقتِ وسعت وہ یہ رقم کسی اور کو ادا کر دے۔آپ کی طرف سے رقم ہذا قائم مقام قرض نہیں ہوگی بلکہ ایک فرض کی ادائیگی ہے۔حدیث میں ہے:

«اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ» ❶

گورنمنٹ کا بیاجی قرضہ لینے والے کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے؟

سوال : ایک آدمی کی فیکٹری ہے۔لیکن اس نے گورنمنٹ سے قرضہ لے کر بنائی ہے۔ تین چار سال گزرنے کے بعد بھی وہ گورنمنٹ کا قرضہ نہیں اتار سکا۔ بلکہ اور لوگوں سے بھی قرضہ لے کر فیکٹری میں ڈالا ہے ابھی تک وہ قرضہ اتارنے کی پوزیشن میں نہیں آ سکا۔ قرض خواہ اسے تنگ کرتے ہیں۔ کیا اس صورت میں قرضہ اتارنے کے لیے اُسے زکوٰۃ دی جا سکتی ہے؟ (سائل محمد ابراہیم، قصور) (۲۴ اپریل ۱۹۹۸ء)

جواب : ظاہر ہے متذکرہ بالا فیکٹری بیاج کے پیسہ سے بنائی گئی ہے۔ ایسے شخص کو بطورِ اعانت زکوٰۃ کا مال نہیں دینا چاہیے۔ البتہ بیاجی یا حرام مال سے اس کی امداد ہو سکتی ہے تاکہ حرام کا مال حرام رستے جائے۔

مفلوک الحال مزدور شخص کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے؟

سوال : ایک آدمی کے پاس اپنا آبائی مکان ہے جو کہ ۴۔۵ لاکھ کا ہے۔ اس کے پاس کوئی زیور بھی نہیں ہے۔ وہ نوکری یا مزدوری کر کے بال بچوں کا پیٹ پالتا ہے۔ اس کے گھر کا خرچہ زیادہ ہے اور آمدن تھوڑی ہے۔ اس لیے وہ مقروض رہتا ہے۔ کیا اس کا قرضہ زکوٰۃ کی مد سے اتارا جا سکتا ہے؟ بَیِّنُوْا تُوجرُوْا۔ (سائل محمد ابراہیم، قصور) (۲۴ اپریل ۱۹۹۸ء)

جواب : ایسے شخص کو قرض اتارنے کے لیے زکوٰۃ دی جا سکتی ہے کیوں کہ مفلوک الحال ہے۔

کیا مالِ زکوٰۃ قبرستان کی زمین یا چار دیواری پر صرف ہو سکتا ہے؟

سوال : قبرستان کی زمین یا اس کی چار دیواری پر مالِ زکوٰۃ صرف کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

(شیخ محمد سلیم سیالکوٹ) (۱۹ اگست ۱۹۹۶ء)

جواب : قبرستان کی زمین یا اس کی چار دیواری پر مال زکوٰۃ صرف نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ''سورۃ التوبہ'' میں ذکر کردہ آٹھ مصارف میں سے کسی سے اس کا تعلق نہیں۔ تاہم بعض مفسرین نے مصرف ''فی سبیل اللہ'' کو عام کر کے رفاہِ عامہ کے تمام کاموں کو اس میں شامل کرنے کی سعی کی ہے۔ لیکن یہ نظریہ درست نہیں۔ اگر یہ مصرف اتنا ہی عام ہوتا تو دیگر سات مصارف کو بھی ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے کہ لفظ ''فی سبیل اللہ'' میں وہ بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ قرآنی آیت میں ان کا علیحدہ ذکر کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ اس سے مقصود مخصوص امور ہیں اور وہ جہاد اور حج وعمرہ ہیں۔ بعض روایات میں ان امور کی تصریح موجود ہے۔ ملاحظہ ہو ''سنن ابی داؤد'' وغیرہ۔

❶ صحیح البخاری، کَیْفَ کَانَ بَدْءُ الْوَحْیِ إِلَی رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ؟، رقم:۱

کیا بے عمل یا بدعمل سائل کو خیرات دی جا سکتی ہے؟

سوال : خیرات کا حق دار کون ہے؟ سوالی پر رحم تو آتا ہے لیکن اگر وہ مرد ہو تو اس کی داڑھی کٹی ہوئی ہوتی ہے اور اگر عورت ہو تو وہ بے پردہ ہوتی ہے۔ اگر مرد کو اللہ تعالیٰ کے نام پر کچھ پیسے دیے جائیں تو وہ گناہ پر خرچ کرتا ہے (یعنی داڑھی کٹواتا ہے۔) (سائل) (مارچ ۲۰۰۵ء)

جواب : سائل، مرد ہو یا عورت، اگر وہ آپ کے پاس اپنے مستحق ہونے کا اظہار کرتا ہے تو حسبِ استطاعت اس کی امداد ہونی چاہیے۔ جہاں تک اُس کی کوتاہیوں کا تعلق ہے، تو اُس پر اُسے تنبیہ کرنی چاہیے۔ لیکن اس بنا پر کسی کو صدقہ وخیرات سے محروم کرنا اچھا عمل نہیں، تاہم پیشہ ور بھکاریوں سے حتی الامکان اجتناب کرنا چاہیے۔

غیر صحیح العقیدہ مسلمان کو زکوٰۃ وعشر دینے کا حکم

سوال : غیر صحیح العقیدہ لیکن قریبی رشتہ دار غریب مسلمان کو مالِ زکوٰۃ وغیرہ دینے کا کیا حکم ہے۔ جواب دے کر مشکور ہوں۔ (سائل محمد خاں وٹو چک، ضلع شیخوپورہ) (۱۲ جولائی ۱۹۹۶ء)

جواب : اصلاً مالِ زکوٰۃ صحیح العقیدہ لوگوں کو دینا چاہیے۔ حدیث میں ہے:

« وَ لَا يَأْكُلْ طَعَامَكَ اِلَّا تَقِيٌّ » [1]

''یعنی تیرا کھانا پرہیز گار کے سوا کوئی نہ کھائے۔''

نیز صحیح احادیث میں قصہ معروف ہے۔ ایک شخص غلطی سے اپنا صدقہ چور، رنڈی اور مالدار کو باری باری دے بیٹھا۔ تو بعد میں پریشان ہوا۔ پھر خواب کے ذریعہ اس کو تسلی دلائی گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ صدقہ غلط کار لوگوں کا حق نہیں۔ ورنہ وہ پریشان نہ ہوتا اور نہ خواب میں اسے تسلی دلانے کی ضرورت پڑتی۔ ہاں البتہ تالیفِ قلوب کے طور پر ان لوگوں کو مالِ زکوٰۃ سے کچھ دے دیا جائے تو جواز ہے۔ لیکن اس شرط پر کہ اصلاحِ عقیدہ کی تلقین وتبلیغ بھی ساتھ جاری رہے۔

شیعہ کو زکوٰۃ دینے کا کیا حکم ہے؟

سوال : میں اہل حدیث ہوں اور میرا ایک دوست شیعہ ہے جو کہ صحابہ کے دشمن ہیں۔ اس کی دو لڑکیاں نوجوان ہیں۔ وہ قریب الموت ہے۔ وہ اپنی زندگی میں اپنی لڑکیوں کی شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس نے مجھ سے کوئی امداد طلب کی ہے۔ میرے پاس زکوٰۃ کی رقم ہے۔ کیا اس میں سے تین چار ہزار کی امداد کر سکتا ہوں یا نہیں۔ اس پر زکوٰۃ لگ سکتی ہے اور اس کا اجر مجھے بھی کچھ مل سکتا ہے یا نہیں؟ شرع محمدی سے میری مدد کریں۔

ہاں اس کے علاوہ اگر اپنے پاس سے بھی کوئی مدد کی جائے تو اُس کا اجر بھی ملے گا یا نہیں؟ اس کا جواب جلدی سے

[1] سنن أبي داؤد، بَابُ مَنْ يُؤْمَرُ أَنْ يُجَالِسَ، رقم:٤٨٣٢

جلدی دیویں، مہربانی ہوگی تاکہ بروقت میں اس کی مدد کرسکوں۔ (ملک عبدالغفور، مجاہد ٹاؤن، میانوالی) (۱۰ مئی ۱۹۹۶ء)

جواب : مالِ زکوٰۃ عقیدۃً اچھے لوگوں کو ہی دینا چاہیے، ہاں البتہ انسانی ہمدردی کے طور پر عام مال سے اس کی کوئی امداد کردی جائے تو کوئی حرج نہیں کیونکہ انسان تو انسان ہے۔ اسلام نے تو حیوانات کے ساتھ بھی احسان کرنے کی تعلیم دی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے: پیاسے کتے کو پانی پلانے کی صورت میں احسان کرنے والے شخص کو اللہ تعالیٰ نے معاف کردیا تھا۔ (ملاحظہ ہو''صحیح بخاری''وغیرہ) اس طرح ممکن ہے۔ اللہ رب العزت آپ کے نامہ اعمال میں اجر و ثواب ثبت کردے، اور اس حسن سلوک سے ان کو رشد و ہدایت کی توفیق میسر آجائے۔ (و ما ذلك على الله بعزيز)

کیا مشرک یا بدعتی کو زکاۃ دی جاسکتی ہے؟

سوال : کیا زکاۃ یا صدقات وغیرہ ایسے لوگوں کو دیے جاسکتے ہیں جو مشرک ہوں، یا جو باوجود کوشش کے دین کی طرف، نماز، روزہ کی طرف نہیں آتے۔ بلکہ شرک و بدعت کو اپنی جہالت کی وجہ سے دین سمجھتے ہیں۔ پھر تنگ دست بھی ہیں؟ (سائل) (۲۱ مئی ۲۰۰۴ء)

جواب : زکاۃ عشر اور دیگر صدقات مشرک یا بدعتی کو نہیں دینے چاہئیں۔ حدیث میں ہے:

« لَا يَأْكُلْ طَعَامَكَ اِلَّا تَقِيٌّ » [1]

''تمہارا کھانا صرف پرہیز گار ہی کھائے۔''

اس لیے زکاۃ وغیرہ صرف پرہیز گار کو دینی چاہیے۔

والد اپنی زکوٰۃ سے بیٹے کو تنخواہ نہ دے

سوال : مندرجہ ذیل سوالات کا جواب قرآن وحدیث کی روشنی میں دیں۔ کیا باپ اپنے بیٹے کو تعلیم القرآن کے سلسلہ میں اپنے مال کی زکوٰۃ سے تنخواہ دے سکتا ہے؟ (از عبداللہ) (۱۵ مارچ ۱۹۹۶ء)

جواب : والد کی زکوٰۃ سے بیٹے کو تنخواہ نہ دی جائے۔ کیونکہ حدیث میں «هُمْ مِنْ آبَائِهِمْ» [2] یعنی اولاد اپنے آباء سے ہے۔'' کی بناء پر وہ والد کے تابع ہے اور والد چونکہ صاحب زکوٰۃ ہے۔ اس پر زکوٰۃ نہیں لگ سکتی تو اولاد کو بھی نہیں لگ سکتی۔ ہاں البتہ بیٹا اگر جوان ہو اور اس کا اپنا الگ کاروبار ہو محتاج ہونے کی صورت میں اس پر زکوٰۃ صرف ہوسکتی ہے لیکن بطورِ تنخواہ نہیں۔

---

[1] سنن أبي داؤد، بَابُ مَنْ يُؤْمَرُ أَنْ يُجَالِسَ، رقم:٤٨٣٢

[2] صحيح البخاري، بَابُ أَهْلِ الدَّارِ يُبَيَّتُونَ، فَيُصَابُ الوِلْدَانُ وَالذَّرَارِيُّ، رقم:٣٠١٢

مسجد کی رقم مدرسہ پر خرچ کرنے کا جواز

سوال: کیا مسجد کی رقم مدرسہ میں لگ سکتی ہے جو کہ اسی مسجد میں قائم ہو۔؟ (از عبداللہ) (۱۵ مارچ ۱۹۹۶ء)

جواب: مسجد اور مدرسہ دونوں چونکہ وقف ہیں لہٰذا مسجد کی رقم مدرسہ پر صرف ہو سکتی ہے۔

مقامی مستحقین کو نظر انداز کر کے جہاد کے لیے فنڈ جمع کرنے کا حکم

سوال: آج کل ہر شہر اور قصبہ میں کارکنان جمعیت اہل حدیث اور مرکز الدعوۃ میں مختلف مسائل پر چپقلش چل رہی ہے۔ ہر فریق اپنے اپنے جماعتی جریدہ کے مسائل کو حتمی سمجھ کر دوسرے کو غلط قرار دے رہا ہے۔ عید الاضحیٰ کے موقع پر مرکز الدعوۃ کے لڑکوں نے جہاد کے نام پر قربانی کی کھالیں اکٹھی کرنے کی مہم چلائی۔ ہمارے قریبی شہر کے ایک عالم نے کہا کہ قربانی کی کھالوں کے حق دار مقامی غریب اور مسکین لوگ ہیں۔ یہ کوئی نیکی نہیں ہے کہ مساکین کا حق چھین کر آپ کشمیری مجاہدین کے حوالے کر دیں، کشمیری مجاہدوں کی مدد کرنی ہے تو اصل مال سے کریں۔ اور مرکز الدعوۃ کے لڑکوں کے سپرد کرنے کی بجائے مہاجرین اور مجاہدین کو خود دے کر آئیں۔ مرکز الدعوۃ کے کارکنوں نے شور مچا دیا کہ یہ لوگ جہاد کے منکر ہیں۔ مدارس نے آج تک کیا کیا ہے۔ اصل کام تو جہاد ہے جس سے یہ لوگ بھاگتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

اب آپ سے گزارش ہے کہ بغیر کسی کی رعایت کرتے ہوئے قرآن وسنت کی رُو سے اس مسئلہ کی وضاحت کریں کہ قربانی کی کھالوں کے اصل حق دار کون ہیں؟ کیا نبی ﷺ کے زمانہ میں فطرانہ، صدقہ، خیرات اور زکوٰۃ اور کھالیں اکٹھی کر کے مجاہدوں کو دی جاتی تھیں؟ (اے ٹی سلفی، بورے والا) (۴ اگست ۱۹۹۵ء)

جواب: صدقہ خیرات کے اصل مستحق مقامی فقراء و مساکین ہیں چنانچہ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ ''زاد المعاد'' (۳/۴۶) میں فرماتے ہیں:

> ''جس کا حاصل یہ ہے کہ قوم نجیب کے قاصد نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اپنے ساتھ صدقات بھی لیتے آئے۔ اس پر آپ ﷺ نے ان کی عزت کی اور فرمایا کہ ان صدقات کو اپنے فقیروں میں تقسیم کر دو۔ انھوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! ہمارے فقیروں سے جو کچھ بچا ہے وہی لائے ہیں۔''

اور حدیث میں ہے:

« فَأَخْبِرْهُمْ أَنَّ اللّٰهَ قَدْ فَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ فَتُرَدُّ عَلَى فُقَرَائِهِمْ.» [1]

---

[1] صحيح البخاري، بَابُ أَخْذِ الصَّدَقَةِ مِنَ الأَغْنِيَاءِ وَتُرَدُّ فِي الفُقَرَاءِ حَيْثُ كَانُوا، رقم:١٤٩٦، صحيح مسلم، باب الدعاء إلى الشهادتين وشرائع الإسلام، رقم:١٩

''نبی ﷺ نے فرمایا، معاذ اہل یمن کو اس بات سے آگاہ کرنا کہ اللہ نے ان پر زکوٰۃ فرض کی ہے۔ ان کے مالداروں سے لے کر انہی کے محتاجوں پر اسے لوٹایا جائے۔''

اس حدیث سے اس امر کی تائید لی جا سکتی ہے۔

« قَالَ الْإِسْمَاعِيلِيُّ ظَاهِرُ حَدِيثِ الْبَابِ أَنَّ الصَّدَقَةَ تُرَدُّ عَلَى فُقَرَاءِ من أخذت من أغنيائهم .» ❶

اس سے یہ بات مترشح ہے کہ مقامی حق داروں کا خیال نہ رکھنا حقوق غصب کرنے کے مترادف ہے جو مومن کی شان سے بعید ہے۔ لہٰذا جہادی مہم کے علمبرداروں کے لیے ضروری ہے کہ غیروں کے استحقاقات کو بھی نظر میں رکھیں۔ اصل یہ ہے کہ ہر جگہ مقامی بیت المال قائم کیا جائے اور مستحقین کا اندراج کیا جائے۔ پھر ہر صاحب حاجت کا خیال رکھا جائے۔ مقامی ضروریات کے علاوہ جہادی مہم میں بھی بھرپور حصہ لینا چاہیے۔

مسلمانوں کی جہادی تنظیموں کے ذمہ داران پر فرض عائد ہوتا ہے کہ آپس میں متحد ہو کر «وَإِنَّمَا الإِمَامُ جُنَّةٌ يُقَاتَلُ مِنْ وَرَائِهِ » ❷ کا نقشہ پیش کریں بصورتِ دیگر صحیح نتائج کی توقع کرنا عبث ہے۔ افغانستان کی واضح مثال اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ صالح قیادت کے فقدان کی وجہ سے فوائد وثمرات کا حصول مشکل امر بنا ہوا ہے۔ لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ

نیز امراء جہاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے میں اللہ کے ہاں جوابدہی کا احساس پیدا کریں کہ ہم نے عدالتِ عالیہ الٰہیہ میں پائی پائی کا حساب دینا ہے۔ اس وقت کی آمد سے قبل قوم کو بھی اعتماد میں لینا ضروری ہے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے عمال سے حساب لیتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے لوگ سر محفل حساب پوچھا کرتے تھے۔ کتاب الاموال اور کتاب الخراج ابو یوسف میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔

رسول اکرم ﷺ کے عہد میں جہاد کے عام مالی موارد مالِ فیٔ، خراج، مال غنیمت وغیرہ ہوا کرتے تھے۔ «جُعِلَ رِزْقِي تَحْتَ ظِلِّ رُمْحِي» ❸ بوقت ضرورت عمومی صدقہ مصرف ''فی سبیل اللہ'' کے ضمن میں مالِ زکوٰۃ وغیرہ بھی شامل ہے۔

مجاہدین اور مقامی طلبہ میں سے زکوٰۃ کا زیادہ حق دار کون ہے؟

سوال: ہم لوگ اللہ کے فضل وکرم سے صاحب مال و جائیداد ہیں اور ہر سال اللہ کی توفیق سے زکوٰۃ بھی ادا کر رہے

❶ فتح الباری:۳/ ۳۵۷

❷ صحیح البخاری، بَابُ يُقَاتَلُ مِنْ وَرَاءِ الإِمَامِ وَيُتَّقَى بِهِ، رقم:۲۹۵۷

❸ صحیح البخاری، بَابُ مَا قِيلَ فِي الرِّمَاحِ، قبل الحديث: ۲۹۱٤

ہیں۔ جب سے جہاد شروع ہوا ہے۔ ہم لوگ اپنی زکوٰۃ جہاد فنڈ میں ہی جمع کرا دیتے ہیں۔ اب ایک دوست نے توجہ دلائی ہے کہ ''زکوٰۃ'' تو خالصتاً اللہ کا مال ہے اور جو آدمی مسلمان ہونے کے باوجود ادا کرنے سے انکار کرے اس کے خلاف تو خود جہاد کرنا فرض ہے۔ اور یہی اسوۂ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہے۔ زکوٰۃ کو اسی طور طریقہ پر خرچ کرنا چاہیے جس طریقہ سے اللہ نے ترتیب مقرر کی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں عمل کیا ہے جس طرح زکوٰۃ اسلام کا ایک رکن ہے۔ اسی طرح جہاد بھی اسلام کا دوسرا رکن ہے۔ دونوں کے احکامات اللہ نے الگ الگ ارشاد فرمائیں ہیں؟ اس دوست کا نقطۂ نظر بھی آپ کے ملاحظہ کے لیے روانہ کیا جا رہا ہے۔

اب ہمیں مندرجہ ذیل اشکال ہیں۔

ا۔ کیا زکوٰۃ مجاہدین پر خرچ کی جاسکتی ہے؟

۲۔ مجاہدین اور مقامی مدرسہ کے طلباء میں سے کس کو ترجیح دی جائے؟

۳۔ کیا مجاہدین کو زکوٰۃ دے دینے کے بعد ہم جہاد بالمال کے فرض سے سبکدوش ہو جائیں گے؟ (ڈاکٹر سید شہزاد علی بخاری بخاریز ہسپتال ابوظہبی روڈ۔ رحیم یار خان) (۲ اگست ۱۹۹۷ء)

جواب : ا۔ مجاہدین فی سبیل اللہ پر زکوٰۃ صرف ہوسکتی ہے۔ کیونکہ مصارفِ زکوٰۃ میں یہ شامل ہیں۔

۲۔ زکوٰۃ کے سلسلہ میں مقامی غرباء و مساکین اور غریب طلبۂ مدرسہ مقدم ہیں۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

« تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ وَتُرَدُّ عَلَى فُقَرَائِهِمْ . » [1]

''مقامی مالداروں سے زکوٰۃ وصول کی جائے اور انھی فقراء میں تقسیم کی جائے۔''

ان کی ضروریات سے زائد جہاد فنڈ میں جمع کرا دی جائے۔

۳۔ مجاہدین کو زکوٰۃ دینے سے آپ جہاد میں شریکِ کار سمجھے جائیں گے۔

زکوٰۃ وعشر کے مال سے حج وعمرہ کرنا

سوال : میں نے کسی شمارہ میں احکام ومسائل کے تحت یہ پڑھا تھا کہ آدمی عشر کے مال سے عمرہ کرسکتا ہے۔ آپ دلائل سے بتائیں کہ آدمی عُشر کے مال سے عمرہ کرسکتا ہے یا نہیں؟ اس کا جواب جلد درکار ہے کیونکہ میں عمرہ کرنا چاہتا ہوں۔

(سائل حاجی عبدالرشید ماموں کانجن، ضلع فیصل آباد) (۲۰ نومبر ۱۹۹۸ء)

جواب : زکوٰۃ اور عشر کا مال حج اور عمرہ میں صرف ہوسکتا ہے۔ ''سنن ابی داؤد'' کے ''باب العمرۃ'' میں تصریح ہے کہ حج

---

[1] صحيح البخارى كتاب الزكاة ، بَابُ وُجُوبِ الزَّكَاةِ، رقم:١٣٩٥

مصرفِ زکوٰۃ ''فی سبیل اللہ'' میں شامل ہے۔اور ''مسند احمد'' کی روایت میں حج کے ساتھ عمرہ کی بھی صراحت ہے۔«اَلْحَجُّ وَالْعُمْرَةُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ» ❶

اس حدیث کی شرح میں امام شوکانی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

''باب کی احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں کہ حج اور عمرہ ''فی سبیل اللہ'' میں شامل ہیں۔جس شخص نے اپنے مال میں سے کوئی شئے اللہ کی راہ میں وقف کردی وہ اس کو حاجیوں اور عمرہ کرنے والوں کی تیاری میں صرف کرسکتا ہے اور جب کوئی سواری ہوتو حاجی اور عمرہ کرنے والے کے لیے اس پر سواری کرنا جائز ہے۔اور اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ زکوٰۃ کے حصے ''فی سبیل اللہ'' سے کچھ اُن لوگوں پر بھی خرچ ہوسکتا ہے جو حج اور عمرے کا قصد کرتے ہوں۔ ❷

زکوٰۃ کی رقم سے فلاحی ادارے یا دینی ادارے کا تعاون:

سوال : (ا) کسی فلاحی ادارے یا دینی ادارے کو زکوٰۃ کی مَد سے رقم برائے مندرجہ ذیل امور دی جاسکتی ہے۔

۱۔ برائے تعمیر ہسپتال۔ بلڈنگ۔ مشینری وغیرہ۔

۲۔ برائے تعمیر مدرسہ،عمارت وکتب برائے طلباء

۳۔ برائے اشاعت تبلیغی لٹریچر برائے تقسیم۔ (محمد الیاس۔دوائی والا۔کراچی) (۲۲ اگست ۱۹۹۷ء)

جواب : مذکورہ بالا چیزوں سے فائدہ اٹھانے والے اگر صرف مستحقینِ زکوٰۃ ہوں پھر تو مالِ زکوٰۃ کو ان اشیاء پر صرف کیا جاسکتا ہے ورنہ ناجائز ہے۔اور تبلیغی لٹریچر پر بھی اسے صرف کرنا ناجائز ہے۔کیوں کہ اس سے مستحقین کا حق تلف ہوتا ہے اور مالِ زکوٰۃ اغنیاء کے ہاتھ میں بھی جاسکتا ہے جو ان کے لیے حلال نہیں۔

زکوٰۃ کے مصارف میں سے فی سبیل اللہ میں کون کون سے امور داخل ہیں؟

سوال : زکوٰۃ کے مصارف میں سے فی سبیل اللہ میں کون کون سے امور داخل ہیں؟

(محمد جہانگیر پوٹھ شیرڈ ڈیال میرپور کے۔اے) (۲۶ دسمبر ۱۹۹۷ء)

جواب : مصارفِ زکوٰۃ میں لفظ فی سبیل اللہ میں جہاد بالاتفاق داخل ہے۔حج بھی فی سبیل اللہ میں داخل ہے۔اس کی باب ''ابوداؤد'' باب العمرة میں صریح حدیث موجود ہے۔اور ''نیل الاوطار'' کتاب الزکوٰۃ باب الصرف فی سبیل اللہ میں بعض اور روایتوں کا بھی ذکر ہے۔

❶ سنن الدارمی، بَابُ:إِذَا أَوْصَى بِشَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ، رقم: ۳۳۴۷

❷ نیل الاوطار:۴/ ۱۸۴

جن میں تصریح ہے کہ حج فی سبیل اللہ میں داخل ہے اور بعض روایتوں میں عمرہ کی بابت بھی تصریح ہے۔ اگر عمرہ کی تصریح نہ ہوتی تو بھی عمرہ حج کے حکم میں داخل ہوتا لیکن بعض روایتوں میں تصریح آنے سے اور پختگی ہوگئی۔

(فتاویٰ اہلحدیث: ۲/۴۹۳)

لیکن بعض اہل علم کا خیال ہے۔ فی سبیل اللہ کا لفظ عام ہے۔ ہر کارِ خیر کو شامل ہے۔ چنانچہ ''تفسیر فتح البیان'' اور ''تفسیر کبیر'' میں اس امر کی تصریح موجود ہے۔

ہمارے شیخ محدث روپڑی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اگر اس پر کوئی عمل کرے تو اس پر اعتراض تو نہیں ہوسکتا مگر چونکہ زکوٰۃ فرضی صدقہ ہے۔ اس کو ایسی طرز پر ادا نہ کرنا چاہیے۔ جس میں تردد ہے۔ دیکھئے نماز میں جب شک ہو جاتا ہے کہ ایک رکعت پڑھی ہے یا دو، تو حکم ہے کہ ایک رکعت اور پڑھے تاکہ شک سے نکل جائے۔ پس زکوٰۃ بھی قرآن میں نماز کے ساتھ ذکر ہوئی ہے اس میں بھی احتیاط چاہیے۔ اس لیے بہتر ہے فی سبیل اللہ سے مراد جہاد لیا جائے یا حج عمرہ کیونکہ جہاد تو بالاتفاق مراد ہے اور حج عمرہ حدیث نے داخل کر دیا ہے۔ مگر جیسا عام ہے ویسا رکھا جائے تو پھر فقراء مساکین وغیرہ کا الگ ذکر کیا ہے۔ اس لیے ظاہر یہی ہے کہ اس سے مراد خاص ہے اور خاص بغیر دلیل کے مراد نہیں ہوسکتا۔ دلیل یا تو آیت ہے یا اتفاقِ مفسرین ہے۔ جیسا کہ حج عمرہ ہونے پر ہے۔ باقی کی بابت کوئی دلیل نہیں۔ (حوالہ مذکور: ۲/۴۹۵)

(عام صدقات)

دنیا ملعون ہے تو اس سے حاصل شدہ چندے، صدقات وخیرات کا حکم

سوال: حدیث شریف میں دنیا کو ملعون کہا گیا بلکہ مردار اور اس کو چاہنے والے کتے۔ مگر اس عالم اسباب میں اس کے بغیر گزارہ بھی نہیں۔ دورِ رسالت ﷺ سے لے کر آج تک مسلمانوں سے چندہ صدقات وخیرات کی اپیل کی جاتی رہی ہے بلکہ آج کل تو مذہب کے نام پر مانگنے کی خوب دَوڑ لگی ہوئی ہے۔ اس تضاد کی تشریح یا تاویل کیسے ممکن ہے؟

(۱۵ نومبر ۱۹۹۶)

جواب: دنیا قابلِ مذمت اس وقت بنتی ہے جب اللہ سے دُوری کا سبب بنے اور جب اس کو راہِ للہ صرف کرکے قربِ الٰہی کی سعی کی جائے تو یہ باعثِ افتخار ہے جس طرح کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعدد واقعات ہمارے سامنے ہیں۔ مثلاً حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ عمر رضی اللہ عنہ سے انفاق میں سبقت لے گئے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ غزوۂ تبوک کے موقعہ پر مال خرچ کرکے درجات العلیٰ کے وارث بنے۔

زکوٰۃ کی بجائے صدقہ وخیرات اور دینی مدارس کی امداد کرنا

سوال: ایک آدمی اپنے مال کی مستقل طور پر ہر سال زکوٰۃ ادا نہیں کرتا مگر صدقہ وخیرات اور دینی مدارس کی امداد زکوٰۃ

سے کہیں زیادہ کرتا ہے۔کیا یہ طریقہ درست ہے؟ نیز زکوٰۃ ایڈوانس دی جاسکتی ہے یا نہیں؟

(محمد ابراہیم نجیب فیصل آباد) (۵ستمبر۱۹۹۷ء)

جواب: شریعت میں نصابِ زکوٰۃ مقرر ہے۔اس کے مطابق ادائیگی زکوٰۃ ضروری ہے۔تا ہم اس کے علاوہ بھی اگر کوئی شخص صدقہ وخیرات کرنا چاہے تو باعثِ فضیلت فعل ہے۔

صدقہ خیرات کس طرح اور کس آدمی کو دینا چاہیے؟

سوال: صدقہ خیرات کس طرح اور کس آدمی کو دینا چاہیے؟ (محمد یوسف۔ضلع ایبٹ آباد) (۹ جولائی ۱۹۹۹ء)

جواب: صدقہ خیرات جب آدمی چاہے حسب توفیق دے سکتا ہے۔بشرطیکہ اہل بدعت سے مشابہت لازم نہ آئے۔ فقراء ومساکین اور محتاجوں کو صدقہ دینا چاہیے۔مزید تفصیل ''سورة التوبۃ'' کی آیت:۶۰، میں ملاحظہ فرمائیں۔

میت کی طرف سے صدقہ کرنا

سوال: ایک آدمی فوت ہو جاتا ہے، اس نے کوئی وصیت نہیں کی کہ میرے فوت ہوجانے کے بعد صدقہ کرنا، کیا اسکی طرف سے صدقہ کرنا جائز ہے؟ (محمد نصر اللہ گوندلانوالہ،تحصیل وضلع گوجرانوالہ) (۶ نومبر۱۹۹۲ء)

جواب: فوت شدہ آدمی کی طرف سے صدقہ کرنا جائز ہے۔اگرچہ وصیت نہ کی ہو۔حدیث میں ہے:

« فَهَلْ لَّهَا اَجْرٌ اِنْ تَصَدَّقْتُ عَنْهَا قَالَ نَعَمْ»[1]

''یعنی ایک نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! میری والدہ اچانک فوت ہوگئی۔خیال ہے اگر وہ کلام کرتی تو صدقہ کرتی۔اگر میں اس کی طرف سے صدقہ کروں تو اُس کے لیے اجر ہے فرمایا ہاں۔''

کیا مطلق صدقہ کے جانور کا گوشت گھر میں استعمال ہوسکتا ہے؟

سوال: اگر کوئی آدمی اپنے گھر میں صدقہ کا جانور ذبح کرتا ہے اور یہ صدقہ مطلق ہے۔نذر، کفارہ وغیرہ کا صدقہ نہیں ہے یا بطورِ صدقہ کھانا تیار کرتا ہے۔کیا وہ صدقہ کے اس گوشت یا کھانے کو اپنے استعمال میں لاسکتا ہے یا نہیں؟ یعنی اس گوشت یا کھانے میں سے اپنے اہل وعیال کو کھلا سکتا ہے یا نہیں؟ بَيِّنُوْا تُوجَرُوْا۔ (سائل حافظ محمد یوسف خطیب ہیئر بیدیاں روڈ لاہور) (۲۱ اپریل۔۱۹۹۵ء)

جواب: جو جانور بطورِ صدقہ متعین کردیا جائے اس کا گوشت متصدق اپنے گھر استعمال میں نہ لائے وہ صرف فقراء و مساکین وغیرہ کا حق ہے۔اگرچہ عام صدقہ ہی کیوں نہ ہو اس لیے کہ صدقہ کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی اللہ کی رضا کی خاطر اس کی قربت کے حصول اور نیکی کی بناء پر اپنا استحقاق ترک کردے۔

---

[1] صحیح البخاری، بَابُ مَوْتِ الْفَجْأَةِ الْبَغْتَةِ، رقم:١٣٨٨، صحیح مسلم، رقم:١٠٠٤

گھر والوں کا صدقہ کا جانور اپنے لیے پکانا اور کھانا

سوال: گھر والوں نے صدقہ کا جانور ذبح کیا۔ کیا اس میں سے لے کر اپنے لیے پکایا اور کھایا جا سکتا ہے؟

(انجینئر محمد بلال کوٹ ادو، ضلع مظفر گڑھ) (۱۰ مئی ۱۹۹۶ء)

جواب: عام صدقہ سے مقصود چونکہ اللہ کا قرب ہوتا ہے اس لیے اصل یہ ہے کہ صاحب بیت خود کچھ نہ کھائے ورنہ صدقہ وہی حصہ ہوگا جو عملاً صدقہ کر دیا ہے۔

صدقہ کا بکرا ذبح کر کے خود بھی کھایا جا سکتا ہے؟

سوال: ایک آدمی نے صدقہ کا بکرا ذبح کیا۔ کیا وہ خود بھی یہ گوشت کھا سکتا ہے؟ قرآن وسنت سے دلیل دیں۔

(فتح علی گہلن ہٹھاڑ) (۱۲ مارچ ۱۹۹۹ء)

جواب: صدقہ کا گوشت فقراء کو کھلانا چاہیے۔ خود نہ کھائے۔ بالخصوص صدقہ واجبہ ہاں البتہ عمومی دعوت کی صورت میں خود بھی کھا سکتا ہے۔ مثلاً احبابِ جماعت کی عمومی دعوت کی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

باپ کے علم میں لائے بغیر مال سے غرباء ومساکین کی اعانت کرنا

سوال: مسئلہ یہ ہے کہ والد صاحب مجھے جو دو ہزار روپے دوائیوں کا خرچ دیتے ہیں۔ اس میں سے جتنا ہو سکے۔ غریبوں خصوصاً گھریلو ملازموں (جو کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر میں رہتے ہیں) کی مدد کرتی رہتی ہوں۔ اس کے علاوہ والدہ صاحبہ اور والد صاحب کی اجازت کے بغیر ان کے پیسے نکال کر جب ملازموں کو ضرورت ہو، دیتی رہتی ہوں۔ ملازم ایک کمانے والا ہے۔ ۸۔۱۰ افراد (بیوی بچے) کھانے والے ہیں۔ اس کی تنخواہ ۲۰۰۰ روپے ماہانہ ہے۔ گزارا انتہائی تنگی سے ہوتا ہے۔ ہمارے گھر کا ہر فرد حتی الوسع ان کی ہر طرح کی مدد کرتا رہتا ہے۔

اب مسئلہ یہ پوچھنا ہے کہ میں جو والدین کی اجازت کے بغیر ان کی رقم نکال کر غریبوں کو اس وقت دیتی ہوں جب ان کو ضرورت ہو، تو کیا یہ چوری سمجھی جائے گی؟ اور کیا مجھے گناہ ملے گا۔ اس مسئلہ کا حل میں نے حافظ صلاح الدین یوسف صاحب سے اور حافظ ثناء اللہ پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور خطیب جامع مسجد آریہ نگر سمن آباد سے ٹیلیفون پر پوچھا تھا تو انھوں نے کہا تھا گناہ بہت کم ہے اور ثواب بہت زیادہ۔ اب میں اپنی تسلی کے لیے یہ چاہتی ہوں کہ میرے پاس لکھا ہوا ثبوت ہو۔ آپ حضرات کے جواب کی منتظر رہوں گی۔ (نصرت ہاشمی مزنگ چونگی) (۲۱ جون ۱۹۹۶ء)

جواب: والد محترم کی اجازت کے بغیر ان کے مال سے غرباء ومساکین کی اعانت کرنا درست فعل نہیں۔ اس بات کا علم والد صاحب کو تفصیلی یا اجمالی ہونا ضروری ہے کیونکہ مال کے مالک وہ ہیں آپ نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس سے بدگمانی بھی پیدا ہو سکتی ہے جس سے گھریلو زندگی کے مجروح ہونے کا اندیشہ ہے۔ بعض احادیث میں ہے:

«اِتَّقُوا مَوَاضِعَ التُّھَمِ.» ❶

''اپنے کو بدظنی کے مقام سے بچانا چاہیے۔''

باپ کے پیسے چوری کرکے غریب اور مستحق گھرانے کی مدد کرنا:

سوال: ہم گھر کے ۸ افراد ہیں۔کمانے والے دو ہیں۔ایک والد صاحب جن کی پنشن اور زرعی اراضی کی آمدنی ہے۔ اور ایک بھائی صاحب جو ڈاکٹر ہیں۔والد صاحب ماہانہ تین ہزار اور بھائی صاحب ماہانہ ۴ ہزار روپے خرچ کے لیے دیتے ہیں۔ جو ملا کر ۷۰۰۰ روپے بنتے ہیں۔اس مہنگائی کے دَور میں کفایت شعاری سے خرچ کرنے کے باوجود خرچ آمدن سے بڑھ جاتا ہے۔ ماہانہ خرچ کا حساب کتاب والدہ صاحبہ کے پاس ہے۔مسئلہ یہ ہے کہ ۷۰۰۰ روپے میں خرچ بہت مشکل ہوتا ہے۔والدہ صاحبہ پریشان رہتی ہیں۔شوگر کی مریض ہیں۔ میں والد صاحب کی اجازت کے بغیر ہزار پانچ سو روپے نکال کر دیتی ہوں جو گھر میں خرچ ہوتے ہیں۔ والدہ صاحبہ کی پریشانی تھوڑی کم ہو جاتی ہے۔لیکن ضمیر مجھے پریشان کیے رکھتے ہے کہ کہیں چوری نہ سمجھی جائے۔ والدہ صاحبہ اپنی ذات کے لیے کنجوس ہیں، دوسروں کے لیے نہیں۔ غریبوں کی صدقہ ،زکوٰۃ (خصوصاً قرضِ حسنہ) سے امداد کرتی رہتی ہیں۔ان کی گھریلو اخراجات کی پریشانی مجھ سے نہیں دیکھی جاتی۔ (نصرت ہاشمی مزنگ چونگی) (۲۱ جون ۱۹۹۶ء)

جواب: گھریلو اخراجات اگر سات ہزار ماہانہ سے پورے نہیں ہوتے تو اس کا بہتر اور مناسب حل یہ ہے کہ مہنگائی کے پیش نظر والد صاحب سے اضافہ کا مطالبہ کیا جائے۔ ان کی اجازت کے بغیر والدہ صاحبہ کو مزید رقم دینا یہ درست فعل نہیں۔ پھر ایسی رقم سے اگر صدقہ خیرات بھی کیا جائے تو وہ مقامِ قبولیت کو نہیں پاتا کیونکہ انفاق میں صاحبِ مال کے لیے ثواب کی نیت کرنا ضروری ہے۔ جو یہاں مفقود ہے۔

عورت کا خاوند سے بلا اجازت اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا:

سوال: عورت اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر اشیاء روپے پیسے وغیرہ کسی کو دے سکتی ہے اگر اس کا اپنا مال ہو کیا پھر بھی اجازت لینا پڑے گی؟ (سائل) (۱۹ اپریل ۱۹۹۹ء)

جواب: راہِ للہ مال خرچ کرنے کے لیے شوہر کی طرف سے اجمالی اجازت ہونی چاہیے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا اختیار یہی ہے۔ دیگر اہل علم کے نزدیک صریح اذن ضروری ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: عون المعبود (۲/ ۵۷) اگر اس کا اپنا مال ہو تب وہ خرچ کرنے میں آزاد ہے۔

❶ السنن الکبرٰی للبیھقی، بَابُ الْمَرْأَۃِ تَزُوْرُ زَوْجَھَا فِی اعْتِکَافِہٖ وَمَا فِی تِلْکَ الْقِصَّۃِ مِنَ السُّنَّۃِ فِی تَرْکِ الْوُقُوْفِ فِی مَوَاضِعِ التُّھَمِ، رقم:۸۶۰۵، شعب الایمان، فَصْلٌ فِیمَنْ أَبْعَدَ نَفْسَہٗ عَنْ مَوَاضِعِ التُّھَمِ، رقم:۶۳۸۱

صدقہ کا مال صدقہ کی راہ میں جانا چاہیے

سوال : ایک شخص خود کسی کتاب کا مؤلف ہے لیکن اسے چھپوانے کے لیے لوگوں سے (رقم کا) تعاون حاصل کر کے اور خود اپنی طرف سے اس کتاب کو قیمتاً فروخت کرنا چاہتا ہے اور فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ کیا اُس کا یہ فعل شرعاً یا اخلاقاً درست ہے؟ (عبدالقادر۔قصور) (۹ جولائی ۱۹۹۹ء)

جواب : کتاب کے مؤلف کو غیر سے جو رقم ملی ہے پہلے اس کی حیثیت کا تعین کرنا ہو گا۔ آیا یہ محض بطورِ احسان مالی تعاون ہے کہ مؤلف کتاب ہذا کو فروخت کر کے مالی مفاد حاصل کر سکتا ہے یا اس کی حیثیت صدقہ کی ہے۔ تو اس صورت میں صدقہ کا مال صدقہ کی راہ میں جانا چاہیے۔ اگر بطورِ احسان رقم میسر آئی ہے تو مالی فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ بصورتِ دیگر صدقہ کا مال صدقہ کی راہ میں خرچ ہونا چاہیے۔

اسلامی آداب سے ناواقف، مشرک گداگروں کی امداد کرنا

سوال : ''سورۃ الضحیٰ'' میں ہے کہ (سائل کو نہ جھڑکیں) کچھ سائل تو گھنٹی بجاتے ہیں۔ کچھ زور زور سے دروازے پر دستک دیتے ہیں، اور کچھ خاص دن جمعرات کو آتے ہیں۔ ان میں سے کچھ کی صدا ہوتی ہے ''جمعرات دی روٹی دا سوال اے بابا'' دوسرے دنوں میں کچھ کی صدا ہوتی ہے ''مولا علی رنگ لاوے دوارے وسدے رہن'' کچھ کی صدا ہوتی ہے۔ ''حسن حسین دے ناں دا سوال اے پتر''

الغرض پورا ہفتہ اسی قسم کے گداگروں کی ریل پیل رہتی ہے۔ ایسوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے جو ایسے طریقے سے پیٹ پالتے ہیں۔ میں نے حدیث میں پڑھا ہے کہ تیرا کھانا پرہیز گار ہی کھائے۔'' کیا ایسے لوگوں کو خیرات دینی چاہیے؟ جواز کی صورت میں انھیں صدقۃ الفطر اور قربانی کا گوشت دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

(سائل: رانا محمد اقبال۔ساہیوال) (۲۵ اگست ۲۰۰۰ء)

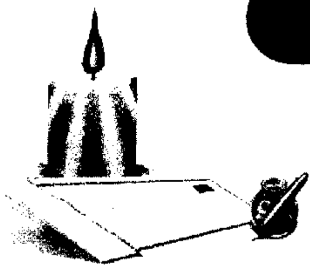
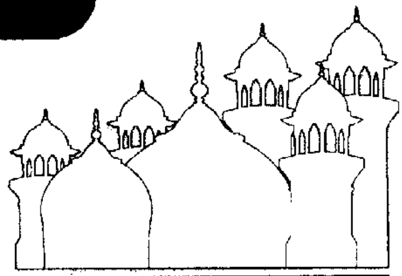
جواب : اسلامی آداب سے ناواقف اور غلط عقیدے کے حامل شخص کو بطریقِ احسن سمجھانا چاہیے:

﴿لَعَلَّهُ يَزَّكّٰى اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى﴾ (عبس:۳۔۴)

'شاید وہ پاکیزگی اختیار کر لے یا نصیحت قبول کرے تو اُسے نصیحت نفع دے۔''

عام حالات میں اچھے لوگوں کو ہی کھانا کھلانا چاہیے۔ البتہ سوال کی صورت میں وسعت ہے۔ اس کے باوجود کوشش ہونی چاہیے کہ قربانی کا گوشت اور فطرانہ وغیرہ نیکوکار لوگوں کو ہی دیا جائے۔

حج وعمرہ

دیارِ حبیب جانے کی دعا کرنا کیسا ہے؟

سوال : بعض حضرات دعاء میں یہ الفاظ کہتے ہیں: ''اے خدا مجھے دیارِ حبیب جانے کی توفیق عطا فرما'' اس سلسلہ میں قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرمادیں۔ کیا اس کا تعلق نیت سے ہے۔ (صفدر حسین سوڈیوال۔لاہور)

جواب : ظاہر ہے کہ ایک مومن مسلمان کا اس دعاء سے مقصود اور مطمح نظر، حج، عمرہ، بیت اللہ اور مسجد نبوی میں عبادت کی لذتوں سے محظوظ ہونا ہی ہوگا۔ مسجد نبوی کے بالتبع اگر روضۂ اطہر کی زیارت کی نیت بھی ہو تو کوئی حرج نہیں۔ البتہ مستقلاً بالارادۃ صرف اس کے لیے رخت سفر باندھنا غیر درست فعل ہے۔ حدیث میں ہے:

« لَا تَشُدُّوا الرِّحَالَ إِلَّا إِلَى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ: مَسْجِدِي هَذَا، وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، وَالْمَسْجِدِ الْأَقْصَى .» [1]

کیا عمرہ کرنا واجب ہے؟

سوال : کیا حج کی طرح عمرہ بھی صاحب استطاعت پر فرض ہے؟ (سائل) (۸۔اگست ۲۰۰۳ء)

جواب : عمرے کے واجب ہونے میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ امام شافعی اور امام احمد وجوب کے قائل ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی ''صحیح بخاری'' میں وجوب کو اختیار کیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

---

[1] صحيح البخاري، بَابُ حَجِّ النِّسَاءِ، رقم: ١٨٦٤، صحيح مسلم، بَابُ سَفَرِ الْمَرْأَةِ مَعَ مَحْرَمٍ إِلَى حَجٍّ وَغَيْرِهِ، رقم: ٤١٥ (٨٢٧)۔ بحواله مشكوٰة مع المرعاة، ج:١، ص:٤٥٤،

«بَابُ الْعُمْرَةَ . بَابُ وُجُوبِ الْعُمْرَةِ وَفَضْلِهَا. وَقَالَ ابْنُ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا : لَيْسَ أَحَدٌ إِلَّا وَعَلَيْهِ حَجَّةٌ، وَعُمْرَةٌ . »

''ابن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ہر ایک پر حج اور عمرہ فرض ہے۔''

اس تعلیق کو ابن خزیمہ، دارقطنی اور ''حاکم'' نے ابن جریج کے طریق سے موصول بیان کیا ہے۔

حنفیہ اور مالکیہ کا مشہور قول یہ ہے کہ عمرہ نفلی عمل ہے۔ جن چند روایات سے ان کا استدلال ہے، اُن میں سے زیادہ تر ضعیف ہیں۔ جب کہ وجوبِ عمرہ کے بارے میں کئی ایک احادیث وارد ہیں۔ ان میں سے حدیثِ جبریل میں ہے کہ جب انھوں نے نبی ﷺ سے اسلام کے بارے میں سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

« الْإِسْلَامُ أَنْ تَشْهَدَ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللّٰهِ، وَأَنْ تُقِيمَ الصَّلَاةَ، وَتُؤْتِيَ الزَّكَاةَ، وَتَحُجَّ الْبَيْتَ وَتَعْتَمِرَ، وَتَغْتَسِلَ مِنَ الْجَنَابَةِ، وَأَنْ تُتِمَّ الْوُضُوءَ، وَتَصُومَ رَمَضَانَ.» [1]

''اسلام یہ ہے کہ تم اس بات کی گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں اور بے شک محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کرو اور زکاۃ دو اور بیت اللہ کا حج اور عمرہ کرو، غسلِ جنابت کرو اور وضو پورا کرو اور رمضان کے روزے رکھو۔''

اس حدیث کو ابن خزیمہ اور دارقطنی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے۔ دارقطنی رحمہ اللہ نے کہا ہے: «هٰذَا اِسْنَادٌ ثَابِتٌ صَحِيْحٌ.» ''یہ اسناد صحیح ثابت ہے۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ میں نے کہا: یا رسول اللہ! کیا عورتوں پر بھی جہاد ہے؟ فرمایا:

« نَعَمْ، عَلَيْهِنَّ جِهَادٌ، لَا قِتَالَ فِيهِ :الْحَجُّ وَالْعُمْرَةُ .» [2]

''ان کے ذمے ایسا جہاد ہے جس میں لڑائی نہیں، وہ حج اور عمرہ ہے۔''

یہ حدیث ''مسند احمد'' اور ''سنن ابن ماجہ'' میں بسند صحیح موجود ہے، جب کہ ''سنن ترمذی'' میں ہے:

«تَابِعُوا بَيْنَ الحَجِّ وَالعُمْرَةِ.» [3]

---

[1] صحیح ابن خزیمة، بَابُ ذِكْرِ الْبَيَانِ أَنَّ الْعُمْرَةَ فَرْضٌ وَأَنَّهَا مِنَ الْإِسْلَامِ كَالْحَجِّ ......الخ ، رقم:٦٥٣٠ ، السنن الكبرى للبيهقي، بَابُ مَنْ قَالَ بِوُجُوبِ الْعُمْرَةِ اسْتِدْلَالًا بِقَوْلِ اللهِ تَعَالَى (وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ) ......، رقم:٨٧٦٦

[2] سنن ابن ماجه، بَابُ الْحَجِّ ، جِهَادُ النِّسَاءِ، رقم:٢٩٠١

[3] سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي ثَوَابِ الحَجِّ وَالعُمْرَةِ، رقم:٨١٠

مسجد عائشہ سے کثرت سے عمرے کرنے کا کیا حکم ہے؟

سوال : ایک عمرے اور دوسرے عمرے کے درمیان کتنے عرصے کا فرق ہونا چاہیے۔ میں نے دیکھا ہے کہ بعض حضرات روزانہ ہی مسجد عائشہ سے احرام باندھ کر عمرہ کر لیتے ہیں۔ بعض دو تین دن بعد اور اسی طرح مختلف عرصہ بعد۔ مسنون طریقہ کی وضاحت فرمادیں۔ (شیخ محمد فاروق۔ پشاور) (۲۵ فروری ۲۰۰۰ء)

جواب : بلاریب صحیح حدیث میں تعدّدِ (کثرت) عمرہ کی ترغیب وارد ہے۔ ایک عمرہ کے بعد دوسرا عمرہ درمیانی کوتاہیوں کے لیے کفارہ ہے۔ اور حج مبرور (مقبول حج) کی جزاء صرف بہشت ہے۔ بذاتِ خود نبی ﷺ نے زندگی میں چند ہی عمرے کیے اور صحابہ کرام وائمہ سنت سے بھی چند ہی ثابت ہیں۔ دو عمروں کے درمیان وقفے کی کسی حدیث میں اگرچہ تصریح نہیں، لیکن نبی ﷺ اور صحابہ کرام اور ائمہ سلف کے معمولات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بکثرت عمرے نہیں کرتے تھے۔

اور مسجد عائشہ رضی اللہ عنہا سے روزانہ یا ایک دن میں کئی دفعہ عمرے کرنے کا جو بعض لوگوں نے معمول بنا رکھا ہے، سنت سے قطعاً ثابت نہیں۔ اگر یہاں سے احرام باندھنے کی کوئی اہمیت ہوتی تو صحابہ کرام اور سلف صالحین یقیناً اس کے زیادہ حق دار تھے۔ لیکن ان سے ثابت نہیں کہ وہ وقفے وقفے بعد مسجد عائشہ سے احرام باندھ کر عمرے کرتے ہوں، نہ روزانہ اور نہ دو تین دن بعد، نہ ہفتوں، مہینوں اور نہ برسوں بعد، اس عادت کو بدلنا ضروری ہے ورنہ سنت میں دخل اندازی سمجھی جائے گی جو مقامِ خطر ہے۔

ہاں زندگی میں جب کوئی شخص عمرہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو مواقیت یا حل وغیرہ سے احرام باندھ کر عمرے کے لیے جا سکتا ہے جو باعث اجر و ثواب ہے۔

عمرہ اور صلح حدیبیہ کے متعلق اہم سوال

سوال : صلح حدیبیہ میں حضور اور صحابہ بغرض عمرہ گئے تھے۔ معتمر (عمرہ کرنے والے) کے لیے تو قربانی لازم نہیں ہے اور اپنے ساتھ لے جانے کا سوال ہے کہ حضور اور صحابہ کیوں لے کر گئے اور روک دیے جانے کے بعد حدیبیہ میں ہی قربانی کر دی گئی۔ ﴿فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ﴾ (البقرۃ: ۱۹۶) کا کیا مطلب ہے؟ کیا حضور کو اور صحابہ کو یہ بتا دیا گیا تھا کہ تم روک دیے جاؤ گے اور تمہارے لیے اس وقت قربانی کرنا ضروری ہے؟ لہٰذا ساتھ لیتے جاؤ۔ اگر پہلے سے روک دیے جانے کا علم نہ ہو تو اچانک قربانی کہاں سے لائے گا؟ براہِ کرم اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب : اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کے دل و دماغ میں وہ اذیت ناک منظر ہو جس کا مسلمانوں کو کفار کی طرف سے اس وقت سامنا تھا۔ اس زمانے میں مسلمان تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ کبھی دوبارہ مکہ مکرمہ میں داخل ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے بحالتِ خواب چونکہ اپنے نبی ﷺ کو امید کی کرن دکھائی تھی جس کی بناء پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں شوقِ زیارت کا اضافہ ہوا۔

اندریں حالات دشمن کی طرف سے رکاوٹ پیدا کرنے کے امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دشمن کو مزید تسلی و اطمینان دلانے کے لیے کہ ہمارا ارادہ حرب و قتال کا نہیں، جانوروں کی گردنوں میں پٹے ڈال دیے جو امن کی علامت تھی۔ اس کے باوجود ان کے سامنے سرداری اور چودھراہٹ مانع آئی تو مسلمانوں کو حدودِ حرم کے قریب ہی جانور ذبح کرکے اس شرط پر واپس آنا پڑا کہ آئندہ سال عمرہ کریں گے۔ معاہدہ کی بناء پر یہ سال چونکہ امن وسلامتی کا سال تھا اس لیے دوسرے سال مسلمان ہدایا (قربانی کے جانور) ساتھ لے کر نہیں آئے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ راستے میں روکے جانے کی صورت میں جیسی قربانی میسر ہوگی، ذبح کرنے کا جواز ہے۔ اونٹ، گائے بکری اور جانور دستیاب نہ ہونے کی صورت میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ امام احمد اور ایک قول کے مطابق امام شافعی فرماتے ہیں کہ دس روزے رکھے۔ (المغنی:۵/۲۰۰)

بعض نے کہا اگر جانور نہ مل سکے تو اسی طرح حلال ہو جائے۔ بعد میں میسر آنے پر قربانی کردے، بعض نے کہا فدیۃ الاذی ادا کرے۔ قریب ترین مسلک یہ ہے کہ محصر (روکا گیا شخص) تمتع پر قیاس کرتے ہوئے دس روزے رکھے۔ (تفسیر اضواء البیان:۱/۱۱۷)

نبی ﷺ اور صحابہ کرام کو روکے جانے کا پیشگی علم نہ تھا لیکن خطرہ ضرور تھا، اس لیے پہلے سے انتظام کرنا پڑا، یاد رہے حج یا عمرے سے روکا گیا آدمی اسی جگہ جانور ذبح کرکے حلال ہو سکتا ہے۔ قربانی کا حرم کی حدود میں داخل ہونا ضروری نہیں، جس طرح کہ بعض اہل علم کا مسلک ہے۔

نبی کریم ﷺ کو عمرہ کرنے کا خواب

سوال : قرآن میں ہے ﴿لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ﴾ ''یعنی رسول اللہ ﷺ کا خواب عمرہ کرنے کے متعلق۔ چنانچہ آپ ﷺ اسی ارادہ سے نکلے مگر مشرکین مکہ نے آپ کو واپس کردیا۔ دونوں باتیں متضاد ہیں۔ یعنی قرآن بھی درست ہے۔ آپ کا خواب بھی سچا۔ مگر اس سال آپ ﷺ عمرہ نہ کر سکے۔ وضاحت وتشریح مطلوب ہے؟ (۱۵نومبر ۱۹۹۶)

جواب : خواب میں آپ ﷺ کو عمرہ کی صرف بشارت دی گئی تھی۔ وقت کا تعین نہیں تھا۔ اس صداقت کا اظہار سن سات ہجری کو ہو گیا۔ ﴿يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ﴾ (اٰل عمرٰن:۴۰)

صاحبِ استطاعت شخص کا عمرہ کے لیے جانا اور چوری چھپے حج کا فریضہ ادا کرنا

سوال : جو لوگ عمرہ کا ویزہ لے کر سعودی عرب جاتے ہیں اور وہاں جا کر حکومت کی نظروں سے چھپ کر اپنا وقت گزارتے ہیں۔ پھر حج کرکے اپنے ملک واپس آتے ہیں۔ کیا اس طریقہ سے بھی حج کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ فعل چوری یا

دھوکہ دہی کے زمرہ میں تو نہیں آتا اور صاحبِ استطاعت بھی رقم بچانے کے لیے ایسا کرسکتا ہے؟

(عبدالرزاق اختر، رحیم یارخان) (۲۰ مئی ۱۹۹۴ء)

جواب: اسلام کی خاطر جب چوری کرنے کا جواز ہے جس طرح کہ قصہ مرثد میں معروف ہے کہ وہ مکہ سے مظلوم مسلمانوں کو چوری اٹھا کر لے آتا تھا۔ [1]

اسی طرح حج بھی چوری چھپے ہوسکتا ہے کیونکہ یہ عمل خیر ہے۔ صاحبِ استطاعت بھی بوقتِ ضرورت ایسا کر سکتا ہے۔

حج اور لڑکی کے نکاح سے مقدم کس کو کیا جائے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ: ایک آدمی کے پاس اتنی رقم آ گئی ہے کہ وہ فریضہ حج ادا کرسکے اور اس وقت اس کی بیٹی بھی جوان ہے، وہ آدمی مذکورہ رقم سے حج ادا کرے یا بیٹی کی شادی کرے؟

(محمد انور، کوٹ لکھپت، لاہور) (۱۷ جون ۱۹۹۴ء)

جواب: جس شخص کے پاس فریضہ حج ادا کرنے کی مالی استطاعت موجود ہے اسے حج کی تیاری کرنی چاہیے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (ال عمرٰن:۹۷)

''اور لوگوں پر اللہ کا حق (یعنی فرض) ہے کہ جو اس گھر تک جانے کا مقدور رکھے وہ اس کا حج کرے اور جو اس حکم کی تعمیل نہ کرے تو اللہ بھی اہل عالم سے بے نیاز ہے۔''

پھر ''صحیح بخاری'' میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی رویت میں حج کو اسلام کے ارکانِ خمسہ میں سے اہم ترین رکن قرار دیا گیا ہے۔ نیز اہل علم نے اس کی فرضیت کے لیے جو شروط و قیود ذکر کی ہیں ان میں اس بات کا نام ونشان تک نہیں ملتا کہ جس کی اولاد جوان ہو، حج کی بجائے پہلے ان کے نکاح کرے۔ بہرصورت حج کو نکاح سے منسلک کرنا درست بات نہیں۔ بلاشک بیٹی کے نکاح کا اہتمام بھی اپنی جگہ ایک اہم فریضہ ہے لیکن دینِ اسلام نے بیٹی والوں کو مالی معاملات میں قطعاً کسی شے کا مکلّف نہیں ٹھہرایا۔ لہٰذا لڑکی کے والد کو چاہیے کہ موزوں دیندار رشتہ تلاش کرے جو رسومات اور فضول خرچی کی قباحتوں سے مبرا ہو تاکہ جانبین کو راحت وآرام میسر آسکے۔

باعثِ تعجب بات یہ ہے کہ آج کے پرآشوب دور میں دین کے دعویدار بھی اسراف وتبذیر کے سمندر میں مستغرق

---

[1] قرطبی: ۱۲/ ۱۶۸

نظر آتے ہیں۔ جس سے اصلاحی کنارہ کچھ دور ہی دکھائی دیتا ہے لیکن ناممکن نہیں، لہٰذا اہل تدین مخلصین کا فرض ہے کہ مل بیٹھ کر مسئلہ ہذا پر غور وخوض کریں تاکہ قیمتی زندگی کو اسلام کی سنہری تعلیمات کے مطابق ڈھالا جا سکے۔ واللہ ولی التوفیق۔

کاروبار کرے یا حج کا فریضہ ادا کرے؟

سوال: ایک شخص کے پاس نقدی روپے اتنے ہیں کہ وہ حج کر سکتا ہے مگر اس کا خیال ہے کہ ابھی حج کا مہینہ (وقت) کچھ دور ہے یعنی چند ماہ باقی ہیں، لہٰذا وہ کوئی کاروبار شروع کرتا ہے اور حج سے محروم ہو جاتا ہے۔ جب کہ دوسرا ایسا ہی شخص حج کرتا ہے جب کہ تیسرا شخص ایسا ہے کہ اس کے پاس عین حج کے وقت (مہینہ میں) زادِراہ پورا ہے مگر وہ کاروبار وغیرہ کو ترجیح دیتا ہے اور حج نہیں کرتا۔

مندرجہ بالا تینوں اشخاص کا طرزِ عمل از روئے شریعت کیسا ہے؟ (محمد صدیق تلیاں، ایبٹ آباد) (۱۸ جون ۱۹۹۹ء)

جواب: گھریلو اخراجات کے علاوہ اگر حج کی رقم موجود ہو تو فوراً حج کا اہتمام کرنا چاہیے اور کاروباری معاملہ کو مؤخر کر دینا چاہیے۔ درمیانے آدمی کا طرزِ عمل درست ہے۔ پہلا اور تیسرا خطا کار ہیں۔ ان کو اپنے طرزِ عمل پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔

کیا حج کی قبولیت کے لیے والدین کا راضی ہونا شرط ہے؟

سوال: ایک شخص حج کرنے گیا۔ دادا اور ماں کی اجازت سے۔ دادا کا دعویٰ یہ ہے کہ جب تک باپ اجازت نہ دے حج قبول نہیں۔ (سائل: حاجی مشتاق احمد محمدی چک...... بہاولپور) (۱۲ دسمبر ۱۹۹۷ء)

جواب: بیٹے کو چاہیے تھا، حج پر جانے سے قبل اپنے والدین کو راضی کرتا۔ اس کے باوجود حج درست ہے۔ ان کے ساتھ احسان وسلوک کا سلسلہ بدستور حتی المقدور جاری رہنا چاہیے۔

حج پر خرچ ہونے والی رقم حلال کی ہونی چاہیے؟

سوال: حج پر خرچ ہونے والی رقم حلال ہونی چاہیے مگر آج کل حلال روزی بڑی مشکل ہے۔

(محمد طفیل۔ لاہور) (۱۶ جولائی ۱۹۹۹ء)

جواب: حج کے لیے حلال کمائی کی حتی المقدور سعی کرنی چاہیے۔ حدیث میں ہے:

«اِنَّ اللّٰهَ طَيِّبٌ لَا يَقْبَلُ اِلَّا طَيِّبًا»[1]

بغیر محرم کے سفرِ حج کی اجازت

سوال: ایک عورت پر حج فرض ہے، جس کی عمر تقریباً ۶۵ سال ہے۔ پاکستان سے سعودیہ تک جانے کے لیے اس کا کوئی محرم نہیں ہے۔ جب کہ سعودیہ میں اس عورت کا بیٹا موجود ہے۔ جو اس کو حج کروا رہا ہے تو کیا اس عورت کا حج

[1] صحيح مسلم، بَابُ قَبُولِ الصَّدَقَةِ مِنَ الْكَسْبِ الطَّيِّبِ وَتَرْبِيَتِهَا، رقم:١٠١٥

درست ہوگا۔ اگر اس کا کوئی جعلی محرم بنا کر حج پر بھیج دیا جائے جب کہ اسی علاقے سے مزید عورتیں بھی حج پر جا رہی ہیں؟۔ (سائل محمد شفیع طاہر، مدینہ منورہ) (۲۰ نومبر ۱۹۹۸ء)

جواب: مسئلہ ہذا میں اگرچہ اہل علم کا اختلاف ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ مذکورہ عورت ثقہ دیندار عورتوں کی جماعت کے ساتھ حج کا سفر اختیار کرسکتی ہے۔ وفات النبی ﷺ کے بعد عہدِ عمر رضی اللہ عنہ میں ازواجِ مطہرات کا عمل جواز کا مؤید ہے۔ امام شافعی، امام مالک، اوزاعی، ابن سیرین، عطاء، سعید بن جبیر اور دیگر بعض ائمہ رحمہم اللہ جواز کے قائل ہیں۔

امام مالک رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''الموطأ'' میں عنوان قائم کیا ہے:

«حَجُّ الْمَرْأَةِ بِغَيْرِ ذِي مَحْرَمٍ.»

یعنی'' امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ جس عورت کا خاوند نہیں اور اس نے حج نہیں کیا اگر اس کا کوئی محرم نہ ہو یا ہو مگر ساتھ نہ جا سکے تو وہ عورت فریضۂ حج ترک نہ کرے بلکہ دوسری عورتوں کے ساتھ جائے اور حدیث میں ہے:

« لَا تَمْنَعُوا إِمَاءَ اللَّهِ مَسَاجِدَ اللَّهِ .» [1]

''اللہ کی بندیوں کو مسجدوں سے مت روکو۔''

حدیث ہذا کا سبب اگرچہ خاص ہے لیکن قاعدہ مسلم ہے:

«اَلْعِبْرَةُ بِعُمُوْمِ اللَّفْظِ لَا بِخُصُوصِ السَّبَبِ .»

''لہٰذا فرضی تقاضا پورا کرنے کا کوئی حرج نہیں۔''

غیر محرم کے ساتھ عورت کا سفرِ حج وعمرہ

سوال: کچھ افراد عمرے کے لیے جا رہے ہیں۔ ان میں مرد بھی ہیں اور خواتین بھی۔ خواتین محرم بھی ہیں۔ اور غیر محرم بھی آپ کتاب وسنت کی روشنی مین آگاہ فرمائیں کہ کیا یہ سفر جائز ہے؟ (طاہر مبین، اچھرہ لاہور) (۲۲ دسمبر ۲۰۰۰ء)

جواب: مسئلہ ہذا میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''عطاء، سعید بن جبیر، اوزاعی، امام شافعی رحمہ اللہ اور دیگر بہت سے ائمہ کا کہنا ہے کہ عورتوں کی جماعت ہو تو جائز ہے کیونکہ ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر معاون بن جاتی ہیں اور دل مطمئن ہو جاتا ہے جب کہ امام مالک رحمہ اللہ نے باب ہی یہ باندھا ہے کہ «حَجُّ الْمَرْأَة بِغَيْرِ ذِيْ مَحْرَمٍ» ''یعنی امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں جس عورت کا خاوند نہیں اور اس نے حج نہیں کیا، اگر ان کا کوئی مرد نہ ہو یا ہو مگر ساتھ نہ جا سکے تو وہ عورت فریضۂ حج ترک نہ کرے بلکہ دوسری عورتوں کے ساتھ جائے۔'' [2]

---

[1] صحيح البخاري، بَابُ هَلْ عَلَى مَنْ لَمْ يَشْهَدِ الْجُمُعَةَ غُسْلٌ مِنَ النِّسَاءِ وَالصِّبْيَانِ وَغَيْرِهِمْ؟، رقم:۹۰۰

[2] الموطأ مالك، حَجُّ الْمَرْأَةِ بِغَيْرِ ذِي مَحْرَمٍ، رقم:۱۶۰۹

عدی بن حاتم کو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عنقریب عورت حج بیت اللہ کے لیے نکلے گی اس کے ساتھ کوئی نہیں ہو گا۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہیں ڈرے گی۔'' یعنی ایسا امن ہوگا کہ عورت اکیلی بے خوف وخطر سفر کرے گی۔

اسی طرح کتب احادیث وفقہ میں ہے کہ اگر کوئی عورت کفار کے قبضے میں آ جائے پھر وہ رہائی حاصل کرے تو وہ بالاتفاق اکیلی سفر کرسکتی ہے۔ آپ ﷺ کی صاحبزادی زینب رضی اللہ عنہا کو بوقتِ ہجرت بعض صحابہ کرام ہی لائے تھے۔

صحیح بخاری «بَابُ حَجِّ النِّسَاءِ» میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اجازت سے عثمان بن عفان اور عبدالرحمٰن بن عوف کے ہمراہ ''حرم مبارک'' (یعنی ازواجِ مطہرات) حج کو گئے۔ [1]

فریضہ حج اور عدتِ وفات جمع ہو جانے کی صورت میں کسے مقدم کیا جائے؟

سوال: پچاس سالہ ایک عورت حج پر جانا چاہتی ہے۔ قبل از سفرِ حج، قضائے الٰہی سے اس کا شوہر انتقال کر جاتا ہے۔ اب وہ عدتِ وفات پوری کرے یا حج پر چلی جائے؟ (ثناء اللہ بھٹی لاہور) (یکم جولائی ۱۹۸۸ء)

جواب: صورتِ مسئولہ میں دو واجب جمع ہوئے ہیں۔

(۱) عدتِ وفات پوری کرنا۔ (۲) فریضہ حج کی ادائیگی۔

واجبین میں سے عدتِ وفات کا تعلق ''واجب مضیق'' سے ہے، جب کہ حج کا تعلق ''واجب موسع'' سے ہے!

''واجب مضیق'' وہ ہے جس کا وقت محدود ہو فدیہ دوسرے وقت میں کرنا ناممکن ہو۔

اور ''واجب موسع'' وہ ہے کہ جس کے وقت میں وسعت ہو اور اس کی ادائیگی دوسرے وقت میں ممکن ہو۔ عدتِ وفات کا تعلق ''واجب مضیق'' سے ہے، اس لیے کہ کسی دوسرے وقت میں اسے پورا کرنا ناممکن ہے۔ جب کہ حج کا تعلق ''واجبِ موسع'' سے ہے، جو بعد میں بھی ادا ہوسکتا ہے۔ اندریں صورت اہل اصول کے ہاں یہ بات مسلم ہے کہ واجب مضیق کو واجب موسع پر مقدم کیا جاتا ہے۔ لہٰذا مذکورہ عورت پہلے عدت پوری کرے گی اور پھر حج کی ادائیگی کی سعی کرے گی۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَ الَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ يَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا﴾ (البقرة: ٢٣٤)

''اور جو لوگ تم میں سے وفات پا جاتے ہیں اور بیویوں کو چھوڑ جاتے ہیں تو وہ چار ماہ دس دن انتظار کریں۔''

فقیہ ابن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«وَ لَا تَخْرُجُ اِلَى الْحَجِّ فِيْ عِدَّةِ الْوَفَاةِ نَصَّ عَلَيْهِ اَحْمَدُ» [2]

[1] صحيح البخاري، بَابُ حَجِّ النِّسَاءِ، رقم: ١٨٦٠

[2] المغني جزء، ٣، ص: ٣٤٠

امام احمد رحمہ اللہ نے تصریح کی ہے کہ عورت، عدتِ وفات میں حج کے لیے نہ جائے۔''

...... واضح ہو کہ عمر کے اعتبار سے عورت چاہے اوائل میں ہو یا اواخر میں، نفس مسئلہ میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ عدت ہر حالت میں حق العبد اور حق اللہ ہے۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ وَعِلْمُهُ اَتَمُّ.

بذریعہ قرعہ اندازی حج کا ٹکٹ

سوال : صنعتی اداروں میں یونین کے مطالبہ پر کارخانہ دار اپنے ملازمین کی کچھ مخصوص تعداد بذریعہ قرعہ اندازی حج کے لیے اپنے خرچ سے بھیجتا ہے۔ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے۔ حج کا خرچ برداشت کرنے والے (خواہ وہ غیر مسلم ہی ہو) کارخانہ دار کو اور حج کی سعادت حاصل کرنے والے ملازم (خواہ وہ خود بھی صاحبِ استطاعت ہو) کو ثواب ملے گا؟ (عبدالرزاق اختر، رحیم یار خان) (۲۰ مئی ۱۹۹۴ء)

جواب : صنعتی اداروں کی قرعہ اندازی کے ذریعہ حج پر جانا جائز ہے۔ خواہ جانے والا مستطیع ہو کیونکہ مصرف ''فی سبیل اللہ'' میں یہ بھی داخل ہے۔ بشرطیکہ کمائی حلال کی ہو اور بھیجنے والا مسلمان ہو۔ اس لیے کہ غیر مسلم کا عبادتی پہلو سے کوئی تعلق نہیں۔

حج کا فارم پر کرتے وقت جھوٹ بولنا

سوال : جب حج کے لیے فارم پر کیے جاتے ہیں تو اس سوال کہ ''آپ نے پہلے حج کیا ہوا ہے یا نہیں'' کے جواب میں حج کر چکنے کے باوجود لکھا جاتا ہے۔ پہلے حج نہیں کیا ہوا'' سب سے پہلے جھوٹ بولا جاتا ہے۔

(محمد طفیل۔لاہور) (۱۶ جولائی ۱۹۹۹ء)

جواب : حج فارم پر کرتے وقت اگر حج پہلے کیا ہو تو وضاحت کر دینی چاہیے۔ ساری خیر و برکت سچائی میں ہے۔

نیت احرام کے دو نفلوں کا جواز؟

سوال : نیت احرام کے دو نفلوں کا جواز؟ کتاب جلد اول ص: ۷۱۹ میں ہے کہ اگر نماز کا وقت نہیں تو احرام کی نیت سے دو نفل پڑھو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حج کرنے کے لیے نکلے۔ مسجد ذوالحلیفہ میں دو رکعت نماز ادا کرنے کے بعد حج کا احرام باندھا۔[1]

تجلیاتِ نبوت (مؤلف وتخریج مولانا صفی الرحمن مبارکپوری رحمہ اللہ) میں لکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کا ارادہ فرمایا۔ اعلان کرنے پر مدینہ میں بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ (مسلم: ۳۹۴/۱) ہفتہ کے دن ۲۶ ذوالقعدہ (فتح الباری: ۱۰۴/۸)

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الحج، بَابُ وَقْتِ الاِحْرَامِ، رقم: ۱۷۷۰۔ مسند احمد، (ج:۱، ص:۲۶۰)، رقم:۲۳۵۸

ظہر کی نماز کے بعد چل کر عصر سے پہلے ذوالحلیفہ پہنچ کر دو رکعت عصر پڑھی پھر وہیں رات گزاری۔ ❶ صبح ہونے پر فرمایا کہ آج رات میرے رب کی طرف سے ایک آنے والے نے کہا کہ اس مبارک وادی میں نماز پڑھو اور کہو کہ حج میں عمرہ ہے۔ ❷

معلوم ہوتا ہے کہ اسی روایت سے اخذ کیا گیا ہے کہ احرام کی نیت سے دو نفل ادا کیے جائیں مگر بعض علمائے کرام (پاکستانی وسعودی) سے معلوم ہوا کہ احرام کی نیت سے دو نوافل سنت نہیں یعنی صراحتاً اس کا ذکر نہیں ملتا بلکہ اس روایت میں بھی ایسا نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ فرشتے نے صبح کی نماز کا اشارہ دیا ہو کہ بجائے مسجد کے اسی مبارک وادی میں ادا کرلیں اور پھر احرام باندھیں۔ چناں چہ بخاری کے ابواب « بَابُ مَنْ بَاتَ بِذِي الْحُلَيْفَةِ حَتَّى أَصْبَحَ، بَابُ رَفْعِ الصَّوْتِ بِالْإِهْلَالِ اور التَّلْبِيَة» کی روایات سے مترشح ہوتا ہے کہ آپ ﷺ صبح کی نماز کے بعد اونٹنی پر سوار ہوکر احرام باندھ کر تلبیہ پکارتے۔ آپ ﷺ نے زندگی میں کئی دفعہ احرام باندھا تو ان کے متعلق صراحتاً حکم یا عمل نہیں ملتا کہ نیت احرام کے دو نفل ادا کیے جائیں۔ وضاحت فرمادیں کہ کس حوالے سے اسے سنت تصور کیا جاتا ہے؟

(سائل: ڈاکٹر عبیدالرحمٰن چودھری) (۶ اپریل ۲۰۰۷ء)

جواب: احرام کی نیت سے دو نفل نبی ﷺ سے ثابت نہیں۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«وَلَمْ يُنْقَلْ عَنْهُ (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) أَنَّهُ صَلَّى لِلْإِحْرَامِ رَكْعَتَيْنِ غَيْرَ فَرْضِ الظُّهْرِ..» ❸

''نبی ﷺ سے منقول نہیں کہ آپ ﷺ نے احرام کی نیت سے دو رکعتیں پڑھی ہوں سوائے ظہر کے فرض کے۔''

اور ''سنن ابی داؤد'' کی روایت میں جو یہ الفاظ ہیں:

«فَلَمَّا صَلَّى فِي مَسْجِدِهِ بِذِي الْحُلَيْفَةِ رَكْعَتَيْهِ» ❹

''جب آپ ﷺ نے ذوالحلیفہ کی مسجد میں دو رکعتیں ادا کیں'' سے مراد ظہر کی قصر نماز ہے اور مولانا کی تشریح بہ نیت نماز احرام محل نظر ہے۔ بوقت احرام جس نماز کا ذکر ہے وہ ظہر کی نماز ہے۔ جس طرح کہ

❶ صحيح البخاري، بَابُ مَنْ بَاتَ بِذِي الْحُلَيْفَةِ حَتَّى أَصْبَحَ، رقم: ١٥٤٦، بَابُ رَفْعِ الصَّوْتِ بِالْإِهْلَالِ، رقم: ١٥٤٨

❷ صحيح البخاري، بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: الْعَقِيقُ وَادٍ مُبَارَكٌ، رقم: ١٥٣٤، و ٢٣٣٧، ٧٣٤٣

❸ زاد المعاد: ٢/ ١٠٧

❹ سنن أبي داؤد، بَابٌ فِي وَقْتِ الْإِحْرَامِ، رقم: ١٧٧٠

طرق حدیث میں اس امر کی تصریح موجود ہے۔

احرام کہاں سے باندھا جائے؟

سوال : اکثر ہماری حج پر ڈیوٹی لگی ہے۔ اگر احرام باندھ کر جائیں تو طائف کی چوکی سے نہیں گزرنے دیتے ویسے بھی سرکاری طور پر ہمیں اجازت نہیں ہوتی۔ منیٰ میں آٹھ دس روز قیام حج سے پہلے ہوتا ہے۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ ۸ تاریخ کو وہیں سے ہم احرام باندھ لیں یا میقات پر دوبارہ جا کر احرام باندھنا لازم ہے؟ کیا ہم مقیم کے زمرے میں آجاتے ہیں؟ (ڈاکٹر حبیب الرحمٰن کیلانی) (۱۲ جون ۲۰۰۹ء)

جواب : اگر پہلے سے حج کی نیت نہ ہو تو مقامِ عمل سے احرام باندھا جا سکتا ہے۔ بصورتِ دیگر واپسی ضروری ہے۔ میقات سے احرام باندھ کر آئیں اور اگر فدیہ دے کر وہیں سے احرام باندھ لیں تو یہ بھی درست ہے۔

حج تمتع کیا ہے؟

سوال : اگر کسی غریب آدمی کو بمشکل حج کی استطاعت نصیب ہوئی ہو، تو وہ حج کے ساتھ ہی عمرہ بھی کر آئے یا صرف حج کر کے واپس آجائے اور دوبارہ استطاعت ہو تو عمرے کو جائے؟ اگر حج وعمرہ اکٹھا کر لیا ہے تو یہ حج کی کون سی قسم ہوگی؟ (سائل) (۸۔ اگست ۲۰۰۳ء)

جواب : آدمی کو چاہیے کہ جب حج کے لیے سفر پر روانہ ہو تو میقات پر احرام باندھتے وقت عمرے کی نیت بھی کر لے، بعد ازاں عمرہ ادا کر کے احرام کھول دے، پھر آٹھ ذوالحجہ کو اپنی قیام گاہ سے حج کا احرام باندھ کر منیٰ کی طرف روانہ ہو جائے۔ شرعی اصطلاح میں اس کا نام حج تمتع ہے۔ بہت سارے اہل علم کے نزدیک حاجی کے ساتھ جب ھدی (قربانی) نہ ہو تو یہ حج کی افضل ترین قسم ہے۔ اس طرح ایک ہی سفر میں بآسانی حج اور عمرہ دونوں ادا ہو جائیں گے۔

حجِ قران کے لیے "ھَدْی" ساتھ لے جانا ضروری نہیں

سوال : آج کل قربانی ساتھ لے جانے کا نہ وقت ہوتا ہے نہ اس کی جگہ۔ حکومت خود ہی منیٰ میں جانور پہنچا دیتی ہے۔ اس صورت میں نیت حج قران کی کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ (ڈاکٹر حبیب الرحمٰن کیلانی) (۱۲ جون ۲۰۰۹ء)

جواب : اس صورت میں حجِ قران کی نیت ہو سکتی ہے۔ علاقہ سے ھَدْی کو ساتھ لے کر جانا شرط نہیں لیکن اگر ھَدْی لے جائے تو حجِ قران ہونا چاہیے۔

عمروں میں سر کے بعض حصوں کی تقصیر کرنا

سوال : حج یا صرف عمرہ کی نیت سے مکہ پہنچنے کے بعد عمرہ کی ادائیگی کے بعد سر کے بال اُسترے سے صاف کروائیں یا مشین سے کٹوائیں؟ بعض حضرات سر کا صرف چوتھائی حصہ بال کٹواتے ہیں۔ پھر دوسرے عمرہ میں اور چوتھے عمرہ میں

اسی طرح بعض حضرات عمرہ مکمل ہونے پر قینچی سے صرف چند بال کاٹ دیتے ہیں۔ براہِ مہربانی اس کی وضاحت فرمائیں۔ (شیخ محمد فاروق۔ پشاور) (۲۵ فروری ۲۰۰۰ء)

جواب : جب آدمی عمرہ کے لیے مکہ معظّمہ جائے اور حج میں اگر کافی دن ہیں تو سارا سر اُسترے سے صاف کرادے اور اگر کم دن ہیں تو مشین وغیرہ سے تقصیر کرالے تاکہ تحلیق (سر منڈانے) پر عمل حج کے موقع پر ہو جو باعثِ فضیلت ہے۔ اور بعض لوگ جو عمروں کی کثرت کی وجہ سے کہیں کہیں سے تھوڑے تھوڑے بالوں کی تقصیر کرتے ہیں یہ سنت سے ثابت نہیں۔ اس سے احتراز ضروری ہے۔

حجر اسود ابتداءً کہاں سے آیا؟

سوال : حجر اسود ابتداءً کہاں سے آیا؟ ابراہیم علیہ السلام کو تعمیرِ مسجد کے لیے اس کی بنیادوں کی نشاندہی کی گئی گویا ظاہراً عمارت موجود نہ تھی تو اس وقت حجر اسود کہاں تھا؟ کیا انھوں نے بھی دیوار میں ہی نصب کیا تھا؟

(ڈاکٹر عبید الرحمٰن چوہدری، لاہور) (۱۷ اپریل ۱۹۹۸ء) (۲۰ مئی ۲۰۱۱ء)

جواب : بعض روایات کے مطابق اس کی آمد جنت سے ہے۔[1] اگرچہ بعض میں ضعف ہے لیکن دیگر بعض قابل استدلال ہیں۔[2]

بلکہ کعبہ کی اساس موجود تھی۔ ابراہیم علیہ السلام نے انہی بنیادوں پر عمارت کو استوار کیا۔ (ملاحظہ ہو تاریخ الکعبۃ المعظمۃ) تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی تاریخ کے ساتھ ساتھ ہی حجر اسود کا وجود زمین پر قائم رہا ہے۔ اگرچہ کیفیات کی وضاحت مشکل امر ہے۔ چاہے وہ دَورِ ابراہیمی میں ہو یا اس سے قبل۔

حجر اسود کا اصل کہاں سے ہے؟

سوال : حجر اسود کیا واقعی جنت سے لایا گیا ہے اگر نہیں تو اس کی تاریخ کیا ہے؟ (حذیفہ مبشر بن محمد بلال انجینئر واپڈا، کوٹ ادو ضلع مظفر گڑھ) (۲۲ ستمبر ۱۹۹۵ء)

جواب : بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حجر اسود کا تعلق جنت سے ہے اگرچہ کچھ ضعیف ہیں لیکن دیگر بعض قابلِ حجت ہیں۔ ملاحظہ ہو فتح الباری (۴۶۲/۳) بلکہ علامہ البانی رحمہ اللہ نے ''حواشی مشکوٰۃ'' پر ان کو صحیح قرار دیا ہے۔ بخاری باب ما ذکر فی الحجر الاسود اور جملہ تفاصیل کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ الکعبۃ المعظمۃ مؤلفہ حسین عبد اللہ باسلامہ الفصل الخامس، خبر الحجر الاسود، ص:۱۴۹

[1] صححہ الالبانی صحیح الترمذی: ۸۷۷ وقال الترمذی: ھذا حدیث حسن صحیح

[2] فتح الباری: ۳/ ٤٦٢

کیا روزِ جزاء حجر اسود اور کعبہ کی شفاعت ہوگی؟/کیا کعبہ کو قیمتی غلاف پہنانا اسراف نہیں؟

سوال: بخدمت مدیر ''الاعتصام'' و مفتی ''الاعتصام'' سلام مسنون۔

روز نامہ ''جنگ'' لاہور کی ۱۲ مئی کی اشاعت میں یہ خبر نظروں سے گزری کہ ''گورنر مکہ'' نے خانہ کعبہ کو غسل دیا اور ہزاروں عبادت گزاروں نے اس روح پرور منظر کو دیکھا، نیز غلافِ کعبہ ۱۹ مئی کو تبدیل ہوگا۔ ایک غلاف کی تیاری پر ۱۷ ملین ریال کا خرچہ آیا ہے۔ غلاف کی تیاری مکہ مکرمہ میں قائم خصوصی کارخانے میں ہوتی ہے۔ (جنگ لاہور ۱۲ مئی ۱۹۹۴ء)

سوال یہ ہے کہ یہ غسل و غلافِ کعبہ اور اس پر اتنا کثیر خرچ کیا حدیث وسنت سے ثابت ہے؟ یا کہ یہ ایک تاریخی قسم کی رسم ہے۔ جسے نبھایا جا رہا ہے۔؟ جب کہ اتنے خرچہ سے کئی غریب مسلمان ممالک اور بے شمار غریب اہل اسلام کی معاونت و کفالت ہوسکتی ہے۔ نیز دیگر معاملات میں جب اسراف سے اجتناب اور سادگی اور کفایت شعاری کا درس دیا جاتا ہے تو غلافِ کعبہ کے سلسلہ میں اس پر عمل کیوں نہیں کیا جاتا۔

علاوہ ازیں کعبہ شریف اپنی عظمت کے باوجود جب پتھر سے تعمیر شدہ ہے تو اسے کپڑے پہنانے کی کیا ضرورت ہے؟ اور اس کا کیا فائدہ ہے؟ کیا اسے لباس و غلاف پہنانا غیر ضروری و بے مقصد نہیں؟

کہا جاتا ہے کہ حجرِ اسود، کعبہ شریف بروزِ محشر شفاعت کریں گے اس کی اصل و دلیل کیا ہے؟ مدلل جواب سے معلومات میں اضافہ کریں۔ (منتظر جواب، فقیر حسین خادم مسجد روڈے والی محلّہ اسلام آباد گوجرانوالہ) (۵۔ اگست ۱۹۹۴ء)

جواب: کعبہ کی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ اغلب اَدوار میں اس پر بہتر سے بہتر غلاف چڑھایا گیا۔ اہل علم نے اس پر نکیر نہیں فرمائی۔ بالخصوص سلف صالحین جن کے افعال و اقوال کو منارۂ ہدایت سمجھا جاتا ہے بلکہ فعل ہذا کو بنظر استحسان دیکھا گیا۔ چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ، قاضی زین الدین عبدالباسط کے بارے میں فرماتے ہیں:

« فَبَالَغَ فِی تَحْسِینِهَا بِحَیْثُ یَعْجِزُ الْوَاصِفُ عَنْ صِفَةِ حُسْنِهَا جَزَاهُ اللَّهُ عَلَى ذَلِكَ أَفْضَلَ الْمُجَازَاةِ .»[1]

''یعنی اس نے غلاف کی بے انتہاء تحسین وتزئین کی کہ بیان کرنے والا اس کے بیان اور توصیف سے قاصر ہے۔ اللہ تعالیٰ اس عمل پر ان کو بہترین بدلہ سے نوازے۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے انفاقِ ہذا اسراف وتبذیر کے زمرہ میں داخل نہیں کیونکہ اس پر بالتواتر عملی اجازت موجود ہے۔ اسی بناء پر اہل علم کہتے ہیں کہ دیگر مساجد کو کعبہ پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ اس عظیم خدمت کے علاوہ واضح ہو کہ موجودہ دور میں سعودی حکومت کی افضل ترین حسنات سے حرمین کی توسیع کا شاندار منصوبہ ہے جو تکمیل کے آخری مراحل

[1] فتح الباری:۳/ ٤٦٠

میں ہے۔آل سعود کا یہ ایک عظیم کارنامہ ہے۔جس کی مثال پیش کرنے سے آج کی دنیا قاصر ہے۔رب تعالیٰ نے انھیں زمینی خزانوں سے نوازا ہے تو اس کے پسندیدہ مقامات پر زائرین کے آرام کی خاطر اس دولت کو اُس کی راہ میں لٹایا اور پانی کی طرح بہایا جارہا ہے۔رَبِّ زِدْ فَزِدْ

ہر زائر کی زبان سے بے ساختہ اس حکومت کے لیے دعائیں نکلتی ہیں۔ یا رب العالمین اس موحد سرکار کو تادیر قائم رکھنا تاکہ تیرے دین برحق کی خدمت کرتی رہے۔آمین یارب العالمین

اسی طرح غسل کعبہ بھی عملی تواتر کی قبیل سے ہے بعض روایات میں تصریح موجود ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر نبی ﷺ نے بتوں کو توڑنے اور تصویروں کو مٹانے کے بعد کعبہ کو غسل دینے کا حکم دیا تھا۔

«اِنَّ النَّبِیَّ ﷺ اَمَرَ بِغُسْلِ الْکَعْبَةِ بَعْدَ مَا کسر الْاَصْنَام وَ طمس التَّصَاوِیْر» [1]

یاد رہے کسوۃ کعبہ کے تیسرے باب میں کافی مواد موجود ہے جو فی الجملہ مفید ہے۔ ملاحظہ ہو ص: ۲۲۷ تا ۲۷۲۔ نیز غلاف صرف کعبہ کے احترام کی خاطر پہنایا جاتا ہے۔ جو اسی کا خاصہ ہے۔ [2]

ترمذی میں حدیث ہے:

«وَسَتَرْتُمْ بُیُوتَکُمْ کَمَا تُسْتَرُ الْکَعْبَةُ.» [3]

''یعنی قیامت کی نشانیوں میں سے ہے کہ تم اپنے گھروں کو ایسے ڈھانکو گے جیسے کعبہ کو ڈھانکا جاتا ہے۔'' [4]

یہاں مزید عقلی توجیہات کی چنداں ضرورت نہیں کیونکہ مسلمان ہمیشہ احکامِ الٰہی کا پابند ہوتا ہے چاہے کسی شئے کی مشروعیت اس کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔

حجر اسود کے بارے میں ایسی روایات موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ جس نے اس کا برحق استلام کیا روزِ جزا اس کا گواہ بن کر آئے گا۔ اگر چہ ان روایات میں سے کئی ایک متکلم فیہ ہیں لیکن مجموعی طور پر وہ قابلِ حجت ہیں۔ [5] لیکن

---

[1] تاریخ کعبة المعظمة، ص:۳۲۷، بحواله حسين عبدالله باسلامه منائح الكرم

[2] جس میں کسی دوسری عمارت کو شریک نہیں کرنا چاہیے اسی لیے وہ حتی المقدور اچھا ہونا چاہیے گھٹیا قسم کے کپڑوں سے کسی کا کیا احترام ہوگا۔ (ن۔ح۔ن)

[3] سنن الترمذی، رقم: ۲٤٧٦

[4] کسی عمارت کو یا زیب وزینت کی خاطر ڈھانکا جاتا ہے (جیسے گھروں میں پردے لٹکانا) یا ادب واحترام کی خاطر (جیسے کعبۃ اللہ پر غلاف چڑھایا جاتا ہے) ترمذی کی اس روایت سے معلوم ہوا کہ جب گھروں کو زیب وزینت کے خیال سے ڈھانکنا بھی شرعاً پسند نہیں کیا گیا تو پھر عمارت کو کسی ادب واحترام کی خاطر ڈھانکنا کیسے جائز ہوسکتا ہے کیوں کہ اس سے کعبۃ اللہ کے امتیاز وتشخص کا مجروح ہونا اور اس کی خصوصیات میں دوسری عمارتوں کا شریک ہونا لازم آتا ہے۔ (ن۔ح۔ن)

[5] فتح الباری:۳/ ٤٦٢، بَابُ مَا ذکر فی الحجر الاَسْوَد

کعبہ کی بابت کوئی روایت نظر سے نہیں گزری جس میں اس بات کی تصریح ہو۔ واللہ الھادی للصواب۔

مقام ابراہیم علیہ السلام پر قدموں کے نشانات کی حقیقت

سوال: مقامِ ابراہیم علیہ السلام پر پاؤں کے نشانات کیا واقعی ابراہیم علیہ السلام کے قدم کے ہیں؟ (سائل) (۲۷ نومبر ۱۹۹۸ء)

جواب: تاریخی اور تفسیری روایات میں اسی طرح مشہور ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَ كَانَتْ آثَارُ قَدَمَيْهِ ظَاهِرَةً فِيْهِ وَ لَمْ يَزَل هٰذَا مَعْرُوْفَةٌ تَعْرِفُهُ الْعَرَبُ فِي جَاهِلِيَّتِهَا » ❶

''یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدموں کے نشانات پتھر میں نمایاں ہیں۔ ہمیشہ سے یہ بات معروف ہے۔ عرب اپنے زمانہ جاہلیت میں بھی اس سے شناسا تھے۔''

تفسیر قرطبی (۱۱۳/۲) میں بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اثبات نقل کیا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو فتح الباری۔ (۱۶۹/۸) شہرت اس بات کی متقاضی ہے کہ اس کا اصل ہے۔

طوافِ زیارت اور طوافِ الوداع کا حکم

سوال: کیا طوافِ زیارت کے ساتھ ہی طواف الوداع کیا جا سکتا ہے۔ طواف الوداع کی کتنی مدت ہے۔ کیا ایک دفعہ میقات سے گزرنے کے بعد دوبارہ آ کر طواف الوداع کیا جا سکتا ہے۔ یا پھر ہر صورت میں طواف الوداع کر کے طائف جانا چاہیے۔ (یہ میقات قرن المنازل سے باہر ہے) (سائل ڈاکٹر حبیب الرحمٰن کیلانی، طائف، سعودی عرب) (۱۲ جون ۲۰۰۹ء)

جواب: طوافِ زیارت اگر تاخیر سے ہو تو دونوں اکٹھے ہو سکتے ہیں لیکن یہ ضروری ہے کہ طوافِ الوداع کے بعد مکہ سے کوچ کر جائے۔ ہاں البتہ اگر نماز کا وقت ہو تو نماز پڑھ کر سفر کو جائے۔ اتنی تاخیر کا کوئی حرج نہیں۔ بلاوجہ زیادہ رُکنا نہیں چاہیے۔ ہاں واپس دوبارہ آ کر طوافِ الوداع ہو سکتا ہے اور اگر واپس نہ آئے تو فدیہ دے۔ ❷

تاہم کوشش ہونی چاہیے کہ طوافِ الوداع کے بعد مکہ مکرمہ سے رخصت ہو۔ برادرِ محترم ڈاکٹر صاحب کی خواہش کے مطابق سولہ سوالوں کے جوابات بالاختصار عرض کر دیے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو جمیع اعمال میں خلوص بخشے۔ آمین

کیا طواف وداع میں سعی نہیں ہوتی؟

سوال: اپنی کوتاہ علمی کی وجہ سے علمائے کرام کی تصانیف وتالیفات سے دینی مسائل کا حل تلاش کرتا ہوں ان کی کسی بھی

---

❶ تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۱۱۸

❷ فتح الباری، ج:۳، ص:۵۸۵

علمی تحقیق کو محلِ نظر ٹھہرانے سے احتراز ضرور ہے مگر بوجوہ اطمینان قلب کے لیے طرزِ ابراہیمی علیہ السلام وعزیر علیہ السلام اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہوں تا کہ ایک پختہ مرجوع طریق کی راہنمائی ہو جائے۔

جن کتابوں سے چند مسائل اخذ کیے ہیں درج ذیل ہیں امید کامل ہے کہ آپ بہ مطابق قرآن وسنت راہنمائی فرما کر عنداللہ ماجور ہوں گے۔ (کتاب تعلیم الاسلام۔ مؤلف مولانا عبدالسلام بستوی)

کیا طواف وداع میں سعی نہیں ہوتی؟ کتاب صفحہ ۸۰۲ پر ہے کہ طواف وداع آفاقی پر واجب ہے مکی پر نہیں۔ اس طواف میں رمل اور اضطباع نہیں اور نہ ہی اس کے بعد سعی ہوتی ہے۔ (سائل: ڈاکٹر عبیدالرحمٰن چودھری) (۶ اپریل ۲۰۰۷ء)

جواب: طوافِ وداع کے بارے میں مولانا بستوی مرحوم رحمہ اللہ نے جو فرمایا ہے درست ہے۔

کیا حاجی لوگ منیٰ میں نمازِ عید پڑھیں؟

سوال: سوال یہ ہے کہ آپ کے ہفت روزہ الاعتصام شمارہ ۱۳، ۱۹۹۵ء میں لکھا ہے کہ حاجی آدمی مزدلفہ سے واپسی پر ممکن ہو تو نمازِ عید پڑھ لیں'' کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کی نماز حج کے وقت پڑھی تھی؟ آج جو آدمی عید کی نماز پڑھتا ہے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نافرمان تو نہ ہو گا؟ کیا حاجی نمازِ عید بھی ایامِ منیٰ میں پڑھ سکتا ہے خواہ وہ منیٰ میں ہی ہو یا حرم میں۔ کیا وہ نافرمان تو نہ ہوگا۔ (ایک سائل) (یکم مارچ ۱۹۹۶ء)

جواب: مسئلہ ہذا میں اہل علم کا کچھ اختلاف ہے لیکن راجح بات یہ ہے کہ منیٰ میں حاجی کے لیے نمازِ عید نہیں۔ اس بات کی واضح دلیل ''صحیح مسلم'' میں وارد حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی طویل روایت ہے جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حج کی صفت و کیفیت بیان ہوئی ہے۔ اس میں الفاظ یوں ہیں:

«حَتَّى إِذَا أَتَى الْجَمْرَةَ الَّتِي عِنْدَهَا الشَّجَرَةُ، فَرَمَى بِسَبْعِ حَصَيَاتٍ يُكَبِّرُ عَلَى كُلِّ حَصَاةٍ مِنْ حَصَى الْخَذْفِ، ثُمَّ رَمَى مِنْ بَطْنِ الْوَادِي، ثُمَّ انْصَرَفَ إِلَى الْمَنْحَرِ فَنَحَرَ ثَلَاثًا وَسِتِّينَ بَدَنَةً بِيَدِهِ.»[1]

''یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس جمرہ کے پاس آئے جو درخت کے قریب ہے، اس کو چھوٹے سات کنکر مارے جو دو انگلیوں سے مارے جاتے ہیں۔ پھر قربان گاہ کی طرف لوٹ آئے۔ پس تریسٹھ اونٹ اپنے ہاتھ سے قربان کیے۔''

اس حدیث میں اس امر کی دلیل ہے کہ حاجی پر نمازِ عید نہیں کیونکہ حاجی پر اگر عید ہوتی تو جمروں سے فارغ ہو کر نمازِ عید پڑھ کر پھر قربانی کرنی چاہیے تھی۔ اس لیے کہ قربانی نمازِ عید کے بعد ہوتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا رمی جمار (جمرات کو

[1] سنن الدارمی، بَابٌ فِي سُنَّةِ الْحَاجِّ، رقم:۱۸۹۲، صحیح مسلم، بَابُ حَجَّةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ، رقم:۱۲۱۸

کنکریاں مارنے) سے فارغ ہو کر سیدھا قربان گاہ میں تشریف لے جانا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے نمازِ عید نہیں پڑھی۔

کیا حاجی ایامِ منیٰ میں نمازیں جمع کر سکتا ہے؟

سوال : کیا حاجی نمازِ جمع بھی ایامِ منیٰ میں پڑھ سکتا ہے خواہ وہ منیٰ میں ہی ہو یا حرم میں۔ کیا وہ نافرمان تو نہ ہو گا۔ (ایک سائل) (یکم مارچ ۱۹۹۶ء)

جواب : ایامِ منیٰ میں حاجی نماز صرف قصر کرے جمع نہ کرے کیونکہ حجۃ الوداع میں نبی اکرم ﷺ نے اسی طرح نماز پڑھی تھی۔ (ملاحظہ ہو، صحیح بخاری وغیرہ)

جمرات کو کنکریاں مارنے کا پس منظر کیا؟

سوال : رمی جمار سے متعلق یہ کہ یہ کنکر شیطان کو مارے جاتے ہیں جب کہ بخاری وغیرہ میں بھی کوئی واضح صورت نہیں ہے کہ یہ شیطان کی نشانی ہے۔ جب کہ مودودی صاحب اس کا انکار کرتے ہیں۔ بقول ان کے یہ شیطان کی نشانی کے بجائے ابرہہ نے جو کعبہ پر حملہ کیا تھا تو یہاں سے گزر رہا تھا۔ اسی طرح کی باتیں وہ کہتے ہیں کیا یہ واقعی درست بات ہے؟ (حافظ محمد اقبال رحمانی، ٹاؤن کراچی) (۱۵ مارچ ۱۹۹۶ء)

جواب : رمی جمار (جمرات کو کنکریاں مارنا) محض ایک حکم کی تعمیل ہے۔ بعض اسرائیلیات میں ہے کہ ابتداءً یہاں ابراہیم علیہ السلام کے سامنے شیطان نمودار ہوا تھا۔ اس نے اسماعیل علیہ السلام کی قربانی میں رکاوٹ ڈالنے کی سعی کی تو انھوں نے کنکر چلائے تھے۔ اب اس کی یاد میں رمی جمار ہے۔ اس بناء پر بعد میں عوام میں مشہور ہو گیا کہ یہ کنکریاں شیطانوں کو لگتی ہیں اور یہ تین شیطان ہیں۔

بلاشبہ ابرہہ کا قصہ بھی قریباً اسی سرزمین میں پیش آیا تھا۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«وَالْجَمْرَةُ اسْمٌ لِمُجْتَمَعِ الْحَصَى سُمِّيَتْ بِذَلِكَ لِاجْتِمَاعِ النَّاسِ بِهَا يُقَالُ تَجَمَّرَ بَنُو فُلَانٍ إِذَا اجْتَمَعُوا وَقِيلَ إِنَّ الْعَرَبَ تُسَمِّي الْحَصَى الصِّغَارَ جِمَارًا فَسُمِّيَتْ تَسْمِيَةَ الشَّيْءِ بِلَازِمِهِ وَقِيلَ لِأَنَّ آدَمَ أَوْ إِبْرَاهِيمَ لَمَّا عَرَضَ لَهُ إِبْلِيسُ فَحَصَبَهُ جَمَرَ بَيْنَ يَدَيْهِ أَيْ أَسْرَعَ فَسُمِّيَتْ بِذَلِكَ .» [1]

یعنی اصلاً جمرۃ کنکریوں کے ڈھیر کو کہتے ہیں اس کا نام جمرہ اس لیے رکھا گیا ہے کہ لوگوں کا یہاں اجتماع ہوتا ہے۔

[1] فتح الباری:۳/ ۵۸۱۔۵۸۲

حاجی دورانِ حج فوت ہو جائے تو اس کے سابقہ ظلم کا کیا معاملہ ہوگا؟

سوال: اگر حاجی دورانِ حج فوت ہو جائے اور اس نے کچھ آدمیوں پر ظلم کیا ہو تو اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟
(والسلام) (محمد طفیل۔لاہور) (۱۶ جولائی ۱۹۹۹ء)

جواب: نیکی واقعی بلاریاء ہونی چاہیے اور ظلم زیادتی کرنے والے کو عدالت الٰہی میں اپنی بداعمالیوں کا حساب پیش کرنا ہوگا۔

حاجی صاحبان کے استقبال کا طریقہ کار کیا ہونا چاہیے؟

سوال: حاجی صاحبان کے استقبال کا طریقہ کار کیا ہونا چاہیے۔ان کے گلے میں روپوں یا کلیوں کے ہار پہنانا کیسا ہے؟ اور کیا حاجی صاحبان کو مبارک باد دینا درست ہے؟ (سائل: محمد علی شاہ، لاہور) ۳۱ مئی ۲۰۰۲ء)

جواب: حجاج کا استقبال کرنا شرعاً جائز ہے۔[1] لیکن نمود ونمائش اور ریا کاری سے پاک ہونا چاہیے اور قبولیت کی دعا دینا بھی اچھی تمنا کا اظہار ہے، بظاہر اس میں بھی کوئی حرج نہیں، حاجی کو پھولوں اور روپوں کے ہاروں سے لاد دینا اسی زمرے میں آتا ہے۔

کیا حج بدل کے لیے اپنے ملک سے سفر کروانا ضروری ہے؟

سوال: میرا حقیقی چھوٹا بھائی محمد اکرم خان فوت ہو چکا ہے، ہم اُس کی طرف سے حج بدل کرانا چاہتے تھے، اس سلسلہ میں ہم نے مکۃ المکرمہ میں رہائش پذیر ایک قریبی تعلق دار سے رابطہ کر کے حج بدل کے بارے میں بات کی اور اُن کو پیش کش کی کہ ایام حج میں حج کے دوران آنے والے جملہ اخراجات ہم ادا کریں گے، آپ ہمارے بھائی کی طرف سے حج کریں جس کے جواب میں انھوں نے کہا ہے کہ وہ ہمارے بھائی کی طرف سے اِسی سال حج بدل کر رہے ہیں لیکن کسی قسم کا خرچہ نہیں لیں گے تو کیا ایسی صورت میں ہمارے مرحوم بھائی کی طرف سے حج ہو جائے گا؟ یا اگلے سال ہمیں پاکستان سے باقاعدہ داخلہ دے کر کسی کو حج بدل پر بھیجنا ضروری ہوگا؟ از روئے قرآن وحدیث جواب سے سرفراز فرمائیں۔ (سائل: ڈاکٹر حسنین احمد خان پٹانی، جام پور) (۲۱۔اپریل ۲۰۰۶ء)

جواب: حج بدل کی مذکورہ صورت درست ہے، اپنے ملک سے دوبارہ حج کروانے کی ضرورت نہیں۔ ان شاء اللہ۔
(وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ.)

کیا حج پر بار بار جانا جائز ہے؟

سوال: حضور نبی کریم ﷺ نے صرف ایک حج کیا ہے حج زندگی میں ایک مرتبہ فرض ہے۔کیا حج پر بار بار جانا جائز ہے؟ چاہے کوئی رشتہ دار وغیرہ تنگدست اور مفلسی میں زندگی گزار رہا ہو؟ (محمد طفیل۔لاہور) (۱۶ جولائی ۱۹۹۹ء)

[1] قسطلانی: ۴/ ۲۷۸

جواب : واقعی حج زندگی میں صرف ایک دفعہ فرض ہے۔ایسے شخص کو چاہیے کہ فرض ادا کرنے کے بعد دیگر اعمال خیر پر توجہ مرکوز کرے اور اگر کسی وقت کوئی نفلی حج کر لے،تو بہر صورت اس کا بھی جواز ہے۔ حج اور عمرہ کی ترغیب میں وارد عمومی احادیث اس پر دال ہیں۔فرمایا:

« العُمْرَةُ إِلَى العُمْرَةِ كَفَّارَةٌ لِمَا بَيْنَهُمَا، وَالحَجُّ المَبْرُورُ لَيْسَ لَهُ جَزَاءٌ إِلَّا الجَنَّةُ.»[1]

نبی ﷺ نے ایک حج اس لیے کیا کہ اس کے بعد آپ ﷺ رحلت فرما گئے۔لیکن حجۃ الوداع میں ہی آئندہ حج کی خواہش کا اظہار فرمایا ہے۔

« لَعَلِّي لَا أَحُجُّ بَعْدَ حَجَّتِي هَذِهِ.»[2] ممکن ہے میں اس سال کے بعد حج نہ کرسکوں۔"

اس سے معلوم ہوا کہ متعدد بار حج کا جواز ہے۔ بعد میں خلفائے راشدین کا عمل بھی اس کا مؤید ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حج؟

سوال : فوت شدہ آدمی کی طرف سے اُسی کی رقم سے یا اپنی رقم سے کسی دوسرے کو حج کروایا جاتا ہے۔ایسے ہی عید پر فوت شدہ افراد کی طرف سے قربانی بھی کی جاتی ہے۔ ہمارے علاقے میں ایک آدمی نے سات حج کیے ہیں، ایک تو اپنی طرف سے اور باقی نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف سے۔ مہربانی فرما کر قرآن وحدیث کی روشنی میں اس عمل کی شرعی حیثیت کی وضاحت کردیں۔ (سائل) (مارچ ۲۰۰۵ء)

جواب : "صحیح مسلم" میں مروی ہے کہ ایک صحابیہ رضی اللہ عنہا نے نبی اکرم ﷺ سے عرض کی کہ میری ماں نے حج نہیں کیا تھا، وہ وفات پا چکی ہے، کیا میں اس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ فرمایا:

« حُجِّي عَنْهَا»[1] "اُس کی طرف سے تو حج کر۔"

اس روایت سے معلوم ہوا کہ فوت شدہ کی طرف سے حج ہوسکتا ہے۔اسی طرح فوت شدہ کی طرف سے قربانی کرنا بھی جائز ہے، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: فتاویٰ علامہ شمس الحق عظیم آبادی رحمہ اللہ۔

لیکن بالخصوص نبی اکرم ﷺ کی طرف سے حج کرنے کا کوئی ثبوت نہیں، اگر یہ فعل مشروع ہوتا تو صحابہ کرام ﷺ اس کے زیادہ حق دار تھے لیکن اُن سے یہ عمل ثابت نہیں۔

قاتل یا سود خور وغیرہ کو حج کی فضیلت حاصل ہوگی؟

سوال : اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جو آدمی حج کر لیتا ہے وہ ایسے ہو جاتا ہے جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔قتل،

---

[1] صحیح البخاری، بَابُ وُجُوبِ العُمْرَةِ وَفَضْلِهَا، رقم:۱۷۷۳

[2] صحیح مسلم، بَابُ اسْتِحْبَابِ رَمْيِ جَمْرَةِ الْعَقَبَةِ يَوْمَ النَّحْرِ ...... الخ، رقم:۱۲۹۷

غصب، جھوٹ، حرام خوری، سودی کاروبار اور لوگوں سے بدسلوکی جیسے اخلاقی جرائم کرتا ہو وہ بھی ایسے ہوگا؟

(محمد طفیل۔لاہور) (۱۶جولائی ۱۹۹۹ء)

جواب : سوال میں مشارٌ الیہ الفاظ قرآن میں نہیں بلکہ حدیث میں ہے۔اس فضیلت کا اطلاق اس آدمی پر ہوتا ہے جو کبائر سے اجتناب کرتا ہے ان جرائم کے مرتکب انسان کو توبہ نصوحہ کرنے کے بعد حج کرنا چاہیے تاکہ فضیلتِ ہذا کا ادراک اس کے لیے ممکن ہو سکے ورنہ خسارہ کا سودا ہے۔

کیا مسجد نمرہ کا کچھ حصہ میدانِ عرفات کی حدود سے باہر بنا ہوا ہے؟

سوال : بعض کتبِ حج سے معلوم ہوا کہ مسجد نمرہ کا کچھ حصہ میدانِ عرفات کی حدود سے باہر بنا ہوا ہے۔ جب کہ اس میں موجود لوگ حج کی غرض سے وہاں جاتے ہیں اور جگہ حاصل کرنا بھی مشکل ہوتا ہے۔تو جو لوگ اس حصہ میں بیٹھے رہتے ہیں ان کا حج نہیں ہوتا۔مسجد کو آخر ایسا بنانے کی ضرورت کیا تھی؟ کیا یہ بہتر نہ تھا کہ تمام مسجد کو میدانِ عرفات ہی میں بنایا جاتا تاکہ حجاج کو آسانی ہو؟ (۱۵نومبر ۱۹۹۶)

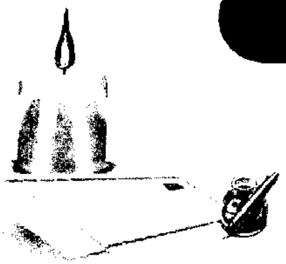
جواب : مسجد نمرہ کا محرابی حصہ وقوف عرفہ سے باہر ہے۔مسجد صرف نماز پڑھنے کے لیے بنی ہے۔ وقوف کے لیے نہیں۔ وقوف وقتِ زوال اور نماز کے بعد ہے۔ نبی ﷺ بھی بذاتِ خود یہاں نماز ادا کرکے آگے بڑھ گئے تھے۔ ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:۲۱) یہاں مسجد کی بناء پر اعتراض نہیں ہوسکتا۔

حرم کے فالتو چپل کو استعمال کرنے کا کیا حکم ہے؟

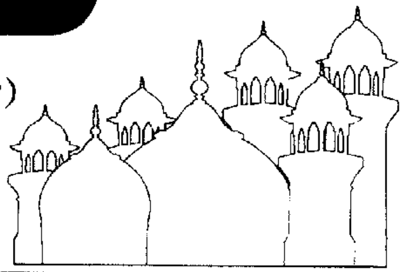
سوال : پاکستان سے روانگی کے وقت تقریباً ہر شخص نیا جوتا ڈال کر روانہ ہوتا ہے لیکن بیت اللہ سے نکلتے وقت وہ جوتا نہیں ہوتا بلکہ ہزاروں کی تعداد میں دوسرے جوتے پڑے ہوتے ہیں کیا دوسرا جوتا، استعمال کیا جا سکتا ہے؟ اور کیا اس جوتے میں آدمی واپس پاکستان آ سکتا ہے؟ اگرچہ جوتا حرم شریف میں لے جایا جا سکتا ہے مگر اس طریقہ سے طواف اور نماز میں تکلیف ہوتی ہے۔ نیز ہر نماز کے بعد نئے چپل خریدنا بھی محال ہے اور سڑکوں پر ننگے پاؤں گھومنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ (شیخ محمد فاروق۔ پشاور) (۲۵فروری ۲۰۰۰ء)

جواب : ایامِ حج میں چپل بکثرت ضائع ہو جاتے ہیں اور حفاظت کے باوجود سنبھالنا مشکل ہوتا ہے تو بامرِ مجبوری آدمی وقتی طور پر فالتو جوتوں میں سے استعمال کرلے لیکن واپسی پر وہیں چھوڑ آئے، کیونکہ حرم میں حاجی یا کسی دوسرے شخص کی گری ہوئی چیز اٹھانے سے آپ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ جہاں تک ممکن ہو لقطۂ حرم (حرم کی گری ہوئی اشیاء) اٹھانے سے احتراز کرنا چاہیے۔ واپسی پر نیا جوتا خرید لینا چاہیے۔ چاہے سستا ہی ہو، ضروری نہیں کہ قیمتی جوتا خریدا جائے۔ یا پھر ننگے پاؤں چلنا بھی شرعاً جائز ہے۔ اپنی جیب دیکھ کر کوئی طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔

قربانی



(مسائل قربانی)



عید قربان کی تکبیرات کے شروع اور ختم ہونے کا وقت کونسا ہے؟

سوال : عید قربان کی تکبیرات کے شروع اور ختم ہونے کا وقت کونسا ہے؟

(ابو طاہر نذیر احمد، عبد الرشید (کراچی) (۲۳ فروری ۲۰۰۱ء)

جواب : اس بارے کوئی مرفوع متصل روایت نہیں ہے البتہ آثار صحابہ، حضرت علی اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ سے ثابت ہے کہ تکبیرات یومِ عرفہ یعنی نو ذوالحجہ کی صبح سے لے کر ۱۳ ذوالحجہ تک ہیں۔ (فتح الباری: ۲/۴۶۲)

یہی بات ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی ابن ابی شیبہ وغیرہ میں ثابت ہے۔

کیا ہر نماز کے بعد با آوازِ بلند تکبیرات کہنی چاہئیں؟

سوال : کیا ہر نماز کے بعد با آوازِ بلند تکبیرات کہنی چاہئیں۔ خواہ کسی کی نماز میں خلل ہی پڑتا ہو؟ (ابو طاہر نذیر احمد، عبد الرشید۔ کراچی) (۲۳ فروری ۲۰۰۱ء)

جواب : فرض نماز کے بعد با آوازِ بلند تکبیریں کہنا جائز ہے۔ ''صحیح بخاری'' کے باب اَلتَّكْبِيرِ أَيَّامَ مِنًى وَإِذَا غَدَا إِلَى عَرَفَةَ. کے تحت حضرت عمر سے بالعموم اور ابن عمر سے بالخصوص جواز منقول ہے، البتہ کسی کی نماز میں خلل سے بچنا چاہیے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: المغنی: ۲/۲۹۱۔

کیا عید کی نماز سے پہلے تکبیرات سپیکر میں پڑھنا درست ہے؟

سوال : کیا عید کی نماز سے پہلے تکبیرات سپیکر میں پڑھنا درست ہے؟

(ابو طاہر نذیر احمد، عبد الرشید۔ کراچی) (۲۳ فروری ۲۰۰۱ء)

جواب : تکبیریں جب بلند آواز سے پڑھنے کا جواز ہے تو سپیکر میں بھی جائز ہے، عدم جواز کی کوئی وجہ نہیں۔

تکبیرات کے اصل کلمات کیا ہیں؟

سوال : تکبیرات کے اصل کلمات کیا ہیں؟ (ابوطاہر نذیر احمد، عبدالرشید۔ کراچی) (۲۳ فروری ۲۰۰۱ء)

جواب : اس کے بارے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَأَمَّا صِيغَةُ التَّكْبِيرِ فَأَصَحُّ مَا وَرَدَ فِيهِ مَا أَخْرَجَهُ عَبْدُ الرَّزَّاقِ بِسَنَدٍ صَحِيحٍ عَنْ سَلْمَانَ.»

''یعنی کلمات تکبیر کے بارے صحیح ترین قول سلمان رضی اللہ عنہ کا ہے، جسے عبدالرزاق نے بسند صحیح روایت کیا ہے۔''

اس کے الفاظ یوں ہیں: بعض آثار میں « اَللّٰهُ اَكْبَرُ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ كَبِيْرًا » [1] « اَللّٰهُ اَكْبَرُ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه وَاللّٰهُ اَكْبَر وَ لِلّٰهِ الْحَمْدُ » کے کلمات بھی ہیں۔ مگر اس میں راوی یزید بن ابی زیاد ضعیف ہے، البتہ المغنی (۳/۲۹۰) میں متعدد سلف کی طرف ان کلمات کی نسبت کی گئی ہے۔

تکبیر کے مزید الفاظ کی تحقیق

سوال : عید کے موقع پر جو تکبیرات کہتے ہیں مثلاً ''اَللّٰهُ اَكْبَر، اَللّٰهُ اَكْبَرُ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ'' اس کے علاوہ '' اَللّٰهُ اَكْبَرُ كَبِيْرًا، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا، وَ سُبْحَانَ اللّٰهِ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا''

محترم! کیا دونوں تکبیرات حدیث سے ثابت ہیں یا ایک؟ اس کے بارے میں ''الاعتصام'' میں کئی بار تکبیرات شائع ہوئی ہیں جن میں صرف پہلی تکبیر ہی لکھی گئی ہے، دوسری تکبیر کا ذکر نہیں ہے۔ بندہ کی تسلی کریں۔ کیا دونوں کہنی چاہئیں یا ایک۔ حوالہ رسالہ ''الاعتصام'': ۲۳، جولائی ۱۹۸۲ء۔

جواب : عید کے موقع پر تکبیرات کا جواز علی الاطلاق کتاب وسنت سے ثابت ہے۔ البتہ الفاظ کے بارے میں مختلف آثار واقوال وارد ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: سب سے صحیح ترین الفاظ وہ ہیں، جن کو عبدالرزاق نے بسند صحیح سلمان سے بیان کیا ہے:

« اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ كَبِيْرًا.»

بعض نے ''وَ لِلّٰهِ الْحَمْدُ'' کی زیادتی بیان کی ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے، کہ تین دفعہ تکبیر کہے اور لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ...... الخ کا اضافہ کرے۔ اور یہ بھی کہا گیا، کہ دو دفعہ تکبیر کہے۔ اس کے بعد کہے '' لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ وَ لِلّٰهِ الْحَمْدُ'' یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے اسی کی طرح

[1] فتح الباری: ۲/ ٤٦٢

منقول ہے۔ ''فتح الباری'' (۲/۴۶۲) اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بحوالہ ''سعید بن منصور'' اور ''ابن ابی شیبہ'' کے الفاظ یوں ہیں:

« اَللّٰهُ اَكْبَرُ، وَاللّٰهُ اَكْبَرُ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ، وَ لِلّٰهِ الْحَمْدُ.» ❶

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: امام مالک رحمہ اللہ اور دیگر اہلِ علم کی ایک جماعت کے ہاں لفظ تکبیر یوں ہیں:

« اَللّٰهُ اَكْبَرُ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ »

علماء میں سے بعض ثناء، تکبیر تہلیل اور تسبیح کے قائل ہیں۔ اور بعض وہ ہیں، جو اس طرح پڑھتے ہیں:

''اَللّٰهُ اَكْبَرُ كَبِيْرًا، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا، وَ سُبْحَانَ اللّٰهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا'' ❷

فقیہ ابن قدامہ فرماتے ہیں:

'' مذکورہ الفاظ کا نمازِ عید کی تکبیرات کے دوران پڑھنا اچھا ہے، لیکن بات یہ ہے کہ تکبیرات کے دوران نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور سلف صالحین سے بسند صحیح، یہ ذکر ثابت نہیں ہو سکا۔ لہٰذا خاموشی اختیار کرنی چاہیے۔ بعض نے یہ الفاظ بھی نقل کیے ہیں: ''سُبْحَانَ اللّٰهِ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ، وَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ'' جونسا کوئی ذکر کرنا چاہے، کرسکتا ہے۔ ❸

''ابن ابی شیبہ'' میں بسند صحیح ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے بایں الفاظ ذکر مروی ہے:

« أَللّٰهُ اَكْبَرُ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وَاللّٰهُ اَكْبَر، اَللّٰهُ اَكْبَرُ، وَ لِلّٰهِ الْحَمْدُ.» ❹

جابر کی ایک مرفوع روایت میں بھی، یہی الفاظ ہیں، لیکن وہ سخت ضعیف ہے۔ حاصل یہ کہ بموقعہ عید الفاظ ذکر مرفوعاً بسند صحیح نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہو سکے، اور بعض صحیح آثار میں، جو بعض الفاظ ثابت ہیں۔ انہی پر اکتفاء کرنا چاہیے، جب کہ سائل کے ذکر کردہ اذکار میں سے پہلا ثابت ہے، دوسرا محلِ نظر ہے۔ غالباً اسی بناء پر دوسرے ذکر کو ''الاعتصام'' میں قابلِ التفات (قابلِ توجہ) نہیں سمجھا گیا۔ (وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ.)

کیا قربانی دینے والے کے لیے صاحبِ نصاب زکوٰۃ ہونا ضروری ہے؟

سوال: سنا ہے قربانی ہر صاحبِ نصاب پر واجب ہے۔ اس زمانے میں ساڑھے باون تولے چاندی قریباً پانچ ہزار روپے کی بنتی ہے۔ ایک غریب انسان تھوڑے تھوڑے پیسے اپنے کسی آڑے وقت کے لیے بچائے اور نصاب کی حد تک

❶ نیل المرام، ص:۲۲

❷ أحكام القرآن:۲/ ۳۰۷

❸ المرعاة:۲/ ۳٤۲

❹ مصنف ابن ابی شیبة، كَيْفَ يُكَبِّرُ يَوْمَ عَرَفَةَ، رقم:٥٦٥١، (ج:۲/ ص:۲۱۲)۔ بحواله إرواء الغليل:۲/ ۱۲٥

رقم پہنچ جائے گی۔ آہستہ آہستہ وہ دوبارہ اس حد تک پہنچے تو پھر وہی بات۔ اس کا مطلب ہے کہ کوئی غریب نصاب کی حد سے آگے جا ہی نہیں سکتا۔ نہ ہی حکومت قابلِ ذکر مدد کرتی ہے۔ کیونکہ اسلامی نظام نافذ ہی نہیں ہے۔ ایسی صورت میں غریب لوگ کسی مشکل وقت کے لیے بچانا چاہیں تو کیسے بچائیں؟ والسلام (محمد احسان۔ لاہور) (۱۲ دسمبر ۱۹۹۷ء)

جواب: جمہور اہل علم کے نزدیک قربانی دینے والے کے لیے صاحبِ نصاب زکوٰۃ ہونا ضروری نہیں۔ تاہم امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک صاحبِ نصاب اور مقیم ہونا ضروری ہے۔ لیکن راجح مسلک پہلا ہے۔ اس لیے کہ کسی صحیح حدیث میں صاحبِ نصاب ہونے کی قید موجود نہیں۔

قربانی کرنے کا ثواب پہلے دن زیادہ ہے یا باقی تینوں دن برابر ہے؟

سوال: پہلے دن قربانی کرنا زیادہ ثواب ہے یا تینوں دن قربانی کا ثواب ایک جیسا ہے؟ (سائل) (۷۔ اپریل ۲۰۰۰)

جواب: عام حالات میں پہلے دن قربانی کرنے کا زیادہ ثواب ہے اس دن کی عظمت کے پیشِ نظر اس کا نام ''یوم النحر'' ہے۔ اور باقی ایام میں عامۃ الناس کو مسئلہ سے آگاہی کے لیے کر دی جائے تو شاید اجر و ثواب میں نقص پیدا نہ ہو۔ یا مصلحتِ عامہ پیشِ نظر ہو تو پھر بھی ہے۔ قربانی کے تین دن نہیں بلکہ چار دن ہیں۔ (۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳ ذوالحجہ) ملاحظہ ہو: تفسیر ابن کثیر: ۱/ ۳۳۱۔

نمازِ عید سے پہلے کی ہوئی قربانی کا حکم

سوال: گاؤں کے کچھ افراد ہر سال نمازِ عید سے پہلے قربانی کر دیتے ہیں جب میں اُن کو اس فعل کی حقیقت سے آگاہ کرتا ہوں تو وہ میری بات کو رد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قرآن وسنت کی روشنی میں دلائل پیش کرو، میں ایک طالب علم ہوں اور اس سے متعلق زیادہ نہیں جانتا۔ آپ سے التماس ہے کہ قرآن وحدیث کا مکمل حوالہ دے کر اس مسئلے سے متعلق آگاہ کریں۔ (حاجی محمد سلیمان، راول پنڈی) (۲۱/ اپریل ۲۰۰۶ء)

جواب: نمازِ عید سے پہلے قربانی نہیں کی جاسکتی، چناں چہ ''صحیح بخاری'' میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث میں ہے کہ:

«مَنْ ذَبَحَ قَبْلَ الصَّلَاةِ فَلْيُعِدْ.»[1]

''جس نے نمازِ عید سے پہلے جانور ذبح کرلیا اُسے چاہیے کہ دوبارہ ذبح کرے۔''

ذبح کے وقت گائے وغیرہ کے پیٹ سے ملنے والا بچہ کیا حکم رکھتا ہے؟

سوال: گائے، بکری یا بھینس کے ذبح کے کرنے کے وقت ان کے پیٹ سے اگر مردہ بچہ برآمد ہو تو وہ کس زمرے

[1] صحيح البخاري، باب من ذبح قبل الصلاة أعاد، رقم: ٥٥٦١

میں آئے گا؟ حلال یا حرام؟ (ڈاکٹر حق نواز قریشی، راولپنڈی) (۵ جولائی ۲۰۰۲ء)

جواب : ذبح کے وقت جانور کے پیٹ سے مردہ پیدا ہونے والا بچہ حلال ہے۔

''سنن ابی داؤد'' میں حدیث ہے:

«ذَكَاةُ الْجَنِيْنِ ذَكَاةُ أُمِّهٖ.» ❶

''جس ذبح سے ماں حلال ہوئی اس کے بالتبع بچہ بھی حلال ہوگیا۔''

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: عون المعبود: ۳/۶۳۔

قربانی کا جانور ذبح کرتے وقت کی مسنون دعا

سوال : قربانی کا جانور ذبح کرتے وقت کی مسنون دعا ذکر فرمائیں۔ (محمد صدیق تلیاں، ایبٹ آباد) (۱۸ جون ۱۹۹۹ء)

جواب : جانور ذبح کرنے کی مسنون دعا: «بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَكْبَر» ❷

قربانی کرنے کا مسنون طریقہ اور دعا کیا ہے؟

سوال : قربانی کرنے کا مسنون طریقہ اور دعا کیا ہے؟ (ابوطاہر نذیر احمد، عبدالرشید۔ کراچی) (۲۳ فروری ۲۰۰۱ء)

جواب : اہل علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جانور کو بائیں طرف لٹایا جائے اور اس کے شانے پر پاؤں رکھنا مستحب ہے۔ پھر یہ دعا پڑھے: «بِسْمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَكْبَر» ❸

اور قربانی نمازِ عید کے بعد کرنی چاہیے۔ ❹

کیا قربانی کرتے وقت کی دعا ضعیف ہے؟

سوال : میں نے پچھلے ماہ الاعتصام لگوایا تھا۔ رسالہ اپنی وسعت معلومات کی وجہ سے واقعی بہت اچھا ہے۔ اس سال جلد نمبر ۵۰ شمارہ نمبر ۱۳ میں ایک مضمون ''فضائل ومسائل عید الاضحیٰ'' میری نظر سے گزرا اس میں ایک بات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ صفحہ ۹ اور ۱۰ پر قربانی کرتے وقت کی دعا:

«إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ......» ❺

---

❶ سنن أبی داؤد، بَابُ مَا جَاءَ فِي ذَكَاةِ الْجَنِينِ، رقم: ۲۸۲۸

❷ سنن ابن ماجه، بَابٌ فِي الشَّاةِ يُضَحّٰى بِهَا عَنْ جَمَاعَةٍ، رقم: ۲۸۱۰

❸ أيضًا

❹ صحيح البخاری، بَابُ الْأَكْلِ يَوْمَ النَّحْرِ، رقم: ۹۵۴، ۹۵۵

❺ سنن أبی داؤد، بَابُ مَا يُسْتَحَبُّ مِنَ الضَّحَايَا، رقم: ۲۷۹۵، سنن ابن ماجه، بَابُ أَضَاحِيِّ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، رقم: ۳۱۲۱

راقم الحروف کے نزدیک سخت ضعیف ہے۔ یہ روایت ابوداؤد کے ساتھ ''مسند احمد''، مشکوٰۃ شریف اور اس کے علاوہ اور بھی کتابوں میں مذکور ہے۔ لیکن ہر ایک کے سلسلۂ اسناد میں ضعف پایا جاتا ہے۔ میں کوئی عالم تو نہیں ہوں کہ اس پر مزید بحث کروں لیکن اگر تفصیل دیکھنی ہو تو اس کتاب (مشکوٰۃ المصابیح للالبانی) میں مذکور باب کے نیچے دیکھیں۔ (فیصل مختار) (۳ جولائی ۱۹۹۸ء)

جواب: روایت ہذا ضعیف ہے کیونکہ اس میں راوی عبدالمطلب بن عبداللہ بن حطب کے بارے میں کہا جاتا ہے۔ جابر رضی اللہ عنہ سے اس کا سماع نہیں لیکن منذری اور ابوحاتم رازی نے کہا ممکن ہے اس کو پایا ہو۔ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''تہذیب التہذیب'' میں اور ابن ابی حاتم نے ''المراسیل'' میں عَنْ اَبِیہ کہا جابر سے اس کا سماع نہیں لیکن جابر رضی اللہ عنہ کی ایک دوسری روایت جس کو ابویعلیٰ نے ذکر کیا اس کے بارے میں امام ہیثمی رحمہ اللہ نے کہا اس کی سند حسن درجہ کی ہے۔ اور امام ابوداؤد کا بھی اس پر سکوت ہے۔ (بحوالہ مرعاۃ المفاتیح)

حدیث ''قربانی تمہارے باپ ابراہیم کی سنت ہے'' صحیح ہے یا ضعیف؟

سوال: قربانی تمہارے باپ ابراہیم کی سنت ہے۔ (الحدیث) کیا یہ روایت صحیح ہے؟

(محمد صدیق تلیاں، ایبٹ آباد) (۱۸ جون ۱۹۹۹ء)

جواب: ضعیف ہے مشکوٰۃ حاشیہ علامہ البانی (۱/۴۴۶)

قربانی کا گوشت سب سے پہلے کس نے کھایا تھا؟

سوال: قربانی کا گوشت سب سے پہلے کس نے کھایا تھا؟ ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں قربانی کا گوشت آگ کھایا کرتی تھی۔ آگ کے بعد سب سے پہلے کس انسان نے قربانی کا گوشت کھایا تھا؟ اس کا نام بتائیں۔ شکریہ)

(ایک سائل قمر الزمان فیروز پوری) (۳۱ جولائی ۱۹۹۸ء)

جواب: سب سے پہلے نذر و نیاز کی حلت و اباحت حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کے لیے ہوئی جس طرح کہ ''تفسیر قرطبی'' و ''تفسیر بیضاوی'' وغیرہ میں مصرح ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان اشیاء کا استعمال انھوں نے کیا ہوگا۔ بعد میں یہی اباحت امتِ محمدیہ کے لیے برقرار رہی۔

قربانی کا گوشت چند وضاحتی پہلو: (تعاقب از جناب محمد اسلم رانا، ایڈیٹر ماہنامہ المذاہب لاہور)

مقرر جریدہ ''الاعتصام'' بابت ۲۴ جولائی کے ''احکام و مسائل میں مندرجہ ذیل سوال و جواب نظر سے گزرے۔

سوال: قربانی کا گوشت سب سے پہلے کس نے کھایا تھا؟ ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں قربانی کا گوشت آگ کھایا کرتی تھی۔ آگ کے بعد سب سے پہلے کس انسان نے قربانی کا گوشت کھایا تھا؟ اس کا نام بتائیں۔ شکریہ

جواب: سب سے پہلے نذر و نیاز کی حلت واباحت حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کے لیے ہوئی جس طرح کہ ''تفسیر قرطبی''، ''تفسیر بیضاوی'' وغیرہ میں مصرح ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان اشیاء کا استعمال انھوں نے کیا ہوگا۔ بعد میں یہی اباحت امتِ محمدیہ کے لیے برقرار رہی۔''

یہ سوال اور جواب دونوں محل نظر ہیں۔

سب سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک ''قربانی کے گوشت'' سے مراد اصحابِ استطاعت کی طرف سے بڑی عید کے موقع پر ذبح کیے جانے والے جانور کا گوشت ہے۔ گمان غالب ہے کہ سائل کا اشارہ بھی اسی قسم کے گوشت کی طرف ہے۔

لیکن یہودیوں اور عیسائیوں میں قربانی کی اصطلاح کا مفہوم وسیع ہے۔ چنانچہ مرقوم ہے:

قربانی: وہ ہدیہ جو اس غرض سے پیش کیا جائے کہ ہدیہ دینے والا اور لینے والا ایک دوسرے کے قریب ہو جائیں یا باہمی رفاقت حاصل کریں۔ (قاموس الکتاب مؤلفہ پادری ایف ایس خیر اللہ، مطبوعہ ۱۹۸۴ء وصفحہ ۴۳، کالم: ۳)

اولین قربانی کا بیان بائبل کے ان الفاظ میں ہے:

''...... قائن اپنے کھیت کے پھل کا ہدیہ خداوند کے واسطے لایا اور ہابل بھی اپنی بھیڑ بکریوں کے کچھ پہلوٹھے بچوں کا اور کچھ ان کی چربی لایا اور خداوند نے ہابل کو اور اس کے ہدیہ کو منظور کیا پر قائن کو اور اس کے ہدیہ کو منظور نہ کیا۔'' (بائبل کی کتاب پیدائش باب: ۴)

بائبل کے مشہور مفسر پادری ڈملو لکھتے ہیں:

''جس طریقہ سے خدا نے اپنی تائید کا اظہار کیا۔ اس کا ذکر نہیں ہے۔ تاہم دیکھیں قضاۃ: ۶: ۲۱، ا۔ سلاطین ۱۸: ۳۸، ۳۔ تواریخ ۷: ۱'' (تفسیر ڈملو صفحہ ۱۱ کالم ۳)

مذکورہ حوالہ جات کی تفصیل یہ ہے:

قضاۃ: ۶: ۲۱ ''...... اس پتھر سے آگ نکلی اور اس نے گوشت اور فطیری روٹیوں کو بھسم کر دیا۔''

یہ اس امر کا نشان تھا کہ جدعان سے باتیں کرنے والا خدا ہی تھا۔

(۱)۔ **سلاطین** ۱۸: ۳۸: ''تب خداوند کی آگ نازل ہوئی اور اس نے اس سوختنی قربانی کو بکریوں اور پتھروں اور مٹی سمیت بھسم کر دیا اور اس پانی کو جو کھائی میں تھا چاٹ لیا۔''

اس موقع پر ایلیاہ نبی کی صداقت جتانا مقصود تھا۔

(۲)۔ **تواریخ** ۷: ۱ ''اور جب سلیمان دعاء کر چکا تو آسمان پر سے آگ اُتری اور سوختنی قربانی اور ذبیحوں کو بھسم کر دیا۔''

جو اس امر کا اعلان تھا کہ سلیمان کی تعمیر کردہ ہیکل خدا کو منظور و مقبول تھی۔

وضاحت: بنی اسرائیل میں یہ سب خاص مواقع تھے۔ اس طرح قربانی کا گوشت پیش کرنا اور انہیں آگ کا کھانا قاعدہ نہیں تھا۔

مفسر کا خیال ہے کہ ہابل کی قربانی کو بھی آگ ہی کھا گئی ہوگی۔

یاد رہے کہ یہودیوں نے آنحضرت ﷺ سے مطالبہ کیا تھا اگر اللہ پاک کے سچے نبی ہو تو اپنی قربانی آگ کو کھلا کر دکھاؤ۔ (آل عمران:۱۸۳)

کلام مجید میں چھٹے پارہ کے درمیان حضرت آدم علیہ السلام کے دونوں بیٹوں کا یہی قصہ اپنے الفاظ میں مذکور ہے۔ قربانی کی منظوری کا طریقہ وہاں بھی نہیں بتایا گیا۔

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے معبودوں کے لیے جانوروں کی قربانیاں گزرانا اقوامِ عالم میں عام تھا۔ اہل اسلام کی زبان میں کہا جا سکتا ہے کہ گزشتہ امتوں (بشمولِ یہود) کی نماز حق تعالیٰ کے حضور جانور قربانی کرنا تھا۔ پادری فانڈر بتاتے ہیں:

''جانوروں کی قربانی کی نہایت قدیم رسم جو کہ تمام اقوام میں پائی جاتی تھی۔ اُسے خدا نے جائز ٹھہرایا اور اس کے قواعد تورات میں مقرر کیے۔ تورات میں تعلیم یہ تھی کہ مختلف موقعوں پر مختلف قسم کے جانور قربان کیے جائیں اور ان قربانیوں کی مختلف اغراض تھیں۔'' (میزان الحق مصنف پادری سی جی فانڈر ڈی ڈی ،ص:۴۳)

یعنی قربانی کی یہ رسم قدیم سے چلی آ رہی تھی۔ جو خدا نے تورات میں بھی قائم رکھی۔ علامہ پال ارنسٹ نے با وضاحت لکھا ہے:

''توریت میں قوانین تاریخی باتوں کے ساتھ باترتیب طور پر بیان نہیں کیے گئے بلکہ وہ بکھرے ہوئے ہیں اور پراگندہ صورت میں ہیں۔ اور ان کے لیے ترتیب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ قوانین ان حالات کی پیداوار ہیں یعنی ان حالات کے مطابق ہیں۔ جو خروج کے وقت اور پھر بعد میں ملک موعود میں تھے۔ وہ قوانین صرف موسوی زمانے ہی کے نہیں بلکہ مابعد کے زمانے کے بھی ہیں اور اصطلاحات میں جو بہت سے فرق پائے جاتے ہیں، ان فرقوں اور اختلافوں کا باعث بھی وہ مختلف حالات ہی ہیں۔ خروج کے زمانے میں بیابان میں حالات اور طرح کے تھے۔ لیکن ملک موعود میں ان کے حالات اور طرح کے تھے۔ مگر ساری شریعت موسیٰ ہی سے منسوب کی گئی ہے۔ کیونکہ وہ سب سے بڑا شارع تھا۔ وہ شریعت کا بانی اور چشمہ تھا۔ تو بعد کے قوانین بھی اسی سے منسوب کیے گئے۔ (حقائق بائبل مقدس مصنفہ علامہ پال ارنسٹ نائٹ آف

سینٹ سلولیٹر مطبوعہ ۱۹۷۵ء۔ صفحہ: ۳۴۷)

مطلب یہ کہ تورات میں جو شریعت بیان ہوئی ہے وہ ساری کی ساری موسیٰ کی عطا کردہ نہیں ہے۔ بہتیرے احکام موسیٰ کے بعد تورات میں اضافہ کیے گئے ہیں۔ قربانیاں بھی شامل ہیں۔

قرآن کریم کی ''سورۃ حج'' آیت کریمہ ۳۴ سے بھی واضح ہے کہ قربانی ہر قوم کے لیے مقرر کی گئی تھی۔

''قربانیوں کے کئی درجے بھی ہیں۔ بیل شاہی قربانی تھی بھیڑ اور بکری عام قربانی تھی۔ فاختہ یا جوان کبوتر غریب آدمی کی قربانی تھی۔ اور جو کی روٹی مفلس کی قربانی تھی۔'' (قاموس صفحہ ۷۴۵ ک ۲)

قربانی کی معروف متعلقہ اقسام یہ تھیں:

۱۔ سوختنی قربانی: یہ مکمل طور پر جلا دی جاتی تھی۔ (بزبان بائبل یہ قربانیاں ''خدا کی غذا ہیں۔'' (احبار ۶:۳۱) اسلم)

۲۔ نذر کی قربانی: تیل اور لوبان، نمک بھی ساتھ ہوتا تھا۔ اس کا کچھ حصہ مذبح پر جلایا جاتا تھا۔ باقی کو سردار کاہن اور ان کے بیٹے کھاتے تھے۔

۳۔ سلامتی کا ذبح: اس کا ایک حصہ تو مذبح کے اوپر جلا دیا جاتا تھا۔ لیکن باقی کو قربانی گزارنے والا اور کاہن کھاتے تھے۔ (قاموس، ص: ۷۴۴)

۴۔ عید فسح: پر قربان کیے جانے والے بکرے کا سارا گوشت کھایا جاتا ہے۔ (خروج باب: ۱۲)

نذر کی روٹیاں: ہیکل میں نذر کی میز پر رکھی جاتی تھیں۔ ہر ساتویں دن خداوند کے حضور سے اٹھائی جاتی تھیں اور کاہن ان کی جگہ تازہ گرم روٹیاں رکھتے تھے۔ (۱۔ سموئیل ۶:۲۱) پرانی روٹیاں کاہنوں کی بالائی یافتہ تھیں۔ وہ انھیں لے کر کسی پاک جگہ کھاتے تھے۔ (احبار ۹:۲۴)

القصہ قربانیوں کی اقسام کا گوشت خود جلایا تھا۔ باقی قربانیوں کا تھوڑا سا گوشت مذبح پر جلا کر باقی گوشت ہیکل (یہودی مسجد) کے مولوی اور قربانی پیش کرنے والا کھاتے تھے۔

نذر کی روٹیاں بھی حسب قاعدہ مولوی صاحبان اور انکے یار بیلی کھایا کرتے تھے۔

ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں قربانی کا گوشت آگ کے کھانے کی روایت ہمارے مطالعہ میں نہیں آسکی۔

بت پرستوں کے مندروں میں بتوں کے لیے جو قربانیاں کی جاتی تھیں ان کا گوشت کھایا جاتا تھا۔

(قاموس الکتاب، صفحہ: ۱۳۸، ک:۱)

یہودی قربانی کا گوشت کھاتے تھے۔ قربانی کے جلائے جانے والے گوشت کو خود نذرِ آتش کرتے تھے۔ آسمان سے آگ آکر نہیں کھایا کرتی تھی۔ نذریں نیازیں بھی کھائی جاتی تھیں۔

''نذر و نیاز کی حلت و اباحت حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے موجود تھی۔''

اسلام میں قربانی کی معروف ترین صورت عید اضحیٰ کے موقع پر سنتِ ابراہیمی کی یاد میں جانور قربان کرنا ہے۔اس کا سارے کا سارا گوشت کھایا جاتا ہے۔ (سورۃ حج آیات:٣٦۔٣٧) اس سلسلہ میں مسلم تفاسیر کا تذکرہ بلاضرورت ہے۔

کیا عید الاضحیٰ کے دن اپنی قربانی کے گوشت سے ہی کھانا کھانا چاہیے؟

سوال: کیا سنت نبوی ﷺ سے ثابت ہے کہ عید الاضحیٰ کے دن اپنی قربانی کے گوشت سے ہی کھانا کھانا چاہیے؟ (ابوطاہر نذیر احمد، عبدالرشید۔کراچی) (٢٣ فروری ٢٠٠١ء)

جواب: عقبہ بن عبداللہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ واپس آ کر اپنی قربانی کا گوشت کھاتے، ابن قطان نے اس اضافے کو صحیح قرار دیا ہے۔ (نصب الرایہ:٢/٢٠٩، داری، ابن عدی)

« زاد احمد والدارقطنی والبیھقی، فَیَاکُل مِنْ اُضْحِیَتِه»

''امام احمد، دارقطنی اور بیہقی میں یہ الفاظ زائد ہیں کہ'' آپ اپنی قربانی کا گوشت کھاتے۔'' جب کہ ''آپ (عیدگاہ سے) واپس آ کر اپنی قربانی کی کلیجی کھاتے'' اور ''بیہقی'' میں ہے:

« وَ کَانَ اِذَا رَجَعَ اَکَلَ مِنْ کَبِدِ اُضْحِیَتِهٖ »[1]

لیکن یہ صرف مستحب ہے واجب نہیں، حدیث البراء میں ہے:

« اِنَّ الْیَوْمَ یَوْمُ اَکْلٍ وَّ شُرْبٍ» [2]

اس روایت میں آپ ﷺ نے یہ تو وضاحت فرمائی ہے کہ وقت سے پہلے قربانی ناکافی ہے لیکن اس کے کھانے سے روکا نہیں یہ جواز کی دلیل ہے۔

قربانی کے گوشت میں اپنا حصہ کتنا رکھنا چاہیے؟

سوال: عید الاضحیٰ میں قربانی کرنے والا جس قدر گوشت اپنے لیے رکھنا چاہے رکھ سکتا ہے یا تیسرے حصے سے زیادہ نہیں رکھ سکتا؟ (سائل: محمد علی شاہ، لاہور) ٣١ مئی ٢٠٠٢ء)

جواب: قربانی کے گوشت کے تین حصے کرنا کئی ایک اہل علم کے نزدیک مستحب ہے واجب نہیں۔ضرورت کی بناء پر اگر کوئی زیادہ بھی رکھ لے تو کوئی حرج نہیں۔تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ (المرعاۃ:٢/٣٦٩)

کیا قربانی کا گوشت ہندوؤں کو دینا جائز ہے؟

سوال: کیا قربانی کا گوشت ہندوؤں کو دینا جائز ہے؟ (محمد قاسم اللہ ڈنوں سموں گوٹھ حاجی محمد سموں کنری سندھ۔ ١١۔اپریل ١٩٩٧ء)

---

[1] السنن الکبریٰ للبیھقی، بَابُ: یَتْرُکُ الْاَکْلَ یَوْمَ النَّحْرِ حَتّٰی یَرْجِعَ، رقم:٦١٦١

[2] صحیح البخاری، بَابُ الاَکْلِ یَوْمَ النَّحْرِ، رقم:٩٥٥

جواب: سوال کی صورت میں قربانی کا گوشت غیر مسلم کو دیا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ﴾ (الضحیٰ:۱۰)

بلاسوال دینا اچھا نہیں۔ حدیث میں ہے:

« وَ لَا يَاْكُلْ طَعَامَكَ اِلَّا تَقِيٌّ » ❶

یعنی ''تیرا کھانا پرہیز گار ہی کھائے۔''

اونٹ کی قربانی میں دس حصہ داروں کی شراکت

سوال: کیا اونٹ کی قربانی میں دس حصہ داروں کی شراکت صحیح حدیث سے ثابت ہے؟

(محمد صدیق تلیاں، ایبٹ آباد) (۱۸ جون ۱۹۹۹ء)

جواب: اونٹ کی قربانی میں دس افراد کی شراکت والی حدیث کو مشکوٰۃ کے حاشیہ پر علامہ البانی رحمہ اللہ نے صحیح کہا ہے۔ (۴۶۱/۱)

اونٹ کی قربانی کے کل کتنے حصے ہیں؟ نیز بھینس کی قربانی کا حکم

سوال: اونٹ کی قربانی کے کل کتنے حصے ہیں؟ کیا بیل کی قربانی بھی جائز ہے، نیز کیا بھینس کی قربانی ہو سکتی ہے؟ (ابوطاہر نذیر احمد، عبدالرشید۔کراچی) (۲۳ فروری ۲۰۰۱ء)

جواب: اونٹ کی قربانی میں دس حصے ہو سکتے ہیں۔ ❷

علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ (حواشی مشکوٰۃ:۴۶۲/۱) گائے یا بیل کی قربانی تو جائز اور مشروع ہے۔ (مشکوٰۃ، باب فی الاضحیۃ) البتہ بھینس کے متعلق زیادہ احتیاط والا مسلک یہ ہے کہ جن جانوروں کی قربانی بطورِ نص ثابت ہے صرف وہی کی جائے، بھینس ان میں شامل نہیں اور نہ صحابہ وتابعین سے اس کی قربانی کا کوئی ثبوت ملتا ہے۔

ہمارے شیخ روپڑی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید پارہ ۸ رکوع ۴ میں بَهِيْـمَةُ الْاَنْـعَـامِ کی چار قسمیں بیان کی گئی ہیں: دنبہ، بکری، اونٹ، گائے۔ ان میں بھینس کا ذکر نہیں جبکہ قربانی کے متعلق ہے کہ بَهِيْـمَةُ الْاَنْـعَـامِ سے ہو، اس بناء پر بھینس کی قربانی جائز نہیں۔ ❸

---

❶ سنن أبی داؤد، بَابُ مَنْ يُؤْمَرُ أَنْ يُجَالِسَ، رقم:٤٨٣٢

❷ سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي الاِشْتِرَاكِ فِي الأُضْحِيَّةِ، رقم:١٥٠١، صحيح ابن خزيمه:٢٩٠٨

❸ فتاویٰ اهل حديث ٢/ ٤٢٦

اونٹ کی قربانی میں کتنے حصے ہیں؟ (بریلوی مکتبِ فکر کے فتوے پر تعاقب)

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ کے بارے میں کہ ''اونٹ کی قربانی میں دس حصے دار شریک ہو سکتے ہیں یا نہیں؟'' قرآن وحدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔ لاہور کے ایک ''محمد حسین صاحب'' کے اسی سوال پر جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور نے بھی ایک فتویٰ صادر فرمایا ہے وہ بھی اس استفسار کے ساتھ لف ہے۔ (سائل: قاری محمد حیات ربانی)

جامعہ نظامیہ رضویہ کا فتویٰ: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم:

جواب: مسئولہ صورت میں اونٹ کی قربانی میں ۱۰ حصہ دار شریک نہیں ہو سکتے۔ کہ صحیح حدیثوں میں گائے اور اونٹ میں سات حصے متعین ہیں، حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ :اَلْبَقَرَةُ عَنْ سَبْعَةٍ، وَالْجَزُورُ عَنْ سَبْعَةٍ.»[1]

''یعنی گائے سات کی طرف سے اور اونٹ سات کی طرف سے۔'' اور چودہ سو سالہ جمہور مسلمانوں کا عمل ہے اور اس عمل پر کسی نے کوئی اعتراض نہ کیا اور آئمہ مجتہدین وفقہاءِ کرام سب کا یہی عمل رہا کہ اونٹ میں سات حصہ ہیں۔ تاہم غیر مقلد فرقہ جو چند سالوں سے نو پید ہے اور جمہور مسلمانوں کا بدخواہ ہے، نے غریب روایات سے استدلال کیا کہ دس حصے ہو سکتے ہیں۔ حالانکہ ان کا یہ استدلال غلط ہے کہ غریب روایت سے حکم ثابت نہیں ہوتا، ترمذی شریف میں دس حصے والی روایت کو نقل کرنے کے بعد فرمایا: « هٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ، بَابُ الْأُضْحِيَة» لہٰذا مسلمانوں پر لازم ہے کہ چودہ سو سالہ جاری عمل کو اختیار کریں اور گمراہ فرقوں کے فتنہ سے اپنے کو محفوظ رکھیں۔ (وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ)۔

(نائب مفتی، جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور)

جواب: (**از حضرت شیخ الحدیث حافظ ثناء اللہ خان صاحب مدنی۔ الاعتصام**) اونٹ کی قربانی میں دس حصے دار شریک ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ

«كُنَّا مَعَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي سَفَرٍ فَحَضَرَ الْاَضْحَى فَاشْتَرَكْنَا فِي الْبَقَرَةِ سَبْعَةً، وَفِي الْبَعِيرِ عَشَرَةً..»[2]

ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے، عید الاضحیٰ کا وقت آ گیا تو ہم ایک گائے میں سات اور ایک اونٹ میں دس شریک ہوئے۔

علامہ البانی رحمہ اللہ ''تعلیق مشکوٰۃ'' (۴۶۲/۱) میں فرماتے ہیں:

---

[1] صحیح مسلم، بَابُ الِاشْتِرَاكِ فِي الْهَدْيِ وَإِجْزَاءِ الْبَقَرَةِ ......الخ، رقم: ۱۳۱۸، سنن ابی داؤد، رقم: ۲۸۰۷

[2] سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي الِاشْتِرَاكِ فِي الأُضْحِيَّةِ، رقم: ۱۵۰۱، صحیح ابن خزیمہ: ۲۹۰۸

« وَ اِسْنَادُهٗ صَحِيْحٌ، رِجَالُهٗ رِجَالُ الصَّحِيْحِ.»

''اس حدیث کی سند صحیح ہے اس کے راوی صحیح کے راوی ہیں۔''

علامہ البانی رحمہ اللہ نے اسے ''صحیح الترمذی'' میں شامل کیا ہے۔

جامعہ نظامیہ، رضویہ لاہور کے مفتی صاحب نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اونٹ کی قربانی میں دس آدمیوں کی حصہ داری کے بارے میں وارد روایات غریب اور ناقابلِ استدلال ہیں، غریب روایت سے حکم ثابت نہیں ہوتا، امام ترمذی نے «بَابُ الْأُضْحِيَة» میں اسے غریب کہا ہے۔ اسی پر اکتفاء کرنے کی بجائے مسلک اہل حدیث پر خوب کیچڑ اچھالا اور اپنی بھڑاس نکالی ہے۔ رضاخانی فرقے کی اور اس سے پہلے ہر دور کے اہل بدعت کی یہی عادت رہی ہے۔ شاہ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ نے فرمایا:

''اہل بدعت کی علامت ہے کہ اہل حدیث سے بغض رکھتے ہیں۔''

لہٰذا یہ زبان انہی کو مبارک ہو۔ اس وقت بالاختصار جس بات کا جائزہ لینا مقصود ہے وہ یہ کہ کیا فی الواقع حدیث ہذا ضعیف اور ناقابلِ عمل ہے اور افرادِ امت میں سے کسی کا اس پر عمل نہیں ہے؟

جن محدثینِ کرام نے اس روایت کو اپنی ''تالیفات'' میں جگہ دی ہے، پہلے ان کے حوالہ جات ملاحظہ فرمائیں!

مسند احمد(۱/۲۷۵) ، سنن ابن ماجه(۳۱۳۱) سنن النسائی(۷/۲۲۲)، صحیح ابن خزیمه (۲۹۰۰)،صحیح ابن حبان(٤٠٠٧) ، معجم طبرانی کبیر(۱۱۹۲۹) ، معجم طبرانی اوسط (۸۱۲۸)، حاکم(٤/۲۹۰۰) ،بیهقی(٥/۲۳٥)، بغوی(۱۱۳۲)، تحفة الاشراف(٥/۱٥۱، حدیث رقم:۱٦٥۸) ، المسند الجامع(۹/۳٤٥، حدیث رقم: ٦۷۰٦)

مفتی صاحب موصوف نے ''امام ترمذی'' کے حوالے سے صرف اس کی غرابت نقل کی ہے جب کہ امرِ واقع یہ ہے کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث پر حسن غریب کا حکم لگایا ہے اور اس سے مقصود سندوں کے اختلاف کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ بعض کے اعتبار سے غریب اور بعض کے اعتبار سے حسن ہے۔ ذیل میں اس روایت کے متعلق مختلف ائمہ حدیث کے اقوال نقل کیے جاتے ہیں۔

- امام حاکم رحمہ اللہ نے کہا: « صَحِيْحٌ عَلٰى شَرْطِ الْبُخَارِيِّ » ''اس حدیث کی سند صحیح ہے اس کے راوی صحیح کے راوی ہیں۔''
- امام الجرح والتعدیل ذہبی رحمہ اللہ نے اس کی موافقت کی ہے۔
- امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے اپنی ''صحیح'' میں اسی پر اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے اس موقف کو قوی قرار دیا ہے اور اپنے مسلک کی تقویت کے لیے رافع بن خدیج کی حدیث سے تائید حاصل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک جہادی مہم

میں ایک اونٹ کو دس بکریوں کے قائم مقام قرار دیا تھا۔ ❶

- امام ابن ماجہ نے اپنی ''سنن'' میں اس حدیث پر بایں الفاظ تبویب قائم کی ہے: «بَابُ عَنْ كَمْ تُجْزِءُ الْبَدَنَةُ وَالْبَقَرَةُ» یعنی کتنے آدمیوں کی طرف سے اونٹ اور گائے کافی ہو سکتی ہے؟ اس سے معلوم ہوا کہ امام موصوف کے نزدیک اونٹ میں دس کی شراکت کا جواز ہے۔
- امام اسحاق رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اونٹ دس آدمیوں کی طرف سے کافی ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے انھوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے استدلال کیا ہے۔
- امام ابن حزم ''المحلّٰی'' (۳۸۲/۷) میں فرماتے ہیں کہ یہی بات صحابہ سے ابن عباس (راوی حدیث) سے منقول ہے۔
- امام شوکانی ''نیل الاوطار'' میں فرماتے ہیں کہ ''اونٹ کی قربانی میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ شافعیہ، حنفیہ اور جمہور اس بات کے قائل ہیں کہ اونٹ سات کی طرف سے کافی ہوتا ہے۔ جب کہ عترت، اسحاق بن راہویہ، ابن خزیمہ اور ایک روایت میں ابن مسیب نے کہا ہے کہ اونٹ دس افراد کی طرف سے کافی ہو جاتا ہے اور یہی بات حق اور صواب ہے۔ ❷

واضح ہو کہ حق کی معرفت کا معیار قلت و کثرت نہیں بلکہ اصل دلیل کی پیروی ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ﴾ (النساء: ۵۹) اَیْ اِلٰی كِتَابِ اللّٰهِ وَ سُنَّةِ رَسُوْلِهٖ ، لَا اِلٰی آرَاءِ الرِّجَالِ وَافْهَامِهِمْ.

''یعنی اپنے اختلاف کو اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت کی طرف لوٹا دو نہ کہ افرادِ امت کی آراء و افکار کی طرف۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول مشہور ہے کہ: «اَعْرِفِ الْحَقَّ تَعْرِفْ اَهْلَهٗ»

''حق کی پہچان کرو، اہل حق کا تجھے علم ہو جائے گا۔''

«اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَارْزُقْنَا اِتِّبَاعَهٗ وَ اَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَ ارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ.»

امید ہے حضرت مفتی صاحب اپنے فتوے پر نظر ثانی فرمائیں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

«وَمُرَاجَعَةُ الْحَقِّ خَيْرٌ مِنَ التَّمَادِيْ فِي الْبَاطِلِ» ❸

❶ صحيح البخاري، كتابُ الشِّرْكَة، بَابُ قِسْمَة الْغَنَمِ، رقم:۲٤٨٨، معجم الكبير، رقم:٤٣٨٣

❷ بحواله تحفة الاحوذي:۲/ ۳٥٦

❸ اعلام الموقعين:١/ ٦٨

"باطل پر اصرار سے بہتر ہے کہ آدمی حق کی طرف رجوع کرلے۔"

قربانی میں مشرک اور بے نمازی افراد شراکت دار بن جائیں تو قربانی درست ہے؟

سوال : کیا قربانی کے جانور میں حصہ داروں میں سے بعض بے نماز ہوں تو باقی حصہ داروں کی قربانی درست ہے؟

(محمد صدیق تلیاں، ایبٹ آباد) (۱۸ جون ۱۹۹۹ء)

جواب : مشرک اور بے نماز کی حصہ داری سے احتراز کرنا چاہیے۔ اگر کوئی ایسی صورت پیش آجائے تو حتی المقدور اس سے خلاصی کی کوشش کرنی چاہیے۔ بصورتِ دیگر اللہ سے توبہ واستغفار کرلینی چاہیے۔ وہ کوتاہی معاف کرنے والا ہے۔

قربانی کے بعض حصے دار بے نماز ہوں تو کیا قربانی درست ہے؟

سوال : قربانی (مثلاً گائے/ بیل کی) کے حصہ داروں میں بعض نمازی اور بعض بے نماز ہوں تو کیا اس طرح قربانی درست ہے؟ (محمد صدیق تلیاں، ضلع ایبٹ آباد) (۱۰ جنوری ۲۰۰۶ء)

جواب : جانور ایک ہونے کی بنا پر اصل تو یہ ہے کہ ایک کی طرف سے قربانی ہو، لیکن رب العزت کا احسان ہے کہ اُس نے ایک کو سات کے قائم مقام قرار دیا ہے، اس لیے شریک ایک ہی قسم کے ہونے چاہئیں، یعنی سب کا اہل توحید ہونا ضروری ہے، پھر سب کی نیت بھی قربانی کی ہونی چاہیے، نذر عقیقہ وغیرہ کو اس میں دخل نہیں۔ اصل یہ ہے کہ جو بات شریعت میں قیاس کے خلاف ہو، وہ اسی مقام پر بند رہتی ہے کیوں کہ علت معلوم نہیں تو اس کا حکم دوسری جگہ کس طرح منتقل ہوسکتا ہے۔

کیا گائے، بیل اونٹ ایک آدمی کرسکتا ہے یا حصہ دار کی شمولیت ضروری ہے؟

سوال : کیا گائے، بیل، اونٹ صرف ایک آدمی ہی قربان کرسکتا ہے یا سات حصہ دار ہی ہوں؟

(محمد صدیق تلیاں، ایبٹ آباد) (۱۸ جون ۱۹۹۹ء)

جواب : گائے، بیل، اونٹ صرف ایک آدمی بھی کرسکتا ہے بلکہ اصل یہی ہے، شراکت محض اللہ کا فضل ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی ﷺ نے سو قربانیاں کی تھیں۔ [1]

اور دوسرے موقع پر دو مینڈھے ذبح کیے۔ (مشکوٰۃ باب فی الاضحیۃ)

کیا آدمی اپنی زرخرید یا گھریلو گائے کی قربانی میں شرکت کرسکتا ہے؟

سوال : زید نے ایک گائے پال رکھی ہے جو کہ زرخرید نہیں بلکہ گھریلو ہے۔ خوبصورت، بے عیب اور قربانی کے لائق ترین ہے۔ کچھ لوگوں نے زید سے مذکورہ گائے قربانی کے لیے خریدنے کو کہا اور اس کی قیمت ثالثی پانچ ہزار (=/۵۰۰۰)

[1] زاد المعاد: ۱/ ۲۲۸۔۲۲۹

متعین ہوگئی۔ پھر (=/۵۰۰۰) کو سات حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ اب زید کہتا ہے کہ میں بھی اس گائے میں اپنا حصہ بصورتِ قربانی کرنا چاہتا ہوں۔ لہٰذا تم مجھے چھ حصوں کے پیسے دے دو۔ جب کہ زید کی اس گائے میں پہلے سے قربانی کے لیے کوئی نیت نہ تھی۔ وقتی طور پر تیار ہوا ہے۔ ہمیں تو بظاہر اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔ تاہم شرعی فیصلہ مطلوب ہے جب کہ اس تقسیم عمل کو حافظ عبداللہ محدث روپڑی رحمہ اللہ نے اپنے فتاویٰ میں غیر درست و مشکوک کہا ہے۔

۲۔ زید نے ایک گائے خرید کی ہے اب اس میں بغیر منافع کے اصل رقم پر اپنا حصہ شامل کر کے قربانی کرسکتا ہے۔ یعنی دی ہوئی رقم کے سات حصے ہوئے اپنا حصہ چھوڑ کر باقی اپنی اصل رقم سے چھ حصے وصول کرتا ہے۔ کیا یہ درست ہے؟

(ایک سائل) (۲۲۔ اگست ۱۹۹۷ء)

جواب: اصل بات یہ ہے کہ شرعی حدود و قیود دو قسموں پر مشتمل ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جس میں شراکت کا جواز نہیں۔ جیسے کفارۂ قتلِ خطا ہے۔ جرم میں تعدد افراد کی صورت میں ہر ایک کو مستقلاً کفارہ خطا ادا کرنا ہوگا اور دوسری قسم اس کے برعکس ہے۔ مثلاً کسی نے مسجد کے لیے قطعہ اراضی وقف کیا تو بعد ازاں بالفعل یہاں مسجد تعمیر ہوگئی۔ تو بلاشبہ واقف یہاں خود بھی نماز پڑھ سکتا ہے۔ اسی طرح زید کے زرخرید یا خود پالے ہوئے جانور میں بھی شراکت کا جواز ہے کیونکہ شریعت نے انتفاع کی اجازت دی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے بازار میں ایک شخص کو قربانی کا جانور لے جاتے دیکھ کر فرمایا: «اِرْکَبْهَا»[1] "اس پر سوار ہو جا۔"

امام بخاری رحمہ اللہ «هَلْ يَنْتَفِعُ الوَاقِفُ بِوَقْفِهِ؟» کے تحت رقمطراز ہیں:

« وَقَدْ اشْتَرَطَ عُمَرُ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ: لَا جُنَاحَ عَلَى مَنْ وَلِيَهُ أَنْ يَأْكُلَ مِنْهَا وَقَدْ يَلِي الوَاقِفُ وَغَيْرُهُ، وَكَذٰلِكَ كُلُّ مَنْ جَعَلَ بَدَنَةً أَوْ شَيْئًا لِلَّهِ، فَلَهُ أَنْ يَنْتَفِعَ بِهَا كَمَا يَنْتَفِعُ غَيْرُهُ، وَإِنْ لَمْ يَشْتَرِطْ .»

پھر شریعت میں وقف مشاع کا جواز بھی اس امر کا مؤید ہے۔ "صحیح بخاری" کی تبویب میں ہے:

«بَابُ إِذَا أَوْقَفَ جَمَاعَةٌ أَرْضًا مُشَاعًا فَهُوَ جَائِزٌ»

یعنی چند افراد مل کر مشترکہ زمین کو وقف کردیں تو اس کا جواز ہے۔ نبی ﷺ نے گائے کی قربانی میں شراکت کی عمومیت اجازت فرمائی ہے کہ سات افراد اس میں شرکت کرسکتے ہیں۔ آپ ﷺ نے کسی کو مستثنیٰ قرار نہیں دیا۔ اس کا تقاضا ہے کہ بائع خود بھی بقدر حصہ اس میں شریک ہوسکتا ہے۔ اور ایک دم ایک کی طرف سے وہاں ہوتا ہے جہاں پر شرعی اجازت موجود نہ ہو۔ جب کہ محل بحث میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ فقیہ ابن قدامہ بھی مطلق اشتراک کے قائل ہیں۔

[1] صحيح البخاري، بَابٌ: هَلْ يَنْتَفِعُ الوَاقِفُ بِوَقْفِهِ؟، رقم:٢٧٥٤

چنانچہ فرماتے ہیں:

« وَيَجُوزُ أَنْ يَشْتَرِكَ السَّبْعَةُ فِي الْبَدَنَةِ وَالْبَقَرَةِ، سَوَاءٌ كَانَ وَاجِبًا أَوْ تَطَوُّعًا، وَسَوَاءٌ أَرَادَ جَمِيعُهُمُ الْقُرْبَةَ، أَوْ بَعْضُهُمْ، وَأَرَادَ الْبَاقُونَ اللَّحْمَ.» [1]

''اونٹ، گائے میں سات آدمیوں کی شرکت کا جواز ہے برابر ہے۔ شراکت واجبی یا نفلی قربانی میں ہو اور برابر ہے سب کا ارادہ قربت (عبادت) ہو یا بعض کا اور دیگر افراد کا ارادہ محض حصولِ گوشت ہو۔''

بنا بریں حضرت الشیخ محدث روپڑی رحمہ اللہ کے موقف سے موافقت کرنا مشکل امر ہے۔

۲۔ سابقہ دلائل کی رو سے بظاہر دونوں طرح جواز ہے۔ چاہے شراکت اصل قیمت میں ہو یا منافع کے ہمراہ۔

فیملی سسٹم میں ایک ہی قربانی کافی ہے؟

سوال: ایک ہی گھر میں والد باروزگار ہے۔ پنشن بھی ملتی ہے بیٹا بھی روزگار ہے۔ ایک ہی گھر میں فیملی سسٹم پر رہتے ہیں۔ کیا دونوں پر علیحدہ علیحدہ قربانی فرض ہے یا ایک ہی قربانی کافی ہے؟ (ایک سائل) (۱۰ جون ۱۹۹۴ء)

جواب: ایک قربانی ایک اہل بیت کی طرف سے کافی ہو سکتی ہے۔ حدیث میں ہے:

« يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ عَلَى كُلِّ أَهْلِ بَيْتٍ فِي كُلِّ عَامٍ أُضْحِيَّةً » [2]

''یعنی ہر گھر والوں پر ہر سال ایک قربانی ہے۔'' سنن ابن ماجہ میں بعض دیگر روایات بھی اس کی مؤید ہیں۔

ایک گھر میں تمام بھائیوں کو الگ الگ قربانی کرنا ہوگی؟

سوال: ایک گھر میں دو تین شادی شدہ بھائی اکٹھے رہتے ہیں۔ آیا سب کو الگ الگ قربانی دینا ہوگی۔ یا کہ ایک کی طرف سے قربانی کرنا سب کی طرف سے ہو جائے گی؟ چونکہ حدیث ہے کہ گھر کے ایک فرد کی طرف سے قربانی سب گھر والوں کی طرف سے ہو جاتی ہے۔ (محمد مسعود صابر خورشید کالونی۔ گجرات) (۱۹ جولائی ۱۹۹۶ء)

جواب: اگر کھانا پکانا سب بھائیوں کا اکٹھا ہے تو ایک قربانی ہو سکتی ہے۔ ترمذی میں حدیث ہے:

« يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ عَلَى كُلِّ أَهْلِ بَيْتٍ فِي كُلِّ عَامٍ أُضْحِيَّةً » [3]

---

[1] المغنی: ج:۳، ص: ۵۷۹۔۵۸۰

[2] سنن ابن ماجہ، بَابُ الْأَضَاحِيِّ، وَاجِبَةٌ هِيَ أَمْ لَا، رقم:۳۱۲۵، سنن ابی داؤد، بَابُ مَا جَاءَ فِي إِيجَابِ الْأَضَاحِيِّ، رقم:۲۷۸۸

[3] سنن ابن ماجہ، بَابُ الْأَضَاحِيِّ، وَاجِبَةٌ هِيَ أَمْ لَا، رقم:۳۱۲۵، سنن ابی داؤد، بَابُ مَا جَاءَ فِي إِيجَابِ الْأَضَاحِيِّ، رقم:۲۷۸۸

"یعنی ہر گھر والوں پر سال میں ایک قربانی ہے۔" بصورتِ دیگر علیحدہ علیحدہ قربانی کرنی ہوگی۔

قربانی کی بجائے زلزلہ متاثرین یا سیلاب زدگان کی امداد کا حکم

سوال : صاحب استطاعت شخص قربانی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، کیا وہ قربانی ہی کرے یا وہ (قربانی والی) رقم زلزلہ زدگان کو دے دے؟ (محمد صدیق تلیاں، ضلع ایبٹ آباد) (۱۰ جنوری ۲۰۰۶ء)

جواب : قربانی کی استطاعت والے کو قربانی ہی کرنی چاہیے، کیوں کہ اس روز محبوب ترین عمل « اِهْرَاقُ الدَّمِ » [1] یعنی "خون بہانا ہے۔" زلزلہ زدگان کی اپنی جیب خاص سے مدد کرے۔"

تبلیغی مرکز رائیونڈ میں قربانی کرنے کا حکم؟

سوال : کچھ عرصہ سے بیرون جات سے آئے ہوئے حضرات عید الاضحیٰ کی قربانی اپنے گھر کی بجائے مرکز تبلیغ رائیونڈ میں ذبح کرتے اور ان کا گوشت وہیں مرکز میں استعمال کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ بعض اس کے جواز اور کچھ دوسرے لوگ اس فعل کے عدمِ جواز کے قائل ہیں کتاب و سنت کی رُو سے اس مسئلہ کی صحیح صورت کیا ہے؟

(عبدالمجید گوندل) (یکم اکتوبر ۱۹۹۳ء)

جواب : قربانی کا گوشت جہاں بھی حق داروں تک پہنچ سکے۔ وہاں ہی ذبیحہ درست ہے۔ مرکز تبلیغ میں ذبح سے مقصود اگر یہ ہو کہ یہاں مستحقین بکثرت موجود ہیں۔ آسانی سے ان کو گوشت دیا جا سکتا ہے۔ تو اس میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ عزیز و اقارب کے حق میں کوتاہی نہ ہونے پائے۔ بصورتِ دیگر فعل ہذا تقصیر شمار ہوگا جو درست بات نہیں۔ اور اگر کوئی نادان یہ سمجھتا ہے کہ مرکز میں ذبح کے بغیر ہماری قربانی مقامِ قبولیت حاصل نہیں کر سکے گی تو اس رسم کو مٹانا واجب ہے کیونکہ اس سے شرک کا دروازہ کھلتا ہے جس کا انسداد ضروری ہے۔

عذر کے بغیر قربانی میں تاخیر کر سکتے ہیں؟

سوال : عذر کے بغیر قربانی لیٹ کر سکتے ہیں؟ تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ قربانی کا آخری دن کونسا ہے؟

(ابوطاہر نذیر احمد، عبدالرشید۔ کراچی) (۲۳ فروری ۲۰۰۱ء)

جواب : میسر آنے کی صورت میں پہلے دن ہی قربانی کر دینی چاہیے کیونکہ نبی ﷺ کا اپنا معمول یہی تھا، لہٰذا فضیلت اسی میں ہے، لوگوں کو صرف بتا دینا ہی کافی ہے کہ اتنے روز تک قربانی کرنا جائز ہے۔

قربانی کرنے کے کل کتنے ایام ہیں؟

سوال : قربانی کرنے کے کل کتنے ایام ہیں؟ (ابوطاہر نذیر احمد، عبدالرشید۔ کراچی) (۲۳ فروری ۲۰۰۱ء)

[1] سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي فَضْلِ الأُضْحِيَةِ، رقم:۱٤۹۳)

جواب : بعض اقوال کے مطابق تیرہ تاریخ تک قربانی کرنے کا جواز ہے تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: تفسیر اضواء البیان ۵/ ۴۹۶۔

فتاویٰ اہل حدیث: ۲/ ۴۳۴، اور زاد المعاد نیز ابن کثیر اور فتح الباری: ۱۰/ ۸۔

امت کی طرف سے قربانی کا ذکر

سوال : جس حدیث پاک میں حضور ﷺ کی ایک قربانی امت کی طرف سے کرنے کا ذکر ہے اس میں یہ صاف ذکر ہے کہ یہ قربانی میری امت کے ان افراد کی طرف سے ہے جو قربانی کی استطاعت نہیں رکھتے۔ اس سے صاف ظاہر ہے اس میں صرف ایسے افراد ہی شامل ہوتے ہیں جو اُس وقت زندہ تھے اور قربانی کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ رہی دوسری حدیث جس میں حضور ﷺ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ کی طرف سے قربانی کرنے کے لیے وصیت کا ذکر ہے تو اس کی رو سے وصیت شرط ہے۔ تو پھر کیا وصیت کی عدم موجودگی میں بھی میت کی طرف سے قربانی کی جاسکتی ہے؟
(سائل) (۱۱۔ اپریل ۲۰۰۸ء)

جواب : نبی ﷺ نے جو قربانی کی تھی وہ امت کے تمام افراد کی طرف سے تھی۔ عدم استطاعت کی قید حدیث میں موجود نہیں۔ حدیث کے الفاظ « وَ عَمَّنْ لَمْ يُضَحِّ مِنْ اُمَّتِیْ » سب کو شامل ہیں چاہے کسی کو استطاعت ہو یا نہ ہو، اور چاہے وہ موجود ہو یا فوت شدہ۔ جس طرح کہ « وَعَنْ مُحَمَّدٍ وَ اُمَّتِهِ » سب افراد امت کو شامل ہے۔ انہی الفاظ سے شارحین حدیث کا استدلال ہے کہ قربانی واجب نہیں۔ کیوں کہ « وَ عَمَّنْ لَمْ يُضَحِّ » بلا استثناء سب کو شامل ہے۔
اس سے معلوم ہوا کہ فوت شدہ کی طرف سے مطلقاً قربانی ہوسکتی ہے وصیت کی ہو یا نہ کی ہو۔ "غنية الالمعی" میں ہے جس کا ماحصل یہ ہے:

« إِنَّ قَوْلَ مَنْ رَخَّصَ فِی التَّضْحِيَّةِ عَنِ الْمَيِّتِ مُطَابِقٌ لِلْاَدِلَّةِ وَ لَا دَلِيْلَ لِمَنْ مَنَعَهَا وَ قَدْ ثَبَتَ أَنَّهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُضَحِّیْ بِكَبْشَيْنِ أَحَدُهُمَا عَنْ نَفْسِهِ وَ أَهْلِ بَيْتِهِ وَ الْآخَرُ عَنْ أُمَّتِهِ مَنْ شَهِدَ لَهُ بِالتَّوْحِيدِ وَ شَهِدَ لَهُ بِالْبَلَاغِ وَ مَعْلُوْمٌ أَنَّ كَثِيْرًا مِنْ أُمَّتِهِ قَدْ كَانُوْا مَاتُوا فِی عَهْدِهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَدَخَلَ فِیْ أُضْحِيَّتِهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْأَحْيَاءُ وَالْاَمْوَاتُ كُلُّهُمْ وَ الْكَبْشُ الْوَاحِدُ الَّذِیْ يُضَحِّیْ بِهِ عَنْ أُمَّتِهِ كَمَا كَانَ لِلْاَحْيَاءِ كَذَالِكَ كَانَ لِلْاَمْوَاتِ مِنْ أُمَّتِهِ بِلَا تَفْرِقَةٍ وَ لَمْ يَثْبُتْ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَتَصَدَّقُ بِذٰلِكَ الْكَبْشِ كُلِّهِ وَ لَا يَأْكُلُ مِنْهُ شَيْئًا أَوْ كَانَ يَتَصَدَّقُ بِجُزْءٍ مُّعَيَّنٍ بِقَدْرِ حِصَّةِ الْاَمْوَاتِ بَلْ قَالَ أَبُوْ رَافِعٍ : « اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُطْعِمُهَا جَمِيْعًا الْمَسَاكِيْنَ وَ يَأْكُلُ

هُوَ وَ أَهْلُهُ مِنْهُمَا » رَوَاهُ أَحْمَدُ وَ كَانَ دَأْبُهُ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّه يَأْكُلُ مِنَ الْأُضْحِيَّةِ هُوَ وَ أَهْلُهُ وَ يُطْعِمُ مِنْهَا الْمَسَاكِيْنَ وَ أَمَرَ بِذٰلِكَ أُمَّتَهُ وَ لَمْ يُحْفَظْ عَنْهُ خِلَافُهُ فَإِذَا ضَحَّى الرَّجُلُ عَنْ نَفْسِهِ وَ عَنْ بَعْضِ أَمْوَاتِهِ أَوْ عَنْ نَفْسِهِ وَ عَنْ أَهْلِهِ وَ عَنْ بَعْضِ أَمْوَاتِهِ فَيَجُوْزُ اَنْ يَّاكُلَ هُوَ وَ أَهْلُهُ مِنْ تِلْكَ الْأُضْحِيَّةِ وَ لَيْسَ عَلَيْهِ أَنْ يَتَصَدَّقَ بِهَا كُلِّهَا نَعَمْ اِنْ تُخَصَّ الْأُضْحِيَّةُ لِلْاَمْوَاتِ مِنْ دُوْنِ شِرْكَةِ الْاَحْيَاءِ فِيْهَا فَهِيَ حَقٌّ لِلْمَسَاكِيْنِ كَمَا قَالَ عَبْدُ اللهِ بْنُ الْمُبَارَكِ .انتهى [1]

فوت شدہ کی طرف سے قربانی کی جاسکتی ہے؟

سوال : فوت شدہ کی طرف سے قربانی کی جاسکتی ہے۔ اگر چہ اس نے کوئی وصیت نہ کی ہو؟

(محمد نصر اللہ گوندلانوالہ تحصیل وضلع گوجرانوالہ) (۶ نومبر ۱۹۹۲ء)

جواب : فوت شدہ کی طرف سے بلاوصیت قربانی ہوسکتی ہے جس طرح کہ نبی ﷺ نے امت کے افراد کی طرف سے قربانی کی تھی۔ ملاحظہ ہو کتب احادیث۔

فوت شدگان کی طرف سے قربانی کا حکم:

سوال : جو آدمی فوت ہوگیا ہو، کیا اس کے نام سے قربانی کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ جواز کی صورت میں اس قربانی کا گوشت گھر والے خود کھاسکتے ہیں یا نہیں؟ کچھ لوگ اللہ کے رسول ﷺ کے نام کی قربانی کرتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنے پیروں کے نام مثلاً غوثِ پاک وغیرہ کی قربانی کرتے ہیں۔ کیا ان کی قربانی ہوجائے گی۔

(زاہد غزالی۔ لاہور) (۸ فروری ۲۰۰۲ء)

جواب : میت کی طرف سے قربانی کرنا درست عمل ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ اپنی طرف سے اور اپنے اہل بیت کی طرف سے اور اپنی امت کے ہر اس شخص کی طرف سے قربانی کرتے تھے جو توحید و رسالت کی شہادت دیتا ہو۔ ظاہر ہے کہ آپ ﷺ کی امت سے بہت سے لوگ آپ کے زمانے میں موجود تھے اور کچھ ان کی زندگی ہی میں وفات پاچکے تھے۔ امت کی طرف سے قربانی میں زندہ اور فوت شدہ کی تفریق کے بغیر دونوں طرح کے لوگ داخل ہو جاتے ہیں۔ یہ حدیث محدثین نے متعدد سندوں سے نقل کی ہے۔ اس کی صحت میں بھی کوئی شک نہیں، یہ حدیث اس امر کی واضح دلیل ہے کہ میت کی طرف سے قربانی ہوسکتی ہے۔

''شرح مسلم'' میں امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے ان لوگوں نے استدلال کیا

---

[1] المرعاة: ۲/ ۳۵۸، ۳۵۹

ہے جو قربانی اور اس کے ثواب میں اپنے علاوہ دوسرے کو بھی شریک کرنے کے قائل ہیں۔ یہی ہمارا اور جمہور کا مذہب ہے۔ میت کی طرف سے قربانی کے گوشت کا حکم عام قربانی کی طرح ہے، آپ ﷺ سے ثابت نہیں کہ آپ ﷺ نے بقدرِ حصۂ میت صدقہ کیا ہو۔ ابو رافع کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ وہ گوشت مساکین کو کھلاتے، خود کھاتے اور اپنے اہل وعیال کو بھی کھلاتے تھے۔ ہاں البتہ اگر صرف میت کی طرف سے قربانی کی جارہی ہو اور اس میں زندہ لوگ شریک نہ ہوں تو یہ صرف فقراء و مساکین کا حق ہے۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مبارک نے فرمایا ہے۔

رسول اللہ ﷺ اور دیگر مکرم و معزز افراد امت کی طرف سے بطورِ خاص قربانی کرنا ثابت نہیں۔ اگر اس کی کوئی اصل ہوتی تو صحابہ کرام اور سلف صالحین اس کے زیادہ حق دار تھے لیکن ان سے کچھ ثابت نہیں ہو سکا۔

شہید بھائیوں کی طرف سے قربانی کرنا

سوال: میرے دو بھائی جو کہ مجھ سے چھوٹے تھے۔ کشمیر میں یکے بعد دیگرے شہید ہو چکے ہیں۔ اب میں ان کی طرف سے قربانی کرنا چاہتا ہوں کیا یہ جائز ہے یا کہ نہیں؟ نیز اگر قربانی کے علاوہ عام صدقہ ان کی طرف سے کیا جائے تو کیا جائز ہے یا کہ نہیں؟۔ (ایک سائل از بہاولپور) (۱۲ جون ۱۹۹۸ء)

جواب: میت کی طرف سے قربانی ہو سکتی ہے۔ تفصیل کے ملاحظہ ہو فتاویٰ شمس الحق عظیم آبادی اور مرعاۃ المفاتیح (۲/ ۳۵۸ تا ۳۵۹) اس سلسلہ میں میرا تفصیلی فتویٰ ''الاعتصام'' میں شائع شدہ ہے۔

اور میت کی طرف سے عام صدقہ بھی ہو سکتا ہے صحیحین میں ہے ایک شخص نے نبی ﷺ سے عرض کی، میری ماں، ناگہانی مرگئی اور میرا خیال ہے کہ اگر وہ بول سکتی تو ضرور صدقہ کی وصیت کرتی۔ پس اگر میں صدقہ کروں تو کیا اس کا ثواب اس کو ملے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔

(قربانی کے جانور کے اوصاف)

کیا قربانی کا جانور بیچ کر اُس سے اچھا جانور خریدا جا سکتا ہے؟

سوال: زید کو قربانی کا جانور خریدے ہوئے تقریباً ایک ہفتہ گزر گیا۔ دل میں خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ یہ جانور بیچ کر اس کی قیمت میں کچھ رقم اور ملا کر ایک اعلیٰ قسم کا بکرا خرید کر قربانی کیا جائے لہٰذا بکرا فروخت کر دیا گیا۔ بعد میں دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ قربانی کا جانور بیچنا درست نہ ہے۔ لہٰذا سودا پھر واپس کروایا گیا۔

الف۔ کیا قربانی کا جانور بیچ کر اُس سے اچھا جانور خریدا جا سکتا ہے؟

ب۔ جب کہ یہ بیع لاعلمی میں ہوئی۔ کیونکہ ارادہ صرف اس سے اچھا جانور خریدنے کا تھا۔

ج۔ اگر خریدار بیع واپس نہ کرتا تو؟

د۔ اب جب کہ زید کو اپنا جانور واپس مل گیا ہے وہی قربانی کے لیے کافی ہے یا جس اعلیٰ جانور کا وہ ارادہ کر چکا ہے اُسے بھی وہ خرید کر قربانی کرے؟ (سائل: رانا محمد اقبال۔ساہیوال) (۲۵ اگست ۲۰۰۰ء)

جواب: قربانی کا جانور بہتر جانور کے ساتھ تبدیل کرنا جائز ہے۔ چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

« عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ فِی الرَّجُلِ یَشْتَرِی الْأُضْحِیَّةَ أَوِ الْبَدَنَةَ فَیَبِیعُهَا وَیَشْتَرِی أَسْمَنَ مِنْهَا، فَذَكَرَ رُخْصَةً .» ❶

''اس آدمی کے بارے میں (سوال ہوا) جو قربانی کا جانور فروخت کر کے بہتر جانور خریدنا چاہے تو فرمایا اس کی اجازت ہے۔اس روایت کو طبرانی نے ''اوسط'' میں ذکر کیا ہے۔ حافظ ہیثمی رحمہ اللہ نے کہا اس روایت کے سب راوی ثقہ ہیں۔''

اس کی تائید ترمذی اور ابوداؤد کی بھی بعض روایات سے ہوتی ہے لیکن ان میں کچھ کلام ہے۔ یہی مسلک امام احمد، عطاء، مجاہد، عکرمہ، مالک، محمد بن حسن، اور امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ کا ہے۔

''مختصر الخرقی'' میں ہے:

« وَ یَجُوْزُ اَنْ تُبَدَّلَ الْاُضْحِیَةَ اِذَا اَوْجبهَا بِخَیْرٍ مِّنْهَا .» (مسئلہ رقم:۱۷۶۲)

''قربانی کے واجب کے ہونے کے بعد اس سے بہتر جانور کے ساتھ تبدیلی جائز ہے۔''

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ''مرعاۃ المفاتیح'' (۲/۳۶۸) بایں صورت (ب، ج، اور د) کے جوابات کی ضرورت نہیں رہتی۔

قربانی کے جانور کی شرائط کیا ہیں؟

سوال: قربانی کے جانور کی شرائط کیا ہیں؟ (ابوطاہر نذیر احمد، عبدالرشید۔کراچی) (۲۳ فروری ۲۰۰۱ء)

جواب: قربانی میں کسی بھی انداز کا عیب دار جانور ذبح نہیں کرنا چاہیے، کانا، لنگڑا، سینگ ٹوٹا، کان کٹا، بیمار اور بہت کمزور جانور، قربانی کے لیے جائز نہیں۔ ❷

بھیڑ کی قربانی ''جذع'' سے کم عمر کی نہیں ہوتی، جذع بھیڑ کا وہ بچہ جو ایک سال کا ہو اس کے علاوہ بکری، گائے اور اونٹ میں مسنہ یا ثنی میں دو دانت والا ہونا ضروری ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو فتاویٰ اہل حدیث: ۲/۴۱۹، شیخنا محدث روپڑی رحمہ اللہ۔

---

❶ المعجم الاوسط، للطبرانی، رقم:۱۹۶۷

❷ سنن ابی داؤد، بَابُ مَا یُكْرَهُ مِنَ الضَّحَایَا، رقم:۲۸۰۲

قربانی کا بکرا دو دانتا ہونا چاہیے

سوال: قربانی کا بکرا دو دانت ہونا چاہیے یا کہ ایک سال وغیرہ کا ہو تو کھیرا بھی کرسکتا ہے جب کہ حضور ﷺ نے اپنے ایک صحابی کو جس نے عید کی نماز پڑھنے سے پہلے ہی اپنی قربانی کا جانور ذبح کردیا تھا تو حضور ﷺ نے اجازت دے دی تھی کہ تو کھیرا بھی کرسکتا ہے۔ (ایک سائل) (۱۳ دسمبر ۱۹۹۶ء)

جواب: قربانی کے بکرے کے لیے ضروری ہے کہ وہ دو دانت والا ہو۔ "صحیح مسلم" میں حدیث ہے:

«لَا تَذْبَحُوْا اِلَّا مُسِنَّة.» ❶

نبی ﷺ نے جس صحابی کو کھیرا جانور قربانی کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی تھی۔ ساتھ یہ بھی فرمادیا تھا کہ اجازت ہذا تیرے ساتھ مخصوص ہے۔« وَ لَنْ تُجزِئَ عَنْ اَحَدٍ بَعْدَكَ» ❷

لہٰذا اس واقعہ سے یا اس جیسے واقعات سے عمومی استدلال کرنا غیر درست ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَ فِی الْحَدِیْثِ اَنَّ الْجَذْعَ مِنَ الْمَعْزِ لَا یُجْزِئُ وَ هُوَ قَوْلُ الْجَمْهُوْرِ» ❸

بکرا غیر دو دانتا کی قربانی کا حکم

سوال: ایک آدمی نے چار ماہ کا بکرا خریدا۔ پھر ۹ ماہ اس کی پرورش کی لیکن وہ پھر بھی دوندا نہیں ہوا۔ وہ آدمی بہت غریب ہے۔ اس کے علاوہ اور خریدنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اور نہ ہی اس کا بکرا فروخت ہوتا ہے اور وہ قربانی کے ثواب کا بھی طالب ہے کیا یہ اپنا غیر دو دانتا بکرا قربانی کرسکتا ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں وضاحت فرمائیں۔ (ایک سائل) (۲۱ اگست ۱۹۹۸ء)

جواب: بکرا دو دانت والا ہی ہو تو اس کی قربانی ہوسکتی ہے۔ صحیح حدیث میں ہے:

«لَا تَذْبَحُوْا اِلَّا مُسِنَّة.» ❹

"یعنی جانور مت قربانی کرو مگر دو دانت والا۔"

مذکور شخص اگر فی الواقع اپنے قول و عمل میں سچا ہے تو نیت کے اعتبار سے قربانی کے اجر و ثواب سے محروم نہیں رہے گا۔ ان شاء اللہ۔ لیکن اس جانور کو بہ نیت قربانی ذبح کرنا ناجائز ہے۔

❶ صحیح مسلم، بَابُ سِنِّ الْاُضْحِيَّةِ، رقم: ۱۹۶۳

❷ صحیح البخاري (مع فتح الباري: ۱۰/ ۱۳) بَابُ سُنَّةِ الاُضْحِيَّةِ، رقم: ۵۵۴۵

❸ فتح الباري: ۱۰/ ۵

❹ صحیح مسلم، بَابُ سِنِّ الْاُضْحِيَّةِ، رقم: ۱۹۶۳

کیا ثنیہ (دو دانتے جانور) کے ہوتے ہوئے جذعہ کی قربانی جائز ہے؟

سوال: کیا ثنیہ (دو دانتے جانور) کے ہوتے ہوئے بغیر کسی شرعی عذر کے جذعہ (ایک سال کا جانور جس کے دانت گرے نہ ہوں) کی قربانی جائز ہے؟ جب کہ بخاری شریف میں ہے:

«قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ لَا تَذْبَحُوا إِلَّا مُسِنَّةً إِلَّا أَنْ يَعْسُرَ عَلَيْكُمْ فَتَذْبَحُوا جَذَعَةً مِنَ الضَّأْنِ» [1]

''نہ ذبح کرو مگر مسنہ، ہاں اگر تنگی ہو تو بھیڑ کا جذع کر سکتے ہو۔''

ناچیز کے نزدیک بخاری شریف کی مذکورہ حدیث کے مطابق اگر کسی بھی جانور کا ثنیہ میسر نہ ہو تو پھر صرف بھیڑ کا جذعہ جائز ہے کیونکہ بخاری کی حدیث زیادہ مفصل ہے۔ آپ احادیث کی روشنی میں وضاحت فرما دیں۔ (ابوطاہر نذیر احمد، عبدالرشید۔ کراچی) (۲۳ فروری ۲۰۰۱ء)

جواب: حدیث «لَا تَذْبَحُوْا...... الخ» ''صحیح بخاری'' کی بجائے ''صحیح مسلم'' میں ہے۔ حدیث ہذا میں اگرچہ تنگی کی صورت میں دنبے چھترے کے جذعہ (ایک سال کا) کی قربانی کی اجازت ہے۔ لیکن عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی روایت میں مطلقاً بھیڑ کے جذعہ کی قربانی کا ذکر ہے۔ [2]

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی سند کو قوی قرار دیا ہے۔ سنن ابی داؤد میں مجاشع کی مرفوع روایت میں بھی علی الاطلاق جذعہ کا جواز ہے۔ لیکن بیہقی کی روایت میں «جَذَعَةً مِنْ الضَّأْنِ» کی تصریح ہے اور ابوہریرہ کی روایت جو ترمذی میں ہے، کے مطابق ''بھیڑ کے جذعہ کی قربانی اچھی ہے۔'' یہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے لیکن معنی کے اعتبار سے صحیح ہے، ان احادیث کی وجہ سے جمہور اہل علم نے حدیث «لَا تَذْبَحُوْا...... الخ» کو استحباب اور افضلیت پر محمول کیا ہے چنانچہ عبارت یوں ہے:

«يُسْتَحِبُّ اَنْ لَا تَذْبَحُوْا اِلَّا مُسِنَّةً فَاِنْ عَجَزْتُمْ فَاذْبَحُوْا جَذْعَةً مِنَ الضَّأْنِ»

''یعنی تمہارے لیے مستحب یہ ہے کہ دو دانتا ذبح کرو، اگر ایسا کرنا تمہارے لیے مشکل ہو تو بھیڑ کا ایک سال کا بچہ (چھترا) ذبح کرلو۔''

لہٰذا عمومی استثنائی احادیث کے سبب جمہور مطلقاً (یعنی تنگی اور مشکل کے بغیر بھی) دنبے، چھترے کی قربانی کے جواز کے قائل ہیں، اور یہی بات زیادہ واضح ہے، برخلاف اس کے کہ صرف تنگی کی صورت میں «جَذَعَةً مِنْ الضَّأْنِ» کی اجازت دی جائے جو موقف آپ نے اختیار کیا ہے صاحب مرعاۃ المصابیح (۲/۳۵۳) نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔

---

[1] أيضًا

[2] سنن النسائی، بَابُ الْمُسِنَّةُ وَالْجَذَعَةُ(۲/ ۲۰۴)، رقم:۴۳۷۹، السنن الکبرٰی للبیهقی(۹/ ۲۷۰)

صرف تنگی کی صورت میں ''جذعہ'' جائز ہے۔لیکن سابقہ احادیث کی بنا پر مجھے اس میں تردّد ہے اور علامہ البانی رحمہ اللہ نے تو ابوالزبیر مدلس کی وجہ سے حدیث «لَا تَذْبَحُوْا اِلَّا مُسِنَّة......الخ» کی صحت سے انکار کیا ہے، کیونکہ اس نے اس حدیث کو جابر سے بصیغہ عن سے ذکر کیا ہے اور اصولِ حدیث میں یہ بات معروف ہے کہ مدلس راوی جب تک مروی عن سے تحدیث بیان کرنے یا سماع کی صراحت نہ کرے تو اس کی روایت قابلِ حجت نہیں ہوتی۔تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، سلسلة الاحادیث الضعیفة:١/١٦١۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ ''معلوم دنوں'' میں ذکر اللہ سے مراد یہ ہے کہ دس دن ابتدائے ذوالحجہ کے (قربانی کا دن) اور ایامِ تشریق (١٣ ذوالحجہ تک) ابن عمر اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہما ذوالحجہ کے ابتدائی دس دنوں کے دوران بازار جاتے تو تکبیرات کہتے، انھیں دیکھ کر عام لوگ بھی شروع کر دیتے۔محمد بن علی تو نفلی نماز کے بعد بھی کہتے۔

تکبیرات کا سلسلہ ابتدائے ذوالحجہ سے تیرہ تاریخ تک نمازوں کے بعد اور عام اوقات میں بھی جاری رہنا چاہیے۔ صحابہ کرام کا عمل اس کے مطابق تھا اور راجح مسلک یہی ہے۔

تعاقب از سید محمد قاسم شاہ صاحب بن پیر محبّ اللہ شاہ راشدی رحمہ اللہ

زبیر علی زئی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے شمارہ نمبر ٧ (٢٨ ذوالقعدہ ١٤٢١ھ) میں ''قربانی کے ضروری مسائل'' کے عنوان میں آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ: البانی نے ''صحیح مسلم'' کی روایت «لَا تَذْبَحُوْا اِلَّا مُسِنَّة......الخ» کو ابوالزبیر کی تدلیس کی وجہ سے ضعیف کہا ہے۔

اس کے متعلق عرض ہے کہ الشیخ الالبانی نے تو ''صحیح مسلم'' کی اور بھی بہت سی روایات کو ضعیف قرار دیا ہے۔اگر تدلیس کی وجہ سے مسلم شریف کی یہ روایت ضعیف ہو سکتی ہے تو اسی تدلیس کی وجہ سے اور بھی بہت سی روایات ''صحیح بخاری'' اور ''صحیح مسلم'' کی ضعیف ہو سکتی ہیں اور پھر ان متفقہ صحیح روایات کو ضعیف کرنے کا سلسلہ چل نکلا تو پھر صرف تدلیس کی وجہ سے ہی کیوں؟ صحیح البخاری اور صحیح المسلم میں ایسے بہت سے رواۃ ہیں، جن پر اہل علم نے کلام کیا ہوا ہے تو پھر وہ روایات بھی ساقط عن الاحتجاج ہو جائیں گی! اگر آپ فرمائیں گے کہ ان رواۃ کا دوسری جگہ پر وہ مقام نہیں جو بخاری اور مسلم میں ہے کیونکہ ان کی روایات کو بخاری و مسلم میں امت نے متفقہ طور پر ہی قبول کیا ہے، تو ان کی شرائط اور پرکھ کی وجہ سے اس میں تدلیس کی روایات بھی شامل ہیں وہ بھی احتجاج کے قابل ہیں۔

امید ہے کہ جواب عنایت فرمائیں گے۔اگر میں غلطی پر ہوں تب بھی صحیح بات سے مستفید فرمائیں گے۔

والسلام: احقر العباد ابواحسان اللہ۔محمد قاسم محبّ اللہ الراشدی الحسینی عفا اللہ عنہم

جوابِ تعاقب:

بلاشبہ ''صحیح بخاری'' اور مسلم کا مرتبہ و مقام اپنی جگہ مسلمہ ہے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ ان میں کئی ایک مدلس

راوی موجود ہیں۔ شارحین حدیث بالخصوص حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی عادت ہے کہ ''صحیح بخاری'' کے مدلس راوی پر وارد اعتراضات کا ''فتح الباری'' میں دفاع ہر ممکن صورت میں کرتے ہیں۔ دفاع کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ تدلیس قدح (ایک نقص) ہے، اس نسبت سے راوی کے معیوب ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے، اس نازک مسئلے کی اہمیت کے پیش نظر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کتاب تعریف اھل التقدیس بمراتب الموصوفین بالتدلیس لکھ کر اس کو خوب اجاگر کیا ہے۔ مرتبہ اولیٰ میں تینتیس وہ افراد ذکر کیے ہیں، جو بہت کم موصوف بالتدلیس ہیں۔ اور مرتبۂ ثانیہ میں بھی یہی گنتی ہے۔ ان سب راویوں کی امامت وجلالت مسلمہ ہے اور روایات میں وہ قلتِ تدلیس سے معروف ہیں جیسے سفیان ثوری ہیں، یا جس راوی کے بارے میں علم ہے کہ وہ صرف ثقہ سے تدلیس کرتا ہے، جس طرح سفیان بن عیینہ ہیں۔ ان حضرات کی تدلیس کو ائمہ فن نے قابلِ برداشت سمجھا ہے۔

پھر مرتبہ ثالثہ میں پچاس افراد کا تذکرہ ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کثرت سے تدلیس کرتے ہیں۔ ائمہ نے ان کی احادیث کو صرف اسی صورت میں قابلِ حجت سمجھا ہے کہ وہ سماع کی صراحت کریں (یعنی لفظ ''عــــن'' بولنے کی بجائے «سَمِعْتُ» کہیں) زیر بحث راوی ابوالزبیر مکی کا شمار بھی انہی لوگوں میں ہے اور اس نے مشارٌ الیہ حدیث «عن» کے لفظ سے بیان کی ہے، سماع کی صراحت نہیں۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ محدثین کے قواعد وضوابط کے مطابق اس کا جواب تلاش کیا جائے۔ اس صورت میں علامہ البانی رحمہ اللہ کی طرف سے وارد شبہ خود بخود زائل ہوسکتا ہے۔ اگر ''دارقطنی'' کے اعتراضات کے جوابوں کی ضرورت محسوس ہوسکتی ہے تو اس اعتراض کا رفع ہونا بھی ضروری ہے۔ مجھے امید ہے کہ علمی اسلوب میں آپ اس کی طرف توجہ فرمائیں گے۔ اس مسئلے کی مزید تفصیل تلمیذی عبدالرشید راشد حفظہ اللہ کی طرف سے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔

اس تعاقب کا جائزہ۔ (از مولانا عبدالرشید راشد)

موقر جریدے ''الاعتصام'' کے شمارہ نمبر ۷ (بتاریخ ۲۸ ذوالقعدہ ۱۴۲۱ھ) میں حضرت الاستاذ شیخ الحدیث حافظ ثناء اللہ صاحب مدنی متعنا اللہ بطول حیاتہ کا ایک مضمون ''قربانی کے ضروری مسائل'' کے عنوان سے طبع ہوا، جس میں حضرت نے ''صحیح مسلم'' کی معروف روایت: «لَا تَذْبَحُوْا اِلَّا مُسِنَّۃً اِلَّا اَنْ یُّعْسَرَ عَلَیْکُمْ فَتَذْبَحُوْا جَذْعَۃً مِنَ الضَّأْنِ» کی تضعیف محدث العصر علامہ البانی رحمہ اللہ کے حوالے سے نقل کی اور اس کی علت یہ بیان فرمائی کہ اس میں ابوالزبیر مکی مدلس راوی ہے اور یہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مذکورہ سند میں عنعنہ (لفظ عن) سے بیان کرتا ہے۔ اس لیے یہ حدیث ضعیف ہے۔

اس پر محترم محمد قاسم شاہ صاحب الراشدی بایں الفاظ معترض ہیں کہ:

''الشیخ البانی نے تو ''صحیح مسلم'' کی اور بھی بہت سی روایات کو ضعیف قرار دیا ہے۔''

بنظر انصاف غور فرمائیں کہ مذکورہ علت کا یہ جواب کس قدر مناسب ہے؟ کیونکہ اس وقت شیخ البانی ؒ کی شخصیت زیر بحث نہیں۔ جب کہ علم حدیث سے تعلق رکھنے والے حضرات شیخ البانی ؒ کی خدماتِ جلیلہ سے بخوبی آگاہ ہیں۔ البتہ خطاً وسہو سے کوئی بھی شخصیت مستثنیٰ نہیں۔

تصحیح وتضعیف سے متعلقہ علماء کے اقوال کو محدثین کے مسلمہ اصول حدیث کی روشنی میں دیکھنا چاہیے اور مسلمہ ومتفقہ اصول کی بنا پر ہی ان سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ اب پہلے ابو الزبیر مکی کے متعلق محدثین کے اقوال ملاحظہ فرمائیں۔ حافظ ابن حجر ؒ ''تقریب'' میں فرماتے ہیں کہ:

«صُدُوْقٌ اِلَّا أَنَّه يُدَلِّسُ»

حافظ ابن حجر ؒ نے ابوالزبیر مکی کو اپنی تالیف تعریف اهل التقديس بمراتب الموصوفين بالتدليس (ص:۱۰۸) میں مدلسین کے طبقہ ثالثہ میں ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے:

«مَشْهُوْرٌ بِالتَّدْلِيْسِ وَوَهِمَ الْحَاكِمُ فِي كِتَابِ عُلُوْمِ الْحَدِيْثِ فَقَالَ فِيْ سَنَدِهٖ: وَ فِيهِ رِجَالٌ غَيْرمَعْرُوْفِيْنَ بِالتَّدْلِيْسِ »» وَ قَدْ وَصَفَهُ النَّسَائِيُّ وَغَيْرُهُ بِالتَّدْلِيْس »

اس طبقہ کے مدلسین کے متعلق علماء کی راجح رائے یہی ہے کہ اگر یہ تحدیث کی صراحت کریں تو قابلِ حجت ہیں وگرنہ نہیں۔

امام سبط بن عجمی شافعی نے بھی ابوالزبیر کو مدلسین میں ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: التبيين لاسماء المدلسين، ص:۵۴۔ امام ذہبی فرماتے ہیں:

«وَ أَمَا اَبُوْ مُحَمَّدُ بْنِ حَزْمٍ، فَاِنَّهٗ يُرَدُّ مِنْ حَدِيْثِهٖ مَا يَقُوْلُ فِيْهِ «عَنْ جَابِرٍ» وَ نَحْوِهٖ لِاَنَّهٗ عِنْدَهُمْ مِمَّنْ يُدَلِّسُ»

البتہ اگر ابوالزبیر سے روایت کرنے والے اللیث بن سعد ہوں تو محدثین کے ہاں ابوالزبیر کا عنعنہ سے روایت کرنا بھی قابلِ حجت ہے۔ جس کی دلیل وہ قصہ ہے جسے امام ذہبی اور حافظ ابن حجر وغیرہ نے ذکر کیا ہے کہ سعید بن ابی مریم کہتے ہیں ہمیں اللیث نے بیان کیا کہ:

«جِئْتُ اَبَا الزُّبَيْرِ فَدَفَعَ اِلَيّ كِتَابَيْنِ فَانْقَلَبْتُ بِهِمَا ثُمَّ قُلْتُ فِيْ نَفْسِيْ: لَوْ عَاوَدْتُّهٗ فَسَأَلْتُهٗ أَسَمِعَ هٰذَا كُلَّهٗ مِن جَابِرٍ؟ فَسَأَلْتُهٗ فَقَالَ: مِنْهُ مَا سَمِعْتُ، وَ مِنْهُ مَا حَدَّثْتُ بِهٖ فَقُلْتُ: أَعْلِمْ لِيْ عَلٰى مَا سَمِعْتَ مِنْه فَأَعْلَمَ لِيْ عَلٰى هٰذَا الَّذِيْ عِنْدِيْ»

جہاں اس قصے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللیث بن سعد کی ابوالزبیر سے بیان کردہ روایات قابلِ صحت ہیں، وہاں اس سے ابوالزبیر کے مدلس ہونے کی شہادت بھی ملتی ہے۔

اگر کسی روایت میں تضعیف کی معقول علت موجود ہو تو اس کی صحت کے لیے صرف ''صحیح مسلم'' میں ہونا تو کافی نہیں۔اسی لیے امام ذہبی ''میزان الاعتدال'' (۳۹/۴) میں فرماتے ہیں:

« وَ فِی صَحِیحِ مُسْلِمٍ عِدَّةُ اَحَادِیْثَ مِمَّا لَمْ یُوَضِّحْ فِیْهَا اَبُو الزَّبِیر السَّمَاع مِنْ جَابِرٍ وَ لَا هِیَ مِنْ طَرِیْقِ اللَّیْثِ عَنْهُ فَفِی الْقَلْبِ مِنْهَا شَیْءٌ »

معلوم ہوتا ہے کہ ابو الزبیر کی تدلیس کی وجہ سے ہی امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کی روایات کو اپنی ''صحیح'' میں ذکر کرنے سے احتراز کیا ہے۔''صحیح بخاری'' میں ابو الزبیر کی صرف ایک ہی روایت کتاب البیوع میں موصول ذکر ہوئی ہے۔اور اس میں معروف تابعی عطاء نے ابوالزبیر کی متابعت کی ہے۔جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''ھدی الساری'' (ص:۴۶۴) میں اس کی صراحت کی ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''التہذیب'' میں بھی اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ

«حَدِیْثُهُ عِنْدَ الْبُخَارِیِّ مَقْرُوْنٌ بِغَیْرِهٖ »

اب ''صحیح مسلم'' کی وہ سند ملاحظہ فرمائیں جسے حضرت الاستاذ اور علامہ البانی رحمہ اللہ نے ضعیف کہا ہے:

« حَدَّثَنَا اَحْمَدُ بْنُ یُوْنُسَ حَدَّثَنَا زُهَیْرٌ حَدَّثَنَا اَبُو الزُّبَیْرِ عَنْ جَابِرٍ قَالَ...... الخ »

تلاش بسیار کے باوجود ہمیں کوئی ایسا طریق نہیں مل سکا جس میں ابوالزبیر کی حضرت جابر سے اس روایت میں سماع کی تصریح ہو اور ابوالزبیر سے بیان کرنے والے اللیث بن سعد بھی نہیں۔اب مذکورہ بحث کی روشنی میں آپ خود فیصلہ فرمائیں کہ شیخ البانی کا اسے ضعیف قرار دینا بے محل ہے؟ اور اس سے قبل امام ذہبی رحمہ اللہ کا مذکورہ بالا قول «فَفِی الْقَلْبِ مِنْهَا شَیْءٌ » کس حقیقت کی غمازی کرتا ہے؟

علمی اور ٹھوس حقائق کی روشنی میں ''صحیح مسلم'' کی کسی روایت سے اختلاف کا حق باقی ہے، البتہ مستشرقین اور آج کے ''دانش وروں'' کے صحیحین کو بلاوجہ تختہ مشق بنانے کی کسی طرح حمایت نہیں کی جاسکتی، محدثین کے مسلمہ ضوابط کی روشنی میں کسی روایت کے حکم میں اختلاف کرنے سے صحیحین کی تنقیص لازم نہیں آتی، جبکہ اس سے قبل علمائے امت نے صحیحین کی درج ذیل روایت کو علمی حقائق کی روشنی میں معلول قرار دیا ہے۔

« اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ تَزَوَّجَ مَیْمُوْنَةَ وَ هُوَ مُحْرِمٌ »[1]

امید ہے کہ حقائق کی روشنی میں ''صحیح مسلم'' کی مذکورہ بالا روایت کا حکم اصحاب بصیرت پر واضح ہو گا۔اگر کوئی صاحب علم مذکورہ سند میں ابوالزبیر کا حضرت جابر سے سماع ثابت کر دیں تو راقم ان کا ممنون ہوگا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں حقائق قبول کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔آمین۔(هٰذَا مَا عِنْدِیْ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.)

[1] صحیح البخاری، بَابُ تَزْوِیجِ الْمُحْرِمِ، رقم:۱۸۳۷

کیا صحیح میں مدلسین کی روایات قابلِ حجت نہیں ہیں؟ ❶

(ا) تعاقب از حضرت مولانا ابوالاشبال احمد شاغف، مکہ مکرمہ

محترم جناب حافظ ثناء اللہ مدنی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

۲۵ مئی کے ''الاعتصام'' میں حدیث «لَا تَذْبَحُوْا اِلَّا مُسِنَّة......الخ» پر اعتراض اور اس کا جواب پڑھا۔ یہ ایک علمی بحث ہے جو تحقیق کی متقاضی ہے۔ تقلید اور محض جذبات سے اسے حل کرنا جہالت نہیں تو نادانی ضرور ہے۔

صحیحین پر اعتراضات کا سلسلہ قدیم بھی ہے اور جدید بھی۔ ابو الحسن الدارقطنی وغیرہ کے اعتراضات کا جواب تو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''ھدی الساری'' میں بالتفصیل دے دیا ہے۔ اور حافظ کے جوابات سے ظاہر ہوتا ہے کہ دارقطنی رحمہ اللہ وغیرہ نے غلط فہمی کی بناء پر امام بخاری رحمہ اللہ وامام مسلم رحمہ اللہ پر اعتراضات کا باب کھولا اور بعد میں آنے والوں نے اپنی جہالت کا ثبوت دیا۔

ایک اصولی بات ہے کہ امام بخاری ومسلم نے ''صحیحین'' کو مرتب کرتے ہوئے التزام صحت کو ملحوظ ہی نہیں رکھا بلکہ تصنیف کے بعد انھیں بڑے بڑے ائمۂ فن کے سامنے پیش کیا اور ان ائمۂ فن نے ان کی صحت کی تصدیق وتحسین کی پھر انھوں نے اس کی تحدیث کی اور امت مسلمہ نے تلقی بالقبول سے نوازا۔

اعتراض کرنے والے چاہے امام دارقطنی ہوں یا شیخ ناصر الدین البانی یا اور کوئی محدثِ زمان یہ سارے امام بخاری ومسلم کے سامنے بونے نظر آتے ہیں۔

ذرا سوچئے اور غور کیجیے کہ جو شخص سات لاکھ حدیثوں کا حافظ ہو نیز ان کے راویوں اور علل وغیرہ سے بھی واقف ہو اس پر کوئی مقلد اعتراض کرنا شروع کردے تو اس کو جہالت ہی سے تعبیر کیا جائے گا۔ ''صحیح مسلم'' کی حدیث «لَا

❶ صحیح بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ میں حدیث ہے کہ ''جب ''حاکم'' کسی فیصلے میں اجتہاد سے کام لے اور اس کا اجتہاد درست ہو تو اس کے لیے دو اجر ہیں اور اگر کسی فیصلے میں اس کا اجتہاد غلط ہو جائے تو اس کے لیے ایک اجر ہے۔'' ...... اہل علم، فقہاء اور مجتہدین کا مختلف فقہی مسائل میں اختلاف اسی حدیث کے تناظر میں دیکھا جانا چاہیے...... ۲۵ مئی ۲۰۰۱ء کے ''الاعتصام'' میں شیخ الحدیث حضرت مولانا حافظ ثناء اللہ خان مدنی صاحب حفظہ اللہ نے ''صحیح مسلم'' کی ایک حدیث کو اپنی تحقیق کے مطابق راوی ابوالزبیر کی تدلیس کی وجہ سے ناقابلِ حجت قرار دیا تھا، جب کہ دیگر کئی ایک اہل علم کے نزدیک یہ موقف درست نہیں ہے...... دراصل صحیحین کی مدلسین سے مروی احادیث کے قبول اور عدمِ قبول میں اگرچہ علمائے سلف میں اختلاف رہا ہے مگر اکثر اہل علم وتحقیق کی رائے یہی ہے کہ کی ارجحیت اور امامین جلیلین کی صحت و نقل حدیث میں حد درجہ احتیاط کی وجہ سے وہ قبولیت کا درجہ رکھتی ہیں...... اسی موقف کی بناء پر ''الاعتصام'' کو چند حضراتِ علم و ماہرین فن حدیث کی طرف سے تنقیدیں وتحقیقی مضامین موصول ہوئے ہیں جو علمی دیانت وامانت کے تقاضوں کے پیش نظر قارئین ''الاعتصام'' کی نذر کیے جارہے ہیں؟ (ادارہ)

تَذْبَحُوْا اِلَّا مُسِنَّۃ......الخ» پر غالباً ''دارقطنی'' وغیرہ نے اعتراض نہیں کیا۔ (وَاللّٰہُ تَعَالٰی اَعْلَمُ)۔ البتہ البانی صاحب رحمہ اللہ اور پھر ان کے عقیدت مندوں نے جی بھر کر اسے اچھالنا شروع کر دیا اور یہ بازار اب تک گرم ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

میں نے البانی صاحب کی بہت سی علمی غلطیوں پر ان کی جو کتابیں میرے پاس ہیں ان پر بطورِ تنبیہ کچھ لکھ رکھا ہے۔ دس بارہ سال قبل جب وہ جدہ تشریف لائے تو میں نے اس کی نقل انھیں پیش کی کہ آئندہ ایڈیشن میں تصحیح کر لیں۔ لیکن غالباً وہ سمجھ نہ سکے۔

البانی صاحب تو اپنے رب سے جا ملے، ان کے مقلدوں سے سوال ہے کہ امام مسلم کو یہ معلوم تھا یا نہیں کہ ابوالزبیر مدلس ہے؟ اگر جواب نفی میں ہے تو جہالت۔ اور اثبات میں ہے تو ان کی روایتوں پر جو ''صحیح مسلم'' میں ہیں اعتراض صحیح نہیں۔ بلکہ امام مسلم نے ان کی وہی روایتیں صحیح میں شامل کی ہیں، جن کی صحت مسلّم تھی اور ان میں کوئی علت نہیں کیونکہ شرطِ صحیح اس کی متقاضی ہے۔ لہٰذا معترضین کو اعتراض سے قبل ان کے جمیع طرق سے واقفیت ضروری ہے ورنہ اعتراض جائز نہیں۔ چاہے معترض دارقطنی ہوں یا ابن حزم والبانی، کسی کے لیے جائز نہیں۔

البانی صاحب کے مقلدین غالباً اس سے باخبر ہوں گے کہ محدثین نے کتب احادیث پر مستخرجات کا التزام کیا ہے اور خاص طور سے صحیحین پر کئی مستخرجات ہیں۔ نیز مستخرجات کے فوائد سے بھی واقف ہوں گے۔ لہٰذا صحیحین پر اعتراض کرنے سے قبل ان مستخرجات کی طرف رجوع کر لینا چاہیے۔ اس وقت میرے پاس مسند ابی عوانہ مخطوط (قلمی نسخہ) اور کچھ مطبوع موجود ہیں یہ کتاب مستخرج علی صحیح مسلم ہے۔ اس کی مطبوعہ جلدوں میں سے پانچویں جلد کے ص: ۲۸۷ اور ص: ۲۸۸ پر اس حدیث زیر بحث کی بعض اسانید مذکور ہیں اور ص: ۲۸۸ پر ہے: رَوَاہُ مُحَمَّدُ بْنُ بَکْرٍ عَنِ ابْنِ جُرَیْجٍ حَدَّثَنِی اَبُو الزُّبَیْرِ أَنَّہ سَمِعَ جَابِرًا یَقُوْلُ و ذکر الحدیث » یہ طریق معلق ہے یہاں مصنف نے بالکل امام بخاری کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ امام بخاری نے اپنی ''صحیح'' کے اکثر مقامات پر تحدیث و سماع ثابت کرنے کے لیے اسی طرح کیا ہے۔

معلوم ہوا کہ ابوالزبیر نے حضرت جابر سے اس حدیث کو سنا ہے۔ امام مسلم کو اس کی خبر تھی۔ انھیں کیا خبر تھی کہ ایک دور ایسا بھی آئے گا کہ وہ شخص بھی ان پر اعتراض کرنے کھڑا ہو جائے گا۔ جو ان کی پشم کے برابر نہیں ہوگا۔ بہر حال امام مسلم کی یہ حدیث بالکل صحیح ہے۔ اس پر اعتراض کرنے والوں کی نادانی کہہ لیجیے یا جہالت۔

یہ چند سطور دفاعِ صحیحین کے سلسلہ میں لکھی گئی ہیں اگرچہ اس میں کچھ تلخی بھی ہے لیکن میں صحیحین پر اعتراض برداشت نہیں کرتا۔ چاہے وہ کسی کے قلم سے ہو۔ امید ہے کہ آپ غور فرمائیں گے۔

(ابوالاشبال احمد شاغف) (۲۲ جون ۲۰۰۱ء)

(۲) صحیحین میں مدلسین کی روایات اور حدیث مسنہ (از حضرت مولانا ارشاد الحق اثری، فیصل آباد)

صحیح مسلم شریف، ص:۱۵۵، ج:۲، میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

«لَا تَذْبَحُوْا اِلَّا مُسِنَّةً اِلَّا اَنْ يُّعْسَرَ عَلَيْكُمْ فَتَذْبَحُوْا جَذْعَةً مِنَ الضَّأْنِ» ❶

''قربانی میں نہ ذبح کرو مگر مسنہ ہاں اگر تنگی ہو تو بھیڑ کا جذعہ کرلو۔''

اس روایت کے بارے میں حافظ ابن حزم، علامہ البانی اور ہمارے محترم مولانا حافظ ثناء اللہ صاحب مدنی مدظلہ العالی کی رائے ہے کہ یہ روایت ضعیف ہے۔ کیونکہ ''ابو الزبیر'' راوی مدلس ہے اور روایت معنعن ہے۔ اسی پر جناب مولانا محمد قاسم الراشدی پیر آف جھنڈا رحمہ اللہ جو ماشاء اللہ اپنے آباؤ اجداد کی وراثت علمی کے وارث ہیں۔ نے تعاقب کیا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

''ابوزبیر ہی نہیں اور بھی ''صحیح بخاری'' و ''صحیح مسلم'' میں مدلسین کی روایات ہیں۔ تو وہ بھی ضعیف ہیں بلکہ صحیحین میں کئی راوی ہیں جن پر اہل علم نے کلام کیا ہے تو کیا وہ بھی ساقط عن الاحتجاج ہوں گی؟ صحیحین میں ان کی روایات صحیح ہیں تو مدلسین کی روایات بھی صحیح ہیں۔''

اس کے جواب میں محترم مولانا حافظ ثناء اللہ صاحب مدنی اور پھر ان کے تلمیذ رشید مولانا عبدالرشید راشد صاحب نے جو کچھ لکھا، قارئین کرام اس کی تفصیل ''الاعتصام'' ج:۵۳، شمارہ نمبر:۱۹ (۲۵ مئی ۲۰۰۱ء) میں ملاحظہ فرمائیں۔ خلاصہ کلام یہ کہ ''ابوالزبیر مدلس ہے۔ صحیحین پر امام دارقطنی کے اعتراضات کے جواب کی ضرورت ہے تو اس اعتراض کا رفع کرنا بھی ضروری ہے۔ علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے تو فرمایا ہے کہ ''صحیح مسلم'' میں متعدد روایات ہیں جن میں ابوالزبیر نے جابر سے سماع کی صراحت نہیں کی:

« فَفِي الْقَلْبِ مِنْهَا شَيْءٌ » ❷

''اور مسلم کی اس روایت میں بھی ابوالزبیر مدلس ہے۔ صراحتِ سماع ثابت نہیں۔''

امام دارقطنی رحمہ اللہ کے اعتراضات کی نوعیت کیا ہے؟ اس کی تفصیل یہاں غیر ضروری ہے۔ تاہم صحیحین کی عظمت و رفعت کی بناء پر ہی علماء نے ان کے جوابات بھی دیے۔ اسی طرح مدلسین و مختلطین کے بارے میں جو اعتراضات ہیں، ان کے جوابات بھی دیے گئے اور انہی میں سے ایک جواب یہ ہے کہ متقدمین محدثین نے جن روایات میں انقطاع یا عدم سماع کی صراحت نہیں کی ان میں سے صحیحین کے مدلسین کی روایات، بالخصوص وہ جو اصول میں مروی ہیں۔ محمول علی السماع ہوں گی۔ جس کی تفصیل ''توضیح الکلام'' (۲:ص:۲۹۵، ۴۶۴) وغیرہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

---

❶ صحیح مسلم، بَابُ سِنِّ الْأُضْحِيَةِ، رقم:۱۹۶۳

❷ میزان الاعتدال: ٤/ ٣٩

علامہ ابن دقیق العید رحمہ اللہ اور علامہ المزی رحمہ اللہ نے اس بارے کچھ شبہات کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے صحیحین میں مدلسین کی بعض روایات میں صراحت سماع ثابت نہیں۔ مگر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

«لَيْسَتِ الاَحَادِيْثُ الَّتِيْ فِي الصَّحِيحَيْنِ بِالْعَنْعَةِ عَنِ الْمُدَلِّسِيْنَ كُلّهَا فِي الاِحْتِجَاجِ فَيُحْمَلُ كَلَامُهُمْ هُنَا عَلَى مَا كَانَ مِنْهَا فِي الْاِحْتِجَاجِ فَقَطْ، وَ أَمَّا مَا كَانَ فِي الْمُتَابِعَاتِ فَيَحْتَمِلُ اَنْ يَّكُوْنَ حَصَلَ التَّسَامُحُ فِي تَخْرِيْجِهَا كَغَيْرِهَا ......» ❶

''صحیحین میں مدلسین کی معنعن روایات تمام کی تمام ایسی نہیں جن سے احتجاج و استدلال کیا گیا ہے اور جن حضرات نے کہا ہے کہ صحیحین میں مدلسین کی معنعن روایات محمول علی السماع ہیں۔ تو اس سے مراد وہی روایات ہیں جن سے استدلال کیا گیا ہے۔ البتہ وہ روایات جو متابعات میں ہیں، تو ان کے بارے میں احتمال ہے کہ ان میں تسامح ہوا ہو جیسا کہ دوسری متابعات میں تسامح ہوا ہے۔

امام مسلم رحمہ اللہ دوسرے طبقہ کے راویوں سے بھی متابعات میں روایت لیتے ہیں۔ جیسے ان کی روایات اور طبقہ اولیٰ کے راویوں کی روایات میں فرق ہے، یہی فرق استدلالاً و احتجاجاً روایت میں اور اس کی متابعات میں مدلسین کے بارے میں بھی ملحوظ رکھنا چاہیے۔''

متقدمین محدثین رحمہم اللہ کے پیش نظر لاکھوں احادیث بالکل سامنے اور آنکھوں سے دیکھنے کی بات تھی۔ جیسا کہ ان کے تراجم میں کہا گیا ہے: «كَأَنَّ السُّنَنَ بَيْنَ عَيْنَيْهِ» وہ حضرات اگر کسی روایت میں انقطاع و تدلیس کا حکم لگائیں تو اس کی نوعیت اور ہے۔ حافظ ابن حزم یا متاخرین میں کسی کا یہ فیصلہ بہر نوع محل بحث ونظر ہے۔

حافظ ابن حزم رحمہ اللہ کا اپنی تمام تر وسعتِ نظر کے باوجود نقد و جرح میں وہ مقام نہیں جو ائمہ متقدمین کو حاصل ہے۔ جس کا کسی بھی صاحبِ علم کو انکار نہیں۔ ضرورت محسوس ہوئی تو اس کے بارے میں بھی شواہد پیش کردیے جائیں گے۔ ان شاء اللہ

علامہ ذہبی اور مسلم میں مدلس کی معنعن روایت

علامہ ذہبی رحمہ اللہ کی قدر ومنزلت سے کون واقف نہیں؟ انھوں نے بھی ''صحیح مسلم'' میں ابوالزبیر کی معنعن روایت پر عدم اطمینان کا اظہار فرمایا اور بطورِ دلیل ''صحیح مسلم'' کی تین احادیث بھی ذکر کردیں جو حسب ذیل ہیں:

۱۔ «لَا يَحِلُّ لِأَحَدِكُمْ أَنْ يَحْمِلَ بِمَكَّةَ السِّلَاحَ»

۲۔ رَأَى عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ اِمْرَأَةً فَاَعْجَبْتُه فَأَتَى أَهْلَهُ زَيْنَبَ

❶ النكت على ابن الصلاح، ج:۲، ص:٦٣٦

۳۔ اَلنَّهْيُ عَنْ تَجْصِيْصِ الْقَبْرِ ❶

حالانکہ تیسری روایت جو ''صحیح مسلم'' (ج:۱،ص:۳۱۲) میں «حفص بن غیاث عن ابن جریج عن ابی الزبیر عن جابر» کی سند سے معنعن مروی ہے، خود ''صحیح مسلم'' ہی میں اس کے بعد «حجاج بن محمد و عبدالرزاق عن ابن جریج قال أخبرنی ابوالزبیر أنه سَمِعَ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ» سے صراحت سماع کے ساتھ بھی مروی ہے۔

تعجب ہے کہ علامہ ذہبی سے یہ بات مخفی کیسے رہی؟ علامہ کوثری نے مقالات میں اسی روایت کو ابوالزبیر کی تدلیس کی بناء پر ضعیف قرار دیا مگر علامہ البانی رحمہ اللہ نے ''تحذیر الساجد'' ص:۲۹ میں ان کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ ''صحیح مسلم'' اور ''مسند احمد'' میں تحدیث ثابت ہے بلکہ سلیمان بن احمد نے اس کی متابعت بھی کی ہے۔ تفصیل ''تحذیر الساجد'' میں ملاحظہ فرمائیں۔

دوسری حدیث ''صحیح مسلم'' (ج:۱،ص:۴۴۹) میں «اَبـو الـزُّبَيْر عَنْ جَابِرٍ» کی سند سے مذکور ہے۔ حالانکہ مسند امام احمد (ج:۳،ص:۳۴۸) میں یہی روایت «ابن لهيعة عن ابی الزبير قَالَ أَخْبَرَنِی» کی سند سے مروی ہے جس سے سماع کی صراحت ثابت ہوتی ہے۔ اور مسند (ج:۳،ص:۳۴۱) میں «ابن لهيعة ثَنَا أَبو الزُّبَيْرِ عَنْ جَابِرٍ» کی سند سے بھی مروی ہے، جس میں ابن لھیعہ کی صراحت سماع منقول ہے۔ مزید برآں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت کا شاہد حضرت ابو کبشہ رضی اللہ عنہما انماری سے ثابت ہے جسے امام احمد (مسند، ج:۴،ص:۲۳۱) وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ اس لیے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی یہ روایت بھی صحیح ہے۔ ضعیف نہیں۔

پہلی روایت صحیح مسلم (ج:۱،ص:۴۳۹)، کتاب الحج میں منقول ہے۔ جو «مَعْقَل عَنْ اَبِی الزُّبَيْرِ عَن جَابِرٍ» کی سند سے مروی ہے۔ مگر یہی روایت ''مسند احمد'' (ج:۳،ص:۳۱۰، ۳۹۳) میں «موسٰی و حسن کلاهما عَنِ ابْنِ لِهْيعَة اَنَا وَ اَبُو الزُّبَيْرِ قَالَ وَ أَخْبَرَنِیْ جَابِرٌ» اور ایک سند میں «أَنَّ جَابِرًا أُخْبَرَهُ» کی سند سے منقول ہے۔ جس میں صراحت سماع منقول ہے۔ مگر اس میں تحریم مدینہ کا اشارہ ہے، ''مکۃ'' کی حرمت میں صراحتاً ذکر نہیں۔ نیز یہ روایت امام مسلم نے تحریم مکہ کے بیان میں حضرت ابوہریرہ، حضرت عمرو بن سعید اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مفصل روایت کے بعد گویا متابعت میں ذکر کی ہے۔ اس لیے اپنی اصل کے اعتبار سے یہ روایت بھی ضعیف نہیں۔ تعجب ہے کہ علامہ البانی رحمہ اللہ نے ''صحیح الجامع'' (رقم:۶۴۵، ج:۲،ص:۱۲۶۶) میں اسی روایت کو ذکر کر کے گویا اس پر صحیح کا حکم لگایا مگر اس کے لیے انھوں نے مزید مختصر مسلم، رقم:۶۷۷ کا حوالہ دیا۔ جب کہ مختصر مسلم للمنذری میں حافظ ذہبی رحمہ اللہ کے حوالہ سے ابوالزبیر کی تدلیس پر اعتراض نقل کیا ہے، اس کو صحیح نہیں کہا۔ حالانکہ یہ اعتراض بھی درست نہیں۔ ابن لھیعہ کی روایت

❶ المیزان، ج:٤، ص:۳۹

ہیں صراحت سماع ثابت ہے۔ وہ فی نفسہ ثقہ وصدوق ہے اختلاط کے باعث اس پر کلام ہے اور جن حضرات نے اس سے اختلاط سے پہلے سنا ہے، ان کی احادیث حسن بلکہ صحیح قرار دی گئی ہیں اور شواہد و متابعات میں بھی جب اس کی روایت مقبول ہے، وہ مدلس کے سماع کی صراحت کردے تو یہ صراحتِ سماع مردود کیوں ہے؟ بلاشبہ ثبوت سماع کے لیے سند کی صحت ضروری ہے مگر مدلس کا اپنے استاد سے سماع تو ہوتا ہے۔ لیکن تدلیس کی وجہ سے اس کی معنعن روایت قابل قبول نہیں ہوتی۔ اور جب ابن لھیعہ نے جو فی نفسہ ثقہ وصدوق راوی ہے، صراحت سماع کردی تو وہ مقبول ہونی چاہیے نہ کہ مردود۔

غور فرمائیے کہ مسند امام احمد (ج:۳،ص:۳۴۷) کے حوالے سے ''صحیح مسلم'' کی تائید میں جو روایت ہم پیش کر آئے ہیں، علامہ البانی رحمہ اللہ نے اسے ''السلسلة الصحیحة ،رقم:۲۹۳۸، (ج:۶،ص:۱۰۵۲) میں ذکر کیا ہے۔ اس کے بارے فرماتے ہیں:

«رِجَالُ اِسْنَادِهِ ثِقَاتٌ رِجَالُ مُسْلِمٍ غَیْرَ ابْنِ لَهِیْعَةَ وَهُوَ ثِقَةٌ لٰکِنَّهٗ سَیِّءُ الْحِفْظِ»

اس کے بعد انھوں نے ''صحیح مسلم'' کی وہی روایت ذکر کی ہے جس پر مختصر صحیح مسلم للمنذری کے حاشیہ میں علامہ ذہبی رحمہ اللہ کا کلام نقل کیا ہے اور ابو الزبیر کے عنعنہ پر عدم اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ جیسا کہ باحوالہ ہم پہلے نقل کر آئے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

« وَلِحَدِیْثِ التَّرْجُمَةِ مُتَابِعٌ بِسَنَدٍ صَحِیْحٍ عَنْهُ وَ هُوَ مَعْقَلُ بْنُ عُبَیْدِ اللّٰهِ الْجَزَرِیُّ عَنْ اَبِی الزُّبَیْرِ عَنْ جَابِرٍ مَرْفُوْعًا بِلَفْظِ مُسْلِمٍ وَ مِنْ طَرِیْقِهِ الْبَغَوِیِّ فِی شَرْحِ السُّنَّةِ وَ ابن حِبَّان وَ مَعْقَل هٰذَا فِیْهِ کَلَامٌ مِنْ قِبَلِ حِفْظِهٖ، قَالَ الْحَافِظُ فِی التَّقْرِیْبِ: صُدُوْقٌ یُخْطِیُٔ فَقَدْ خَالَفَ ابْنَ لَهِیْعَةَ فِیْ قَوْلِهٖ عَنِ اَبِی الزُّبَیْرِ: أَخْبَرَهُ جَابِرٌ، وَ قَوْلُهٗ: الْمَدِیْنَة، مَکَانَ مَکَّةَ وَ مِنَ الصَّعْبِ تَرْجِیْحُ أَحَدِ الْقَوْلَیْنِ عَلَی الآخَرِ وَ لَعَلَّ الرَّاجِحَ الْجَمْعُ بَیْنَهُمَا » [1]

''یعنی اس حدیث کا سند صحیح سے متابع ہے اور وہ معقل بن عبید اللہ عن ابی الزبیر عن جابر کی سند سے یہ الفاظ ہیں: «لَا یَحِلُّ لِاَحَدٍ اَنْ یَحْمِلَ بِمَکَّةَ السَّلَاحَ» جسے امام مسلم، بغوی اور ابن حبان نے روایت کیا ہے۔ معقل میں حافظہ کی بناء پر کلام ہے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''تقریب'' میں صدوق یخطی کہا ہے اور اس نے ابن لھیعہ کی مخالفت کی ہے۔ ابن لھیعہ، ابوالزبیر سے «اَخْبَرَهُ جَابِرٌ» کہتے ہیں اور ''مکة'' کی جگہ ''المدینة'' کہتے ہیں۔ دونوں میں سے کسی ایک قول کو ترجیح دینا مشکل ہے اور شاید دونوں کو جمع کرنا راجح ہے۔''

[1] سلسلة الصحیحة ،ج:٦، ص:١٠٥٣، ١٠٥٤

اس کے بعد دونوں کے شواہد ذکر کیے ہیں۔ اب بتائیے کہ اختلاف کے باوجود دونوں کو ایک دوسرے کا متابع کہنا چہ معنی دارد؟

ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ امام مسلم رحمہ اللہ نے تو حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہی حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابن عباس کی روایت کی تائید میں بیان کی۔ تائید و متابعت کا وہ حکم نہیں جو احتجاج و استدلال کی روایت کا ہوتا ہے۔ تاہم ابن لهیعہ نے اس میں صراحتِ سماع کی ہے گو متن میں کچھ فرق ہے۔ نیز اس سے یہ بات بھی مترشح ہوتی ہے کہ علامہ البانی رحمہ اللہ بھی بالآخر ''صحیح مسلم'' کی اس روایت کو درست قرار دیتے تھے۔ ''صحیح الجامع الصغیر'' میں ذکر کرنا بھی اس کا مؤید ہے۔

امام مسلم رحمہ اللہ کے علاوہ امام ابن حبان نے بھی اپنی ''الصحیح'' میں یہ روایت ذکر کی اور ''مقدمة الصحيح'' (ص:۹۰) میں انھوں نے صراحت کی ہے کہ میں نے مدلسین کی وہی روایات اپنی اس کتاب میں ذکر کی ہیں جن میں سماع ثابت ہے۔ ان کی یہ وضاحت کرنا بھی دلیل ہے کہ اس روایت میں ابوالزبیر کا سماع ثابت ہے۔

اس طرح علامہ البانی رحمہ اللہ نے دوسری حدیث کو بھی «الصحيحة» (رقم:۲۳۶) میں ذکر کیا ہے۔ چنانچہ ''مسند احمد'' وغیرہ کے حوالہ سے اولاً حضرت ابوکبشہ رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی اور اس کے راویوں کو ثقہ وصدوق قرار دیا اور بطورِ شاہد ''صحیح مسلم'' وغیرہ سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کی اور کہا:

« وَ أَبُو الزُّبَيْرِ مُدَلِّسٌ وَقَد عَنْعَنه لٰكِنْ حَدِيْثُهٗ فِي الشَّوَاهِدِ لَا بَأْسَ بِهٖ لَا سِيَّمَا وَقَدْ صَرَّحَ بِالتَّحْدِيْثِ فِي رِوَايَةِ ابْنِ لَهِيْعَةَ عَنْه ، وَ اَمَّا مُسْلِمٌ فَقَدْ اِحْتَجَّ بِهٖ » [1]

''ابوزبیر مدلس ہے اور اس نے اسے معنعن ذکر کیا ہے، لیکن اس کی حدیث شواہد کے طور پر ذکر کرنے میں کوئی حرج نہیں خصوصاً جب کہ ابن لهیعۃ کی اس سے روایت میں تصریح سماع ہے اور امام مسلم نے اس سے استدلال کیا ہے۔''

بتلائیے! ابن لهیعہ کی بیان کردہ صراحتِ سماع کو قبول کیا ہے یا نہیں؟ علامہ البانی رحمہ اللہ کا اپنا ذوق تھا۔ محدثین سابقین کے برعکس بسا اوقات پہلے ضعیف اور متکلم فیہ سند ذکر کرتے ہیں۔ پھر اس کے متابع اور شواہد جو اس سے اعلیٰ سند سے مروی ہوں، ان کو نقل کرتے چلے جاتے ہیں اور یوں بالآخر اس کی صحت کا فیصلہ صادر فرماتے ہیں۔ جیسا کہ اسی روایت میں آپ دیکھ رہے ہیں۔ ابوکبشہ رضی اللہ عنہ کی روایت کو اولاً ذکر کیا۔ ازہر بن سعید تابعی کو ابن حبان اور العجلی کے قول کی بناء پر ثقہ قرار دیا۔ حالانکہ وہ خود ان کو متساہل قرار دیتے ہیں۔ اور کئی مقامات پر ان کی توثیق کی تردید کر دیتے۔ جس کی تفصیل کا یہ محل نہیں۔ پھر اس کی تائید میں بطورِ شاہد ''صحیح مسلم'' کی حدیث ذکر کی ہے۔

[1] سلسلة الصحيحة ، رقم:۲۳۵

اسی طرح «الصحیحة»(رقم:۲۳٦۸) میں پہلے «اَلْمنتخب، مسند عبد بن حمید» سے «اَلْمَرءُ فِیْ صَلَاتِہٖ مَا انْتَظَرَھَا »، « حماد بن شعیب الحمانی عن ابی الزبیر عن جابر» کی سند سے ذکر کی اور فرمایا کہ یہ سند ضعیف ہے کیونکہ ابو زبیر مدلس اور حماد ضعیف ہے۔ پھر فرمایا کہ اس کی متابعت ثابت ہے۔ چنانچہ اس کے بعد «ابن لهیعة ثَنَا اَبو الزُّبَیْرِ قَالَ : سَاَلْتُ جَابِرًا »کی سند سے یہ روایت ذکر کی ہے اور فرمایا: «رِجَالُهُ ثِقَاتٌ غَیْرَ اَنَّ ابْنَ لِهیَعَة سَیِّءُ الْحِفْظِ »اس کے راوی ثقہ ہیں سوائے ابن لھیعہ کے وہ سی ءالحفظ ہے۔ پھر فرماتے ہیں، لیکن اس کی متابعت منقول ہے چنانچہ اس کے بعد ''مسند احمد'' سے «الاعمش عَن اَبِی سُفْیَانَ عَنْ جَابِرٍ »کی مسند سے اسے ذکر کیا ورفرمایا: «هٰذَا اِسْنَادٌ صَحِیْحٌ عَلٰی شَرْطِ مُسْلِمٍ» کہ اس کی سند شرط مسلم پر صحیح ہے۔

غور فرمایئے بات کیا ہوئی اور پھر ابن لھیعہ کی بیان کردہ صراحت سماع کو قبول کیا یا نہیں؟ اگر تصریح سماع کا اعتبار نہیں تو ابن لھیعہ کے حافظہ کی کمزوری کو ہی ذکر کیوں کیا؟ ابو زبیر کی تدلیس کا ذکر بھی ہونا چاہیے تھا۔

اس ساری تفصیل سے یہ بات نصف النہار کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے ''صحیح مسلم'' کی جن تین روایات کے بارے میں ابو الزبیر کی تدلیس کی بناء پر عدم اطمینان کا اظہار فرمایا وہ تینوں صحیح ہیں، بلکہ ان میں سماع بھی ثابت ہے۔ جب علامہ ذہبی رحمہ اللہ ایسے نابغہ شخصیت کا یہ خدشہ درست نہیں تو متاخرین میں سے کسی کا ایسا حکم کیونکر قابلِ اعتناء ہوسکتا ہے۔ امام مسلم رحمہ اللہ کا تتبع بہر حال مقدم ہے۔ صحیحین میں مختلط اور متکلم فیہ راویوں کی احادیث کا انتخاب اور ان کے بارے میں امام بخاری و مسلم کی احتیاط پر اعتماد ہے تو مدلسین کے بارے میں ہی بے اعتمادی کیوں ہے ؟ متاخرین میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ وغیرہ نے مدلسین کی معنعن روایات میں سماع کا تتبع کیا ہے تو یہ مزید اطمینان قلب کے طور پر ہے، ان کو ضعیف یا نا قابلِ اعتماد ٹھہرانے کی بناء پر نہیں۔

حدیث مسنہ

حدیث مسنہ ہی کو لیجیے امام مسلم رحمہ اللہ کے علاوہ امام ابن خزیمہ نے بھی اپنی ''الصحیح'' (ج:۴،ص:۲۹۵) میں نیز ''المنتقی ابن الجارود (رقم: ۹۰۴) ''ابوعوانہ'' (ج: ۵ ص: ۲۲۷) ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، مسند احمد ابو یعلی اور بیہقی میں موجود ہے۔ علامہ البانی رحمہ اللہ نے امام ابن حزم رحمہ اللہ کی اقتداء میں اسے ابو الزبیر کی تدلیس کی بناء پر ضعیف قرار دیا۔ علامہ البانی رحمہ اللہ کے تلامذہ بھی عموماً انہی کی تحقیق پر اعتماد کرتے ہوئے اسے ضعیف قرار دیتے ہیں۔

خود ہیچمدان ایک عرصہ پہلے ان کا ہمنوا تھا۔ چنانچہ انتیس سال قبل فروری ۱۹۷۲ء کے دو شماروں میں انہی خیالات کا اظہار کیا گیا تھا۔ مگر مزید تتبع و تحقیق سے ان خیالات سے اب اتفاق نہیں۔ اس لیے کہ امام ابوعوانہ نے اپنی ''مسند'' میں جو دراصل ''صحیح مسلم'' پر مستخرج ہے۔ ابو الزبیر کے سماع کی صراحت کی۔ چنانچہ زہیر عن ابی الزبیر کی مختلف اسانید ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

«وَ رَوَاه محمد بن بكر عن ابن جريج حَدَّثَنِیْ اَبُو الزُّبَيْرِ أَنَّهُ سَمِعَ جَابِرًا يَقُوْلُ، وَ ذَكَرَ الْحَدِيْث » ❶

بتلایئے تصریح سماع اور کسے کہتے ہیں؟

مگر یہاں دو اشکال ہیں، جن کا اظہار علامہ البانی رحمہ اللہ نے «الصحیحة» ❷ کے تحت کیا ہے۔ ایک یہ کہ یہ سند معلق ہے۔ جس سے استدلال صحیح نہیں، دوسرا یہ کہ یہاں غالباً ناقل یا طابع سے سہو ہوا ہے۔ امام مسلم رحمہ اللہ نے حدیثِ سنہ کے بعد ایک دوسری حدیث «محمد بن بكر عن ابن جريج حَدَّثَنِیْ اَبُو الزُّبَيْرِ اَنَّهُ سَمِعَ جَابِرًا» کی سند سے ذکر کی۔ امام ابوعوانہ نے اس کی تخریج کی ہے اور پہلی سند ناقل یا طابع کی غلطی سے ساقط ہو گئی ہے۔ حدیثِ مسنہ کے ساتھ اس کا تعلق نہیں۔

بلاشبہ دوسری بات میں وزن ہے بشرطیکہ صحیح نسخہ سے اس کی تائید ہو۔ انھوں نے فرمایا ہے کہ ظاہریہ کے مکتبہ میں اس کا نسخہ موجود ہے۔ اگر بات ویسی ہی ہے جیسے علامہ البانی رحمہ اللہ نے کہی ہے تو یہ صراحتِ سماع درست نہیں۔ لیکن جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے تو وہ محلِ نظر ہے کیونکہ ابوعوانہ ہی نہیں ''صحیح بخاری'' میں بھی امام بخاری رحمہ اللہ صراحتِ سماع کے لیے معلق روایت ذکر کرتے ہیں اور اس کے بارے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں: «لَمْ اَجِدْهُ» مجھے یہ روایت نہیں ملی۔ مثلاً «بَابُ لَا يَسْتَنْجِی بِرَوْثٍ» میں جو ''زہیر عن ابی اسحاق'' کی سند سے روایت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

« وَ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ بْنُ يُوْسُفَ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ اَبِیْ اِسْحَاقَ حَدَّثَنِیْ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ »

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اور علامہ عینی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہ تعلیقاً روایت ابواسحاق کی تدلیس پر اعتراض کے جواب میں صراحتِ سماع کے لیے امام بخاری رحمہ اللہ نے ذکر کی ہے۔ مگر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: «لَمْ اَجِدْهَا» کہ اس روایت کو میں نے نہیں پایا۔ ❸

اس لیے اگر ایسی معلق روایت کی سند نہ بھی ملے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اس قیل و قال کے علاوہ امام مسلم رحمہ اللہ امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ، ابن الجارود کا اپنی کتابوں میں اس روایت کو ذکر کرنا اس کی صحت کی دلیل ہے۔ متاخرین میں سے کسی کو اس میں ابوالزبیر کی تصریح سماع نہیں ملی تو ان کی یہ کوشش چند قلمی اور مطبوعہ کتابوں تک محدود ہے۔ ان کے اس تتبع کو متقدمین کی تحری و تتبع سے کوئی نسبت نہیں، جنھوں نے لاکھوں احادیث

❶ ابوعوانہ، ج:٥، ص: ٢٢٨

❷ سلسلة الصحيحة (ج:٦، ص:٤٦٤، رقم:٢٧٠٧)

❸ مقدمة فتح الباری، ص:٢٢

سے ''الصحیح'' کا انتخاب کیا اور بحیثیت مجموعی امت نے ان پر اعتماد کیا۔ علامہ البانی رحمہ اللہ بلاشبہ عبقری انسان تھے اور حدیث کی خدمت میں ان کی مساعی لازوال ہے۔ مگر ان کا کچھ اپنا اسلوب ہے۔ صحیحین کی ارجحیت کے بھی وہ قائل نہیں۔ اسی لیے وہ ان کی روایات کو اولیت نہیں دیتے بلکہ اپنی تحقیق وتنقید میں بسا اوقات بلا دریغ ان پر حرف گیری فرماتے ہیں۔

علامہ البانی رحمہ اللہ سے قبل بھی بعض حضرات نے ''صحیحین'' کی بعض روایات پر تنقید کی ہے۔ مگر ہر دور میں بحمد اللہ ان کا دفاع بھی ہوتا رہا۔ امام دارقطنی رحمہ اللہ کے اعتراضات کا جواب علامہ نووی اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے دیا۔ حافظ زین الدین عبدالرحیم العراقی نے اس سلسلے میں «اَلْاَحَادِیْثُ الْمُخرجة فِی الصَّحِیْحَیْنِ اَلَّتِیْ تُکُلِّمَ فِیْهَا بِضَعْفٍ وَ اِنْقِطَاعٍ» کے نام سے مستقل کتاب لکھی، علامہ عراقی کے فرزند ارجمند حافظ ولی الدین ابوزرعہ احمد بن عبدالرحیم نے بھی «اَلْبَیَان وَالتَّوْضِیْح لِمَنْ خَرَّجَ لَه فِی الصَّحِیْح وَ قَدْ مَسَّ ضَرب مِنَ التَّجْرِیْحِ» کے نام سے مستقل رسالہ لکھا۔ گویا صحیحین کی بعض روایات پر تنقید بھی ہوئی مگر بحمد اللہ اس کا دفاع بھی ہر دور میں ہوتا رہا۔ جس کی تفصیل سے بحمد اللہ یہ ناکارہ بہت حد تک باخبر ہے۔

''صحیحین'' میں مختلط راویوں کی روایات مروی ہیں۔ عموماً محدثین متاخرین کے ہاں تو صحیحین کی عظمت اور ان کے مصنفین کی تحقیق وتنقیح کی بناء پر یہ قاعدہ ہی قرار پا جائے کہ مختلطین سے روایت کرنے والوں نے اختلاط سے پہلے سنا ہے۔ اور اگر ثابت ہو جائے کہ راوی نے اختلاط کے بعد سنا ہے تو اس کے بارے میں یہ طے پا جائے کہ امام بخاری و مسلم نے ان کی احادیث کو منتخب کیا ہے اور جس کو صحیح سمجھا اس کو «الصَّحیح» میں درج کیا ہے۔ جیسا کہ ''ہدی الساری'' (ص:۴۰۶) میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اور صحیح ابن حبان کے مقدمہ (ج:۱،ص:۹۰) میں امام ابن حبان نے صراحت کی ہے۔ جس کی تفصیل ''توضیح الکلام'' (ج:۲،ص:۴۶۶۔۴۶۹) میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ جب مختلط راوی کے بارے میں یہ فیصلہ ہے تو مدلس کے بارے میں بھی اسی اصول کے مطابق فیصلہ ہونا چاہیے۔ کسی متاخر کا صراحت سماع نہ ملنے پر انقطاع کا حکم اس کا اپنا فیصلہ ہے۔ شیخین کا تتبع وتفتیش بہر حال ان سے مقدم ہے اور صحیحین پر اس قسم کی تنقید قطعاً خوش آئند نہیں۔ (مولانا ارشاد الحق اثری) (۲۲ جون ۲۰۰۱ء)

(۳) (از مولانا سید محمد قاسم شاہ، سندھ)

جناب حافظ ثناء اللہ مدنی صاحب۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

امید ہے کہ مزاج عالی مع الخیر ہوں گے۔ پہلے ایک جواب ارسال کر چکا ہوں اب دوسرے سوال کے متعلق یہ تحریر ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ قبول فرمائے۔ آمین۔

میں اب بھی اپنے اسی موقف پر قائم ہوں کہ ''صحیحین'' کا جو مرتبہ و مقام ہے وہ کتب احادیث میں کسی اور کا نہیں

تب ہی تو جمہور علمائے امت کی طرف سے ان کو تلقی بالقبول حاصل ہے ورنہ ان میں ایسے بہت سے رواۃ ہیں جن پر کلام ہوا ہے اور آپ بخوبی یہ علم رکھتے ہیں کہ کتنے ہی ایسے رواۃ ہیں جو دوسری کتب احادیث میں وارد ہوں تو ان کی روایت ضعیف ہوتی ہے، اگر وہ رواۃ ''صحیحین'' میں وارد ہوں تو ان کی روایات صحیح ہوتی ہیں اور ان کے تذکرے کی میں سمجھتا ہوں کہ ضرورت نہیں۔ اسی طرح ''صحیحین'' میں کتنے ہی ایسے مدلسین روایت کرتے ہیں جنھوں نے وہاں سماع کی تصریح نہیں کی۔ لیکن اجماع امت نے ان سب کو قبولیت کا درجہ دیا ہے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ پوری امت ہی غلطی پر ہو اور ان کو جو قبولیت کا درجہ دیا ہے تو وہ بھی سوچ سمجھ کر اور ماہرین نقاد نے پوری طرح پرکھ کر دیا ہے۔

اگر آپ یہ فرمائیں کہ ایسی اکثر روایات کا متصل ہونا دوسرے مقامات پر یا دوسری کتب احادیث میں ثابت ہو چکا ہے تو میں یہ عرض کروں گا کہ صحیحین پر جو مستخرجات لکھے جا چکے ہیں وہ اب تک کتنے منظر عام پر آ چکے ہیں؟ ایک دو کے علاوہ باقی سب ہی ابھی تک نظروں سے پوشیدہ ہیں، جب سارے ہی منظر عام پر آ جائیں گے پھر ہی کسی حتمی فیصلے کے متعلق سوچا جا سکتا ہے اور موجودہ حالات میں جب کہ ہمارے یہاں وہ پورا مواد ہی موجود نہیں ہم ان پر ضعف کا حکم کس طرح لگا سکتے ہیں؟

حقیقت ان روایات پر ضعف کا حکم لگانا میرے علم کی کمی تو ہو سکتی ہے یعنی اپنی تحقیق کے مطابق جسے میں ضعیف سمجھ رہا ہوں وہ درحقیقت ضعیف نہ ہو۔ بلکہ اس کی وجہ میرے علم کا ناقص ہونا ہو جس کا مجھے ادراک نہیں ہو رہا کیونکہ وہ کتابیں جن میں ان روایات کے متصل ذکر ہونے کا قوی امکان ہے میرے سامنے نہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی وجوہ ہیں جن کی بناء پر علمائے امت نے ان کو قبول کیا ہے اور ان پر ضعیف کا حکم لگانے سے احتراز کیا ہے۔

جیسا کہ امام ذہبی ''میزان الاعتدال'' (ج:۱ص: ۶۴۱) پر خالد بن مخلد القطوانی کے ترجمہ میں ایک حدیث ذکر کرتے ہیں کہ:«مَنْ عَادَى لِيْ وَلِيًّا» یہ حدیث صحیح البخاری میں ہے۔ پھر فرماتے ہیں:«فَهٰذَا حَدِيْثٌ غَرِيْبٌ جِدًّا ، لَوْ لَاهَيْبَةُ الجَامِعِ الصَّحِيْحِ لَعُدُّوْهُ فِي مُنْكَرَاتِ خَالِدِ بْنِ مَخْلَدٍ»

اسی طرح ''میزان الاعتدال'' (ج:۴ص:۳۹) پر ابو الزبیر المکی کے ترجمہ میں رقمطراز ہیں کہ:

«وَ فِيْ صَحِيْحُ مُسْلِمٍ، عِدَّةُ اَحَادِيْثَ مِما لم يُوْضِحْ فِيْهَا اَبُو الزُّبَيْرِ السَّمَاعَ عَنْ جَابِرٍ وَهِيَ مِنْ غَيْرِ طَرِيْقِ اللَّيْثِ عَنْهُ فَفِي الْقَلْبِ مِنْهَا شَيْءٌ ـ مِنْ ذٰلِكَ حَدِيْثٌ لَا يَحِلُّ لِأَحَدٍ حَمْلَ السِّلَاحِ بِمَكَّةَ وَ حَدِيْثَ رَأَى عَلَيْهِ الصلاة والسلام اِمْرَأَةً فَاَعجَبَتْهُ فَاَتٰى اَهْلَهُ زَيْنَبَ وَ حَدِيْثُ النَّهْيِ عَنْ تَجْصِيْصِ الْقُبُوْرِ وَغَيرِ ذٰلِكَ »

دیکھئے امام ذہبی رحمہ اللہ جیسے نقاد اور ماہر محدث کو بھی ان روایات کو ضعیف کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اپنے تذبذب کا اظہار تو فرماتے ہیں لیکن ان پر ضعف کا حکم لگانے سے احتراز کرتے ہیں اور آج کوئی ''صحیحین'' کی کتر بیونت پر لگا ہوا

ہے۔ صحاح ستہ کا بھرم تو پہلے ہی ٹوٹ چکا۔ آئندہ بھی اگر یہی پوزیشن رہی تو ضعیف البخاری وضعیف المسلم بھی بن جائیں گے اس لیے بہتری اسی میں ہے کہ تحقیق کو تو جاری رکھا جائے مگر ان پر قینچی چلانے سے احتراز کیا جائے اور جس طرح جمہور علمائے امت نے ان کو قبول کیا ہے ہم بھی ان کو قبول کریں۔ جیسا کہ امام نووی مقدمہ ''شرح مسلم'' (ج:۱،ص:۳۳) پر رقمطراز ہیں کہ:

«وَاعلَمْ اَن ما كَانَ فِي الصَّحِيْحَيْنِ عَنِ الْمُدَلِّسِيْنِ بِعَنْ وَ نَحْوِهَا فَمَحْمُوْلٌ عَلٰى ثُبُوْتِ السَّمَاعِ مِنْ جِهَةٍ اُخْرٰى »

اسی طرح ''تقریب''، ص:۹ پر رقمطراز ہیں:

« وَ مَاكَانَ فِي الصَّحِيْحَيْنِ وَ شِبْهِهَا عَنِ الْمُدَلِّسِيْنَ بِعْنِ مَحْمُوْلٌ عَلٰى ثبوت السَّمَاعِ مِنْ جِهَةٍ اُخْرٰى »

اسی طرح ''شرح مسلم'' (ج:۱،ص:۲۰) پر رقمطراز ہیں:

« وَ اِنَّمَا يَفْتَرِقُ الصَّحِيْحَان عَنْ غَيْرِهِمَا مِنَ الْكُتُبِ فِي كَوْن مَا فِيهِمَا صَحِيْحًا لَا يُحْتَاجُ الی النَّظرِ فِيْه وَ مَا كَانَ فِيْ غَيْرِهِمَا لَا يُعْمَلُ بِه حَتّٰى يَنْظُرَ وَ توجَدَ فِيهِ شُرُوْطُ الصَّحِيْح »

اسی طرح حافظ سیوطیؒ ''الفیہ'' السیوطی (ص:۳۴) پر فرماتے ہیں:

« و ما اَتَانَا فِي الصَّحِيْحَيْنِ بِعَنْ فَحَمْلُهٗ عَلٰى ثُبُوْتِهٖ قمن»

اور اس کی شرح میں حافظ احمد محمد شاکر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَ قَدْ وَقَعَ فِي الصَّحِيْحَيْنِ اَحَادِيثُ كَثِيْرَةٌ مِنْ رِوَايَةِ بَعْضِ الْمُدَلِّسِيْنَ الثَّقَاتِ وَ لَمْ يَصْرَحُوْا فِيْهَا بِالسَّمَاعِ كَقَتَادَةِ وَ سُفْيَانَ الثَّوْرِي وَ سُفْيَانَ بْنِ عُيَيْنَةَ وَ عَبْدُالرَّزَّاقِ وَ هُوَ مَحْمُوْلٌ عَلٰى ثُبُوْتِ السَّمَاعِ مِنْ جِهَةٍ اُخْرٰى غَيْرَ الَّتِيْ ذَكَرَهَا صَاحِبُ الصَّحِيْح »

اسی طرح شیخ الاسلام سید محب اللہ الراشدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''صحیحین کے متعلق تو آپ کا اور ہمارا یہی حسن ظن ہے کہ ان میں جو بھی رواۃ مدلسین ہیں ان کا عنعنہ ونحوھا اتصال پر محمول ہیں۔''[1]

اگر اور بھی حوالے پیش کیے جائیں تو مضمون خاصا طویل ہو جائے گا اس لیے ان پر اکتفاء کرتا ہوں۔ دوسری بات

[1] تسکین القلب المشوش، ص:۴۳

یہ کہ ان محدثین کرام اور ماہرین نقاد نے ان کو ایسے ہی قبول نہیں کیا، بلکہ وہ ہیں ہی قبول کرنے کے لائق۔ جیسا کہ امام مسلم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« عَرَضْتُ كِتَابِي هٰذَا عَلٰى اَبِيْ زُرْعَةَ الرَّازِيِّ فَكُلُّ مَا اَشَارَ اِلَيْهِ اَنَّ لَهٗ عِلَّةً تَرَكْتُهٗ وَ كُلُّ مَا قَالَ: اِنَّهٗ صَحِيْحٌ وَلَيْسَ لَهٗ عِلَّةٌ خَرَّجْتُهٗ » [1]

و قال اَيْضًا فِي صَحِيْحِ مُسْلِمٍ بِشَرحِ النَّوَوِيِّ ، ج:٤، ص:١٢٢ : مَا وَضَعْتُ شَيْئًا فِي كِتَابِيْ هٰذَا الا بِحُجَّةٍ و مَا اَسْقَطْتُ مِنْهُ شَيْئًا اِلَّا بِحُجَّةٍ ـ لَيْسَ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدِيْ صَحِيْحٌ وَضَعْتُهٗ اِنَّمَا وَضَعْتُ مَا اَجْمَعُوْا عَلَيْهِ ـ اھ»

اور «مَا اَجْمَعُوْا» سے مراد کون ہیں؟ اس کی تصریح شیخ الاسلام سراج الدین البلقینی نے ''محاسن الاصلاح''، ص:۹۱ پر اس طرح کی ہے:

« اَرَادَ مُسْلِمٌ بِقَوْلِهٖ « مَا اَجْمَعُوْا عَلَيْهِ» اَرْبَعَةٌ اَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلٍ ، وَ يَحْيٰى بْنُ مَعِيْنٍ وَ عُثْمَانُ بْنُ اَبِيْ شَيْبَةَ وَ سَعِيْدُ بْنُ مَنْصُوْرِ الْخُرَاسَانِيُّ۔

تو ایسے اماموں کی نظروں سے یہ احادیث بھی گزری ہوں گی جن میں عنعنہ ہے۔ تو ان نقاد ماہرین اماموں کی نظروں سے یہ علّتیں کیسے پوشیدہ رہیں۔ اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ انھوں نے ان کو ان علتوں سے پاک سمجھا تب ہی ان کو قبول کیا۔ جب ایسے اماموں نے ان کو قبول کیا ہے تو ہم جیسے ان روایات کو ضعیف کرنے کی جسارت نہیں کر سکتے۔

باقی رہا «لَا تَذْبَحُوْا اِلَّا مُسِنَّة......الخ» کی حدیث میں ابوالزبیر کا حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے سماع تو مسند ابی عوانہ (ص:۲۲۷۔۲۲۸، ج:۵) پر اس کی صراحت موجود ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

« رَوَاهُ مُحَمَّدُ بْنُ بَكْرٍ عَنِ ابْنِ جُرَيْجٍ حَدَّثَنِيْ اَبُو الزُّبَيْرِ اَنَّهٗ سَمِعَ جَابِرًا يَقُوْلُ ، وَذَكَرَ الْحَدِيْثَ »

تو یہاں ابوالزبیر کے سماع کی تصریح ہوگئی، ان شاء اللہ سبحانہ وتعالیٰ اب کوئی اشکال نہ ہوگا۔

(ابواحسان اللہ محمد قاسم شاہ) (۲۲ جون ۲۰۰۱ء)

حدیث مسنہ کے راوی ابوالزبیر (تحقیق کا دوسرا رخ) (از جناب مولانا عبدالرشید راشد)

یکم ربیع الاول ۱۴۲۲ھ کے ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں ''صحیح مسلم'' کی ایک روایت سے متعلق ابوالزبیر مکی کی تدلیس کے حوالے سے میرا ایک مضمون شائع ہوا، جس کی تفصیل مذکورہ پرچہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

[1] مقدمة شرح النووی، ج:۱، ص:۱۵، صيانة صحيح مسلم، ص:۷۸، ۹۸

اس پر ہمارے انتہائی مخلص و مہربان دوست حضرت مولانا ارشاد الحق صاحب اثری (متعنا اللہ بطولہ حیاتہ) نے تفصیلی تعاقب فرمایا ہے جو ''الاعتصام'' کے حالیہ شمارہ نمبر ۲۳ میں شائع ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت کو تخریج حدیث اور رواۃ پر جو گہری بصیرت عطا فرمائی ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ

زیر بحث ''حدیث مسنہ'' میں ابو الزبیر کی تدلیس کے جواب میں علامہ اثری ﷾ نے دو دلیلیں ذکر کی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۱۔ مسند ابی عوانہ (۵/ ۲۲۸) میں ابو الزبیر کے حصرت جابر رضی اللہ عنہ سے سماع کی تصریح موجود ہے۔

۲۔ ائمہ متقدمین بالخصوص شیخین کی اسانید و رجال پر وسعت نظری کے پیش نظر ان کا تتبع و تفتیش متاخرین پر مقدم ہے۔

اوّل الذکر دلیل پر حضرت اثری ﷾ نے علامہ البانی رحمہ اللہ سے دو اشکال ذکر کیے ہیں جن کی تفصیل سلسلہ صحیحہ (۶/ ۴۶۴۔۴۶۵) میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔ جن میں سے ثانی الذکر اشکال کو قوی قرار دیا ہے بشرطیکہ صحیح نسخے سے اس کی تائید ہو۔

البتہ اوّل الذکر اشکال کہ ''مسند ابی عوانہ کا وہ طریق جس میں سماع کی تصریح ہے، معلق ہے اور معلق ہونے کے اعتبار سے لائق اعتناء نہیں۔'' فاضل ممدوح نے اس اشکال کے دفاع کی بھر پور کوشش کی ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ بھی بعض اوقات تصریح سماع کے لیے معلق روایت ذکر کرتے ہیں جب کہ اس کے بارے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: «لَمْ اَجِـدْہُ» کہ مجھے یہ سند موصول نہیں ہو سکی۔ نتیجہ یہ اخذ کیا ہے کہ سماع کی تصریح کے لیے معلق روایت بھی کافی ہے اور اس کے لیے ''صحیح بخاری'' «بَـابُ لَا یَسْتَـنْـجِـیْ بِـرَوْثٍ» سے ایک مثال ذکر کی ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے زہیر عن ابی اسحاق کے طریق سے حدیث نقل کر کے سماع کی تصریح کی طرف اشارہ کرنے کے لیے فرمایا ہے:

« وَقَالَ اِبْرَاھِیْمُ بْنُ یُوْسُفَ عَنْ اَبِیْهِ عَنْ اَبِیْ اِسْحَاقَ حَدَّثَنِیْ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ»

اس تعلیق پر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ رقمطراز ہیں: «لَـمْ اَجِـدْھَا» اس لیے ایسی معلق روایت کی سند نہ بھی ملے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اس پر گزارش ہے کہ اولاً: ''صحیح بخاری'' میں جو تعلیقات بصیغہ جزم ہیں، ان کے متعلق ائمہ محدثین کی رائے یہ ہے کہ جن رواۃ سے یہ تعلیقاً مذکور ہیں۔ امام بخاری کے التزام صحت اور تحری و تتبع کے پیش نظر ان رواۃ سے یہ یقیناً صحیح ثابت ہیں۔ اگر چہ وہ موصول ثابت نہ بھی ہو سکیں اور ان رواۃ کے بعد سند کا یہ حصہ مذکور ہے۔ اس پر غور کر لینا چاہیے اور یہ رائے بلاشبہ صحیح ہے لیکن یہ حکم زیادہ سے زیادہ صحیح کے ساتھ خاص ہے۔ صحیحین کی تعلیقات کو مثال بنا کر دیگر کتب احادیث کی تعلیقات پر اعتماد بہر حال محل نظر ہے۔ خواہ وہ تعلیقات تصریح سماع کے لیے ہی ہوں۔

ثانیاً: ''صحیح بخاری'' کی مذکورہ تعلیق کے علاوہ بھی وہ حدیث یقیناً صحیح ہے۔ اس حدیث کی صحت کا انحصار صرف اس تعلیق پر ہی نہیں بلکہ صحت کے دیگر مرجحات بھی موجود ہیں جن کی تفصیل مقدمہ فتح الباری ومسند احمد بن حنبل کی تحقیق میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے اور ان مرجحات پر مولانا اثری یقیناً مطلع ہیں۔ لہٰذا حضرت کا ''صحیح بخاری'' کی تعلیقات کو بنیاد بنا کر مسند ابی عوانہ کی تعلیق پر اعتماد کرنا محل نظر ہے۔

فاضل اثری کی دوسری دلیل یہ ہے کہ ''متقدمین کی وسعتِ نظری کے پیش نظر بالخصوص شیخین کی تحری وتتبع متاخرین پر مقدم ہے۔''

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ متقدمین رجال واسانید پر وسیع النظر تھے۔ اور ذخیرۂ حدیث پر کامل ادراک تھا اور متاخرین کی تحقیق چند قلمی اور مطبوعہ کتابوں تک محدود ہے۔ لیکن صرف اس حسن ظن کی بنیاد پر متاخرین کی تحقیق کو قابل اعتنا نہ سمجھنا قرین انصاف نہیں۔

بالعموم متاخرین تو کجا دورِ حاضر کے بعض فضلاء کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں جو رجال واسانید پر انتہائی بلیغ النظر ہیں، جن میں میرے نزدیک حضرت اثری ﷾ بھی ہیں۔ کیا متقدمین کے کامل وسیع النظر ہونے کے باوجود متاخرین کے بعض اہم افادات نہیں ہیں؟ علوم کا کوئی بھی طالب علم اس کا انکار نہیں کرسکتا۔ حضرت اثری کا یہ تعاقب ہی اس پر شاہد عدل ہے کہ علامہ ذہبی جیسی عبقری شخصیت نے کامل وسیع النظر ہونے کے باوجود ابوالزبیر کے عنعنہ پر عدم الطمینان کا اظہار کرتے ہوئے جن تین احادیث کو بطورِ مثال ذکر کیا ہے۔ حضرت اثری ﷾ نے خالص علمی انداز میں تحقیق کر کے ثابت کیا ہے کہ یہ تینوں روایات صحیح ہیں اور ان میں تصریح سماع موجود ہے۔ اس کے باوصف یہ سمجھنا کہ متاخرین کی کوشش صرف چند قلمی ومطبوعہ کتب تک محدود ہے۔ فیاللعجب

آخر حسن ظن کی بھی کوئی حد ہونی چاہیے۔ دورِ حاضر میں تحقیق وتفتیش کے جو وسائل میسر ہیں متقدمین کے ہاں ان کا تصور بھی نہیں۔ دورِ حاضر کی کوئی تحقیق جو حقائق کی روشنی میں ہو، اگر متقدمین کی تحقیق کے خلاف ہو تو وسعتِ ظرفی سے اسے قبول کرنا چاہیے نہ کہ محض حسن ظن کی بنیاد پر اسے ناقابل التفات سمجھا جائے۔ (۲۹ جون ۲۰۰۱ء)

جواب علمی انداز میں ہی دیا جانا چاہیے! (از شیخ الحدیث حافظ ثناء اللہ خان صاحب مدنی)

''الاعتصام'' کے شمارہ نمبر ۷، جلد: ۵۳ کی اشاعت میں ''قربانی کے ضروری مسائل'' سے متعلق ایک فتویٰ میں، میں نے عقبہ بن عامر وغیرہ کی روایات کی روشنی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی ''روایت مسنہ'' جسے امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی ''صحیح'' میں نقل کیا ہے کو استحباب پر محمول کیا جو کہ جمہور اہل علم کا موقف ہے۔ اسی تناظر میں ضمناً میں نے شیخ البانی رحمہ اللہ سے اس کی عدمِ صحت نقل کی۔ میں نے اپنی طرف سے اس پر ضعف کا حکم قطعاً نہیں لگایا۔ ''الاعتصام'' کے شمارہ جات اس کے شاہد ہیں۔ شیخ البانی رحمہ اللہ کی طرف سے تضعیف نقل کرنے سے مقصود صرف یہ تھا کہ مذکورہ علت کے رفع کے لیے اہل علم

کو توجہ دلائی جائے۔ چنانچہ اس پر بعض علماء نے تحقیق فرمائی جس سے قارئین ''الاعتصام'' بھرپور مستفید ہوئے اور کئی علمی نکات سامنے آئے ان میں سے بطورِ خاص رفیق محترم جناب مولانا ارشاد الحق صاحب اثری کا مضمون قابلِ ذکر ہے۔

حضرت مولانا ہماری جماعت کا عظیم قابلِ فخر سرمایہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے علم و فضل میں برکت فرمائے۔ آمین۔

مولانا کے مضمون کے بعض مندرجات سے اختلاف ممکن ہے لیکن مجموعی اعتبار سے آپ کی تحقیق نہایت علمی و متین انداز میں تھی جو نہایت قابلِ تحسین ہے۔ جب کہ مولانا ابوالاشبال احمد شاغف (غفر اللہ لہ) ''صحیحین'' کے دفاع میں جذبات سے مغلوب ہو کر اعتدال اور توازن قائم نہ رکھ سکے اور فریق ثانی پر سوقیانہ انداز میں حملہ آور ہوئے اور انھیں اپنے تند و تیز جملوں کے نشتر سے مجروح کرتے چلے گئے۔ اس پر انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کے سوا کیا کہا جا سکتا تھا؟ جب حضرت خود ہی اپنے مضمون میں تلخی کے معترف ہیں تو قارئین کے حضرت کے متعلق کیا تاثرات ہوں گے؟

مولانا کا مضمون اس لائق نہیں کہ اس پر کچھ لکھا جائے بلکہ (ان نامناسب الفاظ کی وجہ سے) میرے نزدیک تو سرے سے اشاعت کے قابل ہی نہیں تھا مگر نہ جانے اصحاب'' الاعتصام'' کو اس میں کیا خوبی نظر آئی کہ علمی دیانت و امانت کے تقاضوں کے پیش نظر وہ اسے طبع کرنے پر مجبور ہوئے۔

مذکورہ مضمون چونکہ میرے نام سے مکتوب ہے اور میرے مطلع ہونے کے بغیر ہی اسے شائع کر دیا گیا۔ اس لیے مجھے چند سطور لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اگر یہ رسالہ طبع ہونے سے قبل میرے مطالعہ میں آتا تو کم از کم قارئین کے نزدیک مولانا کی شخصیت محترم و مکرم ہی رہتی۔

علماء کا بعض مسائل پر اختلاف کرنا بعید از قیاس نہیں لیکن کیا اختلاف رائے کا تقاضا یہی ہے کہ فریق ثانی پر مسموم تیر چلائے جائیں؟ اگر تحقیق اسی کا نام ہے تو ایسی تحقیق کو سلام۔

اگر شیخ البانی کی تحقیق کو قابلِ اعتنا سمجھنے والے ''مقلدین'' کی پھبتی کے حقدار ہیں تو حضرت شیخین کریمین کے ساتھ وابستگی میں انتہائی غلو سے کام لینے والے ''مقلدین'' کیوں نہیں؟ ﴿تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيزٰى﴾ مجھے معلوم ہے کہ شیخ البانی رحمہ اللہ سے شدید اختلاف رکھنے والے لوگ بھی اکثر انہی کی تحقیق کے محتاج نظر آئے ہیں۔ ﴿والفضل ما شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاء﴾

زیر بحث مسئلہ پر جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ کافی ہے۔ اسے مزید طول دینا مناسب نہیں، لہٰذا ''الاعتصام'' کو چاہیے وہ اسے یہیں موقوف کر دے۔ البتہ اگر واقعتاً کوئی مزید علمی تحقیق سامنے آئے تو اس کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔

آخر میں حضرات علماء سے مؤدبانہ التماس ہے کہ کسی کی تحقیق سے اختلاف رائے کا حق رکھتے ہوئے افراط و تفریط سے احتراز فرمائیں۔ خالص علمی اور حکیمانہ انداز میں شریک بحث ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین۔ (۲۹ جون ۲۰۰۱ء)

(جانور کی قربانی کتنی عمر میں جائز ہے؟)

کیا کھیرے جانور کی قربانی کی رعایت صرف حضرت بردہ رضی اللہ عنہ کے لیے تھی؟

سوال : ان دو احادیث میں سے کس حدیث پر عمل کیا جائے۔ اگر ایک حدیث پر عمل کریں گے تو دوسری حدیث سے انحراف ہوگا۔

حدیث نمبر ۱: عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو بکریاں دیں اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم میں بانٹنے کے لیے ،ایک بکری کا بچہ سال بھر کا بچ رہا۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے ذکر کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا تو اس کی قربانی کر لے۔ ❶

حدیث نمبر ۲: ابو بردہ بن نیار نے عرض کیا جو براء بن عازب کے ماموں تھے، یا رسول اللہ ﷺ! میں نے تو اپنی بکری نماز سے پہلے ہی کاٹ ڈالی۔ اور مجھے یہ خیال رہا کہ یہ دن کھانے پینے کا ہے تو میں نے یہ چاہا کہ سب سے پہلے میرے ہی گھر میں بکری کٹے۔ اس لیے میں نے اپنی بکری کاٹ ڈالی اور نماز کو آنے سے پہلے کھا بھی لی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تیری بکری تو گوشت کی بکری ٹھہری۔ اس نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے پاس ایک سال کی پٹھیا ہے جو گوشت کی دو بکریوں سے مجھ کو اچھی لگتی ہے کیا وہ میری طرف سے قربانی میں کافی ہو جائے گی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں اور تیرے بعد کسی کی طرف سے کافی نہ ہوگی۔ ❷

ہماری مشکل یہ ہے کہ پہلی حدیث سے ایک سال کی بکری کی قربانی جائز ہے جب کہ دوسری حدیث میں یہ رعایت صرف ابو بردہ کے لیے ہے کسی دوسرے کے لیے نہیں۔ جواب قرآن و حدیث کی روشنی میں مطلوب ہے۔ (جان محمد گاہو، ڈاکخانہ خاص پھلاڈیوں سندھ) (۱۱ ستمبر ۱۹۹۸ء)

جواب : عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی روایت کے بعض طرق میں بھی ''بیہقی'' نے تخصیص کے الفاظ نقل کیے ہیں۔ ان میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تطبیق و توفیق یوں دی ہے کہ آپ ﷺ کا یہ حکم ہر ایک کے لیے ایک ہی وقت میں صادر ہوا یا پہلے کی خصوصیت کو دوسرے کی خصوصیت نے منسوخ کر دیا۔ ❸

لہٰذا عقبہ کی حدیث سے ایک سال کے بکرے کی قربانی کا جواز پیدا کرنا درست نہیں یہ صرف انہی کے لیے مخصوص تھا۔

---

❶ صحیح البخاری ، بَابُ وَكَالَةِ الشَّرِيكِ الشَّرِيكَ فِي القِسْمَةِ وَغَيْرِهَا ، رقم:۲۳۰۰

❷ صحیح البخاری ، بَابُ الأَكْلِ يَوْمَ النَّحْرِ ، رقم:۹۵۵

❸ فتح الباری:۱۰/ ۱۴

(عیب والے جانور کی قربانی)

آدھے سے زیادہ ٹوٹے ہوئے سینگ والا قربانی کا جانور؟

سوال: جناب میں نے قربانی کے لیے ایک دنبہ تین ماہ قبل خریدا جس کے سینگ نیچے کی طرف مڑے ہوئے تھے، دنبے کے ساتھ ہی ایک بچھڑا بھی بندھا ہوا تھا، میں نے دیکھا کہ دنبے کا ایک سینگ غائب ہے تھوڑا سا باقی ہے آپ یہ فرمائیں قرآن وحدیث کی روشنی میں یہ دنبہ قربانی کے لیے جائز ہے۔ یا دوسرے جانور کا انتظام کیا جائے؟

(حکیم فاروق احمد اعوان) (۲۳ فروری ۲۰۰۱ء)

جواب: موجودہ صورت میں قربانی کا دنبہ تبدیل کرنا چاہیے۔ نبی ﷺ نے « اَعْضَبُ الْقَرْنِ وَالْاُذُنِ» (ٹوٹے ہوئے سینگ یا کان والے جانور کی قربانی سے منع فرمایا ہے۔)

حضرت سعید بن میتب فرماتے ہیں کہ ''اعضب'' سے مراد نصف یا نصف سے زیادہ کان کٹا یا سینگ ٹوٹا ہے اس سے کم ہو تو پھر گنجائش ہے، لیکن بہتر یہی ہے کہ بالکل صحیح سالم اور باشرائط ہو۔

اگر قربانی کا جانور خریدنے کے بعد عیب دار ہو جائے تو؟

سوال: قربانی کا جانور خریدنے کے بعد اس میں عیب ہو جائے تو کیا عیب والے کی قربانی کرے یا دوسرا جانور لے کر قربانی کرے؟ جس قربانی کے جانور میں عیب ہو گیا وہ اللہ کے نام کیا ہوا تھا۔ اب وہ جانور مسجد، مدرسہ یا کسی غریب کو دینا چاہیے یا مالک اپنے لیے رکھ لے؟ (محمد قاسم اللہ ڈنوں سموں گوٹھ حاجی محمد سموں کنری سندھ) (۱۱۔اپریل ۱۹۹۷ء)

جواب: مسئلہ ہذا میں اہل علم کا اگرچہ اختلاف ہے لیکن اس میں محقق مسلک یہ ہے کہ قربانی کے دن سے پہلے اگر کوئی ایسا عیب ہو جائے جو قربانی سے مانع ہو تو ایسی صورت میں جانور بدل لینا چاہیے اور معیوب جانور کو صدقہ کرنا چاہیے۔ صورت چاہے جونسی ہو اور اگر اس کو فروخت کر کے قیمت قربانی کے لیے دوسرے خریدشدہ جانور میں ڈال لی جائے تو یہ بھی جائز ہے۔

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو فتاویٰ اہل حدیث: ۲/۵۳۰۔ لشیخنا محدث روپڑی رحمہ اللہ تعالیٰ۔

اگر قربانی کا جانور خریدنے کے بعد اس کے عیب کا علم ہو؟

سوال: اگر قربانی خریدنے کے بعد پتہ چلے کہ یہ ایک آنکھ سے اندھا ہے یا کان میں سوراخ ہے یا مخنث ہے یا لنگڑا پن ہے تو آدمی کیا کرے؟ (سائل) (۱۲ اپریل ۲۰۰۲ء)

جواب: قربانی کا جانور خریدنے کے بعد معلوم ہو کہ اس میں قربانی سے روکنے والا کوئی عیب موجود ہے تو اس صورت میں اس کو تبدیل کرنا ہوگا۔

قربانی کا جانور خریدنے کے بعد اگر نقص واقع ہو جائے؟

سوال : محترم حافظ صاحب! السلام علیکم ایک آدمی نے قربانی کے لیے بکرا خریدا ہوا تھا، اس بکرے کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ کیا اب اس کی قربانی کی جاسکتی ہے؟ (خالد محمود، ضلع قصور) (۲۶ جنوری ۲۰۰۱ء)

جواب : قربانی کی نیت سے خریدے ہوئے بکرے کی اگر ٹانگ ٹوٹ جائے تو اس کا علاج کرائیں۔ اگر صحت مند ہو جائے یعنی لنگڑے پن کا اثر باقی نہ رہے، تو یہ قربان ہوسکتا ہے بصورتِ دیگر اس کو بدلنا ضروری ہے۔

قربانی کے متعلق ایک فتوے کی وضاحت

سوال : آپ نے قربانی کے جانور کے متعلق لکھا ہے کہ تبدیل کر سکتا ہے۔ جب کہ ایک حدیث میں ہے کہ نبی ﷺ کے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! میں نے دنبہ قربانی کے لیے رکھا ہوا تھا۔ اس کی چکلی بھیڑیا لے گیا ہے تو آپ نے فرمایا: «ضَحِّ بِهِ »[1] آپ نے فرمایا: اس کی قربانی کر۔'' (ابن ماجہ)

نیز ''التوحید'' اخبار میں ایک آدمی نے مولانا داؤد غزنوی رحمہ اللہ سے قربانی کے متعلق دریافت کیا کہ میں نے قربانی کے لیے گائے چھوڑی ہے مگر کمزور اور بیمار ہے اس کو بدل کر قربانی کروں؟ تو مولانا نے فرمایا کہ نبی ﷺ کے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے پوچھا یا رسول اللہ! میں نے گائے قربانی کے لیے چھوڑی تھی مگر کمزور اور بیمار ہے میں بدلنا چاہتا ہوں تو آپ نے فرمایا: ''اسی کی قربانی کر'' اس کی وضاحت فرما دیجیے شکریہ۔ (سائل عبدالغفور وٹو) (۲۶ جنوری ۲۰۰۱ء)

جواب : اولاً چکی والی روایت ضعیف ہے۔ اگر اسے صحیح بھی مان لیا جائے تو یہ نقص ان نقائص میں سے نہیں جن کی وجہ سے جانوروں کی قربانی سے منع کیا گیا ہے۔ گائے سے متعلقہ قصے والی کوئی روایت میرے علم میں نہیں۔

پیدائشی بے دانت جانور کی قربانی کا حکم

سوال : ایک بکرا جس کی عمر اس وقت ایک سال تین ماہ ہے اور پیدائشی طور پر اس کے دانت نہیں ہیں جب کہ قربانی کے جانور کے لیے دو دانت والا ہونا ضروری ہے تو کیا ایسی صورت میں ایسا جانور قربانی کیا جا سکتا ہے۔ نیز اب ایک سال تین ماہ بعد اس کے سامنے کے دو دانت نکلنے شروع ہو چکے ہیں۔ بَيِّنُوْا تُوجَرُوْا

(محمد حسن احسن، خطی، عارف والا ضلع ساہیوال) (۵ نومبر ۱۹۹۳ء)

جواب : اس قسم کے نادر واقعات میں عام عادت کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں عام حالات میں بکرا ڈیڑھ سال کے لگ بھگ دو دانت نکال ڈالتا ہے۔ اس اعتبار سے مذکور بکرا عمر ہذا کو اگر پہنچ جائے تو وہ لائق قربانی ہے۔ ان شاء اللہ۔ غالباً اس قسم کے امور کے پیش نظر بعض ائمہ جانوروں میں صرف تحدید عمر کے قائل نظر آتے ہیں۔ کما فی النهاية

[1] سنن الدارمی، بَابُ مَا يُجْزِءُ مِنَ الضَّحَايَا، رقم:۱۹۹۶

بحوالہ عون المعبود(۵۳/۳)

جس طرح کہ بلوغت انسانی کا اعتبار بعض ائمہ کے نزدیک عمر کی حد بندی سے ہے۔اور اگر اس جانور کے دانت ایک سال تین ماہ بعد ظاہر ہونے شروع ہو گئے تو مزید انتظار کر لیا جائے۔ حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِہٖ

بلا وجہ قربانی کا جانور تبدیل کرنا

سوال : ایک آدمی نے قربانی کا دنبہ خریدا۔ دو تین ماہ بعد اس نے ارادہ کیا کہ میں گائے کی قربانی دوں۔کیا وہ دنبہ فروخت کر کے گائے خرید سکتا ہے؟ (سائل عبدالرشید عراقی) (۱۷ جولائی ۱۹۹۸ء)

جواب : بلا وجہ قربانی کا جانور تبدیل نہیں کرنا چاہیے۔ہاں البتہ دوسرے جانور میں مزید کوئی اہم فائدہ نظر آئے تو بظاہر تبدیلی کا کوئی حرج نہیں۔ جیسے یہاں گوشت کا اضافہ ہے۔

پانچ چھ ماہ کا چھترا قربانی میں لگ سکتا ہے؟

سوال : پانچ یا چھ ماہ کا چھترا (دنبہ) جو دو دانتے چھترے کے برابر ہو کیا اس کی قربانی جائز ہے؟

(ایک متلاشی حق، فیصل آباد) (۲۴ اپریل ۹۲ء)

جواب : پانچ چھ ماہ کا چھترا کرنا درست نہیں، چاہے کتنا فربہ ہو۔ بوقتِ ضرورت ایک سال سے کم عمر کا نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ اس پر ''جذعہ'' کا اطلاق ہے۔حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس کی تعریف میں رقمطراز ہیں:

« فَمِنَ الضَّأْنِ مَا أَكْمَلَ السَّنَةَ وَهُوَ قَوْلُ الْجَمْهُورِ » ❶

''بھیڑ کا جذعہ، وہ ہے جو ایک سال کا ہو اور یہ جمہور علماء کا قول ہے۔''

مخنث (نہ مذکر نہ مؤنث) جانور کی قربانی کا کیا حکم ہے؟

سوال : مخنث (نہ مذکر نہ مؤنث) جانور کی قربانی کا کیا حکم ہے؟ (محمد صدیق تلیاں، ایبٹ آباد) (۱۸ جون ۱۹۹۹ء)

جواب : مخنث جانور کی قربانی درست ہے۔عدمِ جواز کی کوئی وجہ نہیں۔ تذکیر و تانیث کا شرع میں تعین نہیں۔

بانجھ بکری کی قربانی

سوال : بانجھ بکری کی قربانی شرعاً جائز ہے یا ناجائز؟

(مولانا محمد زکریا صاحب نائب شیخ الحدیث مسجد قدس دالگراں چوک لاہور) (۳۰ جولائی ۱۹۹۳ء)

جواب : قربانی کے عیوب کی جو تفصیل کتبِ حدیث میں بیان کی گئی ہے۔ان میں عقیم یعنی بانجھ پن کو بطورِ عیب بیان نہیں کیا گیا۔لہٰذا اس جانور کی قربانی کے جواز میں کوئی شبہ نہ ہونا چاہیے اور اہل علم اس کی قربانی کے جواز کے قائل ہیں۔

❶ فتح الباری: ۱۰/ ۵

چنانچہ مفتی عزیز الرحمٰن دیوبندی فرماتے ہیں کہ بانجھ جانور کی قربانی درست ہے۔[1]

علاوہ ازیں ہمارے نزدیک جس طرح خصی جانور کی قربانی کا گوشت غیر خصی گوشت سے زیادہ لذیذ اور مرغوب ہوتا ہے۔ اسی طرح بانجھ بکری کا گوشت مطفلہ بکری کے گوشت سے بہتر ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کی قربانی میں شبہ کی ضرورت نہیں۔ (هٰذَا مَا عِنْدِيْ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.)

(خصی جانور کی قربانی)

خصی جانور قربانی کرنا جائز ہے

سوال: خصی بکرا کی قربانی کا کیا حکم ہے کیوں کہ اس میں عیب ہے۔ کیا قربانی میں لگ سکتا ہے؟

(عبید اللہ عفیف۔ کوٹ ادو) (۸ ستمبر ۱۹۹۵ء)

جواب: جانور کو خصی کرنے کے بارے میں اہل علم کا سخت اختلاف ہے۔ ایک گروہ مطلقاً عدمِ جواز کا قائل ہے۔ جب کہ دوسرا گروہ جواز کا قائل ہے۔ اور کچھ اہل علم کے نزدیک ماکول اللحم (حلال) جانور کو خصی کرنا جائز ہے۔ اور غیر ماکول اللحم کو خصی کرنا ناجائز ہے۔ ترجیح اس بات کو ہے کہ مأکول اللحم جانور کو بوقتِ ضرورت خصی کرنا جائز ہے۔ متعدد روایات سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خصی شدہ نر دنبوں کی قربانی کی ہے۔

ظاہر ہے کہ جانور کو خصی صرف گوشت کو بہتر بنانے کے لیے کیا جاتا ہے۔ اس لیے مباح عمل ہے۔ یہ عیب نہیں ہاں البتہ بلاوجہ خصی کر دیا جائے تو واقعی عیب بن جاتا ہے۔ اس مختصر سی بحث سے معلوم ہوا کہ خصی بکرا کی قربانی جائز ہے۔ مسئلہ ہذا پر تفصیلی گفتگو ''الاعتصام'' میں پہلے شائع ہو چکی ہے۔

کیا خصی جانور کی قربانی جائز ہے؟

سوال: ہمارے ہاں ایک مسئلہ پیدا ہو گیا ہے کہ بکرا اگر خصی ہو تو اس میں عیب پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لیے قربانی میں شک پیدا ہو گیا ہے۔ آپ براہِ مہربانی اس کی وضاحت تحریر فرمائیں۔ بڑی مہربانی ہو گی۔

(محمد زکریا بھٹی سلانوالی۔ سرگودھا) (۱۹ اپریل ۱۹۹۵ء)

جواب: خصی شدہ بکرے کو قربانی کرنا جائز ہے۔ ''مسند احمد'' اور ''سنن ابی داؤد'' وغیرہ کی بعض روایات میں موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خصی شدہ نر دنبوں کی قربانی کی ہے۔[2] اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ''فتح الباری'' میں امام قرطبی سے

---

[1] فتاویٰ دارالعلوم دیوبند، ج:۱، ص:۷۴

[2] مسند احمد برقم:۲۵۸۸۶، سنن ابن ماجه، بَابُ أَضَاحِيِّ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، رقم: ۳۱۲۲.

نقل فرماتے ہیں کہ آدمی کی طرح جانوروں کو خصی کرنا درست نہیں۔ سوائے اس کے کہ اس سے گوشت کو بہتر بنانا یا اس کے ضرر سے محفوظ رہنا مقصود ہو۔

امام خطابی فرماتے ہیں:

«وَفِي هَذَا دَلِيلٌ عَلَى أَنَّ الْخَصِيَّ فِي الضَّحَايَا غَيْرُ مَكْرُوهٍ وَقَدْ كَرِهَهُ بَعْضُ أَهْلِ الْعِلْمِ لِنَقْصِ الْعُضْوِ وَهَذَا النَّقْصُ لَيْسَ بِعَيْبٍ لِأَنَّ الْخِصَاءَ يَزِيدُ اللَّحْمَ طِيبًا وَيَنْفِي فِيهِ الزُّهُومَةَ وَسُوءَ الرَّائِحَةِ.» [1]

اصلاً مسئلہ ہذا سلف صالحین میں شدید ترین اختلافی مسائل میں سے ایک ہے۔

علامہ شمس الحق عظیم آبادی نے "القول المحقق" میں اس مسئلہ پر بڑی تفصیلی اور ناقدانہ بحث فرمائی ہے۔ اور اخیر میں اس کا نچوڑ یوں بیان فرمایا ہے۔ کہ ان تمام باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ جن جانوروں کا گوشت نہیں کھایا جاتا ان کا خصی کرنا جائز نہیں اور جن کا گوشت کھایا جاتا ہے ان کا خصی کرنا افضل ہے۔ اور عزیمت کا یہی تقاضا ہے۔ ہاں خصی کرنا جائز ہے اور اس کی اجازت ہے۔ [2]

مسئلہ ہذا پر میرا ایک تفصیلی فتویٰ ''الاعتصام'' میں پہلے شائع ہو چکا ہے۔ اس کی طرف رجوع بھی مفید ہے۔

خصی بکرے کی قربانی کا جواز

سوال: خصی بکرے کی قربانی جائز ہے کہ نہیں؟ کیوں کہ بعض حضرات کے نزدیک خصی پن ایک نقص ہے۔

(آپ کا بھائی سید طاہر عباس شاہ جوہر آباد خوشاب) (۳۱ جولائی ۱۹۹۸ء)

جواب: خصی شدہ جانور کی قربانی کرنا جائز ہے۔ ''مسند احمد''، ''سنن ابی داؤد'' اور ابن ماجہ وغیرہ کی روایات میں تصریح موجود ہے کہ نبی ﷺ نے عید قربان کے دن دو دنبے ذبح کیے جو سینگ دار ابلق اور خصی تھے۔'' [3]

جانور کا گوشت اچھا بنانے کے لیے خصی کرنا عیب یا نقص نہیں ہاں البتہ بلاوجہ خصی کرنا واقعی معیوب کام ہے۔

خصی جانور ذبح کرنا نیز کیا جانور خصی کرنا جائز ہے؟

سوال: کیا خصی جانور کو ذبح کرنا جائز ہے؟ مزید بتائیں کہ جانور کو خصی کرنا جائز ہے یا کہ نہیں؟

(محمد زبیر بھٹی جھبراں) (۱۳ مارچ ۱۹۹۲ء)

---

[1] عون المعبود: ۳/ ۵۳

[2] فتاویٰ عظیم آبادی: ، ص: ۳۳۳

[3] مسند احمد برقم: ۲۵۸۸۶ ، سنن ابن ماجه ، بَابُ أَضَاحِيِّ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ، رقم: ۳۱۲۲ .

جواب: خصی جانور ذبح کرنا درست ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے دو خصی کردہ دنبوں کی قربانی کی۔ [1] اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یوں ہیں:

«ذَبَحَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَوْمَ الذَّبْحِ كَبْشَيْنِ اَقْرَنَيْنِ اَمْلَحَيْنِ مَوْجُوْئَيْنِ» [2]

''یعنی آنحضرت ﷺ نے عید قربان کے دن دو دنبے ذبح کیے، جو سینگ دار ابلق اور خصی تھے۔''

ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا خصی جانوروں کو ذبح کرنا خصی کرنے کے جواز کی دلیل ہے۔

علامہ عظیم آبادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، جانوروں کی خصی اگر ناجائز ہوتی تو رسول اللہ ﷺ اس پر سکوت نہ فرماتے۔ بلکہ مرتبہ رسالت کے پیش نظر ممنوع چیز کے ارتکاب پر ناراضگی کا اظہار کرتے اور عادت شریفہ کے مطابق فرماتے کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ اس طرح کے کام کرتے ہیں؟ اس فعل پر حضور ﷺ کی خاموشی اس کے جواز کی دلیل ہے۔ یہ مسئلہ اصولِ حدیث کی کتابوں میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ (فتاویٰ، ص:۳۲۳) کچھ لوگوں کا نظریہ اس کے برخلاف بھی پایا جاتا ہے لیکن راجح مذہب وہی ہے جس کی وضاحت ہو چکی۔

جانبین کے دلائل پر احاطہ کے لیے ملاحظہ ہو، رسالہ ''القول المحقق'' مؤلفہ علامہ شمس الحق عظیم آبادی اور فتاویٰ، ص:۳۱۶ تا ۳۲۵ یہ رسالہ بزبان فارسی اعلام اہل العصر (مطبوعہ دہلی: ۱۳۰۵ھ) کے ساتھ چھپا تھا۔

خصی جانور کی قربانی کا حکم اور ممانعت والی روایات و آثار کی وضاحت

سوال: کیا خصی جانور کی قربانی درست ہے؟ (سائل) (۷ فروری ۲۰۰۳ء)

جواب: خصی جانور کی قربانی کرنا درست ہے۔ ابو رافع کی روایت میں ہے کہ:

''رسول اللہ ﷺ نے دو سفید سیاہی مائل خصی کیے ہوئے دنبوں کی قربانی دی۔''

یہ روایت ''مسند احمد'' میں ہے۔ علامہ البانی رحمہ اللہ نے ''ارواء الغلیل'' (۴/۳۶۰) میں اس پر صحت کا حکم لگایا ہے۔

''الموسوعۃ الحدیثیۃ لامام احمد بن حنبل'' میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ یا عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ:

«أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ضَحَّى بِكَبْشَيْنِ سَمِينَيْنِ عَظِيمَيْنِ أَمْلَحَيْنِ أَقْرَنَيْنِ مَوْجُوأَيْنِ.» [3]

''رسول اللہ ﷺ نے دو سفید سیاہی مائل، موٹے تازے، سینگوں والے دنبوں کو قربان کیا۔''

پھر اس پر صحیح لغیرہ کا حکم لگایا ہے۔ ملاحظہ ہو: (۴۱/۴۹۷)

---

[1] مسند احمد برقم:۲۵۸۸٦، سنن ابن ماجه، بَابُ أَضَاحِيِّ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، رقم: ۳۱۲۲.

[2] أيضًا

[3] مسند احمد، رقم:۲۵۰٤٦

جانور کو خصی کرنے والی حدیث اگر صحیح ہے تو پھر اس کی قربانی کرنا کیسا ہے؟

سوال : «وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ: أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ـصَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ـ نَهَى عَنْ صَبْرِ ذِي الرُّوحِ وَعَنْ إِخْصَاءِ الْبَهَائِمِ نَهْيًا شَدِيدًا» [1]

۱۔ یہ حدیث سند کے لحاظ سے کیسی ہے؟

۲۔ اگر صحیح ہے تو جانور کا خصی کرنا پھر اس کی قربانی کرنا کیسا ہے؟ (سائل) (۱۸ جنوری ۲۰۰۲ء)

جواب : حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی اس حدیث کے بارے میں امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«وَ اَخْرَجَ الْبَزَّارُ بِاِسْنَادٍ صَحِيْحٍ مِنْ حَدِيْثِ ابْنِ عَبَّاسٍ .» [2]

''یعنی ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث کو بزار نے بسند صحیح بیان کیا ہے۔''

صاحب ''مجمع الزوائد'' نے کہا ہے:

«رِجَالُهُ رِجَالُ الصَّحِيْحِ.» (۲۶۵/۵)

''اس حدیث کے راوی صحیح کے راوی ہیں۔''

یعنی صحیح کے راویوں جیسے اوصاف ان راویوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔

علامہ شمس الحق عظیم آبادی رحمہ اللہ نے اپنے ''فتاویٰ'' میں مسئلہ ہذا پر خوب سیر حاصل بحث کی ہے جو لائق مطالعہ ہے۔اختتام بحث پر فرماتے ہیں:

''ان تمام باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ جن جانوروں کا گوشت نہیں کھایا جاتا ان کا خصی کرنا جائز نہیں اور جن کا گوشت کھایا جاتا ہے ان کا خصی نہ کرنا افضل ہے۔اور عزیمت کا یہی تقاضا ہے،البتہ خصی کرنا جائز ہے۔ اور اس کی اجازت ہے۔'' (ص:۳۳۳)

خصی جانور ذبح کرنے کے متعلق سنن ابی داؤد کی ایک روایت کی تحقیق

سوال : ''سنن ابی داؤد'' کی حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی روایت (جس میں جواز کا ذکر ہے) پر محدثین نے جو جرح کی ہے،اس کی کیا حیثیت ہے؟ (سائل) (۷ فروری ۲۰۰۳ء)

جواب : ''سنن ابی داؤد'' والی روایت ضعیف ہے۔اس کی سند میں مدلس راوی محمد بن اسحاق ''عن'' کے الفاظ سے روایت کرتے ہیں۔اسی طرح اس کی سند میں ابوعیاش راوی غیر معروف ہے۔لیکن ''مسند احمد'' اور ''حاکم'' میں ابورافع

[1] مجمع الزوائد، ج:۵، ص:۲۶۵، بَابُ النَّهْيِ عَنْ خِصَاءِ الْخَيْرِ وَغَيْرِهَا، رقم:۹۳۶۸

[2] نیل الاوطار، ۸/ ۹۱

کی روایت اس کی شاہد ہے۔ اس بناء پر اس کی سند حسن درجے کی ہوئی۔ ملاحظہ ہو: تنقیح الرواۃ (۱/ ۲۷۷)

بعض سلف سے خصی جانور ذبح کرنے کے متعلق ممانعت کی حیثیت؟

سوال : خصی جانور ذبح کرنے سے بعض سلف نے منع بھی کیا ہے۔ اگر یہ آثار درست ہیں تو خصی جانور ذبح کرنے منع کیوں نہیں ہیں؟ (سائل) (۷فروری ۲۰۰۳ء)

جواب : فی الواقع منع کے بعض آثار موجود ہیں لیکن مرفوع متصل روایات کے مقابلے میں ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ ہاں البتہ ''مسند بزار'' کی ایک روایت میں نہی وارد ہے۔ اگر اس روایت کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سے مراد وہ جانور ہیں جن کا گوشت نہیں کھایا جاتا اور جن جانوروں کا گوشت کھایا جاتا ہے ان کا خصی نہ کرنا افضل ہے اور عزیمت کا یہی تقاضا ہے۔ ہاں مذکور مستندات کی بناء پر خصی کرنا جائز ہے۔ اور اس کی اجازت ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو فتاویٰ علامہ شمس الحق عظیم آبادی: (۳۱۶ تا ۳۳۵)

کیا خرقاء اور جدعاء میں خصی ہونا نہیں آتا؟

سوال : کیا خرقاء اور جدعاء میں خصی ہونا نہیں آتا؟ (سائل) (۷فروری ۲۰۰۳ء)

جواب : خرقاء اس جانور کو کہتے ہیں جس کے کان میں گول سوراخ ہو۔ جدعاء وہ جانور جس کے ناک، کان، ہونٹ کٹے ہوں۔ اس لفظ کا زیادہ تعلق ناک سے ہے، جب مطلق آئے، غالباً مراد ناک کا کٹنا ہوتا ہے اور جانور کا خصی ہونا اس میں داخل نہیں۔ [1]

نرینہ جانور خصی کرنا کیسا ہے؟

سوال : ۳۔ نرینہ جانور بکرا وغیرہ خصّی کرنا کیسا ہے؟ بہت سارے مسلمان قربانی کے بکروں کو خصّی کرتے ہیں۔ کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ (محمد قاسم اللہ ڈنوں سموں گوٹھ حاجی محمد سموں کنری سندھ) (۱۱۔ اپریل ۱۹۹۷ء)

جواب : ۳۔ نر جانور بکرے وغیرہ کو خصّی کرنا جائز ہے۔ چنانچہ سنن ابن ماجہ میں حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ جب قربانی کا ارادہ فرماتے تو دو بڑے سینگوں والے سفید خصی کردہ دنبے خریدتے۔ [2] اسی طرح ''مسند احمد'' وغیرہ میں ابو رافع کی روایت میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے دو سفید خصی کردہ دنبوں کی قربانی دی۔ جملہ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو رسالہ "القول المحقق" مؤلفہ مولانا شمس الحق محدث عظیم آبادی رحمہ اللہ۔

---

[1] مرعاۃ المفاتیح: ۲/ ۳۵۹

[2] سنن ابن ماجه، بَابُ أَضَاحِيِّ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، رقم: ۳۱۲۲

(بھینس کی قربانی)

بھینس کی قربانی کا حکم؟

سوال: کیا جاموس (بھینسا) بھی قربانی کے لیے جائز ہے؟ (ایک متلاشی حق، فیصل آباد) (۲۴ اپریل ۹۲ء)

جواب: قرآن مجید نے قربانی کے لیے بَہِیْمَۃُ الْاَنْعَامِ کو متعین کیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ﴾ (الحج : ٣٤)

''تاکہ جو مویشی چارپائے اللہ نے ان کو دیے ہیں (اُن کے ذبح کرنے کے وقت) ان پر اللہ کا نام لیں۔''

''بَہِیْمَۃُ الْاَنْعَامِ'' سے مراد اُونٹ، گائے، بکری، دنبہ، چھترا وغیرہ ہیں ان میں بھینس شامل نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ان جانوروں کے علاوہ کی قربانی منقول نہیں۔ البتہ حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ بھینس کی قربانی کرنا جائز ہے۔ ان لوگوں نے بھینس کو گائے پر قیاس کیا ہے۔ لیکن سب لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ بھینس اوصاف کے اعتبار سے گائے سے بالکل مختلف جنس ہے۔ اس بناء پر فقہائے کرام نے اس بات کی صراحت کی ہے۔ کہ اگر کسی نے قسم کھالی کہ وہ گائے کا گوشت نہیں کھائے گا لیکن اس نے بھینس کا گوشت کھا لیا تو اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی۔ اور جن لغویوں نے اس کو گائے کی قسم قرار دیا ہے بظاہر تساہل معلوم ہوتا ہے۔ (وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ.)

اور کوئی کہے جب بھینس کی قربانی دینی درست نہیں، پھر تو اس کی زکوۃ بھی واجب نہیں ہونی چاہیے؟ اس اعتراض کا جواب شیخی المکرم محدث روپڑی رحمہ اللہ کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں۔

یاد رہے کہ بعض مسائل احتیاط کے لحاظ سے دو جہتوں والے ہوتے ہیں اور عمل احتیاط پر کرنا پڑتا ہے۔

ام المومنین سودۃ کے والد زمعہ کی لونڈی سے زمانہ جاہلیت میں عتبہ بن ابی وقاص نے زنا کیا۔ لڑکا پیدا ہوا۔ جو اپنی والدہ کے پاس پرورش پاتا رہا۔ زانی مر گیا اور اپنے بھائی سعد بن ابی وقاص کو وصیت کر گیا کہ زمعہ کی لونڈی کا لڑکا میرا ہے اس کو اپنے قبضہ میں کر لینا۔ فتح مکہ کے موقعہ پر سعد بن ابی وقاص نے اس لڑکے کو پکڑ لیا۔ اور کہا یہ میرا بھتیجا ہے۔ زمعہ کے بیٹے نے کہا یہ میرے باپ کا بیٹا ہے۔ لہٰذا میرا بھائی ہے اس کو میں لوں گا۔ مقدمہ دربارِ نبوی ﷺ میں پیش ہوا۔ تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

« اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ، وَلِلْعَاهِرِ الْحَجَرُ. » [1]

یعنی اولاد بیوی والے کی ہے اور زانی کے لیے پتھر ہیں۔''

یعنی وہ ناکام ہے اور اس کا حکم سنگسار کیا جانا ہے۔ بچہ سودہ رضی اللہ عنہا کے بھائی کے حوالہ کر دیا۔ جو حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کا

[1] مشکوۃ باب اللعان، فصل اول: ٣٠٣٧، صحیح البخاری، بَابٌ: لِلْعَاهِرِ الْحَجَرُ، رقم: ٦٨١٧

بھی بھائی بن گیا۔لیکن سودہ رضی اللہ عنہا کو حکم فرمایا کہ اس سے پردہ کرے، کیوں کہ اس کی شکل وصورت زانی سے ملتی جلتی تھی۔ جس سے شبہ ہوتا تھا کہ یہ زانی کے نطفہ سے ہے۔اس مسئلہ میں شکل وصورت کے لحاظ سے تو پردہ کا حکم ہوا۔اور جس کے گھر میں پیدا ہوا، اُس کے لحاظ سے اس کا بیٹا بنا دیا گویا احتیاط کی جانب کو ملحوظ رکھا۔ ایسا ہی بھینس کا معاملہ ہے۔اس میں بھی دونوں جہتوں میں احتیاط پر عمل ہوگا۔زکوٰۃ ادا کرنے میں احتیاط ہے اور قربانی نہ کرنے میں احتیاط ہے۔اس بناء پر بھینسے کی قربانی جائز نہیں اور بعض نے جو یہ لکھا ہے کہ اَلْجَامُوسُ نَوْعٌ مِنَ الْبَقَرِ یعنی بھینس گائے کی قسم ہے۔یہ بھی اسی زکوٰۃ کے لحاظ سے صحیح ہوسکتا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ بھینس دوسری جنس ہے۔

(فتاویٰ اہل حدیث، ج:۲،ص:۴۲۶۔۴۲۷)

یہ وہ عظیم مسئلہ ہے جس کی بنا پر محقق شہیر مولانا عبدالقادر حصاری رحمہ اللہ نے شیخی المکرّم کو مجتہد کے لقب سے نوازا تھا۔ [1] رحمهما الله رحمة واسعة

حضرت امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی اپنی صحیح میں اس احتیاطی پہلو کو خوب واضح کیا ہے۔ملاحظہ ہو: باب تفسير المشبهات كتاب البيوع)

یاد رہے گائے اور بھینس تیس راس میں سے ایک سال کا بچھڑا یا بچھڑی، بچہ یا بچی زکوٰۃ میں واجب ہے بشرطیکہ وہ باہر چرتی ہوں۔ان کا چارہ قیمتاً نہ ہو۔ [2]

بھینس کی قربانی جائز ہے یا ناجائز؟

سوال: بھینس کی قربانی جائز ہے یا ناجائز؟ علمائے بہاول پور کا موقف یہ ہے کہ بھینس کی قربانی کا چونکہ رسول اللہ ﷺ،صحابہ کرام سے کوئی ثبوت نہیں۔اور قرآن پاک کی ''سورہ الانعام'' کی (آیت۴۴) میں آٹھ نر و مادہ جانوروں کا ذکر ہے اور ان میں بھینس شامل نہیں۔لہٰذا اس کی قربانی بھی نہیں۔ (یہاں سے قربانی کا استدلال جائز نہیں۔کیونکہ یہ سورہ مکی ہے اور احکامِ قربانی مدینہ میں نازل ہوئے) جب کہ دوسرے شہروں سے یہاں آنے والے علمائے کرام کا موقف اس کے برعکس ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ بھینس کی قربانی اگرچہ مسنون نہیں مگر اس کا جواز ضرور ہے کیونکہ ''سورۃ الحج'' آیت نمبر:۳۴/۲۸ میں اللہ تعالیٰ نے قربانی کے لیے بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ (چوپائے) کی شرط لگائی ہے۔اور بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ کا لفظ عام ہے۔جس کو

[1] الاعتصام: مولانا عبدالقادر عارف حصاری مرحوم نے ابتداءً بھینس کی قربانی کے عدمِ جواز کا فتویٰ دیا تھا لیکن بعد میں رجوع کرکے جواز کا فتویٰ دے دیا تھا۔ جو الاعتصام میں چھپا ہوا موجود ہے۔علاوہ ازیں صاحب ''مرعاۃ'' شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ رحمانی رحمہ اللہ نے بھی اس کے جواز سے انکار نہیں کیا ہے تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو،''الاعتصام'' ۲۔اکتوبر،۱۹۸۱ء (ص۔ی)

[2] مؤطا امام مالك باب ما جاء فى صدقة البقرة، رقم:٢٤

اجماع امت نے گھریلو پالتو جانوروں کے ساتھ خاص کیا ہے اور یہ بھی باجماع امت سب پر واضح ہے کہ بھینس بھی پالتو بَہِیْمَۃُ الْاَنْعَامِ میں سے ہے لہٰذا باقی جانوروں کی طرح یہ بھی قربانی کے جانوروں میں داخل ہے۔

اگر اس آیت یعنی ''سورۃ الحج'' والی مدنی آیت کو ''سورۃ الانعام'' والی مکی آیت سے بھی خاص مان لیں اور بَہِیْمَۃُ الْاَنْعَامِ سے ابل، بقر، اور غنم مراد لیں تب بھی مسئلہ واضح ہے کیونکہ اہل لغت اور فقہاء کا اس بات پر اجماع ہے کہ بھینس بقر کی نوع ہے لہٰذا جس طرح بقر قربانی کے جانوروں میں شامل ہے کسی صریح اور صحیح دلیل کے بغیر اس کو بقر سے خارج کرنا ثابت نہیں۔ مزید برآں احکام قربانی پوری دنیا کے لیے ہیں۔ اس کو دنیا کے کسی خاص علاقے کے ساتھ محدود کرنا درست نہیں۔ یہاں پر یہ مسئلہ باعثِ نزاع بنا ہوا ہے۔ لہٰذا آپ اس بارے میں اپنی تحقیق کی روشنی میں فتویٰ ارسال فرما کر عنداللہ ماجور ہوں تاکہ ضعیف موقف ہم پر واضح ہو جائے۔ (محمد حنیف وینس، گنج بازار، بہاولپور) (۱۹ جون ۱۹۹۸ء)

جواب: بھینس کی قربانی درست نہیں۔ کیوں کہ یہ بَہِیْمَۃُ الْاَنْعَامِ میں شامل نہیں جن کی قربانی کا قرآن میں حکم ہے، وہ ہیں دنبہ، بکری، اونٹ، گائے، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ مرعاۃ المفاتیح (۲/۳۴۴۔۳۴۵) اور فتاویٰ اہل حدیث: (۲/۴۲۶۔۴۲۷)

بھینس کی قربانی سنت ہے یا بدعت

سوال: بھینس کی قربانی سنت ہے یا بدعت؟

جواب: بھینس اور بھینسے کی قربانی نہ کرنے میں احتیاط ہیں اس لیے کہ یہ جانور ﴿بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ﴾ (دنبہ، بکری، اونٹ، گائے) کی تعریف میں داخل نہیں اگرچہ ملحق ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: فتاویٰ اہل حدیث، ج:۲، ص: ۴۳۶۔۴۲۷۔

بھینس یا بھینسے کی قربانی جائز ہے؟

سوال: کیا بھینس یا بھینسے کی قربانی جائز ہے؟ نیز قربانی کے گوشت کا صحیح مصرف کیا ہے؟ قربانی کے جانور کو حلال کروانے کی اجرت کھال میں سے دی جاسکتی ہے؟ اور جانوروں کی کھالوں کا صحیح مصرف کیا ہے؟

(غلام عباس طاہر لیل، ضلع جھنگ) (۲۲ جون ۲۰۰۷)

جواب: ①.....شریعت میں قربانی صرف بَہِیْمَۃُ الْاَنْعَامِ کی ہے اور اس کا اطلاق اونٹ گائے اور بھیڑ بکری پر ہے۔ بھینس چوں کہ علیحدہ صنف معروف ہے اس کی قربانی نہیں ہوگی۔

اگر کوئی قسم کھالے کہ گائے کا گوشت نہیں کھائے گا پھر بھینس کا کھا لیا تو اس سے اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی لیکن حنفی مذہب میں بھینس کی قربانی کا جواز ہے۔ ''کنوز الحقائق'' میں ایک حدیث بیان ہوئی ہے جس میں بھینس کی قربانی کا جواز

ہے لیکن اس کی صحت ثابت نہیں باقی یہ دعویٰ کہ بھینس گائے کی قسم ہے واقعہ کے خلاف ہے۔

ہمارے شیخ محدث روپڑی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ ہاں زکوٰۃ کے مسئلہ میں بھینس کا حکم گائے والا ہے۔ یعنی نصاب کی صورت میں زکوٰۃ واجب ہے۔ نیز فرمایا یاد رہے کہ بعض مسائل احتیاط کے لحاظ سے دو جہتوں والے ہوتے ہیں اور عمل احتیاط پر کرنا پڑتا ہے۔ ام المومنین سودہ کے والد زمعہ کی لونڈی سے زمانہ جاہلیت میں عتبہ بن ابی وقاص نے زنا کیا لڑکا پیدا ہوا جو اپنی والدہ کے پاس پرورش پاتا رہا۔ زانی مرگیا اور اپنے بھائی سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو وصیت کرگیا کہ زمعہ کی لونڈی کا لڑکا میرا ہے اس کو اپنے قبضہ میں کرلینا۔ فتح مکہ کے موقعہ پر سعد بن ابی وقاص نے اس لڑکے کو پکڑ لیا اور کہا یہ میرا بھتیجا ہے۔ زمعہ کے بیٹے نے کہا یہ میرے باپ کا بیٹا ہے۔ لہٰذا میرا بھائی ہے اس کو میں لوں گا۔ مقدمہ دربار نبوی میں پیش ہوا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« الوَلَدُ لِلْفِرَاشِ، وَلِلْعَاهِرِ الحَجَرُ.»[1]

یعنی ''اولاد بیوی والے کی ہے اور زانی کے لیے پتھر ہیں۔''

یعنی وہ ناکام ہے اور اس کا حکم سنگسار کیا جانا ہے، بچہ سودہ کے بھائی کے حوالے کر دیا جو حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کا بھی بھائی بن گیا لیکن سودہ کو حکم فرمایا اس سے پردہ کرے۔ کیوں کہ اس کی شکل وصورت زانی سے ملتی جلتی تھی جس سے شبہ ہوتا تھا کہ یہ زانی کے نطفہ سے ہے۔ اس مسئلہ میں شکل وصورت کے لحاظ سے تو پردہ کا حکم ہوا اور جس کے گھر میں پیدا ہوا اس کے لحاظ سے اس کا بیٹا بنا دیا گیا۔ گویا احتیاط کی جانب کو ملحوظ رکھا۔ ایسا ہی بھینس کا معاملہ ہے اس میں بھی دونوں جہتوں میں احتیاط پر عمل ہوگا زکوٰۃ ادا کرنے میں احتیاط ہے اور قربانی نہ کرنے میں احتیاط ہے اس بناء پر بھینسے کی قربانی جائز نہیں اور بعض نے جو یہ لکھا ہے: « اَلْجَامُوْسُ نَوْعٌ مِنَ الْبَقَرِ » یعنی بھینس گائے کی قسم ہے یہ بھی اس زکوٰۃ کے لحاظ سے صحیح ہوسکتا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ بھینس دوسری جنس ہے۔ (فتاویٰ اہل حدیث: ۲/ ۲۲۶، ۲۲۷)

② ......قربانی کے گوشت کے تین حصے کرلیے جائیں۔ ایک گھر کے لیے دوسرا احباب تیسرا غرباء مساکین کے لیے۔ اس سلسلہ میں مستند ابن مسعود سے مروی ایک روایت ہے۔ (المغنی: ۱۳/ ۳۷۹)

③ ......قربانی کے جانور کو ذبح کروانے کی اجرت میں کھال وغیرہ نہیں دینی چاہیے۔ ملاحظہ ہو: صحیح بخاری باب لا يعطى الجزار من الهدى شيئا۔

④ ......کھالیں صدقہ کردینی چاہئیں ''صحیح بخاری'' يتصدق بجلود الهدى مع فتح الباری :۳/ ۷۰۲۔ ان سے خود بھی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔[2]

---

[1] صحيح البخاري، بَابٌ: لِلْعَاهِرِ الحَجَرُ، رقم:٦٨١٧، (مشكوة باب اللعان، فصل اول): ٣٠٢٧.

[2] فتاویٰ اهل حديث :٢/ ٤٤٠

بھینس اور بھینسے کی قربانی کا حکم؟

سوال : کیا بھینس اور بھینسے کی قربانی کی جا سکتی ہے؟ اس کی وضاحت حدیث کی روشنی میں فرمائیں۔

(سائل) (۱۲ اپریل ۲۰۰۲ء)

جواب : بھینس کی یا بھینسے کی قربانی درست نہیں کیونکہ شریعت میں قربانی کے لیے بَہِیْمَۃُ الْاَنْعَامِ کا تعین کیا گیا ہے۔ اس کا اطلاق اونٹ، گائے، بکری، دنبے اور چھترے پر ہوتا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مرعاۃ المفاتیح (۲/۳۵۳، ۳۵۴)

کیا بھینس کی قربانی جائز ہے؟

سوال : بعض علمائے کے نزدیک بھینس کی قربانی جائز ہے اور بعض کے نزدیک نہیں۔ برائے مہربانی اس امر کی وضاحت فرمادیں اور بالخصوص شیخ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ یا آپ کے استاذ حضرت علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ کا اس کے متعلق کیا خیال ہے؟ (سائل) (۲۶ اپریل ۲۰۰۲ء)

جواب : اصلاً قربانی صرف بَہِیْمَۃُ الْاَنْعَامِ کی ہے اور وہ اونٹ گائے، بکری، دنبہ، چھترا، نبی ﷺ اور صحابہ کرام سے ان کے علاوہ قربانی ثابت نہیں۔ البتہ حنفیہ کے نزدیک بھینس کی قربانی کا جواز ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ''مسند الفردوس دیلمی'' کی طرف منسوب ایک حدیث ذکر کی ہے لیکن اس کا حال غیر معلوم ہے اور بھینس کو گائے کی قسم قرار دینا تساہل ہے۔

''ابن ابی شیبہ'' میں حسن سے منقول ہے کہ بھینس بمنزلہ گائے ہے یا یہ کہنا کہ وہ گائے کی طرح ہے یہی اصل ہے جب کہ سب لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ بھینس گائے سے علیحدہ قسم ہے۔ اگر کسی نے قسم کھائی کہ گائے کا گوشت نہیں کھائے گا بھینس کا کھا لیا تو وہ حانث نہیں ہوگا۔ یعنی اس طرح قسم نہیں ٹوٹے گی۔ اس بناء پر اطمینان بخش بات یہ ہے کہ بھینس کی قربانی نہ کی جائے اور اگر کوئی کرلے تو اس پر ملامت نہیں۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو فتاویٰ اہل حدیث لشیخنا، محدث روپڑی (۲/۴۲۶)

''مرعاۃ المفاتیح'' (۲/۳۵۳۔۳۵۴) اور مشارٌ الیہ شیوخ بھی صرف بَہِیْمَۃُ الْاَنْعَامِ کے قائل ہیں اور ہمارے شیخ صاحب تفسیر ''اضواء البیان'' فرماتے ہیں۔

« وَمُرَاجَعَةُ الْحَقِّ خَيْرٌ مِنَ التَّمَادِي فِي الْبَاطِلِ.» (٦٣٥/٥)

''ظاہری آیت کی بناء پر زیادہ احتیاط والا مسلک یہ ہے کہ بَہِیْمَۃُ الْاَنْعَامِ کے علاوہ قربانی نہ کی جائے۔''

کیا بھینس کی قربانی کرنا درست ہے؟

سوال : کیا بھینس کی قربانی (نر یا مادہ) درست ہے؟ اور دلیل کیا ہے؟ بعض علماء ممانعت کا فتویٰ دیتے ہیں جیسے کہ مولانا داؤد غزنوی رحمہ اللہ کا رسالہ ہے۔ جس میں منع کیا گیا ہے؟

جواب : بھینس کی قربانی میں اہل علم کا اختلاف ہے۔علمائے احناف جواز کے قائل ہیں اس بناء پر کہ بھینس گائے کی قسم ہے۔لیکن یہ بات معروف ہے کہ بھینس گائے سے علیحدہ نوع ہے۔ان کا باہم بہت سارا فرق ہے جس سے انکار کی گنجائش نہیں۔اس بارے میں علامہ مناوی نے ''کنوز الحقائق'' میں ایک حدیث بھی بیان کی ہے لیکن وہ ثابت نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ بھینس بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ (اونٹ گائے بکری بھیڑ) میں شامل نہیں جن کی قربانی کا حکم ہے۔لہٰذا اس کی قربانی نہ کرنے میں احتیاط ہے۔تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: فتاویٰ اہل حدیث:۲/ ۴۲۶۔۴۲۷

(قربانی کی کھالوں کے مصارف)

کیا کھال ذاتی مصرف میں آ سکتی ہے؟

سوال : کھال کا مصرف کیا ہے؟ ذاتی استعمال کے لیے کھال رکھ سکتا ہے؟ اور کیا قصائی کو اجرت میں کھال دی جا سکتی ہے۔ (ابوطاہر نذیر احمد، عبدالرشید۔کراچی) (۲۳ فروری ۲۰۰۱ء)

جواب : ذبح کرنے والے قصاب کی مزدوری قربانی کے گوشت سے یا کھال کے ذریعے دینی جائز نہیں۔[1] البتہ اپنے استعمال یعنی مصلّٰی وغیرہ بنانے کے لیے رکھ سکتا ہے۔

قربانی دینے والا قربانی کی کھال کا جوتا یا جائے نماز بنا سکتا ہے؟

سوال : قربانی دینے والا قربانی کی کھال کا جوتا یا جائے نماز بنا سکتا ہے؟ (سائل) (۱۰ مئی ۲۰۰۲ء)

جواب : بظاہر جواز ہے کیونکہ یہ ایسا ہی ہے جیسے گوشت خود کھاتا اور دوسروں کو کھلاتا ہے۔''منتقی الاخبار'' میں قتادہ بن نعمان کی روایت میں ہے کہ: ''قربانی کا گوشت جب تک چاہو خود کھاؤ اور صدقہ کرو اور ان کے چمڑوں سے فائدہ اٹھاؤ اور فروخت نہ کرو۔''

قربانی کی کھال کسی مال دار دوست کو گوشت کی طرح بطورِ ہدیہ دی جا سکتی ہے؟

سوال : قربانی کی کھال کسی مال دار دوست کو بطورِ ہدیہ دی جا سکتی ہے جیسے گوشت ہدیۃً دیا جاتا ہے؟ (سائل) (۱۰ مئی ۲۰۰۲ء)

جواب : ہاں قربانی کی کھال کسی مال دار کو بطورِ ہدیہ دی جا سکتی ہے۔قربانی کے گوشت اور چمڑے کا حکم ایک جیسا ہے۔ ابتداء میں جب رسول اللہ ﷺ نے تین دن سے زیادہ قربانی کا گوشت رکھنے سے منع فرمایا تھا، تو صحابہ نے چمڑوں کی مشکیں بنانی بھی ترک کردی تھیں۔ اگر قربانی کا چمڑا گوشت کا حکم نہ رکھتا تو صحابہ رضی اللہ عنہم مشکیں بنانا ترک نہ کرتے۔(منتقی الاخبار)

---

[1] صحیح البخاری، رقم:۱۷۱۷، صحیح مسلم، بَابٌ فِي الصَّدَقَةِ بِلُحُومِ الْهَدْيِ وَجُلُودِهَا وَجِلَالِهَا، رقم:۱۳۱۷

قربانی کی کھال بیچ کر اس کی قیمت مساکین میں بانٹ دینا:

سوال: قربانی کی کھال دینے والا بیچ کر مساکین کو رقم بانٹ سکتا ہے؟ (سائل) (۱۰ مئی ۲۰۰۲ء)

جواب: اصل یہ ہے کہ قربانی کی کھال ہی صدقہ کی جائے، خود فروخت نہ کی جائے۔ چنانچہ ''الترغیب والترہیب'' میں حدیث ہے:

« مَنْ بَاعَ جِلْدَ أُضْحِيَّتِهِ فَلَا أُضْحِيَّةَ لَهُ .» [1]

''جس نے قربانی کا چمڑا فروخت کیا اس کی قربانی نہیں۔''

جیسے قربانی کا گوشت فروخت کرنا ناجائز ہے یہی حکم چمڑے کا بھی ہے۔ البتہ مستحقین کے لیے ہر قسم کے تصرف کا جواز ہے۔ اگر اتفاقاً صاحب قربانی نے قربانی کا چمڑا فروخت کر دیا تو اس کی قیمت خود نہ کھائے بلکہ فقراء و مستحقین پر بانٹ دے یا رقم جماعتی بیت المال میں جمع کرا دے۔

قربانی کے ایک حصے کی قیمت سے کھال وغیرہ منہا کرنا

سوال: ہمارے ہاں قربانی کی گائے کسی سے خریدی جاتی ہے یا کوئی حصہ دار اسے پالتا رہتا ہے۔ وہ پالنے والا جو خود بھی حصہ دار ہوتا ہے، قربانی کے دوسرے حصہ داروں کے اتفاق سے سر اور چمڑا اپنے حصے کی قیمت میں شامل کر کے رکھتا ہے۔ یا سب حصے داروں کے اتفاق سے کسی خریدنے والے کے ہاتھوں خصوصاً کھال فروخت کی جاتی ہے۔ بہر حال سر اور کھال دونوں فروخت کرنے یا کسی حصے دار کے اسے رکھنے کے نتیجے میں دوسرے حصہ داروں کے حصص کی قیمت میں کمی آتی ہے۔ تو کیا یہ صورت گوشت اور کھال فروخت کرنے کے زمرے میں آتی ہے۔ جس سے منع کیا گیا ہے؟ یا یہ صورت جائز ہے؟ بَيِّنُوْا تُوجَرُوْا۔ (عبدالرحیم بلتستان) (۹ اگست ۲۰۰۲ء)

جواب: اصلاً قربانی سے مراد وہ جانور ہے۔ جو عید کے دن اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے ذبح کیا جاتا ہے اور وہ شئے ایک ہے اس میں شراکت نہیں ہونی چاہیے۔ اس لیے اہل علم کہتے ہیں کہ مختلف نیتوں کے ساتھ افراد اس میں شریک نہیں ہو سکتے۔ مثلاً بعض کی نیت محض حصولِ گوشت کی ہو اور دیگر کی نیت قربانی کی تو اس طرح قربانی نہیں ہوگی۔ شریعت نے سات کی شراکت کی جو سہولت دی ہے یہ صرف رب العزت کا احسان ہے یہ حکم اپنے محل پر بند رہے گا۔

دوسری طرف اس شخص کی نیت کے خلوص میں بھی کمی واقع ہو جاتی ہے۔ جس سے اس قربانی کے ضائع ہونے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ بنابریں سر اور کھال کی تخصیص نہیں ہونی چاہیے۔ بلکہ اس میں سب حصہ دار برابر ہیں۔ اور کھال تو

[1] المستدرك للحاكم، تَفْسِيرُ سُورَةِ الْحَجِّ، رقم:۳٤٦٨، السنن الكبرى للبيهقي، بَابُ لَا يَبِيعُ مِنْ أُضْحِيَّتِهِ شَيْئًا، وَلَا يُعْطِي أَجْرَ الْجَازِرِ مِنْهَا، رقم:۱۹۲۳۳

ویسے بھی فقراء اور مساکین کا حق ہے جس کا لحاظ رکھنا از بس ضروری ہے۔ دوسری طرف ''ترغیب وترہیب'' میں حدیث ہے:

« مَنْ بَاعَ جِلْدَ أُضْحِيَّتِهِ فَلَا أُضْحِيَّةَ لَهُ.» ❶

''جس نے قربانی کا چمڑا فروخت کیا اس کی قربانی نہیں۔''

اسی طرح قربانی کا گوشت کرنا بھی بالاتفاق ممنوع ہے۔ شخص ہذا اس زد میں بھی آتا ہے۔ لہٰذا اس عمل سے احتراز ضروری ہے۔ اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ گائے پالنے والے کو باقاعدہ الگ سے مزدوری دی جائے جس کے ذمہ دار سب شرکاء ہوں۔

قربانی کی کھالیں کسی رفاہی کام میں استعمال کی جاسکتی ہیں؟

سوال: قربانی کی کھالیں کسی رفاہی کام میں استعمال کی جاسکتی ہیں؟ (سائل) (۱۰ مئی ۲۰۰۲ء)

جواب: قربانی کی کھال مستحق مسکین کو دینی چاہیے، عام رفاہی کاموں میں صرف کرنے سے احتراز کرنا چاہیے۔

کیا قربانی کی کھالوں سے برائے امام مسجد مکان تعمیر ہوسکتا ہے؟

سوال: قربانی کی کھالوں کی رقم، امام مسجد کے مکان پر صرف کی جاسکتی ہے یا نہیں۔ جب کہ جماعت بھی اس پوزیشن میں نہیں کہ وہ اس بوجھ کو اٹھا سکے۔

جواب: مصارفِ زکوٰۃ میں لفظ ''فی سبیل اللہ'' کو عام سمجھ کر بعض فقہائے کرام نے تمام اُمورِ خیر اور وجوہِ برّ (نیکی کے کاموں) میں مال زکوٰۃ کے صرف کو جائز رکھا ہے۔ مثلاً مُردوں کو کفن دینا۔ پُل بنانا۔ قلعے اور مسجدیں تعمیر کرنا وغیرہ وغیرہ۔ اس بنا پر امام مسجد کے لیے مکان کی تعمیر بھی اس میں داخل ہوسکتی ہے کیوں کہ قربانی کی کھالوں اور زکوٰۃ کے مصارف ایک ہی ہیں۔

اس عموم پر اگر کوئی عمل کرے اس پر اعتراض تو امرِ مشکل ہے۔ ہاں اس میں کچھ تأمل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر لفظ ''فی سبیل اللہ'' اتنا عام ہے تو دیگر مصارف فقراء ومساکین وغیرہ کو ذکر کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ اس لیے کہ وہ بھی ''فی سبیل اللہ'' میں شامل ہیں۔

جب ان کو علیحدہ بیان کیا گیا ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ ''فی سبیل اللہ'' کسی خاص شئے کا نام ہے۔ وہ ہے جہاد یا حج عمرہ، جہاد تو بالاتفاق مراد ہے اور حج عمرہ کو حدیث نے داخل کردیا ہے چنانچہ ''تفسیر فتح البیان'' میں ہے:

« وَالْاَوَّلُ اَوْلٰی لِاِجْمَاعِ الْجَمْهُوْرِ عَلَيْهِ.»

''یعنی پہلی صورت جہاد (مع حج) مراد ہونا بہتر ہے کیونکہ اس پر جمہور کا اجماع ہے۔''

---

❶ المستدرك للحاكم، تَفْسِيرُ سُورَةِ الْحَجِّ، رقم:٣٤٦٨

اور ''تفسیر خازن'' میں ہے:

« اَلْقَوْلُ الْاَوَّلُ هُوَ لِاِجْمَاعِ الْجَمْهُوْرِ عَلَيْهِ . »

''یعنی پہلا قول ہی صحیح ہے کیونکہ اس پر جمہور کا اجماع ہے۔''

کیا قربانی کی کھالیں امام مسجد کو دی جاسکتی ہیں؟

سوال: قربانی کی کھال مسجد کے خطیب و امام وغیرہ کے لیے لینی جائز ہے یا نہیں؟

(عبدالستار خطیب جامع مسجد اہل حدیث سمبلہ خورد) (۱۰ جولائی ۱۹۹۲ء)

جواب: قربانی کی کھالیں چونکہ غرباء و مساکین کا حق ہیں اس لیے ان کو خطابت و امامت کے عوض میں نہیں دیا جاسکتا۔ جب کہ نفس امامت کا عوض بھی محل نظر ہے۔ چہ جائیکہ اس شئے کو عوض بنایا جائے جس میں سرے سے عوض بننے کی صلاحیت ہی موجود نہیں۔ ہاں البتہ اگر خطیب و امام فقیر و مسکین ہے تو عام فقراء و مساکین کا لحاظ رکھتے ہوئے اسے کچھ دے دیا جائے تو کوئی حرج نہیں لیکن امامت کا عوض سمجھ کر نہ دیا جائے۔

امام مسجد کو قربانی کی کھالیں دینا

سوال: کیا نہایت ضرورت مند اور مقروض امام مسجد کو قربانی کی کھالیں دی جاسکتی ہیں؟

جواب: جملہ مستحقین کے حقوق کا خیال رکھتے ہوئے اور امام کے فقر و فاقہ اور ضروریاتِ زندگی کے پیش نظر اس کو قربانی کی کھالیں دی جاسکتی ہیں۔

قربانی کی کھالوں سے کسی عالم دین کے لیے دینی کتب خرید کرنا؟

سوال: قربانی کی کھالوں سے کسی عالم دین کے لیے دینی کتاب منگوائی جاسکتی ہیں کہ وہ انھیں پڑھ کر دین کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرے؟ (سائل) (۱۰ مئی ۲۰۰۲ء)

جواب: قربانی کی کھالوں سے عالم دین کے لیے خدمتِ دین کے جذبے سے کتابیں خریدی جاسکتی ہیں۔ حدیث میں قربانی کے چمڑوں کی بابت صدقہ کرنے کا حکم دیا ہے اور آیت ﴿لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (البقرۃ:۲۷۳) میں صدقات کے مستحق وہ لوگ بتائے گئے ہیں جو ''فی سبیل اللہ'' محصور ہیں۔ ان میں مستحق علماء بھی ہیں۔

قربانی کی کھالوں سے مسجد کی لائبریری کے لیے کتب خریدنا:

سوال: قربانی کی کھالوں سے مسجد کی لائبریری کے لیے دینی کتب خریدنا اور پھر بلا امتیاز اغنیاء و مساکین سب کا فائدہ اٹھانا کیسا ہے؟

(سائل حافظ عبدالرحمٰن صدیقی خطیب جامع مسجد محمدی اہل حدیث تلواڑہ راجپوتاں تحصیل ڈسکہ ضلع سیالکوٹ) (۲۵ دسمبر ۱۹۹۲ء)

جواب : قربانی کی کھالیں خالصتاً فقراء و مساکین کا استحقاق ہیں جب کہ لائبریری سے فائدہ اٹھانے والے بلاامتیاز اغنیاء و مساکین سبھی قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔اس لیے قربانی کی کھالیں لائبریری کی کتب پر صرف نہیں ہوسکتیں۔

قربانی کی کھال ذاتی کتب خانہ کے لیے استعمال کرنا

سوال : کیا قربانی کی کھال ذاتی کتب خانے ، ذاتی راستے یا عام رستے بنانے کے لیے استعمال ہوسکتی ہے؟

(محمد صدیق تلیاں، ایبٹ آباد) (۱۸ جون ۱۹۹۹ء)

جواب : قربانی کی کھال فقراء و مساکین کو دینی چاہیے۔اگر مصلّٰی یا ڈول وغیرہ بنا لیا جائے تو اس کا بھی جواز ہے لیکن رفاہِ عامہ کے کاموں میں صرف نہیں کرنی چاہیے اور فروخت کرکے پیسے کھانے کی بھی اجازت نہیں۔

قربانی کی کھالوں سے مدرسہ کی لائبریری قائم کرنا

سوال : مدرسہ عمر الحفیظ کے لیے قربانی کی کھالیں اکٹھی کرکے ایک بہت بڑی لائبریری قائم کی ہے۔اور مزید اس کی توسیع کے لیے ہم قربانی کی کھالوں کی رقم استعمال میں لانا چاہتے ہیں ۔کیا شرعی طور پر جائز ہے؟ اور واضح رہے کہ مدرسہ عمر الحفیظ میں صرف مقامی طلباء و طالبات تعلیم حاصل کرتے ہیں۔جب کہ لائبریری سے ہمہ وقت بیسیوں لوگ استفادہ کرتے ہیں اور اپنے قلوب کو قرآن و سنت کی روشنی سے منور کرتے ہیں اور اپنے غلط عقائد سے توبہ کرتے ہیں۔

(ناظم محمد صدیق المکتۃ المدینہ اسلامک لائبریری) (۳ جولائی ۱۹۹۸ء)

جواب : قربانی کی کھالیں فقراء اور مساکین کا حق ہے۔جب کہ لائبریری سے بلا امتیاز امیر و غریب سبھی مستفیض ہوتے ہیں۔اس لیے موجودہ شکل میں کھالوں کے مصرف سے احتراز کرنا چاہیے۔

قربانی کی کھالوں سے مسجد میں اسلامی لائبریری کا قیام

سوال : ہم ہر سال قربانی کی کھالوں سے لائبریری کی توسیع کرتے ہیں۔تو بعض بھائی اعتراض کرتے ہیں کہ قربانی کی کھالیں ،صرف خوراک فنڈ غرباء مساکین کی اعانت کے لیے ہی استعمال ہوسکتی ہیں جب کہ یہ لائبریری شرک و بدعت کے مضبوط ترین گڑھ میں واقع ہے۔جہاں پر کتاب و سنت اور مسلک حق کی ترویج کے لیے مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان حالات کو مدنظر رکھ کر مندرجہ بالا سوالات کے جوابات سے نوازیں۔ (سائل عبدالقیوم) (۴ دسمبر ۱۹۹۸ء)

جواب : قربانی کی کھالیں چونکہ غرباء و مساکین کا حق ہے جب کہ لائبریری سے بلا امتیاز سبھی لوگ فیض یاب ہوتے ہیں۔لہٰذا اس پر قربانی کی کھالیں صرف نہیں ہونی چاہئیں۔حصولِ زر کے لیے دیگر مباح ذرائع اختیار کرلیے جائیں تاکہ شکوک و شبہات سے بالاتر ہوکر صحیح نہج پر دینی خدمت سرانجام دی جاسکے۔ واللہ المستعان

قربانی کی کھالوں سے لائبریری کی کتابیں خریدنا کیسا ہے؟

سوال : آج کل تقریباً ہر مسجد میں مقامی سطح پر چھوٹی چھوٹی لائبریری کا اہتمام ہوتا ہے کیا قربانی کی کھالیں اس لائبریری پر خرچ ہوسکتی ہیں جو کہ عموماً مسجد میں ہی ہوتی ہے۔

(عبدالستار خطیب جامع مسجد اہل حدیث سمبلہ خورد) (۱۰ جولائی ۱۹۹۲ء)

جواب : قربانی کی کھالیں خالصتاً فقراء و مساکین کا استحقاق ہیں جب کہ لائبریری سے فائدہ اٹھانے والے بلا امتیاز اغنیاء و مساکین سبھی قسم کے لوگ ہوتے ہیں اس لیے قربانی کی کھالیں لائبریری کی کتب پر صرف نہیں ہوسکتیں۔

کیا امام مسجد قربانی کی کھالوں سے کتابیں خرید سکتا ہے؟

سوال : ہمارے علاقے میں تقریباً ۹۵ فیصد ائمہ وخطباء مساجد قربانی کی کھالیں لیتے ہیں۔ اور جو نہیں لیتے تو ان میں سے بعض ان سے اپنی دینی کتب خرید لیتے ہیں۔ کیا ایسا کرنا جائز ہے؟

(عبدالستار خطیب جامع مسجد اہل حدیث سمبلہ خورد) (۱۰ جولائی ۱۹۹۲ء)

جواب : یہ بات تو واضح ہے کہ خطباء وائمہ کے لیے قربانی کی کھالیں لینا ناجائز ہے اور اگر کوئی خطیب یا امام بلا استحقاق ان سے کتابیں خرید کرتا ہے تو یہ بھی ناجائز ہے۔

مسجد کو زکوٰۃ اور قربانی کی کھالیں لگ سکتی ہیں؟

سوال : کیا مسجد کو زکوٰۃ اور قربانی کی کھالیں لگ سکتی ہیں یا نہیں؟ (سائل) (۲۷ جولائی ۲۰۰۱ء)

جواب : زکوٰۃ اور قربانی کی کھالوں کو مسجد پر نہیں لگانا چاہیے۔ اگرچہ بعض لوگ لفظ ''فی سبیل اللہ'' کے عموم کی بناء پر جواز کے قائل ہیں لیکن راجح بات یہ ہے کہ اس سے مراد جہاد اور حج وعمرہ ہیں۔ ہمارے شیخ محدث روپڑی رحمہ اللہ طویل بحث کے بعد فرماتے ہیں: کہ اس لیے ظاہر یہی ہے کہ اس سے مراد خاص ہے اور خاص بغیر دلیل کے مراد نہیں ہوسکتا۔ دلیل یا تو آیت ہے یا اتفاق مفسرین جیسا جہاد کے مراد ہونے پر اتفاق ہے یا حدیث یا تفسیر صحابہ رضی اللہ عنہم ہے جیسا حج وعمرہ ہونے پر ہے باقی کی بابت کوئی دلیل نہیں۔ (فتاویٰ اہل حدیث: ۲/۴۹۵)

قربانی کے چمڑے مسجد پر نہیں لگ سکتے کیونکہ ان کا حکم قربانی کے گوشت کا حکم ہے۔ ''ترغیب وترہیب'' میں ایک روایت ہے جس نے قربانی کا چمڑہ فروخت کیا اس کی قربانی نہیں۔'' جس طرح گوشت فروخت کرکے اس کی قیمت مسجد میں نہیں لگ سکتی یہی حکم قربانی کے چمڑے کا ہے۔

قربانی کی کھالیں اسکولوں پر صرف ہوسکتی ہیں؟

سوال : بعض پرائیویٹ سکول اور تعلیمی ادارے جن میں زیر تعلیم طلباء سے فیس ۵۰ روپے تا ۱۵ روپے وصول کی جاتی

ہے۔ سرکاری سکولوں کا مروّجہ نصابِ تعلیم ان اداروں میں پڑھایا جاتا ہے۔ ان پرائیویٹ سکولوں کے بانی حضرات کا دعویٰ ہے کہ ہم تعلیمی انقلاب برپا کر رہے ہیں۔ فیس کی وصولی کے ساتھ ایسے ادارے زکوٰۃ، صدقات اور قربانی کی کھالیں بھی مانگتے ہیں۔ جب کہ ان کے مقابلے میں دینی ادارے موجود ہیں۔ جہاں، غریب، نادار، یتیم، مسافر طلباء دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ وہ دینی ادارہ طلباء کے جملہ اخراجات رہائش، خوراک، کتابیں، لباس کا کفیل اور ذمہ دار ہوتا ہے۔

کیا ایسے تجارتی مراکز اور کاروباری اداروں پر زکوٰۃ صدقات اور قربانی کی کھالیں خرچ کی جاسکتی ہیں؟ بَیِّنُوْا تُوجرُوْا۔ (۱۷/ اپریل ۱۹۹۸ء)

جواب: قربانی کی کھالوں اور زکوٰۃ وصدقات وغیرہ کے اصل حق دار تجارتی اور کاروباری اداروں کے بجائے افراد مستحقین ہیں۔ جن کی تصریح ''سورۃ التوبہ'' کی آیت نمبر ۶۰ میں ہے۔ تعلیمی ادارے اگر بلا معاوضہ ان کو مستحق طلبہ پر خرچ کرتے ہیں تو یہی مطلوب ہے اور ایسے اداروں اور مراکز کو قربانی کی کھالیں وغیرہ نہیں دینی چاہئیں جو محض تجارتی نقطہ نظر سے ان کو چلاتے ہیں۔

(ذبح کے آداب)

چھری کے علاوہ کس کس چیز سے جانور ذبح کیے جاسکتے ہیں؟

سوال: جانور تیز دھار چھری کے علاوہ کن اشیاء سے ذبح کیا جاسکتا ہے؟ (چھری یا چاقو نہ ہونے کی صورت میں)
(ڈاکٹر حق نواز قریشی، راولپنڈی) (۵ جولائی ۲۰۰۲ء)

جواب: تیز اور سفید پتھر سے بھی جانور ذبح ہوسکتا ہے اس کے بارے میں ''سنن ابی داؤد'' میں حدیث ہے۔ «بَابٌ فِی الذَّبِیحَةِ بِالْمَرْوَةِ .» بلکہ ہر وہ چیز جو تیز دھارے والی ہو اور اس سے خون بہہ جائے تو اس سے جانور ذبح ہو سکتا ہے۔ لیکن دانت اور ہڈی سے ذبح کرنا ممنوع ہے۔ ملاحظہ ہو: العون (۶۱/۳)

کیا اپنے ہاتھ سے قربانی کرنا ضروری ہے؟

سوال: کیا اپنے ہاتھ سے قربانی کرنا ضروری ہے؟ (ابوطاہر نذیر احمد، عبدالرشید۔ کراچی) (۲۳ فروری ۲۰۰۱ء)

جواب: مستحب تو یہی ہے کہ ذبح خود کرے، اگر ذبح کرنے کے لیے دوسرے کو اپنا نائب بنا دے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے، البتہ ذبح کے وقت وہاں موجود رہے۔

اونٹ کو نحر کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

سوال: اونٹ کو نحر کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ بعض لوگ تین جگہ سے ذبح کرتے ہیں۔
(ولی اللہ رحمانی دوست پورہ کھڈیاں خاص ضلع قصور) (۹ ستمبر ۱۹۹۴ء)

جواب : کھڑے اونٹ کو بائیں ٹانگ باندھ کر سینہ پر چھرا لگا کر نحر کیا جاتا ہے۔ تین جگہ سے ذبح کا کوئی مسئلہ نہیں۔

اونٹ کو ذبح کرنے کا مروجہ طریقہ (تین جگہ سے ذبح کرنے کا) درست ہے؟

سوال : اونٹ کو ذبح کرنے کا جو طریقہ رائج ہے کہ تین جگہ سے ذبح کرتے ہیں، کیا یہ درست ہے؟

(سائل) (۱۰ مئی ۲۰۰۲ء)

جواب : اصلاً شرع میں اونٹ کے لیے نحر ہے جب کہ گائے اور بکری وغیرہ کے لیے ذبح ہے۔ واضح رہے کہ اونٹ کو کھڑا کر کے قربان کیا جاتا ہے اس کا ایک پاؤں باندھ دیا جاتا ہے۔ پھر اس کے حلقوم میں زور سے نیزہ مارا جاتا ہے۔ جس سے خون کا ایک فوارہ نکل پڑتا ہے، پھر جب خاصا خون نکل جاتا ہے تب اونٹ زمین پر گر پڑتا ہے۔ یہی مفہوم ہے ﴿صَوَآفَّ﴾ کا۔ ابن عباس، مجاہد، ضحاک وغیرہ نے اس کی یہی تشریح کی ہے بلکہ نبی ﷺ سے بھی یہی منقول ہے۔ چنانچہ مسلم اور بخاری میں روایت ہے کہ ابن عمر نے ایک شخص کو دیکھا جو اپنے اونٹ کو بٹھا کر قربان کر رہا تھا اس پر انھوں نے فرمایا:

«ابْعَثْهَا قِيَامًا مُقَيَّدَةً سُنَّةَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.» [1]

''اس کے پاؤں باندھ کر کھڑا کر! یہ ہے ابو القاسم ﷺ کی سنت۔''

''سنن ابی داؤد'' میں جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ اور آپ کے صحابہ اونٹ کا بایاں پاؤں باندھ کر باقی تین پاؤں پر اسے کھڑا کرتے تھے، پھر اس کو نحر کرتے تھے۔ اس مفہوم کی طرف خود قرآن بھی اشارہ کر رہا ہے۔ ﴿فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا﴾ (الحج:٣٦)

''جب ان کی پیٹھیں زمین پر ٹک جائیں۔''

اس طرح اس صورت میں کہا جائے گا جب کہ جانور کھڑا ہو اور پھر زمین پر گرے، ورنہ لٹا کر قربانی کرنے کی صورت میں تو پیٹھ ویسے ہی ٹکی ہوئی ہوتی ہے۔ [2]

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: فتح الباری (۹/ ۶۴۰۔۶۴۱)

البتہ اونٹ کو تین جگہ سے ذبح کرنے کا رائج طریقہ سنت سے ثابت نہیں۔

کیا عند الذبائح جانور کو قبلے رُخ لٹانا ضروری ہے؟

سوال : کیا عند الذبائح جانور کو قبلے رُخ لٹانا ضروری ہے؟ (عبد الغنی عاصم۔ لسبیلا) (۵ مئی ۲۰۰۰ء)

---

[1] صحيح البخاري، بَابُ نَحْرِ الْإِبِلِ مُقَيَّدَةً، رقم:١٧١٣

[2] تفهيم القرآن:٣/ ٢٢٧

جواب: سماحۃ المفتی محمد بن ابراہیم آل الشیخ رحمہ اللہ ذبح کی سنتیں ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

'''نمبر:۵۔ یہ ہے کہ جانور کو قبلہ رُخ کیا جائے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے جب کوئی جانور ذبح کیا، یا کسی ہدی کو نحر کیا تو اسے قبلہ رخ کیا۔ اونٹ کا کھڑے کھڑے بایاں گھٹنا باندھنا چاہیے۔ بکری اور گائے کو بائیں طرف لٹانا چاہیے۔ [1]

واضح ہو کہ جانور کو قبلہ رُخ لٹانے کا اہتمام ہونا چاہیے۔ اگر کسی وقت نہ بھی ہو سکے تو ذبیحہ درست ہوگا۔ ان شاء اللہ۔ فعل ہذا ضروری نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شریعت نے بے قابو دوڑے ہوئے اونٹ کے نحر کو ہر ممکن صورت میں جائز رکھا ہے۔

قریب المرگ جانور کا ذبح کرنا

سوال: جب کسی جانور کے مرنے کا خطرہ ہو تو کیا اس کو ذبح کیا جا سکتا ہے؟ (محمد شاہد۔ حجرہ شاہ مقیم) (۲۸ ستمبر ۲۰۰۱ء)

جواب: حلال جانور کے مرنے کا خطرہ لاحق ہو تو فوراً ذبح کر دینا چاہیے۔ ''صحیح بخاری'' میں ہے:

« مَنْ نَسِيَ فَلَا بَأْسَ.» [2]

یعنی جو بوقت ذبح اللہ کا نام لینا بھول گیا ہو تو (ایسے ذبیحے کے کھانے میں) کوئی حرج نہیں۔''

اس اثر کو ''دار قطنی'' اور ''سعید بن منصور'' وغیرہ نے موصول ذکر کیا ہے۔ آپ نے تو دورانِ ذبح تسمیہ کہہ لیا ہے۔ لہٰذا جانور حلال ہے اور اگر بھول کر تکبیر بالکل ہی رہ جاتی تو سابقہ دلیل کی بناء پر پھر بھی حلال تھا۔ امام احمد رحمہ اللہ اور اہل علم کے ایک گروہ کا مسلک بھی یہی ہے۔ [3]

(ذبح کے احکام)

سرکٹی مرغی کے ذبح کا حکم

سوال: ایک مرغی کا بس کے نیچے آ کر سر جدا ہو گیا اور جان جسم میں باقی ہے۔ مرنے سے قبل گردن کی جانب سے ذبح کر دی ہے۔ مذکورہ صورت میں مرغی حلال ہے یا حرام؟ بَيِّنُوا تُوجَرُوا

(مولانا محمد زکریا صاحب نائب شیخ الحدیث مسجد قدس دالگراں چوک لاہور) (۳۰ جولائی ۱۹۹۳ء)

جواب: تجربہ اور مشاہدہ کے مطابق کسی متنفس کی زندگی اور حیات کا تعلق اس کے سر ہی کے ساتھ ہے۔ اگر سر سلامت

---

[1] فتاویٰ اسلامیہ: ۳/ ۴۳۱

[2] صحیح البخاری، فی ترجمة الباب: التَّسْمِيَةِ عَلَى الذَّبِيحَةِ، وَمَنْ تَرَكَ مُتَعَمِّدًا۔ قبل رقم الحدیث: ۵۴۹۸

[3] فتح الباری: ۹/ ۶۲۴

رہے تو وہ زندہ ہے ورنہ مردہ اور بے جان لاشہ ہے۔ آج کی سائنس نے ہماری اس رائے کی تصدیق کر دی ہے اور وہ اس طرح کہ ڈاکٹر حضرات نہ صرف دل کا آپریشن کر رہے ہیں اور دلوں کا تبادلہ بھی سننے میں آ رہا ہے۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ انتقالِ قلب کے وقت انسان زندہ رہ سکتا ہے جب کہ ایسا کبھی سننے اور دیکھنے میں نہیں آیا کہ کسی تن اور دھڑ سے اس کا سر جدا ہو گیا ہو یا اس کو جدا کر دیا گیا ہو اور وہ تن یا دھڑ زندہ رہ گیا ہو۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ زندگی اور موت میں سر ہی حد فاصل ہے۔ اگر سر سلامت ہے اور اس کا رابطہ دھڑ کے ساتھ قائم ہے تو وہ متنفس زندہ ہے۔ ورنہ مردہ ہے۔

لہٰذا وہ مرغی سر جدا ہو جانے کی صورت میں بالکل مردہ تھی۔ لہٰذا اس کو ذبح کرنے کی کوشش بالکل بے سود اور بعد از وقت تھی یعنی وہ حرام ہو چکی تھی۔ (هٰذَا مَا عِنْدِیْ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.)

مرغی ذبح کرتے وقت اگر پوری گردن کٹ جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟

سوال: مرغی ذبح کرتے وقت اگر پوری گردن کٹ جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ حلال یا حرام؟

(تلمیذکم: حافظ عبدالوحید) (۲۴ نومبر ۲۰۰۰ء)

جواب: مرغی وغیرہ ذبح کرتے وقت اگر پوری گردن کٹ جائے تو پھر بھی حلال ہے۔ چنانچہ "صحیح بخاری" کے ترجمۃ الباب میں ہے:

«وَقَالَ ابْنُ عُمَرَ: وَابْنُ عَبَّاسٍ، وَأَنَسٌ: إِذَا قَطَعَ الرَّأْسَ فَلَا بَأْسَ.» [1]

"یعنی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما، ابن عباس رضی اللہ عنہما، اور انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب جانور کی گردن کٹ جائے تو کوئی حرج نہیں۔" یعنی پھر بھی حلال ہے۔"

اذان دینے والی مرغی کو ذبح کرنا

سوال: اگر مرغی اذان دے تو اس کو ذبح کر دینا چاہیے یہ رجحان عام ہے۔ کیا یہ قرآن وسنت سے ثابت ہے؟ (محمد جہانگیر، آزاد کشمیر) (۱۸ اکتوبر ۱۹۹۶ء)

جواب: اذان دینے والی مرغی کو ذبح کر دینے کا رجحان غلط اور جاہلانہ توہم پرستی پر مبنی ہے۔ ضرورت ہو تو اسے ذبح کرنا بلا تردد جائز ہے۔ ممانعت کی کوئی دلیل نہیں۔ محض اذان کی وجہ سے اسے ذبح کر دینا جاہلانہ فعل ہے۔ شریعت میں اس کا کوئی اصل نہیں۔ پھر جانوروں کی مخصوص اوقات میں بولی پر اذان کا اطلاق عرف عام میں مجازی ہے۔ حقیقتاً نہیں۔ جس طرح کہ جمرات کو عامۃ الناس شیاطین سے موسوم کرتے ہیں۔

[1] صحیح البخاری، بَابُ الْأَمْرِ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّهْيِ عَنِ الْمُنْكَرِ، قبل رقم الحدیث: ۵۵۱۰

مرغی کو ذبح کر کے کھالینا اور اس کی قیمت مسجد میں دے دینا

سوال: ایک آدمی نے ایک مرغی خدا کے نام پر پال رکھی ہے اور جب وہ بڑی ہوتی ہے تو وہ اس کو خود ذبح کر کے کھا جاتا ہے اور اس کی قیمت مسجد میں دے دیتا ہے۔ کیا یہ درست ہے؟

(محمد زکریا، متعلّم جامعہ کمالیہ دارالحدیث راجووال) (۱۶ جنوری ۱۹۹۸ء)

جواب: بہ نیت نفلی صدقہ جانور بہتر ہے کہ اسے ذبح کر کے یا زندہ صدقہ کر دیا جائے۔ اگر کسی وجہ سے ایسا نہ ہو سکے تو قیمت دینے میں بھی بظاہر کوئی حرج نہیں۔

بے نماز مسلمان کا ذبیحہ درست ہے یا نہیں؟

سوال: بے نماز مسلمان کا ذبیحہ درست ہے یا نہیں؟ (محمد صدیق تلیاں، ایبٹ آباد) (۱۸ جون ۱۹۹۹ء)

جواب: بے نماز کے ذبیحہ سے بچنا چاہیے۔

کس قسم کے کتے کا شکار کیا ہوا جانور حلال ہے؟

سوال: شکاری کتا بوقت شکار کس طرح چھوڑا جائے اور کس قسم کے کتے کا شکار کیا ہوا جانور حلال ہے؟ اگر کتا شکار کیے ہوئے جانور کا کچھ حصہ کھا جائے تو اس جانور کے بارے میں کیا حکم ہے؟

(ڈاکٹر حق نواز قریشی، راولپنڈی) (۵ جولائی ۲۰۰۲ء)

جواب: سدھائے ہوئے جانور بالخصوص کتے کی پہچان یہ ہے کہ بلانے پر فوراً تعمیل کرے، شکار پر جھپٹنے کا اشارہ دیا جائے تو جھپٹے، روکا جائے تو رُک جائے۔ البتہ کتے کے علاوہ کسی اور جانور میں رُکنے والی صفت ناممکن ہے۔ مذکورہ اوصاف کے حامل تعلیم یافتہ کتے کا شکار حلال ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَ مَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَ اذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ﴾(المائدة:٤)

''اور جو شکاری درندے تم نے شکار کرنے کو سدھائے ہوں (اور) جن کو تم شکار کی تعلیم دیتے ہو، جس طرح کہ اللہ نے تم کو تعلیم دی ہے جو وہ تمہارے واسطے محفوظ رکھیں تو وہ تم کھالیا کرو اور اس پر اللہ کا ذکر کیا کرو۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''اور تم سدھائے ہوئے کتے کے ساتھ جو شکار کرو اس پر اللہ کا نام ذکر کرلو پھر کھاؤ۔''[2]

[1] صحيح البخاری، بَابُ إِذَا أَكَلَ الكَلْبُ، رقم: ٥٤٨٣

[2] أيضًا

شکاری جانور یعنی کتا وغیرہ شکار سے اگر کھالے تو اس میں سے نہیں کھانا چاہیے۔ صحیحین میں حدیث ہے کہ: ''کتا شکار میں سے اگر کھالیتا ہے تو تو نہ کھا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس نے اسے اپنے لیے پکڑا ہے۔''❶

سابقہ آیت میں بھی یہی ہے کہ اس سے کھاؤ جو انھوں نے تمہارے لیے روک لیا ہے۔

یہودی یا عیسائی اگر خاموشی سے جانور ذبح کردے تو کیا حکم ہے؟

سوال: ۱۱ نومبر ۱۹۹۴ء، شمارہ ۴۵ میں ''احکام ومسائل'' میں آپ نے یہود ونصاریٰ کے ذبیحہ کے متعلق لکھا تھا کہ ان کا ذبیحہ حلال ہے لیکن اگر تو سنے کہ وہ غیر اللہ کا نام لے رہا ہے تو مت کھا، لیکن اگر ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کسی کا نام لیے بغیر ذبح کرتا ہے۔ یعنی کسی کا نام نہیں لیتا بلکہ وہ گوشت بیچنے کے لیے کرتا ہے تاکہ رقم ملے تو اس کے متعلق کیا حکم ہے؟ کیا ان کا وہ ذبیحہ حلال ہے؟ اس کے علاوہ اگر یہود ونصاریٰ کے علاوہ کسی اور مذہب سے تعلق رکھتا ہو یا کسی سے تعلق نہ ہو اور پھر کسی کا نام لیے بغیر ذبح کرے اور ہم کو اچھی طرح معلوم ہو تو کیا اس کا گوشت کھانا جائز ہے؟ تفصیل سے ذکر فرمائیں۔

(سائل۔ ارسلان حسن خان برکی، فیصل آباد) (۳۰ جون ۱۹۹۵ء)

جواب: جس یہودی یا عیسائی کے بارے میں معلوم ہو جائے کہ اس نے اللہ کا نام لیے بغیر ہی خاموشی سے جانور ذبح کردیا ہے یہ بھی نہیں کھانا چاہیے۔

قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِاسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ﴾ (الانعام:۱۲۱)

''اور جس چیز پر اللہ کا نام نہ لیا جائے اسے مت کھاؤ کہ اس کا کھانا گناہ ہے۔''

یہود ونصاریٰ کے علاوہ دیگر ادیانِ باطلہ والوں کا ذبیحہ ہر صورت حرام ہے کیونکہ شرعی نص میں صرف ان کو مخصوص کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَ طَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ﴾ (المائدۃ:۵)

''اور اہل کتاب کا کھانا بھی تم کو حلال ہے۔''

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَالطَّعَامُ اِسْمٌ لِمَا يُؤْكَلُ وَالذَّبَائِحِ مِنْهُ وَهُوَ هُنَا خَاصٌّ بِالذَّبَائِحِ عِنْدَ كَثِيْرٍ مِّنْ اَهْلِ الْعِلْمِ بِالتَّاْوِيْلِ » ❷

❶ أيضًا

❷ الجامع لاحكام القرآن:٦/ ٧٦

مشرک کے ذبیحہ کے بارے میں کیا حکم ہے؟

سوال: مشرک کے ذبیحہ کے بارے میں کیا حکم ہے؟ (محمد صدیق تلیاں، ایبٹ آباد) (۱۸ جون ۱۹۹۹ء)

جواب: مشرک کے ذبیحہ سے اجتناب ضروری ہے۔ البتہ یہود ونصاریٰ کا ذبیحہ اس سے مستثنیٰ ہے۔

امریکہ میں عیسائیوں کا ذبیحہ:

سوال: امریکہ وغیرہ میں کرسچن وغیرہ لوگ جانوروں کو ذبح کرتے ہیں۔ ذبح کرتے وقت نہ اللہ کا نام لیتے ہیں نہ کسی اور کا۔ اس طرح ذبح شدہ جانور کے گوشت کا کیا حکم ہے حلال ہے یا حرام؟

جواب: قرآن مجید کے عموم ﴿ وَ طَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ﴾ (المائدۃ:۵) کی بناء پر بظاہر حلت ہے۔

مشینی ذبیحہ کی شرعی حیثیت:

سوال: مشینی ذبیحہ کی شرعی حیثیت واضح فرمائیں؟ (محمد صدیق تلیاں، ایبٹ آباد) (۱۸ جون ۱۹۹۹ء)

جواب: مشینی ذبیحہ درست نہیں کیونکہ اس طرح خون نہیں بہتا۔ جب کہ حدیث میں ہے:

«مَا أَنْهَرَ الدَّمَ.» [1]

اور جواہر الفقہ (۲/۳۱۶) میں ہے: ''اتنی بات متعین ہے کہ اگر جانور کی عروقِ ذبح نہیں کاٹی گئیں یا ذبح کرنے والا مسلمان یا کتابی نہیں ہے یا سب کچھ ہے مگر ذبح کے وقت اللہ کا نام لینا قصداً چھوڑ دیا۔ یا کسی غیر اللہ کا نام اس پر ذکر کیا ہے۔ تو وہ ذبیحہ حلال نہیں۔''

کسی مشین میں شرائطِ مذکور کی خلاف ورزی نہ ہو تو اس کا ذبح کیا ہوا جانور حلال ہے۔ اگر ان میں سے ایک شرط بھی فوت ہو جائے تو ذبیحہ حرام ہو جائے گا اور جب تک صحیح صورت معلوم نہ ہو، اس وقت تک مشینی ذبیحہ کے گوشت سے احتیاط کرنا واجب ہے۔ (وَاللّٰهُ سُبْحَانَهُ وَتَعَالٰى اَعْلَمُ.)

(عقیقہ کے مسائل)

کیا عقیقہ واجب ہے؟

سوال: کیا عقیقہ واجب ہے؟ جو شخص عقیقہ نہ کرسکتا ہو تو اس کے متعلق کیا حکم ہے؟

(محمد جہانگیر، آزاد کشمیر) (۱۸ اکتوبر ۱۹۹۶ء)

جواب: عقیقہ کے وجوب اور عدمِ وجوب میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ ظاہر بات یہ ہے کہ حتی المقدور عقیقہ کا اہتمام

[1] صحيح البخاري، بَابُ مَنْ عَدَلَ عَشْرًا مِنَ الغَنَمِ بِجَزُورٍ فِي القسم، رقم:۲۵۰۷

ہونا چاہیے۔کاہلی اور سستی سے گناہ گار ہونے کا اندیشہ ہے۔ ہمارے شیخ محدث روپڑی رحمہ اللہ وجوب کے قائل ہیں۔ جب کہ امام شوکانی رحمہ اللہ کا نظریہ استحباب کا ہے۔لیکن شیخنا رحمہ اللہ نے علامہ شوکانی رحمہ اللہ سے موافقت نہیں کی بلکہ ان کے خلاف دلائل پیش کیے ہیں۔ ملاحظہ ہو: فتاویٰ اہل حدیث (۳/۳۰۸،۳۰۹) اور جس کو عقیقہ کی استطاعت نہ ہو یہ قابل مؤاخذہ نہیں۔ممکن ہے اس کو نیت کا ثواب عمل سے زیادہ مل جائے۔حدیث میں ہے:

« نِيَّةُ الْمُؤْمِنِ خَيْرٌ مِّنْ عَمَلِهِ .» ❶

عقیقہ کب اور کب تک؟

سوال : ہم نے بچے کا عقیقہ نہیں کیا۔اب بچہ پانچ ماہ کا ہونے والا ہے کیا ہم اب بھی عقیقہ کر سکتے ہیں؟ اس کے علاوہ کئی لوگوں نے بچوں، بچیوں کا عقیقہ نہیں کیا۔کیا وہ اب بھی کئی سال کے بعد بچوں کا عقیقہ کر سکتے ہیں۔صحیح طریقہ اور مقدار بھی بتادیں؟ (ام طلحہ۔جہلم) (۱۲ فروری ۱۹۹۹ء)

جواب : جامع ترمذی میں حدیث ہے:

«يُذْبَحُ عَنْهُ يَوْمَ السَّابِعِ .» ❷

''یعنی بچے کی طرف سے ولادت کے ساتویں روز عقیقہ کیا جائے۔''

امام مالک رحمہ اللہ بھی اسی بات کے قائل ہیں۔لیکن ان کے نزدیک یومِ ولادت اس میں شامل نہیں۔ الا یہ کہ بچہ طلوعِ فجر سے پہلے پیدا ہو،لیکن اطلاقِ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ولادت کا دن بھی اس میں شامل ہے۔محدث مبارکپوری رحمہ اللہ نے اسی مسلک کو اختیار کیا ہے۔پھر ظاہر حدیث اس بات پر دال ہے کہ عقیقہ کیلیے ساتواں دن مقرر ہے۔ علامہ مبارکپوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«قُلْتُ وَالظَّاهِرُ أَنَّ الْعَقِيقَةَ مُؤَقَّتَةٌ بِالْيَوْمِ السَّابِعِ فَقَوْلُ مَالِكٍ هُوَ الظَّاهِرُ وَاللّٰهُ تَعَالٰى أَعْلَمُ وَأَمَّا رِوَايَةُ السَّابِعِ الثَّانِي وَالسَّابِعِ الثَّالِثِ فَضَعِيفَةٌ كَمَا عَرَفْتَ فِيمَا مَرَّ.»❸

''یعنی میں کہتا ہوں عقیقہ کے لیے ساتواں دن مقرر ہے۔مالک رحمہ اللہ کا قول ہی ظاہر ہے۔(وَاللّٰهُ سُبْحَانَهُ وَتَعَالٰى اَعْلَمُ .)،اور جہاں تک تعلق ہے دوسرے اور تیسرے ہفتے میں عقیقہ کرنے کا۔سو یہ روایات کمزور ہیں۔''

❶ المعجم الكبير للطبرانی ، رقم:٥٩٤٢ ، شعب الايمان ، بَابُ إِخْلَاص العمل لله عزوجل ، رقم:٦٤٤٧

❷ سنن الترمذی ، بَابٌ مِنَ الْعَقِيقَةِ ، رقم:١٥٢٢ ، سنن ابن ماجه ، بَابُ الْعَقِيقَةِ ، رقم:٣١٦٥

❸ تحفة الاحوذی:٥/ ١١٦ ، طبع مصری

جس طرح کہ ہماری سابقہ وضاحت سے آپ کو معلوم ہوا ہے۔محترم آپ کا بچہ چونکہ پانچ ماہ کا ہونے والا ہے اس کا اور دیگر زائد مدت بچوں کا عقیقہ اب نہیں ہوسکتا۔عقیقہ صرف ساتویں روز ہی ہوسکتا ہے۔اس کے علاوہ نہیں۔کما تقدم فی نص الحدیث۔

عقیقہ کے احکام کیا ہیں؟، پندرہ سولہ سال عمر کے بعد عقیقہ ہوگا یا صدقہ؟

سوال : عقیقہ کے احکام کیا ہیں؟ ایک شخص کے دو بیٹے ہیں اور ان کی عمریں ۱۶/۱۵ برس ہیں۔کیا اب عقیقہ ہوگا یا صرف صدقہ کا اجر ملے گا؟ نیز طریقۂ کار کیا ہے؟ (سائل: حافظ فیض الرحمٰن فاروقی، سندھ) (۱۵ اکتوبر ۱۹۹۹ء)

جواب : عقیقہ اس جانور کو کہتے ہیں جو بچے کی پیدائش کے ساتویں دن ذبح کیا جاتا ہے۔(منہاج المسلم،ص۳۱۲)اس کے چند احکام مختصراً یہ ہیں:

لڑکی کی طرف سے ایک جانور اور لڑکے کی طرف سے دو جانور دینا مستحب ہے۔اور یہ بھی مستحب ہے کہ ساتویں دن بچے کا اچھا نام تجویز کیا جائے۔اس دن سر مونڈا جائے اور بالوں کے ہم وزن چاندی خیرات کردی جائے۔وغیرہ وغیرہ۔

اصل یہ ہے کہ عقیقہ ساتویں دن کیا جائے۔حدیث میں ہے:

«يُذْبَحُ عَنْهُ يَوْمَ السَّابِعِ.» ❶

اس کے بعد عقیقہ کرنے کی کوئی نص صریح صحیح نظر سے نہیں گزری اور اس میں تو کوئی اشکال نہیں کہ صدقہ کا اجر ملے گا۔ان شاء اللہ۔طریقۂ کار یہ ہے کہ فقراء و مساکین میں تقسیم کردیا جائے۔

مسنون طریقۂ عقیقہ کیا ہے؟ جانور کا گوشت کچا تقسیم کیا جائے یا پکا کر؟

سوال : کیا عقیقہ میں جانور کا مسنّہ ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ اور عقیقہ کا مسنون طریقہ کیا ہے؟ آیا جانور ذبح کر کے تقسیم کر دیا جائے یا پکا کر لوگوں کو کھلایا جائے؟ نیز بعض جاہل لوگوں کا خیال ہے کہ بچے کے والدین عقیقہ کا گوشت نہ کھائیں۔کیا یہ صحیح ہے؟ (عبدالستار) (۴۔اپریل ۱۹۹۷ء)

جواب : عقیقہ کے جانور کے بارے میں کسی حدیث میں تصریح وارد نہیں۔صرف «مُكَافِئَتَانِ» ❷ کا لفظ آیا ہے اور اس کے معنی میں اختلاف ہے کسی کے نزدیک قربانی کے جانور کے برابر اور بعض نے کہا ایک دوسرے کے برابر اور ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ ذبح ہونے میں برابر یعنی ایک دوسرے کے متصل ذبح کیے جائیں۔لہٰذا احتیاط اس میں ہے کہ مُسنّہ ذبح کیا جائے اور عقیقہ کے جانور کے گوشت کا حکم قربانی جیسا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

---

❶ سنن الترمذی، بَابُ مِنَ الْعَقِيقَةِ، رقم:۱۵۲۲، سنن ابن ماجه، بَابُ الْعَقِيقَةِ، رقم:۳۱۶۵

❷ سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي الْعَقِيقَةِ، رقم:۱۵۱۳

﴿ اَطۡعِمُوا الۡقَانِعَ وَ الۡمُعۡتَرَّ ﴾ (الحج: ٣٦)

''یعنی مانگنے اور نہ مانگنے والے سب کو کھلاؤ۔''

فقہاء حنابلہ بعض روایات کی بناء پر اس بات کے قائل ہیں کہ قربانی وغیرہ کا گوشت تین حصوں میں تقسیم کیا جائے۔ ایک حصہ اہل وعیال کے لیے، دوسرا احباب کے لیے اور تیسرا افقراء و مساکین پر تقسیم کر دیا جائے۔ ملاحظہ ہو: مرعاۃ المفاتیح: ۲/ ۳۲۹۔

اور عقیقے کا گوشت والدین کے لیے ممنوع قرار دینا محض جاہلی رسم ہے شریعت میں اس کا کوئی اصل نہیں۔

عقیقہ کے جانور کی شروط؟

سوال: قربانی کے جانور اور عقیقہ کے جانور دونوں کی شرطیں ایک جیسی ہیں یا مختلف ہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دے کر عنداللہ ماجور ہوں۔ (محمد رمضان آزاد، چھانگا مانگا۔قصور) (۱۲اگست،۱۹۹۴ء)

جواب: عقیقہ کے جانور میں شروط کی تصریح کسی حدیث میں موجود نہیں۔ البتہ حدیث میں لفظ «مُکَافِئَتَانِ»[1] وارد ہوا ہے۔

اس سے بعض اہل علم نے یہ سمجھا ہے کہ اس میں شروط قربانی جیسی ہونی چاہئیں۔ احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ اس میں شروط قربانی جیسی ہوں۔ ہمارے شیخ محدث روپڑی رحمہ اللہ نے بھی اسی بات کو اختیار کیا ہے۔ ملاحظہ ہو فتاویٰ اہل حدیث جلد دوم، ص: ۳۰۶، ۳۰۷۔

عقیقہ کے جانور دو دانت والا ہونا ضروری ہے؟

سوال: عقیقہ کے جانور میں قربانی کی شرائط مثلاً دو دانت والا ہونا اور بڑے جانوروں میں سے گائے وغیرہ میں سات کا شامل ہونا کی وضاحت فرمائیں۔ (میاں محمد افضل سرائے سدھو خانیوال) (۱۶ مئی ۱۹۹۷ء)

جواب: عقیقہ کے جانور میں قربانی کی شرائط کا پایا جانا ضروری نہیں اور گائے کے عقیقہ کے بارے میں وارد روایت صحیح نہیں۔ لہٰذا اصل یہ ہے کہ بکرا یا بکری نر، مادہ عقیقہ میں ذبح کیے جائیں۔ لڑکے کی طرف سے دو اور لڑکی کی طرف سے ایک، جس طرح کہ احادیث میں منصوص ہے۔ مفروصحتِ حدیث گائے میں قربانی کی طرح عقیقہ میں سات کا اشتراک سنت سے ثابت نہیں۔

کیا بچے کے عقیقے کے لیے اونٹ ذبح کرنا درست ہے؟ عقیقے کے جانور کی شرائط کیا ہیں؟

سوال: کیا یہ درست ہے کہ بچے کے عقیقے میں ایک گائے یا اونٹ کر دیا جائے کیونکہ وہ سات قربانیوں کے برابر ہے؟

[1] سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي العَقِيقَةِ، رقم: ۱۵۱۳

یا دو جانیں ہی لازمی ہیں؟ کون سا مسلک کتاب وسنت کے زیادہ قریب ہے؟ اور عقیقے کے جانور میں قربانی والی شرائط ہیں یا نہیں؟ (سائل) (۱۲ اپریل ۲۰۰۲ء)

جواب: بچے کی طرف سے عقیقہ دو بکریوں کا ہونا چاہیے دیگر جانوروں کے بارے میں کوئی صحیح روایت وارد نہیں اور بچی کی طرف سے ایک بکری کافی ہے۔

عقیقہ کے جانور کی شرائط کے بارے میں حدیث میں کوئی خاص تصریح وارد نہیں، صرف مکافئتان کا لفظ آیا ہے۔ ''مجمع البحار'' میں ہے کہ دو بکریاں جو سن (عمر) میں برابر ہوں، جس سے مقصد یہ ہے کہ عقیقے کا جانور مسنہ (دودانتا) ہونا چاہیے۔ یا کم از کم یہ ہے کہ ایک سال کا جذعہ (دنبہ) ہو، البتہ احتیاط اس میں ہے کہ جانور میں قربانی والی شرائط ہوں۔

اونٹ گائے سے عقیقہ کا کیا حکم ہے؟

سوال: کیا گائے یا اونٹ سے عقیقہ کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟۔قربانی میں گائے کے سات اور اونٹ کے دس حصے ہوتے ہیں۔عقیقہ میں گائے یا اونٹ کی کیا صورت ہوگی؟ (عبدالرشید) (۲۴ نومبر ۱۹۹۵ء)

جواب: مسئلہ ہذا میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ جمہور اہل علم جواز کے قائل ہیں۔ (فتح الباری (۵۹۳/۹) میں بحوالہ ''طبرانی'' اور ''ابوالشیخ'' حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً ایک روایت نقل کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

«يُعَقُّ عَنْهُ مِنَ الْإِبِلِ وَالْبَقَرِ وَالْغَنَمِ .»

''یعنی لڑکے کی طرف سے اونٹ، گائے، بکری کا عقیقہ کیا جائے۔''

لیکن کسی حدیث میں حصوں کی تصریح نہیں۔ اسی بناء پر اہل علم کا اس بارے میں اختلاف ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ پورے اونٹ اور گائے کے قائل ہیں اور امام رافعی رحمہ اللہ کا کہنا ہے قربانی کی طرح اس میں بھی سات حصے ہو سکتے ہیں۔ اونٹ میں دس کا بھی جواز بیان کیا گیا ہے۔ شاید انھوں نے عقیقہ کو قربانی پر قیاس کیا ہو۔ لیکن اونٹ کی قربانی میں دس کی شراکت بذاتِ خود مختلف فیہ مسئلہ ہے۔ پس دلائل کے اعتبار سے راجح مسلک یہ ہے کہ بکری یا ایک مینڈھا عقیقہ کیا جائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«عَنِ الْغُلَامِ شَاتَانِ مُكَافِئَتَانِ، وَعَنِ الْجَارِيَةِ شَاةٌ.» ❶

اونٹ اور گائے کے جواز والی مذکورہ بالا روایت سخت ضعیف اور نا قابلِ حجت ہے۔ بلکہ علامہ البانی نے ''الارواء'' (۳۹۳/۴) میں اس کو من گھڑت قرار دیا ہے۔ اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی خاموشی پر تعجب کا اظہار کیا ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اونٹ کے عقیقہ کا سختی سے انکار کیا ہے۔ اور بطورِ استدلال حدیث «عَنِ الْغُلَامِ شَاتَانِ» پیش کی

❶ سنن ابن ماجه، بَابُ الْعَقِيقَةِ، رقم:۳۱۶۲، سنن الترمذي، بَابُ مَا جَاءَ فِي الْعَقِيقَةِ، رقم:۱۵۱۳

ہے۔(رواہ الطحاوی والبیھقی)

عقیقے میں گائے یا اونٹ ذبح کرنا کیسا ہے؟

سوال : ایک شخص عقیقے میں بجائے بکری یا بکرے کے گائے یا اونٹ ذبح کردیتا ہے۔کیا یہ عقیقہ ہو جائے گا؟ بعض علمائے کرام کا خیال ہے کہ عقیقہ صرف بکرے اور چھترے ہی سے ادا ہوسکتا ہے،اگر ان کے علاوہ کسی اور جانور سے کیا جائے تو وہ عام صدقہ ہوگا،عقیقہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔اس لیے کہ گائے اونٹ وغیرہ سے عقیقہ کرنا قرآن وسنت میں ثابت نہیں۔ (محمد یامین خان سلفی۔گوجراں والا) (۱۲ جولائی ۲۰۰۲ء)

جواب : اونٹ اور گائے سے عقیقے کی کوئی روایت ثابت نہیں۔لہٰذا صرف بکری یا بکرے پر اکتفا کرنی چاہیے۔اگر کسی نے لاعلمی میں ایسا کیا ہے تو وہ اجر وثواب سے محروم نہیں رہے گا۔ان شاء اللہ

کیا گائے اور اونٹ میں قربانی کے حصوں کے علاوہ عقیقہ کیا جا سکتا ہے؟

سوال : قربانی کے جانور (مثلاً گائے) میں بعض لوگ پانچ حصے قربانی کے رکھ لیتے ہیں اور ۲ حصے کسی ایک بیٹے کے عقیقے کے رکھ لیتے ہیں۔کیا یہ عمل درست ہے یا عقیقے کے لیے دو جانیں ہی کرنا پڑیں گی۔ (سائل) (۳۱ جنوری ۲۰۰۳ء)

جواب : قربانی کی گائے میں عقیقے کی شراکت نہیں ہوسکتی۔اس کی دو وجہیں ہیں:

۱۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ گائے سے عقیقہ کرنا کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ راجح مسلک کے مطابق لڑکے کی طرف سے دو بکروں سے عقیقہ ہونا چاہیے۔جس طرح کہ حدیث میں صراحت کی گئی ہے۔

کیا عقیقہ کے لیے صرف بکرا اور مینڈھا ذبح کیا جائے؟

سوال : کیا عقیقہ کے لیے صرف بکرا اور مینڈھا ذبح کیا جائے؟یا گائے ،اونٹ وغیرہ بھی ذبح کیے جاسکتے ہیں؟ کیا عقیقے کا گوشت کچا تقسیم کیا جائے یا اس کو پکا کر دعوت کی جائے؟ (فیصل مختار) (۱۹ اکتوبر ۱۹۹۸ء)

جواب : عقیقہ بکرے اور مینڈھے کا ہونا چاہیے۔گائے ،اونٹ کے بارے میں وارد روایات ضعیف ہیں۔عقیقے کا گوشت کچا اور پکا دونوں طرح تقسیم کرنا درست ہے۔شریعت نے کوئی پابندی نہیں لگائی۔

کیا لڑکے کی طرف سے دو جانور ذبح کرنا ضروری ہے؟

سوال : کیا لڑکے کی طرف سے دو جانیں دینا اور لڑکی کی طرف سے ایک جان دینا لازمی ہے یا ایک ایک جان بھی کفایت کر جائے گی؟ (محمد یامین خان سلفی۔گوجراں والا) (۱۲ جولائی ۲۰۰۲ء)

جواب : اصل یہ ہے کہ لڑکے کی طرف سے دو جانور اور لڑکی کی طرف سے ایک جانور ذبح کیا جائے۔حضرت ابن

عمر رضی اللہ عنہما اور امام مالک رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ دونوں کی طرف سے ایک ایک بکری عقیقے میں کی جائے لیکن راجح مسلک پہلا ہے۔ملاحظہ ہو: تحفة الودود باحکام المولود،ص:۳۸، الفصل العاشر

(نومولود کے متعلقہ احکام)

کیا شادی کے بعد پہلی اولاد اِناث (بچی) ہوتو خیر و برکت کا ذریعہ ہے؟

سوال: ایک عالم نے یہ بتایا کہ پہلی اولاد اگر بچی ہو یعنی ''اناث'' تو وہ خیر و برکت کا ذریعہ ہوتی ہے۔کیا اس کے متعلق کوئی دلیل ہے؟ (سائل) (۱۲جنوری۲۰۰۱ء)

جواب: ایسی کوئی روایت نہیں کہ پہلی اولاد بچی ہوتو خیر و برکت کا ذریعہ بنتی ہے۔

نومولود کے کان میں اذان کہنے کا حکم؟

سوال: نومولود کے کان میں اذان اور اقامت کہنا چاہیے یا نہیں؟ (عطاء اللہ خان۔لاہور) (٦ستمبر۲۰۰۲ء)

جواب: حدیث ضعیف ہے۔

نومولود کے کان میں اذان اور اقامت: (تعاقب از عبدالجبار۔شہداد پور)

محترمی و مکرمی جناب حافظ عبدالوحید صاحب (مدیر ہفت روزہ ''الاعتصام'')۔السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

''الاعتصام'' میں شیخ الحدیث حافظ ثناء اللہ مدنی صاحب کا فتویٰ شائع ہوا ہے۔سوال کیا گیا ہے کہ کیا نومولود بچے یا بچی کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہنی چاہیے یا نہیں؟ تو جناب حافظ صاحب نے فتویٰ دیا ہے کہ ''یہ حدیث ضعیف ہے۔''

حضرت نے یہاں تک بات کی ہے۔مطلب یہ ہے کہ جب حدیث ہی ضعیف ہے تو پھر نومولود بچے کے کان میں اذان اور اقامت کس کام کی؟ ''الاعتصام'' چونکہ پورے پاکستان میں جگہ جگہ پڑھا جاتا ہے تو اس پر جماعتوں نے سوال کرنا شروع کردیے ہیں۔حیدرآباد سے حافظ یونس جو حافظ محمد ادریس کے بڑے بھائی ہیں، نے مجھے کہا کہ آپ اس کی تحقیق کرکے ''الاعتصام'' کو ضرور لکھیں۔شہداد پور سے ڈاکٹر عبدالغفور نے بھی یہی تقاضا کیا،لہٰذا میں اپنے علم کے مطابق یہ تحریر ارسال کر رہا ہوں۔تحقیق کا میدان بہت وسیع ہے۔نومولود بچے کے دائیں کان میں اذان اور بائیں میں اقامت کہنے پر علماء اہل حدیث کا اتفاق ہے کہ یہ عمل صحیح ہے۔میں امید کرتا ہوں کہ آپ یہ تحریر ''الاعتصام'' میں شائع کریں گے۔شکریہ (عبدالجبار۔شہداد پور) (۲۵اکتوبر۲۰۰۲ء)

نومولود بچے یا بچی کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہنی حدیث وسنت سے ثابت ہے اور عمل

صحیح ہے۔اس عمل کے صحیح ہونے کے لیے چند احادیث پیش کی جاتی ہیں۔

پہلی حدیث:

«عَنْ عُبَيْدِ اللَّهِ بْنِ أَبِي رَافِعٍ، عَنْ أَبِيهِ، قَالَ: رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَذَّنَ فِي أُذُنِ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ حِينَ وَلَدَتْهُ فَاطِمَةُ بِالصَّلَاةِ» [1]

''حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے (حضرت) حسین کے کان میں اذان کہی جب فاطمہ الزہراء نے انھیں جنم دیا۔''

اس حدیث کو امام احمد رحمہ اللہ نے اور امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے ''حسن'' کہا ہے۔ جب کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے ''حسن صحیح'' کہا ہے۔ [2] اس حدیث کا راوی عاصم بن عبیداللہ اگرچہ ضعیف ہے لیکن دوسری دوسندوں کی وجہ سے یہ حدیث حسن درجے کی ہے۔

دوسری حدیث:

« مَنْ وُلِدَ لَهُ مَوْلُودٌ فَأَذَّنَ فِي أُذُنِهِ الْيُمْنَى وَأَقَامَ فِي الْيُسْرَى لَمْ تَضُرَّهُ أُمُّ الصِّبْيَانِ.» [3]

''حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، جس کے پاس کوئی بچہ یا بچی پیدا ہوتو وہ اس کے دائیں کان میں اذان اور بائیں میں اقامت کہے تو اسے ام الصبیان تکلیف نہیں دے گی۔''

''ام الصبیان'' ایک جنّی کا نام ہے جو ہر نومولود کو اذیت اور تکلیف دیتی ہے۔ یعنی نومولود بچے کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہنے کی وجہ سے بچہ اس جنّی کی شرارت سے محفوظ رہے گا۔

تیسری حدیث:

« عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ " :أَذَّنَ فِي أُذُنِ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ يَوْمَ وُلِدَ، فَأَذَّنَ فِي أُذُنِهِ الْيُمْنَى، وَأَقَامَ فِي أُذُنِهِ الْيُسْرَى .» [4]

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت حسین کی ولادت کے دن ان کے

---

[1] سنن أبي داود، بَابٌ فِي الصَّبِيِّ يُولَدُ فَيُؤَذَّنُ فِي أُذُنِهِ، رقم:٥١٠٥ ، سنن الترمذي، بَابُ الأَذَانِ فِي أُذُنِ الْمَوْلُودِ، رقم:١٥١٤

[2] نيل الاوطار، ص:٢٢٩

[3] رواه ابن السني في عمل اليوم والليلة، بَابُ مَا يَعْمَلُ بِالْوَلَدِ إِذَا وُلِدَ، رقم:٦٢٣ ، و أبو يعلى موصلي : ٦٧٨٠۔ نيل الاوطار، ص:٢٣٠/

[4] شعب الايمان للبيهقي ، حق السادة على المماليك، رقم:٨٢٥٥

دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہی۔"

اس حدیث کو شیخ البانی رحمہ اللہ نے سند کے لحاظ سے حضرت حسین کی روایت سے بہتر قرار دیا ہے اور حدیث ابی رافع کے لیے بہتر شاہد قرار دیا ہے۔ (دیکھیں: سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ، ج:۱، ص:۳۳۱)

خلیفہ راشد عمر بن عبدالعزیز کے بارے میں "مصنف عبدالرزاق" میں ہے:

«أَنَّ عُمَرَ بْنَ عَبْدِ الْعَزِيزِ: كَانَ إِذَا وُلِدَ لَهُ وَلَدٌ أَخَذَهُ كَمَا هُوَ فِي خِرْقَتِهِ، فَأَذَّنَ فِي أُذُنِهِ الْيُمْنَى، وَأَقَامَ فِي الْيُسْرَى، وَسَمَّاهُ مَكَانَهُ.»[1]

"عمر بن عبدالعزیز کے یہاں جب کوئی بچہ پیدا ہوتا تو اس کو اسی حالت میں لیتے تھے (یعنی وہ کپڑے میں لپیٹے ہوئے ہوتے) اور اس کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہتے اور اس وقت اس کا نام بھی رکھتے تھے۔"

امام بغوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

«رُوِي أَن عُمَرَ بْنَ عبْدِ الْعزِيزِ كَانَ يُؤَذِّنُ فِي الْيُمْنى ويُقِيمُ فِي الْيُسْرى إِذا وُلِد الصَّبِيُّ.»[2]

"حضرت عمر بن عبدالعزیز کے بارے میں یہ روایت ہے کہ جب کوئی بچہ پیدا ہوتا تھا تو اس کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہتے تھے۔"

نومولود بچے یا بچی کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہنے والے عمل کو مسنون اور صحیح قرار دینے والے محدثین کرام، علماءِ دین اور محققین کرام کے نام لکھے جاتے ہیں۔

۱۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے ایک کان میں اذان دینے والی حدیث کو "حسن" اور "صحیح" کہا ہے۔ اور کہا ہے کہ اس پر عمل ہے۔ (جامع الترمذی، باب العقیقۃ)

۲۔ حضرت مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ نے اس عمل کو مشروع قرار دیا ہے۔ (تحفۃ الاحوذی، ج:۲، ص:۳۶۳)

۳۔ علامہ محمد عطاء اللہ حنیف نے اس عمل کو مشروع قرار دیا ہے۔ (تنقیح الرواۃ، ج:۲، ص:۲۳۰)

۴۔ علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے اس عمل کو مستحب قرار دیا ہے (نیل الاوطار، ج:۳، ص:۲۳۰)

۵۔ علامہ ابن القیم الجوزیہ رحمہ اللہ نے اس عمل کو صحیح قرار دیا ہے۔ (حوالہ زاد المعاد)

۶۔ علامہ شمس الحق عظیم آبادی نے اس عمل کو صحیح قرار دیا ہے۔ (فتاویٰ عظیم آبادی)

۷۔ علامہ شیخ الکل سید نذیر حسین نے اس عمل کو صحیح قرار دیا ہے۔ (فتاویٰ نذیریہ)

---

[1] مصنف عبدالرزاق (ج:۲، ص: ۳۳٦) بَابُ مَوْتِهِ قَبْلَ سَابِعِهِ وَمَتَى يُسَمَّى وَمَا يُصْنَعُ بِهِ رقم:۷۹۸۵

[2] شرح السنة (ج:۱۱، ص:۲۷۳) بابُ الأذانِ فِي أُذنِ الْمولُودِ، رقم:۲۸۲۲

۸۔ محترم شیخ شعیب الارنووط اور شیخ عبدالقادر ارنووط نے ''ابو رافع'' والی حدیث کو تقویت دینے کے لیے ابن عباس رضی اللہ عنہما والی حدیث کو جو امام بیہقی رحمہ اللہ نے ''شعب الایمان'' میں درج کی اس کو شاہد کے طور پر پیش کر کے اس عمل کو صحیح قرار دیا ہے۔ (حوالہ زاد المعاد مع تحقیق و تعلیق، ج:۲،ص:۳۳۳)

۹۔ حضرت مولانا حمید اللہ میرٹھی نے اس عمل کو مسنون قرار دیا ہے۔ (خطباتِ توحید)۔

۱۰۔ علامہ شیخ العرب والعجم بدیع الدین شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اس عمل کو صحیح قرار دیا ہے۔ (حوالہ خطبات التوحید پر نظر ثانی وافادات)

۱۱۔ فضیلۃ الشیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے ''حدیث ابی رافع'' کو تقویت دینے کے لیے ''حدیث ابن عباس'' جو امام بیہقی رحمہ اللہ کی ''شعب الایمان'' میں ہے، پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ حدیث ابی رافع حسن درجہ کی ہے اور یہ عمل بھی صحیح ہے۔(حوالہ سلسلة الاحاديث الضعيفة، ص: ۳۳۱، ج: ۱)

۱۲۔ امام النووی رحمہ اللہ نے اس عمل کو مسنون قرار دیا ہے۔(حوالہ شرح المهند، ج:٤، ص: ٤٤٢)

۱۳۔ علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''تحفۃ الودود'' میں مستقل باب باندھا ہے کہ:

«اَلْبَابُ الرَّابِعُ فِی اِسْتِحْبَابِ التَّأْذِیْنَ فِیْ اُذُنِهِ الْیُمْنٰی وَالْاِقَامَة فِی اُذُنِهِ الْیُسْرٰی »

''یہ باب ہے نومولود بچے کے دائیں کان میں اذان کہنے اور بائیں کان میں اقامت کہنے کے بارے میں۔''

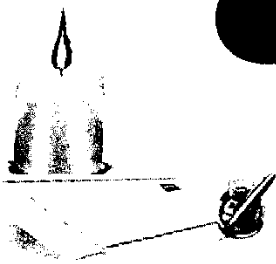
تین احادیث اور خلیفہ راشد عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے عمل اور ان تمام علمائے دین، محدثین و محققین کی آراء اور اس عمل کو صحیح قرار دینے کے بعد میری بھی رائے یہی ہے کہ یہ عمل صحیح ہے۔(وَاللّٰهُ سُبْحَانَهُ وَتَعَالٰی اَعْلَمُ.)

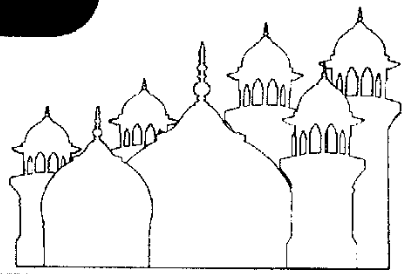
لڑکی کا ختنہ کرنا کیسا ہے؟

سوال : لڑکی کا ختنہ کرنا واجب ہے یا مستحب؟ (وقار علی۔ لاہور) (۱۸ اپریل ۱۹۹۷ء)

جواب : لڑکی کا ختنہ کرنا مستحب ہے۔ واجب نہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، عون المعبود۔

جہاد





جہادی تنظیموں کی شرعی حیثیت

سوال: محترم شیخ الحدیث صاحب۔

۱۔ جہادِ کشمیر میں جو پاکستانی جہادی تنظیمیں کام کر رہی ہیں۔ان کی اسلام میں کیا حیثیت ہے؟

۲۔ ایک بیٹا جہادی تنظیم کے معسکر میں جا کر بذریعہ خط والدین سے اجازت طلب کرتا ہے اور اجازت نہ ملنے کی صورت میں بغاوت کی دھمکی دیتا ہے۔اور خط کے آخر میں آپ کا گستاخ نافرمان بیٹا کے الفاظ تحریر کرتا ہے۔اس کے جہاد کی اسلام میں کیا حیثیت ہے؟

۳۔ اس بچے کے والدین خالص اللہ کی رضا جاننے کے لیے آپ سے رجوع کر رہے ہیں کہ ان حالات میں والدین کے لیے کیا حکم ہے؟

۴۔ جہاد بالسیف کی اصل شکل کیا ہونی چاہیے؟ اور جہاد کا شوق رکھنے والا اپنی خواہش کیسے پوری کرے؟ (والسلام)

(نذیر احمد اسد۔بدوملہی) (۱۷ستمبر۱۹۹۹ء)

جواب: جہادی تنظیمیں اگر فی الواقع اپنے عمل میں مخلص ہیں تو سب کو اکٹھے۔«وَإِنَّمَا الإِمَامُ جُنَّةٌ يُقَاتَلُ مِنْ وَرَائِهِ» [1] کا نقشہ پیش کرنا چاہیے۔اسلام متحدہ قیادت کا داعی ہے مگر موجودہ طریق کار اور عملِ جہاد میں بھی امید ہے کہ ہر ایک اپنی نیت کے اعتبار سے ماجور ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، بَابُ يُقَاتَلُ مِنْ وَرَاءِ الإِمَامِ وَيُتَّقَى بِهِ، رقم:٢٩٥٧

۲۔ جہاد پر جانے کے لیے والدین کی اجازت اوّلین فرض ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی ''صحیح'' میں تبویب قائم کی ہے: «بَابُ الجِهَادِ بِإِذْنِ الأَبَوَيْنِ» یعنی جہاد میں والدین کی اجازت کا بیان۔ پھر اس کے ضمن میں یہ حدیث لائے ہیں۔

''ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت میں جہاد کی طلب میں حاضر ہوا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تیرے والدین زندہ ہیں؟ اس نے کہا ہاں! تو فرمایا انہی کی خدمت کرتا رہ۔''❶

اجازت نہ ملنے کی صورت میں والدین کو دھمکی آمیز خطوط لکھنے والا اللہ اور اس کے رسول کا نافرمان ہے اسے اپنے انجام پر غور کرنا چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ساری محنت اکارت جائے۔

۳۔ بیٹے کا فرض ہے کہ جہادی مہم سے واپس آ کر پہلے والدین کو راضی کرے پھر ان کی اجازت پر واپسی موقوف رکھے ورنہ انجامِ کار پر خطرہ ہے۔

۴۔ جہاد بالسیف کے لیے ابتدائی مرحلہ یہ ہے کہ پہلے جہادی تربیت حاصل کی جائے پھر دشمن سے مقابلہ کے لیے اپنے کو ہر وقت تیار رکھے۔ ضرورت پڑنے پر میدانِ کارزار میں کود جائے۔

مختلف ٹولیوں اور علیحدہ علیحدہ جماعتوں کے جہاد کی شرعی حیثیت

سوال: عصر حاضر میں مختلف جماعتیں لوگوں کو جہاد کی ترغیب دیتی ہیں، حالاں کہ ٹولیوں اور محدود افراد کی صورت میں جہاد کرنے سے مسلمانوں کی طاقت کمزور ہو رہی ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ حالات کے مطابق جہاد کا طریقہ کار وضع کرنا امیر کا کام ہوتا ہے اور موجودہ حالات میں جہاد کا یہی طریقہ کار موزوں ہے۔

سوال یہ ہے کہ موجودہ حالات میں ٹولیوں کی شکل میں جہاد کا کیا حکم ہے؟ (سائل) (۱۶ جنوری ۲۰۰۴ء)

جواب: کسی حد تک اس کا جواز ہے تاہم اصلاً متحدہ قیادت کے تحت جہاد ہونا چاہیے۔ شریک ہونے والا اپنی نیت کے مطابق اجر پائے گا اگرچہ طریقہ کار میں اصلاح کی ضرورت ہے۔

کیا فطرانہ اور قربانی کی کھال جہاد کے لیے دی جا سکتی ہے:

سوال: ہفت روزہ ''اہل حدیث'' میں حافظ عبدالستار الحماد صاحب حفظہ اللہ نے ایک سوال کے جواب میں جو فرمایا ہے (تراشہ لف ہذا ہے) کہ مجاہدین کو فطرانہ اور کھال نہیں لگتی۔ آیا یہ درست ہے؟ وضاحت سے جواب لکھیں۔ ہمارے ہاں ایسے لگتا ہے کہ مجاہدین تنظیموں کا بھی یہی کام رہ گیا ہے۔ امید ہے اپنی پہلی فرصت میں جواب مرحمت فرما دیں گے۔

(محمد اسلام طاہر محمدی) (۱۳/ اگست ۲۰۰۴ء)

---

❶ صحیح البخاری، بَابُ الجِهَادِ بِإِذْنِ الأَبَوَيْنِ، رقم: ٣٠٠٤

جواب: متعدد احادیث میں قربانی کی کھالوں کو صدقہ کرنے کا حکم آیا ہے اور قرآن میں ہے: ﴿لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ أُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ﴾ ''(ہاں تم جو خرچ کرو گے تو) ان حاجت مندوں کے لیے ہے جو اللہ کی راہ میں رُکے بیٹھے ہیں اور ملک میں کسی طرف جانے کی طاقت نہیں رکھتے۔''

مجاہدین چونکہ اللہ کی راہ میں مصروفِ کار رہتے ہیں اس لیے عموم کے اعتبار سے آیت ہذا ان کو بھی شامل ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں، فرمان الٰہی کا معنی یہ ہے

« اِنَّهُمْ حصِرُوْا اَنْفُسَهُمْ وَ وَقَفُوْهَا عَلَى الْجِهَادِ وَ اِنَّ قَوْله ﴿فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ مُخْتَصٌّ بِالْجِهَادِ فِي عُرْفِ الْقُرْاٰنِ وَ لِاَنَّ الْجِهَادَ كَانَ وَاجِبًا فِيْ ذٰلِكَ الزَّمَانِ وَ كَانَ تَشْتَدُّ الْحَاجَةُ اِلٰى مَنْ يَحْبِسُ نَفْسَهٗ لِلْمُجَاهَدَةِ مَعَ الرَّسُوْلِ ﷺ فَيَكُوْنُ مُسْتَعِدًا كَذٰلِكَ مَتٰى مَسَّتِ الْحَاجَة »[1]

لہٰذا قربانی کی کھالوں کو جہاد فنڈ میں دینا جائز ہے۔ نیز صدقہ فطر بھی چونکہ من وجہ زکوٰۃ ہے اس لیے اس کو بھی مصرف جہاد میں دیا جا سکتا ہے۔

جہادِ کشمیر کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

سوال: اس وقت کے جہادِ کشمیر کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ (محمد صدیق تلیاں، ایبٹ آباد) (۱۸ جون ۱۹۹۹ء)

جواب: جہادِ کشمیر مجاہد کی نیت پر منحصر ہے اگر یہ اللہ کے کلمہ کی سربلندی کے لیے ہے تو بلاشبہ شرعی جہاد ہے۔

جہادِ کشمیر کی شرعی حیثیت

سوال: آج کل کشمیر میں مجاہدین اسلام ہندوستان کے مشرکین کے ساتھ جہاد میں برسرپیکار ہیں۔ مگر افسوس کہ بعض مولوی صاحبان متعلقہ تنظیموں مثلاً لشکر طیبہ، البدر، حزب المجاہدین اور حرکۃ المجاہدین وغیرہ کے تحت اس جہاد کو جہاد میں شمار نہیں کرتے بلکہ اسے بالکل ناجائز کہتے ہیں۔ دلائل سے روشنی ڈالیں اور صحیح صورتِ حال واضح فرمائیں۔ (سائل) (۲۷ جولائی ۲۰۰۱ء)

جواب: کشمیر کا جہاد بلاشبہ بمعنی ''الجہاد'' ہے لیکن موجودہ حالات میں طریقہ کار درست نہیں۔ اسلام نے جہاد میں خصوصی طور پر ہمیں وحدت کا سبق دیا ہے اور باہمی نزاع سے بایں الفاظ ڈرایا ہے:

﴿وَ لَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِيْحُكُمْ﴾ (الانفال:٤٦)

''آپس میں جھگڑا نہ کرنا کہ (ایسا کرو گے تو) تم بزدل ہو جاؤ گے اور تمہارا اقبال جاتا رہے گا۔''

[1] تفسیر کبیر: ۷/ ۷۰

لیکن ہماری صورتِ حال اس کے برعکس ہے۔ تمام جہادی تنظیموں کو چاہیے کہ علیحدہ علیحدہ کی بجائے متحدہ قیادت میں جہاد کی سعی کریں، جس کو شریعت نے امامت سے تعبیر کیا ہے۔

«وَإِنَّمَا الإِمَامُ جُنَّةٌ يُقَاتَلُ مِنْ وَرَائِهِ »[1]

''امام ڈھال ہے جس کے پیچھے لڑائی کی جاتی ہے۔'' کی تصویر کا نظر آنا ضروری ہے۔ تاکہ امتِ مسلمہ کماحقہ جہاد کے ثمرات سے مطلوبہ شکل میں مستفید ہو سکے۔ ورنہ تفرق وتشتت کی صورت میں انجام کار وہی کچھ ہے جس کا مشاہدہ افغانستان میں ہو رہا ہے۔ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔

کیا کشمیر میں لڑائی فی الواقع اسلامی جہاد کا حصہ ہے

سوال: کیا کشمیر میں لڑائی فی الواقع اسلامی جہاد کا حصہ ہے۔ اس سلسلہ میں کچھ لوگ شکوک وشبہات کا شکار ہیں۔ وضاحت فرمائیں۔ (ایک سائل) (۸ جنوری ۱۹۹۹ء)

جواب: کشمیر کا جہاد بلاشبہ اسلامی جہاد ہے۔ اس لیے کہ وہ لوگ مظلوم ہیں۔ ہندو بنیا مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کا جانی دشمن ہے۔ ہر لحہ گھات لگائے بیٹھا ہے کہ ہر ممکن طریق سے اہل اسلام کو نیست ونابود کر دیا جائے۔ لہٰذا جہاد کی متنوع صورتوں میں سے کسی ایک کے ذریعے اس میں ضرور حصہ لینا چاہیے۔

قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ o الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ﴾ (الحج: ۳۹۔۴۰)

''جن مسلمانوں سے کافر جنگ کر رہے ہیں۔ انھیں بھی مقابلے کی اجازت دی جاتی ہے کیوں کہ وہ مظلوم ہیں بے شک ان کی مدد پر اللہ قادر ہے۔ یہ وہ ہیں جنھیں بلاوجہ ان کے گھروں سے نکالا گیا صرف ان کے اس قول پر کہ ہمارا پروردگار فقط اللہ ہے۔''

موجودہ جہادی مہم اور اصلاح کی ایک صورت

سوال: اگرچہ یہ چند الفاظ بعض جماعتوں کے لیے کھٹکیں گے لیکن شرعی وضاحت بھی ضروری ہے کہ کشمیر میں جو مختلف تنظیمیں جہاد میں برسرِ پیکار ہیں۔ یہ لوگ اگر محدود ہندو فوجی قتل کرتے ہیں تو ان کے عوض انڈین فوجی پورے گاؤں کا محاصرہ کرتے ہیں۔ عورتوں کی عصمت دری کرتے ہیں۔ بچوں بوڑھوں کو اذیتیں دے کر ختم کرتے ہیں۔ یعنی ان حریت پسندوں کا یہ فعل تمام گاؤں کے لیے وبالِ جان بن جاتا ہے۔ کیا یہ درست ہے اور جہاد ہے؟ اگر ان جہادی تنظیموں کا

[1] صحيح البخاری، بَابُ يُقَاتَلُ مِنْ وَرَاءِ الإِمَامِ وَيُتَّقَى بِهِ، رقم:۲۹۵۷

نظریہ ایک ہے تو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے ہو کر جہاد کیوں نہیں کرتے۔ عوام کے اس سوال کا جواب کیا ہوگا کہ یہ لوگ صرف چندہ ہتھیانے کے لیے تمام کارروائیاں کر رہے ہیں۔ وضاحت سے قرآن و حدیث کی روشنی میں بیان فرما کر شکریہ کا موقع دیں۔ (ایک سائل) (۱۶ فروری ۱۹۹۶ء)

جواب : جملہ جہادی تنظیموں کو چاہیے کہ یکجا ہو کر ایک پلیٹ فارم پر ایک امیر کی قیادت میں جہاد کریں۔ اسی میں خیر و برکت ہے۔

«وَإِنَّمَا الإِمَامُ جُنَّةٌ يُقَاتَلُ مِنْ وَرَائِهِ» [1]

جہاں تک موجودہ تشتت وتفرق کی کیفیت کا تعلق ہے۔ اس طرح کے جہاد کی عہد خیر القرون میں مثال ملنی صرف ناممکن ہی نہیں بلکہ امر محال ہے کہ بلا قیادتِ عامہ تحزّبیت (گروہوں) میں منقسم ہو کر وہ جہاد کے مقاصد کو پروان چڑھاتے ہوں کیونکہ وہ فرمانِ باری تعالیٰ ﴿وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِيْحُكُمْ﴾ (الانفال:٤٦) اور آپس میں جھگڑا نہ کرنا کہ (ایسا کرو گے تو) تم بزدل ہو جاؤ گے اور تمہارا اقبال جاتا رہے گا۔'' (سورۃ الانفال آیت:۴۶) کو خوب یاد رکھتے تھے اور اس کے رموز و اسرار سے واقف تھے۔ آج افغانستان میں ہماری ذلت و رسوائی کا سبب انہی الفاظ کا عدمِ فہم بنا ہوا ہے۔ اَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهَا

میرے خیال میں عمومی نقصان سے بچاؤ کا واحد حل یہ ہے کہ دشمن سے جہاد منظّم صورت میں کرنے کی سعی کرنی چاہیے تاکہ اسے سنبھلنے کا موقع ہی میسر نہ آسکے۔ فاتحین قیصر و کسریٰ کے وارثوں پر واجب ہے کہ موضوع ہذا پر مل بیٹھ کر غور وخوض کریں تاکہ کل کو مثبت نتائج کی توقع کی جا سکے۔ سدا جانی و مالی بھاری نقصان اٹھاتے رہنا عقل و دانش کے منافی ہے۔ واللہ ولی التوفیق

مالِ غنیمت مجاہدین میں تقسیم کر دینا چاہیے یا ذخیرہ کر لینا چاہیے؟

سوال : جنگ سے حاصل ہونے والا مالِ غنیمت مجاہدین میں تقسیم کرنے کے بجائے اس کو لوگوں کو دکھانے کی خاطر اپنے دفتر میں رکھا جا سکتا ہے؟ (سائل محمد یحییٰ عزیز کوٹ رادھا کشن) (۱۴ اگست ۱۹۹۸ء)

جواب : مالِ غنیمت مجاہدین میں فوراً تقسیم کر دینا چاہیے۔ اس کا ذخیرہ کرنا درست نہیں۔ نبی ﷺ کی زندگی اس بات پر شاہد ہے۔

کانفرنسوں کا نام ''غزوۂ ہند کانفرنس'' رکھنا جائز ہے؟

سوال : آج کل ایک جماعت غزوۂ ہند کانفرنس منعقد کرتی ہے۔ ہمارے مولوی صاحب کا کہنا ہے کہ غزوۂ ہند کانفرنس

---

[1] صحيح البخاري، بَابُ يُقَاتَلُ مِنْ وَرَاءِ الإِمَامِ وَيُتَّقَى بِهِ، رقم:٢٩٥٧

نام رکھنا غلط ہے۔غزوہ وہ ہوتا ہے جس میں رسول اکرم ﷺ شامل ہوں۔

جواب : اصحابِ مغازی کے نزدیک مغازی رسول اللہ ﷺ کا مفہوم یہ ہے:

«مَا وَقَعَ مِنْ قَصْدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ الْكُفَّارَ بِنَفْسِهٖ اَوْ بِجَيْشٍ مِنْ قِبَلِهٖ.» [1]

''یعنی نبی ﷺ کا بذاتِہ کفار کا قصد کرنا یا آپ کا اپنی طرف سے ان کے مقابلہ میں لشکر روانہ کرنا۔''

اس تعریف سے معلوم ہوا کہ غزوہٴ کے لیے نبی ﷺ کا بنفسِ نفیس شریک ہونا ضروری نہیں۔لفظ غزوہ کا اصل معنی قصد الشئی ہے۔تفسیر قرطبی (۲۴۶/۴) اور فتح الباری (۲۷۹/۷) میں ہے:

«وَأَصْلُ الْغَزْوِ الْقَصْدُ وَمَغْزَى الْكَلَامِ مَقْصَدُهُ.»

یعنی کسی شئے کا قصد کرنا۔''

لغوی معنی کے اعتبار سے اس کا اطلاق غزوہٴ ہند پر ہوسکتا ہے۔

قرآن میں ہے: ﴿اَوْ كَانُوْا غُزًّى﴾(اٰل عمرٰن:۱۵٦)''یا جہاد کو نکلیں۔''

جہادی ٹریننگ کا شرعی حکم کیا؟ (بعض جاہلوں کے فتوے کی کیا حیثیت ہے)

سوال : ایک شخص نے موقف پیش کیا کہ ''جس شخص نے ۲۱ دن کی جہادی بنیادی ٹریننگ نہیں کی وہ پکا کافر اور منافق ہے۔'' سوال یہ ہے کہ بے شمار انبیاء، صلحاء اور اولیاء، صحابہ وتابعین اور محدثین وائمہ دین وغیرہم ہیں جنھوں نے مذکورہ ۲۱ دن کی ٹریننگ نہیں کی۔ مذکورہ آدمی کے قول کی شریعت اسلامیہ کی روشنی میں کیا حیثیت ہے؟ (سائل) (۱۳ جون ۲۰۰۳ء)

جواب : اس میں کچھ شک نہیں ہر مسلمان کے لیے بقدرِ استطاعت جہاد کی تیاری ضروری ہے۔ساری زندگی اس بات پر قائم ودائم رہنا چاہیے، اس کے لیے دنوں کی کوئی قید نہیں،سلف صالحین اسی پر عمل پیرا تھے۔سوچ سمجھے بغیر اور بغیر علم کے فتویٰ بازی نہیں کرنی چاہیے اس سے امت میں گمراہی اور افراتفری پھیلنے کا اندیشہ ہے۔

جہاد کے لیے زندگی وقف کرنا، والدین سے اجازت لینا اور شادی نہ کرنا:

سوال : آج کل موجودہ زمانے میں جہاد سب پر فرض ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کیا اس کے لیے کوئی شخص ساری زندگی اس میں وقف کرسکتا ہے؟ یعنی باوجود وسائل کے وہ شادی نہ کرے یا جہاد کے لیے اپنے والدین سے اجازت نہ لے۔ (ایک سائل) (۲۴ مئی ۱۹۹٦ء)

جواب : قرآنی آیت ﴿وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ﴾(الانفال:٦٠) کے پیشِ نظر جملہ مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ فوجی تربیت حاصل کریں اور ہمہ تن جہاد کے لیے تیار رہیں۔ بوقتِ ضرورت میدانِ معرکہ میں کود پڑیں۔

[1] فتح الباري:۷/ ۳۷۹

ساری زندگی جہاد کے لیے وقف کرنے کا اگر یہ مفہوم ہے کہ جملہ عزیز و اقارب کو خیر باد کہہ کر کلیۃً ان سے کٹ جائے یہ تو غیر درست ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ چند ماہ بعد مجاہدین کو رخصت پر بھیج دیا کرتے تھے تاکہ بیوی بچوں کے حقوق ادا کر آئیں۔ اور اگر اس سے مقصود ہمہ تن جہاد کے لیے استعداد پیدا کرنا ہے تو پھر واقعتاً درست فعل ہے بلکہ اس عملی جذبہ کا پایا جانا ضروری ہے۔ ورنہ ڈر ہے کہیں علامتِ نفاق پر موت واقع نہ ہو جائے۔

وسائل کے باوجود شادی نہ کرنا سنت نبوی ﷺ سے بے رغبتی کرنا ہے۔ جو درست فعل نہیں۔

سعید بن جبیر رحمہ اللہ کا بیان ہے مجھ سے ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: نکاح کر میں نے انکار کر دیا تو فرمایا:

«فَتَزَوَّجْ فَإِنَّ خَيْرَ هَذِهِ الْأُمَّةِ أَكْثَرُهَا نِسَاءً.»[1]

''نکاح کر کیونکہ اس امت کے افضل ترین آدمی یعنی نبی ﷺ کی سب سے زیادہ بیویاں تھیں۔''

عام حالات میں جہاد والدین کی اجازت سے ہونا چاہیے۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں بایں الفاظ تبویب قائم کی ہے۔ «بَابُ الْجِهَادِ بِإِذْنِ الْأَبَوَيْنِ»۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ''فتح الباری'' میں رقمطراز ہیں:

«قَالَ جُمْهُورُ الْعُلَمَاءِ يَحْرُمُ الْجِهَادُ إِذَا مَنَعَ الْأَبَوَانِ أَوْ أَحَدُهُمَا بِشَرْطِ أَنْ يَكُونَا مُسْلِمِينَ لِأَنَّ بِرَّهُمَا فَرْضُ عَيْنٍ عَلَيْهِ وَالْجِهَادُ فَرْضُ كِفَايَةٍ فَإِذَا تَعَيَّنَ الْجِهَادُ فَلَا إِذْنَ.» (۹/۱۴۰۔۱۴۱)

یعنی اکثر علماء اس بات کے قائل ہیں کہ جب والدین یا کوئی ایک ان میں سے جہاد کرنے سے منع کرے تو اس صورت میں جہاد کرنا حرام ہو جاتا ہے۔ بشرطیکہ وہ دونوں مسلمان ہوں کیونکہ اولاد کے لیے ان دونوں سے نیکی کرنا فرض عین ہے۔ یعنی ہر صورت ضروری ہے جب جہاد فرض کفایہ ہے یعنی بعض کے جہاد سے باقی لوگوں سے جہاد ساقط ہو جاتا ہے۔ جب جہاد متعین ہو جائے تو والدین سے اجازت کی چنداں ضرورت نہیں رہتی۔ اور اس کی تین صورتیں ہیں: (۱) خلیفۂ وقت اعلانِ عام کر دے۔ (۲) دشمن مسلمانوں پر حملہ آور ہو۔ (۳) انسان میدانِ معرکہ میں صف آراء ہو''

کیا دنیاوی تعلیم کے حصول کے لیے گھر سے نکلنے والا شخص راستہ میں مر جائے تو وہ شہید ہوگا؟

سوال: اگر ایک شخص دنیاوی تعلیم کے لیے گھر سے نکلے تو اگر خدانخواستہ وہ راستے میں ہی فوت ہو جائے تو کیا وہ شہید کہلاتا ہے؟ کیونکہ کئی دفعہ پڑھا ہے کہ جو علم کے حصول کے لیے نکلے وہ شہید کہلاتا ہے۔

(سائل: شاہد عزیز۔ اسلام آباد) (۲۸ نومبر ۱۹۹۷ء)

---

[1] صحیح البخاری، بَابُ كَثْرَةِ النِّسَاءِ، رقم: ۵۰۶۹

جواب: دنیاوی تعلیم کا حصول اگر دین کی معاونت کے لیے ہے تو یہ بھی دین ہی بن جاتی ہے۔

«اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ» ❶

ایسا آدمی موت کی صورت میں اجر وثواب سے محروم نہیں۔ ان شاء اللہ۔

کیا دنیاوی علم حاصل کرنے کا مرتبہ دینی علم حاصل کرنے والے کے برابر ہوسکتا ہے؟

سوال: حضور ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے۔علم کا حاصل کرنا ہر مرد، عورت پر فرض ہے۔کیا اس علم میں دین کے علاوہ دنیاوی علم بھی شامل ہے؟ اور یہ بھی ارشاد ہے کہ ''جو علم حاصل کرنے کے لیے نکلتا ہے وہ اللہ کی راہ میں نکلتا ہے اب جو دنیاوی علم صرف اور صرف دین کو قائم پہنچانے کے لیے حاصل کرے گا، کیا اس کا مرتبہ بھی اتنا ہی ہوگا جتنا کہ دین کا علم حاصل کرنے والے کا؟ جب کہ دنیاوی علم حاصل کرنے والے نے دین کے بنیادی علم کو حاصل کر لیا ہو؟ (محمد جہانگیر پوٹھ شیرڈ ڈیال میر پور کے۔اے) (۲۶ دسمبر ۱۹۹۷ء)

جواب: دنیاوی علم کو جب دینی جذبہ سے حاصل کیا جائے وہ بھی اسکے حکم میں ہے:

«اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ» ❷

ارکانِ شوریٰ کی خصوصیات اور نئی جماعت بنانا

سوال: ایک جماعت کی شوریٰ کمیٹی کے ممبران کی کیا خصوصیات ہونی چاہیے؟ اور شوریٰ کے ممبران منتخب کرنے کے لیے شرعی طریقہ کیا ہے؟ آج کل کی جماعتوں کی حالت کا تو آپ کو بھی علم ہے۔کیا ان جماعتوں کے ہوتے ہوئے اگر ہم دیکھیں کہ یہ جماعتیں کتاب وسنت کے مطابق کام نہیں کر رہی ہیں تو کیا دوسری جماعت بنا سکتے ہیں؟ ان مسائل کا کتاب وسنت کی روشنی میں جواب دیں۔ (ایک سائل) (۲۴ مئی ۱۹۹۶ء)

جواب: ارکانِ شوریٰ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اہل علم اور امین ہوں۔شیخین حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما ان اوصاف کے حاملین سے مشورہ کرتے تھے۔امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«وَكَانَتِ الْاَئِمَّةُ بَعْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْتَشِيرُونَ الْاُمَنَاءَ مِنْ أَهْلِ العِلْمِ فِي الْأُمُورِ المُبَاحَةِ لِيَأْخُذُوا بِأَسْهَلِهَا .... وَكَانَ الْقُرَّاءُ أَصْحَابَ مَشُورَةِ عُمَرَ كُهُولًا كَانُوا أَوْ شُبَّانًا، وَكَانَ وَقَّافًا عِنْدَ كِتَابِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ.» ❸

---

❶ صحيح البخاري، كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟، رقم:١

❷ ايضًا

❸ صحيح البخاري، بَابُ قَوْلِ اللَّهِ تَعَالَى: وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ، قبل رقم الحديث:٧٣٦٩

جن کے علم وتقویٰ پر خلیفہ وقت کو اعتماد ہو۔ بوقتِ ضرورت ان سے مشورہ لے سکتا ہے اور اپنی صوابدید سے ان کو منتخب بھی کر سکتا ہے۔ موجودہ حالات میں کوشش کرنی چاہیے کہ اقرب الی الصواب جماعت کا انتخاب کرلیا جائے یا پھر بلا قید افعالِ خیر میں سب کا تعاون جاری رکھا جائے اور ان کی شر سے بچنے کی کوشش کی جائے۔''

نئی جماعت کھڑی کرنے سے ممکن ہے مزید فتنے جنم لیں۔ حتی المقدور اس سے احتراز کرنا چاہیے اور موجودہ کی اصلاح کے لیے کوشاں رہنا چاہیے۔ والتوفیق بید اللہ

اور اگر یہ بھی ناممکن ہو تو پھر سب سے علیحدگی کی صورت میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جیسا کردار ادا کرنا چاہیے۔ یہاں تک کہ سب کے سب کلمہ واحدہ پر جمع ہو جائیں۔ تعجب خیز بات یہ ہے کہ مدعیانِ کتاب وسنت بذاتِ خود ان کی تعلیمات و دعوت سے عملی زندگی میں کوسوں دور نظر آتے ہیں۔ جن پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ ابھی تک کوئی مصلح مؤثر نظر نہیں آ رہا جو اقتدار کے لالچی اور پجاری طبقہ کو یکجا کر سکے۔

﴿ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ﴾ (الطلاق:۱)

انتخابِ امیر کے لیے جمہوری طریقہ ووٹنگ کا استعمال

سوال : ووٹنگ کے ذریعے جو حکومت منتخب ہوتی ہے اور جو جمہوریت ہے کیا یہ اسلامی ہے؟

(مرزا آفتاب اقبال (ابوطلحہ) خورد ضلع جہلم) (۲۸ اگست ۱۹۹۸ء)

جواب : انتخابِ امیر کے لیے عوام سے رائے طلب کرنا تو شریعت میں ثابت ہے۔ البتہ مغربی جمہوریت کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمارے ہاں مروّج نظامِ جمہوریت اسلام سے متصادم ہے۔ اس کو بدلنا از بس ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں میرا ایک تفصیلی فتویٰ ماہنامہ محدث میں شائع شدہ ہے۔ اس کا مطالعہ کافی مفید ہے۔

جہادِ اصغر سے جہادِ اکبر والی حدیث کا مطلب

سوال : ایک عرصہ تک ہم لوگ اسے «رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْاَصْغَرِ اِلَى الْجِهَادِ الْاَكْبَرِ» (ہم چھوٹے جہاد یعنی قتال سے بڑے جہاد یعنی جہاد بالنفس کی طرف لوٹ آئے ہیں) حدیث سمجھتے رہے۔ بطورِ حدیث سنا بھی اور پڑھا بھی۔ اب ایک کتاب عبد اللہ بن عزام (شہید افغانستان) کی لکھی ہوئی ''دیکھنا! قافلہ چھوٹ نہ جائے'' میں یہ بات نظر سے گزری کہ یہ حدیث نہیں ہے بلکہ ایک تابعی ابراہیم بن ابی عتلہ کا قول ہے اس کی حقیقت سے ہمیں آگاہ کریں کہ واقعی یہ حدیث ہے یا تابعی کا قول ہے۔ آپ کے شکر گزار ہوں گے۔ (حافظ محمد اقبال رحمانی عرفات ٹاؤن، کراچی) (۱۵ مارچ ۱۹۹۶ء)

جواب : «رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْاَصْغَرِ اِلَى الْجِهَادِ الْاَكْبَرِ» کے بارے میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''لوگوں کی زبان پر مشہور ہے کہ یہ ابراہیم بن عیلہ کی کلام ہے۔''

علامہ عجلونی ''کشف الخفاء'' میں فرماتے ہیں: ''یہ حدیث ''الاحیاء'' میں ہے۔'' حافظ عراقی نے کہا: ''بیہقی نے بسندِ ضعیف اس کو جابر رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے۔'' (۱/۴۲۴۔۴۲۵)

یاد رہے لفظ ابو عتلہ نہیں بلکہ عیلہ ہے۔

جہاد اصغر سے جہاد اکبر کی طرف لوٹنے والی حدیث کی تحقیق

سوال : «رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْاَصْغَرِ اِلَی الْجِهَادِ الْاَكْبَرِ» کیا یہ حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے؟ وضاحت فرمادیں۔ (سائل) (۱۶ فروری ۲۰۰۱ء)

جواب : حافظ ابن حجر ''تسدید القوس'' میں فرماتے ہیں کہ یہ ابراہیم بن عیلہ کا قول ہے اور حافظ عراقی نے کہا ہے کہ بیہقی میں سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے بسندِ ضعیف مروی ہے۔ (بحوالہ کشف الخفاء عجلونی، ص:۴۲۴)۔

جہاد کی رقم جلسہ، اجتماع وغیرہ پر خرچ کرنا:

سوال : جہاد کی رقم جلسہ، اجتماع وغیرہ پر خرچ کی جاسکتی ہے؟ (حاجی محمد اصغر الکافی بلوچ، راجن پور) (۲ جنوری ۱۹۹۸ء)

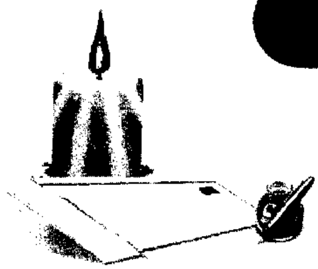
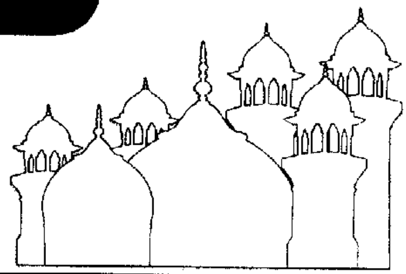
جواب : جلسہ اگر جہاد کی خاطر ہو تو اس میں جہادی رقم صرف کرنے کا کوئی حرج نہیں۔

«اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ» [1]

---

[1] صحیح البخاری، كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟، رقم:۱

البیعة

بیعت کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اور کیا بیعت کو تقلید سے تعبیر کرنا درست ہے؟

سوال: (الف) بیعت کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

(ب) کیا کسی عالم دین کے ہاتھ پر بیعت ضروری ہے کہ مسائل دین و دنیا سے واقفیت رہے؟

(ج) بیعت کو تقلید سے تعبیر کیا جا سکتا ہے؟ (سائل، جمیل احمد، کراچی) (۱۸ستمبر ۱۹۹۸ء)

جواب: (الف) بیعت حاکم وقت خلیفہ سے شریعت کی پیروی کے عہد کا نام ہے جو ہاتھ پر ہاتھ رکھنے اور زبانی کلامی عہد و پیمان سے بھی ہو سکتی ہے۔

(ب) کسی عالم دین کے ہاتھ پر شریعت میں بیعت کا تصور نہیں کیونکہ بیعت کا تعلق نبی ﷺ کی ذات سے ہوتا ہے یا جو نبی کے قائم مقام ہو۔ جیسے خلیفہ، حاکم، دین و دنیا کے مسائل میں کسی بھی صاحبِ علم سے رہنمائی حاصل ہو سکتی ہے۔ بیعت شرط نہیں۔

(ج) بیعت کو تقلید سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا کیونکہ بیعت اطاعت شریعت کے عہد کا نام ہے جب کہ تقلید کا مفہوم یہ ہے کہ غیر کے قول کو بلا دلیل قبول کر لینا۔

اسلام میں بیعت کی کیا حیثیت ہے؟

سوال: ❀ اسلام میں بیعت کی کیا حیثیت ہے؟

❀ ڈاکٹر اسرار کی بیعت شرعی نقطہ نظر سے کیسی ہے؟

❀ تبلیغی جماعت کی بیعت شرعی نقطہ نظر سے کیسی ہے؟

❀ پیر بھائیوں کی بیعت شرعی نقطہ نظر سے کیسی ہے؟

❀ آج کے دور میں کس کے ہاتھ پر بیعت کی جائے؟ نیز بتائیں کہ بیعت کن موقعوں پر کی جاتی ہے اور کس کے ہاتھ پر کی جاتی ہے؟

❀ جب ہم نے کلمہ پڑھ لیا ہے تو کیا کسی کا بیعت ہونا ضروری ہے؟ (سائل) (۳۔اگست ۲۰۰۷ء)

جواب: ڈاکٹر اسرار اور تبلیغی جماعت اور پیر بھائیوں کی مروجہ بیعت کتاب وسنت سے ثابت نہیں ہے۔ بیعت کا تعلق صرف نبی ﷺ کی ذات سے یا اُن کے قائم مقام سے ہوتا ہے۔ صاحب اقتدار خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت ہوتی ہے جو کتاب وسنت کا داعی ہو۔ موجودہ دور میں سعودی عرب کے سربراہِ مملکت کی بیعت ممکن ہے۔ خلیفہ وقت جب مناسب سمجھے حالات کے مطابق بیعت لے سکتا ہے۔ کلمہ پڑھنے کے بعد اپنے رب سے شریعت کی پابندی کا صرف عہد ہی کافی ہوسکتا ہے۔ کسی سے بیعت کرنا ضروری نہیں قرآن میں ہے:

﴿ وَ مَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِكُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِهٖ وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴾ (التوبة: ۱۱۱)

''اور اللہ سے زیادہ وعدہ پورا کرنے والا کون ہے؟ سو جو سودا تم نے اس سے کیا ہے اس سے خوش رہو، اور یہی بڑی کامیابی ہے۔''

قصۂ ثمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ عدم بیعت کی واضح دلیل ہے۔ [1]

کیا زندگی میں کسی کا بیعت ہونا صحیح ضروری ہے؟

سوال: کیا زندگی میں کسی کا بیعت ہونا صحیح ہے؟ جیسے عموماً لوگ پیر ومرشد پکڑتے ہیں۔ (ذوالفقار علی) (۱۷ مارچ ۱۹۹۵)

جواب: محض پیری مریدی کی بیعت کا شرع میں کوئی وجود نہیں۔ بیعت کا اصل تعلق نبی کی ذات سے ہوتا ہے جو اللہ کے ساتھ پابندی عہد کی صورت میں ضمانت ہے یا پھر خلافت کی صورت میں جو اس کا قائم مقام ہو اس کی بیعت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اسلام میں بیعت کا کوئی تصور نہیں۔ اگر اس کا کوئی وجود ہوتا تو ''قُرُوْنِ مُفَضَّلَة'' یعنی صحابہ وتابعین کے خیر وبرکات والے زمانے، اس کے زیادہ حق دار ہوتے جب کہ ان میں اس کا نام ونشان تک نہیں ملتا۔ لہٰذا یہ «کُلُّ مُحْدَثٍ بِدْعَةٌ» کے زمرہ میں شامل ہے۔

کیا آج کے دور میں بیعت کرنا ''بدعت'' ہے؟

سوال: ۱۹ر جولائی ۱۹۹۶ء شمارہ نمبر ۲۷ میں آپ کا ایک فتویٰ شائع ہوا تھا جس میں آپ نے بیعت کو بدعت قرار دیا

[1] صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب وفد بنی حنیفة ......، رقم: ۴۳۷۲

ہے۔اب نہ تو کسی نبی کو آنا ہے اور نہ اب کوئی خلیفہ ہے۔آج کے دور ناگوار میں ایک اکیلا آدمی برائیوں کے طوفان کے سامنے کیسے سینہ تان کے کھڑا ہوسکتا ہے؟ اس کے لیے ایک بڑی جماعت کی ضرورت ہے جو برائیوں کی روک تھام کر سکے۔کسی جماعت میں امیر جماعت کی بیعت کے بغیر ڈسپلن قائم ہونا ممکن نہیں۔تنظیم اسلامی کا ڈسپلن بیعت امیر پر قائم ہے۔اگر بیعت بدعت ہے پھر تو دنیا میں اسلام کبھی نہیں آ سکتا۔اس کے علاوہ شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ نے بھی سید احمد شہید رحمہ اللہ کی بیعت کی تھی۔

اس لیے آپ قرآن وحدیث کی روشنی میں یہ جواب دیں کہ پھر بیعت کے بغیر (جو آپ کے فتویٰ کی روشنی میں بدعت ہے) ایک اکیلا آدمی کیا کرے؟ (سائل) (۳۔اگست ۲۰۰۷ء)

جواب: جواباً عرض ہے کہ ایک سوال کے جواب میں میں نے مطلق بیعت کو بدعت قرار نہیں دیا تھا بلکہ پیری مریدی اور حزبی اسراری مروجہ بیعت کو بدعت قرار دیا تھا کہ شریعت میں اس کا کوئی وجود نہیں۔

جہاں تک نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس یا آپ ﷺ کے بعد قائم مقام کی حیثیت سے خلیفہ کی بیعت کا تعلق ہے سو یہ برحق ہے۔بطور مثال میں نے لکھا بھی تھا کہ آج کے دورِ انحطاط میں سعودی سربراہِ حکومت کی بیعت ممکن ہے کیوں کہ وہاں کسی نہ کسی انداز میں شریعتِ الٰہیہ کا نفاذ ہے۔جزیرۂ عرب میں جب ملک عبدالعزیز حکومت پر متمکن ہوئے تو اس زمانہ میں ہندوستان کے کئی ایک اہل علم ان سے بیعت ہوئے تھے، اس بات کا تذکرہ بالصراحۃ (وضاحت کے ساتھ) سعودی تاریخ میں موجود ہے۔باقی شاہ اسماعیل رحمہ اللہ نے جو سید احمد شہید رحمہ اللہ کی بیعت کی تھی تو یہ بحیثیت حاکم تھی۔اس کے عملی ظہور پر تاریخ شاہد ہے اس کے انکار کی چنداں گنجائش نہیں۔تاہم ہمارے ہاں بعض مدعیان عمل بالحدیث پیری مریدی جیسی بیعت کے تساہلات کا شکار ہیں لیکن اس کو جواز کی دلیل بنا کر پیش کرنا کسی طور صحیح نہیں۔

حضرت امام مالک رحمہ اللہ کا قول مشہور ہے: ''جو شے عہدِ نبوت میں دین تھی وہ آج بھی دین ہے۔اور جو اس وقت دین نہیں تھی، وہ آج بھی دین نہیں بن سکتی اور جو شخص دین میں بدعت ایجاد کرتا ہے دراصل اس کا زعم باطل یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے پیغام رسانی میں خیانت کی ہے، جب کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ .... ﴾ (المائدة:٣)

نیز فرمایا:

﴿ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ﴾ (المائدة: ٦٧)

پھر گناہوں سے پاکیزگی حاصل کرنے اور عملی زندگی سنوارنے کے لیے بیعت کو شرط قرار نہیں دیا جاسکتا کیوں کہ نبی ﷺ کے مجموعی عہد پر اگر غور وخوض کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ آپ ﷺ نے بعض اہم مواقع پر بیعت لی ہے جب کہ عام حالات میں مجرد عہد وپیمان کو کافی سمجھا ہے۔حتیٰ کہ نئے مسلمان ہونے والے کے لیے بھی بسا اوقات بیعت کو

ضروری نہیں سمجھا گیا، قصہ ثمامۃ بن اثال رضی اللہ عنہ اس امر کی واضح مثال ہے۔ لہٰذا بندے کو چاہیے کہ عملی زندگی کو سدھارنے کے لیے تعلق باللہ پر انحصار کر کے اس کو مضبوط تر بنانے کی ہر لحہ سعی کرتا رہے۔ والتوفیق بید اللہ وعلی اللہ فلیتوکل المتوکلون۔

فوت شدہ کی طرف سے زندہ کا بیعت لینا؟

سوال: سالانہ اجتماع عام رائیونڈ سال ۱۹۹۲ء کے موقع پر حسب سابق بیعت عام منعقد ہوئی ہے۔ اس کے اختتامی الفاظ تھے: ''بیعت کی ہم نے حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر انعام کے واسطے سے۔'' (واضح رہے کہ یہ بیعت تبلیغی جماعت کے موجودہ امیر حضرت مولانا انعام الحسن صاحب نے لی)

دریافت طلب امر یہ ہے کہ آیا اس نوع کی بیعت جس میں فوت شدہ شخص کے ہاتھ پر بالواسطہ یا بلاواسطہ بیعت ہو، قرآن وسنت میں اس کی کیا حیثیت ہے؟ (عبدالمجید گوندل) (یکم اکتوبر ۱۹۹۳ء)

جواب: اس قسم کی بیعت امرِ محدث (بدعتی کام) ہے۔ شریعت اسلامی میں اس کا کوئی جواز نہیں اور نہ صحابہ کرام اور ائمہ دین سے اس کی سند دستیاب ہے۔ لہٰذا اس سے اجتناب ضروری ہے۔ صحیح حدیث میں ارشادِ نبوی ہے:

« مَنْ اَحْدَثَ فِيْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ »[1]

''یعنی جو کوئی دین میں اضافہ کرتا ہے وہ مردود ہے۔''

کیا ''بیعت کیے بغیر مرنا'' جاہلیت کی موت مرنا ہے؟

سوال: میں نے پندرہ روزہ ''صحیفہ اہل حدیث'' (کراچی) میں پڑھا تھا کہ جو شخص امام کی بیعت کیے بغیر مرجائے وہ جاہلیت کی موت مرتا ہے۔ میں جب سے اہل حدیث ہوا ہوں کسی امام کی بیعت نہیں کی۔ آپ اس بارے میں میری رہنمائی فرما دیجیے۔

جواب: حدیث میں امام کی بیعت سے حاکم وقت کی بیعت مراد ہے۔ چناں چہ ''صحیح بخاری'' میں حدیث ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

« مَنْ كَرِهَ مِنْ أَمِيْرِهِ شَيْئًا فَلْيَصْبِرْ، فَإِنَّهُ مَنْ خَرَجَ مِنَ السُّلْطَانِ شِبْرًا مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً »[2]

''جس نے اپنے امیر میں کوئی مکروہ (ناپسندیدہ) شے پائی پس چاہیے کہ وہ صبر کرے (اور اُس کا ساتھ نہ

---

[1] صحيح البخاري، بَابُ إِذَا اصْطَلَحُوا عَلَى صُلْحِ جَوْرٍ فَالصُّلْحُ مَرْدُودٌ، رقم:٢٦٩٧

[2] صحيح البخاري، بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَتَرَوْنَ بَعْدِي أُمُورًا تُنْكِرُونَهَا، رقم: ٧٠٥٣

چھوڑے) کیوں کہ جو حاکم کی اطاعت سے ایک بالشت پیچھے ہٹتا ہے وہ جاہلیت کی موت مرتا ہے۔“
اس کی تشریح میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

« وَالْمُرَادُ بِالْمِيْتَةِ الجَاهِلِيَّةِ : وَهِيَ بِكَسْرِ الْمِيْمِ حَالَةُ الْمَوْتِ كَمَوْتِ أَهْلِ الْجَاهِلِيَّةِ عَلٰى ضَلَالٍ ، وَ لَيْسَ لَهٗ إِمَامٌ مُطَاعٌ لِأَنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَعْرِفُوْنَ ذٰلِكَ ، وَ لَيْسَ الْمُرَادُ أَنَّهٗ يَمُوْتُ كَافِرًا بَلْ يَمُوْتُ عَاصِيًا . وَ يَحْتَمِلُ أَنْ يَكُوْنَ التَّشْبِيْهُ عَلٰى ظَاهِرِهٖ ، وَ مَعْنَاهُ أَنَّهٗ يَمُوْتُ مِثْلَ مَوْتِ الْجَاهِلِيِّ ، وَ إِنْ لَّمْ يَكُنْ هُوَ جَاهِلِيًّا ، أَوْ أَنَّ ذٰلِكَ وَ رَدَ مَوْرِدَ الزَّجْرِ وَالتَّنْفِيْرِ . وَ ظَاهِرُهٗ غَيْرُ مُرَادٍ وَيُؤَيِّدُ أَنَّ الْمُرَادَ بِالْجَاهِلِيَّةِ التَّشْبِيْهُ . قَوْلُهٗ فِي الْحَدِيْثِ الْآخَرِ « مَنْ فَارَقَ الْجَمَاعَةَ شِبْرًا فَكَأَنَّمَا خَلَعَ رِبْقَةَ الْإِسْلَامِ مِنْ عُنُقِهٖ » أَخْرَجَهُ التِّرْمِذِي ، و ابن خزيمة ، و ابن حبان ۔ [1]

یعنی اس کی موت ایسی حالت میں آئی ہے جیسی اہلِ جاہلیت کی موت گمراہی پر آتی ہے جب کہ ان کا کوئی امام وپیشوا نہیں ہوتا کیوں کہ وہ لوگ اس نظم سے واقف نہیں تھے۔ یہ مراد نہیں کہ یہ آدمی کافر مرتا ہے بلکہ گناہ گار مرتا ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ تشبیہ اپنے ظاہر پر ہو معنی اس کا یہ ہے کہ وہ جاہلی کی طرح مرتا ہے اگرچہ خود جاہل نہیں یا اس سے مقصود محض زجر اور نفرت کا اظہار ہے ظاہر مراد نہیں۔ اس بات کی تائید کہ جاہلی موت سے مراد محض تشبیہ ہے ایک اَور حدیث سے ہوتی ہے جس میں ہے کہ ”جو جماعت سے ایک بالشت علیحدگی اختیار کرتا ہے گویا اس نے اپنی گردن سے اسلامی رسی اتار پھینکی۔“

صاحبِ اقتدار کے علاوہ دوسرے کی بیعت کا کوئی جواز نہیں، فی الوقت اگر کسی حاکم کی بیعت شرعی ہوسکتی ہے تو سعودی عرب کے حاکم کی ہوسکتی ہے۔ باقی سب شوقیہ دل بہلاوا ہے جس کا شرع میں کوئی اصل نہیں۔

مسئلہ بیعت اور اہل ”صحیفہ“

مسئلہ بیعت پر میں نے متعدد دفعہ ہفت روزہ الاعتصام میں لکھا جو اس سے قبل تفصیلاً شائع ہو چکا ہے۔ اب کی بار چوں کہ سائل کے سوال میں ’صحیفہ‘ کا نام آ گیا اس لیے اہل صحیفہ نے اس پر لکھنا ضروری خیال کیا اور اس پر بطور دلیل بعض علماء کے عمل کو پیش کیا۔

گزارش یہ ہے کہ اس عمل کے وہی لوگ ذمہ دار ہیں جو اس پر عامل تھے۔ جہاں تک شاہ محمد شریف گھڑیالوی مرحوم کی بیعت کا تعلق ہے سو ان کو سلطان ابن سعود نے اپنا نائب مقرر کیا تھا اس لیے جواز کا پہلو ہے۔ مولانا عبدالجلیل خاں مرحوم کے مضمون میں جن نصوص کا ذکر ہے ان سب کا تعلق بااختیار حاکم سے ہے جس سے کوئی اختلاف ونزاع نہیں۔

[1] فتح الباری:۱۳/ ۷

اہل صحیفہ نے مجھ سے دریافت کیا ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ جب کفار سے چھپ چھپ کر اشاعت اسلام فرماتے تھے تو کیا وہ اس وقت امیر یا امام تھے؟ کیا وہ اس وقت بیعت لے سکتے تھے یا نہیں؟ کیا ہم پاکستان چھوڑ کر سعودی عرب جا کر حاکم کی بیعت کریں؟ کیا آپ نے اس پر عمل کرلیا؟ یا آپ پاکستان میں ان احادیث پر عمل کو دل کا بہلاوا اور غیر شرعی عمل سمجھتے ہیں۔

جواباً عرض ہے کہ نبوت ورسالت اللہ تعالیٰ کا امر ہے جو ہر وقت اور ہر حالت میں نبی ﷺ کے ساتھ قائم ودائم رہتا ہے۔ نبی جب مناسب خیال کرے بیعت لے سکتا ہے اور اس کی بیعت کرنی چاہیے، لیکن ہر وقت بیعت ضروری بھی نہیں ہوتی، ثمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ کا قصہ اس امر کی واضح دلیل ہے۔ کیوں کہ بیعت کا اصل مقصد اطاعت ہے اور ہر طرح کی ہمدردی اور معاونت ہے۔ لہٰذا سعودی حکمران کی اطاعت کا عہد ہم یہاں کرسکتے ہے۔ وہاں جا کر بیعت ہونا ضروری نہیں اور میرا الحمد للہ اس پر عمل ہے۔ مذکورہ مضمون میں مشار الیہ احادیث کا تعلق مصنوعی عہدوں سے نہیں، حقیقت کو تسلیم کرنا مومن کی شان ہے۔ واللہ ولی التوفیق (حافظ ثناء اللہ المدنی)

حدیث «مَنْ فَارَقَ الْجَمَاعَةَ شِبْرًا......» کا مفہوم کیا ہے؟

سوال: (۳) حدیث: «مَنْ فَارَقَ الْجَمَاعَةَ شِبْرًا فَمَاتَ، إِلَّا مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً» [1] کیا یہ حدیث موجودہ دور کی تنظیموں کے متعلق اللہ کے نبی ﷺ نے بیان فرمائی ہے؟ کیوں کہ آج کل ہر ''امیر'' اسے اپنی تنظیم اور ''اطاعت'' کے لیے بطورِ دلیل پیش کرتا ہے۔ اس حدیث کا صحیح مطلب کیا ہے؟ (ابوعبداللہ شہدادکوٹ سندھ) (۱۳ستمبر ۱۹۹۶ء)

جواب: حدیث ہذا اپنی جگہ برحق ہے لیکن اس کا تعلق امامتِ کبریٰ سے ہے۔ جاہلیت کی موت کی وعید اس صورت میں ہے جب با اختیار امام موجود ہو۔ اب چونکہ امام نہیں اس لیے وعید بھی نہیں۔

امت کے تہتر (۷۳) فرقوں والی حدیث کی وضاحت

سوال: رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے کہ بنی اسرائیل ۷۲ فرقوں میں بٹ گئے تھے، میری امت کے ۷۳ فرقے ہوں گے صرف ایک جنتی ہوگا۔ کیا اہل حدیث، دیوبندی اور بریلوی بھی فرقے شمار ہوں گے؟

(ظفر اقبال۔ وزیر آباد) (۵ جولائی ۲۰۰۲ء)

جواب: کسی کو نشانہ بنانے کی بجائے اصول بیان کردیتا ہوں جس سے آپ پرکھ لیں کہ کون کس گروہ میں داخل ہے۔ امت کی ان جماعتوں کے مختلف درجات ہیں۔ ان میں سے ایک جماعت شریعت کے احکام دل و جان سے تسلیم کرنے اور شریعت کی اتباع کرنے کا انتہائی شوق رکھتی ہے اور دین میں بدعتیں ایجاد کرنے یا نصوص میں تحریف کرنے یا ان میں

[1] صحيح البخاري، بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: سَتَرَوْنَ بَعْدِي أُمُورًا تُنْكِرُونَهَا، رقم: ۷۰۵٤

کمی وبیشی کرنے سے انتہائی گریزاں رہتی ہے، تو ایسے خوش نصیب لوگ ہی فرقہ ناجیہ میں شمار ہوتے ہیں۔

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ شریعت کی بعض نصوص کا انکار کردیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اسلام میں ابھی ابھی (نئے نئے) داخل ہوئے ہیں (اور انھیں ان نصوص کا علم نہیں) یا وہ اسلامی علاقوں کے دور دراز خطے میں پیدا ہوئے۔ (جہاں اسلامی تعلیمات عام نہیں) تو انھیں یہ شرعی حکم معلوم نہیں ہوسکا جس کا انھوں نے انکار کیا ہے۔ بعض افراد ایسے ہوتے ہیں جو کسی گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں یا ایسی بدعت ایجاد کرتے ہیں جو دائرہ اسلام سے خارج نہیں کرتی تو یہ مومن ہیں۔ انھوں نے جو نیکی کی اس کے لحاظ سے وہ اللہ کے فرماں بردار ہیں۔ اور جس گناہ یا بدعت کا ارتکاب کیا اس کے لحاظ سے گناہ گار ہیں یہ لوگ اللہ کی مشیت میں داخل ہیں، چاہے تو معاف کردے یا سزا دے۔

کچھ وہ لوگ ہیں جو واضح ہوجانے کے بعد بھی دین کے کسی بنیادی مسئلے کا انکار کردیتے ہیں اور اللہ کی ہدایت چھوڑ کر اپنی خواہش نفس کی پیروی کرتے ہیں یا شرعی نصوص کی ایسی بعید تاویل کرتے ہیں، جو پہلے گزرے ہوئے تمام مسلمانوں کے خلاف ہوتی ہے۔ جب ان کے سامنے حق واضح کیا جائے اور مباحثہ ومناظرہ کے ذریعے حجت قائم کردی جائے تب بھی حق کو قبول نہیں کرتے تو ایسے لوگ کافر اور مرتد ہیں، خواہ وہ خود کو مسلمان کہیں، خواہ اپنے عقیدہ وطریقہ کے مطابق پوری کوشش سے اسلام کی تبلیغ کریں۔ (ملخص فتاوی شیخنا ابن باز رحمہ اللہ، ص: ۱۵۰، جلد دوم)

دینی جماعتیں اور تنظیم سازی کی شرعی حیثیت:

سوال: ہمارے ملک میں بہت سی دینی جماعتیں اور تنظیمیں ہیں مثلاً جمعیت اہل حدیث، غرباء اہل حدیث، حزب اللہ، مرکز الدعوۃ والارشاد، جماعت المسلمین، مرکزی جمعیت اہل حدیث، اشاعۃ التوحید والسنۃ (عبدالسلام رستمی) وغیرہ۔

① ان کی جماعت سازی اور تنظیم سازی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

② ان جماعتوں اور تنظیموں کے امیر کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

③ خلافت اسلامیہ کے احیاء کے لیے انفرادی دعوت وجہاد کرنا چاہیے یا کسی تنظیم کے ساتھ مل کر کوشش کی جائے؟ (سائل: عبدالرحمٰن) (۲۹ ستمبر ۲۰۰۰ء)

جواب: ①: مختلف ناموں سے جماعت بندی اور تنظیم سازی میں شرعاً کوئی حرج نہیں۔ بشرطیکہ مقصود صرف دعوت الی اللہ اور کسی نہ کسی انداز میں دین کی خدمت ہو، ناموں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ''صحیح بخاری'' میں حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«اُكْتُبُوْا لِيْ مَنْ تَلَفَّظَ بِالْإِسْلَامِ مِنَ النَّاسِ، فَكَتَبْنَا لَهُ أَلْفًا وَّخَمْسَمِائَةِ رَجُلٍ» [1]

---

[1] صحيح البخاري، كتاب الجهاد، باب كتابة الامام الناس: ٣٠٦٠

''مجھے مسلمانوں کے نام لکھ کر دو تو ہم نے پندرہ سو آدمیوں کے نام لکھ کر دیئے۔''

حدیث ہذا تنظیم سازی کے جواز کی دلیل ہے۔

②......ان جماعتوں اور تنظیموں کے امیر کی حیثیت سفری امیر جیسی ہے نہ کہ ''امیر المومنین'' جیسی، جہاں وہ اپنی حدود میں شریعت کا نفاذ کرتا ہے۔

③......اسلامی خلافت کے احیاء کے لیے انفرادی جدوجہد کی بجائے زیادہ بہتر یہ ہے کہ اقرب الی الحق تنظیم کے ساتھ مل کر کوشش کی جائے۔

مثل مشہور ہے: ایک اور ایک دو گیارہ۔

تنظیم سازی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

سوال : (۱) تنظیم سازی کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ تنظیم سازی کرنا عین اسلام کی خدمت ہے یا گناہ کبیرہ؟ یا بدعت ہے؟ واضح رہے کہ ایک ہی عقیدہ ونظریہ کے حامل قرآن وسنت کے پیروکاروں نے مختلف ناموں سے بے شمار تنظیمیں بنا ڈالی ہیں۔ ایک ہی قریہ وشہر میں کئی کئی تنظیمیں سرگرم عمل ہیں۔ لیکن متحد نہیں اور ایک امیر نہیں۔ بلکہ ایک دوسرے کی مخالفت کرتی ہیں۔ الغرض آج کل تنظیم ہی کو معیارِ حبّ وبغض تصور کر لیا گیا ہے۔ (ابوعبداللہ شہداد کوٹ سندھ) (۱۳ ستمبر ۱۹۹۶ء)

جواب : امامِ وقت اگر محسوس کرے تو تنظیم سازی کا جواز ہے۔ ''صحیح بخاری'' میں حدیث ہے:

« اُكْتُبُوْا لِيْ مَنْ تَلَفَّظَ بِالْاِسْلَامِ مِنَ النَّاسِ » ❶

''یعنی مجھے ان لوگوں کے نام لکھ کر دو جو مسلمان ہو چکے ہیں۔''

لیکن یہ تنظیم سازی کفر کے مقابلے میں ہے آپس میں نہیں۔ ہم مسلک اور ہم مشرب مختلف گروہوں اور جماعتوں کی تنظیم سازی اتفاق کے بجائے افتراق کا سبب بنے گی اس سے بچاؤ ضروری ہے۔

امت مسلمہ کے ذمہ سب سے اہم فریضہ یہ ہے کہ خلافت وامارت کے قیام کے لیے سعی کریں۔ جملہ امور شریعت ایک نظم ونسق کے تحت آنے سے ہی ملی وحدت کا خواب پورا ہو سکتا ہے۔ ورنہ انجام کار تشتت وتفرق اور انتشار کے ماسوا کچھ نہ ہوگا۔ قرآنی تعلیمات میں اس سے ہمیں باز رہنے کی تلقین کی گئی ہے:

﴿وَ لَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِيْحُكُمْ﴾ (الانفال:٤٦)

اور امام المحدثین بخاری رحمہ اللہ نے اپنی ''صحیح'' میں بایں الفاظ تبویب قائم کی:

« بَابُ مَا يُكْرَهُ مِنَ التَّنَازُعِ وَالِاخْتِلَافِ فِي الْحَرْبِ، وَعُقُوبَةِ مَنْ عَصَى إِمَامَهُ.»

❶ صحيح بخاري، كتاب الجهاد، باب كتابة الامام الناس: ٣٠٦٠

پھر آیت بالا سے استدلال کیا ہے۔

انتہائی دکھ درد اور افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آج سیکولر ملحدانہ اور بے دین نظریات کے حامل افراد اور تنظیمیں پوری ہمت اور قوت کے ساتھ اسلام اور اہل اسلام کے خلاف اپنی ریشہ دوانیوں اور توانائیوں کو استعمال کر رہے ہیں۔ کسی حد تک وہ اپنی کامیابی اور کامرانی کے خواب پورے ہوتے بھی دیکھ رہے ہیں۔ لیکن اسلام کے علمبردار ار مدعیانِ کتاب و سنت بالخصوص سلفی یا اہل حدیث حضرات بری طرح افتراق و انتشار کا شکار ہیں۔ جس سے واپسی کی راہ بظاہر کوئی نظر نہیں آتی۔ اِلَّا ان یّشاءَ اللّٰہ ربنا وسع ربّنا کل شیءٍ علمًا

دراصل بات یہ ہے کہ قریباً ہر جماعت اور ہر تنظیم کے ذمہ داران اور قائدین حضرات کے ذاتی نوعیت کے کچھ مفادات اور اغراض و مقاصد ہیں۔ جن سے وابستگی ان کے نزدیک جزو ایمان ہے۔ عوام ''کالانعام'' کو دجل و فریب کے ذریعہ سبز باغ دکھا کر انہی کی تکمیل و ترویج میں شب و روز مصروفِ کار ہیں اسی کے نتیجہ میں جگہ جگہ لڑائی جھگڑے اور ریا کاری اور قتل و غارت کا بازار گرم ہے۔ اور تکفیری توپوں کے رُخ غیروں کی بجائے اپنوں کی طرف زیادہ ہیں۔

اندریں حالات خیر و سلامتی کی راہ مجھے تو صرف اس میں نظر آتی ہے کہ جماعتی سیاست سے گوشہ نشینی اختیار کر کے مخلصین احباب کو ساتھ ملا کر یا انفرادی طور پر جیسے بھی ممکن ہو، شہر شہر، قریہ قریہ دعوتی و تبلیغی کام پورے انہماک سے شروع کر دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ خیر و برکت فرما کر شرفِ قبولیت سے نوازے گا۔ ان شاء اللہ

کس تنظیم سے تعلق رکھا جائے؟

سوال: (۳) ہمارے علاقہ (شہدادکوٹ سندھ) میں ایک تنظیم عرصہ سے کام کر رہی ہے۔ تقریباً ۴۰ یا ۵۰ برس سے۔ اب اس کے بعد یہاں ایک اور تنظیم نے جنم لیا ہے۔ پہلی تنظیم کا کہنا یہ ہے کہ دوسری تنظیم نے یہاں اختلاف و افتراق پیدا کیا ہے۔ جب کہ دوسری تنظیم کہتی ہے کہ ہم دین کا کام کر رہے ہیں۔ لہٰذا ہمیں یہاں کام سے نہ روکا جائے۔ الغرض ایسی صورتِ حال میں ہمیں شرعی طور پر کیا کرنا چاہیے؟ کس کا ساتھ دینا چاہیے؟ یا پھر علیحدگی اختیار کی جائے؟ نیز ان کے دینی پروگرامز کے متعلق کیا حکم ہے؟ (ابوعبداللہ شہدادکوٹ سندھ) (۱۳ستمبر ۱۹۹۶ء)

جواب: بلا امتیاز جن لوگوں میں خیر کا پہلو غالب نظر آئے ان کا ساتھ دیں، لیکن پارٹی بازی کی ضرر رسانی سے احتراز کریں۔

موجودہ جہادی تنظیموں میں سے مسلمان اپنے خون پسینے کی کمائی کس تنظیم کی نذر کرے؟

سوال: (۴) موجودہ دور کی جہادی تنظیمیں اوران کا جہاد آپ کے سامنے ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ ہر ایک تنظیم کا نظم اور وسائل الگ الگ ہیں۔ نیز تعاون و فنڈ حاصل کرنے کے لیے ہر تنظیم اپنے کارناموں کو اپنے اپنے جرائد میں بڑھ

چڑھ کر پبلسٹی (تشہیر) کرتے ہیں۔ اور ان تنظیموں کے کارکنوں کو اللہ کی قسم میں نے خود ایک دوسرے کی مخالفت کرتے سنا ہے۔ اب ایسی صورتِ حال میں ایک مسلمان اپنے خون پسینے کی کمائی کس تنظیم کی نذر کرے؟

مجھے امید ہے کہ آپ ہر صورت اپنی دعوت و منہج کا پاس رکھتے ہوئے اپنے رسالہ ''الاعتصام'' میں ان سوالات کا جواب ضرور عنایت فرمائیں گے۔ میں آپ کا شکر گزار رہوں گا۔ (ابو عبداللہ شہداد کوٹ سندھ) (۱۳ ستمبر ۱۹۹۶ء)

جواب: موجودہ جہادی تنظیمیں اگر واقعتاً اپنے اعمال و اقوال میں مخلص ہیں تو کم از کم ان کو کلمۃ واحدۃ پر جمع ہو جانا چاہیے تا کہ ثمرات و غایات کا حصول آسانی سے ممکن ہو سکے۔ ان کی آپس کی نزاع کو بھی ختم کرنے کا یہ آسان ترین نسخہ ہے کہ کسی ایک کی قیادت پر مجتمع ہو جائیں۔ ایک عام مسلمان اپنی حلال کی کمائی سے بلا امتیاز ان مجاہدین کی امداد کرے جن کو وہ اقرب الی الصواب سمجھتا ہے۔

کفار کا اہل اسلام پر ظلم آخر کیوں؟

سوال: تاریخ مسلمہ کے موجودہ دور اور خصوصاً ۹/۱۱ کے تناظر میں مسلمانانِ عالم اور عالم اسلام کی جو صورت حال ہوگئی ہے وہ سب اہل علم و نظر حضرات کے سامنے بالکل واضح اور عیاں ہے۔ لہٰذا اس داستان کو دہرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن موجودہ صورت حال کو سامنے رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب عالم کفر کا قطعی منصوبہ امت مسلمہ اور عالم اسلام کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نیست اور نابود کر کے ہی دم لینے کا ہے۔ العیاذ باللہ تعالیٰ

اس صورتِ حال سے ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر امت کے اپنے اندرونی خلفشار، دینی و اخلاقی، سیاسی و معاشی زوال کی تیز رفتاری کا یہی عالم رہا تو پھر ہماری اس شکست خوردگی کی آخری منزل کیا ہوگی؟ کیا اب امت کے وجود کا باقی رہنا ممکن ہو سکے گا؟ اگر ہو سکے گا تو اس کی صورت کیا ہوگی؟ آپ حضرات کے نزدیک مذکورہ صورت حال کے پیدا ہونے کے حقیقی اسباب و عوامل کیا ہیں؟ کیا یہ سب اسباب ہمارے دشمنوں کے پیدا کردہ ہیں یا ان کے پیدا کرنے والے اور ذمہ دار ہم خود بھی ہیں؟ کیا اس صورتِ حال سے نکلنے کی کوئی تدبیر اب بھی باقی ہے؟ اگر باقی ہے تو وہ کیا ہے؟ اسباب زوال اور نجات کے لیے ممکنہ تدابیر فکر مند مسلمانوں کے سامنے لانے کی بے حد ضرورت ہے۔

علمائے کرام اور دانشور اہل قلم حضرات سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ وہ اس صورتِ حال پر اپنا حقیقت پسندانہ، بے لاگ اور جامع تجزیہ اور اس کا قابل عمل حل تحریر فرما کر رہنمائی کریں۔

(سائل: پروفیسر عبدالخالق سہریانی بلوچ، کندھ کوٹ، سندھ) (۲۴ اگست ۲۰۰۷ء)

جواب: موجودہ صورتِ حال ہماری بداعمالیوں کا نتیجہ ہے۔ قرآنِ مجید نے اس کی نشان دہی فرمائی ہے:

﴿ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴾ (الروم: ۴۱)

''خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب فساد پھیل گیا ہے تاکہ اللہ ان کو ان کے بعض عملوں کا مزہ چکھائے عجب نہیں کہ وہ باز آ جائیں۔''

اس پریشان کن صورتِ حال سے نکلنے کی تدبیر یہ ہے کہ ہم اللہ کے حضور توبہ انابت کریں اور اپنی زندگی کو کتاب وسنت کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں اس پر کاربند رہنے میں دنیا وآخرت کی ساری بھلائی ہے۔ اگر ہم نے اپنے کو سدھارنے کی سعی نہ کی تو نوشتہ دیوار تباہی کوئی نہیں روک سکتا۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰهُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗۤ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّةٍ عَلَی الْكٰفِرِیْنَ یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآىِٕمٍ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴾ (المائدة:٥٤)

''اے ایمان والو! اگر کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا تو اللہ ایسے لوگ پیدا کر دے گا جن کو دوست رکھے اور جسے وہ دوست رکھیں۔ اور جو مومنوں کے حق میں نرمی کریں اور کافروں سے سختی سے پیش آئیں اللہ کی راہ میں جہاد کریں اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں یہ اللہ کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا اور جاننے والا ہے۔''

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَیَاْبَی اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ○ هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴾ (التوبة: ٣٢-٣٣)

''یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے (پھونک مار کر) بجھا دیں اور اللہ اپنے نور کو پورا کیے بغیر رہنے کا نہیں۔ اگرچہ کافروں کو برا ہی لگے وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ اس دین کو (دنیا کے) تمام دینوں پر غالب کرے اگرچہ مشرک ناخوش ہی ہوں۔''

قرآنی نصوص اس بات پر دال ہیں کہ غلبہ دین کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا اگر ہم نے اپنی اصلاح احوال کی طرف توجہ نہ دی تو ہماری جگہ دوسرے لوگ آ جائیں گے جن کے ہاتھ پر یقیناً غلبہ دین ہوگا۔ مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں مایوسی کفار کا شیوہ ہے۔ مومن اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہوتا۔

آداب (کتاب اللباس)

کیا سفید ڈاڑھی رکھنا مناسب ہے؟

سوال: کیا ڈاڑھی سفید رکھنا مناسب نہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ڈاڑھی سفید رکھنا غلط ہے۔ ڈاڑھی رنگنے کے متعلق فرمانِ رسول کی وضاحت کیا ہے؟ (نسیم الحق طیب، الہ آباد) (۸ مارچ ۱۹۹۶ء)

جواب: داڑھی کو رنگنا اور اپنی اصلی حالت پر رہنے دینا دونوں طرح جائز ہے۔ حافظ ابن حجر رسول اللہ ﷺ کے عمل کے بارے میں بحث کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

«وَ حَاصِلُهٗ اَنَّ مَنْ جَزَمَ اَنَّهٗ خَضَّبَ كَمَا فِی ظَاهِرِ حَدِيْثِ اُمِّ سَلَمَةَ وَ كَمَا فِی حَدِيْثِ ابْنِ عُمَرَ الْمَاضِی قَرِيْبًا اَنَّهٗ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَضَّبَ بِالصُّفْرَةِ حَكَی مَا شَاهَدَهٗ، وَ كَانَ ذٰلِكَ فِی بَعْضِ الْاَحْيَانِ وَ مَنْ نَفٰی ذٰلِكَ كَأَنَسٍ فَهُوَ مَحْمُوْلٌ عَلَی الْأَكْثَرِ الْأَغْلَبِ مِنْ حَالِهٖ.» ❶

''حاصل بحث یہ ہے کہ جس نے اس بات کا جزم کیا ہے کہ آپ ﷺ نے بالوں کو رنگا ہے جس طرح ام سلمہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کی احادیث میں ہے، کہ آپ ﷺ نے بالوں کو زرد بنایا انھوں نے جس شے کا مشاہدہ کیا اسے بیان کیا ہے۔ اور یہ عمل بعض اوقات میں ہے اور جس نے نفی کی ہے جس طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ ہیں تو یہ آپ ﷺ کی اغلب اور اکثر حالت پر محمول ہے۔ اور جو لوگ داڑھی سفید رکھنے کو غلط سمجھتے ہیں،

❶ فتح الباری: ۱۰/ ۳۵٤

سابقہ توجیہ کی بناء پر ان کا خیال غیر درست ہے۔ بلکہ امام طبری رحمہ اللہ نے یہاں تک کہا ہے ،اگر کسی علاقہ میں لوگ داڑھیوں کو رنگتے نہ ہوں، اور رنگنے والا انسان منفرد حیثیت کا حامل نظر آئے تو اس کے حق میں فعل ہذا کو ترک کرنا اولیٰ ہے۔''[1]

اور یہود و نصاریٰ کی مخالفت میں بال رنگنے والی روایت کو اہل علم نے صرف استحباب پر محمول کیا ہے اس طرح کے شریعت میں تیس سے زائد احکام موجود ہیں، اُن سے بالوں کو سیدھا چھوڑنے کے بجائے مانگ نکالنا ہے۔لیکن بعد میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے دونوں طرح ثابت ہے۔ کچھ اس طرح کا معاملہ محل نزاع میں ہے کہ بالوں کو رنگنا اور ترک کرنا دونوں طرح جواز منقول ہے۔

داڑھی رنگنے کے متعلق کیا حکم ہے؟

سوال : داڑھی رنگنے کا کیا حکم ہے عموماً بتایا جاتا ہے کہ مجاہدین کو داڑھی رنگنا چاہیے بلکہ خضاب بھی لگا سکتے ہیں اور کسی کے لیے جائز نہیں۔ (شاہجہان ملک) (۱۲ نومبر ۱۹۹۹ء)

جواب : داڑھی رنگنا مستحب ہے لیکن خالص سیاہ کرنے سے بچنا چاہیے اور اگر نہ بھی رنگا جائے تو جواز ہے۔اس بارے میں وارد دلائل کا خلاصہ یہی ہے تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔فتح الباری: ۱۰/ ۳۵۱ تا ۳۵۶۔باب ما یذکر فی الشیب اور باب الخضاب۔

کالا رنگ داڑھی کو رنگنا جائز ہے؟

سوال : کالا رنگ داڑھی کو رنگنا جائز ہے؟ (ابوحنظلہ محمد محمود علوی) (۱۳ جون ۱۹۹۷ء)

جواب : داڑھی خالص سیاہ کرنا حرام ہے۔قصہ ابوقحافہ اس کی واضح دلیل ہے۔فرمایا:

«وَاجْتَنِبُوا السَّوَادَ.» [2]

داڑھی کو رنگنے والی کالی مہندی کا استعمال:

سوال : داڑھی کو رنگنے والی کالی مہندی وغیرہ لگانا جائز ہے۔یا نہیں؟ (محمد عرفان محمدی ضلع وہاڑی) (۲ دسمبر ۱۹۹۲ء)

جواب : خالص سیاہ رنگ سے پرہیز ضروری ہے۔ابوقحافہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

«وَاجْتَنِبُوا السَّوَادَ » [3]

---

[1] فتح الباری: ۱۰/ ۳۵۵

[2] صحیح مسلم، بَابٌ فِی صَبْغِ الشَّعْرِ وَتَغْیِیرِ الشَّیْبِ، رقم: ۲۱۰۲

[3] صحیح مسلم، بَابٌ فِی صَبْغِ الشَّعْرِ وَتَغْیِیرِ الشَّیْبِ، رقم: ۲۱۰۲ ۔ منتقی الاخبار بابُ تَغْیِیرِ الشَّیْبِ بِالْحِنَاءِ وَالْکَتَمِ وَنَحْوِهِمَا وَکَرَاهِیَةِ السَّوَاد

سر اور ڈاڑھی کے بالوں کو رنگنے کے لیے کونسا رنگ مسنون ہے؟

سوال: شریعت مطہرہ میں ایک معمر مسلمان کو اپنے سر اور ڈاڑھی کے بالوں کو رنگنے کی اجازت ہے اور اگر ہے تو کونسا رنگ مسنون ہے؟ (حاجی عبدالرحمٰن السّلفی چترال) (۱۵ جنوری ۱۹۹۹ء)

جواب: سر اور ڈاڑھی کے بالوں کو خالص سیاہ رنگ کے علاوہ ہر رنگ سے رنگا جا سکتا ہے۔

کیا ڈاڑھی رنگنا ضروری ہے

سوال: میں نے ایک مولوی صاحب سے کہا کہ مولوی صاحب آپ کی ڈاڑھی کے بال سفید ہیں۔ ان کو آپ تبدیل کیوں نہیں کرتے اور میں نے اسے وہ حدیث بھی سنائی کہ غیر مسلموں کی مخالفت کرو، تو انھوں نے جواب میں کہا کہ اگر انسان زندگی میں ایک مرتبہ ہی رنگ لے تو کافی ہے ساری زندگی رنگنے کی ضرورت نہیں۔ پھر انھوں نے یہ بھی حدیث سنائی کہ یہودی جوتیاں اتار کر نماز پڑھتے ہیں اور ہم جوتیاں پہن کر نماز ادا کریں، تو میں اس کی یہ بات سن کر خاموش ہو گیا۔ آپ اس مسئلہ میں تفصیلی جواب تحریر فرمائیں۔ (عمر علی مغل) (۳ مارچ ۲۰۰۰ء)

جواب: مولوی صاحب نے جو کچھ فرمایا وہ صحیح ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جس کا حاصل یہ ہے کہ جس نے نبی ﷺ کی ڈاڑھی رنگنے کا ذکر کیا ہے (جس طرح کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایات میں ہے کہ آپ ﷺ نے زرد رنگ کیا تھا) یہ بعض حالات میں ہے اور جس نے نفی کی ہے (جیسے حضرت انس رضی اللہ عنہ ہیں) یہ آپ ﷺ کے اکثر اور اغلب حال پر محمول ہوگا۔ (فتح الباری: ۱۰/۳۵۴) یہود کا ڈاڑھی نہ رنگنا وقتی ہے حتمی نہیں۔ یہود ڈاڑھی رنگ بھی سکتے ہیں تو اس صورت میں کیا حکم ہوگا؟ ظاہر ہے کہ شرعی احکام ابدی ہیں، افعالِ یہود کے تابع نہیں، لہٰذا ڈاڑھی رنگنا صرف مستحب ہے واجب نہیں۔

کیا بالوں پر کالی مہندی یا کلف لگائی جا سکتی ہے؟

سوال: کیا بالوں پر کالی مہندی یا کلف لگائی جا سکتی ہے؟ کتاب و سنت کی روشنی میں وضاحت کریں۔
(فتح علی گہلن ہٹھاڑ) (۱۲ مارچ ۱۹۹۹ء)

جواب: بالوں کو سیاہ کرنا قطعاً منع ہے۔ حدیث میں ہے:

« وَاجْتَنِبُوا السَّوَادَ » [1]

''یعنی ابو قحافہ کو بال سیاہ کرنے سے بچاؤ۔''

لہٰذا بالوں پر سیاہ مہندی یا کلف وغیرہ استعمال نہیں کرنا چاہیے۔

---

[1] صحیح مسلم، بَابٌ فِي صَبْغِ الشَّعْرِ وَتَغْيِيرِ الشَّيْبِ، رقم: ۱۲۰۲

بالوں کو خضاب لگانا

سوال: کیا بالوں پر سرخ یا بھورے رنگ (Brown Colour) کا خضاب لگانا جائز ہے؟ اور کالا خضاب کن حالتوں میں لگایا جا سکتا ہے؟ (محمد ایوب ہٹھان، ماتلی ضلع بدین) (۱۴ اپریل ۲۰۰۳ء)

جواب: احادیث میں صرف کالے خضاب کی ممانعت وارد ہے، اس کے علاوہ تمام رنگ استعمال کرنے جائز ہیں تاہم بعض علماء نے جہاد کی حالت میں سیاہ خضاب کی بھی اجازت دی ہے اور بعض نے مطلقاً (یعنی عام حالات میں بھی) رخصت دی ہے۔ سلف میں سے سعد بن ابی وقاص، عقبہ بن عامر، حسن، حسین، جریر وغیرہ رخصت کے قائل ہیں۔ ابن ابی عاصم نے ''کتاب الخضاب'' میں اسی مسلک کو اختیار کیا ہے۔ لیکن راجح بات یہ ہے کہ خالص سیاہ خضاب مطلقاً ناجائز ہے۔ حدیث جابر رضی اللہ عنہ میں ہے:

«جَنِّبُوا السَّوَادَ.» ❶

''یعنی اسے خضاب لگاؤ مگر کالے رنگ سے بچاؤ۔''

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: فتح الباری: (۱۰/۳۵۴۔۳۵۵)۔

عورتوں کا بیوٹی پارلر سے بال رنگوانے کا حکم

سوال: عورت کا بیوٹی پارلر میں جا کر مہندی کی بجائے کیمکل یا کسی اور چیز سے بال رنگوانا کیسا ہے؟

(سائل) (۲۵ جولائی ۲۰۰۳ء)

جواب: خالص کالے رنگ سے بچتے ہوئے اگر مہندی کے علاوہ بھی مصنوعی طریقے سے بالوں کو رنگ لیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ حرام کی آمیزش نہ ہو اور فاسق و فاجر اور کافر عورتوں سے تشبیہ بھی مقصود نہ ہو۔ نبی ﷺ کا فرمان ہے:

«مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ.» ❷

''جو کسی قوم کی مشابہت کرتا ہے وہ ان ہی سے بن جاتا ہے۔''

یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ جنس میں یا کسی وصف میں اشتراک اپنے اندر ایک خاص کشش رکھتا ہے۔ جو طبعی طور پر یا عادی طور پر اثر انداز ہوتا ہے اور اپنے اندر عقل کو مسخر کرنے کی خاصیت بھی رکھتا ہے جس سے انکار کی گنجائش نہیں۔

بالوں کا اپنا طبعی رنگ (سیاہ یا کوئی اور بھورا وغیرہ) اصل حالت میں قائم ہو تو پھر بلاوجہ تبدیلی کا نہیں سوچنا چاہیے

❶ مسند احمد، رقم:١٤٦٤١

❷ سنن أبي داؤد، بَابٌ فِي لُبْسِ الشُّهْرَةِ، رقم:٤٠٣١

کیونکہ رسول اکرم ﷺ نے سفید بالوں کی تبدیلی کا حکم دیا ہے۔فرمایا:

«غَيِّرُوا هَذَا بِشَيْءٍ، وَاجْتَنِبُوا السَّوَادَ » ❶

''اس سفید رنگ کو تبدیل کردو مگر سیاہ رنگ سے بچنا۔''

بیوی کے اصرار پر بالوں کو سیاہ کرنا کیسا ہے؟

سوال: زید کی عمر ۳۹ سال ہے اور وہ شکل وصورت سے اپنی عمر سے بھی کم دکھائی دیتا ہے۔لیکن اس کے سر کے تمام بال اور داڑھی کے بھی اکثر بال سفید ہو چکے ہیں۔اس کی بیوی اسے سیاہ خضاب لگانے کے لیے مجبور کرتی ہے۔کیا وہ سیاہ خضاب لگا سکتا ہے؟ اگر لگا سکتا ہے تو کتنے عرصہ تک؟

جواب: بالوں کو سیاہ کرنا مطلقاً ممنوع ہے۔صحیح حدیث میں نبی اکرم ﷺ سے ثابت ہے۔

«غَيِّرُوا الشَّيْبَ» ❷

دوسری روایت میں ہے:«غَيِّرُوا هَذَا بِشَيْءٍ، وَاجْتَنِبُوا السَّوَادَ» ❸

''یعنی سفید بالوں کو تبدیل کرو۔اور انھیں سیاہ کرنے سے بچاؤ۔''

اور دوسری روایت میں ہے:

يَكُونُ قَوْمٌ يَخْضِبُونَ فِي آخِرِ الزَّمَانِ بِالسَّوَادِ، كَحَوَاصِلِ الْحَمَامِ، لَا يَرِيحُونَ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ.» ❹

البتہ سیاہ رنگ کے ساتھ سرخ رنگ مل جائے لیکن بالوں کو خالص سیاہ کرنا بہرصورت حرام ہے۔اس لیے بھی کہ اس میں مخلوق کا خالق سے مقابلہ نظر آتا ہے۔جو کسی طور صحیح نہیں۔جب تک اس نے چاہا بالوں کو سیاہ رکھا پھر سیاہی کو سفیدی میں بدل ڈالا۔(اب مخلوق کے لائق نہیں کہ خالق کی تبدیل شدہ ہیئت وشکل کو حاصل کرنے کی دوبارہ ناکام سعی کرے)۔

کیا عورت اپنے شوہر کی وجہ سے بال سیاہ کرسکتی ہے؟

سوال: کیا عورت اپنے شوہر کی خاطر سفید بالوں کو سیاہ کرسکتی ہے؟ (خالد محمد، ۱۶ چک برکی) (۶ اگست ۲۰۰۴ء)

جواب: بعض اہل علم نے عورت کو بال سیاہ کرنے کی اجازت دی ہے، حلیمی نے اس مسلک کو اختیار کیا ہے۔(فتح

❶ صحیح مسلم، بَابُ فِي صَبْغِ الشَّعْرِ وَتَغْيِيرِ الشَّيْبِ، رقم:۲۱۰۲

❷ سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي الخِضَابِ، رقم:۱۷۵۲

❸ صحیح مسلم، بَابُ فِي صَبْغِ الشَّعْرِ وَتَغْيِيرِ الشَّيْبِ، رقم:۲۱۰۲

❹ سنن ابی داؤد، بَابُ مَا جَاءَ فِي خِضَابِ السَّوَادِ، رقم: ۴۲۱۲ ، سنن النسائی، النَّهْيُ عَنِ الْخِضَابِ بِالسَّوَادِ، رقم:۵۰۷۵

الباری: ۱۰/ ۳۵۵) لیکن عمومی احادیث کے پیش نظر بظاہر مرد اور عورت کے لیے اس حکم میں کوئی تفریق نہیں ہے۔
فرمایا:«غَيِّرُوا هَذَا بِشَيْءٍ، وَاجْتَنِبُوا السَّوَادَ » ❶

بالوں کو سیاہ کرنے کا حکم

سوال : عمر کے ساتھ ساتھ انسانی جسم تغیرات کا شکار ہوتا ہے۔ ہر انسان اپنے جیتے جی چاہتا ہے کہ لوگوں کو اس کی صورت بھلی معلوم ہو۔ اسی خواہش کے پیش نظر بعض لوگ اپنے ان بالوں کو سیاہ کر لیتے ہیں جن پر چاندی اتر آئی ہو۔ اگر اس عمل سے کسی کو دھوکہ دینا نہیں بلکہ قبل از وقت بدلتی صورت کو وقت کے مطابق ڈھالنا مقصود ہو تو اس کی شرعی نوعیت /حیثیت کیا ہوگی؟ قدیم زمانہ میں ایسی چیزوں سے بال سیاہ کیے جاتے تھے جو مضر صحت بلکہ مضرِ جان تھیں۔ لہٰذا ان کا استعمال ممنوع تھا۔ (جب کہ بے ضرر چیزوں جیسے ''لال مہندی'' کا استعمال جائز تھا) مگر آج بے ضرر مصنوعات آ گئی ہیں تو کیا ان کا استعمال کرنا بھی ممنوع ہوگا۔ امید ہے آپ اس سوال کا تسلی بخش جواب عنایت فرمائیں گے۔

(ایک سائل لاہور) (۲۳ اپریل ۱۹۹۹ء)

جواب : نبی ﷺ نے مطلقاً بالوں کو سیاہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اس میں ضرر اور بے ضرر چیز کی تفریق نہیں فرمائی۔
لہٰذا سیاہی سے مطلقاً اجتناب ضروری ہے۔ صحیح حدیث میں ہے:

«وَاجْتَنِبُوا السَّوَادَ » ❷

''یعنی ابوقحافہ کو بال سیاہ کرنے سے بچاؤ۔''

کیا بیماری کی وجہ سے سفید ہوجانے والے بالوں کو سیاہ کیا جا سکتا ہے؟

سوال : اگر کسی بیماری کی وجہ سے بال سفید ہو جائیں (یعنی بڑھاپا نہ ہو) تو کیا انھیں سیاہ کیا جا سکتا ہے؟

(خالد محمد، ۱۶ چک برکی) (۶ اگست ۲۰۰۴ء)

جواب : خالصتاً سیاہ خضاب کا استعمال مطلقاً ناجائز ہے کیونکہ ممانعت کی احادیث میں عمر کے کسی حصہ کو اور کسی علت کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا البتہ اگر ساتھ دوسرا رنگ ملا دیا جائے تو اس کے جواز میں کوئی کلام نہیں۔

خوب صورتی کے لیے دانتوں کو تراشنا کیسا ہے؟

سوال : آرائش و زیبائش اور خوبصورتی بڑھانے کے لیے دانتوں کو تراشنا، باریک یا برابر کرنا شرعاً کیسا ہے؟

(سائل) (۱۵ اپریل ۲۰۰۵)

❶ صحیح مسلم، بَابٌ فِي صَبْغِ الشَّعْرِ وَتَغْيِيرِ الشَّيْبِ، رقم:۲۱۰۲
❷ أیضًا

جواب: خوبصورتی کے لیے دانتوں کو تراشنا، باریک یا برابر کرنا منع ہے، جیسا کہ صحیح بخاری بَابُ الْمُتَفَلِّجَاتِ لِلْحُسْنِ، فتح الباری، ج۱۰/۳۷۲) اور سنن ابی داؤد باب فی صلة الشعر، عون المعبود:۴/۱۲۷) میں واضح روایات موجود ہیں۔

مرد حضرات کا سونے کے دانت لگوانا، اور اس فن کی کمائی کا حکم؟

سوال: کیا مرد حضرات سونے کے مصنوعی دانت لگوا سکتے ہیں؟ اور اس فن سے روزی کا حصول شرعاً کیسا ہے؟

(سائل) (۱۵ اپریل ۲۰۰۵)

جواب: مرد بوقت ضرورت سونے کا دانت لگوا سکتا ہے۔ روزی کے واسطے اس فن کو اختیار کرنا محل نظر ہے کیوں کہ محض بوقت مجبوری اس کا جواز ہے۔

سونے کے دانت لگوانا

سوال: کیا مرد سونے کا دانت لگوا سکتا ہے؟ حالانکہ سونا مردوں کو حرام ہے؟

(محمد مسعود، صابر خورشید کالونی گجرات) (۱۹ جولائی ۱۹۹۶ء)

جواب: بوقت شدید ضرورت سونے کا دانت لگوایا جا سکتا ہے۔ حدیث میں ہے: یوم کلاب کو ایک شخص کا ناک کٹ گیا تو اس نے چاندی کا لگوا لیا۔ بعد میں اس میں بدبو پڑ گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: سونے کا لگوا لے۔ [1]

« فِيْهِ اِسْتِبَاحَةُ اسْتِعْمَالِ الْيَسِيْرِ مِنَ الذَّهَبِ لِلرِّجَالِ عِنْدَ الضَّرُوْرَةِ كَرَبْطِ الْأَسْنَانِ بِهٖ وَمَا جَرٰى مَجْرَاهُ مَعًا لَايَجْرِي غَيْرُهُ فِيْهِ مَجْرَاهُ۔انتهى.» [2]

اس کے باوجود تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ حتی المقدور سونے کا دانت لگوانے سے احتراز کیا جائے کیوں کہ مرد کے لیے اصلاً سونا حرام ہے۔ منصوص کے سوا حرمت کا پہلو غالب ہونا چاہیے، بالخصوص اس وقت جب کہ سونے کے دانت کا بدل بآسانی دستیاب ہو سکے۔

ڈاڑھی رکھنے کا کیا حکم ہے؟

سوال: ڈاڑھی رکھنے کے متعلق اللہ اور اس کے رسول ﷺ کیا فرماتے ہیں؟ کیا یہ فرض ہے کہ سنت اور اگر سنت ہے تو مؤکدہ یا غیر مؤکدہ، تفصیل سے جواب دے کر عند اللہ ماجور ہوں۔ اس سے میرے حلقے کے بہت سے احباب کا بھلا ہو

[1] سنن ابی داؤد، بَابُ مَا جَاءَ فِي رَبْطِ الْأَسْنَانِ بِالذَّهَبِ، رقم:۴۲۳۲، سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي شَدِّ الْأَسْنَانِ بِالذَّهَبِ، رقم:۱۷۷۰

[2] عون المعبود:۴/ ۱۸۴

گا۔ (شیخ عبدالرحمٰن۔اسلام آباد) (۲۸ اپریل ۱۹۹۵ء)

جواب: ڈاڑھی رکھنا واجب ہے۔انبیاء علیہم السلام کی سنت قدیمہ ہے۔صحیح احادیث میں اس کی تعبیر بصیغۂ امر کی گئی ہے جو وجوب کی دلیل ہے۔چنانچہ فرمایا:«وَاعْفُوْا اللِّحٰی» یعنی داڑھیاں بڑھاؤ اور بعض الفاظ میں «اَوْفُوْا، اَرْخُوْا، اَرْجُوْا،وَفِّرُوْا» ہے۔

امام نووی شرح مسلم میں فرماتے ہیں:

«وَ مَعْنَاهَا كُلُّهَا تَرْكُهَا عَلٰى حَالِهَا هٰذَا هُوَ الظَّاهِرُ مِنَ الْحَدِيْثِ الَّذِیْ تَقْتَضِيْهِ اَلفَاظُهٗ»(۱۵۱/۳)

''یعنی ان تمام الفاظ کا مفہوم یہ ہے کہ ڈاڑھی کو اپنی حالت پر چھوڑ دو۔حدیث کے ظاہری الفاظ کا تقاضا یہی ہے۔ دیگر بعض احادیث میں دس امور کو فطرت قرار دیا گیا ہے۔ان میں سے ایک إِعْفَاءُ اللِّحْيَة (ڈاڑھی کا بڑھانا) بھی ہے۔[1] مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو۔الاعتصام ۱۱ نومبر ۱۹۹۴ء

ڈاڑھی کٹوانا کیسا ہے؟

سوال: ڈاڑھی کے متعلق شرعی حکم کیا ہے؟ کیا اسے کٹوایا بھی جا سکتا ہے اور ڈاڑھی نہ رکھنے والا گناہ کا مرتکب ہوتا ہے یا نہیں؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں واضح کریں۔(فائزہ منیر۔ٹیکسلا) (۲۳ جولائی ۱۹۹۹ء)

جواب: افضل یہ ہے کہ ڈاڑھی پوری رکھی جائے مٹھی سے زائد کٹوائی جا سکتی ہے۔تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: فتاویٰ اہل حدیث:۳/۳۳۵ تا ۳۳۸) ڈاڑھی نہ رکھنے والا کبیرہ گناہ کا مرتکب ٹھہرتا ہے کیونکہ اس نے اوامر شریعت کی مخالفت کی ہے۔

ڈاڑھی کی حدود اور تعریف کیا ہے؟

سوال: ڈاڑھی کی حد کیا ہے؟ رخساروں کے بال اور ٹھوڑی کے نیچے گردن کے بال ڈاڑھی کا حصہ ہیں یا نہیں؟ رخساروں اور گردن کے بالوں کو صاف کرنا جائز ہے یا ناجائز؟

جواب: ڈاڑھی کے بارے میں احادیث میں پانچ الفاظ وارد ہیں:

«أَعْفُوْا ، اَوْفُوْا، اَرْخُوْا ، اَرْجُوْا ، وَفِّرُوْا .»

(شرح مسلم:۱۵۱/۳) میں امام نووی رحمہ اللہ ان تمام الفاظ کا ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

«وَمَعْنَاهَا كُلُّهَا تَرْكُهَا عَلَى حَالِهَا .»

''ان سب کا معنیٰ یہ کہ ڈاڑھی کو اپنی حالت پر چھوڑ دو۔''

ڈاڑھی کا اطلاق دونوں گالوں اور ٹھوڑی کے بالوں پر ہوتا ہے۔ (المنجد)

[1] صحیح مسلم:۱٤٧/٣

اس سے معلوم ہوا کہ رخساروں کے بال ڈاڑھی کی تعریف میں شامل ہیں، لہٰذا ان کو صاف نہیں کرنا چاہیے۔ ہاں البتہ ٹھوڑی کے نیچے گردن کے بال داڑھی میں شامل نہیں انکو صاف کیا جا سکتا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب (مومن کا تاج ڈاڑھی۔ تلمیذی قاری صہیب احمد)

ڈاڑھی کے نیچے جو گردن پر بال ہوتے ہیں ان کا خط کروانا

سوال : کیا ڈاڑھی کے نیچے جو گردن پر بال ہوتے ہیں ان کو آدمی منڈواسکتا ہے یا وہ ڈاڑھی میں شامل ہیں اگر شامل ہیں تو دلیل سے وضاحت فرمائیں۔ ایسے ہی جو بال رخسار پر ہوتے ہیں وہ آدمی منڈواسکتا ہے یا نہیں؟ رخسار اور گردن پر بالوں کے منڈوانے کو کچھ علماء جائز اور کچھ ناجائز قرار دیتے ہیں۔ حقیقت سے آگاہ فرمائیں۔

(قاری ظفر اقبال ظفر۔ گوجرانوالہ) (۲۰ اکتوبر ۲۰۰۰ء)

جواب : گردن کے بال ڈاڑھی میں شامل نہیں۔ اس لیے آدمی ان کو منڈواسکتا ہے جب کہ رخساروں کے بال ڈاڑھی کی تعریف میں شامل ہیں۔ لہٰذا ان کو منڈوانا ناجائز ہے۔

المنجد میں ہے۔ «شَعْرُ الْخَدَّیْنِ وَالذَّقَنِ» رخسار اور ٹھوڑی کے بال کو ڈاڑھی کہا جاتا ہے۔

ڈاڑھی کا مذاق اڑانے والے کا حکم

سوال : ایک آدمی ڈاڑھی کا مذاق اڑاتا ہے اور پھر خوفِ خدا سے توبہ کر لیتا ہے کیا اس کی توبہ قبول ہوسکتی ہے؟

جواب : ڈاڑھی کا مذاق اڑانے والے کی توبہ قابل قبول ہے۔ قصہ افک میں یہ الفاظ ہیں:

« فَإِنَّ الْعَبْدَ إِذَا اعْتَرَفَ بِذَنْبٍ ثُمَّ تَابَ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ» [1]

''یعنی بندہ جب اپنے گناہ کا اقرار کر لیتا ہے اور اللہ سے توبہ کی درخواست کرتا ہے تو وہ اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے۔''

بطورِ سزا ڈاڑھی مونڈنا

سوال : بندہ موضع پیال تحصیل وضلع قصور کا رہائشی ہے یہ کہ بندہ شہد کی تجارت کا کاروبار کرتا ہے۔ یہ کہ کسی شخص کا شہد لگا ہوا، چوری کر لیا گیا۔ اس شخص نے میرے اوپر بہتان اور الزام لگا دیا کہ شہد میں نے چوری سے اتار لیا ہے، حالانکہ میں نے حقیقتاً شہد چوری سے نہ اتارا تھا۔

یہ کہ میں نے اپنے طور پر اور پنچائتی طور پر اپنی بے گناہی کا ثبوت دینے کو کہا مگر یہ شخص نہ مانا۔ اس نے مجھے فحش گالیاں دیں اور مجھ پر تشدد کیا۔ اور اس نے زبردستی میری ڈاڑھی مونڈ ڈالی۔ اور بلیڈ والے اُسترے سے جو کہ ویسے بھی

[1] صحیح البخاری، بَابُ تَعْدِيلِ النِّسَاءِ بَعْضِهِنَّ بَعْضًا، رقم: ٢٦٦١

ناپاک تھا۔ اسی طرح سے اس شخص نے سنت رسول کی دھجیاں بکھیریں۔ اور توہین کی اور مجھے دھمکیاں دیں کہ تیرے ساتھ ابھی کم سلوک کیا گیا ہے۔ آئندہ غلطی کی تو ایسے اور کسی طریقہ سے سزا دیں گے۔

میں نے اس واقعہ کی اطلاع مقامی پولیس کو دے دی۔ پولیس نے اس شخص کے خلاف کارروائی کر کے پرچہ درج کر دیا ہے اور ملزم اب ضمانت پر رہا ہو چکا ہے۔ عدالت میں مقدمہ کی سماعت جاری ہے اور کیس سماعت ہوتے ہیں نہ کہ سزا مجسٹریٹ صاحب دیں گے۔ مجھے معلوم نہیں۔

برائے مہربانی مجھے ڈاڑھی مونڈ نے سنت رسول کی توہین کرنے والے کے خلاف شرعی فتویٰ درکار ہے کہ اسلام کی رو سے اس شخص کے بارے میں کیا سزا مقرر ہے۔

(سائل بشیر احمد، سابق خطیب قلعہ والی مسجد کوٹ لکھپت، حال کھڈیاں ضلع قصور) (۲۲ دسمبر ۱۹۹۵ء)

جواب: بظاہر واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ مشارٌ الیہ شخص نے آپ کے ساتھ ظلم و زیادتی کی یہاں تک کہ ڈاڑھی سنت رسول ﷺ کی اہانت کا مرتکب ہوا۔ جرم ہذا مستوجب تعذیر ہے۔ مجاز افسر کے لیے ضروری ہے کہ اس باغی اسلام کو مناسب حال ضرور سزا دے جو باعثِ عبرت ہو تا کہ آئندہ اسے خبث باطن کے اظہار کی جرأت نہ ہو سکے۔

مشکوٰۃ باب الامر بالمعروف میں ہے کہ ''اگر کسی قوم میں کوئی گناہ ہوتا ہو اور وہ قوم ظالم کا ہاتھ پکڑنے پر قادر ہو پھر وہ نہ پکڑے تو اللہ کی طرف سے سب پر عذاب آئے گا۔''

رخساروں پر اور نچلے ہونٹ کے بالکل نیچے چھوٹی داڑھی کا حکم

سوال: رخساروں اور ڈاڑھی پر جو بال اُگیں وہ ڈاڑھی ہے لیکن ٹھوڑی سے اوپر نچلے ہونٹ کے بالکل نیچے، عنفقہ چھوٹی ڈاڑھی کیا یہ بھی ڈاڑھی میں شامل ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اسے کتر ڈالتے تھے۔ (صحیح البخاری، کتاب اللباس قصّ الشارب) (ایک سائل کریم پارک لاہور) (۱۳ اکتوبر ۱۹۹۵ء)

جواب: عَنفقہ یعنی بچہ ڈاڑھی بھی ڈاڑھی میں شامل ہے جو اسے خارج سمجھتے ہیں، ان کی غلطی ہے کیونکہ جو بال نیچے کے جباڑے پر ہیں ان کے ڈاڑھی میں داخل ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ (فتاویٰ اہل حدیث جلد: اول، ص: ۲۷۳)

ممکن ہے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا بچہ ڈاڑھی کو لینے کا فعل کسی عذر یا اجتہاد کی بنا پر ہو کہ ڈاڑھی کی حد بندی میں داخل نہیں جب کہ فی الواقع یہ داخل ہے۔ یا «یَأْخُذُ هٰذَیْنِ» سے مراد منہ کے دونوں جانب چند بال ہوں جن کے منہ میں گرنے کا خدشہ لاحق رہتا ہے نہ کہ بچہ ڈاڑھی۔

جبڑے کی ہڈی پر اُگے بالوں کا حکم

سوال: جبڑے کی ہڈی سے پرے جو بال اُگیں ان کا کیا حکم ہے۔ آنکھوں کی نچلی ہڈی کے بال مونڈنا جائز

ہے؟ (ایک سائل کریم پارک لاہور) (۱۳ اکتوبر ۱۹۹۵ء)

جواب: یہ بھی ڈاڑھی میں شامل ہیں ان کو بھی لینا ناجائز ہے کیونکہ آپ ﷺ نے نماص (چہرے کے بال اکھاڑنے) سے منع فرمایا ہے۔ ❶

مقدارِ لحیہ: حافظ ثناء اللہ صاحب کے ایک فتویٰ پر تعاقب اور اس کا جواب

تعاقب: ہفت روزہ الاعتصام لاہور مجریہ ۱۱ نومبر ۱۹۹۴ء کے ص ۸ پر احکام و مسائل کے تحت ''ڈاڑھی کا شرعاً کیا حکم ہے، ڈاڑھی کی مقدارِ شرعی کیا ہے؟'' دو سوال مذکور ہیں جن کا جواب فضیلۃ الشیخ الحافظ ثناء اللہ مدنی حفظہ اللہ نے تحریر فرمایا۔

''ڈاڑھی کو انبیاء علیہم السلام کی سنت قدیمہ بروایت «عَشْرٌ مِّنَ الْفِطْرَةِ اَیْ مِنْ سُنَّةِ الاَنْبِیَاءِ الَّذِیْنَ اَمَرْنَا اَنْ نَقْتَدِیْ بِهِمْ»(الحدیث، نسائی، ص: ۲۳۷) اور وجوب، بصیغہ امر، «وَاعْفُوْا اَوْفُوْا، اَرْخُوْا، وَفِّرُوْا» ثابت کرنے کے بعد آپ نے مداہنت اختیار کی کہ

''اگر کوئی شخص مٹھی سے زائد کٹا دے تو بعض آثار کی بناء پر گنجائش ہے۔ بالخصوص راوی حدیث «اِعْـفَـاءُ اللِّحْیَة» ابن عمر رضی اللہ عنہما کے عمل سے اس نظریہ کو تقویت ملتی ہے۔''

پھر جواب نمبر ۲ میں ترک علی الحال کے بعد ارشاد فرمایا کہ:

''مٹھی سے زائد سابقہ حوالوں کی بناء پر کٹوانی جائز ہے کٹوانے کی مرفوع روایت بھی بحوالہ ترمذی بیان کی جاتی ہے لیکن اس میں عمر بن ہارون راوی ضعیف ہے۔''

اب غور طلب بات یہ ہے کہ کیا حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ فعل دائمی تھا جس کو حجت کے طور پر پیش کیا گیا ہے؟ چنانچہ ''صحیح بخاری'' میں ہے:

« وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ : إِذَا حَجَّ أَوِ اعْتَمَرَ قَبَضَ عَلَى لِحْيَتِهِ، فَمَا فَضَلَ أَخَذَهُ. » ❷

اس عبارت سے یہ ظاہر ہے کہ حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ کا یہ فعل دائمی نہ تھا بلکہ مخصوص بالحج والعمرۃ تھا۔ اب اس مخصوص اور مقید فعل سے عام استدلال کرنا کیونکر صحیح ہوگا؟ نیز عون المعبود میں ہے کہ:

« كَانُوا يُقَصِّرُونَ مِنَ اللِّحْيَةِ فِي النُّسُكِ. »

یہاں بھی نسک کی شرط ہے اس کے بغیر ڈاڑھی کترانا حرام ہے۔

علامہ مبارکپوری رحمہ اللہ کا فیصلہ

علامہ عبد الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ ''تحفۃ الاحوذی'' میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

---

❶ صحيح البخاري ، بَابُ الْمُتَنَمِّصَاتِ، رقم: ٥٩٣٩

❷ صحيح البخاري، بَابُ تَقْلِيمِ الأَظْفَارِ، رَقم: ٥٨٩٢ (ج:٢، ص:٨٧٥)

«وَأَمَّا قَوْلُ مَنْ قَالَ إِنَّهُ إِذَا زَادَ عَلَى الْقَبْضَةِ يُؤْخَذُ الزَّائِدُ وَاسْتَدَلَّ بِآثَارِ ابْنِ عُمَرَ وَعُمَرَ وَأَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ فَهُوَ ضَعِيفٌ لِأَنَّ أَحَادِيثَ الْإِعْفَاءِ الْمَرْفُوعَةِ الصَّحِيحَةِ تَنْفِي هَذِهِ الْآثَارَ.

فَهَذِهِ الْآثَارُ لَا تَصْلُحُ لِلِاسْتِدْلَالِ بِهَا مَعَ وُجُودِ هَذِهِ الْأَحَادِيثِ الْمَرْفُوعَةِ الصَّحِيحَةِ فَأَسْلَمُ الْأَقْوَالِ هُوَ قَوْلُ مَنْ قَالَ بِظَاهِرِ أَحَادِيثِ الْإِعْفَاءِ وَكَرِهَ أَنْ يُؤْخَذَ شَيْءٌ مِنْ طُولِ اللِّحْيَةِ وَعَرْضِهَا وَاللَّهُ تَعَالَى أَعْلَمُ.»

''ڈاڑھی کو مٹھی سے زائد کٹوانے کے دعویدار جو حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت عمر اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم کے آثار سے استدلال کرتے ہیں وہ انتہائی کمزور ہیں کیونکہ مرفوع صحیح احادیث کی موجودگی میں آثارِ صحابہ سے استدلال صحیح نہیں۔ احادیث مرفوعہ اعفاء اللحیۃ ان اقوال کی نفی کرتی ہیں۔ پس سلامتی والا مذہب ان لوگوں کا ہے جو حدیثِ اعفاء کے ظاہر کو لیتے ہوئے بڑھاتے ہیں اور اس کے طول وعرض سے ڈاڑھی کٹانا حرام سمجھتے ہیں۔''

امام طحاوی رحمہ اللہ

امام طحاوی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے:

«اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ قَطَعَ شَعْرَةً مِنْ لِحْيَتِهٖ لَا يُسْتَجَابُ دُعَاءُهٗ وَ تَنْزِلُ عَلَيْهِ الرَّحْمَةُ، وَ لَا يَنْظُرُ اللّٰهُ اِلَيْهِ نَظْرَ رَحْمَةٍ تُسَمِّيْهِ الْمَلَائِكَةُ مَلْعُوْنًا وَ هُوَ عِنْدَ اللّٰهِ بِمَنْزِلَةِ الْيَهُوْدِ وَالنَّصَارٰى.»

''رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے ڈاڑھی کا ایک بال بھی کاٹا اس کی دعا قبول نہ ہوگی، اس پر رحمت الٰہی کا نزول نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس کی طرف نظرِ رحمت سے نہیں دیکھیں گے۔ فرشتے اس کا نام ملعون رکھیں گے۔ اور وہ عند اللہ یہود ونصاریٰ کے قائم مقام ہوگا۔''

جواب تعاقب (از حافظ ثناء اللہ مدنی صاحب)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق موطأ امام مالک کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

«عَنْ مَالِكٍ عَنْ نَافِعٍ، أَنَّ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ عُمَرَ كَانَ إِذَا أَفْطَرَ مِنْ رَمَضَانَ، وَهُوَ يُرِيدُ الْحَجَّ، لَمْ يَأْخُذْ مِنْ رَأْسِهِ وَلَا مِنْ لِحْيَتِهِ شَيْئًا، حَتَّى يَحُجَّ.» [1]

[1] موطأ امام مالك، بَابُ التَّقْصِيرِ، رقم:١٨٦

''نافع سے روایت ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جب رمضان کے روزوں سے فارغ ہوتے اور حج کا قصد ہوتا تو سر اور ڈاڑھی کے بال نہ لیتے حتی کہ حج کرتے۔''

مذکورہ الفاظ پر بار بار غور فرمائیں۔ یہ واضح طور پر دال ہیں کہ ماسوائے مخصوص ایام کے ان کا یہ فعل دائمی تھا۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« الَّذِي يَظْهَرُ أَنَّ ابْنَ عُمَرَ كَانَ لَا يَخُصُّ هَذَا التَّخْصِيصَ بِالنُّسُكِ بَلْ كَانَ يَحْمِلُ الْأَمْرَ بِالْإِعْفَاءِ عَلَى غَيْرِ الْحَالَةِ الَّتِي تَتَشَوَّهُ فِيهَا الصُّورَةُ بِإِفْرَاطِ طُولِ شَعْرِ اللِّحْيَةِ أَوْ عَرْضِهِ .» ❶

''یعنی جو بات ظاہر ہے وہ یہ ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فعل نسک کے ساتھ مخصوص نہیں تھا بلکہ وہ اعفاء اللحیۃ کا امر اس حالت پر محمول کرتے تھے کہ ڈاڑھی کے طول وعرض میں افراط کی وجہ سے شکل وصورت قبیح نہ ہونے پائے۔''

نیز شیخنا مجتہد العصر محدث روپڑی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا فعل، سو اس سے مجھے اتنا تردد ہے اگر غیر حج عمرے میں ڈاڑھی کو چھیڑنا ناجائز ہوتا تو ناجائز کام حج اور عمرے میں کس طرح جائز ہو گیا؟ احرام سے نکلنے کے لیے وہی کام کیا جاتا ہے جو غیر احرام میں جائز ہو۔ خاص طور پر جب ظاہر الفاظ قرآن میں سر منڈانے کا ذکر ہے اور احادیث میں اس کا ذکر ہے تو آیت کو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ڈاڑھی کے کٹانے پر کس طرح چسپاں کر لیا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ غیر حج عمرے میں وہ کٹانے کے قائل تھے۔ اس لیے حج عمرے میں سر کے علاوہ بقیہ حجامت (ناخن وغیرہ) کی طرح مٹھی سے زائد ڈاڑھی بھی کٹا لیتے۔ اور چونکہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما حدیث اِعْفُوا اللِّحٰی (ڈاڑھیاں بڑھاؤ) کے راوی ہیں۔ اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ صحابی کا خیال ہے حدیث کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ شاید اس کو حدیث نہ پہنچی ہو۔ کیونکہ حدیث تو وہ خود روایت کر رہے ہیں۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذرا سی بات میں خلاف برداشت نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ عادت کے طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی فعل صادر ہوتا تو اس میں بھی موافقت کی کوشش کرتے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ضرور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سند لی ہے۔ ورنہ ڈاڑھیاں بڑھانے کی حدیث کے راوی ہو کر ایک ناجائز کام کا ارتکاب نہ کرتے۔ اس لیے اگر کوئی شخص مٹھی سے زائد کٹائے تو اس پر اعتراض نہ کرنا چاہیے۔ ہاں افضل یہی ہے کہ مٹھی سے زائد نہ کٹائی جائے۔ (جلد سوم، ص: ۳۴۷۔۳۴۸)

علامہ مبارکپوری رحمہ اللہ کی رائے کا جواب محدث روپڑی رحمہ اللہ کے کلام میں گزر چکا۔

امام طحاوی کی طرف منسوب حدیث کی بناء پر ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ائمہ دین پر کیا فتوی چسپاں کریں گے جن کا عمل

❶ فتح الباری: ۱۰/ ۳۵۰

اس کے خلاف تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ اس روایت کی صحت محل نظر ہے۔ اور اعتبار کے لائق نہیں۔ اثبت العرش ثم انقش (۱۰ فروری ۱۹۹۵ء)

مٹھی بھر داڑھی کا حکم

سوال: ڈاڑھی کی مقدار مٹھی بھر ہونی چاہیے یا کہ جتنی لمبی ہوتی جائے اس کو آدمی نہ کٹوائے؟ اس میں سے صحیح عمل کونسا ہے؟ اور مٹھی بھر ڈاڑھی والی حدیث صحیح ہے؟ (محمد یحییٰ عزیز کوٹ رادھا کشن قصور) (۶ دسمبر ۱۹۹۶ء)

جواب: افضل یہ ہے کہ ڈاڑھی کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے اور اگر کوئی مٹھی سے زائد کٹا لے تو اس پر اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔

اس سلسلہ میں وارد مرفوع روایت تو ضعیف ہے کیونکہ اس میں راوی عمر بن ہارون ضعیف ہے۔ البتہ جواز کا استدلال متبع سنت والآثار حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے فعل سے ہے۔

جملہ تفاصیل کے لیے ملاحظہ ہو، فتاویٰ اہل حدیث (۳/ ۳۳۷۔۳۳۸)

موضوعِ ہذا پر قبل ازیں میرا ایک تفصیلی فتویٰ بھی ''الاعتصام'' میں شائع ہو چکا ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ ''اِعْفَاءُ اللِّحْيَة'' کا کیا مفہوم لیتے ہیں؟

سوال: امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے اعفاء اللحیہ کا جو مفہوم لیا ہے جیسا کہ آگے بروایت ابن ھانئ آ رہا ہے کیا وہ اس میں حق پر ہیں یا حدیث کے سمجھنے میں ان سے تسامح ہو گیا ہے جب کہ انھوں نے مسند میں اعفاء اللحیہ سے متعلق پانچ چھ حدیثیں روایت کی ہیں۔ ان کے شاگرد ابن ھانئ نیساپوری کہتے ہیں:

« سَأَلْتُ اَبَا عَبْدَاللّٰهِ عَنِ الرَّجُلِ يَأْخُذُ مِنْ عَارِضَيْهِ ؟ قَالَ: يَأْخُذُ مِنَ اللِّحْيَةِ مَا فَضَلَ عنِ الْقَبْضَةِ، قُلْتُ: فَحَدِيْثُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ : اِحْفُوا الشَّوَارِبَ وَاعْفُوا اللِّحٰى؟ قَالَ يَأْخُذُ مِنْ طُوْلِهَا وَ مِن تَحْتِ حَلْقِهِ وَ رَأَيْتُ اَبَا عَبْدِ اللّٰهِ يَأْخُذُ مِنْ عَارِضَيْهِ وَ مِنْ تَحْتِ حَلْقِهِ .» [1]

جواب: ڈاڑھی کی بابت مختار بات یہ ہے کہ اسے اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَالْمُخْتَارُ تَرْكُهَا عَلٰى حَالِهَا وَ اَنْ لَا يَتَعَرَّضَ لَهَا بَتَقْصِيْرٍ وَ لَا غَيْرِهٖ .» [2]

اور امام احمد رحمہ اللہ نے جو وضاحت فرمائی ہے یہ بعض اقوال و آثار اور حدیث عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ وغیرہ پر

[1] مسائل الامام احمد بن حنبل لابن هانى النيسابورى، ج:۲، ص:۱۵۱۔۱۵۲، طبع المكتب الاسلامية

[2] فتح البارى، ج:۱۰، ص:۳۵۰

مبنی ہے حتی کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ راوی حدیث توفیر لحیہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے فعل اخذ لحیہ کے بارے میں تشریح و توضیح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

«اَلَّذِی یظْهر أَن بن عُمَرَ کَانَ لَا یَخُصُّ هَذَا التَّخْصِیصَ بِالنُّسُكِ بَلْ کَانَ یَحْمِلُ الْأَمْرَ بِالْإِعْفَاءِ عَلٰی غَیْرِ الْحَالَةِ الَّتِی تَتَشَوَّهُ فِیهَا الصُّورَةُ بِإِفْرَاطِ طُولِ شَعْرِ اللِّحْیَةِ أَوْ عَرْضِهِ.» ❶

''یعنی جو بات ظاہر ہے وہ یہ ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما مٹھی سے زائد ڈاڑھی کاٹنے کے فعل کو حج اور عمرہ کے ساتھ مخصوص نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ان کے ہاں اعفاء لحیہ کا عمل اس حالت پر محمول تھا کہ اس سے بالوں کے طول وعرض میں بڑھنے سے قباحت پیدا نہ ہو۔''

صورتِ مسئولہ میں امام احمد رحمہ اللہ کی تشریح بھی ایسی ہی حالت پر محمول ہوگی تا کہ رواۃ حدیث کے فہم میں مطابقت پیدا ہو سکے۔ (وَاللّٰهُ سُبْحَانَهُ وَتَعَالٰی اَعْلَمُ وَ عِلْمُهُ اَتَمُّ.)

اسلام میں داڑھی کا کیا حکم ہے؟

سوال: میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام میں داڑھی کا کیا حکم ہے؟ (مغربی مسلمانوں کے روزمرہ مسائل)

جواب: داڑھی رکھنا واجب ہے۔ یہ ان سنتوں میں سے ہے جنھیں فطرت قرار دیا گیا ہے اور شعائرِ اسلام میں سے ہے۔ بہت سی صحیح اور صریح حدیثوں میں اسے بڑھانے کا حکم آیا ہے۔ صیغہ امر کے بارے میں اصول یہ ہے کہ اس سے وجوب ثابت ہوتا ہے۔ سوائے اس کے کہ کوئی قرینہ دوسرے مفہوم کی طرف اشارہ کر رہا ہو۔ اس لیے جمہور علماء نے داڑھی بڑھانا واجب قرار دیا ہے۔ اور اسے منڈوانا گناہ اور نافرمانی قرار دیا ہے۔ مسلمان کو یہ کام نہیں کرنا چاہیے سوائے اس کے کہ وہ انتہائی مجبور ہو جائے۔ جس طرح ممنوع امور کا معاملہ ہے کہ ان کا جواز صرف شدید مجبوری کی حالت میں ہوتا ہے، مسلمان مرد کو چاہیے کہ ایسی مجبوری کو جلد از جلد ختم کرنے کی کوشش کرے۔

داڑھی کے بال منڈوائے جا سکتے ہیں یا نہیں؟

سوال: داڑھی کے بال منڈوائے جا سکتے ہیں یا نہیں؟ (ڈاکٹر گلشن مہر۔ خیر پور۔ سندھ) (۲۴ اکتوبر ۱۹۹۷ء)

جواب: اصل یہ ہے کہ داڑھی پوری رکھی جائے۔

مونچھیں ترشوانا یا منڈوانا دونوں میں افضل کون سی صورت ہے؟

سوال: مونچھیں قینچی سے چھوٹی کرنا افضل ہے یا استرے سے منڈوانا؟ (عطاء اللہ خان۔ لاہور) (۶ ستمبر ۲۰۰۲ء)

❶ فتح الباری، ج:۱۰، ص:۳۵۰

جواب: قینچی کے ساتھ سامنے سے مونچھیں چھوٹی کرنی چاہئیں۔

مونچھیں کترا وانا افضل ہے یا منڈوانا؟

سوال: مونچھیں کتروانا یا منڈوانا افضل ہے؟

جواب: مونچھوں کے کترانے یا منڈانے کے بارے میں احادیث میں مختلف الفاظ وارد ہیں۔ بعض الفاظ کترانے پر نص ہیں جب کہ بعض دیگر الفاظ سے عمومی ازالہ کا مفہوم مترشح ہے۔

اس بنا پر بعض اہل علم صرف تقصیر کے قائل ہیں اور دوسرا ایک گروہ مکمل صفائی کا قائل نظر آتا ہے۔ دوسری جانب امام طبری رحمہ اللہ نے دونوں امروں کو جائز قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَيُرَجِّحُ قَوْلَ الطَّبَرِيِّ ثُبُوتُ الْأَمْرَيْنِ مَعًا فِي الْأَحَادِيثِ الْمَرْفُوعَةِ .» [1]

''یعنی طبری کے قول کو ترجیح ہے اس لیے کہ دونوں معاملے مرفوع احادیث سے ثابت ہیں۔''

میرا رجحان بھی اسی طرف ہے کہ دونوں صورتوں میں سے جس کو اختیار کر لیا جائے درست ہے کسی ایک صورت کو دوسری پر راجح قرار دینا مشکل امر ہے۔ جملہ دلائل کی وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو: فتح الباری (۱۰/ ۳۴۷۔۳۴۸)

سر کو ڈھانپنا لباس میں شامل ہے؟

سوال: بعض لوگ کہتے ہیں کہ سر کو ڈھانپنا لباس میں شامل ہے اور کیوں کہ لباس سنت میں شمار نہیں ہوتا اس لیے ٹوپی یا عمامہ وغیرہ کا استعمال بھی ہمارے لیے سنت نہیں بنے گا۔ (ایک سائل) (۱۴ جنوری ۱۹۹۴ء)

جواب: راسخین فی العلم واقعی اس بات کے قائل ہیں کہ لباس عادات سنن میں سے ہے۔ چنانچہ شیخ خیر الدین وائلی مسئلہ پگڑی پر بحث کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

« وَ هِيَ لَيْسَتْ سُنَّةٌ تَعَبُّدِيَّةٌ اَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِهَا بَلْ هِيَ مُجَرَّدُ سُنَّةٌ مِنْ سُنَنِ الْعَادَاتِ » [2]

''یعنی پگڑی پہننا تعبدی عبادت نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہو بلکہ یہ تو محض عادات سنن میں سے ایک سنت ہے۔''

نیز علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَالصَّوَابُ اَنَّ اَفْضَلَ الطُّرُقِ طَرِيْقُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الَّتِيْ سَنَّهَا

---

[1] فتح الباري: ١٠/ ٣٤٧

[2] كتاب المسجد في الاسلام، ص: ٢١٤

وَ اَمَرَ بِهَا وَ رَغَّبَ فِيْهَا وَ دَاوَمَ عَلَيْهَا وَ هِيَ اَنَّ هَدْيَهُ فِي اللِّبَاسِ مَا تَيَسَّرَ مِنَ اللِّبَاسِ » [1]

''درست بات یہ ہے کہ سب سے افضل ترین طریق رسول اللہ ﷺ کا طریق ہے جو آپ نے مقرر فرمایا، اُس کا حکم دیا، اس میں رغبت کی اس پر مداومت کی، وہ یہ ہے کہ لباس میں آپ کا طریقِ کار یہ تھا کہ جو شئے آسانی سے میسر آتی پہن لیتے۔''

اس کے باوجود اگر کوئی شخص آپ ﷺ کی پیروی میں آپ کے لباس کی پسندیدہ صورتوں میں سے کسی صورت کو اختیار کرتا ہے تو وہ اپنی نیت کے اعتبار سے ماجور ہے۔ (ان شاء اللہ) مثلاً کسی نے رسول اللہ ﷺ کے انداز کی پگڑی پہنی، بہ نیت اتباعِ رسول۔ یہ آدمی مستحق اجر وثواب ہے لیکن دوسرا شخص اپنے ماحول کے اعتبار سے غیر انداز اختیار کرتا ہے تو یہ بھی جائز ہے، بشرطیکہ اس سے غیر مسلموں کی مشابہت مقصود نہ ہو، جب کہ منہی عنہ صورتوں کا مرتکب بنظر شرع مجرم ٹھہرتا ہے۔

سر کے بال، لبیں، ناخن تراش کر پھینکنے کا حکم

سوال: سر کے بال لبیں، ناخن تراش کر یونہی پھینک دیں یا کوئی احترام ہے؟ (ایک سائل) (۳۰ اپریل ۱۹۹۹ء)

جواب: دفن کرنا چاہیے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، کتاب تحفة الودود فی احکام المولود لابن القیم الجوزی رحمه الله تعالیٰ۔

تیل اور سرمہ لگانے کا حکم

سوال: سر کے بالوں کو تیل لگانا اور رات کو آنکھوں میں سرمہ لگانا کیا حکم رکھتا ہے؟ (سائل) (۱۰ مئی ۲۰۰۲ء)

جواب: حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ کثرت سے اپنے سر مبارک پر تیل لگایا کرتے تھے۔ [2] رات کو آنکھوں میں طاق عدد کی صورت میں سرمہ لگانے کا بھی احادیث میں ذکر ہے۔ [3]

کیا بالوں کے درمیان مانگ نکالنا سنت ہے؟

سوال: کیا بالوں کے درمیان مانگ نکالنا ''سنت'' ہے میں نے سنا تھا کہ جس حدیث میں مانگ نکالنا آتا ہے وہ ضعیف ہے۔ (ایک سائل) (۱۴ جنوری ۱۹۹۴ء)

---

[1] زاد المعاد: ۱/ ۳٦

[2] مختصر الشمائل المحمدية، بَابُ مَا جَاءَ فِيْ تَرَجُّلِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ، رقم: ۲٦

[3] مختصر الشمائل المحمدية، بَابُ مَا جَاءَ فِيْ كحْلِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ۔، رقم: ٤٢، منتقى الاخبار، بَابُ الْاِكْتِحَالُ وَالْاِدْهَان وَالتطيب، رقم: ۲۱٦۔

جواب : بالوں کے مانگ نکالنے والی روایت بلاشبہ صحیح ہے۔ [1]

کیا بالوں کی الٹی مانگ جائز ہے؟

سوال : کیا الٹی مانگ نکالنا یعنی سائیڈ سے مانگ نکالنا جائز ہے؟ قرآن و سنت سے وضاحت فرمادیں۔
(سائل) (۲۶ اپریل ۲۰۰۲ء)

جواب : مانگ میں سنت طریقہ یہ ہے کہ پیشانی سے سر کے بالوں کے درمیان سے نکالے اس میں مرد اور عورت برابر ہے اور ایک طرف سے مانگ نکالنا غیر مسنون طریقہ ہے۔ اس میں غیر مسلموں کے ساتھ مشابہت ہے۔ حدیث میں ہے:

«مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ.» [2]

اس حدیث کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو: (فتاویٰ اہل حدیث: ۳/ ۳۳۸) اور زیر بحث مسئلہ کی مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، کتاب فتاویٰ المرأۃ المسلمۃ (۲/ ۵۲۹۔۵۳۰)۔

کیا سر کے بالوں کی سیدھی مانگ نکالنا مسنون ہے؟

سوال : سیدھی مانگ نکالنا سنت ہے اور اس کا التزام کرنا چاہیے۔ لیکن کیا ٹیڑھی مانگ نکالنا جائز ہے۔ ٹیڑھی مانگ نکالنے والے پر یا جو شخص سرے سے مانگ ہی نہیں نکالتا، اس پر کیا حکم لاگو ہوتا ہے؟ (سائل) (۱۷ مئی ۲۰۰۲ء)

جواب : سر کے بالوں کی سیدھی مانگ نکالنا مسنون ہے۔ جب کہ ٹیڑھی مانگ نکالنا غیر مسلموں کا طریقہ ہے۔ حدیث میں ہے:

«مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ.» [3]

''جو شخص کسی قوم کی مشابہت کرے گا وہ انہی میں سے ہوگا۔''

اگر کوئی مانگ نہ نکالے، بال سیدھے رکھے تو اس کا بھی جواز ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«الصَّحِيْحُ جَوَازُ السَّدلِ وَالْفَرق» [4]

''صحیح بات یہ ہے کہ بال سیدھے رکھنا اور مانگ نکالنا دونوں طرح جائز ہے۔''

ٹیڑھی مانگ اور انگریزی حجامت کا شرعی حکم

سوال : ٹیڑھی مانگ اور انگریزی حجامت (جسے بودا کہتے ہیں) کا شرعی حکم ارشاد فرمائیں۔
(ابوعبدالرحمٰن۔کراچی) (۲ جون ۲۰۰۰ء)

---

[1] صحيح البخاري، بَابُ إِتْيَانِ الْيَهُودِ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، حِينَ قَدِمَ الْمَدِينَةَ، رقم: ٣٩٤٤

[2] سنن أبي داؤد، بَابٌ فِي لُبْسِ الشُّهْرَةِ، رقم: ٤٠٣١

[3] أيضًا

[4] فتح الباري: ١٠/ ٣٦٢

جواب: ٹیڑھی مانگ اور انگریزی حجامت سے لازماً احتراز ہونا چاہیے کیونکہ یہ غیر مسلموں کا شعار ہے۔ نبی ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

«مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ.» ❶

''جو کسی قوم سے مشابہت اختیار کرے گا وہ انہی میں ہوگا۔''

حدیثِ ہذا کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو۔ فتاویٰ اہل حدیث (۳/ ۳۳۸ تا ۳۴۴)۔

حجامت بنوانے کا صحیح طریقہ

سوال: آج کل اکثر لوگ حجامت اس طرح بنواتے ہیں کہ سر کے اگلے حصے کے بال تو لمبے رہتے ہیں اور پچھلے حصے کے بال زیادہ ترشوا کر چھوٹے کرا لیتے ہیں۔ کیا اس طرح حجامت بنوانا درست ہے؟ اگر نہیں تو حدیث وسنت سے حجامت بنوانے کا کیا طریقہ ثابت ہے؟ (سائل: ابوسعید اعوان بابا) (۱۰ جنوری ۲۰۰۶ء)

جواب: آدمی سارے بال رکھ لے یا سارے مونڈ دے، یہی سنت طریقہ ہے، ❷ ارشادِ نبوی ہے:

« اِحْلِقُوْا كُلَّهٗ أَوْ ذَرُوْا كُلَّهٗ » ❸

کیا لگاتار سر کے بال منڈوانا جائز نہیں؟

سوال: بعض لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ لگاتار تین مرتبہ سر منڈوانے والا شخص واجب القتل ہو جاتا ہے۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں یہ بات واضح بیان کریں کہ کیا یہ بات درست ہے؟ سر منڈوانا ناپسندیدہ عمل ہے یا پسندیدہ؟ لگاتار سر منڈوانا کیسا ہے؟ قرآن و حدیث سے ثابت کرنے کے علاوہ چاروں فقہی مسالک کا نقطہ نظر بھی ضرور بیان فرما دیجیے۔ اگر کوئی مسلک اُسے ناپسندیدہ قرار دیتا ہے اور حدیث میں اس کی کراہت ثابت نہیں تو اس مسلک کی دلیل بیان کریں کہ وہ کیوں اُسے قابلِ کراہت کہتا ہے۔ (محمد رفیع اسد۔ پتوکی) (۹ جنوری ۲۰۰۴ء)

جواب: سر منڈوانا کسی کراہت (ناپسندیدگی) کے بغیر جائز ہے اس میں کوئی کلام نہیں۔ جو شخص کہتا ہے کہ تین دفعہ سر منڈوانا والا واجب القتل ہے وہ شریعت سے ناواقف اور جاہل ہے۔ متعدد احادیث سے سر منڈوانے کا جواز ثابت ہے۔

---

❶ سنن أبی داؤد، بَابٌ فِی لُبْسِ الشُّهْرَةِ، رقم: ٤٠٣١

❷ فتح الباری بحواله ابو داؤد: ٤١٩٥۔ نسائی: ٥٠٤٨.

❸ اس سلسلے میں پروفیسر حافظ ثناء اللہ خان صاحب نے اپنے ایک خطاب میں فرمایا تھا کہ انسان کی تخلیقی حالت کو سامنے رکھنا چاہیے یعنی بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اُس کے سر کے تمام بال برابر ہوتے ہیں، یہی فطری طریقہ ہے، لہٰذا بال ترشوانے میں اسی کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ اگلے اور پچھلے بال برابر ہوں۔ (ع۔ و)

مثلاً جب حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر آئی تو تین راتوں کے بعد آپ ﷺ نے ان کے بچوں کے سر منڈوائے۔ فرمایا: «اُدْعُوْا لِیَ الْحَلَّاقَ فَاَمَرَهُ فَحَلَّقَ رُؤُسَنَا» [1] نبی ﷺ نے جب غسل جنابت میں کوتاہی پر تنبیہ سنائی اور وعید دلائی تو علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ''اس وقت سے میں اپنے سر کا دشمن بن گیا۔ تین بار ان کلمات کو دہرایا۔ راوی نے کہا کہ علی رضی اللہ عنہ اپنے سر کے بال کاٹ ڈالتے تھے۔

صاحب ''عون المعبود'' فرماتے ہیں:

« وَاسْتُدِلَّ بِحَدِيثِ عَلِيٍّ هٰذَا جَوَازُ حَلْقِ الرَّأْسِ وَلَوْ دَوَامًا وَيَدُلُّ عَلَى جَوَازِ حَلْقِ الرَّأْسِ حَدِيْثُ ابْنُ عُمَرَ أَنَّ النَّبِيَّ رَأَى صَبِيًّا حَلَقَ بَعْضَ رَأْسِهِ وَتَرَكَ بَعْضَهُ فَنَهٰى عَنْ ذٰلِكَ وَقَالَ اِحْلِقُوْا كُلَّهُ اَوِ اتْرُكُوْا كُلَّهُ » [2]

''حضرت علی کی اس حدیث سے سر کے بال منڈوانے کے جواز پر استدلال کیا گیا ہے، اگر چہ کوئی ہمیشہ منڈوائے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث بھی سر کے بال منڈوانے کے جائز ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ نبی ﷺ نے ایک بچے کو دیکھا جس کے سر کا کچھ حصہ مونڈا ہوا تھا اور کچھ حصے کو چھوڑا ہوا تھا۔ تو آپ ﷺ نے اس سے منع فرمادیا، فرمایا پورا سر مونڈ دو یا پورا چھوڑ دو۔''

یہ روایات سر کے بال منڈوانے کی دلیلیں ہیں۔ اس کے باوجود بہتر یہ ہے کہ آدمی سر پر بال رکھے۔ سلف صالحین کی اکثر عادت یہی تھی۔ جملہ فقہی مسالک کو بھی اس بات سے اتفاق ہے۔

سر کے بالوں کی مقدار کتنی ہونی چاہیے؟

سوال: سر کے بال جس قدر چاہیں چھوٹے رکھ سکتے ہیں یا کانوں تک ہی رکھنے چاہئیں؟

(شیخ عبداللہ، سنت نگر، لاہور) (۲۶ اپریل ۲۰۰۲ء)

جواب: بال صرف کانوں تک ہونے چاہئیں۔

سر پر بال رکھنے کی مسنون شکلیں کون کونسی ہیں؟

سوال: سر پر بال رکھنے کی مسنون شکلیں کون کونسی ہیں؟ (حاجی عبدالرحمٰن السلفی چترال) (۱۵ جنوری ۱۹۹۹ء)

جواب: سر کے بالوں کو متفرق جگہ سے لینا منع ہے۔ سر کے پورے بال رکھنے افضل ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کا عمل اسی پر تھا۔ منڈانے کا بھی جواز ہے۔ ایک بچے کا آپ ﷺ نے بعض بال مونڈے ہوئے دیکھے تو فرمایا: اس کے سب بال

[1] سنن ابی داؤد، بَابٌ فِي حَلْقِ الرَّأْسِ، رقم:۴۱۹۲

[2] صحيح مسلم، بَابُ كَرَاهَةِ الْقَزَعِ، رقم:۲۱۲۰

منڈوا دو یا پھر سب رکھو۔"❶

کیا سر کے بال کانوں کی لَو تک رکھنے جائز ہیں؟

سوال : سر کے بال کانوں تک رکھیں جائیں تو ماتھے، پڑپڑی اور کن پٹی کے بال کانوں کے اوپر سرے تک رکھنے چاہئیں یا کانوں کی لَو تک رکھنے ضروری ہیں؟ (شیخ عبداللہ، سنت نگر، لاہور) (۲۶ اپریل ۲۰۰۲ء)

جواب : دونوں طرح جواز ہے۔

کانوں تک بال رکھنے کی صورت میں سر کے پچھلے حصے کے بال صاف کر دیں؟

سوال : کانوں تک بال رکھنے کی صورت میں کیا سر کے پچھلے حصے کے بال کانوں کی لَو تک رکھے جائیں گے؟

(شیخ عبداللہ، سنت نگر، لاہور) (۲۶ اپریل ۲۰۰۲ء)

جواب : ظاہر یہ ہے کہ سر کے پچھلے حصے کے بالوں کو صاف کر دیا جائے۔

دیندار لوگوں کا طرزِ معاشرت دنیادار لوگوں سے مختلف ہونا چاہیے؟

سوال : معروف معانی میں دیندار افراد (علماء، خطباء اور مدرسین علومِ شرعیہ) کی حجامت، لباس، میں دوسرے لوگوں سے کوئی امتیاز ہونا چاہیے یا نہیں؟

جواب : ہاں! اہل دین حضرات کا فرض ہے کہ عملی اعتبار سے عامۃ الناس کے لیے جملہ معاملات میں عمدہ نمونہ بنیں تاکہ علم کے ساتھ ساتھ ان کے عمل سے بھی رہنمائی حاصل ہو۔

کیا دیندار اور دنیادار معاشرے میں طبقاتی تقسیم کا تصور؟

سوال : کیا مسلمان معاشرے میں دیندار اور دنیادار ہونے کے حوالے سے کوئی طبقاتی تقسیم ہے یا نہیں؟

جواب : اسلامی معاشرے میں دین دار اور دنیادار کی طبقاتی تقسیم کا کوئی تصور نہیں، بلکہ جملہ امور کا انحصار آدمی کی نیت پر ہے۔ چنانچہ صحیح حدیث میں ہے:

«اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ» ❷

نبی کریم ﷺ کس انگلی میں انگوٹھی پہنا کرتے تھے؟

سوال : نبی کریم ﷺ کسی انگلی میں انگوٹھی پہنا کرتے تھے؟ (سائل) (۲۱ جون ۲۰۰۲ء)

جواب : چھوٹی انگلی میں۔ (تحفۃ الاحوذی: ۵۲/۳)

❶ سنن ابی داؤد، بَابٌ فِي الذُّؤَابَةِ، رقم: ٤١٩٥

❷ صحیح البخاری، کَیْفَ کَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ إِلَی رَسُولِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ؟، رقم: ۱

چاندی کی انگوٹھی کا وزن اور اس پر نام لکھوانا

سوال : چاندی کی انگوٹھی کتنے وزن کی بنوانی چاہیے۔ کیا اس پر اپنا نام کندہ کروایا جا سکتا ہے یا نہیں؟

(خالد مصطفیٰ۔ ایس ایس ٹی گورنمنٹ نسیم ہائی سکول حاصلانوالہ تحصیل پھالیہ ضلع گجرات) (۴ ستمبر ۱۹۹۲ء)

جواب : قریباً چھ ماشے چاندی، کسی مصلحت کی بنا پر اگر اس میں نام وغیرہ لکھ دیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔

کیا آدمی کے لیے چاندی کی انگوٹھی پہننا جائز ہے؟ اور وزن؟

سوال : چاندی آدمی کے لیے کتنے ماشے جائز ہے، کیا آدمی چاندی کی انگوٹھی وغیرہ پہن سکتا ہے؟

(سائل محمد یحییٰ عزیز، کوٹ رادھا کشن، قصور) (۲۴ دسمبر ۱۹۹۳ء)

جواب : مرد کے لیے چاندی کی انگوٹھی پہننا جائز ہے۔ حدیث میں ہے:

«ثُمَّ اتَّخَذَ خَاتَمًا مِنْ فِضَّةٍ، فَاتَّخَذَ النَّاسُ خَوَاتِيمَ الفِضَّةِ قَالَ ابْنُ عُمَرَ :فَلَبِسَ الخَاتَمَ بَعْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَبُو بَكْرٍ، ثُمَّ عُمَرُ، ثُمَّ عُثْمَانُ، حَتَّى وَقَعَ مِنْ عُثْمَانَ فِي بِئْرِ أَرِيسَ .»[1]

یعنی ''پھر نبی ﷺ نے چاندی کی انگوٹھی بنائی (آپ کو دیکھ کر) لوگوں نے بھی چاندی کی انگوٹھیاں بنالیں۔ آپ ﷺ کے بعد اس انگوٹھی کو ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ نے پہنا حتی کہ حضرت عثمان سے اریس کنواں میں گر گئی۔''

جو بعد میں دستیاب نہ ہو سکی۔ وزن قریباً چھ ماشے ہو۔

درمیانی انگلی میں انگوٹھی پہننے کی ممانعت

سوال : انگوٹھی درمیانی انگلی میں نہ پہننے کا حکم مرد کے ساتھ خاص ہے یا عورت کے ساتھ؟ یا دونوں کیساتھ؟ (سائل) (۶ جولائی ۲۰۰۱ء)

جواب : ممانعت کا تعلق کراہت تنزیہ (بہتری) کے طور پر صرف مرد سے ہے۔ عورت اس سے مستثنیٰ ہے۔ ملاحظہ ہو، صحیح مسلم، کی شرح نووی:۳/ ۱۹۷۔

مردوں کے لیے درمیان انگلی میں انگوٹھی پہننا؟

سوال : درمیانی انگلی میں انگوٹھی پہننا مردوں کے لیے شرعاً ناپسندیدہ ہے، البتہ عورتوں کے لیے اجازت ہے۔ (شرح

---

[1] صحيح البخاري، بَابُ خَاتَمِ الفِضَّةِ، رقم:٥٨٦٦

نووی:۲/۱۹۷) میرے پاس دارالکتاب العرب (بیروت) کا نسخہ ہے میں نے تلاش کیا مجھے نہیں ملا براہ مہربانی حوالہ دے دیں۔ (کلیم بن محمد حسین۔ راولپنڈی) (۱۹ اکتوبر ۲۰۰۱ء)

جواب : حوالے کے لیے ملاحظہ فرمائیں شرح نووی صحیح مسلم (۲/ ۱۹۷)، طبع کتب خانہ رشیدیہ دہلی۔

محرّم یا غیر محرّم کے مہینے میں کالا لباس پہننے کا حکم

سوال : محرّم یا غیر محرّم کے مہینے میں کالا لباس پہن کر نماز ادا ہو جائے گی یا نہیں۔ کیونکہ ہم نے سنا ہے کہ سیاہ لباس دوزخی لوگوں کا لباس ہے۔ (ایک سائل) (۲۶ ستمبر ۱۹۹۷ء)

جواب : کالا لباس پہننے کا کوئی حرج نہیں بشرطیکہ غیر قوم سے مشابہت مقصود نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے کالی پگڑی پہنی ہے اور ام خالد بنت خالد کو آپ ﷺ نے سیاہ کمبل پہنا کر خوشی کا اظہار کیا تھا۔ [1]

نیز ابوداؤد اور نسائی وغیرہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے۔

« صَنَعْتُ لِرَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بُرْدَةً سَوْدَاءَ، فَلَبِسَهَا .» [2]

اہلِ نار کا لباس سیاہ ہوگا اس سلسلہ میں کوئی واضح نص نظر سے نہیں گزری نیز بعض لوگ جو ایام حزن میں سیاہ لباس پہنتے ہیں اس کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں۔ یاد رہے عام حالات میں بلاشبہ سب سے بہتر لباس سفید ہے۔

مردوں یا عورتوں کو کالے کپڑے پہننے کا حکم

سوال : مردوں یا عورتوں کو کالے کپڑے پہننے کے بارے میں قرآن وحدیث کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں۔ (بشیر احمد قصوری) (۱۸ مئی ۲۰۰۱ء)

جواب : مردوں اور عورتوں کے لیے سیاہ لباس پہننا جائز ہے، اس میں کوئی ممانعت نہیں۔ ''صحیح بخاری'' میں ہے کہ نبی ﷺ نے ام خالد کو سیاہ لباس پہنایا تھا۔ [3]

سنن ابی داؤد، وغیرہ میں ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، میں نے رسول اللہ ﷺ کے لیے روئی کا سیاہ جبہ تیار کیا اور آپ نے وہ پہنا۔ [4]

عون المعبود (۴/ ۹۵) میں ہے:

---

[1] صحیح البخاری بَابُ الْخَمِيصَةِ السَّوْدَاءِ، رقم:۵۸۲۳

[2] سنن أبی داؤد، بَابٌ فِي السَّوَادِ، رقم: ٤٠٧٤

[3] صحیح البخاری بَابُ الْخَمِيصَةِ السَّوْدَاءِ، رقم:۵۸۲۳

[4] فتح الباری:۹/ ۲۸۱

« وَالْحَدِيْثُ يَدُلُّ عَلٰى مَشْرُوْعِيَة لُبس السَّوَادِ وَاِنَّهٗ لَا كَرَاهَة فِيْهِ »

''یعنی یہ حدیث سیاہ لباس پہننے کے جواز پر دلالت کرتی ہے۔''

''سنن النسائی'' میں ہے کہ فتح مکہ کے دن آپ نے سیاہ پگڑی پہنی ہوئی تھی۔ (اللباس العمائم السواد)

کیا پتلون پہننا جائز ہے؟ اور شرفاء سے کیا مراد ہے؟

سوال: کیا پتلون پہننا جائز ہے؟ کہتے ہیں کہ جس چیز کو شرفاء قبول کرلیں وہ چیز جائز ہو جاتی ہے۔'' شرفاء سے کیا مراد ہے؟ (ام کلثوم۔لاہوتی) (۱۶۔اگست ۲۰۰۲ء)

جواب: شیخ ابن باز اور سعودی عرب کے کئی ایک اہل علم پتلون کے جواز کے قائل ہیں۔ (فتاویٰ ابن باز ۱/۲۳۶)

شرفاء سے مراد متدین لوگ ہیں۔

مرد کے لیے چست لباس پہننا جائز ہے؟

سوال: مرد کے لیے ایسا چست لباس پہننا جائز ہے جو باریک تو نہ ہو البتہ اس نے تمام ستر اچھی طرح چھپا دیا ہو، لیکن اس کی تراش خراش ایسی ہو کہ کولہوں کے سائز اور ان کی حدود کا تعین ممکن ہو اور ایک ٹانگ بھی دوسری ٹانگ سے الگ نظر آ رہی ہو؟

جواب: ایسا تنگ لباس جو ساتر (مکمل چھپانے والا) ہو اور جس سے جسم کے اندرونی حصے کا وصف بیان نہ ہوتا ہو (مثلاً جلد سفید ہے یا سیاہ وغیرہ) مرد کے لیے پہننے میں کوئی حرج نہیں۔ اگرچہ زیادہ بہتر اور احتیاط اسی میں ہے کہ لباس کھلا ہو۔ (فتاویٰ اسلامیہ: ۴/۲۴۲)

پینٹ شرٹ کا حکم

سوال: پینٹ شرٹ پہننا کیا جائز ہے، ٹائی وغیرہ بھی؟ (سائل: اجمل احمد فاروقی، گوجراں والا) (۱۳۔اپریل ۲۰۰۷ء)

جواب: جس طرز لباس کو شرفائے قوم اختیار کرلیں اس کا پہننا جائز ہے اگرچہ معاشرہ میں غیر قوم کا شعار سمجھا جائے۔ نبی ﷺ نے شامی جبہ پہنا تھا حالاں کہ وہ اس وقت دار الکفر تھا اور بعض روایات میں رومی کا ذکر ہے۔ ''صحیح بخاری'' باب الصلاۃ فی الجبۃ الشامیۃ۔ ❶

ٹائی لگانے کا حکم

سوال: بلاشبہ ٹائی پہننا عیسائیوں کی علامت تھی لیکن موجودہ دور کے مسلمانوں میں بھی وہ عام اور مروّج ہو چکی ہے، کیا اس صورت حال میں ٹائی پہننا جائز ہے؟ (عطا محمد جنجوعہ) (۲۷/اگست ۲۰۰۴ء)

---

❶ فتح الباری: ۱/ ۶۱۳

جواب: ٹائی پہننے کی حالت میں کسی کو دیکھ کر عیسائی ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو گنجائش ہے، تاہم ورع و تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ ٹائی لگانے سے قطعاً اجتناب کیا جائے۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو فتاویٰ اہل حدیث: ۳/ ۳۳۸ تا ۳۴۴)

مرد کا اپنے کپڑوں پر کڑھائی کروانا

سوال: مرد کا اپنے کپڑوں پر کڑھائی کروانا کیسا فعل ہے؟ (احسان ملک، گل بہار کالونی۔ فیصل آباد) (۷ جون ۱۹۹۶ء)

جواب: مرد کے لباس پر کڑھائی اگر عورت کے لباس کے مشابہ ہو تو حرام ہے بصورتِ دیگر کوئی حرج نہیں۔

مرد کے لیے ریشم پہننا حرام ہے؟

سوال: مرد کے لیے ریشم پہننا حرام ہے۔ اس وقت بازار میں کھدر، لٹھا، ململ کے علاوہ تقریباً ہر مردانہ کپڑے کو دیکھنے یا ہاتھ سے چھونے سے ریشمی ہونے کا ہی گمان ہوتا ہے۔ (رانا محمد اقبال۔ ساہیوال) (۲۷ جون ۱۹۹۷ء)

جواب: مردانہ کسی کپڑے کا صرف ریشمی گمان ہونا کافی نہیں۔ چھان بین کر لینی چاہیے۔ فی الواقع ریشمی ہو تو حرام ہے ورنہ نہیں۔

گانا بجانا مطلقاً حرام ہے

سوال: (۱) کیا گانے وغیرہ سننا، موسیقی سننا وغیرہ گناہ ہے۔ کیا یہ گناہِ کبیرہ ہے۔ یا گناہِ صغیرہ۔ اس کا جواب قرآن و حدیث کی روشنی میں دیں۔

(۲) اگر آدمی تھوڑے بہت گانے بھی سنے اور ساتھ ساتھ اپنے اچھے اعمال یعنی ارکانِ دین بھی پورے کرتا رہے تو اس میں کوئی حرج ہے یا نہیں۔ (سائل محمد سعید: ۱۶ پیپلز کالونی اوکاڑا)

جواب: کتاب و سنت اور ائمہ سنت کی تصریحات کے مطابق گانا بجانا سننا سنانا مطلقاً حرام اور کبائر سے ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّ يَتَّخِذَهَا هُزُوًا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ﴾ (لقمان:٦)

''اور لوگوں میں سے بعض ایسا ہے جو بیہودہ حکایتیں خریدتا ہے تاکہ (لوگوں کو) بے سمجھے اللہ کے رستے سے گمراہ کرے اور اس سے استہزاء کرے یہی لوگ ہیں جن کو ذلیل کرنے والا عذاب ہوگا۔''

ائمہ مفسرین نے اس آیت کریمہ کا شانِ نزول یہ بیان کیا ہے کہ رؤساء قریش میں سے ایک شخص نضر بن الحارث بغرضِ تجارت حیرہ جاتا تھا۔ وہاں سے شاہانِ فارس اور رستم اور اسفندیار وغیرہ کی حکایات و واقعات پر مشتمل کتابیں خرید لاتا۔ مکہ میں لوگوں کو ان کے پڑھنے کی ترغیب دیتا۔ کہتا لوگو! محمد ﷺ تم کو قومِ عاد اور ثمود کے قصے سناتا ہے اور میں تم کو

ان شاہوں کی کہانیاں بیان کرتا ہوں۔ مورخ خطیب وغیرہ کا کہنا ہے اس نے گانے والی عورتیں بھی رکھی تھیں۔ اگر کوئی مسلمان ہونا چاہتا تو اُس کو ورغلا کر اپنی مجلس میں شراب پلا کر گانوں میں مست کرتا۔ ساتھ یہ کہتا کہ یہ بدر جہا محمد ﷺ کے پیغام سے اور اس سے بہتر ہے کہ نماز پڑھو، روزہ رکھو، اور لڑائی کرو۔ پھر اللہ عزوجل نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اسی بناء پر اکثر مفسرین کے نزدیک بقول واحدی وغیرہ لہوالحدیث سے مراد غناء ہے۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ نے ابواسحاق سے نقل کیا ہے کہ اکثر و بیشتر ﴿لَهْوَ الْحَدِيْثِ﴾ کی تفسیر میں یہاں غنا مراد لیا گیا ہے۔ اس لیے کہ وہ اللہ کی یاد سے روکتا ہے۔ (اغاثة اللهفان، ج:۱،ص:۲۵۷)

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ہر وہ شئے جو اللہ کی عبادت اور اس کی یاد سے دُور کر دینے والی ہے ﴿لَهْوَ الْحَدِيْثِ﴾ ہے۔ (روح المعانی)

نیز اہل معانی نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ ﴿لَهْوَ﴾ کا مفہوم عام ہے جو گانے بجانے۔ موسیقی، ڈھول ڈھمکا اور ہر قسم کی شیطانی کھیل اور آواز کو شامل ہے۔''

مسند احمد کی روایت میں ﴿لَهْوَ الْحَدِيْثِ﴾ کی تفسیر غناء کے ساتھ مرفوعاً بھی وارد ہے۔ نیز ایک حدیث میں نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے۔

«مَنِ اسْتَمَعَ اِلٰی قَيْنَةٍ صُبَّ فِیْ اُذُنَيْهِ الْاٰنُكُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ.» ❶

یعنی جس نے گانے والی عورت کی آواز کو سنا روزِ قیامت اس کے کان میں قلعی ڈالی جائے گی۔''

دوسری روایت جو شواہد اور متابعات کے اعتبارات سے قابلِ حجت قرار پاتی ہے۔ اس میں ہے کہ گانے والیوں کی خرید وفروخت مت کرو۔ اور نہ انھیں تعلیم دو۔ اور ان کی تجارت میں کوئی بھلائی نہیں اور ان کی قیمت بھی حرام ہے۔ مزید آنکہ صحابہ جلیل حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول مشہور ہے:

«اَلْغِنَاءُ يُنْبِتُ النِّفَاقَ فِی الْقَلْبِ كَمَا يُنْبِتُ الْمَاءُ الْبَقْلَ.» ❷

''یعنی گانا بجانا دل میں نفاق اس طرح پیدا کرتا ہے جس طرح پانی سے گھاس، سبزہ اُگتا ہے۔''

اسی طرح ائمہ اسلام سے امام مالک رحمہ اللہ کا قول ہے جس نے کسی لونڈی کو خریدا، بعد میں معلوم ہوا کہ یہ گانے والی ہے۔ اس عیب کی بنا پر اس کو واپس کیا جا سکتا ہے۔ اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے گانے کو مکروہ سمجھا ہے اور اسے گناہوں میں شمار کرتے ہیں۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ اس سلسلے میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک شدید ترین ہے۔ امام

❶ مسند احمد:۳۳۸۳، صحيح البخاری، رقم:۷۰۴۲، سنن أبی داؤد، رقم:۵۰۲٤

❷ السنن الكبری للبيهقی، رقم:۲۱۰۰۸، سنن ابی داؤد، بَابُ كَرَاهِيَةِ الْغِنَاءِ وَالزَّمْرِ، رقم:٤۹۲۷

صاحب رحمہ اللہ کے اصحاب نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ لہو ولعب اور ملاہی کے جتنے آلے ہیں سب کا سماع حرام ہے جس طرح کہ موسیقی، ڈھول ڈھمکا اور دف وغیرہ۔ اور انھوں نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ یہ معصیت کا کام ہے اس سے فسق و فجور لازم آتا ہے اور اس کی وجہ سے شہادت بھی قابلِ ردّ ہے اور اس سے بھی زیادہ انھوں نے مبالغہ یوں کیا ہے کہ ایسی چیزوں کا سماع فسق و فجور اور ان سے لذت حاصل کرنا کفر ہے۔ (اغاثة اللهفان، ج:۱،ص:۲۴۵)

جب گانا مطلقاً حرام ہے تھوڑا بہت سننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: اغاثة اللهفان (ج:۱، ص:۲۴۲ تا ۲۸۵)

گانا گانے پر رسول اللہ ﷺ کا بددعا دینا؟

سوال: ایک بچی نے جمعرات کو درس میں بتایا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کہیں جا رہے تھے کہ راستے میں دو آدمیوں کو گاتا گاتے اور سنتے ہوئے دیکھا۔ رسول اللہ ﷺ نے کہا: یا اللہ ان دونوں کو جہنم میں ڈال دے۔ سوال یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تو کبھی کسی کے لیے بددعا نہیں کی تو یہ کونسی حدیث میں ہے؟

(ہومیو پیتھک دواخانہ کچا راوی روڈ کریم پارک لاہور) (۳/ اکتوبر ۲۰۰۳ء)

جواب: ایسی کوئی روایت نہیں، البتہ ''مسند احمد'' اور ''سنن ابی داؤد'' کی روایت میں بسند حسن ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے گانے سن کر کانوں میں انگلیاں لیں، دور جا کر نافع کی تصدیق پر ان کو نکالا کہ اب سنائی نہیں دے رہا۔ پھر کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے بھی اسی طرح کیا تھا۔ اس حدیث کا مذکورہ واقعہ سے کوئی تعلق نہیں۔

گانے کی طرز پر نعت پڑھنا کیسا ہے؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام گانے کی طرز پر نعت یا نظم پڑھنے والے اور غیر محرم عورتوں کو قرآن پاک پڑھانے والے مردوں کے متعلق؟ آیا یہ دو شخص گناہگار ہیں یا ثواب کے حقدار ہیں؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں وضاحت فرماتے ہوئے امت مسلمہ کی رہنمائی فرمائیں۔

(محمد الیاس معاون مدرس مدرسہ دار الاقراء بی بلاک ماڈل ٹاؤن۔ لاہور) (۲۵ جولائی ۱۹۹۷ء)

جواب: گانے بجانے کی طرز پر قرآن مجید یا نعت و نظم وغیرہ پڑھنا ممنوع ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو زجر و توبیخ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَ اسۡتَفۡزِزۡ مَنِ اسۡتَطَعۡتَ مِنۡهُمۡ بِصَوۡتِكَ﴾ (بنی اسرائیل: ٦٤)

''ان میں سے تو جسے بھی اپنی آواز سے بہکا سکے بہکا لے۔''

آواز سے مراد پر فریب عورت یا گانے، موسیقی اور لہو ولعب کے دیگر آلات ہیں جن کے ذریعے سے شیطان

بکثرت لوگوں کو گمراہ کر رہا ہے۔ (کتب تفسیر)

غیر محرم عورتوں کو پردے کے پیچھے سے تعلیم دینے کا کوئی حرج نہیں۔ بلکہ امام احمد رحمہ اللہ، ابن عساکر رحمہ اللہ، علامہ سیوطی رحمہ اللہ اور خطیب بغدادی جیسے اجلاء نے عورتوں سے بھی تعلیم حاصل کی ہے۔

میوزک گانے وغیرہ سننے کے متعلق کیا حکم ہے؟

سوال : میوزک گانے وغیرہ سننے کے متعلق کیا حکم ہے۔ سننا تو واقعی گناہ ہے مگر راہ چلتے ہوئے راستے میں جگہ جگہ دکانوں وغیرہ میں ٹیپ لگے ہوئے ہیں۔ ایسی صورت میں شریعت کا کیا حکم ہے۔ کیا کرنا چاہیے؟

(سائل) (۱۲ مارچ ۱۹۹۹ء)

جواب : ایسی صورت میں حتی المقدور بچاؤ کی کوئی بھی تدبیر اختیار کی جاسکتی ہے۔ مثلاً کان بند کرے یا بے توجہی سے گزر جائے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرة: ٢٨٦)

گانے بجانے کے بارے میں روایات کی تصحیح یا تضعیف کی تصدیق

سوال : مندرجہ ذیل احادیث کی صحت کے بارے میں مطلع فرمائیں: (۞) حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ گانے بجانے والیوں کی خرید وفروخت نہ کرو اور نہ اس پیشہ کی تعلیم کرو نہ اس کی تجارت کرو اور اس (پیشہ) کی آمدنی کا مال حرام ہے۔ (جامع ترمذی)

(۞) عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: گانا دل میں اس طرح نفاق پیدا کرتا ہے جس طرح پانی کھیتی کو اگاتا ہے۔ (بیہقی)

(۞) آخر زمانہ میں اس امت کے کچھ لوگوں (کی شکلوں) کو مسخ کرکے بندر اور خنزیر بنا دیا جائے گا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا، اے اللہ کے رسول! کیا وہ لوگ اس بات کی گواہی نہیں دیں گے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں۔ اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں؟ آپ نے فرمایا: کیوں نہیں! بلکہ وہ روزے بھی رکھتے ہوں گے، نماز بھی پڑھتے ہوں گے۔ اور حج بھی ادا کرتے ہوں گے۔ کہا گیا کہ آخر ان کے ساتھ ایسا معاملہ کرنے کی وجہ کیا ہوگی؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ گانے بجانے کے آلات، دَف اور ناچنے گانے والیاں اپنالیں گے۔ پھر شراب اور کھیل تماشا میں اپنی رات گزاریں گے اور اس حال میں صبح کردیں گے کہ ان کی صورتوں کو مسخ کرکے بندر اور خنزیر بنا دیا جائے گا۔ (اغاثۃ اللہفان، جلد:۱)

جواب : گانے بجانے کی حرمت کے بارے میں وارد روایات اور آثار واقوال بعض صحیح بعض حسن اور بعض ... اعتبار سے قابلِ حجت ہیں۔ اس سلسلہ میں امام ابن حزم کی سعی لاحاصل ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب اسکات الرعاع بادلۃ تحریم الغناء والسماع۔ مؤلف محمد احمد باشمیل۔

صورتِ سوال میں مشارٌ الیہ روایات کے قطع نظر تفصیل کے قابل حجت واستناد ہیں۔ (واللہ اعلم)

کیا قوالی سننا جائز ہے؟

سوال: کیا قوالی سننا اسلام میں جائز ہے یا نہیں؟ (محمد عرفان محمدی ضلع وہاڑی) (۶ دسمبر ۱۹۹۶ء)

جواب: قوالی سننا ناجائز ہے کیونکہ یہ لھو الحدیث میں داخل ہے۔ اس سے مراد گانا بجانا، اس کا ساز و سامان اور آلات موسیقی اور ہر وہ چیز جو انسان کو خیر اور معروف سے غافل کردے۔ (ملاحظہ ہو: اوائل سورۂ لقمان)

سوال: کیا ڈھول، آلات موسیقی بجانے والے کی مدد کی جائے ان کو خیرات وغیرہ دینا جائز ہے؟ (محمد قاسم اللہ ڈنوں سموں گوٹھ حاجی محمد سموں کنری سندھ) (۱۱۔ اپریل ۱۹۹۷ء)

جواب: حتی المقدور صدقہ خیرات متشرع لوگوں کو دینا چاہیے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ﴾ (المائدۃ:۲)

''(دیکھو) نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کیا کرو۔''

اور حدیث میں ہے:

« وَ لَا يَأْكُلْ طَعَامَكَ اِلَّا تَقِيٌّ »[1]

یعنی ''تیرا کھانا پرہیزگار ہی کھائے۔''

تالیاں بجانا، سیٹیاں بجانا، کیا کافروں کا طریقہ ہے؟

سوال: آپ کے ایک معاصر توحید وسنت کے داعی ماہوار جریدے کی حالیہ اشاعت میں سورۂ انفال کی آیت نمبر: ۳۵ ﴿وَ مَا كَانَ صَلَاتُهُمْ ....﴾ کی تشریح ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:

''اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تالیاں پیٹنا اور سیٹیاں بجانا کافروں کا طریقہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے کفر قرار دے کر انھیں عذاب کی خوشخبری سنائی ہے۔''

اس تفسیر سے واضح طور پر جو تاثر دیا گیا ہے وہ یہ کہ مجرد، تالیاں پیٹنا اور سیٹیاں بجانا، ارتکابِ کفر ہے اور یہ افعالِ مستوجب سزا ہیں۔

اگر قرآن مجید کی اس آیت سے وہی کچھ مراد ہے جو اوپر دی گئی تشریح میں بیان ہوا ہے تو آپ اس کی تصدیق و تائید فرمادیں اگر ایسا نہیں تو اس تفسیر کی غلطی کو پوری طرح واضح کرتے ہوئے قرآن کے حقیقی مفہوم پر روشنی ڈالیں۔

[1] سنن أبی داؤد، بَابُ مَنْ يُؤْمَرُ أَنْ يُجَالِسَ، رقم:٤٨٣٢

شکریہ۔ (والسلام عبدالمجید گوندل) (۱۵۔اپریل ۱۹۹۴ء)

جواب : مختصراً عرض ہے کہ: ''تالیاں پیٹنا اور سیٹیاں بجانا کافروں کا طریقہ ہے۔'' اس حد تک تو بات صحیح ہے۔ اس سے آگے جو کہا گیا ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ نے اسے کفر قرار دے کر انھیں عذاب کی خوشخبری سنائی ہے۔'' یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ ﴿بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ﴾ کا تعلق صرف ﴿اِلَّا مُكَاءً وَّ تَصْدِيَةً﴾ سے نہیں ہے بلکہ اس سے قبل ان کے دیگر کافرانہ اطوار کا بھی ذکر ہے۔ وہ بھی اس میں شامل ہیں۔ یوں اس کا تعلق ان کے مجموعی اعمال اطوار سے ہوگا، اس لیے صرف تالیاں پیٹنے اور سیٹیاں بجانے کو کفر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ تو ان کے کفریہ عقائد و اعمال کے مظاہر ہیں، جنھیں کافرانہ اطوار تو کہا جا سکتا ہے مجرد اس عمل کو کفر نہیں کہا جا سکتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تصویر کھینچنا اور کھنچوانا کیسا ہے؟

سوال : قرآن و حدیث کی روشنی میں تصویر کھینچنا اور کھنچوانا کیسا ہے؟ اگر تصویر کھنچوانا غلط ہے تو مفتیان ازاں علمائے کرام اور علامہ حضرات تصویریں کس بناء پر کھنچواتے ہیں؟ (محمد ادریس۔لاہور) (۱۵۔اگست ۱۹۹۷ء)

جواب : تصویر کشی مطلقاً حرام ہے۔ صحیح حدیث میں ہے ان مصوروں کو قیامت کے دن عذاب دیا جائے گا اور انھیں کہا جائے گا کہ جو کچھ تم نے بنایا تھا اب اس میں جان بھی ڈالو۔ شرع کی خلاف ورزی کرنے والوں کو بلا امتیاز روزِ جزا اپنا حسابِ عدالت باری تعالیٰ میں خود دینا ہوگا۔ مرتکب سوء کو دیکھ کر برائی پر دلیل ہونا خسارے کا سودا ہے۔ قرآن مجید نے یہود کے بگڑے ہوئے معاشرے کی تصویر کشی یوں کی ہے۔

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (الجمعة: ۵)

''جن لوگوں کے سر پر توراۃ لدوائی گئی پھر انھوں نے اس کے بارِ تعمیل کو نہ اٹھایا اس کی مثال گدھے کی سی ہے جس پر بڑی بڑی کتابیں لدی ہوں جو لوگ اللہ کی کتابوں کی تکذیب کرتے ہیں اس کی مثال بری ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

آج ہمارا ماحول بھی کچھ اس سے مختلف نہیں۔ اس حمام میں سب ننگے نظر آتے ہیں۔ ﴿اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبِّيْ﴾ اللہ رب العزت جملہ مسلمانوں کو فہم و بصیرت سے نوازے۔ آمین۔

تصویر کشی مطلقاً حرام ہے

سوال : کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیانِ عظام اس مسئلہ کے بارے میں ''قرآن و حدیث کی روشنی میں تصویر کھینچنا اور کھنچوانا کیسا ہے؟ بَيِّنُوْا بِدَلِيْلِ الشَّرْعِيِّ وَ تُوجَرُوْا۔ اگر تصویر کھنچوانا غلط ہے تو مفتیان عظام علماء کرام اور علامہ

حضرات تصویریں کس بنا پر کھینچواتے ہیں۔ بَيِّنُوْا بِدَلِيْلِ الشَّرْعِيِّ وَ تُوجرُوْا۔

(محمد ادریس ستارہ کالونی نمبر ۲ سٹریٹ نمبر ۲ چونگی امر سدھو لاہور)

جواب: تصویر کشی مطلقاً حرام ہے۔ صحیح حدیث میں ہے: ان مصوروں کو قیامت کے دن عذاب دیا جائے گا اور انھیں کہا جائے گا کہ جو کچھ تم نے بنایا تھا اب اس میں جان بھی ڈالو۔

شرع کی خلاف ورزی کرنے والے کو بلا امتیاز روزِ جزاء اپنا حساب عدالت باری تعالیٰ میں خود دینا ہوگا۔ مرتکب سوء کو دیکھ کر برائی پر دلیر ہونا خسارہ کا سودا ہے۔ قرآنِ مجید نے یہود کے بگڑے ہوئے معاشرہ کی تصویر کشی یوں کی ہے:

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (الجمعة:۵)

''جن لوگوں کے سر پر تورات لدوائی گئی پھر انھوں نے اس کے بارِ تعمیل کو نہ اٹھایا ان کی مثال گدھے کی سی ہے جس پر بڑی بڑی کتابیں لدی ہوں جو لوگ اللہ کی آیتوں کی تکذیب کرتے ہیں ان کی مثال بری ہے اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

آج ہمارا ماحول بھی کوئی اس سے مختلف نہیں اس حمام میں سب ننگے نظر آتے ہیں۔ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبِّيْ ۔ اللہ رب العزت جملہ مسلمانوں کو فہم و بصیرت سے نوازے۔ آمین۔

شناختی کارڈ اور پاسپورٹ کے لیے تصویر بنوانا جائز ہے؟

سوال: تصویر والا شناختی کارڈ اور پاسپورٹ وغیرہ یا اس طرح کے دیگر کاموں میں آج کل تصویر کی پابندی کروائی جاتی ہے کیا ان کاموں کے لیے؟ تصویر بنوانا جائز ہے۔ (حسن ماڈل ٹاؤن، گوجراں والا) (۴ اپریل ۲۰۰۸ء)

جواب: بوقتِ ضرورت جائز ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: آداب الزفاف فی السنۃ المطہرۃ علامہ البانی رحمہ اللہ، ص: ۱۰۷، ۱۰۸۔

کیا کیمرہ والی تصویریں عکس کے حکم میں ہیں یا تصویروں کے حکم میں ہیں؟

سوال: تصویر کے بارے میں شریعت نے سختی سے روکا ہے۔ بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اس جدید دور میں جو تصویر کیمرہ کے ساتھ لی جاتی ہے وہ اس ضمن میں نہیں آتی بلکہ یہ ممانعت ان تصاویر کے بارہ میں ہے جو ہاتھ سے بنائی جاتی ہیں اور کیمرہ کی تصویریں تو ایک عکس ہے۔ لہٰذا یہ جائز ہے۔ (عبد الرحمٰن حفیظ۔ باغ آزاد کشمیر) (۵ ستمبر ۱۹۹۷ء)

جواب: اسلام میں بلا استثناء ہر ذی روح کی تصویر حرام ہے۔ چاہے جونسی صورت میں تصویر کشی کی جائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا جو بھی تصویر یا مجسمہ دیکھو اسے مٹا دو۔ اور جو قبر اونچی دیکھو اسے برابر کر دو۔ نیز

فرمایا: قیامت کے دن سب سے سخت عذاب مصوروں کو ہوگا۔ ❶

اسی بناء پر آپ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاں پردے پر بنی ہوئی تصویر کا سختی سے انکار فرمایا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سائے دار یا غیر سائے دار ہر طرح کی تصویر حرام ہے۔ کیمرہ سے بنی ہو یا غیر کیمرہ سے علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«وَالثَّانِيَةُ تَحْرِيْمُ تَصْوِيْرُهَا سَوَاءٌ كَانَتْ مُجَسَّمَةٍ أَوْ غَيْرِ مُجَسَّمَةٍ وِ بِعَبَارَةٍ أُخْرٰى لَهَا ظِلٌّ أَوْ لَا ظِلَّ لَهَا وَ هٰذَا مَذْهَبُ الْجَمْهُوْرِ قَالَ النُّوَوِيُّ ذَهَبَ بَعْضُ السَّلْفُ إِلٰى أَنَّ الْمَمْنُوْعِ مَا كَانَ لَهُ ظِلٌّ وَ مَا لَا ظِلَّ لَهُ فَلَا بَأْسَ بِاتِّخَاذِهِ مُطْلَقًا وَ هُوَ مَذْهَبٌ بَاطِلٌ فَإِنِ السترِ الَّذِيْ أَنْكَرَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ كَانَتِ الصُّوْرَةُ فِيْهِ بِلَا ظِلٍ وَ مَعَ ذَالِكَ فَأَمَرَ بِنَزْعِهِ .» ❷

مسئلہ تصویر کشی کا حکم

سوال: میں اگفا (Agfa) کمپنی کے ڈیلر الفا کلر میں سیلز ریپ کا کام کرتا تھا۔ میرا فیلڈ ایریا بھائی پھیرو پتوکی ہے جو کہ ضلع قصور کی تحصیلیں ہیں۔ میرا کام ہے فوٹو گرافروں کے پاس جانا اور جو ان کے پاس گاہک شادی وغمی اور دفتری کاموں میں ریکارڈ میں رکھنے کے لیے تصویریں بنواتے ہیں اور اسی طرح جو لوگ سیر وتفریح پر جاتے ہیں اور تصویریں بنواتے ہیں، یا خود کھینچتے ہیں یا شناختی کارڈ پاسپورٹ اور گھروں میں رکھنے کے لیے بڑی بڑی تصویریں بنواتے ہیں، قرآن وحدیث کی روشنی میں بتائیں کہ:

۱۔ میری کمائی شرعی طور پر حلال ہے یا حرام؟

۲۔ مجھے یہ کام کرتے رہنا چاہیے یا چھوڑ دینا چاہیے؟

۳۔ اگر چھوڑ دیا ہوا ہے تو دوبارہ کر لینا چاہیے یا نہیں؟

میں نے یہ کام اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ ''کتاب التوحید'' کے باب نمبر ۶۱ اور صفحہ نمبر ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، میں مسلمانوں کے لیے تصویر جہاں بھی نظر آئے۔ مٹا دینے کا حکم ہے نہ کہ بنوا کر دینے کا۔

(راحیل اکرام پاشا، گلی نمبر ۳، مکان نمبری ۵۴، عزیز پارک اچھرہ لاہور، پوسٹ کوڈ: ۵۴۶۰۰) (۸۔ اپریل ۱۹۹۴ء)

جواب: مذکورہ کاروبار سے اجتناب ضروری ہے۔ احادیث میں تصویر کشی کے مشغلہ کو بدترین جرم قرار دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس فعل سے حاصل شدہ کمائی بھی حرام ہوگی۔

❶ صحیح مسلم، بَابُ لَا تَدْخُلُ الْمَلَائِكَةُ بَيْتًا فِيهِ كَلْبٌ وَلَا صُورَةٌ، رقم: ۲۱۰۹، مسند البزار، رقم: ۱۹۸۲

❷ آداب الزفاف، ص: ۹۹، طبع: ۳

فعل ہذا کے اگر آپ مرتکب ہیں تو فوراً ترک کر دینا چاہیے اور اگر اس کو بالفعل چھوڑ رکھا ہے تو یہ قابلِ تعریف فعل ہے۔اس میں عقبیٰ کی بہتری ہے۔ (ان شاء اللہ)

کتاب التوحید اور اس کی شروحات اس قسم کے مسائل کے لیے عظیم مرجع تصور ہوتی ہے۔ اصلاحِ احوال کی خاطر اس قسم کی کتابوں کو زیر مطالعہ رکھنا چاہیے ۔قرآن میں اللہ کا وعدہ ہے جو راہِ حق کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ اللہ رب العزت اس کی رہنمائی فرماتا ہے۔

فوٹو کی شرعی حیثیت

سوال : دورانِ مطالعہ فوٹو کے جواز کے متعلق کچھ ضعیف وغریب روایات نظر سے گزریں کہ جن کے حوالے میں فی الوقت نہیں دے سکتا۔ دوسرے یہ کہ علمائے حنابلہ نے تصویر کے جواز کا فتویٰ دیا تھا۔اسی طرح سعودی عرب کے علماء نے کرنسی نوٹوں پر تصویر کے جواز کی بنیاد کن دلائل پر رکھی ہے۔ یہ سوال تو پراگندہ سا ہے مگر درست رہنمائی تو آپ جیسے اہل نظر عبقری صلاحیتوں کے مالک شیوخ ہی کر سکتے ہیں۔

ازراہِ مہربانی یہ ارشاد فرمائیں، فوٹو کے جواز کے بارے میں یہ روایات کہیں یکجا مل سکتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر ذخیرہ احادیث میں ان کا کسی نہ کسی حد تک وجود بھی ملتا ہو اور موجودہ دنیا کا نظام بھی اسی ''غیر شرعی'' فتنے پر چل رہا ہو تو اس معاملے میں اس حد تک شدت روا رکھنا کیونکر مناسب ہے۔ (ایک سائل) (۲ مارچ ۱۹۹۵ء)

جواب : اسلامی شریعت میں بے شمار نصوص ایسی ہیں جو تصویر کشی کی حرمت پر دال ہیں۔ چند ایک ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ « كُلُّ مُصَوِّرٍ فِي النَّارِ » [1]

''ہر مصور جہنم رسید ہوگا۔''

۲۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس سے بڑا ظالم کون ہوگا جو میری طرح تخلیق کرنی چاہتا ہے۔ (اگر ان میں طاقت ہے) تو ایک ذرہ پیدا کر کے دکھائیں یا ایک دانہ بنا کر دکھائیں یا ایک بال پیدا کر کے دکھائیں۔ [2]

۳۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں، میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جس نے دنیا میں کوئی تصویر بنائی تو اُسے قیامت کے دن یہ حکم دیا جائے گا کہ وہ اس میں روح پھونکے، حالانکہ وہ اس میں روح نہیں پھونک سکے گا۔ [3]

[1] صحیح مسلم، بَابُ لَا تَدْخُلُ الْمَلَائِكَةُ بَيْتًا فِيهِ كَلْبٌ وَلَا صُورَةٌ، رقم:۲۱۱۰

[2] صحیح مسلم، بَابُ لَا تَدْخُلُ الْمَلَائِكَةُ بَيْتًا فِيهِ كَلْبٌ وَلَا صُورَةٌ، رقم:۲۱۱۱، صحیح البخاری، رقم:۷۵۵۹

[3] صحیح مسلم، بَابُ لَا تَدْخُلُ الْمَلَائِكَةُ بَيْتًا فِيهِ كَلْبٌ وَلَا صُورَةٌ، رقم:۲۱۱۰، صحیح البخاری، رقم:۲۲۲۵

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ ہر قسم کی تصویر حرام ہے۔ خواہ اس کا سایہ ہو یا نہ ہو، ہاتھ سے بنائی گئی ہو یا کیمرہ سے
نبی ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا تھا کہ وہ جس تصویر کو یا بت کو بھی دیکھیں اُسے مٹا ڈالیں۔ ❶
اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ اگر کوئی دوبارہ ان میں کسی چیز کا ارتکاب کرے اس نے دین وشریعت کا انکار کیا۔
جسے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل کیا گیا ہے۔ ❷

حافظ ابن حجر حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا

« اِنَّ اَصْحَابَ هَذِهِ الصُّوَرِ يُعَذَّبُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَ يُقَالَ لَهُمْ اَحْيوا مَا خَلَقْتُمْ وَ قَالَ اِنَّ الْبَيْتَ الَّذِىْ فِيْهِ الصُّوْرَةُ لَا تَدْخُلُهُ الْمَلَائِكَةِ »

''یعنی اصحاب صور قیامت کے دن عذاب دیے جائیں گے اور ان کو کہا جائے گا جو کچھ تم نے بنایا اس کو زندہ کرو اور فرمایا جس گھر میں تصویر ہو فرشتے داخل نہیں ہوتے۔''

کی تشریح کے ضمن میں فرماتے ہیں، کہ اس سے معلوم ہوا کہ سب تصویریں حرام ہیں اور اس اعتبار سے قطعاً کوئی فرق نہیں کہ ان کا سایہ ہے یا نہیں۔ وہ پینٹ سے بنائی گئی ہیں یا تراشی گئی ہیں یا کرید کر بنائی گئی ہیں یا بن کر بنائی گئی ہیں۔ ❸

آج کے دور میں کچھ علماء فوٹوگرامی کی تصویروں کو جائز قرار دیتے ہیں لیکن ان کے پاس واضح کوئی دلیل نہیں۔
شیخ مصطفیٰ جامعی نے ان کی تردید میں خوب لکھا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ فوٹوگرافی کی تصاویر جائز ہیں۔ دوسری طرف علامہ ناصر الدین البانی فرماتے ہیں وہ تصویر جائز ہے جس میں کوئی خاص فائدہ ہو یا جسے کسی ناگزیر ضرورت کے لیے بنایا جائے چنانچہ فرماتے ہیں، میں قارئین کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ اگرچہ ہم بڑے وثوق کے ساتھ ہر قسم کی تصویر کی حرمت کے قائل ہیں لیکن ہم اس تصویر کی ممانعت کے قائل نہیں جس میں فائدہ متحققہ ہو اور اس کے ساتھ نقصان کا کوئی پہلو ثابت نہ ہو اور یہ فائدہ تصویر کے بغیر ممکن نہ ہو، مثلاً وہ تصویریں جن کی طب اور ڈاکٹری کے سلسلہ میں یا جغرافیہ میں یا مجرموں کی شناخت کے لیے ضرورت ہوتی ہے۔ تاکہ انھیں پکڑا جا سکے یا لوگوں کو ان سے مطلع کیا جا سکے تو اس قسم کی تصویریں جائز ہوں گی، بلکہ شاید بعض مخصوص اوقات میں واجب بھی ہوں، اس کی دلیل دو درج ذیلی حدیثیں ہیں۔

۱۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ گڑیوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھیں اور آنحضرت ﷺ میری سہیلیوں کو میرے پاس لے آیا کرتے تھے تا کہ وہ میرے ساتھ کھیلیں۔

---

❶ صحیح مسلم، بَابُ الْأَمْرِ بِتَسْوِيَةِ الْقَبْرِ، رقم:٩٦٩، المستدرك للحاكم، كتاب الجنائز، رقم:١٣٦٦
❷ فتح الباری:١٢/ ٧۔٥، طبع حلبی
❸ فتح الباری:١١/ ٥١٣

اس حدیث کو بخاری (۱۰/۴۲۳) مسلم (۷/۱۲۵) احمد (۶/۶۶، ۲۳۳، ۲۳۴ تا ۲۳۴)

الفاظ بھی امام احمد ہی کی روایت کے ہیں اور ابن سعد (۸/۶۶) نے روایت کیا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ کے پاس گڑیاں تھیں اور جب آنحضرت ﷺ گھر تشریف لاتے تو ان سے کپڑے کے ساتھ پردہ کر لیتے۔ محدث ابوعوانہ اس کا سبب یہ بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ یہ اس لیے کرتے تا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے کھیل کو ختم نہ کریں۔

اس حدیث کو ابن سعد نے روایت کیا ہے اور اس کی سند بھی صحیح ہے۔ اس حدیث سے یہ استدلال بھی کیا گیا ہے کہ بچیوں کے لیے گڑیاں بنانا جائز ہے۔

آنحضرت ﷺ نے تصویروں کی بابت جو ممانعت فرمائی ہے یہ صورت اس سے مستثنیٰ ہے۔ قاضی عیاض نے بھی بڑے وثوق کے ساتھ یہ بیان فرمایا ہے اور اسے جمہور کا مذہب بتایا ہے۔ بچیوں کے لیے گڑیوں کی خرید وفروخت کو جائز قرار دیا ہے تا کہ انھیں بچپن ہی سے امورِ خانہ داری کی تربیت دی جا سکے۔

۲۔ حضرت ربیع بنت معوذ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عاشوراء کی صبح بستیوں (جو مدینہ منورہ کے گرد و پیش تھیں) کی طرف پیغام بھجوایا کہ جس نے روزہ نہ رکھا ہو وہ دن کا باقی حصہ بھی اسی حالت میں گزارے، اور جس نے روزہ رکھا ہو وہ روزے کو برقرار رکھے۔ حضرت ربیع بیان فرماتی ہیں، کہ اس کے بعد ہم ہمیشہ روزے رکھتے تھے اور چھوٹے بچوں کو بھی روزہ رکھواتے تھے اور انھیں اپنے ساتھ مسجد میں بھی لے جایا کرتے تھے۔ ہم بچوں کو روئی کی گڑیاں بنا کر دیا کرتے وہ انھیں اپنے ساتھ مسجد میں بھی لے جایا کرتے تھے۔ جب کوئی بچہ کھانے کی وجہ سے روتا تو دل (بہلانے کے لیے) اسے گڑیا دے دیتے۔ حتیٰ کہ افطار کا وقت ہو جاتا۔ ایک روایت میں ہے کہ چھوٹے بچے جب ہم سے کھانا مانگتے تو ہم انھیں گڑیاں دے دیتے تا کہ وہ ان سے کھیلتے رہیں اور اپنے روزے کو پورا کر لیں۔ اسے بخاری (۴/۱۶۳) نے روایت کیا ہے الفاظ بخاری ہی کے ہیں۔

مسلم (۳/۱۰۲) نے بھی اسے روایت کیا ہے اور مسلم کی ایک دوسری روایت میں کچھ زائد الفاظ بھی آئے ہیں۔ یہ دونوں حدیثیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ تصویر اس وقت جائز ہے جب اس سے مصلحت یا تربیت کا کوئی پہلو وابستہ ہو جو تہذیب نفوس، ثقافت یا تعلیم کے لیے مفید ہو، لہٰذا ایسی تمام تصویریں جن میں اسلام یا مسلمان کا کوئی فائدہ ہو جائز ہوں گی۔ البتہ مشائخ، بزرگوں اور دوستوں کی تصویریں جن میں کوئی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ کافروں اور بتوں کے پجاریوں سے مشابہت کا باعث بنتی ہیں، حرام ہیں۔ واللہ اعلم (دعوت الی اللہ، ص: ۷۰)

بعض دیگر روایات میں بھی جواز کے اشارے موجود ہیں لیکن وہ سب مخصوص حالات میں ہے، عام نہیں۔

سعودی عرب کے علماء محققین نے علی الاطلاق فوٹو کے جواز کا فتویٰ قطعاً صادر نہیں کیا بلکہ علامہ البانی کی طرح وہ

بھی مخصوص حالات میں جواز کے قائل ہیں۔ چنانچہ ہیئت کبار علماء کی دائمی کمیٹی برائے بحث اور فتویٰ نے فتویٰ صادر کیا ہے کہ زندہ چیزوں کی فوٹو لینی حرام ہے مگر جہاں کوئی انتہائی ضرورت ہو، جس طرح کہ تابعیہ (رہائشی اجازت نامہ) پاسپورٹ اور فاسق و فاجر اور لٹیروں کی تصویریں ہیں تا کہ ان پر کڑی نگاہ رکھ کر جرائم پر قابو پایا جائے اس کے علاوہ اسی طرح کی اور تصویریں لینے کا جواز ہے، جس کے بغیر چارہ کار نہیں۔ [1]

سعودی کرنسی نوٹوں پر بھی تصویر طبع کرنے کی اجازت اہل علم نے ناگزیر ضرورت کے پیش نظر دی ہے۔ عام حالات میں وہ بھی ممانعت کے قائل ہیں۔ ہمارے شیخ محدث روپڑی رحمہ اللہ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں تصویر کا بنانا تو کسی صورت درست نہیں اور بنی ہوئی کا استعمال دو شرطوں سے درست ہے۔ ایک یہ کہ مستقل نہ ہو، کپڑے وغیرہ میں نقش ہو۔ دوم نیچے رہے۔ بلند نہ لٹکائی جائے۔ پھر چند ایک احادیث سے اس نظریہ کا اثبات کیا ہے۔ ملاحظہ ہو، فتاویٰ اہل حدیث جلد سوم، ص: ۳۴۵، ۳۴۶۔

واضح ہو کہ مسئلہ ہذا میں تہدید وعید کی چونکہ کئی ایک روایات وارد ہیں، جن کی صحت و حجیت میں ذرہ برابر شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ لہٰذا مجھے تو اپنے ناقص علم کی حد تک واللہ اعلم احتیاط اس میں نظر آتی ہے کہ بعض احادیث سے اجازت کا پہلو جس انداز میں نکلتا ہے۔ معاملہ صرف انہی صورتوں پر محصور رکھا جائے۔ اور اس میں توسع سے احتراز کرتے ہوئے ظاہری نصوص سے تجاوز نہ کیا جائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب وعلمہ اتم

دورانِ تعلیم حضرت الشیخ محدث روپڑی نے بھی فرمایا تھا کہ گڑیا بنانے اور اس سے کھیلنے کی رخصت صرف بچیوں کے لیے ہے یہ اجازت عام نہیں۔ جناب والا فوٹو کی اجازت کی احادیث کو تلاش کرنے کی بجائے آپ کو ممانعت کی حدیثوں پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے جن کے کتب احادیث میں انبار لگے ہوئے ہیں۔ جب یہ بات مسلمہ ہے کہ احکامِ الٰہی ابدی ہیں تو پھر خود کو شریعت کے مطابق ڈھالنے کی سعی کرنی چاہیے، فتنہ و فسادات کے زمانہ میں دین میں ترمیم کی سوچ خطرناک نظریہ ہے جس سے بچاؤ ہر صورت ضروری ہے۔ اللہ رب العزت جملہ مسلمانوں کو دین حنیف پر استقامت کی توفیق بخشے۔ آمین

بوقتِ ضرورت تصویر کشی کا حکم

سوال: یہ جو تصویر والا شناختی کارڈ ہے اور پاسپورٹ وغیرہ یا اس طرح کے دیگر کاموں میں جیسے آج کل تصویر کی پابندی لگائی جاتی ہے کیا ان کاموں کے لیے ایسی صورت میں تصویر بنوانا جائز ہے۔

جواب: بوقت ضرورت جائز ہے تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: آداب الزفاف فی السنة المطهرة علامه البانی، ص: ۱۰۷، ۱۰۸

---

[1] مجلة البحوث الاسلاميه، رياض، عدد: ۱۹، ص: ۱۳۸

شادی کے موقع پر میاں بیوی کی تصویر سازی کا حکم:

سوال: شادی کے موقع پر میاں بیوی کی تصویریں بنانا جائز ہے یا نہیں؟ (محمد عرفان محمدی ضلع وہاڑی) (۶ دسمبر ۱۹۹۶ء)

جواب: تصویریں لینا حرام ہے۔

یادداشت کے لیے اپنی یا والدین کی تصویر بنا کر گھر رکھنا؟

سوال: یادداشت کے لیے اپنی تصویر بنا کر گھر رکھنا یا پھر والدین کی؟ اور کتابوں کی تصاویر کے بارے میں وضاحت فرمائیں۔ (ام عبداللہ۔ خانیوال) (۱۴ مئی ۱۹۹۹ء)

جواب: تصویر خواہ اپنی ہو یا والدین وغیرہ کی بطورِ یادگار اپنے پاس رکھنا حرام ہے۔ صحیح حدیث میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے فرمایا جو بھی تصویر یا مجسمہ دیکھو اسے مٹا دو اور جو قبر اونچی دیکھو۔ اسے برابر کردو۔ [1]

اور دوسری روایت میں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن سب سے سخت عذاب مصوروں کو ہوگا۔ [2]

کیا کسی عالم دین کی تصویر محبت والفت کی وجہ سے رکھنی جائز ہے؟

سوال: کیا کسی عالم دین کی تصویر محبت والفت کی وجہ سے رکھنی جائز ہے؟ کیا یہ شرک تو نہیں؟ اس کے ساتھ شرکیہ کوئی بھی کام نہیں کیا جاتا۔ صرف ایک محبت کے تقاضے کے طور پر رکھی جائے جیسے علامہ احسان الٰہی ظہیر شہید رحمہ اللہ وغیرہ...... (الاعتصام) سے اس بات کا گلہ بھی ہے کہ مارچ کے مہینے میں جس میں علامہ احسان الٰہی ظہیر کی شہادت کا واقعہ رونما ہوا، اس مہینے میں آپ ''الاعتصام'' میں ان کے بارے میں کوئی مضمون بھی نہیں شائع کرتے جب کہ آج ہماری نسل اپنے اکابر کو بھولتی جارہی ہے۔ (گل زمان ولد نذر خان۔ ضلع قصور) (۱۲ جنوری ۲۰۰۱ء)

جواب: صحیح حدیث میں ہے کہ: ''جس گھر کتا یا تصویر ہو وہاں فرشتے داخل نہیں ہوتے۔''

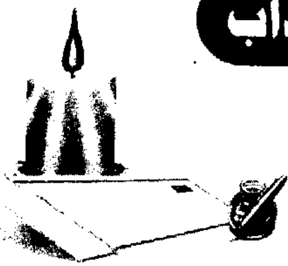
«قَالَ النَّبِیُّ ﷺ لَا تَدْخُلُ الْمَلَائِكَةُ بَيْتًا فِيهِ كَلْبٌ وَلَا تَصَاوِيرُ.» [3]

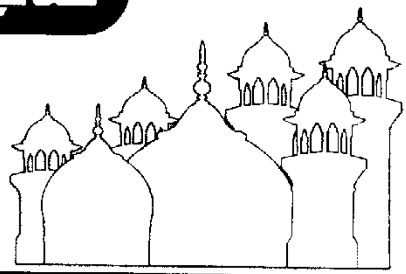
اس سے معلوم ہوا کہ تصویر کو مطلقاً اپنے پاس رکھنا حرام ہے۔ قومِ نوح میں شرک کا آغاز بھی تصویروں کے احترام سے ہوا تھا۔ لہٰذا اس سے اجتناب از بس ضروری ہے۔ یاد رہے کہ اسلام کسی کی برسی منانے کا قائل نہیں۔ البتہ سلف صالحین کے کارناموں کو کسی وقت بھی اجاگر کیا جا سکتا ہے۔ حقائق پر مبنی مضمون لکھ کر آپ بھیجیں ''الاعتصام'' شائع کرے گا۔

---

1. صحیح مسلم، بَابُ الْأَمْرِ بِتَسْوِيَةِ الْقَبْرِ، رقم: ۹۶۹
2. صحیح مسلم، بَابُ لَا تَدْخُلُ الْمَلَائِكَةُ بَيْتًا فِيهِ كَلْبٌ وَلَا صُورَةٌ، رقم: ۲۱۰۹، مسند البزار، رقم: ۱۹۸۲
3. صحیح البخاری، باب التَّصَاوِيرِ.، رقم: ۵۹۴۹

کھانے پینے کے آداب





برتنوں کے نیچے کپڑے بچھانا کیسا ہے؟

سوال: گھروں میں برتنوں کے نیچے جو کپڑے رکھے جاتے ہیں، جائز ہے یا نہیں؟

(خالد محمود بن غفور احمد۔ برکی، ضلع قصور) (۱۴ اپریل ۲۰۰۳ء)

جواب: گھروں میں برتنوں کے نیچے کپڑے رکھنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ عام حالات میں مقصود برتنوں کی نظافت ہوتی ہے۔ تاکہ گرد وغبار سے محفوظ رہیں۔

کھڑے ہوکر پانی پینا سنت یا آداب کے خلاف ہے؟

سوال: کھڑے ہوکر پانی پینا درست ہے یا غلط؟ اور کیا یہ سنت ہے یا آداب میں سے ہے؟

جواب: کھڑے ہوکر کھانے پینے میں اہل علم کا سخت اختلاف ہے۔ راجح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ کھڑے ہوکر کھانے پینے کا اگرچہ جواز ہے لیکن کراہت سے خالی نہیں۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اسی بات کو پسند کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

« وَهٰذَا أَحْسَنُ الْمَسَالِكِ وَأَسْلَمُهَا وَأَبْعَدُهَا مِنَ الِاعْتِرَاضِ . »[1]

''یہ مسلک بہت اچھا اور نہایت سلامتی والا اور اعتراض سے بعید تر ہے۔''

ولیمہ کی دعوت میں کھڑے ہوکر کھانا کھانا

سوال: آج کل ولیمہ پر کھڑے کھڑے کھانے کا انتظام ہوتا ہے۔ کیا کسی حدیث میں کھڑے ہوکر کھانے پینے کی

[1] فتح الباری: ۱۰/ ۸٤

اجازت ہے؟ (راجہ عزیز احمد۔اسلام آباد) (۷نومبر ۱۹۹۷ء)

جواب: بعض احادیث میں جواز کا پہلو ہے لیکن اولیٰ یہ ہے کہ بیٹھ کر کھایا پیا جائے۔ امام خطابی اور ابن بطال وغیرہ نے اسی طریقہ کار کو اختیار کیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی ''فتح الباری'' میں اسی طریقہ کار کو اختیار کیا ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی ''فتح الباری'' میں اسی طریقہ کو پسند قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

« وَهٰذَا أَحْسَنُ الْمَسَالِكِ وَأَسْلَمُهَا وَأَبْعَدُهَا مِنَ الِاعْتِرَاضِ . » ❶

چمچ کے ساتھ کھانا کیسا ہے؟

سوال: چمچ کے ساتھ کھانا کھانا کیسا ہے؟ (محمد صدیق تلیاں، ایبٹ آباد) (۱۸ جون ۱۹۹۹ء)

جواب: چمچہ کے ساتھ کھانا کھانے کا کوئی حرج نہیں۔ محض سہولت کی ایک شکل ہے لیکن بہتر ہے کہ انگلیوں سے کھانا کھایا جائے۔

چمچ کے ساتھ کھانا کیسا ہے؟

سوال: چمچ کے ساتھ کھانا کیسا ہے؟ (محمد صدیق تلیاں، ایبٹ آباد) (۲۱ جنوری ۲۰۰۰ء)

جواب: اصل طریقہ نبوی یہی ہے کہ انگلیوں کے ساتھ کھانا کھایا جائے۔ ''صحیح بخاری'' کے «بَابٌ فِي لَعْقِ الْأَصَابِعِ» کے تحت حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''فتح الباری'' (۹/ ۵۷۷/ ۵۷۸) میں انگلیوں کے استعمال، ان کے عدد اور کیفیت پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ جو لائق مطالعہ ہے اور چمچ چونکہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے لہٰذا اس کے استعمال کو تمتع بنعمۃ اللّٰہ کی بناء پر زیادہ سے زیادہ ''جائز'' کہا جا سکتا ہے۔

کھانا صرف داہنے ہاتھ سے کھانا چاہیے؟

سوال: بغیر کسی عذر کے صرف سیدھے ہاتھ سے یعنی دائیں ہاتھ سے روٹی اس طرح کھانا کہ نہ تو روٹی توڑتے وقت دوسرا ہاتھ لگے اور نہ نوالہ بناتے وقت دوسرا ہاتھ لگائے۔ اس بارے میں وضاحت فرمائیے کہ کھاتے وقت دوسرا ہاتھ لگانا جائز ہے یا نہیں؟ (سیف اللہ حقانی) (۲۹ اگست ۱۹۹۷ء)

جواب: کھانا وغیرہ صرف داہنے ہاتھ سے کھانا چاہیے۔ ''صحیح بخاری'' میں حدیث ہے:

«وَ كُلْ بِيَمِيْنِكَ »❷

''یعنی داہنے ہاتھ سے کھا۔''

---

❶ فتح الباری: ۱۰/ ۸٤

❷ صحیح البخاری، بَابُ التَّسْمِيَةِ عَلَى الطَّعَامِ وَالأَكْلِ بِالْيَمِينِ، رقم:٥٣٧٦

البتہ عذر کی بناء پر دوسرا ہاتھ استعمال ہوسکتا ہے۔ ❶

بامرِ مجبوری دائیں ہاتھ کے بجائے بائیں ہاتھ سے کام کاج کرنے کا کیا حکم ہے؟

سوال : اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو ہاتھ دیے ہیں۔ قدرتی طور پر دائیں ہاتھ میں قوت زیادہ ہے۔ اور دائیں ہاتھ سے سارے کام کاج کرنا یعنی اچھے کام کرنے کا حکم ہے۔ نیز کوئی چیز لیتے دیتے وقت بھی دائیں ہاتھ کو استعمال کرنے کا حکم ہے۔ مگر بعض لوگوں کو قدرتی طور پر پیدا ہی اس طرح کیا گیا ہے کہ ان کی قدرتی طاقت جو کہ دائیں ہاتھ میں ہوتی ہے وہ بائیں طرف معلوم ہوتی ہے مگر وہ کام کرتے وقت بھی اسی ہاتھ کو استعمال کرتے ہیں۔ اب جب کسی بھائی کو بائیں ہاتھ سے کام کرتے ہوئے منع کیا جاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرا دایاں ہاتھ بائیں جانب والا ہے۔ کیوں کہ میری قدرتی طاقت جو کہ دائیں ہاتھ میں ہوتی ہے وہ اللہ نے بائیں ہاتھ میں پیدا کی ہے۔ تو اس بارے میں قرآن وسنت کی روشنی میں جواب دے کر شکریہ کا موقع دیں کہ کیا وہ بائیں ہاتھ سے کام کاج، لین دین کرسکتا ہے؟ شکریہ

(قاری امیر حمزہ حماد، تاندلیانوالہ ضلع فیصل آباد) (۱۹ اپریل ۱۹۹۶ء)

جواب : جس انسان کے لین دین اور کام کاج کی قوت فی الجملہ دائیں ہاتھ کے بجائے بائیں ہاتھ میں ہو وہ ذی قوت ہاتھ کو استعمال میں لائے گا۔ اگرچہ یہ الٹا ہاتھ ہو بشرطیکہ یہ کام وہ ہوں جو دائیں ہاتھ سے مافوق الاستطاعت ہوں۔ قرآن میں ہے:

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (التغابن:١٦)

''سو جہاں تک ہو سکے اللہ سے ڈرو۔''

اور حدیث میں ہے:

«مَا نَهَيْتُكُمْ عَنْهُ فَاجْتَنِبُوهُ، وَمَا أَمَرْتُكُمْ بِهِ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ .» ❷

''جس چیز سے میں تمھیں منع کروں اس سے باز رہو اور جس بات کا حکم دوں تو جس قدر بجا لا سکتے ہو، بجا لاؤ۔''

بہ امر مجبوری بائیں ہاتھ سے مدد لی جاسکتی ہے؟

سوال : دایاں ہاتھ لکھنے میں مصروف ہو، وقت کی تنگی ہو، کوئی گرم مشروب مثلاً چائے وغیرہ بھی پینی ہو تو کیا بہ امر مجبوری بائیں ہاتھ سے مدد لی جاسکتی ہے؟ (عبدالرزاق اختر۔ رحیم یار خان) (۸ جون ۲۰۰۱ء)

---

❶ فتح الباری: ۹/ ۵۲۳

❷ صحیح مسلم، بَابُ تَوْقِيرِهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَتَرْكِ إِكْثَارِ سُؤَالِهِ ...... الخ ، رقم:۱۳۳۷

جواب : اصلاً اچھے کاموں کے لیے صرف دایاں ہاتھ ہے، ہاں البتہ معاونت کی ضرورت ہو تو بائیں ہاتھ کو بھی ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن اکیلے بائیں ہاتھ کو استعمال کرنا درست نہیں الا یہ کہ شدید اضطراری حالت ہو مگر مذکورہ کیفیت اس میں شامل نہیں۔

کھجور سالم ہی منہ میں ڈالنا

سوال : ایک ساتھی کا کہنا ہے کہ کھجور کو سالم ہی منہ میں ڈال لو۔ توڑ کر نہ کھاؤ! یہ مسئلہ کیسا ہے؟

(عبدالرزاق اختر۔ رحیم یار خان) (۸ جون ۲۰۰۱ء)

جواب : ایسا کوئی مسئلہ نہیں حسب حاجت آدمی کھجور کھا سکتا ہے، چاہے سالم کھائے یا توڑ کر۔

سلام وتسلیم اور ملاقات کے آداب

غیر مسلم سلام کہے تو جواب میں کیا کہا جائے؟

سوال : عیسائی اگر السلام علیکم کہے تو اس کا جواب کیا دینا چاہیے؟ نبی ﷺ کے وقت یہودی عیسائی کا جواب علیکم تھا۔ وہ تو عربی جانتے تھے۔ السلام علیک کہتے۔ اب نہیں جانتے۔ (ایک سائل) (۲۸ نومبر ۱۹۹۷ء)

جواب : اگر کوئی عیسائی وغیرہ سلام کہے تو اسے کہنا چاہیے:

«سَلَامٌ عَلَى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَى» [1]

''یعنی جس نے ہدایت کی پیروی کی اس پر سلام ہو۔''

کیا مصافحہ دونوں ہاتھوں سے کرنا چاہیے؟

سوال : امام بخاری رحمہ اللہ ،علامہ وحید الزمان اور بعض علماء دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنے کے قائل ہیں۔ میں نے دوسرے اہل حدیث علماء اور آپ کے فتاویٰ میں ایک ہاتھ سے مصافحہ مسنون ہونا پڑھا ہے۔ دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ (سائل: محمد علی شاہ، لاہور) (۳۱ مئی ۲۰۰۲ء)

جواب : دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کے لیے امام بخاری رحمہ اللہ کا استدلال ابن مسعود کی حدیث سے ہے، جس میں یہ ہے کہ تشہد کی تعلیم کے وقت میرا ہاتھ آپ ﷺ کے دونوں ہاتھوں میں تھا، لیکن اس میں مصافحہ کا ذکر ہی نہیں بلکہ یہ ہاتھوں کو پکڑنا تعلیم کے مزید اہتمام کی بناء پر ہے۔ جب کہ واضح منصوص احادیث میں صرف ایک ہاتھ سے مصافحے کا ذکر ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: تحفۃ الاحوذی، طبع مصر: ۵۲۲/۷۔

---

[1] صحیح البخاری، کَیْفَ کَانَ بَدْءُ الْوَحْیِ إِلَی رَسُولِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ؟، رقم:۷

''مصافحہ'' ایک ہاتھ سے یا دو ہاتھوں سے کرنا چاہیے؟

سوال: محترم مفتی صاحب! عرض ہے کہ میں نے ایک صاحب (جو مسلکاً حنفی ہے) کو ایک ہاتھ سے مصافحے کی حدیث دکھائی تو انھوں نے کہا آپ اہل حدیث حضرات اس حدیث میں ایک ہاتھ (یَدٌ) کس بنا پر مراد لیتے ہو، حالانکہ حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان بچے رہیں۔'' اس حدیث کی عربی میں بھی '' یَــدٌ '' استعمال ہوا ہے، تو اگر کوئی انسان دوسرے انسان کو مارے تو دوسرا ہاتھ استعمال نہیں کرے گا کیا؟ اسی طرح جب مصافحہ میں ایک ہاتھ یعنی یَدٌ آیا ہے تو دوسرا ہاتھ مصافحہ میں استعمال کرے گا۔

اس مسئلہ کو تفصیل سے تحریر کریں تاکہ میرے علم میں بھی اضافہ ہو۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔

(مرزا عمر علی، شہداد پور) (۸۔ اگست ۲۰۰۳ء)

جواب: یہ قیاس مع الفارق ہے کیونکہ یہاں بحث صرف لفظ '' یَــدٌ '' سے نہیں بلکہ یہ لفظ ''مصافحہ'' کے تابع ہے۔ اہل لغت کے نزدیک ''مصافحہ'' ہتھیلی کے ہتھیلی کے ساتھ الصاق (مل جانے) کا نام ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«هِيَ مُفَاعَلَةٌ مِنَ الصَّفْحَةِ وَالْمُرَادُ بِهَا الْإِفْضَاءُ بِصَفْحَةِ الْيَدِ إِلَى صَفْحَةِ الْيَدِ.»[1]

''مصافحہ بروزن مفاعلہ صــفــحۃ سے ماخوذ ہے۔ مراد اس سے یہ ہے کہ ایک آدمی کے ہاتھ کی ہتھیلی کا دوسرے کے ہاتھ کی ہتھیلی کو لگ جانا۔''

علامہ طحاوی رحمہ اللہ نے اور علامہ قاری نے ''مرقاۃ'' میں اور دیگر کئی ایک علمائے حنفیہ نے مصافحہ کی اسی طرح تعریف کی ہے۔ ''تمہید ابن عبدالبر'' میں ہے کہ عبداللہ بن بسر نے کہا:

«صَافَحْتُ بِهَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ.» (رِجَالُهُ كُلُّهُمْ ثِقَاتٌ وَ اِسْنَادُهُ مُتَّصِلٌ)

'لوگو! تم میرے اس ہاتھ کو دیکھتے ہو، اس کے ساتھ میں نے رسول اللہ ﷺ سے مصافحہ کیا تھا۔'' (اس حدیث کے سب راوی ثقہ ہیں اور سند متصل ہے)

''مسند احمد'' کے الفاظ یوں ہیں:

«تَرَوْنَ كَفِّي هٰذِهِ، فَأَشْهَدُ أَنِّي وَضَعْتُهَا عَلَى كَفِّ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.»[2]

''عبداللہ بن بسر نے کہا تم میری اس ہتھیلی کو دیکھتے ہو، پس میں شہادت دیتا ہوں کہ میں نے اس کو محمد ﷺ کی ہتھیلی پر رکھا ہے۔'' (اس کی سند صحیح ہے۔)

[1] فتح الباری:۱۱/ ٥٤

[2] مسند احمد، رقم: ١٧٩٠٦٠

واضح ہو کہ لفظ «يَدِيْ هٰذِهٖ وَ كَفِّيْ هٰذِهٖ» میں معترض کے دعوے کی واضح تردید ہے کیونکہ هٰذِهٖ اسم اشارہ واحد کے لیے ہے، لفظ يَدِيْ اور كَفِّيْ میں بھی ایک ہاتھ اور ایک ہتھیلی کا تعین ہے، دونوں مراد نہیں۔ جب کہ سوال میں مشارٌ الیہ حدیث میں عموم مقصود ہے، يَدٌ حقیقی ہو یا معنوی۔ یعنی مسلمان کو تکلیف دینا ہی منع ہے، ہاتھ سے ہو، زبان سے ہو، ٹانگ سے ہو یا کسی دوسری معنوی صورت میں۔ جیسے ناحق کسی کے حق پر قابض ہو جانا بھی تکلیف دہ امر ہے، لیکن یہ قبضہ حقیقی ہاتھ سے نہیں۔ (عمدۃ القاری:۱/۲۰)

یہاں يَدٌ کا مفہوم واحد اور تثنیہ کی حدود سے بالاتر ہے، عمومی جملہ صورتوں پر اس کا اطلاق ہوگا۔ واحد اور تثنیہ کا تعین اکثر وپیشتر تصریح سے اور بعض اوقات قرائن سے ہوتا ہے۔

مصافحہ میں دوسرے ہاتھ کا استعمال مصافحہ کی اصل تعریف سے خارج ہے اور ''صحیح بخاری'' میں ابن مسعود کی حدیث: «وَكَفِّي بَيْنَ كَفَّيْهِ» [1] سے مقصود مصافحہ نہیں بلکہ مزید اہتمام تعلیم کی خاطر دونوں ہاتھوں کو پکڑنا ہے۔

مولانا عبدالحی لکھنوی حنفی نے اپنے بعض فتوؤں میں اس امر کی تصریح کی ہے جس کی تفصیل ''تحفۃ الاحوذی'' (۷/۵۲۲) میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مستحب یہ ہے کہ مصافحہ دائیں ہاتھ سے ہو، یہی افضل ہے۔ (التحفة :۷/۵۱۹)

تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: کتاب المقالة الحسنى فى سنية المصافحة باليد اليمنى للعلامة عبدالرحمن مباركپوری رحمه الله تعالىٰ۔

مصافحہ کا مسنون طریقہ کیا ہے؟

سوال: مصافحہ کرنے کا صحیح طریقہ سنت کی روشنی میں کیا ہے، بعض افراد دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنا پسند کرتے ہیں اور بعض اسے ناپسند کرتے ہیں۔ (محمد عالم بادل کلاں، گجرات) (۷ دسمبر ۲۰۰۱ء)

جواب: جزری نے ''النہایہ'' میں کہا ہے کہ ''مصافحہ'' مفاعلہ کے وزن پر ہے، جس کے اصل معنی ہیں: ''ہتھیلی سے ہتھیلی کا لگنا اور چہرے کا چہرے کی طرف متوجہ ہونا۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''فتح الباری'' میں کہا ہے کہ یہ مفاعلہ کے وزن پر ہے اور صَفْحَة سے مراد یہ ہے کہ ہاتھ کی ہتھیلی کا ہاتھ کی ہتھیلی کی طرف پہنچنا۔

اسی طرح علماء حنفیہ میں سے ملا علی قاری نے ''مرقاۃ'' میں اور طحاوی وغیرہ نے کہا ہے۔ اس سے معلوم ہوا لغوی طور پر مصافحہ میں اصل یہ ہے کہ صرف ایک ہاتھ سے ہو۔ احادیث سے بھی اس امر کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ ''مسند احمد'' میں

[1] صحيح البخاری، بَابُ الأَخْذِ بِاليَدَيْنِ، رقم:٦٢٦٥

حدیث ہے، حسان بن نوح حمصی کا بیان ہے کہ میں نے عبد اللہ بن بسر کو دیکھا وہ فرماتے تھے کہ: میری اس ہتھیلی کو تم دیکھتے ہو؟ میں اس بات کی شہادت دیتا ہوں کہ میں نے اس کو محمد ﷺ کی ہتھیلی پر رکھا تھا۔ اس کی سند صحیح ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مصافحہ صرف ایک ہاتھ سے ہے۔

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، رسالہ «المقالة الحسنٰی» مؤلف علامہ عبد الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ اور تحفۃ الاحوذی (۷/۵۱۶ تا ۵۲۲)

کیا دونوں ہاتھوں سے سلام لینا جائز ہے؟

سوال: کیا دونوں ہاتھوں سے سلام لینا جائز ہے؟ کیا نبی پاک ﷺ دونوں ہاتھوں سے سلام لیتے تھے؟
(قمر الزماں فیروز پوری۔ جھبراں) (۱۹ اکتوبر ۱۹۹۸ء)

جواب: کسی صحیح حدیث سے واضح طور پر نبی اکرم ﷺ سے دونوں ہاتھوں کے ساتھ مصافحہ کرنا ثابت نہیں۔ متعدد صحیح احادیث میں صرف داہنے ہاتھ کی تصریح ہے۔ لفظ مصافحہ کا مفہوم بھی یہی ہے کہ ہتھیلی کا ہتھیلی سے لگنا جملہ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب "المقالة الحسنٰی" محدث مبارکپوری رحمہ اللہ، صاحب تحفۃ الاحوذی۔

کیا دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنا بدعت ہے؟

سوال: کیا دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنا بدعت ہے؟ یا صرف ایک ہاتھ سے کرنا چاہیے؟

جواب: دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنا سنت سے ثابت نہیں، صرف ایک داہنے ہاتھ سے مصافحہ ہونا چاہیے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب "المقالة الحسنٰی" محدث مبارکپوریؒ، صاحب تحفۃ الاحوذی۔

مصافحہ ایک ہاتھ سے یا دونوں ہاتھوں سے؟

سوال: سلام ایک ہاتھ کے ساتھ کرنا چاہیے یا دونوں ہاتھوں کے ساتھ۔ (سائل) (۱ جون ۲۰۰۱ء)

جواب: مصافحہ صرف داہنے ہاتھ سے ہونا چاہیے۔ مسند امام احمد میں حدیث ہے، حضرت عبد اللہ بن بسر نے فرمایا:

« تَرَوْنَ كَفِّي هٰذِهِ فَأَشْهَدُ اِنِّيْ وَضَعْتُهَا عَلٰى كَفِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ»
اَلْحَدِيْث اِسْنَادُهُ صَحِيْحٌ

یعنی میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ میں نے اس ہتھیلی کو محمد ﷺ کی ہتھیلی پر رکھا تھا۔''

اور ''التمهيد'' ابن عبد البر کی روایت میں «صَافَحْتُ بِهَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ » کے الفاظ ہیں کہ اس ہتھیلی کے ساتھ میں نے رسول اللہ ﷺ سے مصافحہ کیا تھا۔ لفظ مصافحہ کا مفاد اور مفہوم بھی یہی ہے۔ ملاحظہ ہو تاج العروس وغیرہ) مزید تفصیل کے لیے ''المقالۃ الحسنیٰ'' علامہ عبد الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ۔

مصافحہ ایک ہاتھ سے یا دو ہاتھ سے؟

سوال: ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنا افضل ہے یا دو سے؟ بعض حضرات کہتے ہیں کہ دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنا افضل ہے۔ دلیل دیتے ہیں۔ ابو معمر ابن مسعود کی روایت۔ بخاری باب المصافحۃ «عَلَّمَنِیْ النَّبِیُّ وَ کَفِّی بَیْنَ کَفَّیْهِ»

(سائل) (٦ جولائی ٢٠٠١ء)

جواب: جانبین سے مصافحہ صرف داہنے ہاتھوں سے ہونا چاہیے۔''مسند احمد'' میں عبد اللہ بن بسر کی روایت میں اس امر کی تصریح موجود ہے جب کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی مذکورہ روایت میں مصافحہ مقصود نہیں۔ یہ تو صرف تعلیم و تعلم میں دلچسپی اور محض اہتمام کا اظہار تھا۔ جس طرح بڑے بزرگ، چھوٹوں سے شفقت کا اظہار کرتے ہیں۔

حنفی فقہاء نے بھی اس توجیہ کی بھرپور تائید کی ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب «اَلْمقالة الحسنى فى سنية المصافحة باليد اليمنٰى» مؤلفہ علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوری۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ مشارٌ الیہ حدیث «بَابُ الْمُصَافَحَة» میں نہیں بلکہ «بَابُ الْاخذ بِالْيَدِيْنِ» میں ہے۔

اپنے استاد یا بزرگ باعمل عالم دین کے ساتھ دونوں ہاتھ سے مصافحہ کرنا

سوال: کیا آدمی اپنے استاد یا بزرگ باعمل عالم دین کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرسکتا ہے؟

(سائل محمد یحییٰ عزیز کوٹ رادھا کشن) (١٤ اگست ١٩٩٨ء)

جواب: مصافحہ صرف داہنے ہاتھ سے کرنا سنت ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب المقالة الحسنى۔ مؤلفہ محدث عبدالرحمٰن مبارکپوری۔ رحمۃ اللہ علیہ

مجلس سے واپسی کے وقت سلام اور مصافحہ کا حکم

سوال: ملاقات کے وقت مصافحہ کرنے اور سلام کہنے کا حکم تو ہے کیا واپسی کے وقت سلام کہنا اور مصافحہ کرنا کسی حدیث سے ثابت ہے؟ مصافحہ ایک ہاتھ سے کرنا چاہیے یا دو سے؟ (ایک سائل) (١٣ اکتوبر ١٩٩٢ء)

جواب: زائر کا واپسی کے وقت سلام کہنا بھی مسنون ہے۔ چنانچہ ''سنن ابی داؤد'' میں حدیث ہے:

«إِذَا انْتَهَى أَحَدُكُمْ إِلَى الْمَجْلِسِ، فَلْيُسَلِّمْ فَإِذَا أَرَادَ أَنْ يَقُومَ، فَلْيُسَلِّمْ فَلَيْسَتِ الْأُولَى بِأَحَقَّ مِنَ الْآخِرَةِ.»[1]

''یعنی جب ایک تمہارا مجلس میں آئے تو سلام کہے پس جب اٹھ کر جائے پھر بھی سلام کہے۔ پہلے سلام کی شرعی حیثیت دوسرے سے زیادہ نہیں۔''

[1] سنن ابی داؤد، بَابٌ فِي السَّلَامِ إِذَا قَامَ مِنَ الْمَجْلِسِ، رقم:٥٢٠٨

مقصد یہ ہے دونوں دفعہ سلام کہنا مسنون ہے۔

اور جہاں تک مصافحہ کا تعلق ہے۔ سو اس بارے میں عرض ہے اگر تو رخصت ہونے والا مسافر ہے۔ اس سے مصافحہ کا جواز ہے۔ چنانچہ ترمذی میں حدیث ہے:

«كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا وَدَّعَ رَجُلًا أَخَذَ بِيَدِهِ، فَلَا يَدَعُهَا حَتَّى يَكُونَ الرَّجُلُ هُوَ يَدَعُ يَدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ.» ❶

''یعنی نبی ﷺ جب کسی آدمی کو الوداع کرتے تو اس کا ہاتھ پکڑ لیتے اُسے نہ چھوڑتے حتیٰ کہ آدمی نبی ﷺ کے مبارک ہاتھ کو چھوڑتا۔ پھر مسافر کو رخصت کرتے وقت آپ ﷺ یہ دعا پڑھتے۔

«اسْتَوْدِعِ اللّٰهَ دِينَكَ وَأَمَانَتَكَ وَآخِرَ عَمَلِكَ.»

بظاہر یہ حدیث مسافر سے مصافحہ پر دالّ ہے۔ (واللہ اعلم) اور اگر رخصت ہونے والا غیر مسافر ہے تو اس سے مصافحہ کے بارے میں کوئی مرفوع صحیح حدیث ثابت نہیں۔ اور نہ ہی کوئی صحیح اثر موجود ہے۔ لہٰذا مصافحہ سے اجتناب کرنا چاہیے۔

مصافحہ صرف ایک ہاتھ سے مسنون ہے۔ اس بارے میں کئی ایک احادیث وارد ہیں۔ چند ایک ملاحظہ فرمائیں:

«أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ إِذَا صَافَحَ الرَّجُلَ لَمْ يَنْزِعْ يَدَهُ مِنْ يَدِهِ حَتَّى يَكُونَ هُوَ الَّذِي يَنْزِعُ يَدَهُ ......» ❷

''یعنی رسول اللہ ﷺ جب کسی آدمی سے مصافحہ کرتے اپنے ہاتھ کو اُس کے ہاتھ سے جدا نہ کرتے یہاں تک کہ وہ آدمی اپنا ہاتھ جدا کرتا۔''

دوسری روایت میں ہے:

« قَالَ رَجُلٌ :يَا رَسُولَ اللّٰهِ الرَّجُلُ مِنَّا يَلْقَى أَخَاهُ أَوْ صَدِيقَهُ أَيَنْحَنِي لَهُ؟ قَالَ :لَا، قَالَ :أَفَيَلْتَزِمُهُ وَيُقَبِّلُهُ؟ قَالَ :لَا، قَالَ :أَفَيَأْخُذُ بِيَدِهِ وَيُصَافِحُهُ؟ قَالَ:نَعَمْ.» ❸

اور تیسری روایت حدیث الودیع ہے جو پہلے گزر چکی ہے وغیرہ وغیرہ۔

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ کتاب ''المقالة الحسنى فى سنيّة المصافحة باليد اليمنى'' للمحدث مبارکپوری رحمہ اللہ۔

---

❶ سنن الترمذی، ابواب الدعوات ، باب ما یقول اذا ودّع انسانا ، رقم:٣٤٤٢

❷ سنن الترمذی، بحواله مشكاة المصابيح للالبانی ، رقم:٥٨٢٤

❸ سنن الترمذی، باب المصافحة ، رقم:٢٧٢٨

عام ملاقات میں صرف سلام اور واپسی پر سلام، مصافحہ اور معانقہ کا حکم

سوال : کوئی شخص باہر سے آئے تو وہ سلام کہتا ہے۔ حاضرین سلام کے جواب کے ساتھ مصافحہ یا معانقہ کرتے ہیں۔ کیا چلتے وقت بھی مصافحہ یا معانقہ کرنا چاہیے یا صرف سلام کہہ کر چلے جانا چاہیے۔ سنت طریقہ کیا ہے؟

(شاہجہان ملک) (۱۲ نومبر ۱۹۹۹ء)

جواب : عام ملاقات میں صرف سلام ہی کافی ہے اس کے ساتھ ساتھ بسا اوقات مصافحہ کا جواز ہے اور بعض حالات میں معانقہ کا بھی جواز ہے مثلاً کوئی شخص سفر سے آتا ہے یا سفر پر جاتا ہے تو مصافحہ اور معانقہ کرنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ وسعت ہے جب کہ سلام کا التزام تو ہر صورت ہی موجود ہے۔

مصافحہ اور معانقہ کرنا سنت سے ثابت ہے؟

سوال : کیا مصافحہ کرنا اور معانقہ کرنا سنت سے ثابت ہے؟ مصافحہ ایک ہاتھ سے ہی کرنا چاہیے یا دونوں سے بھی جائز ہے؟ (سائل) (۱۰ مئی ۲۰۰۲ء)

جواب : مصافحہ اور معانقہ دونوں سنت سے ثابت ہیں۔ مصافحہ صرف ایک داہنے ہاتھ سے ہونا چاہیے۔ ملاحظہ ہو! سنن الترمذی مَعَ تحفة الاحوذی :۵۱۹/۷۔ بَابُ مَا جَاءَ فِی الْمُصَافَحَةِ . وَ بَابُ مَا جَاءَ فِی الْمُعَانَقَةِ وَالْقُبْلَةِ»

معانقہ کی شرعی حیثیت اور کتنی بار؟

سوال : جب معانقہ کیا جاتا ہے تو بعض لوگ پہلے ہاتھ ملاتے ہیں۔ پھر تین مرتبہ گلے ملتے ہیں مثلاً پہلے دائیں طرف سے، گلے لگایا پھر بائیں طرف سے اور پھر تیسری مرتبہ دائیں طرف سے، اس طرح تین دفعہ گلے ملتے ہیں۔ گلے ملنے سے پہلے بھی ہاتھ ملاتے ہیں اور گلے ملنے کے بعد بھی یوں دو دفعہ ہاتھ ملانا اور تین دفعہ گلے ملنا کیا درست طریقہ ہے؟ سنت سے کیا ثابت ہے؟ (وقار علی۔ لاہور) (۱۸ اپریل ۱۹۹۷ء)

جواب : معانقہ کا مفہوم عربی زبان میں صرف یہ ہے کہ «جَعَلَ يَدَيْهِ عَلٰی عُنِقِهٖ وَ ضَمَّهٗ اِلٰی صَدْرِهٖ.» (المنجمد) اپنے دونوں ہاتھوں کو دوسرے کی گردن پر کر کے اسے سینہ سے ملا لینا تعدّد یا تکرار کی ضرورت نہیں۔ اس بارے میں ''مسند احمد'' اور ابو داؤد میں روایت موجود ہے لیکن سنداً متکلم فیہ ہے۔ اسی طرح طبرانی اوسط میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں معانقہ سفر سے آمد کے ساتھ مقید ہے۔

« وَ اِذَا قَدِمُوْا مِنْ سَفَرٍ تَعَانَقُوْا .»

ترمذی کی روایت میں ہے۔ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی مدینہ آمد پر آپ ﷺ نے اس سے معانقہ اور تقبیل (بوسہ)

سے اظہارِ محبت فرمایا تھا۔ ❶

روایت ہذا کو امام ترمذی نے حسن قرار دیا ہے۔ ابو الہیثم بن التیان کی روایت میں بھی معانقہ اور تقبیل کی تصریح ہے۔ لیکن اس کی سند ضعیف ہے۔

ائمہ میں سے مالک رحمہ اللہ نے فعلِ معانقہ ویسے ہی مکروہ سمجھا ہے جب کہ سفیان بن عینیہ نے اس کو جائز قرار دیا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: فتح الباری: ۱۱/ ۵۹۔۶۰۔

ایک سے زائد مرتبہ معانقہ جائز ہے؟

سوال: معانقہ ایک سے زائد مرتبہ جائز ہے کہ نہیں؟ عام معروف طور پر تین دفعہ معانقہ کیا جاتا ہے۔ (آپ کا بھائی سید طاہر عباس شاہ جوہر آباد خوشاب) (۳۱ جولائی ۱۹۹۸ء)

جواب: نفس معانقہ کی مشروعیت روایات و آثار سے ثابت ہے۔ اگرچہ امام مالک کے نزدیک مکروہ ہے لیکن راجح بات جواز ہے۔ البتہ معانقہ میں تکرار کسی حدیث میں میری نظر سے نہیں گزرا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: فتح الباری: ۱۱/ ۵۹۔۶۰۔

سفر سے واپس آنے پر گلے ملنا ثابت ہے؟

سوال: سفر کے بعد ملیں تو گلے ملنا ثابت ہے لیکن بعض دینی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے موحد لوگ بھی جب روزانہ یا دوسرے تیسرے دن ملتے ہیں تو ''ازراہِ محبت'' گلے ملتے ہیں۔ کیا ایسا کرنا درست ہے؟

(وقار علی۔ لاہور) (۱۸ اپریل ۱۹۹۷ء)

جواب: گلے ملنا سفر کی آمد کے ساتھ مخصوص ہے جس طرح کہ سابقہ روایات میں اس امر کی تصریح موجود ہے۔

عید کے موقع پر گلے ملنا اور ''عید مبارک'' کہنا:

سوال: عید کے موقع پر گلے ملنے اور ''عید مبارک'' کہنے کی کتاب وسنت سے کوئی دلیل ہے؟ ایک مولانا صاحب نے فرمایا کہ عید کے موقع پر گلے ملنا بدعت ہے۔ مہربانی فرما کر کتاب وسنت کی روشنی میں جواب سے مطلع فرمادیں۔

(عبدالرحمٰن خلیق ملکوال) (۲۳ فروری ۲۰۰۱ء)

جواب: عید کا دن مسلمانوں کے لیے خوشی اور باہمی مؤدت ومحبت کے اظہار کا دن ہے، لہٰذا اس میں خوشی کا اظہار ہونا چاہیے۔

حافظ ابن حجر بسند حسن جبیر بن نفیر سے بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ کے اصحاب عید کے روز جب آپس میں

❶ سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي الْمُعَانَقَةِ وَالْقُبْلَةِ، رقم: ۲۷۳۲

ملاقات کرتے تو «تَقَبَّلَ اللّٰهُ مِنَّا وَ مِنْكَ » ❶ ''اللہ ہماری اور تمہاری عید قبول فرمالے۔'' کہہ کر ایک دوسرے کو مبارک باد پیش کرتے۔ ❷

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: کہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ ایک آدمی دوسرے کو عید کے دن «تَقَبَّلَ اللّٰهُ مِنَّا وَ مِنْكَ» کہے۔ حرب نے کہا کہ امام احمد سے سوال ہوا کہ عیدین میں لوگ یہ کہتے ہیں «تَقَبَّلَ اللّٰهُ مِنَّا وَ مِنْكَ» اس کا کیا حکم ہے؟ فرمایا: کوئی حرج نہیں۔ یہ بات اہل شام نے ابوامامہ سے نقل کی ہے۔ ❸

ابوامامہ کا یہ اثر ترکمانی نے ''سنن کبریٰ بیہقی'' کے حاشیے پر ذکر کیا ہے۔ (۳/۳۲۰) امام احمد نے اس کی سند کو جید قرار دیا ہے۔ البتہ خصوصی گلے ملنے کی کسی روایت میں صراحت نہیں، لہٰذا اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

عید کے دن ایک دوسرے سے گلے ملنا کوئی مسنون اور ثابت شدہ عمل نہیں، البتہ عام اظہارِ محبت کے لیے اگر معانقہ کر بھی لیا جائے تو اس میں کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا۔ (وَاللّٰهُ سُبْحَانَهُ وَتَعَالٰی اَعْلَمُ .)

ٹیچر وغیرہ کے احترام میں کھڑے ہونا؟

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیانِ عظام درج ذیل مسائل کے بارے میں کہ:

۱۔ آج کل تقریباً تمام اسکولوں میں یہ رواج پایا جاتا ہے کہ جب کوئی ٹیچر کسی کلاس میں جاتا ہے تو سب بچے اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جب تک استاد کرسی پر نہ بیٹھے یا بچوں کو نیچے بیٹھنے کا حکم نہ دے پوری کلاس کھڑی رہتی ہے۔ اسی طرح جب کوئی عالم دین کسی کے پاس ملاقات کے لیے جاتا ہے تو وہ لوگ بھی اپنی جگہ پر کھڑے ہو جاتے ہیں، جب تک وہ نہ بیٹھے کھڑے رہتے ہیں۔ اور اسی طرح اسکولوں میں جب ہمارا قومی ترانہ گایا جاتا ہے تو اساتذہ سمیت تمام طلباء سجدہ کی جگہ نظریں جمائے کھڑے رہتے ہیں، تو کیا یہ قیام کتاب وسنت کی روشنی میں جائز ہے یا حرام؟ مدلل و مفصل تحریر فرمائیں۔

جواب: مسئلہ ہذا میں اہل علم کا سخت اختلاف ہے۔ ایک گروہ اساتذہ کرام اور بڑے بزرگوں وغیرہ کے لیے بطورِ احترام کھڑے ہونے کا قائل ہے۔ ان میں سے امام نووی اور غزالی رحمہما اللہ وغیرہ ہیں۔ ان کا استدلال فرمانِ نبوی ﷺ «قُوْمُوْا اِلٰی سَیِّدِکُمْ» ❹ سے ہے۔ ابن بطال شارح بخاری نے کہا ہے:

---

❶ السنن الکبرٰی للبیهقی، بَابُ مَا رُوِیَ فِی قَوْلِ النَّاسِ یَوْمَ الْعِیدِ ......الخ ، رقم:٦٢٩٤ ، المعجم الکبیر للطبرانی:١٢٣

❷ فتح الباری:٢/ ٤٤٦

❸ المغنی: ٣/ ٣٩٤

❹ صحیح البخاری ، بَابُ إِذَا نَزَلَ العَدُوُّ عَلَى حُكْمِ رَجُلٍ ، رقم: ٣٠٤٣ ، سنن ابی داؤد ، رقم:٥٢١٥ ، ٥٢١٦

«فِي هَذَا الْحَدِيثِ أَمْرُ الْإِمَامِ الْأَعْظَمِ بِإِكْرَامِ الْكَبِيرِ مِنَ الْمُسْلِمِينَ وَمَشْرُوعِيَّةُ إِكْرَامِ أَهْلِ الْفَضْلِ فِي مَجْلِسِ الْإِمَامِ الْأَعْظَمِ وَالْقِيَامِ فِيهِ لِغَيْرِهِ مِنْ أَصْحَابِهِ وَإِلْزَامُ النَّاسِ كَافَّةً بِالْقِيَامِ إِلَى الْكَبِيرِ مِنْهُمْ.» ❶

اور جو لوگ منع کے قائل ہیں ان کا استدلال ابوامامہ کی روایت سے ہے کہ آپ ﷺ عصا پر ٹیک لگائے نکلے۔ ہم آپ ﷺ کے لیے کھڑے ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: عجمیوں کی طرح ایک دوسرے کے لیے کھڑے مت ہوں۔ امام طبری رحمہ اللہ نے اس حدیث کا جواب دیا ہے کہ اس کی سند میں اضطراب ہے۔ اور اس میں راوی غیر معروف ہیں۔ اور اسی طرح ان کا استدلال آپ کے اس ارشاد سے ہے:

« مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَتَمَثَّلَ لَهُ بَنُو آدَمَ قِيَامًا وَجَبَتْ لَهُ النَّارُ.» ❷

امام طبری رحمہ اللہ نے اس کا جواب یوں دیا ہے: '' اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو کھڑا ہونے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اکرام کے لیے اس میں نہی کا ذکر نہیں۔''

اور ابن قتیبہ نے جواب یوں دیا: ''اس سے مراد سر پر کھڑے رہنا ہے۔ جس طرح کہ عجمی شاہان کی عادت تھی اور ابن بطال نے جواز کے لیے نسائی کی روایت سے استدلال کیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو آتے دیکھ کر خوش [illegible] یہ کہتے پھر کھڑے ہو کر اس کا بوسہ لیتے پھر ہاتھ پکڑ کر اپنی جگہ بٹھا لیتے۔''

یہ روایت ترمذی، اور ابوداؤد وغیرہ میں بھی ہے اور قصہ توبہ کعب بن مالک میں ہے۔

« فَقَامَ إِلَيَّ طَلْحَةُ بْنُ عُبَيْدِ اللّٰهِ يُهَرْوِلُ » ❸

''یعنی طلحہ بن عبید اللہ میری طرف دوڑتے ہوئے آئے۔''

اس طرح کے بہت سارے دلائل جانبین سے دیے جاتے ہیں۔ ابن الحاج نے ''المدخل'' میں امام نووی رحمہ اللہ کے جملہ مستندات کے جوابات دینے کی سعی کی ہے۔ اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''فتح الباری'' میں سوال و جواب کی طویل بحث کی ہے جو ایک محقق کے لیے بے حد مفید ہے۔

اختتام بحث پر امام غزالی کے نظریہ کو پسند فرمایا:

❶ فتح الباری: ١١/ ٤٩

❷ المعجم الکبیر للطبرانی، رقم: ٨٥٢، سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي كَرَاهِيَةِ قِيَامِ الرَّجُلِ لِلرَّجُلِ، رقم: ٢٧٥٥

❸ صحیح البخاری، بَابُ حَدِيثِ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ......الخ، رقم: ٤٤١٨، سنن ابی داؤد، بَابٌ فِي إِعْطَاءِ الْبَشِيرِ، رقم: ٢٧٧٣

«اَلْقِيَامُ عَلَى سَبِيلِ الْإِعْظَامِ مَكْرُوهٌ وَعَلَى سَبِيلِ الْإِكْرَامِ لَا يُكْرَهُ.» (۵۴/۱۱)

''کسی کی بڑائی کے لیے کھڑا ہونا مکروہ اور عزت واحترام کی خاطر کھڑا ہونا جائز ہے۔''

و هٰذَا تَفْصِيْلٌ حَسَنٌ یہ اچھی وضاحت ہے۔

فی الواقع دونوں طرف روایات موجود ہیں۔ جواز کے اعتقاد کے باوجود احتیاط اس میں ہے کہ بطورِ اکرام کھڑا نہ ہو اس لیے کہ عام حالات میں صحابہ کرام رسول اللہ ﷺ کے لیے کھڑے نہیں ہوتے تھے۔ بسا اوقات آپ نے منع بھی فرمایا سوال میں مرقوم پہلی دونوں صورتیں تو قطع نظر احترام کے محض ایک عادت مستمرہ معلوم ہوتی ہیں۔ کتاب وسنت یا سلف صالحین کے عمل سے اس کی مثال ملنی مشکل ہے لہٰذا اس سے احتراز کرنا چاہیے۔ اور قومی ترانہ کے احترام میں کھڑا ہونا تو قطعاً بدعت ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

« مَنْ اَحْدَثَ فِيْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ »[1]

''یعنی جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے۔''

کسی کی آمد پر کھڑے ہونے کا شرعی حکم:

سوال: اکثر تعلیمی اداروں میں یہ رائج ہو چکا ہے کہ استاد جب کلاس روم میں داخل ہوتا ہے، تو بچے اس کے ادب میں کھڑے ہو جاتے ہیں، کیا یہ جائز ہے؟ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب مرحمت فرمائیں۔ (محمد بلال کمبوہ آف کچا پکا)

(۱۶ فروری ۲۰۰۱ء)

جواب: بچوں کا اس طرح کھڑے ہونا ناجائز ہے، حدیث میں ہے:

«مَنْ سَرَّهٗ اَنْ يَّتَمَثَّلَ لَهُ الرِّجَالُ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ»[2]

''جو شخص پسند کرتا ہے کہ لوگ اس کے احترام میں مجسمہ بنے کھڑے رہیں پس اسے اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لینا چاہیے۔''

صلہ رحمی اور میل ملاقات کے آداب

برادری کے ایک بدکردار آدمی سے قطع تعلقی یا صلہ رحمی؟

سوال: برادری میں سے ایک آدمی بدکردار ہے بلکہ اس کی طرف سے عصمت دری کا ثبوت بھی موجود ہے کیا اس کی اس بدکرداری کی وجہ سے اس سے قطع تعلق جائز ہے؟ (عبدالقدوس سلفی پوسٹ بکس ۳۰، ڈیرہ غازیخان) (۶ نومبر ۱۹۹۲ء)

[1] صحيح البخاری، بَابُ إِذَا اصْطَلَحُوا عَلَى صُلْحِ جَوْرٍ فَالصُّلْحُ مَرْدُودٌ، رقم: ۲۶۹۷

[2] سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي كَرَاهِيَةِ قِيَامِ الرَّجُلِ لِلرَّجُلِ، رقم: ۲۷۵۵، سنن ابی داؤد، بَابٌ فِي قِيَامِ الرَّجُلِ لِلرَّجُلِ، رقم: ۵۲۲۹

جواب : ایسے شخص کو توبہ کی طرف راغب کرنا چاہیے اور اگر برائی کے ارتکاب سے باز نہ آئے تو دینی غیرت کے پیش نظر اس سے قطع تعلقی ہونی چاہیے۔

سوال : برادری کا ایک آدمی ایسا ہے کہ جس نے بہتان طرازی دشمنی اور غلط قسم کے پروپیگنڈے کو اپنا وطیرہ بنا لیا ایسے آدمی سے قطع تعلقی جائز ہے یا نہیں؟ (عبدالقدوس سلفی پوسٹ بکس ۳۰، ڈیرہ غازیخان) (۶ نومبر ۱۹۹۲ء)

جواب : ایسے شخص کے لیے نصیحت تجربات کی روشنی میں اگر فائدہ مند نہیں ہے تو اس سے کنارہ کشی اختیار کر لینی چاہیے۔

شادی کے بعد عورت شوہر کی اطاعت کرے یا والدین سے صلہ رحمی:

سوال : عورت کو اس کا خاوند اگر والدین سے ملنے سے روکے تو اس صورت میں بیوی خاوند کی اطاعت کرے یا والدین سے ملنے کو ترجیح دے۔

جواب : عورت کو چاہیے کہ ہر حالت میں اپنے خاوند کی اطاعت کرے۔ والدین سے میل ملاقات شوہر کی رضامندی سے ہونی چاہیے کیوں کہ خاوند کا حق شرعاً فائق ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَوْ كُنْتُ آمِرًا أَحَدًا أَنْ يَسْجُدَ لِأَحَدٍ لَأَمَرْتُ الْمَرْأَةَ أَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا.» [1]

''اگر غیر اللہ کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں عورت کو حکم دیتا کہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔''

اور ترمذی کی دوسری روایت میں ہے:

«أَيُّمَا امْرَأَةٍ مَاتَتْ وَزَوْجُهَا عَنْهَا رَاضٍ دَخَلَتِ الْجَنَّةَ.» [2]

عورت کو چاہیے کہ حتی المقدور خاوند کی سخت طبیعت کو حسنِ خلق سے ملائم کرنے کی سعی کرے۔ خیر اور بہتری اسی میں ہے۔

خاوند کے منع کرنے کے باوجود بیمار والد کی خبر گیری کرنا؟

سوال : خاوند اگر منع کر جائے کہ گھر سے باہر نہ نکلنا۔ اگر اس کا والد بیمار ہو جائے اچانک خبر آ جانے سے کیا بیمار والد کی بیمار پرسی کرنے کو جا سکتی ہے۔ اگر جا سکتی ہے تو اس حدیث پر عمل کیسے ہو گا کہ ایک عورت کا والد وفات پا گیا نبی ﷺ سے پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اگر خاوند منع کر گیا ہے تو یہ عورت نہیں جا سکتی۔'' یہ امام غزالی کی مکاشفة القلوب (مترجم) کے صفحہ: ۶۵۹ پر درج ہے۔ (سائل) (۱۲ جنوری ۲۰۰۱ء)

جواب : خاوند کی اجمالی یا عرفی اجازت کے بغیر عورت کو گھر سے باہر نہیں نکلنا چاہیے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ مشکوٰۃ باب عشرۃ النساء۔

---

❶ سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي حَقِّ الزَّوْجِ عَلَى الْمَرْأَةِ، رقم: ۱۱۵۹، باسناد حسن او صحیح

❷ سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي حَقِّ الزَّوْجِ عَلَى الْمَرْأَةِ، رقم: ۱۱٦۱

کیا اولاد والدین کی غلطیوں کی نشاندہی کرسکتی ہے؟ اور کیسے

سوال: ایک شخص ''اسلم'' اپنے سگے بھائی ''اکرم'' کی بیوی سے ناجائز تعلقات استوار کرکے ''اکرم'' سے اس کی بیوی کو طلاق دلا کر خود اس سے کورٹ میرج کرلیتا ہے۔ بعد میں ''اکرم'' دوسری شادی کرلیتا ہے۔ کافی عرصہ بعد ''اسلم''، ''اکرم'' کے گھر پھر آنا جانا شروع کرلیتا ہے اور اکرم کی دوسری بیوی سے بھی ناجائز تعلقات قائم کرلیتا ہے جس پر مضبوط شواہد موجود ہوں اور ''اکرم'' اس معاملے میں دیوثیت کا کردار ادا کر رہا ہو۔ ''اسلم'' کی اولاد دینی کاموں میں مصروف ہو اور اسلم کے اس غلط کام کی وجہ سے انھیں جگہ جگہ رسوائی ہو۔ اولاد کے منع کرنے پر اسلم سے قطع تعلقات اور قطع کلامی ہو رہی ہو۔ اولاد کو ہاتھ سے روکنے کی طاقت نہ ہو۔ ان حالات میں اسلم کی اولاد اپنے والد سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کیسے کرے؟ اور ﴿وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾ پر کیسے عمل ہو؟ کیا اولاد علاقہ کی باا ثر شخصیات سے مدد طلب کرسکتی ہے؟ اس سے والد کی مزید رسوائی کا بھی اندیشہ ہوسکتا ہے؟ اور ناراضگی میں اضافہ بھی۔ والسلام

(اکرام اللہ۔ سانگھڑ) (۳۱ جولائی ۲۰۰۰ء)

جواب: صحیح احادیث میں برائی سے روکنے کے تین درجات بیان ہوئے ہیں۔ (۱) برائی کو ہاتھ سے روکے۔ (۲) اس کی استطاعت نہ ہو تو زبان سے روکے۔ (۳) اگر یہ کام بھی نہ کرسکے تو برائی کو دل سے برا سمجھے۔ فوائد وثمرات کے اعتبار سے یہ ایمان کا کم ترین درجہ ہے۔

اس حدیث کو نصب العین بنا کر والد صاحب کی اصلاح کے لیے کوشاں رہیں۔ امید ہے کہ اس صورت میں آپ عدالتِ الٰہی میں بری الذمہ قرار پائیں گے۔ شرعی حدود سے تجاوز کرنے کی کوشش نہ کریں۔ اس کام کے لیے باعزت طریقے سے خیر خواہ شخصیات کا تعاون حاصل کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ اللہ رب العزت ہم سب کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق بخشے۔ آمین

تین دن سے زیادہ مسلمان سے قطع تعلقی کا حکم؟

سوال: حدیث شریف میں ہے جو کسی مسلمان بھائی سے اختلاف کی وجہ سے تین دن تک کلام نہیں کرتا تو اس کی کوئی عبادت بھی قبول نہیں ہوتی ہم لوگ باہمی اختلاف کی وجہ سے طویل عرصہ تک بات چیت نہیں کرتے تو کس زمرہ میں آتے ہیں۔ عبادت کی قبولیت کے اعتبار سے۔ امید ہے کہ جلد کتاب وسنت کی روشنی میں مفصل جواب سے نوازیں گے۔ (عبدالجبار پیپلز کالونی ملتان) (۴ جون ۱۹۹۳ء)

جواب: عام حالات میں کسی مومن کے لائق نہیں ہے کہ اپنے مسلمان بھائی سے تین دن سے زیادہ قطع تعلقی کرے۔ اس صورت میں جو بلانے (کلام کرنے) میں پہل کرے وہ بری الذمّہ ہے۔ دوسرا چاہے رضا کا اظہار کرے یا نہ

کرے۔ بصورتِ عدم رضا ذمہ داری اس پر عائد ہوگی۔ اور اس کی عبادت بھی محل نظر ہوگی۔ ہاں البتہ مقاطعہ کا سبب اگر شرعی عذر ہے تو تین دن سے زیادہ بھی جائز ہے۔ جس طرح کہ حضرت کعب بن مالک اور ان کے ساتھیوں کا غزوہ تبوک میں قصہّ معروف ہے۔

دو بھائیوں کی باہمی لڑائی میں صلہ رحمی کا حکم

سوال : دو بھائیوں کی باہمی لڑائی یا ناچاقی کی صورت میں صلہ رحمی کے شرعی حکم پر کس طرح عمل ہوسکتا ہے جب کہ ایک بھائی سے تعلق رکھا جائے تو دوسرا ناراض ہوتا ہے بلکہ ہمیشہ کے لیے قطع تعلقی کا خطرہ ہے۔

(عبدالقدوس سلفی پوسٹ بکس ۳۰، ڈیرہ غازیخان) (۶ نومبر ۱۹۹۲ء)

جواب : دونوں بھائیوں سے آپ برابری کی بنیاد پر احسان وسلوک کی کوشش کریں۔ اس کے باوجود اگر کوئی بُعد اختیار کرتا ہے تو عند اللہ آپ مسئول نہیں ہوں گے۔ ان شاء اللہ بشرطیکہ اپنی نیت میں خلوص رکھیں۔ حتی المقدور قرب کے لیے کوشاں رہیں۔ والتوفیق بید اللہ

قطع رحمی پر مبنی وصیت پر عمل کرنا

سوال : ایک برادری جس کا عقیدہ ومسلک اہل حدیث ہے۔ بزرگوں کی وجہ سے دو حصوں میں منقسم چلی آرہی ہے۔ برادری کے ایک دھڑے کا کہنا ہے کہ ہمارے جد امجد نے وصیت کی تھی تم نے دوسرے دھڑے کے ساتھ روابط کے سلسلہ میں بچ کے رہنا۔ اس لیے ہم ان سے تعلقات نہیں رکھتے۔ کیا ایسی وصیت پر عمل کرنا چاہیے یا نہیں؟

(عبدالقدوس سلفی پوسٹ بکس ۳۰، ڈیرہ غازیخان) (۶ نومبر ۱۹۹۲ء)

جواب : اکابر کی وصیت اگر ٹھوس دینی مصلحت پر مبنی ہے تو وہ لائق عمل ہے۔ جس کا جائزہ وفیصلہ بنظر غور بذمہ علماء راسخین فی العلم ہے ورنہ اس وصیت کی کوئی حیثیت نہیں۔ ان سب لوگوں کو اپنے تعلقات فوراً بحال کر لینے چاہئیں۔

اس صورت میں ہم والد کی تابعداری کریں یا صلہ رحمی کا تقاضا پورا کریں؟

سوال : والد کا اپنی اولاد میں سے بعض کے ساتھ جھگڑا ہے وہ اپنی دوسری اولاد جس کے ساتھ اس کی صلح ہے کو پہلی اولاد سے تعلقات منقطع کرنے کا حکم دیتا ہے تو کیا اس صورت میں والد کی اطاعت کرنی چاہیے یا صلہ رحمی کے تقاضے کو مد نظر رکھتے ہوئے والد کے حکم کی پروا کیے بغیر تمام بہنوں/ بھائیوں سے تعلقات بنائے رکھنے چاہئیں؟

(عبدالقدوس سلفی پوسٹ بکس ۳۰، ڈیرہ غازیخان) (۶ نومبر ۱۹۹۲ء)

جواب : والد کے جھگڑے کی بنیاد اگر دینی ہے تو دوسری اولاد کو والد کی پیروی کرنی چاہیے اور اگر محض دنیاوی ہے تو اس صورت میں والد کی اطاعت ضروری نہیں۔ پہلی اولاد سے تعلقات قائم رکھنے چاہئیں۔

تاریخی وتحقیقی مسائل

حضرت عزیر کون ہیں؟

سوال: سورۃ توبہ میں (حضرت) عزیر کا ذکر ہے، اس شخصیت کے بارے میں وضاحت درکار ہے کہ یہ کون تھے؟ اور قرآن میں اِن کے ذکر کا اصل پس منظر کیا ہے؟ کیونکہ کاہن کا لفظ بھی اُن سے منسوب کیا جاتا ہے۔

(سائل) (۴ جون ۲۰۰۴ء)

جواب: ''المفردات فی غریب القرآن'' میں امام راغب زیرآیت ﴿وَ قَالَتِ الْیَهُوْدُ عُزَیْرُ نِ ابْنُ اللّٰهِ﴾ (التوبۃ:۳۰) کہتے ہیں ''اسم نبی'' کہ ''عزیر'' نبی کا نام ہے۔ (ص:۳۳۳)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق یہود کا حضرت عزیر کو ابن اللہ کہنے کا سبب یہ تھا کہ وہ (یہود) تورات کے اصل نسخے ضائع کر بیٹھے اور دل و دماغ سے محفوظات بھی محو ہوگئیں۔ جنابِ عزیر نے عجز وانکسار کے ساتھ رب کے حضور دعا کی تورات کی یادداشت ان کے حافظے میں لوٹ آئی، پھر انھوں نے قوم میں دعوت وتبلیغ کا سلسلہ شروع کردیا، قوم نے تجربے کے بعد ان کو صادق پایا۔ تورات کے حفظ میں تیسیر کی بنا پر ان پر نبوت کا اطلاق کردیا۔ [1]

یہود و نصاریٰ کے قبیح وشنیع اور اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھنے کے عقیدے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر مسلمانوں کو ان سے جنگ کرنے کا حکم دیا ہے۔ [2]

حضرت عزیر پر کاہن کا اطلاق اہل اسلام کے نزدیک نہیں بلکہ یہ یہود کی کارستانی ہے جو نبیوں پر الزام تراشی کے

[1] تفسیر کبیر:۱۶/ ۲۸

[2] تفسیر ابن کثیر:/ ۴۵۸

عادی ہیں۔اعاذنا اللہ منہ

صحابہ کرام کے متعلق درست موقف

سوال: تاریخ کے ایک طالب علم کے اس سوال کا کیا جواب دیا جا سکتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ میں سے باغی کون ہے؟ قصاص عثمان رضی اللہ عنہ کا مطالبہ ایک سیاسی چال اور اقتدار چھوڑنے سے انکار کے بہانے کے لیے استعمال کیا گیا؟ (سائل) (۱۱ جون ۲۰۰۴ء)

جواب: حضرت علی رضی اللہ عنہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ دونوں حق پر تھے، وجہ نزاع محض اجتہادی تھی جس کی بنا پر کسی پر کوئی مواخذہ نہیں، بلاشبہ وہ سب جنتی ہیں، (رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ) قصۂ عمار کی بنا پر سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے گروہ پر باغی کا اطلاق کرنا درست نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ حضرت عمار کا قاتل وہی باغی گروہ ہے جس نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا، یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج میں شامل تھے۔ نامور محقق حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''گھمسان کے رَن میں عین ممکن ہے کہ حضرت علی کی فوج میں شامل گروہِ باغی ہی کے ہاتھوں انہی کی فوج کے چند آدمی بھی مارے گئے ہوں جن میں حضرت عمار رضی اللہ عنہ بھی شامل ہوں یا پھر ان ہی قاتلین عثمان رضی اللہ عنہ کے کچھ افراد گروہِ معاویہ میں محض اس بناء پر شامل ہو گئے ہوں کہ اس طرح ان کی طرف سے لڑتے ہوئے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو شہید کر کے گروہِ معاویہ رضی اللہ عنہ کو گروہِ باغی باور کرانے کی کوشش کریں۔''

(خلافت وملوکیت، ص: ۳۸۰)

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ الفاظ حدیث «تَقْتُلُهُ الْفِئَةُ الْبَاغِيَةُ» حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب کے باغی ہونے پر نص نہیں، چنانچہ وہ اس کی ایک توجیہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

« ثُمَّ إِنَّ عَمَّارًا تَقْتُلُهُ الْفِئَةُ الْبَاغِيَةُ لَيْسَ نَصًّا فِي أَنَّ هٰذَا اللَّفْظَ لِمُعَاوِيَةَ وَ أَصْحَابِهٖ بَلْ يُمْكِنُ أَنَّهٗ أُرِيْدَ بِهٖ تِلْكَ الْعِصَابَةُ الَّتِيْ حَمَلَتْ عَلَيْهِ حَتّٰى قَتَلَتْهُ وَ هِيَ طَائِفَةٌ مِنَ الْعَسْكَرِ ، وَ مَنْ رَضِيَ بِقَتْلِ عَمَّارٍ كَانَ حُكْمُهٗ حُكْمَهَا ، وَ مِنَ الْمَعْلُوْمِ أَنَّهٗ كَانَ فِي الْعَسْكَرِ مَنْ لَمْ يَرْضَ بِقَتْلِ عَمَّارٍ كَعَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو ابْنِ الْعَاصِ وَغَيْرِهٖ بَلْ كُلُّ النَّاسِ كَانُوْا مُنْكِرِيْنَ لِقَتْلِ عَمَّارٍ حَتّٰى مُعَاوِيَةَ وَ عَمْرٍو.» [1]

''ممکن ہے اس سے مراد گروہ کے وہ افراد ہوں جنھوں نے حضرت عمار پر حملہ کر کے انھیں قتل کر دیا، اور وہ لشکر میں شامل تھے، نیز جو شخص عمار کے قتل پر راضی تھا اس کا حکم بھی ان جیسا ہوگا ورنہ یہ بات معلوم ہے کہ لشکر میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو عمار کے قتل پر راضی نہ تھے جیسے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ وغیرہ ہیں بلکہ سب لوگ

[1] فتاوىٰ ابن تيمية ، ج:٤ ، ص: ٢٢٦

عمار کے قتل کے منکر تھے یہاں تک کہ معاویہ رضی اللہ عنہ اور عمرو رضی اللہ عنہ بھی اس زمرہ میں شامل ہیں۔''
جہاں تک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کے مطالبہ کا تعلق ہے تو وہ مطالبہ فرد واحد کا نہیں تھا جو اقتدار کے لیے کوشاں ہو بلکہ ہر طرف سے اس کو عوامی تائید حاصل تھی۔ موصوف مذکور فرماتے ہیں کہ جب پوری مملکت میں مطالبہ قصاص کی آواز گونج رہی تھی جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے بحیثیت گورنر شام عوامی آواز کو عملی اقدام دینے کے لیے وجہ جواز پوری طرح موجود تھی لیکن پھر بھی ایسا نہیں کیا بلکہ ان کو گورنری طاقت استعمال کرنے پر خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مجبور کیا ورنہ بحیثیت گورنر انھوں نے کبھی نہ مطالبہ کیا۔ ان پر گورنری کی طاقت استعمال کرنے کا الزام اس وقت چسپاں ہوسکتا تھا اگر وہ مطالبے کے ساتھ یہ حکم بھی دیتے کہ مطالبہ پورا نہ ہونے کی صورت میں بذریعہ طاقت یہ مطالبہ پورا کیا جائے گا لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ پرامن طریقے سے مطالبہ قصاص کرتے رہے تاآنکہ انھیں طاقت استعمال کرنے پر مجبور کردیا گیا۔ ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ قصاص عثمان رضی اللہ عنہ کے مطالبہ میں کوئی سیاسی چال مضمر نہ تھی جس سے اقتدار چھڑانا مقصود ہو بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے رویہ سے حالات نے پلٹا کھایا۔ ما شاء اللّٰہ کان۔

قسطنطنیہ فتح کرنے والے کے لیے جنت کی بشارت والی حدیث کی تفصیل کیا ہے؟

سوال : قسطنطنیہ فتح کرنے والے کے لیے جنت کی بشارت والی حدیث کی تفصیل کیا ہے؟ حدیث کی کس کتاب میں ہے اور اس کی سند کیا ہے؟ نیز کیا اس حدیث کے پس منظر میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے جنت کی بشارت ہے؟

جواب : یہ حدیث صحیح بخاری کے بَابُ مَا قِیلَ فِی قِتَالِ الرُّومِ میں مرقوم ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« اَوَّلُ جَیْشٍ مِنْ اُمَّتِی یَغْزُوْنَ الْبَحْرَ قَدْ اَوْجَبُوْا » [1]

''میری امت کا پہلا لشکر جو سمندری غزوہ کرے گا، ان پر جنت واجب ہے۔''

علامہ عینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«أَرَادَ بِهٖ جَیْشَ مُعَاوِیَةَ.» [2]

''مقصود اس سے معاویہ کا لشکر ہے۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« قَالَ الْمُهَلَّبُ : فِیْ هٰذَا الْحَدِیْثِ مَنْقِبَةٌ لِمُعَاوِیَةَ لِأَنَّهٗ أَوَّلُ مَنْ غَزَا الْبَحْرَ وَ مَنْقِبَةٌ لِوَلَدِهٖ یَزِیدَ لِأَنَّهٗ أَوَّلُ مَنْ غَزَا مَدِیْنَةَ قَیْصَرَ » [3]

---

[1] صحیح البخاری، بَابُ مَا قِیلَ فِی قِتَالِ الرُّومِ، رقم:٢٩٢٤

[2] عمدة القاری:١٠/ ٢٤٣

[3] فتح الباری:٦/ ١٠٢

''اس حدیث میں حضرت معاویہ کی فضیلت ہے کیونکہ سب سے پہلے انھوں نے ہی بحری غزوہ کیا اور ان کے بیٹے یزید کی فضیلت ہے کیونکہ سب سے پہلے وہی مدینہ قیصر (قسطنطنیہ) پر حملہ آور ہوا۔''

ظاہر ہے کہ جب حدیث صحیح بخاری میں ہے تو بلاشبہ صحیح ہے۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: الاعتصام (۸/محرم الحرام ۱۴۱۸ھ، جلد: ۴۹، شمار: ۱۸) ۱۹۹۷ء م۔

قصۂ قرطاس کی حقیقت کیا ہے؟

سوال: اہل تشیع بخاری کی اس حدیث کو عموماً اپنے حق میں پیش کرتے ہیں کہ جس میں آپ ﷺ کی بیماری کے دوران یہ فرمانا کہ میرے پاس قلم دوات لے آؤ کہ میں آپ کو لکھ دوں مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہمیں قرآن کافی ہے۔ آپ ﷺ تو ہذیان میں ایسا کہہ رہے ہیں۔ اس سے اہل تشیع درج ذیل مسائل ثابت کرتے ہیں۔ (۱) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کا کہنا نہ مان کر گستاخی کی۔ (۲) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو ہذیان میں مبتلا کہہ کر گستاخی کی۔ آپ ﷺ کا ہذیان میں ہونا شان کے خلاف ہے۔ (۳) آپ ﷺ اپنے بعد خلافت کے بارے میں لکھنا چاہتے تھے۔ (۴) آپ ﷺ تو امّی تھے آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ لاؤ میں لکھ دوں؟ لہٰذا حدیث عقل و نقل کے خلاف ہے۔

جواب: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بطورِ شفقت صرف آپ ﷺ پر بیماری کے غلبہ کی وجہ سے روکا تھا۔ لہٰذا یہ گستاخی نہیں۔ علی سبیل التنزل اگر اس کو گستاخی تسلیم کر لیا جائے تو اس میں عمر رضی اللہ عنہ منفرد نہیں تھے بلکہ وہاں کئی ایک صحابہ و اہل بیت موجود تھے۔ وہ سب اس میں شریک ہوں گے۔ نیز تنہا عمر رضی اللہ عنہ پر الزام لگانا بے انصافی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کیوں نہ تحریر کروایا۔ جب کہ ان کو قربِ دامادی حاصل تھا۔ فتح الباری وغیرہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے۔ مجھے نبی ﷺ نے حکم دیا تھا کہ کوئی کاغذ لاؤ جو لکھا جائے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے روکنے سے آپ ﷺ کا رُک جانا منصبِ رسالت کے منافی ہے۔ جب کہ آپ پر تبلیغ فرض ہے۔

اس واقعہ کے بعد چند روز تک آپ زندہ رہے اگر کوئی ضروری تحریر ہوتی تو ضرور لکھوا دیتے۔

(۲) پہلی بات یہ ہے کہ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مقولہ نہیں۔ حدیث کی کسی کتاب میں اس امر کی تصریح موجود نہیں۔ دوسرا ہجر بمعنی ہذیان لینا غیر متبادر ہے۔ یہ لفظ جدائی کے معنی میں کثیر الاستعمال ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

﴿وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا﴾ (المزمل:۱۰)

دوسری آیت میں ہے: ﴿وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ﴾ (النساء:۳٤)

تیسری بات یہ ہے ہجر کے بعد استفھموہ کا لفظ موجود ہے جس کے معنی یہ ہیں۔ آپ سے پوچھو تو سہی کیا ارشاد فرماتے ہیں اگر ہجر کے معنی ہذیان کے لیے جائیں تو اِسْتَفْهَمُوْہ سے بے ربط اور بے کار ہو جاتا ہے جس کو ہذیان ہو گیا۔ اس سے پوچھنا خلافِ عقل ہے۔ ثابت ہوا ھَجَر یَھْجُرُ کے معنی جدائی کے ہیں نہ کہ ہذیان (فیصلہ حدیث قرطاس، ص:٦٩)

(۳) قصۂ قرطاس جمعرات کو پیش آیا۔ بروز سوموار آپ ﷺ کا انتقال ہوا۔ اس اثناء میں اگر خلافت کے بارے میں کوئی ضروری تحریر ہوتی تو آپ لکھوا سکتے تھے۔ یا فاتح خیبر حضرت علی رضی اللہ عنہ جراءت مندانہ اقدام کر کے لکھوا لیتے۔ بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد ان کے صاحبزادے حضرت حسن رضی اللہ عنہ امت کی مصلحت کے پیش نظر رضا کارانہ طور پر امورِ خلافت سے مستعفی ہو گئے تھے۔ یہ اس امر کی واضح دلیل ہے کہ استحقاقِ خلافت اہل بیت کے لیے متعین نہیں۔

(۴) کتابت کی نسبت آپ کی طرف بلحاظ آمر کے تھی۔ قصۂ صلح حدیبیہ میں بھی ایسے الفاظ موجود ہیں۔ وہ نسبت بھی حکم کے اعتبار سے ہے جب کہ فی الواقع کاتب حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔ اسی طرح معاملہ یہاں بھی سمجھ لینا چاہیے۔ اس میں ایسی کوئی شے نہیں جو عقل و نقل کے منافی ہو۔

قصۂ قرطاس میں لفظ اھجر کا صحیح مفہوم و مطلب کیا ہے؟

سوال: وفات سے چار دن پہلے نبی کریم پر بیماری کی شدت کی وجہ سے بحرانی کیفیت طاری ہو گئی تھی جس کے زیر اثر انھوں نے فرمایا کہ کاغذ قلم لاؤ میں میں ایسا لکھ دوں کہ تم کبھی گمراہ نہ ہو۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اَھْجَرَ (اعراب اسی فرقے کے بانی ڈاکٹر مسعود الدین عثمانی نے لگائے ہیں)

جواب: یہ لفظ صحیح اَھَجَرَ فعل ماضی ہے صورت سوال میں اعراب لگایا ہوا لفظ غلط ہے۔

کسی حدیث سے ثابت نہیں کہ لفظ ھَجَرَ یا یَھْجُرُ حضرت عمر فاروق کا قول ہو اور جن لوگوں نے اس کی نسبت ان کی طرف کی ہے وہ غلط ہے۔

بفرض محال اس کو ہم مان بھی لیں تو ھَجَرَ بمعنی ہذیان نہیں بلکہ بمعنی جدائی ہے۔ جو خاص محبت کا کلمہ ہے نہ کہ گستاخی کا، اور بالفرض ھَجَر بہ معنی ہذیان ہو تو ہمزہ استفہام کے ساتھ ہے اور یہ استفہام انکاری ہے، ترجمہ یہ ہے کہ نبی کو اختلاط تو نہیں ہوتا، دریافت کرو کیا فرماتے ہیں کیوں کہ نبی معصوم کا ارشاد بے مطلب نہ ہوگا۔

ممکن ہے کہ یہ قول اس جماعت کا ہو جو تحریر لکھوانے کی موید تھی اکثر روایات میں ہمزہ استفہام موجود ہے جن میں نہیں وہاں محذوف مانا جائے گا۔ ملاحظہ ہو، فتح الباری۔

امام نووی ''شرح مسلم'' میں فرماتے ہیں، صحیح بات یہ ہے کہ ہمزہ استفہام سب روایتوں میں ہے۔ اور جس روایت میں ہمزہ نہیں وہ ناقل کی غلطی ہے بغیر تحقیق کے اس نے ایسا کہہ دیا۔

اویس قرنی، تبریز، حلاج کے بارے میں معلومات:

سوال: اویس قرنی، شمس تبریز اور منصور حلاج کا اصل واقعہ اور اس کی گرفت قرآن و سنت سے کریں۔

(سائل) (۵ مئی ۱۹۹۵ء)

جواب: اویس قرنی کے فضائل و مناقب ''صحیح مسلم'' وغیرہ میں موجود ہیں، وہاں سے ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں، آپ نے اس کو خیر التابعین قرار دیا ہے۔ ساتھ یہ بھی فرمایا کہ « فَمُرُوهُ فَلْيَسْتَغْفِرْ لَكُمْ » [1]

یعنی ''اے میرے صحابہ رضی اللہ عنہم اس سے اپنے لیے دعا استغفار کرانا۔''

مشکوۃ کے حاشیہ پر ہے اس حدیث سے اویس قرنی کی بڑی عمدہ فضیلت ثابت ہوئی۔ اویس قرنی تابعین میں سے ہے۔ صحابی نہیں۔ ہر چند حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں موجود تھے۔ لیکن ماں کی خدمت سے فرست نہ پائی کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں حاضر ہوتے۔ اس حدیث سے اویس قرنی کی صحابہ پر فضیلت ثابت نہیں ہوتی۔ اس واسطے کہ تابعین اصحاب سے افضل نہیں ہوسکتا صرف دعا ثابت کرانے سے افضلیت نہیں ہوتی۔ اس واسطے کہ خود حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے واسطے بعضے لوگوں سے دعا کروائی ہے۔ بلکہ پانچوں وقت کی اذان میں تمام امت سے اپنے مقامِ محمود کے حاصل ہونے کے واسطے دعا کرنے کو فرمایا ہے۔ (حاشیہ غزنوی: ۵۴۸)

اس کے بارے میں بہت ساری بے بنیاد باتیں بھی مشہور ہیں۔ مثلاً اس نے سنا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض دانت مبارک جنگ احد میں شہید ہو گئے تو اس نے اپنے دانت توڑ لیے۔ صرف اس خیال پر شاید کہ فلاں دانت ہو یا فلاں ہو وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح شمس تبریز کے بارے میں بھی لوگ بہت ساری بے پر کی اڑاتے ہیں جن کا کوئی اصل نہیں اور پھر حسین بن منصور حلاج کا تو معاملہ ہی بڑا عجیب ہے۔ زندقہ کے الزام میں اس کو سولی پر چڑھا دیا گیا تھا۔

شیخنا محدث روپڑی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں کہتے ہیں: حسین بن منصور حلاج بڑا عابد تھا۔ ہر رات ہزار رکعت نفل پڑھتا۔ جب اس کی زبان سے أَنَا الْحَقُّ (میں خدا ہوں) کا کلمہ نکلا تو سید الطائفہ جنید بغدادی نے اور دوسرے بزرگوں نے اس کے قتل کا فتویٰ دے دیا۔ اور سولی پر کھینچ دیا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی ''أخبار الاخيار'' میں لکھتے ہیں کہ: خواجہ نظام الدین اولیاء سے لوگوں نے پوچھا کہ حسین بن منصور حلاج کا کیا حکم ہے؟ فرمایا: مردود ہے۔ جنید نے اس کو مردود لکھا۔ جنید اپنے زمانے کا پیشوا تھا۔ اس کا مردود کہنا سب کا مردود کہنا ہے۔

''اخبار الاخیار'' میں شاہ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے ذکر میں لکھا ہے کہ انھوں نے کہا کہ منصور کو کسی نے پایا کہ اس کی دست گیری کرتا اور جو اس کو غلطی لگی تھی اس سے اس کو روکتا۔ میں اس زمانے میں ہوتا تو اس کی دستگیری کرتا تاکہ وہ اس حد تک نہ پہنچتا۔ (فتاویٰ اہل الحدیث: ۱/۵۳)

بہر صورت ان کے بارے میں اس مختصر مجلس میں تفصیلی جائزہ پیش کرنا ممکن نہیں۔ موضوع ہذا پر محققین مولفین بے شمار کتابیں بازار میں دستیاب ہیں۔ حقیقت حال پر آگاہی کے لیے ان کی طرف رجوع کریں۔

[1] صحیح مسلم، بَابُ مِنْ فَضَائِلِ أُوَيْسٍ الْقَرَنِيِّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، رقم: ٢٥٤٢

اویس قرنی رحمہ اللہ کون تھا؟ کیا تھا؟

سوال: اویس قرنی رحمہ اللہ کون تھا؟ کیا تھا؟

۱۔ کیا اس کو رضی اللہ عنہ کہنا جائز ہے؟

۲۔ کیا اویس قرنی کی قبر بہاولپور میں ہے؟ (سائل: حاجی مشتاق احمد محمدی چک ..... بہاولپور) (۱۲ دسمبر ۱۹۹۷ء)

جواب: اویس قرنی یمن میں اللہ کا ایک نیک بندہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نشانیوں کے ساتھ اس کی آمد کی بشارت دی تھی۔ نیز فرمایا:

« فَمُرُوهُ فَلْيَسْتَغْفِرْ لَكُمْ » ❶

''یعنی اسے کہنا کہ تمھارے لیے بخشش کی دعا کرے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو خیر التابعین کے لقب سے بھی یاد فرمایا ہے۔

۱۔ عام طور پر لفظ رضی اللہ عنہم صحابہ پر بولا جاتا ہے۔ دیگر پر رحمہ اللہ اطلاق ہوتا ہے۔ لیکن بعض لوگ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد آنے والے لوگوں پر بھی وسعت کے اعتبار سے رضی اللہ عنہ کا اطلاق کر دیتے ہیں جو محل نظر ہے۔

۲۔ مذکورہ بالا اوصاف سے متصف اویس قرنی کی قبر تاریخی طور پر بہاولپور میں ثابت نہیں ہو سکی۔ ممکن ہے موجود صاحبِ قرآن کا ہم نام کوئی اور ہو۔

حضرت اویس قرنی صحابی ہیں یا تابعی؟

سوال: اویس قرنی کیا صحابی تھے یا تابعی تھے؟ ان کی والدہ کی اجازت والا واقعہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ان کے لیے اشیاء دینے کا واقعہ اس کی وضاحت فرما دیں؟ (شیخ عبداللہ، سنت نگر، لاہور) (۲۶ اپریل ۲۰۰۲ء)

جواب: اویس قرنی خیر التابعین سے ہیں ان کا اصل قصہ ''صحیح مسلم'' وغیرہ میں موجود ہے اور بہت ساری باتیں ان کی طرف غلط منسوب ہیں جن سے مشارٌ الیہ یہ قصے بھی ہیں۔

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کتنی عمر میں وفات پائی؟

سوال: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی حضرت فاطمہ نے کتنی عمر میں وفات پائی؟ (سائل)

جواب: حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ پیدائش میں اختلاف ہے۔

ابوجعفر باقر کا کہنا ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۳۵ سال تھی اور کعبہ زیر تعمیر تھا۔ جب فاطمہ رضی اللہ عنہا پیدا ہوئی اور عبید اللہ بن محمد بن سلیمان بن جعفر ہاشمی کا قول ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ۴۱ سال تھی جب فاطمہ رضی اللہ عنہا کی ولادت ہوئی۔ بعثت سے ایک سال یا

❶ صحیح مسلم، بَابُ مِنْ فَضَائِلِ أُوَيْسٍ الْقَرَنِيِّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ، رقم:۲٥٤۲

کچھ زیادہ عرصہ پہلے ولادت ہوئی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے قریباً پانچ سال بڑی تھیں۔ ۲ھ اوائل محرم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ان کا نکاح ہوا۔ اور تاریخ وفات بقول واقدی منگل کی رات ۳ رمضان المبارک ۱۱ ہجری ہے۔ [1]

امیر معاویہ کے ایک قول کی تصدیق

سوال: حضرت امیر معاویہ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے فرمایا تھا کہ میری آل میں میرا دشمن ہوگا۔ کیا یہ صحیح ہے؟ (آپ کا دینی بھائی، محمد اسماعیل) (۸ مئی ۱۹۹۸ء)

جواب: میری نظر سے ایسی کوئی نص صریح نہیں گزری۔

کیا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا دور بھی خلافتِ راشدہ میں شمار کیا جا سکتا ہے؟

سوال: کیا حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا دور بھی خلافتِ راشدہ میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

(محمد جہانگیر پوٹھ شیر ڈیال میر پور کے۔اے) (۲۶ دسمبر ۱۹۹۷ء)

جواب: حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ خلیفہ ہی نہیں بنے لہٰذا ان کے عہد کو خلافتِ راشدہ میں شامل کرنا چہ معنی دارد؟

سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ کو امام کہنا درست ہے؟

سوال: ہمارے مولوی صاحب سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو امام کہنے سے منع کرتے ہیں اور کہتے ہیں امام حسن رضی اللہ عنہ کہنا جائز ہے۔ امام حسین علیہ السلام کہنا جائز نہیں ہے کیونکہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ امت کے امام نہیں بنائے گئے۔ کیا مولوی صاحب کا کہنا ٹھیک ہے؟ جو مولوی صاحب یہ کہتے ہیں اُن کی اقتداء کرنی چاہیے یا نہیں؟

(ابوحنظلہ محمد محمود علوی، ضلع اوکاڑہ) (۱۵ مئی ۱۹۹۸ء)

جواب: مولوی صاحب کا مقصد یہ ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ چونکہ خلافت پر متمکن ہوئے تھے۔ اس لیے وہ امام ہیں اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ خلیفہ نہیں بنے۔ اس لیے وہ امام نہیں لیکن بمعنی اعم پیشوا کے طور پر امام کا اطلاق ہو جائے تو وجہِ جواز ہے۔ جس طرح کہ بیشتر افرادِ امت پر اس کا اطلاق ہے۔ امام موصوف کی اقتداء میں نماز ادا کرنی چاہیے کیونکہ یہ نظریہ قابلِ مؤاخذہ نہیں۔ اگرچہ مزید اس میں وسعت ہونی چاہیے۔ کما تقدم انفاً۔

بسلسلہ شہادت حسین چند سوالات کے جوابات

سوال: حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کروانے والے کون تھے؟ اور وہ کیا چاہتے تھے؟ (ناصر محمود لوہیانوالہ۔ گوجرانوالہ) (۲۳ مئی ۱۹۹۷ء)

---

[1] الاصابة لابن حجر: ٤/ ٣٦٥

جواب : خلفاء راشدین ثلاثہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت میں ملوث مجوسی، یہودی، خوارج اور روافض تھے، ان لوگوں کا اہم ترین مقصد تخریب کاری کے ذریعہ اسلام کے کلمہ وحدت اور مجتمع قوت کو پارہ پارہ کرنا تھا تاکہ اسلام کی اشاعت اور تعمیر وترقی میں ہر ممکن رکاوٹ کھڑی کی جا سکے لیکن اللہ رب العزت کا وعدہ برحق ہے۔

﴿ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ یَاْبَى اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ﴾ (التوبة: ٣٢)

''یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے (پھونک مار کر) بجھا دیں اور اللہ تعالیٰ انکاری ہے، مگر اسی بات کا کہ اپنا نور پورا کرے۔ اگرچہ کافروں کو برا ہی لگے۔''

سوال : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امیر المؤمنین یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کو جنتی کیوں کہا؟

(ناصر محمود لوہیانوالہ۔ گوجرانوالہ) (۲۳ مئی ۱۹۹۷ء)

جواب : کسی صحیح حدیث میں اس بات کی تصریح نہیں کہ نصاً رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یزید بن معاویہ کو جنتی قرار دیا ہو۔ البتہ بعض شارحین نے فرمانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:

« اَوَّلُ جَیْشٍ مِنْ اُمَّتِیْ یَغْزُوْنَ مَدِیْنَةَ الْقَیْصَرِ مَغْفُوْرٌ لَّهُمْ » ❶

یعنی میری امت کا پہلا لشکر جو مدینہ قیصر یعنی قسطنطنیہ پر حملہ آور ہوگا انھیں معاف کیا ہوا ہے۔''

سے یہ سمجھا ہے کہ یہ وہی غزوہ ہے جو ۵۲ ہجری میں یزید کی قیادت میں ہوا تھا۔ ❷

جب کہ مدینہ قیصر پر اس سے پہلے بھی ایک غزوہ ہو چکا تھا۔ اور وہ غزوہ ہے جو حضرت عبدالرحمٰن بن خالد بن الولید کی قیادت میں ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو سنن ابوداؤد، باب فی قوله تعالیٰ ﴿ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ لیکن اس میں یہ شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ جامع ترمذی کی روایت میں عبدالرحمٰن کی بجائے فضالہ بن عبید کا ذکر ہے۔ ان کا انتقال سن ۵۸ میں ہوا۔ اس صورت میں امکان موجود ہے کہ غزوہ ہذا سن ۵۲ ہجری کے بعد ہوا ہو، لیکن حضرت عبدالرحمٰن کا انتقال سن ۵۲ ہجری سے قریباً پانچ سال قبل ہوا ہے۔ اس صورت میں یہ غزوہ حتمی طور پر سن ۵۲ ہجری سے پہلے ہوگا۔

سوال : حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو کوفہ سے کیوں روکا؟

(ناصر محمود لوہیانوالہ۔ گوجرانوالہ) (۲۳ مئی ۱۹۹۷ء)

جواب : حالات کی نزاکت کے پیش نظر احباب نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو سفر کوفہ سے روکا۔ کوفیوں کی بیوفائی سب کے

❶ صحیح البخاری، باب ما قیل فی قتال الروم، رقم: ٢٩٢٤

❷ فتح الباری: ٦/ ١٠٢۔١٠٣

ہاں عیاں تھی۔ اس سے پہلے شہادتِ علی رضی اللہ عنہ کا سانحہ اور حضرت مسلم بن عقیل سے ان کی بدسلوکی سے سب واقف تھے۔ یہاں تک کہ بعد میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بذاتِ خود بھی واپسی کی چاہت کا اظہار کرنا پڑا۔ اور فرمایا تھا: «خَذَ لَنَا شِيْعَتَنَا» (کتاب خلاصة المصائب شيعه) یعنی ہمارے شیعہ نے ہم کو ذلیل کیا ہے۔

اسی کتاب میں مزید مرقوم ہے یعنی وہ امام کے قتل کرنے والے سب کوفی تھے۔ ان میں نہ کوئی شامی تھا اور نہ کوئی حجازی۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ وَ کَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا کا ظہور عظیم سانحہ کربلا کی شکل میں امتِ مسلمہ کے لیے مصائب و تکالیف کا سبب بن گیا جس کا مداوا قیامت تک نہ ہو سکے گا۔

سوال: امیر یزید کے ہاتھ مبارک پر جلیل القدر اور خانوادہ نبوت کے کتنے افراد نے بیعت کی؟

(ناصر محمود لوہیانوالہ۔ گوجرانوالہ) (۲۳ مئی ۱۹۹۷ء)

جواب: ظاہر یہ ہے کہ باقی ماندہ سب نے یزید سے عہدِ وفا کر لیا تھا کیونکہ شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ کے بعد سفر شام میں سبھی حضرات راضی خوشی واپس آئے تھے حتی کہ خود حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی قبل ازیں یزید سے بیعت کی خواہش کر چکے تھے۔ جملہ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ طبری وغیرہ۔

شہادت حسین رضی اللہ عنہ کی ایک روایت کی تحقیق

سوال: گزارش یہ ہے کہ شہادت حسین رضی اللہ عنہ کے ضمن میں درج ذیل روایت کی تحقیق مقصود ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے ایک دن دوپہر کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بال بکھرے اور گرد آلود ہیں، آپ کے ہاتھ میں خون کی ایک بوتل ہے میں نے کہا میرے ماں باپ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان ہوں یہ کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ حسین رضی اللہ عنہ اور اس کے ساتھیوں کا خون ہے اسے میں صبح سے اکٹھا کر رہا ہوں۔ پھر میں نے اس وقت کو یاد رکھا تو معلوم ہوا کہ اسی وقت وہ شہید ہوئے تھے۔[1]

① ...... کیا یہ روایت صحیح ہے؟ سنداً، درایتاً

② ...... ابن عباس رضی اللہ عنہ زندہ ہیں ان کو بعد میں معلوم ہوتا ہے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بحالت فوتگی (قبر مبارک سے کربلا تک گرد آلود ہو کر جانا) حسین رضی اللہ عنہ کے کربلا کے سفر کی خبر ہو جانا، پھر بنفس نفیس وہاں خون اکٹھا کرنا کیسے ممکن ہے؟

③ ...... کیا یہ قرآنی عقیدۂ اموات کے خلاف نہیں ہے؟

④ ...... اس روایت سے تو بریلوی، دیوبندی عقیدہ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دنیاوی حیات) ثابت ہوتا ہے۔ صرف حیات ہی نہیں بلکہ ہر ہر اعمال کی خبر اور وہاں مدد مقصود ہو تو پہنچنا وغیرہ باطل عقائد کا ثبوت فراہم ہو رہا ہے۔ قرآن وحدیث

[1] مظاهر حق قديم، ج:٥، ص:٧٣٨۔ مشكوٰة المصابيح، ج:٢، ص:٦١٧۔ بحواله دلائل النبوة البيهقي: ٦/ ٤٧١۔ مسند احمد: ١/ ٢٤٢

سے جواب دے کر عنداللہ ماجور ہوں۔ (سائل: سراج احمد، اٹک) (یکم جون ۲۰۰۷ء)

جواب: مندرجہ بالا روایت صحیح ہے لیکن یہ واقعہ خواب کا ہے غیر نبی کی خواب سے شرعی احکام ثابت نہیں ہوتے۔ بحالت خواب آدمی بعض دفعہ وسیع و عریض مناظر کا مشاہدہ کرتا ہے جس کا احاطہ کرنا بحالت بیداری ناممکن ہوتا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ اگرچہ زندہ ہیں لیکن بیان کردہ منظر تو خواب کا ہے جو اثبات شریعت کے لیے قابل حجت نہیں۔ لہٰذا مذکورہ قصہ یہ کوئی ایسی شے نہیں جس پر استعجاب کا اظہار کرکے قرآنی عقیدہ اموات کے خلاف قرار دیا جاسکے۔ حقیقت یہ ہے کہ خوابی اور برزخی مناظر و مشاہدات سے دنیاوی احکام ثابت کرنا کم عقلی ہے۔ ذی علم اور فہم و فراست کے حاملین کا شیوہ نہیں کیوں کہ وہ تعبیر خواب اور تعبیر شریعت کے تفاوت کو ملحوظ رکھ کر میزانِ عدل کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ پھر اس سے باطل عقیدہ کو ثابت کرنے کی سعی وہی شخص کرے گا جو شرعی احکام سمجھنے سے قاصر ہے۔ واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم۔

شیعہ ہمسائے کی طرف سے لغویات سے بھرپور کتابچہ کی استنادی حیثیت:

سوال: ایک شیعہ ہمسائے نے ایک کتابچہ مجھے لاکر دیا جس میں کئی ایک لغویات کے علاوہ یہ حدیث بھی درج تھی: «قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ يَا عَلِيُّ اَنْتَ وَ شِيْعَتُكَ هُمُ الْفَائِزُوْنَ» ''اے علی رضی اللہ عنہ! تو اور تیرے شیعہ جنتی ہیں۔'' اس کی استنادی حیثیت سے مطلع فرمائیں۔ جزاکم اللہ خیرا۔

(پروفیسر سعید احمد لکھوی) (۲۳ جون ۲۰۰۰ء)

جواب: مشارٌ الیہ روایت کی کوئی اصل نہیں۔ مناقب علی رضی اللہ عنہ میں اکثر روافض کی وضعی روایات ہیں۔ جن کی کوئی اصل نہیں۔ اَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهَا۔

مدینہ قیصر پر حملہ آور پہلا لشکر جس کے لیے مغفرت کا وعدہ ہے وہ کونسا ہے؟

سوال: «اَوَّلُ جَيْشٍ مِنْ اُمَّتِيْ يَغْزُوْنَ مَدِيْنَةَ الْقَيْصَرِ مَغْفُوْرٌ لَّهُمْ» (بخاری) مذکورہ بالا حدیث کی اسنادی حیثیت بیان فرمائیں اور اس حدیث کے مطابق پہلا کمانڈر جیش مغفور کا کون ہے؟ بعض علماء اعتراض کرتے ہیں کہ کمانڈر اول پہلے نیک تھا مگر بعد میں بدچلن، شرابی، زانی صفات کا حامل بن گیا۔ اس لیے وہ مغفرت کی بشارت سے محروم ہے۔ کیا یہ اصول صحیح ہے؟ کیا لسانِ نبوت سے کسی کو مستحسن فعل پر جنت کی بشارت مگر اُس کو فعلِ بد کی صورت میں دوزخ کی وعید؟ (محمد سفیان۔ شیخوپورہ) (۱۶ مئی ۱۹۹۷ء)

جواب: مشارٌ الیہ روایت صحیح ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کو اپنی ''صحیح میں'' «بَابُ مَا قِيلَ فِي قِتَالِ الرُّوْمِ» کے تحت بیان فرمایا ہے۔ لیکن اس میں اوّلیت کے اعتبار سے کسی شخص کا تعین نہیں۔ البتہ شارح ''صحیح بخاری'' المھلب نے

اس کا مصداق ''یزید بن معاویہ'' کو قرار دیا ہے۔لیکن واقعاتی طور پر مدینہ قیصر پر پہلے حملہ آور ہونے والے لشکر کا قائد عبدالرحمٰن بن خالد بن الولید تھا، جس کا تذکرہ ''سنن ابی داؤد'' میں موجود ہے۔اس کے باوجود کئی ایک مؤرخین نے اس کا مصداق لشکر یزید بن معاویہ رضی اللہ عنہ کو سمجھا ہے۔جس میں صحابہ رضی اللہ عنہم بھی اس کی قیادت میں شامل تھے۔لیکن اس کی طرف منسوب مذکورہ مطاعن وعیوب کا اثبات مشکل امر ہے۔ بلکہ بعض کتب تاریخ میں اس کے برعکس موجود ہے۔کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مصاحبِ خاص حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خبرِ وفات سن کر اپنے حلقے کے لوگوں کو یزید کی بیعت کرنے کی تاکید کی اور یزید کے صالح ہونے کی گواہی دی۔

«اِنَّ ابْنَهُ يَزِيْدَ لَمِنْ صَالِحِي اَهْلِهٖ فَالْزَمُوْا مَجَالِسَكُمْ وَ اَعْطُوْا طَاعَتَكُمْ وَ بَيْعَتَكُمْ.»[1]

بنابریں مذکور اصول بے بنیاد ہے جس کی کوئی اصلیت نہیں۔

یزید بن معاویہ کے لیے ''رحمۃ اللہ علیہ'' کہہ سکتے ہیں؟

سوال : سیدنا یزید رحمہ اللہ کہہ سکتے ہیں؟ ،حضرت حسین کا قاتل کون تھا؟ (ابو حنظلہ محمد محمود علوی) (۱۳ جون ۱۹۹۷ء)

جواب : بعض کے نزدیک دعاءِ ترحّم (رحمت کی دعا) کا جواز ہے جب کہ دیگر متوقف ہیں۔حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے قاتل کے نام میں اختلاف ہے۔ بقول خلیفہ بن خیاط قاتل کا نام شمر بن ذی الجوشن ہے۔اور مصعب نے اس کا نام سنان بن ابی سنان ذکر کیا ہے۔[2]

یزید بن معاویہ کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ کہنا

سوال : ہمارے مولوی صاحب یزید بن معاویہ کو رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کیا یزید کے لیے سیدنا یزید اور رحمۃ اللہ علیہ کہنا جائز ہے یانہیں؟ (ابو حنظلہ محمد محمود علوی، ضلع اوکاڑہ) (۱۵ مئی ۱۹۹۸ء)

جواب : یزید کے بارے میں تین طرح کے لوگ ہیں ، کچھ عقیدت کا اظہار کرتے ہیں اور کچھ تکفیر وتفسیق کے قائل ہیں اور تیسرا نظریہ ہے:«لَا نُحِبُّهُ وَ لَا نُبْغِضُهُ.» ''ہمیں نہ اس سے پیار ہے اور نہ بغض۔معاملہ اللہ پر چھوڑتے ہیں۔۔ میرے خیال میں زیادہ سلامتی والا مسلک یہی ہے۔

یزید بن معاویہ کو دانستہ یا نادانستہ گالیاں اور برا بھلا کہنا

سوال : کچھ حضرات دانستہ یا نادانستہ یزید بن معاویہ کو گالیاں دیتے اور برا بھلا کہتے ہیں، جب کہ میں نے ایک اہل

---

1. انساب الاشراف، قسم: دوم، بص:٤، طبع یروشلم:١٩٤٠ء) بحوالہ خلافت و ملوکیت :٤٥
2. الاستیعاب مع الاصابة:١/ ٣٧٩

حدیث عالم سے سنا ہے کہ وہ ایک غزوہ میں شریک تھے۔ مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کے نبی ﷺ نے فرمایا: کہ جتنے صحابی بھی جنگ میں شریک ہیں۔ وہ سب جنتی ہیں۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب دیں؟

(سیف اللہ سلفی۔ ضلع قصور) (۹ جون ۲۰۰۰ء)

جواب: یزید کے بارے میں تین قسم کی آراء ہیں:

۱۔ بعض لوگ اسے اچھا سمجھتے ہیں۔

۲۔ دوسرے وہ جو اُسے شراب کبابی کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بہت ساری بے بنیادی باتیں اس کی طرف منسوب ہیں۔ شرابی کبابی ہونا بھی ان میں سے ایک ہے۔ مستند حوالوں سے یہ بات ثابت نہیں ہوسکی۔

۳۔ تیسرا مسلک یہ ہے کہ ہمیں اس سے نہ پیار ہے نہ بغض۔ اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ زیادہ احتیاط والی بات یہی ہے۔ (وَاللّٰهُ سُبْحَانَهُ وَتَعَالٰى اَعْلَمُ.)

ہاں ''صحیح بخاری'' میں سب سے پہلے مدینۂ قیصر پر حملہ آور کے لیے بشارت ضرور ہے لیکن اس میں زبانِ نبوت سے یزید کا تعین نہیں۔ البتہ بعض شارحین نے اس کا مصداق یزید کو قرار دیا ہے۔ جو بحث کا متقاضی ہے۔ تفصیلی بحث پہلے ''الاعتصام'' میں ہوچکی ہے۔ تکرار کی ضرورت نہیں۔

تلاوتِ قرآن اور ذکر و اذکار

قرآن مجید سننے کے آداب

سوال : محفل قراءت قرآن میں جب قاری صاحب تلاوت کرتے ہیں تو سامعین حضرات اونچی آواز سے اللہ اللہ کہہ کر قاری صاحب کو داد دیتے ہیں۔قرآن وسنت کی رُو سے اس کی کیا حیثیت ہے اور کہاں تک اس کی گنجائش ہے؟ (۲) کیا قراء کرام کا اختتام تلاوت پر ''صدق اللہ العظیم'' قسم کے الفاظ کہنا جائز ہے؟ (۳) اسی طرح جب قاری صاحب آیاتِ عذاب یا آیاتِ انعام تلاوت کرتے ہیں تو کیا سامعین اس کا جواب دے سکتے ہیں؟ اگر دے سکتے ہیں تو سرّا ہونا چاہیے یا جہراً؟ نیز حالتِ نماز میں اس کا کیا حکم ہے؟ (محمد اسلم صدیق، لاہور) (۵۔ اکتوبر ۲۰۰۱ء)

جواب : تلاوت کے دوران اللہ، اللہ کہہ کر داد دینے کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں، بلکہ عمل ہذا نص قرآنی ﴿وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾(الاعراف:۲۰۴)''اور جب قرآن پڑھا جائے تو توجہ سے سنا کرو اور خاموش رہا کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔'' کے خلاف ہے۔اصل بات یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو معانی و مفاہیم سے ناواقفیت کی بناء پر الفاظِ قرآن سے لذت و سرور حاصل ہی نہیں ہوئے بلکہ ان کی لطف اندوزی اور قاری کی نغمہ سرائی پر موقوف ہے،اس کی حسین وجمیل آواز پر مر مٹنے والے ہیں اگرچہ اچھی آواز بھی مطلوب امر ہے۔لیکن امام مناوی فرماتے ہیں کہ قرآنی حروف کی ادائیگی میں ان کی حدود سے تجاوز کرنا حرام ہے۔عامۃ الناس کی دلچسپی کا حال یہ ہے کہ اگر کوئی سادہ آواز میں قرآن پڑھتا ہے۔تو تلاوت سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے بلکہ نفرت کا اظہار کرتے ہیں جب کہ قرآن میں مومنوں کے اوصاف یوں بیان ہوئے ہیں:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ اِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ

إِيمَانًا ﴾ (الانفال: ۲)

''مومن تو وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب انھیں اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے۔''

نیز فرمایا:

﴿تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ إِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴾ (الزمر: ۲۳)

''جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں ان کے بدن کے تو اس (قرآن) سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں پھر ان کے بدن اور دل نرم (ہو کر) اللہ کی یاد کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، یہی اللہ کی ہدایت ہے وہ اس سے جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جس کو اللہ گمراہ کرے اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہے۔''

صحیح حدیث میں موجود ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر تلاوتِ قرآن پیش کی۔ کہا:

«قَالَ أَمْسِكْ. فَإِذَا عَيْنَاهُ تَذْرِفَانِ. »[1]

''میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دونوں آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ تلاوتِ قرآن کرنے یا سننے کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے اثرات انسان کے دل و دماغ پر ظاہر ہوں نہ کہ اللہ، اللہ، کمال کمال، یا استاذ هيه هيه کہہ کر خانہ پُری کی جائے اس سے اجتناب انتہائی ضروری ہے۔[2]

(۲) قراءت کے اختتام پر ''صدق اللہ العظیم'' کہنا کتاب و سنت سے ثابت نہیں۔ ''صحیح بخاری'' وغیرہ میں حدیث ہے:

« مَنْ اَحْدَثَ فِيْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ »[3]

''یعنی جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے۔''

متعدد صحابہ کرام کی تلاوت کے تذکرے احادیث کی کتابوں میں مرقوم ہیں لیکن کسی ایک سے بھی یہ کلمات ثابت نہیں ہو سکے۔ اگر کوئی کہے کہ قرآن میں ہے: ﴿قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ﴾(آل عمرٰن:۹۵) تو جواب اس کا یہ ہے کہ اللہ کا فرمان اپنی جگہ برحق ہے لیکن اس میں یہ کہاں ہے کہ جب تم تلاوت ختم کرو تو یہ کہو ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی تلاوت سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: «حَسْبُكَ»[4] ''تیرے لیے یہ کافی ہے۔'' یہ نہیں فرمایا: «صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْم» اور نہ ابن مسعود

---

[1] صحیح البخاری، باب ﴿فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ......الخ﴾، رقم: ٤٥٨٣

[2] السنن والمبتدعات، ص: ۲۱۹/ ۲۲۰

[3] صحیح البخاری، بَابُ إِذَا اصْطَلَحُوا عَلَى صُلْحِ جَوْرٍ فَالصُّلْحُ مَرْدُودٌ، رقم: ٢٦٩٧

[4] صحیح البخاری، بَابُ قَوْلِ الْمُقْرِئِ لِلْقَارِئِ حَسْبُكَ، رقم: ٥٠٥٠

نے یہ الفاظ کہے: لہٰذا اس سے بھی احتراز از بس ضروری ہے۔

(۳) سامع یا مقتدی کا قاری کی تلاوت میں بعض آیات کا جواب دینا سنت صحیحہ سے ثابت نہیں ہے، ہاں البتہ قاری یا امام کے لیے ثابت ہے۔ چنانچہ ''صحیح مسلم'' میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ رسولِ اکرم ﷺ سے رات کی نماز کی کیفیت نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ جب کسی ایسی آیت سے گزرتے جس میں تسبیح کا ذکر ہوتا تو تسبیح کرتے اور جب سوال (والی آیت) سے گزرتے تو سوال کرتے اور جب تعوذ (والی آیت) سے گزرتے تو پناہ پکڑتے۔

عمیر بن سعید سے روایت ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے نمازِ جمعہ میں ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى﴾ پڑھنے پر «سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی» کہا۔ [1] اس اثر کی سند صحیح ہے۔

اسی طرح حضرت علی سے بھی اس موقع پر یہی کلمات کہنا بسند حسن ثابت ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: القول المقبول فی تخریج و تعلیق صلوٰۃ الرسول ﷺ اس موضوع پر عرصہ قبل ماہ نامہ ''محدث'' میں میرا ایک تفصیلی فتویٰ جواب در جواب کی صورت میں شائع ہو چکا ہے امید ہے کہ اربابِ ذوق کے لیے وہ کافی مفید ہوگا۔

قراءت قرآن (تلاوتِ قرآن) سے قبل تعوذ کے مسنون الفاظ

سوال: قراءت سے قبل تعوذ کے مسنون الفاظ جو صحیح حدیث سے ثابت ہیں، ذکر فرمائیں؟

جواب: قراءت سے قبل ''تعوذ'' کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں: «أَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ.» یا یوں پڑھیں: «أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ مِنْ نَفْخِهٖ وَ نَفْثِهٖ وَ هَمَزِهٖ.» اور الفاظ «أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ.» مرفوع متصل سند سے ثابت نہیں، روایت مرسل ہے۔

سوال: الاعتصام کی گزشتہ اشاعت میں آپ نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ تعوّذ کے الفاظ «أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ.» مرفوع روایت سے ثابت نہیں، البتہ مرسل طریق سے ثابت ہیں۔ جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ مثلاً ''بخاری و مسلم شریف'' میں واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ:

« اِسْتَبَّ رَجُلَانِ عِنْدَ النَّبِيِّ ﷺ فَجَعَلَ اَحَدُهُمَا يَغْضَبُ، وَ يَحْمَرُّ وَجْهُهٗ، وَ يَنْتَفِخُ اَوْدَاجُهٗ فَنَظَرَ اِلَيْهِ النَّبِيُّ ﷺ. فَقَالَ: اِنِّيْ لَاَعْلَمُ كَلِمَةً لَوْ قَالَهَا، لَذَهَبَ ذَاعَنْهُ. اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ.» انتهی

اس کے علاوہ ''سورۂ نحل'' کی آیت کریمہ ﴿ فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ﴾ (پ:١٤) میں ارسال وغیرہ کا سوال نہیں۔ مزید برآں اگر یہ سوال ہو کہ ''صحیحین'' والے واقعہ اور قرآنی آیت میں نماز کا

[1] السنن الکبرٰی للبیهقی، بَابُ الْوُقُوفِ عِنْدَ آيَةِ ......الخ، رقم:٣٦٩٤ (٢/ ٣١١)، مصنف عبدالرزاق: ٢/ ٤٥١

ذکر نہیں تو اس کا جواب امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَلَا شَكَّ اَنَّ الْاٰيَةَ تَدُلُّ عَلٰى مَشْرُوْعِيَةِ الْاِسْتِعَاذَةِ قَبْلَ الْقِرَاءَةِ، وَ هِيَ اَعَمُّ مِنْ اَنْ يَكُوْنَ خَارِجَ الصَّلٰوةِ، اَوْ دَاخِلَهَا.» [1]

نیز مفسرین کرام، مثلاً حافظ ابن کثیر، الجامع لأحکام القرآن قرطبی، امام بغوی، خازن، درمنثور، وحیدی، تفہیم القرآن، تفسیر عثمانی، ترجمہ وتفسیر مولانا عبدالستار دہلوی اور اگر امام شوکانی رحمہ اللہ کی تائید کو شامل کرلیا جائے تو « تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ » یہ سب مفسرین «أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ فِي الصَّلٰوةِ.» کے قائل ہیں اور جو ''تعوذ'' آپ نے ''سنن'' وغیرہ سے تحریر فرمایا ہے۔ وہ بھی مسنون ہے۔ بہرحال اگر میری رائے میں کوئی غلطی ہو تو آپ اصلاح فرمادیں۔

جواب: محترم مولانا عبدالواحد اظہر حفظہ اللہ بعد از سلام گزارش ہے، کہ میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے میرے فتویٰ پر نقد فرمایا: جزاکم اللہ خیراً۔ عرض ہے بلاشبہ ''تعوذ'' کے الفاظ «أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ.» خارجِ نماز ثابت ہیں۔ جس طرح کہ ''صحیحین'' کے مذکورہ قصہ میں ''نص'' موجود ہے۔ اگر میں نے نفی عام کردی ہے تو مجھ سے ذھول ہوا ہے۔ ''سورۃ النحل'' کی آیت کریمہ میں وارد الفاظ کا تو کوئی بھی انکار نہیں کرتا۔ ''تعوذ'' کی جملہ شکلوں میں یہ الفاظ موجود ہیں۔ یہاں صرف یہ مسئلہ زیرِ بحث ہے، کہ بطورِ نصِ نبوی نماز میں کونسے کلماتِ تعوذ ثابت ہیں۔ جواب اس کا یہ ہے، کہ جبیر بن مطعم (رضی اللہ عنہ) کی روایت میں ہے:

« أَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ مِنْ نَفْخِهٖ، وَ نَفْثِهٖ وَ هَمْزِهٖ.»

اور سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے: « أَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ مِنْ هَمْزِهٖ، وَ نَفْخِهٖ، وَ نَفْثِهٖ.» لیکن « أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ » کلمات والی روایت مرسل حسن ہے۔ ملاحظہ ہو! التلخیص الحبیر: ۱/ ۲۳۰.

اور امام شوکانی رحمہ اللہ نے جو کچھ بیان فرمایا ہے: اس کا مفہوم تو صرف یہ ہے، کہ قراءت سے قبل ''استعاذہ'' مشروع ہے، بحالتِ نماز ہو یا اس کے علاوہ۔ اس کا تو کوئی بھی انکار نہیں کرتا۔ سبھی مشروعیت کے قائل ہیں۔ پھر ظاہر ہے، جملہ مفسرین کے اقوال بھی نصِ شریعت کے تابع ہونے چاہئیں۔ علیحدہ ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ مزید کوئی ملاحظات ہوں تو مستفید فرمائیں۔ شکریہ۔

قراءتِ قرآن کا مسنون طریقہ

سوال: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قراءت ہمیشہ ٹھہر ٹھہر کر اور ہر آیت پر وقف کے ساتھ ہوتی تھی۔ یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے تیز

[1] نیل الأوطار: ۴/ ۲۰۵

قراءت کرنا اور بعض آیات پر وقف نہ کرنا بھی ثابت ہے۔ (السائل: ع۔ح۔فیصل آباد) (٦ مارچ ١٩٩٨ء)

جواب: ہر آیت کو جدا جدا پڑھنا چاہیے۔ ملاحظہ ہو ''سنن ابی داؤد''۔

علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«قُلْتُ وَ هٰذِهِ سُنَّةٌ اَعْرَضَ عَنْهَا جَمْهُوْرُ الْقُرَّاءِ فِي هٰذِهِ الْاَزْمَانِ فَضْلًا عَنْ غَيْرِهِمْ.» ❶

''یعنی اس سنت سے اکثر قاریوں نے منہ موڑ رکھا ہے، چہ جائیکہ دیگر اس کا لحاظ رکھیں۔''

اور بعض آیات پر وقف نہ کرنے کا کوئی ثبوت نہیں۔

تلاوتِ قرآن کس طرح کی جائے؟

سوال: محترم حافظ صاحب۔ السلام علیکم!

کیا قرآن کی صرف تلاوت ہی کی جاسکتی ہے یا اسے غور وفکر کے نقطۂ نظر سے عام کتاب کی طرح خاموشی سے بھی پڑھا جا سکتا ہے کہ آدمی کے ہونٹ نہ ہلیں۔ اکثر خواہش پیدا ہوتی ہے کہ قرآن کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے دوسری کتابوں کی طرح خاموشی سے بار بار پڑھا جائے کہ الفاظ کے معنی بھی سمجھ میں آئیں۔ میری عادت ہے کہ اونچی آواز سے یا لب ہلا کر پڑھنے سے سمجھ نہیں آتی۔ اور فقرے (آیات) ذہن نشین نہیں ہوتے۔ ازراہِ کرم تفصیل سے روشنی ڈالیں۔ (احمد فیاض۔گوجرانوالہ) (٢٤ دسمبر ١٩٩٩ء)

جواب: قرآن مجید کی تلاوت بہ آوازِ بلند اور آہستہ دونوں طرح درست ہے۔ لیکن آہستہ سے مراد یہ نہیں کہ ہونٹ بھی ہلنے نہ پائیں۔ بلکہ آہستہ کم از کم اتنا ہونا چاہیے کہ قراءت آدمی کے دونوں کانوں کو سنائی دے اور دل اس کو یاد کرے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے:

«فَاقْرَأْ قِرَاءَةً تُسْمِعُهَا أُذُنَيْكَ وَيُوعِيْهَا قَلْبُكَ.» ❷

پھر قراءت کے اوصاف میں سے ترتیل، ترجیع، حسن صوت اور مد قراءت وغیرہ ہے۔ ان اشیاء کا حصول اس وقت تک ممکن نہیں جب تک انسان اپنے ہونٹوں کو حرکت میں نہ لائے۔ ان صفات کے اثبات کے لیے امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی ''صحیح'' میں متعدد ابواب قائم کیے ہیں۔ کوشش کریں کہ بوقتِ تلاوت ہونٹوں میں حرکت پیدا ہو۔ عادت بن گئی تو آسانی سے یاد بھی ہو جائے گا اور معنی و مفہوم کو سمجھنے کے لیے غور وتدبر ہی مطلوب ہے۔ جس کی کوئی سی صورت بن سکتی ہے۔

---

❶ صفة الصلاة، ص:٥٧

❷ فتح الباري:٩/ ٨٩

ٹیک لگا کر تلاوتِ قرآن مجید کا حکم

سوال: کیا قرآنِ مجید کی تلاوت ٹیک لگا کر یا تکیہ رکھ کر کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ بوجہ تھکاوٹ و سستی کے؟

(ایک سائل از منڈریاں تحصیل ایبٹ آباد) (۲۱ اپریل ۱۹۹۶ء)

جواب: ٹیک وغیرہ لگا کر قرآنِ مجید کی تلاوت کا کوئی حرج نہیں، جائز ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے:

«كَانَ يَتَّكِئُ فِي حِجْرِي وَأَنَا حَائِضٌ، ثُمَّ يَقْرَأُ الْقُرْآنَ.» ❶

''یعنی نبی ﷺ میری گود میں ٹیک لگاتے اور میں حیض والی ہوتی پھر آپ ﷺ قرآن کی تلاوت فرماتے۔''

قرآن مجید کو تجوید کے ساتھ پڑھنا شرعاً فرض ہے یا مستحب؟

سوال: قرآن مجید کو تجوید کے ساتھ پڑھنا شرعاً فرض ہے یا مستحب؟ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت سے جواب دیں۔ (السائل: ع۔ح۔ فیصل آباد) (۶ مارچ ۱۹۹۸ء)

جواب: قرآن مجید کو ٹھہر ٹھہر کر ترتیل کے ساتھ پڑھنا حتی المقدور ضروری ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ﴾ (المزمل:٤)

''اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرو۔''

ضحاک نے کہا ترتیل یہ ہے کہ ایک ایک حرف کو علیحدہ علیحدہ پڑھا جائے۔ اور حدیث میں ہے:

« يُقَالُ لِصَاحِبِ الْقُرْآنِ اقْرَأْ وَارْتَقِ وَرَتِّلْ كَمَا كُنْتَ تُرَتِّلُ فِي الدُّنْيَا.» ❷

اسی طرح ''صحیح بخاری'' اور ''ابوداؤد'' میں مدِّ صوت کا بھی ذکر ہے اور بعض روایات میں ترجیع کا بھی تذکرہ ہے۔

''ض'' کو ''دواد'' پڑھنا کیسا ہے؟

سوال: کچھ لوگ ''ض'' کو ضادؔ کے بجائے ''دواد'' پڑھتے ہیں، وضاحت کریں۔ کیونکہ قرآن میں کئی مقام پر یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ لہٰذا اس کی غلطی سے مفہوم بھی بدل سکتا ہے؟ (محمد مسعود P.P کوٹلی، آزاد کشمیر) (۲۹ دسمبر ۲۰۰۰ء)

جواب: اصل بات یہ ہے کہ ''ضاد'' اور ''ظاء'' دونوں قریب المخرج ہیں۔ زبان کی کروٹ (کنارہ) جب اُوپر کی داڑھوں کی جڑ سے لگے تو وہاں سے ''ض'' نکلے گا۔ اور اگر زبان کی نوک ثنایا علیا (اوپر کے دو درمیان والے دانتوں) کے کنارے سے لگے تو ظاء نکلتا ہے۔ پھر دونوں حروف صوتی صفات کے اعتبار سے ایک جیسے ہیں (یعنی حروفِ مجہورہ، رخوہ،

---

❶ صحيح البخاري، بَابُ قِرَاءَةِ الرَّجُلِ فِي حَجْرِ امْرَأَتِهِ وَهِيَ حَائِضٌ، رقم: ٢٩٧

❷ سنن ابي داود، بَابُ اسْتِحْبَابِ التَّرْتِيلِ فِي الْقِرَاءَةِ، رقم: ١٤٦٤، سنن الترمذي، رقم: ٢٩١٤، و صححه

مطبقہ سے ہیں) اس بناء پر علماء نے کہا ہے کہ جو دونوں کے مخارج (ادائیگی) میں تمیز نہ کر سکے کہ اس سے اگر کوئی تبدیلی ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔ ❶

تجوید کے اعتبار سے لفظ وَالضُّحیٰ درست ہے یا وَالدحٰی؟

سوال: اکثر لوگ قرآنِ مجید کی تلاوت کرتے وقت ''ض'' کی جگہ ''د'' کی آواز نکالتے ہیں جس طرح ''سورۃ الضحیٰ'' میں ''والضُّحٰی'' کی بجائے ''وَالدُّحٰی'' پڑھتے ہیں۔ کیا یہ درست ہے؟ (ماریہ عدیل۔ لاہور) (۵ جولائی ۲۰۰۲ء)

جواب: حرف ''ض'' کا مخرج ادائیگی کے اعتبار سے مشکل ترین مخرج ہے۔ علماء کا صحیح قول یہ ہے کہ ضاد اور ظاء چونکہ قریب المخرج ہیں لہٰذا ادائیگی میں اگر کوئی کمی بیشی واقع ہو جائے تو معاف ہے۔ ❷

واضح ہو کہ دونوں طرح کے لوگوں کا مقصود تو ایک جیسے معنیٰ ہی ہوتے ہیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، البتہ ''ض'' کو واضح ''د'' کی آواز میں ادا کرنا غلط ہے۔

کیا تلاوتِ قرآن مجید میں رموزِ اوقاف کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے؟

سوال: کیا قرآنِ مجید کے آخر میں تحریر شدہ قراءِ کرام کی طرف سے تجویز کردہ رموزِ اوقاف کے مطابق قرآن پڑھنا ضروری ہے؟ (سائل) (۸۔ اگست ۲۰۰۳ء)

جواب: ماہرین فن کے بیان کردہ قواعد وضوابط کا لحاظ ہونا چاہیے جس طرح کہ بالخصوص مدینہ منورہ سے مجمع خادم الحرمین الشریفین الملک فہد کے زیرِ اہتمام طبع شدہ مصاحف کے اخیر میں وضاحتیں مستند طرق سے موجود ہیں۔

کیا بسم اللہ سورت کا حصہ ہے؟

سوال: بسم اللّٰه کیا سورت کا حصہ ہے؟ (محمد جہانگیر ضلع میرپور) (۲۱ اپریل ۱۹۹۵)

جواب: مسئلہ ہذا میں اہل علم کے مختلف اقوال ہیں۔ لیکن راجح قول یہ ہے کہ قرآن کا ہر وہ مقام جہاں بسم اللہ مرقوم ہے اس سورت کا وہ حصہ ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ اہل اسلام کا اجماع ہے کہ جو کچھ ما بین الدفتین (دو گتوں کے درمیان) ہے وہ کلام اللہ ہے۔ مصاحف میں اس کو ثابت رکھنے پر سب کا اتفاق ہے۔ اس کے باوجود کہ انتہائی چھان بین کے ساتھ قرآن کو زوائد سے منزّہ رکھنے کی سعی کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ اس میں آمین بھی نہیں لکھی گئی۔ شرح مسلم میں امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« وَاعْتَمَدَ أَصْحَابُنَا وَمَنْ قَالَ بِأَنَّهَا آيَةٌ مِنَ الْفَاتِحَةِ أَنَّهَا كُتِبَتْ فِي الْمُصْحَفِ

❶ تفسير القرآن:۱/ ٤٥

❷ تفسير ابن كثير:۲/ ٥٤

بِخَطِّ الْمُصْحَفِ وَكَانَ هٰذَا بِاتِّفَاقِ الصَّحَابَةِ وَإِجْمَاعِهِمْ عَلٰى أَنْ لَا يُثْبِتُوا فِيهِ بِخَطِّ الْقُرْآنِ غَيْرَ الْقُرْآنِ وَأَجْمَعَ بَعْدَهُمُ الْمُسْلِمُونَ كُلُّهُمْ فِي كُلِّ الْأَعْصَارِ إِلٰى يَوْمِنَا وَأَجْمَعُوا أَنَّهَا لَيْسَتْ فِي أَوَّلِ بَرَاءَةٍ وَأَنَّهَا لَا تُكْتَبُ فِيهَا وَهٰذَا يُؤَكِّدُ مَا قُلْنَاهُ.» [1]

کیا بسم اللہ ''سورۃ الفاتحہ'' کی مستقل آیت ہے؟

سوال: کیا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ''سورۃ الفاتحہ'' کی ایک مستقل آیت ہے۔ اگر یہ آیت ہے تو دوسری سورتوں میں آیات کی تعداد میں تسمیہ کو آیت شمار کیوں نہیں کیا جاتا؟ (ملاحظہ ہو حافظ صلاح الدین یوسف کی تفسیر والا قرآن احسن البیان۔ نیز تاج کمپنی کے قرآن میں ''سورۃ الفاتحہ'' میں تسمیہ کو آیت شمار نہیں کیا جاتا۔ کیوں؟

جواب: راجح بات یہ ہے کہ بسم اللہ ''سورۃ فاتحہ'' کی مستقل آیت ہے۔ ''سنن ابی داؤد'' وغیرہ میں حضرت ام سلمہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ''سورۃ فاتحہ'' کی تلاوت فرمائی۔ «وَ عَدَّ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ أٰيَةً» اور بسم اللہ کو مستقل آیت شمار کیا۔ [2]

اور اسی طرح ہر سورت کی بھی آیت ہے۔ ماسوائے ''سورۃ توبہ'' کے ''صحیح مسلم'' میں حدیث ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«أُنْزِلَتْ عَلَيَّ آنِفًا سُورَةٌ فَقَرَأَ: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ (إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ......الخ..» [3]

کہ ابھی مجھ پر ایک سورت نازل ہوئی ہے۔ اس کی تلاوت کا آغاز آپ ﷺ نے بسم اللہ سے فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہر سورت کی آیت ہے۔ باقی رہا یہ مسئلہ کہ اس کو سورتوں کی آیات کی گنتی میں شمار کیوں نہیں کیا جاتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی حیثیت سورتوں کے درمیان فصل کی بھی ہے۔ چنانچہ ''سنن ابی داؤد'' وغیرہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوع روایت میں اس امر کی تصریح موجود ہے۔ اس بارے میں اہل تاج کمپنی کا موقف کمزور ہے۔ راجح ہر سورت کے شروع میں بسملہ شمار میں لانا ہے۔

آیت الکرسی اور سواری کی دعا پڑھنے سے پہلے تعوذ و تسمیہ پڑھ سکتے ہیں؟

سوال: آیت الکرسی اور سواری کی دعا پڑھنے سے پہلے تعوّذ و تسمیہ پڑھ سکتے ہیں؟

[1] شرح النووي على مسلم، ٤/ ١١١، المرعاة: ١/ ٥٩١-٥٩٢

[2] بحواله الاتقان، ص:٨٠- دار قطني: ٢١- صحيح ابن خزيمة: ٤٩٣.

[3] صحيح مسلم، بَابُ حُجَّةِ مَنْ قَالَ: الْبَسْمَلَةُ آيَةٌ مِنْ أَوَّلِ كُلِّ سُورَةٍ سِوَى بَرَاءَةٍ، رقم:٤٠٠

جواب: تلاوت شروع کرتے وقت قرآنی آیات کے آغاز میں تعوذ پڑھنی چاہیے اور ''بسم اللہ'' صرف وہاں پڑھنی چاہیے جہاں اس کی تصریح موجود ہے اور سواری پر چڑھنے کی دعا میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت میں ''بسم اللہ'' کی تصریح وارد ہے۔ [1]

آغازِ تلاوت میں بغیر محل بسم اللہ پڑھنے کا حکم؟

سوال: قرآن شریف کی تلاوت کے لیے تعوذ اور بسم اللہ دونوں ضروری ہیں کہ نہیں۔ نیز اگر آیتیں درمیان سے تلاوت کرنی ہوں تو کیا ایسی صورت میں بسم اللہ کا پڑھنا جائز ہے۔

جواب: تلاوتِ قرآن مجید کے موقع پر بلا محل بسم اللہ کی صورت میں آیات کا آغاز صرف تعوذ سے ہونا چاہیے۔ قرآن حکیم میں ہے:

﴿ فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴾ (النحل:٩٨)

''اور جب تم قرآن پڑھنے لگو تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو۔''

کیا ''سورۃ الفاتحہ'' پہلے پارہ میں شامل ہے؟

سوال: کیا ''سورۃ الفاتحہ'' پہلے پارہ میں شامل ہے اگر شامل ہے تو اس کے اوپر پارہ نمبرا (الٓمٓ) کیوں نہیں لکھا جاتا؟ (ملاحظہ ہو احسن البیان، المعجم المفھرس میں موجود قرآن)

سوال: تسمیہ فاتحہ الکتاب اس بات پر دالّ ہے کہ سورت ہذا قرآن کا ایک جزء ہے اور ''صحیح بخاری'' کے ترجمۃ الباب میں ہے:

«وَسُمِّيَتْ أُمَّ الكِتَابِ أَنَّهُ يُبْدَأُ بِكِتَابَتِهَا فِي الْمَصَاحِفِ، وَيُبْدَأُ بِقِرَاءَتِهَا فِي الصَّلَاةِ.» [2]

''سورۃ فاتحہ'' کے ابتدائی حصہ میں پارہ نمبرا (الٓمٓ) لکھنے یا نہ لکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اصل اہمیت واقعہ کو ہوتی ہے۔ سو وہ ثابت ہے کہ فاتحہ مصحف کا ایک حصہ ہے۔ اس وقت میرے پاس تفسیر ابن کثیر کا اردو ترجمہ پڑا ہے اس میں فاتحہ کے آغاز پر پارہ نمبرا (الٓمٓ) مرقوم ہے۔

﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ......﴾ سے ﴿ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴾ تک ایک ہی سانس میں پڑھنا چاہیے

سوال: ''سورۃ فاتحہ'' کی آخری آیت ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ......﴾ سے ﴿ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴾ تک ایک ہی سانس میں پڑھنا چاہیے یا کسی جگہ وقف بھی کر سکتے ہیں؟ (سائل) (٨۔اگست ٢٠٠٣ء)

---

[1] سنن أبي داود، بَابُ مَا يَقُوْلُ الرَّجُلُ إِذَا رَكِبَ، رقم:٢٦٠٢، مشکوٰۃ باب الدعوات فی الاوقاف، رقم:٢٤٣٤

[2] صحيح البخاري، كتاب التفسير، بَابُ مَا جَاءَ فِي فَاتِحَةِ الكِتَابِ، قبل رقم الحديث:٤٤٧٤

جواب: ﴿ صِرَاطَ الَّذِيْنَ...... ﴾ سے ﴿ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴾ تک ایک ہی آیت سمجھ کر پڑھنا چاہیے، یہی مسلک راجح ہے۔ اور پہلی آیت بسم اللہ الرحمٰن ہے۔ مجمع فہد کے طبع شدہ مصاحف میں بھی بسم اللہ کو ترتیب آیات میں پہلی قرار دیا گیا ہے، ''سورہ فاتحہ'' کی سات آیات اسی طرح بنتی ہیں۔

''سورۂ حشر'' کی آخری آیات تلاوت کرنے کی فضیلت

سوال: ''سورۂ حشر'' کی آخری آیات صبح پڑھنے سے شام تک ستر ہزار فرشتے دعاء کرتے ہیں اور شام کو پڑھنے سے صبح تک ستر ہزار فرشتے دعا کرتے ہیں۔ اور اس دن یا رات میں مرگیا تو شہید ہوگا۔ کیا یہ حدیث قوی ہے۔

جواب: ضعیف ہے۔

آیت کریمہ لا الٰه اِلَّا اَنْتَ......الآیۃ کا وظیفہ کس طرح کرنا چاہیے؟

سوال: اسی طرح اگر کوئی مصیبت آجائے یا کوئی اور وجہ ہو تو آیت کریمہ پڑھواتے ہیں، کیا آیت کریمہ کا پڑھوانا جائز ہے۔ ویسے خود تو انسان اکیلا پڑھ سکتا ہے۔ گناہوں کی بخشش کی وجہ سے ہر وقت ہی خدا تعالیٰ کا ذکر زبان پر ہونا چاہیے۔ آج کل جہالت ہی بہت ہے۔ انسان کو شیطان نے گمراہ کر رکھا ہے۔ مہربانی فرما کر تفصیل سے جواب دیں۔

(از سائلہ قصور) (۳۰ اگست ۱۹۹۱ء)

جواب: آیت کریمہ ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (الانبیاء:۸۷) کا وِرد وظیفہ اکیلے صاحب حاجت و ضرورت کو ہی کرنا چاہیے۔ دوسروں سے کرانے کا کوئی ثبوت نہیں۔

یاد رہے اس وظیفہ کے لیے شریعت میں نہ کوئی وقت مقرر ہے اور نہ دن کا تعین اور نہ کوئی گنتی کی حد بندی۔ جس طرح کہ بعض لوگوں نے اختراعی طریقے ایجاد کر چھوڑے ہیں۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

« مَنْ اَحْدَثَ فِيْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ » [1]

یعنی ''جس نے دین میں اضافہ کیا وہ مردود ہے۔''

کیا قرآن حرفاً حرفاً محفوظ ہے؟

سوال: کیا قرآن حرفاً حرفاً محفوظ ہے۔ جب کہ بخاری میں ''سورۃ واللیل'' کی تفسیر میں ہے کہ ایک صحابی کہتا ہے ﴿وَمَا خَلَقَ﴾ (اللیل:۳) کے الفاظ موجود نہیں تھے۔ شامی لوگ ایسا پڑھتے ہیں۔ اسی طرح کی بعض دوسری صحیح روایات موجود ہیں۔ (سائل) (۸ نومبر ۱۹۹۶ء)

جواب: اہل علم کے ہاں یہ بات معروف ہے کہ قرآن مجید کا نزول متعدد قراءتوں پر ہوا ہے۔ مشارٌ الیہ قراءت حضرت

[1] صحيح البخاري، بَابُ إِذَا اصْطَلَحُوا عَلَى صُلْحِ جَوْرٍ فَالصُّلْحُ مَرْدُوْدٌ، رقم:٢٦٩٧

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بعض شاگردوں نے ان سے نقل کی ہے۔ جب کہ دیگر نے قراءۃ مشہورہ کے مطابق نقل کی ہے۔ زیرِ نظر موجود کیفیت اثبات و اعتماد کی صورت میں منسوخ التلاوۃ ہے لیکن ابو الدرداء اور انکے رفقاء کو اس بات کا علم نہ ہو سکا۔ چنانچہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

«ثُمَّ هَذِهِ الْقِرَاءَةُ لَمْ تُنْقَلْ إِلَّا عَمَّنْ ذُكِرَ هُنَا وَمَنْ عَدَاهُمْ قَرَؤُوْا وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَى وَعَلَيْهَا اسْتَقَرَّ الْأَمْرُ مَعَ قُوَّةِ إِسْنَادِ ذَلِكَ إِلَى أَبِي الدَّرْدَاءِ وَمَنْ ذُكِرَ مَعَهُ وَلَعَلَّ هَذَا مِمَّا نُسِخَتْ تِلَاوَتُهُ وَلَمْ يَبْلُغِ النَّسْخُ أَبَا الدَّرْدَاءِ وَمَنْ ذُكِرَ مَعَهُ وَالْعَجَبُ مِنْ نَقْلِ الْحُفَّاظِ مِنَ الْكُوفِيِّيْنَ هَذِهِ الْقِرَاءَةَ عَنْ عَلْقَمَةَ وَعَنِ ابْنِ مَسْعُودٍ وَإِلَيْهِمَا تَنْتَهِي الْقِرَاءَةُ بِالْكُوفَةِ ثُمَّ لَمْ يَقْرَأْ بِهَا أَحَدٌ مِنْهُمْ وَكَذَا أَهْلُ الشَّامِ حَمَلُوا الْقِرَاءَةَ عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ وَلَمْ يَقْرَأْ أَحَدٌ مِنْهُمْ بِهَذَا فَهَذَا مِمَّا يُقَوِّي أَنَّ التِّلَاوَةَ بِهَا نُسِخَتْ.» [1]

قرآنِ کریم کو بغیر وضوء کے چھونا اور پڑھنا

سوال: قرآن کریم کو بے وضو چھونا اور پڑھنا جائز ہے کہ نہیں۔ راجح مذہب کیا ہے؟

(سائل: نور زمان۔ بنوں شہر۔ صوبہ سرحد) (۲۷ نومبر ۱۹۹۸)

جواب: قرآن مجید کو بلا وضوء چھونے کے بارے میں اہل علم کے دو قول ہیں۔ جواز اور عدمِ جواز۔ دلائل کے اعتبار سے ثانی الذکر قول راجح ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿لَا يَمَسُّهُ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ﴾ (الواقعہ:۹) ''اس کو وہی ہاتھ لگاتے ہیں جو پاک ہیں۔'' اور حدیث عمرو بن حزم میں ہے:

«اَنْ لَّا يَمَسَّ الْقُرْاٰنَ اِلَّا طَاهِرٌ.» [2]

''رسول اللہ ﷺ نے اس کے لیے تحریر لکھی۔ قرآن پاک صرف پاک ہی چھوئے۔''

اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے فرمایا:

«لَا تَمَسَّ الْقُرْاٰنَ اِلَّا وَ اَنْتَ طَاهِرٌ.» [3]

''قرآن کو مت مس کر الا یہ کہ تو پاک ہو۔''

---

[1] فتح الباری:۸/ ۷۰۷

[2] سنن الدارمی، بَابُ لَا طَلَاقَ قَبْلَ نِكَاحٍ، رقم:۲۳۱۲، سنن الدارقطنی، بَابٌ فِي نَهْيِ الْمُحْدِثِ عَنْ مَسِّ الْقُرْآنِ، رقم:۴۳۷

[3] المستدرك للحاكم، رقم:۶۰۵۱، السنن الكبرٰى للبيهقی، بَابُ نَهْيِ الْمُحْدِثِ عَنْ مَسِّ الْمُصْحَفِ، رقم:۴۰۸

اور حضرت سعد نے مسِ مصحف کے لیے اپنے بیٹے کو وضوء کا حکم دیا تھا۔ پھر جمہور اہل علم کی رائے بھی یہی ہے۔
ہاں البتہ بعض اہل علم نے بچوں کو بلا وضوء مس کی اجازت دی ہے اس لیے کہ وہ غیر مکلّف ہیں۔ جب کہ بعض اس بات کے قائل ہیں کہ وضوء کرنا ضروری ہے۔ بہر صورت احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ بچوں کو بھی وضوء کرنا چاہیے تا کہ اکرامِ مصحف ان کے ذہنوں میں راسخ ہو یا پھر حائل (پردہ) کے ساتھ مسِ مصحف ہو تو باوضوء اور بے وضوء سب کے لیے جائز ہے۔

قرآن مجید کے بوسیدہ اوراق کے تلف کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

سوال: قرآن کے ضعیف پرزوں کو تلف کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے۔ نیز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے جلانے کے فعل کی دلیل سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔؟ دفن کرنا یا دریابُرد کرنا کیسا ہے؟ (سائل) (۸نومبر ۱۹۹۶ء)

جواب: قرآن مجید کے بوسیدہ اوراق یا پُرزوں کو کسی محفوظ مقام پر دفن کر دیا جائے یا کسی کنوئیں یا نہر وغیرہ میں ڈال دیا جائے یا اوراق کو دھوڈالا جائے۔ فتنے کا ڈر نہ ہو تو جلانے کا بھی جواز ہے۔ چنانچہ اسماعیلی کی روایت میں ہے: «أَنْ تُمْحَى أَوْ تُحْرَقَ.»

یعنی ''اوراق کو تلف کر دیا جائے یا جلا دیا جائے۔''

شارح ''صحیح بخاری'' ابن بطال نے کہا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جن کتابوں میں اللہ کا نام لکھا ہوا ہو ان کو آگ سے جلا دینا جائز ہے۔ اور اس میں ان کا اکرام ہے اور پاؤں کے نیچے آنے سے بچاؤ ہے۔ طاؤس نے کہا جن چٹھیوں میں ''بسم اللہ'' لکھی ہوتی تھی انھیں اکٹھا کر کے جلا دیا جاتا تھا۔ عروہ نے بھی اسی طرح کیا۔ البتہ ابراہیم نے اس فعل کو مکروہ سمجھا ہے۔ ❶

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا فعل حفاظتِ قرآن کی نصوص کے پیش نظر تھا۔ اسی بناء پر فعل ہٰذا کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی مستحسن سمجھا تھا۔ ❷

متبرک اوراق کو جلانے کا حکم

سوال: عرض ہے کہ ہمارے گاؤں ''سوکن ونڈ'' کے گورنمنٹ رضائے مصطفیٰ ہائی سکول کے ایک اُستاد نے چھٹی جماعت کے ٹیسٹ پیپرز گائیڈ یعنی امدادی کتب (جو سکول میں لانا منع ہیں۔ جن میں دینیات وعربی میں قرآنی آیات موجود ہیں) بچوں سے اکٹھی کر کے (جن کی تعداد تقریباً ۵۰ ہے) مٹی کا تیل ڈال کر جلا دیں۔ اس کے متعلق شرعی احکام کیا ہیں؟ کیا استاد کو قرآن وسنت کی روشنی میں شرعی سزا دی جا سکتی ہے یا نہیں؟ مسئلہ کی وضاحت فرما دیں۔

---

❶ فتح الباری:۹/ ۲۱

❷ فتح الباری:۹/ ۲۱

جواب: قرآنی آیات والے بوسیدہ اوراق کو ضائع کرنا جائز ہے۔ پانی میں بہا دیے جائیں یا پاکیزہ زمین میں دفن کر دیے جائیں۔ اوراق کو جلانے کا عمل بھی درست ہے۔ ''صحیح بخاری'' میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے منقول ہے:

« وَأَمَرَ بِمَا سِوَاهُ مِنَ الْقُرْآنِ فِي كُلِّ صَحِيفَةٍ أَوْ مُصْحَفٍ، أَنْ يُحْرَقَ.» [1]

''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت حفصہ کے صحف سے منقول قرآن کے علاوہ ہر صحیفے یا مصحف میں جو قرآن ہے اُسے جلانے کا حکم صادر فرمایا۔''

شارح بخاری امام ابوالحسن ابن بطال فرماتے ہیں:

«فِي هَذَا الْحَدِيثِ جَوَازُ تَحْرِيقِ الْكُتُبِ الَّتِي فِيهَا اسْمُ اللَّهِ بِالنَّارِ وَأَنَّ ذَلِكَ إِكْرَامٌ لَهَا وَصَوْنٌ عَنْ وَطْئِهَا بِالْأَقْدَامِ وَقَدْ أَخْرَجَ عَبْدُ الرَّزَّاقِ مِنْ طَرِيقِ طَاوُسٍ أَنَّهُ كَانَ يُحَرِّقُ الرَّسَائِلَ الَّتِي فِيهَا الْبَسْمَلَةُ إِذَا اجْتَمَعَتْ وَكَذَا فَعَلَ عُرْوَةُ.» [2]

''اس حدیث میں یہ مسئلہ ہے کہ ان کتابوں کو جلانا جائز ہے، جن میں اللہ عزوجل کا اسم گرامی ہو۔ اس میں ان کی عزت و اکرام ہے، بجائے اس کے کہ قدموں کے نیچے روندے جائیں اور ان کی بے ادبی ہو۔ طاؤس کے پاس جب اللہ کے نام والے کتب و رسائل جمع ہو جاتے تو انھیں جلا ڈالتے۔ عروہ کا فعل بھی اسی طرح مروی ہے۔''

مقدس اوراق کی راکھ کا حکم؟

سوال: اگر قرآن شریف کے پرانے اوراق یا دوسرے مقدس اوراق جلائے جائیں تو کیا راکھ محفوظ جگہ میں دفنانا یا دریا برد کرنا ضروری ہے یا عام راکھ کا حکم رکھتی ہے؟ (ابوعبداللہ، غواڑی بلتستان) (۲۸ مئی ۲۰۰۴ء)

جواب: راکھ تو عام راکھ جیسی ہی ہوگی، تاہم ذہنی سکون کے لیے اس کو دفن کر لیا جائے یا پانی میں بہا دیا جائے۔

اخبارات میں آیاتِ قرآنیہ کا ترجمہ چھاپنا

سوال: اخبارات میں جہاں اخبار کا نام لکھا ہوتا ہے اس کے قریب ہی قرآنی آیات کا ترجمہ بھی لکھا ہوتا ہے۔ اخبارات والے جانتے ہیں کہ زیادہ تر لوگ ان اوراق کا خیال نہیں رکھتے اور گندگی کے ڈھیروں پر اخبارات پڑے ہوتے ہیں۔ اندریں صورت اخبار شائع کرنے والے گناہگار ہوں گے یا اخبارات کو محفوظ جگہ پر نہ رکھنے والے؟

(ام کلثوم۔ لاہوتی) (۱۶۔ اگست ۲۰۰۲ء)

---

1. صحيح البخاري، بَابُ جَمْعِ الْقُرْآنِ، رقم: ٤٩٨٧
2. فتح الباري ٩/ ٢١

جواب : اصل بات یہ ہے کہ قرآن کی حرمت کاملہ عربی الفاظ کے ساتھ ہوتی ہے۔ اگر محض ترجمہ کی حفاظت کسی وقت نہ بھی ہو سکے تو معاف ہے۔

قرآنی آیات سے منقش زیورات کو ڈھالنا

سوال : میرے دوست جیولری کا کام کرتے ہیں ان کے پاس اکثر ایسا زیور بکنے کے لیے آ جاتا ہے، جس پر اللہ، محمد کے نام، آیت الکرسی یا دیگر قرآنی آیات لکھی ہوتی ہیں۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں کہ ان زیورات کو ڈھالنا جائز ہے یا نہیں؟ نیز اگر ہم اس زیور کو ایک دفعہ ڈھال چکے ہوں تو اس کا کفارہ کیا ہوگا؟

(عبدالحمید۔ قصور) (۲۷ جولائی ۲۰۰۱ء)

جواب : جن زیورات پر قرآنی آیات مرقوم ہوں ان کو ڈھالنے میں کوئی حرج نہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں قرآن مجید کے نسخوں کا ضیاع جلانے کی صورت میں کیا گیا تھا۔ [1]

یاد رہے کہ اس عمل کے مرتکب پر کوئی کفارہ نہیں۔

کاغذ کا وہ پرزہ جس پر اللہ تعالیٰ یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک لکھا ہو، تلف کرنے کا طریقہ؟

سوال : کافی لوگوں سے سنا ہے کہ اگر اخبارات کتابوں یا رسالوں میں کسی جگہ بھی اللہ کا یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نام آ جائے تو اسے دیوار میں دبا دینا چاہیے یا پانی میں بہا دینا چاہیے یا جلا دینا چاہیے۔

کافی لوگوں سے سنا ہے کہ جلا دینے سے اللہ کا نام اڑ جاتا ہے کیا ضائع کرنے کے مذکورہ طریقے درست ہیں؟

(سائل) (۱۴ جولائی ۲۰۰۰ء)

جواب : کاغذ کا پرزہ جس پر اللہ عزوجل کا اسم ہو یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی ہو، اس کے ضیاع کی مذکورہ شکلوں سے کوئی بھی اختیار کی جا سکتی ہے، تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسے دفن کر دیا جائے یا پانی میں بہا دیا جائے۔ اسم مبارک کے اڑنے کا مسئلہ بے بنیاد ہے، اس کی کوئی دلیل نہیں۔

قرآنی آیات لکھ کر دیواروں پر لٹکانے کا کیا حکم ہے

سوال : مسلمان گھروں میں ''اللہ''، ''محمد'' بڑا سا لکھ کر لگایا ہوتا ہے۔ اس کا کیا حکم ہے؟ حصولِ برکت کے لیے قرآنی آیات لکھ کر دیواروں پر لگانے کا کیا حکم ہے یعنی اگر یہ کام دیواروں کو سجانے کے لیے نہ کیا گیا ہو؟

(ہدایت الٰہی۔ لاہور) (۲۷ ستمبر ۲۰۰۲ء)

جواب : معزز اور مکرم چیزوں کی عزت دل میں ہونی چاہیے، دیواروں پر ان کو لکھ کر لگانا حدیث وسنت سے ثابت نہیں۔

[1] صحيح البخاري، بَابُ جَمْعِ الْقُرْآنِ، رقم: ٤٩٨٧

کیا تعویذ لکھنے والا، تعویذ استعمال کرنے والا مشرک ہے؟

سوال: تعویذ لکھنے والا، تعویذ استعمال کرنے والا مشرک ہے، اگرچہ تعویذ میں قرآن ہی کیوں نہ لکھا ہو۔

جواب: صحابہ کرام اور سلف صالحین کی ایک جماعت سے تعویذ لکھنا ثابت ہے۔ ان پر کیا فتویٰ صادر کریں گے۔ هَدَانَا اللّٰهُ وَ اِيَّاكُمْ

حدیث میں جس تعویذ کو شرک کہا گیا ہے وہ جعلی تعویذی منکے ہیں۔ مسند امام احمد کی روایت میں اس حدیث کے سبب ورود میں اس امر کی طرف اشارہ موجود ہے۔

اگرچہ ہمارے نزدیک اولیٰ یہ ہے کہ مطلقاً تعویذات سے احتراز کیا جائے اگرچہ وہ قرآنی آیات اور صحیح دعاؤں پر ہی مشتمل ہوں۔

قرآنی تعویذوں کا کیا حکم ہے؟

سوال: قرآنی تعویذ گلے اور بازو وغیرہ میں لٹکانا جائز ہے یا نہیں؟ (ہدایت اللہ الٰہی) (۲۷ ستمبر ۲۰۰۲ء)

جواب: قرآنی تعویذات وغیرہ بھی گلے میں لٹکانے سے بچنا ہی چاہیے۔

کیا کسی صحابی سے صحیح اور صریح طور پر ثابت ہے کہ وہ قرآنی تعویذ کا قائل تھا؟

سوال: کیا کسی صحابی سے صحیح اور صریح طور پر ثابت ہے کہ وہ قرآنی تعویذ کا قائل تھا؟

(ہدایت اللہ الٰہی) (۲۷ ستمبر ۲۰۰۲ء)

جواب: بسند صحیح کسی صحابی سے ثابت نہیں۔

ٹیلی ویژن پر قرآن سننا

سوال: آج صبح کے درس میں درس دینے والے نے یہ فرمایا کہ ٹیلی ویژن پر قرآن مجید کی تلاوت سننا گناہ ہے۔ اس لیے آپ کو تکلیف دی جا رہی ہے کہ آپ اس کے حق میں یا خلاف کیا فرماتے ہیں؟

(ایک سائل از وہاڑی) (۵ جون ۱۹۹۸ء)

جواب: ٹیلی ویژن اور ریڈیو وغیرہ جدید آلات سے ہیں جو متأخر زمانہ کی ایجادات ہیں۔ بذاتہٖ غیر متحرک ہیں۔ آدمی اگر ان کا استعمال بھلائی کے لیے کرتا ہے مثلاً قرآن مجید کی تلاوت کا سماع یا مفید باتیں اور اہم خبریں سماعت کرتا ہے تو اس کا جواز ہے اور اگر گانے یا موسیقی وغیرہ کے لیے استعمال کرتا ہے تو بایں صورت سماع کرنا حرام ہے۔ گویا کہ ان چیزوں کی اچھائی یا برائی کا انحصار انسانی افعال اور تصرفات پر ہے لیکن تقویٰ کا تقاضا یہ ہے کہ اس سے احتراز کیا جائے۔ تاکہ غفلت سے شیطانی راہ کی طرف رغبت نہ ہونے پائے۔

قرآن پاک کی ویڈیو یا فلم بنا سکتے ہیں یا نہیں؟

سوال: قرآن پاک کی ویڈیو یا فلم بنا سکتے ہیں یا نہیں؟ (سائل: حافظ محمد سلیم عنایت اللہ) (۱۹ دسمبر ۱۹۹۷ء)

جواب: احترام کے تقاضوں کے مطابق ہو تو جائز ہے۔

قرآنی آیات کے کیلنڈر غلطی سے پھٹ جائیں تو......

سوال: ایک آدمی نے جو کہ (پابند ہے صوم وصلوٰۃ کا) ایک کیلنڈر فروخت کرنے والے کو دیکھا کہ وہ بزرگانِ دین و اولیائے کرام کی تصوراتی تصاویر مع عورتوں کی تصاویر فروخت کر رہا ہے اس نے جیب سے رقم دے کر وہ کیلنڈر لے کر پھاڑ دیے کہ یہ تصاویر بزرگانِ دین کی نہیں ہیں بلکہ عورت کے ساتھ بزرگانِ دین اور اولیائے کرام کی تصاویر دین متین و شریعت مطہرہ کی خلاف ورزی اور اولیائے کرام کی توہین ہے۔ تصاویر والے کیلنڈروں کے نیچے چند آیات قرآنی کے کیلنڈر تھے جو کہ اس کو معلوم نہ تھے۔ جب اس نے تصاویر والے کیلنڈر پھاڑے تو ساتھ ہی وہ بھی نادانستہ پھٹ گئے۔ اب جب اس کو پتہ چلا تو وہ پشیمان ہوا۔ آپ فرمائیں کہ اس شخص کی سزا کیا ہے اور کیا اس کی معافی قابلِ قبول ہوگی؟

(ایک سائل از پسرور) (۵ جون ۱۹۹۸ء)

جواب: ایسی صورت میں اللہ کے حضور معافی کی درخواست کرنی چاہیے اور یہی کافی ہے۔ صحیح حدیث میں ہے:

«فَإِنَّ الْعَبْدَ إِذَا اعْتَرَفَ بِذَنْبٍ ثُمَّ تَابَ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ» [1]

کیا ہر جمعرات بعد از نمازِ مغرب ''سورۂ دُخان'' پڑھنے کی کوئی فضیلت ثابت ہے؟

سوال: کیا جمعرات کو بعد از نمازِ مغرب ''سورۂ دُخان'' پڑھنے کی کوئی فضیلت احادیث سے ثابت ہے۔

(ایک سائل) (۱۲ مارچ ۱۹۹۹ء)

جواب: اس موضوع کی چار روایات امام قرطبی نے بیان فرمائی ہیں۔ لیکن ان میں بعد از مغرب کی تخصیص نہیں بلکہ مطلقاً رات کا ذکر ہے۔ اور ایک روایت میں «لَيْلَةَ الْجُمُعَةِ» اور «يَوْمِ الْجُمُعَةِ» کے الفاظ بھی ہیں۔ [2]

''سورۃ زلزال'' مدنی یا ہے مکی:

سوال: ''سورۃ الزلزال'' مدنی ہے یا مکی؟ (محمد جہانگیر ضلع میرپور) (۲۱ اپریل ۱۹۹۵)

جواب: ''سورہ زلزال''، ابن عباس رضی اللہ عنہما اور قتادہ رضی اللہ عنہ کے اقوال کے مطابق مدنی ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ، عطاء اور جابر کے اقوال کے موجب مکی ہے۔ ''تفسیر قرطبی'' (۲۰/۱۴۶) عمومی رجحان اس کے مدنی ہونے کی طرف ہے۔ (وَاللّٰہ

---

[1] صحيح البخاري، بَابُ تَعْدِيلِ النِّسَاءِ بَعْضِهِنَّ بَعْضًا، رقم:٢٦٦١

[2] تفسير قرطبي:١٦/ ١٢٥

سُبْحَانَهُ وَتَعَالٰی اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.)

ختم قرآن پر بسند صحیح کوئی مخصوص دعا منقول ہے؟

سوال: قرآنِ کریم ختم کرنے پر ''سورۃ الناس'' کے بعد ہر مصحف پر ایک مختصر دعا «اَللّٰهُمَّ اٰنِسْ وَحْشَتِيْ...... يَا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ» اور کئی مصاحف پر ایک بہت طویل دعا (ا)، (ب) سے ی تک شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ کے حوالہ سے درج ہوتی ہے۔ کیا یہ دعائیں (پہلی خصوصاً) صحیح حدیث سے ثابت ہے یا ویسے ہی درج ہیں؟ اور کیا یہ پڑھنی چاہئیں؟
(پروفیسر سعید احمد لکھوی) (۲۳ جون ۲۰۰۰ء)

جواب: قرآنِ مجید کے ختم کرنے پر بسند صحیح نبی ﷺ سے کوئی مخصوص دعا ثابت نہیں۔ علامہ محمد عبدالسلام حضرت الشقیری فرماتے ہیں:

«وَالدُّعَاءُ الَّذِيْ فِيْ آخِرِ الْمَصَاحِفِ لَا يَجُوْزُ التَّعَبُّدُ بِهِ قَطْعًا بَلْ هُوَ مَذْمُوْمٌ مَصْنُوْعٌ شَرْعًا لِاَنَّهُ مُخْتَرَعٌ وَ لَيْسَ مَاثُوْرًا...... الخ .»

''قرآن کے اخیر میں جو دعا طبع کی جاتی ہے اس کے ذریعہ عبادت کرنا ناجائز ہے۔ بلکہ خود ساختہ ہونے کی وجہ سے یہ شرعاً مذموم اور ممنوع ہے کیونکہ نبی ﷺ سے منقول نہیں۔ بلکہ یہ سب بدعت، گمراہی اور من گھڑت توسّل ہے۔ اس کی قراءت حلال نہیں اور نہ ہی مصاحف کے اخیر میں اس کی کتابت جائز ہے۔

قرآن و سنت کافی وشافی ہیں۔ اللہ رب العزت نے سفہاء کی کم عقلی بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿اَوَ لَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّ ذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ﴾ (العنکبوت: ۵۱)

''کیا ان لوگوں کے لیے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تم پر ایسی کتاب نازل کی جو انھیں پڑھ کر سنائی جاتی ہے کچھ شک نہیں کہ مومن لوگوں کے لیے اس میں رحمت اور نصیحت ہے۔''[1]

علامہ عبدالعزیز بن باز رحمہ اللہ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں: ختمِ قرآن پر کوئی معین دعا وارد نہیں لہٰذا آدمی کے لیے جائز ہے کہ نفع بخش دعاؤں میں سے جو چاہے پڑھ لے۔ مثلاً گناہوں کی بخشش طلب کرنا، جنت کا سوال، آگ سے نجات، فتنوں سے پناہ چاہنا اور فہم قرآن کی توفیق مانگنا، اس کے ساتھ ساتھ قرآن پر عمل اور اس کے حفظ کی دعا کرنا اور اس قسم کی دیگر دعائیں کرنا جن سے اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے۔

چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ ختم قرآن پر وہ، اپنے اہل و عیال کو جمع کرکے دعا کرتے اور جہاں تک مجھے علم ہے، نبی ﷺ سے اس سلسلہ میں کوئی شے وارد نہیں اور جو دعاء شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی طرف منسوب ہے،

[1] السنن والمبتدعات، ص: ۲۱۶

مجھے اس کی صحت بھی معلوم نہیں ہوسکی۔ اگر چہ ہمارے مشائخ اور دیگر لوگوں میں مشہور ہے مگر ان کی کتابوں سے اس کا علم نہیں ہوسکا۔ (بحوالہ فتاویٰ اسلامیہ:۴/۱۲-۱۳)

قرآن کی قسم اٹھانا کیسا ہے؟

سوال: خالق کائنات کے سوا مخلوق کی قسم اٹھانا ناجائز ہے تو قرآن جو کلام اللہ اور غیر مخلوق ہے، کی قسم اٹھائی جاسکتی ہے؟ (زبیر احمد اظہر۔ گوجراں والا) (۲۱ ستمبر ۲۰۰۱ء)

جواب: قرآن چونکہ اللہ کی صفت ہے لہٰذا اس کی قسم کھائی جاسکتی ہے۔ عون المعبود (۳/۲۱۶) میں ہے:

«رُوِیَ عَنْ بَعْضِ الصَّحَابَةِ التَّحْلِيْفُ عَلَى الْمُصْحَفِ»

''یعنی بعض صحابہ سے قرآن کی قسم کھانا مروی ہے۔''

قرآن کا واسطہ دے کر دعا کرنا؟

سوال: کیا قرآن پاک کا واسطہ دے کر اللہ سے سوال کیا جاسکتا ہے؟ (زبیر احمد اظہر۔ گوجراں والا) (۲۱ ستمبر ۲۰۰۱ء)

جواب: قرآن چونکہ اللہ کی صفت ہے، اس لیے اس کے واسطے سے اللہ سے التجاء کی جاسکتی ہے۔

کیا قرآن کی قسم اٹھا سکتے ہیں؟

سوال: شریعت کی رُو سے کس کی قسم کھانی چاہیے؟ مثلاً قرآن مجید ہاتھ میں اٹھا کر قسم کھانی چاہیے یا اللہ کا نام لے کر صرف اللہ کی قسم کھانی چاہیے؟ (حاجی محمد خالد۔ لاہور) (۲۳ اگست ۲۰۰۲ء)

جواب: بوقت ضرورت قسم صرف اللہ کا نام لے کر کھانی چاہیے۔ مثلاً یوں کہا جائے۔ وَاللّٰهِ ، بِاللّٰهِ یا تَاللّٰهِ وغیرہ۔ ❶

قرآن پر قسم کھانا بعض صحابہ سے مروی ہے کسی مرفوع متصل روایت میں نہیں۔ چنانچہ ''عون المعبود'' (۳/۲۱۶) میں ہے:

«وَ رُوِیَ عَنْ بَعْضِ الصَّحَابَةِ التَّحْلِيْفُ عَلَى الْمُصْحَفِ.»

کیا عادتاً اٹھائی جانے والی قسموں کا کفارہ ہے؟

سوال: میری والدہ محترمہ کی عادت ہے کہ ان کی مرضی کے خلاف کوئی کام کریں، تو کہتی ہیں کہ تمھیں اللہ کی قسم یہ کام نہ کرنا۔ حالانکہ بعض اوقات وہ غلطی پر ہوتی ہیں۔ ان کے قسم دینے پر اگر اس کے خلاف کیا جائے تو کیا کسی پر قسم کا کفارہ

❶ صحيح البخاري، باب كيف كانت يمين النبي صلى الله عليه وسلم، قبل رقم الحديث:٦٦٢٨

واجب ہوگا یا نہیں؟ اگر ہوگا تو کس پر؟ (سائل) (۱۰ مئی ۲۰۰۲ء)

جواب: اس عادت کو بدلنا چاہیے لیکن شرعاً ایسی قسموں میں کفارہ نہیں۔ ملاحظہ ہو: تفسیر ابن کثیر (۱/۳۵۹۔۳۶۰)

ختم قرآن کے موقع پر مٹھائی تقسیم کرنا بدعت ہے؟

سوال: کیا رمضان المبارک میں نمازِ تراویح میں ختم قرآن کے موقع پر مٹھائی وغیرہ تقسیم کرنا بدعت ہے؟

(۲۲ مئی ۱۹۹۸ء)

جواب: نماز تراویح میں ختمِ قرآن کے موقع پر مٹھائی کی تقسیم ضروریات دین سے نہیں، محض طبعی خوشی کا اظہار ہے۔ شیخنا محدث روپڑی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بعض تفاسیر میں لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب ''سورہ بقرہ'' ختم کی تو دس اونٹ ذبح کیے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی دینی کتاب کے ختم ہونے پر اگر کوئی خوشی کی جائے تو حرج نہیں، لیکن اس کا التزام کرنا اور اس کو ضروری سمجھنا جیسے آج کل ہوتا ہے۔ یہ طریقہ مناسب نہیں، کیونکہ سلف میں اس قسم کے التزام کا ثبوت نہیں۔

(فتاویٰ اہل حدیث: ۲/۳۳۶)

تکمیل قرآن پر مٹھائی وغیرہ تقسیم کرنا کیسا ہے؟

سوال: کیا ۲۷ رمضان کو قرآن مکمل کرنا پھر اس پر مٹھائی بسلسلہ تقاریر اور اجتماعی دعا اور پھر اس پر مزید اضافہ کہ مسجد کی لائٹس بند کرنا۔ کیا قرآن وسنت سے جائز ہے اور اندھیرے میں اجتماعی دعا کا کیا ثبوت ہے؟

(ثناء اللہ بھٹہ) (۱۳۔اپریل ۲۰۰۷ء)

جواب: بلاشبہ رمضان میں تلاوت قرآن مجید کا اہتمام کثرت سے ہونا چاہیے۔ چناں چہ مشکوٰۃ باب الاعتکاف میں حدیث ہے رسول اللہ ﷺ ہر رمضان میں جبریل علیہ السلام سے قرآنِ مجید کا دور کرتے تھے اور جس سال آپ فوت ہوئے اس سال دو دفعہ دور کیا۔ لیکن ستائیس تاریخ کی تعیین نہیں بلا تعیین ستائیس کو بھی ختم ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔ باقی امور کا اضافہ سنت سے ثابت نہیں۔

قرآن ناظرہ اور حفظ کے اختتام پر مٹھائی وغیرہ بانٹنا

سوال: ہمارے مدارس اور مساجد میں عام طور پر جب کوئی طالب علم ناظرہ قرآن پڑھ لیتا ہے یا قرآن پاک مکمل حفظ کرتا ہے تو آخری سبق کسی عالم کو بلا کر سنایا جاتا ہے اور قرآن کی فضیلت یا اس پر عمل کے سلسلے میں بچوں کو وعظ ونصیحت کی جاتی ہے اور گھر والے اپنی خوشی سے مٹھائی وغیرہ تقسیم کرتے ہیں، استاد کو کپڑے یا نقدی وغیرہ بھی پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے مدارس میں ''صحیح بخاری شریف'' کے اختتام پر بھی تقاریب منعقد ہوتی ہیں۔ اس کا شرعی حکم کیا ہے؟

کہیں یہ بدعت تو نہیں؟ قرآن وسنت سے وضاحت فرمائیں۔

(امام مسجد مبارک اہل حدیث، لاری اڈا چونیاں) (۱۲/ دسمبر ۲۰۰۳ء)

جواب: قرآنِ مجید یا بخاری شریف وغیرہ کے اختتام پر وعظ ونصیحت کا اہتمام محض یاددہانی، نصیحت اور اصلاح کی خاطر ہوتا ہے کہ جن عظیم کتابوں کو ختم کیا گیا ہے عملی زندگی کو بھی ان کی تعلیمات کی روشنی میں ڈھالنے کی سعی کرنی چاہیے۔ حضرت انس سے یہ بات ثابت ہے کہ قرآن مجید کے ختم کے موقع پر اپنے اہل وعیال کو اکٹھا کرکے وہ دعا کرتے تھے لیکن اس بارے میں نبی اکرم ﷺ سے کوئی شئے ثابت نہیں۔ اور اسی طرح بعض تفاسیر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے کہ ''سورہ بقرہ'' ختم کرنے پر انھوں نے دس اونٹ ذبح کیے اس سے معلوم ہوا ایسے مواقع پر اگر کوئی شخص خوشی کا اظہار کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

تاہم اس کو لازم نہیں کرلینا چاہیے اور نہ لازم سمجھنا ہی چاہیے جس طرح کہ بعض جگہ لوگوں کی عادت ہے، وہ ان امور کے اہتمام کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ جہاں تک عالم پر قراءت کا تعلق ہے سو یہ بات واضح طور پر قصہ ضمام بن ثعلبہ سے ثابت ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«وَاحْتَجَّ بَعْضُهُمْ فِي القِرَاءَةِ عَلَى العَالِمِ "بِحَدِيثِ ضِمَامِ بْنِ ثَعْلَبَةَ :قَالَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: آللَّهُ أَمَرَكَ أَنْ تُصَلِّيَ الصَّلَوَاتِ قَالَ: نَعَمْ قَالَ: فَهَذِهِ قِرَاءَةٌ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَخْبَرَ ضِمَامٌ قَوْمَهُ بِذَلِكَ فَأَجَازُوهُ.» [1]

مذکورہ دلائل کی روشنی میں عمل ہذا کا جواز معلوم ہوتا ہے لہٰذا اسے بدعت قرار دینا درست نہیں۔

ختم قرآن یا ختم بخاری شریف کے موقع پر مٹھائی یا کھانا کھلانا

سوال: ختمِ قرآن، ختم بخاری شریف وغیرہ یا کسی کتاب کی تکمیل پر جشن منانا اور کھانا کھلانا کیسا ہے؟

جواب: بعض تفسیروں میں لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ''سورۃ البقرۃ'' ختم کی تو دس اونٹ راہ للہ ذبح کر ڈالے۔ اس سے معلوم ہوا کسی دینی کتاب کے اختتام پر کھانا کھلانا یا شیرینی وغیرہ بانٹ دی جائے تو کوئی حرج نہیں کسی حد تک یہ شئے طبعی اور قدرتی خوشی میں بھی داخل ہے۔ البتہ اس فعل کو ضروری سمجھ کر اس کا اہتمام والتزام کرنا سلف سے ثابت نہیں۔ (وَاللّٰهُ تَعَالٰی اَعْلَمُ.)

قرآن سنانے کے بدلے میں تحائف کی وصولی

سوال: ''ترجمہ: حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں عرض گزار ہوا۔ یا رسول اللہ ﷺ! جس آدمی کو

[1] صحيح البخاري، بَابُ مَا جَاءَ فِي العِلْمِ وَقَوْلِهِ تَعَالَى ﴿وَقُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا﴾ (طه:١١٤)

میں قرآن مجید سکھاتا ہوں، اُس نے تحفے کے طور پر مجھے ایک کمان دی ہے۔ یہ مال تو ہے نہیں بلکہ اس کے ساتھ میں جہاد میں تیراندازی کیا کروں گا۔ فرمایا: اگر تم یہ چاہتے ہو کہ تمھیں آگ کا طوق پہنایا جائے تو اسے قبول کرلو...... ❶

اس حدیث شریف کی روشنی میں یا آپ کے علم کے مطابق قرآن وحدیث کی روشنی میں:

۱۔ جولڑکے یالڑکیاں مدرسوں میں پڑھتی ہیں وہ اپنے استادوں کو کپڑے یا کوئی دوسرا تحفہ دے سکتے ہیں یا نہیں؟

۲۔ رمضان المبارک میں جو حافظ صاحبان صرف تراویح میں قرآن پاک سنانے کے عوض جو معاوضہ یا تحفہ لیتے ہیں وہ جائز ہے یا نہیں؟

۳۔ جوعلماء جلسوں میں تقریروں کے پیسے لیتے ہیں وہ جائز ہے یا نہیں؟

(منظور احمد ارائیں، کوٹ لکھپت لاہور) (۱۷ اپریل ۱۹۹۸ء)

جواب : مشارٌ الیہ روایت میں المغیرہ بن زیاد ابو ھاشم الموصلی ''مختلف فیہ'' راوی ہے۔ امام احمد نے اس کو ضعیف الحدیث کہا ہے۔ اس نے کئی ایک منکر احادیث بیان کی ہیں اور ہر وہ حدیث جس کو اس نے مرفوع بیان کیا وہ منکر ہے اور ابوزرعہ نے کہا، اس کی حدیث قابل حجت نہیں۔ ❷

اس کے ہم معنی کئی ایک اور بھی روایات ''نیل الاوطار'' میں منقول ہیں جن سے ممانعت معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ ان میں بھی بعض میں کلام ہے لیکن مجموعی روایات قابلِ حجت ہیں کہ تعلیم قرآن پر اجرت نہیں لینی چاہیے۔ اس بناء پر امام ابوحنیفہ وغیرہ اس بات کے قائل ہیں کہ مطلقاً تعلیم قرآن پر اجرت نہیں لینی چاہیے لیکن جملہ آثار کے پیش نظر ظاہر یہ ہے کہ بلاشرط کوئی شئے قبول کرنے کا کوئی حرج نہیں۔ ''صحیح بخاری'' میں امام بخاری رحمہ اللہ کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔

لہٰذا سوال میں مذکور تین صورتوں کا بلاشروط جواز ہے اور شرط کرنی ناجائز ہے۔

قرآن کے حفظ میں ناکامی کی صورت میں کیا کرنا چاہیے؟

سوال : زید کو اس کے والدین نے قرآن مجید حفظ کرایا ہے۔ شروع میں زید کی بھی یہی خواہش تھی۔ تقریباً ایک تہائی قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد اُسے اندازہ ہوا کہ وہ ساری عمر قرآن مجید کو یاد نہیں رکھ سکتا۔ اس لیے اس نے والدین سے درخواست کی کہ مجھے مدرسہ سے ہٹا دیا جائے لیکن انھوں نے زبردستی کی۔ بادلِ نخواستہ زید نے بقیہ قرآن بھی حفظ کیا۔ لیکن اس میں اس کی کوئی رضامندی نہ تھی۔ پھر قراء حضرات کی تبدیلی نے بھی اس کی پڑھائی پر کافی اثر ڈالا۔ اب جب کہ زید کو صرف ایک تہائی قرآن یاد ہے جس میں اس نے دلچسپی لی۔ صورتِ بالا میں کیا زید قرآن کو بھلانے کی صورت میں اللہ کے عذاب کا مستحق ہے؟ اگر ہے تو کیا اس کا کوئی کفارہ ہے جس کے ذریعے زید آخرت میں خود کو اللہ

❶ سنن أبی داؤد، : ۳٤۱٦۔ سنن ابن ماجه، : ۲۱۵۷۔ مشکوٰۃ کتاب البیوع : ۲۹۹۰ .

❷ عون المعبود :۳/ ۲۷٦

کے عذاب سے بچا سکے۔ زید نے کافی عرصے کے بعد دوبارہ کوشش کی کہ قرآن کو مکمل کر لے لیکن دنیاوی مصروفیتوں کے باعث بظاہر ناممکن ہے۔ (ایک سائل) (۱۳ اکتوبر ۱۹۹۵ء)

جواب: زید کو چاہیے کہ اپنی متنوع قسم کی مصروفیات سے روزانہ وقت نکال کر قرآن مجید کے یاد اور حفظ کے لیے کوشاں رہے۔ اس کے باوجود اگر بظاہر ناکامی نظر آتی ہے تو پھر بھی وہ آخرت میں رضائے الٰہی سے سرخ رو ہوگا۔ صحیح حدیث میں ہے: «اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ» [1]

''تمام اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔''

قرآنی آیات میں جمع کے صیغوں کو مفردات سے تبدیل کرنے کا حکم:

سوال: قرآنی آیات کے جمع متکلم کے صیغوں کو واحد متکلم کے صیغوں میں تبدیل کر لینا کیا حکم رکھتا ہے؟ مذکورہ کتاب کے صفحہ نمبر ۱۵۱ حدیث نمبر ۸۶۵ میں قرآنی آیت: ﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا ﴾......الخ صیغہ واحد متکلم میں موجود ہے۔ حدیث کی سند پر غور فرمائیں اور مسئلہ کی وضاحت فرمائیں۔ کیا دوسری آیت میں بھی ایسے صیغہ واحد متکلم بنایا جا سکتا ہے۔ (سلیم اللہ زمان عربی ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول رائے ونڈ لاہور سٹی) (۲۰ نومبر ۱۹۹۲ء)

جواب: سوال میں مشار الیہ روایت جو قرآنی آیات میں صیغوں کی تبدیلی کے جواز پر دلالت کرتی ہے۔ وہ ضعیف اور ناقابلِ حجت ہے کیوں کہ اس میں عبداللہ بن الولید بن قیس التجیبی المصری ضعیف راوی ہے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« لَيِّنُ الْحَدِيْث وَ لَهُ عِنْدَ اَبِيْ دَاوُد حَدِيْثٌ وَاحِدٌ فِي الدُّعَاءِ اِذَا اسْتَيْقَظَ وَ ضَعَّفَهُ الدَّارَقُطَنِيُّ » [2]

اور علامہ البانی رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

« وَ اِسْنَادُهٗ ضَعِيْفٌ فِيْهِ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ الْوَلِيْدِ وَ هُوَ الْمِصْرِيُّ وَ هُوَ لَيِّنُ الْحَدِيْثِ كَمَا فِي التَّقْرِيْبِ» [3]

عمل اليوم والليلة، ص:۲۵۵، رقم الحديث :۸۷۱۔ اور عمل اليوم والليلة لابن السني، ص:۲۷۶، رقم الحديث: ۷۶۱ ۔اور سنن ابو داؤد بَابُ مَا يَقُوْلُ الرَّجُلُ اِذَا تَعَارَّ مِنَ اللَّيْلِ، مَعَ عون المعبود(۴/ ۴۷۴)

---

1. صحيح البخاري، كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟، رقم:۱
2. تقريب، ۱/ ۴۵۹، تهذيب:۶/ ۶۹
3. مشكوٰة :۱/ ۳۸۲، رقم الحديث:۱۲۱۴

نیز صاحب ''المرعاۃ'' فرماتے ہیں:

« وَ اَخْرَجَهُ اَيْضًا النَّسَائِيُّ وَابْنُ حِبانَ وَالْحَاكِمُ وَ صَحَّحَهُ وَابْنُ مَرْدَوَيَه وَ ابْنُ السنّي فِي عَمَلِ الْيَوْمِ وَاللَّيْلَة: ج:٢،ص:١٧٦.»

یاد رہے تمام ائمہ کے ہاں اس حدیث کا مدار عبداللہ بن الولید پر ہے اور وہ ضعیف ہے۔ لہٰذا حدیث ضعیف ٹھہری۔ مسئلہ ہذا میں کوئی صحیح واضح نص ایسی نگاہ سے نہیں گزری جو قرآنی آیات میں صیغوں کی تبدیلی کے جواز پر دال ہو۔ لہٰذا بلا دلیل ایسے اقدام سے احتیاط میں ہی راہِ سلامتی ہے۔ اور اسی کو اختیار کرنا چاہیے۔ حَتّٰى يَأْتِي اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ

(ذکر واذکار)

دونوں وظیفوں میں سے کونسا اختیار کروں؟

سوال: میں دو عدد پیپر بھیج رہی ہوں۔ ایک امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا لکھا ہوا ہے۔ دوسرے کے متعلق نہیں معلوم کہ یہ کونسے عالم ہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ آپ صرف اتنا بتادیں کہ دونوں میں سے کونسا قابلِ ترجیح اور قابلِ عمل ہے؟ (کے طاہرہ) (۷ مارچ ۱۹۹۷ء)

جواب: دونوں صفحوں پر مرقوم وظائف سے حسب رغبت پڑھ لیا کریں۔ البتہ وظیفہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا تعلق مخصوص جہت قلق واضطراب سے ہے جب کہ دوسرا وِرد عموی جملہ حاجات کے لیے ہے۔

استغفار، تسبیح اور تہلیل کی فضیلت کو پیش نظر رکھوں یا قرآن مجید کی منزل پختہ کروں؟

سوال: استغفار اور تسبیح وتہلیل کی بہت تاکید آئی ہے لیکن میں اگر اپنی قرآن مجید کی منزل پوری رکھوں تو پھر مندرجہ بالا تسبیحات سوسو دفعہ نہیں پڑھ سکتی۔ قرآن مجید زبانی یاد کیا ہوا ہے اگر منزل کم کر کے ذکر واذکار کی تسبیحات شروع کروں تو قرآن مجید بھولنا شروع ہو جاتا ہے۔ اگر دونوں کو جاری رکھوں تو صحت ساتھ نہیں دیتی کونسا راستہ اختیار کروں۔

(کے طاہرہ) (۷ مارچ ۱۹۹۷ء)

جواب: تلاوتِ قرآن کے عمل کو جاری رکھیں اور تسبیح وتہلیل کے وِرد کو بقدرِ استطاعت۔

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرۃ: ٢٨٦)

عوام الناس میں مشہور شش کلمے (چھ کلمے) کی کیا اصل ہے؟

سوال: عوام میں شش کلمے (چھ کلمے) مشہور ہیں۔ کیا دین میں ان کی کوئی اصل ہے۔ اگر دین میں کوئی ثبوت ہے تو آیا ان کلموں کے نام احادیث سے ثابت ہیں۔ مثلاً: اوّل کلمہ طیب...... دوم کلمہ شہادت...... تیسرا کلمہ تمجید...... چوتھا کلمہ توحید...... پانچواں کلمہ استغفار...... چھٹا کلمہ ردِّ کفر۔

نیز مذکورہ کلموں میں سے کوئی احادیث میں ہے تو آیا انہی الفاظ سے ہے جو مشہور ہیں؟ (۲۶ جولائی ۱۹۹۶ء)

جواب : چھ کلموں میں سے انفرادی طور پر بعض کلمات ثابت ہیں لیکن یہ نام غیر معروف ہیں۔ تفصیلی بحث الاعتصام میں پہلے شائع ہو چکی ہے۔

سانس بند کر کے ذکر کرنا

سوال : حافظ ثناء اللہ مدنی صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

سانس کے ساتھ ذکر کرنا مثال کے طور پر اللہ ہو وغیرہ پڑھتے ہوئے سانس دبا لینا، اندر والا سانس اندر اور باہر والا سانس باہر، آہستہ سانس اور نبض کی رفتار کے ساتھ ذکر کرنا۔ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اور جو یہ کہتے ہیں ''کہ جو دم غافل سو دم کافر'' وغیرہ، اس قسم کی باتوں کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ (سائل: محمد اسماعیل خان ذبیح) (۸ جون ۲۰۰۱ء)

جواب : ذکر کا مذکورہ طریقہ سنت سے ثابت نہیں ہے۔ ''صحیح بخاری'' میں حدیث ہے کہ جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے اور'' جو دم غافل سو دم کافر'' ان لوگوں کا خود ساختہ جملہ ہے شریعت میں اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ بلکہ احادیث سے ثابت ہے کہ نیت کر لینے سے حالتِ غفلت بھی مومن کی عبادت میں شمار ہوتی ہے۔ چنانچہ مسند ابی یعلی میں حدیث ہے: ''اللہ تعالیٰ قیامت کے روز کراماً کاتبین کو حکم فرمائے گا کہ میرے بندوں کے لیے فلاں فلاں اجر لکھو، فرشتے کہیں گے: اے ہمارے رب! ہمیں یاد نہیں کہ اس نے یہ کام کیے ہوں اور نہ ہی ہمارے صحیفوں میں موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اس نے ان کی نیت کی تھی۔''

''سنن نسائی'' میں حضرت ابو الدرداء نبی ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ'' جب آدمی بستر پر لیٹتا ہے اور رات کو قیام کا ارادہ کرتا ہے لیکن صبح تک آنکھ نہیں کھلتی، اللہ اس کو بقدرِ نیت ثواب عطا کرتا ہے اور اس کی نیند رب کی طرف سے اس پر صدقہ بن جاتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مذکورہ طریقہ حقائق جملہ کے خلاف ہے اور واقعات اس کی تردید کرتے ہیں۔

ورد وظیفے کا شرعی حکم اور طریقہ؟

سوال : ورد کا اسلام میں کیا تصور ہے؟ اور اگر کسی آیت کا ورد کرنا ہو تو طریقہ وضاحت سے بیان کریں۔

جواب : ورد و وظائف کرنے کی کتاب وسنت میں ترغیب وارد ہے۔ بعض کے لیے اوقات کا تعین ہے۔ اور بعض کے لیے وقت کی تعیین نہیں کی گئی بلکہ عامل کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے اسی طرح بعض صورتوں میں گنتی کا تعین ہے۔ جب کہ دیگر بعض میں گنتی کی تصریح نہیں۔ احادیث میں جس انداز میں وظائف وارد ہوئے ہیں۔ اسی طرح ہونے چاہئیں اپنی طرف سے کمی بیشی نہیں کرنی چاہیے۔

(علاج معالجہ اور دم وغیرہ کے آداب واحکام)

جنات نکالنے کے لیے کون سی آیات پڑھی جائیں؟

سوال: ماہنامہ ''محدث'' میں ''جادوگروں کا قلع قمع کرنے والی تلوار'' کے مصنف نے لکھا ہے کہ نبی ﷺ نے ہر اس دم کی اجازت دی ہے جس میں شرک نہ ہو، اسی لیے جادو کا اثر زائل کرنے اور جن نکالنے کے لیے جن آیات کا پڑھنا تجویز کیا گیا ہے، حدیث نبوی میں ان کا ذکر خاص طور پر ثابت نہ ہونا مانع نہیں۔ نبی کریم ﷺ سے جن نکالنے کے لیے جو آیات پڑھنا ثابت نہیں۔ کیا جن نکالنے کے لیے کہیں سے بھی ان آیات کا دم کرنا جائز ہے؟

(ہدایت الٰہی۔ لاہور) (۲۷ ستمبر ۲۰۰۲ء)

جواب: قرآن مجید چونکہ نسخۂ شفاء ہے لہٰذا کسی بھی اچھے مقصد میں کامیابی کے لیے آیات کا انتخاب ہوسکتا ہے؟

جنات کو پانی کی بوتل میں قید کرنے والے عامل سے علاج کروانا ٹھیک ہے؟

سوال: ایک اہل حدیث عامل جادو کے علاج کے سلسلے میں قرآن پڑھ کر جنات کو پانی بھری بوتل میں قید کرتا ہے اور کچھ دنوں کے بعد وہ پانی ضائع کردیتا ہے۔ کیا یہ طریقہ درست ہے؟

ایک اہل حدیث عامل نے پہلے جنات تابع کر رکھے تھے۔ اب اس کے پاس جنات نہیں ہیں۔ کیا ایسے عامل سے علاج کروانا ٹھیک ہے؟ جزاک اللہ خیراً (عثمان بھٹہ) (۱۶ مئی ۲۰۰۸ء)

جواب: جنات کو پانی بھری بوتلوں میں بند کرنے کا دعویٰ کرنا محض مکر وفریب اور اسوۂ نبوی کے خلاف ہے۔ ''صحیح بخاری'' کتاب الصلوٰۃ وغیرہ میں واقعہ معروف ہے کہ آپ کو جنات کے قید کرنے پر قدرت حاصل تھی۔ لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعا ﴿ رَبِّ هَبْ لِي مُلْكًا لَّا يَنبَغِي لِأَحَدٍ مِّنۢ بَعْدِيٓ ﴾ (صٓ:۳۵) کے پیش نظر آپ نے ایسا نہیں کیا۔ مقام نبوت کا احترام ہم پر بھی واجب ہے۔

جادو کا علاج طریقہ ''حاضرات'' سے کروانا جائز ہے؟

سوال: جادو کے علاج کے لیے اہل حدیث عاملوں نے کئی طریقے اختیار کر رکھے ہیں ان میں سے ایک طریقہ ''حاضرات'' کا یہ ہے کہ عامل کسی بچے یا بڑے کو بٹھا کر قرآن پڑھتے ہیں۔ جس پر عمل ہورہا ہوتا ہے وہ آنکھیں بند کرکے عموماً بیٹھتا ہے۔ قرآن کے الفاظ عامل منہ میں سراً پڑھتا ہے۔ جس پر عمل ہورہا ہو اسے مختلف چیزیں آنکھیں بند کیے نظر آتی ہیں۔ مثلاً جادو کہاں پر دفن ہے۔ کون جادو کروا رہا ہے۔ جادو کا توڑ کیا ہے وغیرہ۔ مختلف لوگ مختلف حالات میں وغیرہ۔

اس طرح جادو کا توڑ کیا جاتا ہے۔ پڑھنے والے کو کچھ نظر نہیں آتا۔ ایک عامل سے یہ کہا گیا کہ یہ تو غیب کی باتیں ہیں۔ اس کا جواب تھا کہ ایسا کرنا قرآن کی رو سے صحیح ہے۔ دلیل کے طور پر یہ آیت پڑھی:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ﴾ (الاعراف:۲۰۱)

''بے شک جو اللہ سے ڈرتے ہیں جب انھیں شیطان کی طرف سے وسوسہ آئے تو وہ آگاہ ہوجاتے ہیں تو ناگہانی دیکھنے والے ہوجاتے ہیں۔''

ان کا کہنا ہے کہ ﴿فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ﴾ (الاعراف:۲۰۱) کا معنی ہے کہ وہ جنات کو دیکھنے لگ جاتے ہیں۔ محترم برائے مہربانی فرمائیں کہ کیا ایسا عمل درست ہے؟ کیا یہ کہانت تو نہیں جو منع ہے؟ اگر یہ کہانت ہے تو کیا ایسے بندے کے پاس کسی بھی دم کے لیے جانا درست ہے؟ (عثمان بھٹہ) (۱۶ مئی ۲۰۰۸ء)

جواب: طریقہ حاضرات خود ساختہ عمل ہے شرع میں اس کا کوئی ثبوت نہیں اور اس عمل کے لیے قرآنی آیت سے جواز کا استدلال بلامحل ہے۔ اور آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے: متقی کہتے ہیں شرع کی پابندی کرنے والے کو یعنی امر کے مطیع اور نہی کے تارک کو۔ مطلب یہ ہوا کہ جب متقیوں کو شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ پہنچتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ ثواب اور وعید عذاب کو یاد کرتے ہی اپنا قصور اور شیطان کا فریب دیکھ کر فوری طور سے اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور توبہ کرتے ہیں۔ (حواشی مفسر قرآن مولانا عبدالستار محدث دہلوی رحمہ اللہ) کتاب وسنت میں وارد مسنون دعاؤں میں ہی ساری خیر وبرکت ہے۔ انہی پر اکتفاء کرنی چاہیے۔ واللہ ولی التوفیق

کیا جن شکل تبدیل کرسکتا ہے؟

سوال: کیا جن انسانوں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں؟ یا تکلیف دے سکتے ہیں؟ ان سے چھٹکارے کا کیا طریقہ ہے؟ (حذیفہ مبشر بن محمد بلال، انجینئر واپڈا، کوٹ ادو ضلع مظفر گڑھ) (۲۲ ستمبر ۱۹۹۵ء)

جواب: جنات اجسام لطیفہ سے عبارت ہیں۔ ان میں مختلف شکلیں اختیار کرنے کی قوت موجود ہے۔ کتبِ احادیث میں متعدد واقعات اس بات کے موید ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ حدیث ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ حفظ زکوۃ رمضان کے تحت فرماتے ہیں:

«وَاَنَّهٗ قَدْ يَتَصَوَّرُ بِبَعْضِ الصُّوَرِ فَتُمْكِنَ رُؤْيَتُهٗ وَ اَنَّ قَوْلَهٗ تَعَالٰى، اِنَّهٗ يَرٰكُمْ هُوَ وَ قَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ، مَخْصُوْصٌ بِمَا اِذَا كَانَ عَلٰى صُوْرَتِهِ الَّتِيْ خُلِقَ عَلَيْهَا.» [1]

[1] فتح الباری:۴/ ۴۸۹

"یعنی بعض دفعہ شیطان بعض صورتیں اختیار کر لیتا ہے جس سے اس کی رؤیت ممکن ہو جاتی ہے اور اللہ کا فرمان ہے کہ وہ اور اس کے بھائی تم کو ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم ان کو نہیں دیکھ سکتے۔ یہ اس صورت کے ساتھ مخصوص ہے جب وہ اپنی اصلی تخلیقی حالت میں ہو۔"

اور صاحب "تفسیر فتوحات الٰہیہ" فرماتے ہیں:

« اَیْ اِذَا کَانُوْا عَلٰی صُوَرِھِمُ الْاَصْلِیَّةِ اَمَّا اِذَا تَصَوَّرُوْا فِیْ غَیْرِھَا فَتَرَاھُمْ کَمَا وَقَعَ کَثِیْرًا» (۲/۱۳۳)

چند سطور بعد فرماتے ہیں:

« فَاَجْسَادُھُمْ مِثْلَ الْھَوَاءِ نَعْلَمُهٗ وَ نَتَحَقَّقُهٗ وَلَا نَرَاهُ وَ ھٰذَا وَجْهُ عَدَمِ رُؤْیَتِنَا لَھُمْ وَوَجْهُ رُؤْیَتِھِمْ لَنَا کَثَافَةُ اَجْسَادِنَا وَوَجْهُ رُؤْیَةِ بَعْضِھِمْ بَعْضًا اَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی قَوّٰی شُعَاعَ اَبْصَارِھِمْ جِدًّا حَتّٰی یَرٰی بَعْضُھُمْ بَعْضًا وَلَوْ جَعَلَ فِیْنَا تِلْكَ الْقُوَّةَ لَرَأَیْنَاھُمْ وَ لٰکِنْ لَمْ یَجْعَلْھَا لَنَا .»

ایک دفعہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے شیطان کو بصورتِ ہاتھی دیکھا تھا اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے:

« فَاِذَا ھُوَ بِدَابَّةٍ شِبْهِ الْغُلَامِ الْمُحْتَلِمِ فَقُلْتُ لَهٗ اَجِنِّیٌّ اَمْ إِنْسِیٌّ؟ قَالَ بَلْ جِنِّیٌّ .» [1]

اور "صحیح مسلم" میں بصورتِ سانپ بھی ذکر ہے۔

حاصل یہ ہے کہ جسم کثیف کی صورت میں انسان کا جن کو دیکھنا ممکن ہے لیکن بصورتِ جسم لطیف ناممکن ہے۔ کما تقدم۔

کیا جنات بنی آدم کو نقصان بھی پہنچا سکتا ہے؟ چھٹکارے کی صورت؟

سوال: کیا جن انسانوں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں؟ یا تکلیف دے سکتے ہیں؟ ان سے چھٹکارے کا کیا طریقہ ہے؟

(حذیفہ مبشر بن محمد بلال، انجینئر واپڈا، کوٹ ادو ضلع مظفر گڑھ) (۲۲ ستمبر ۱۹۹۵ء)

جواب: جن انسان کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ صحیح مسلم میں حدیث ہے۔ ایک شیطان نے نبی ﷺ کی نماز خراب کرنے کی سعی کی تھی اور قرآن میں ہے:

﴿وَاَنَّهٗ کَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ یَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْھُمْ رَھَقًا﴾ (الجن:٦)

"اور یہ کہ بعض بنی آدم بعض جنات کی پناہ پکڑا کرتے تھے۔ (اس سے) ان کی سرکشی اور بڑھ گئی تھی۔"

جنات سے چھٹکارے کی کیا صورت ہے؟

سوال: جنات سے چھٹکارے کا کیا طریقہ ہے؟ (حذیفہ مبشر بن محمد بلال، انجینئر واپڈا، کوٹ ادو ضلع مظفر گڑھ) (۲۲ ستمبر ۱۹۹۵ء)

[1] فتح الباری، ۴/ ۴۸۸-۴۸۹

جواب: ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ مسنون ورد اور وظائف کا اہتمام کیا جائے جو کتب احادیث میں موجود ہیں۔ بالخصوص آیت الکرسی اور سورہ بقرہ کی تلاوت۔

آسیب زدہ کے علاج کا طریقہ

سوال: ایک آدمی پر آسیب کا اثر ہے، اسے جب دورہ پڑتا ہے تو وہ جس پر خفا ہوتا ہے، اسے مارنے کے لیے جان توڑ کوشش کرتا ہے، جب اُسے دورہ پڑے تو اُس وقت کیا علاج کیا جائے؟ (سائل) (۲۱ مئی ۲۰۰۴ء)

جواب: سورۃ فاتحہ پڑھ کر دم کرنا چاہیے۔[1]

سوال: دورہ پڑنے کے دوران وہ عامل پر حملہ کرسکتا ہے یا نہیں؟ کیا دورانِ عمل وہ عامل کو نقصان پہنچا سکتا ہے؟ کیا یہ ضروری ہے کہ عمل شروع کرنے سے پہلے آسیب زدہ کو لوگ اچھی طرح قابو میں کرلیں اور پھر عمل شروع کیا جائے۔

(سائل) (۲۱ مئی ۲۰۰۴ء)

جواب: ایسے شخص کو قابو میں رکھنا ہر ممکن طریقہ سے ضروری ہے تاکہ کسی کو نقصان نہ پہنچائے۔

نظر بد اور تعلیم میں عدم دلچسپی کے بذریعہ مسنون دَم علاج بتائیں:

سوال: نظر بد اور تعلیم میں عدم دلچسپی کے علاج کے لیے کوئی مسنون دم بتا دیجیے۔ (سائل) (مارچ ۲۰۰۵ء)

جواب: درج ذیل دعا خود بھی پڑھیں اور جن افراد کو اس قسم کی شکایت ہو وہ بھی اس کا اہتمام کریں۔

« بِسْمِ اللّٰهِ أَرْقِیْ نَفْسِیْ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ یُؤْذِیْنِیْ، مِنْ شَرِّ كُلِّ نَفْسٍ أَوْ عَیْنٍ حَاسِدٍ۔ اَللّٰهُ یَشْفِیْنِیْ۔ بِسْمِ اللّٰهِ أَرْقِیْ نَفْسِیْ »[2]

تعلیم میں جو بچہ عدم دلچسپی کا شکار ہو، وہ کثرت سے اس دعا کا ورد کرے: ﴿ رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ ○ وَیَسِّرْ لِیْۤ اَمْرِیْ ○ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ ○ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ ○ ﴾ مشکل آسان ہوگی، ان شاءاللہ

قرآنی آیات کے ذریعے کھانے پینے کی اشیاء پر دم کرنا کیسا ہے؟

سوال: کیا قرآنِ پاک میں سے کوئی آیت یا سورۃ پڑھ کر پانی پر دم کرنا جائز ہے؟

(محمد ایوب ہتھان، ماتلی ضلع بدین) (۱۴ اپریل ۲۰۰۳ء)

جواب: بظاہر جواز ہے، ممانعت کی کوئی دلیل نہیں۔ تاہم دم کے لیے بالاجماع تین شرطیں ہیں۔

۱۔ اللہ کی کلام یعنی قرآن کے ساتھ ہو یا اللہ کے اسماء وصفات کے ساتھ ہو۔

---

[1] تحفة الذاکرین، ص: ۲٤٥

[2] صحیح مسلم، بَابُ الطِّبِّ وَالْمَرَضِ وَالرُّقٰی، رقم: ۲۱۸٦

۲۔ عربی زبان میں یا معروف المعنی الفاظ کے ساتھ ہو۔

۳۔ اس بات کا اعتقاد رکھا جائے کہ دم بذاتِ خود مؤثر نہیں بلکہ اس میں تاثیر اللہ کے حکم سے پیدا ہوتی ہے۔ ❶

قاضی عیاض نے کہا ہے کہ دم (جس میں منہ کی ہلکی سی ہوا کے ساتھ ساتھ معمولی نمی بھی ہوتی ہے) کا فائدہ یہ ہے کہ اس کی رطوبت یا اس کی ہوا سے برکت حاصل ہوتی ہے کیونکہ اس میں ذکر الٰہی کی آمیزش ہو چکی ہوتی ہے۔ ❷

جن احادیث میں پینے کی اشیاء میں پھونک مارنے سے منع کیا گیا ہے اس کا تعلق پینے کے وقت سے ہے۔ چنانچہ ''مستدرک حاکم'' میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے:

«لَا یَتَنَفَّسْ اَحَدُکُمْ فِی الْاِنَاءِ اِذَا کَانَ یَشْرَبُ مِنْهُ.» ❸

''آدمی جب پانی پیے تو پینے کے برتن میں سانس نہ لگائے۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ''فتح الباری'' (۱/ ۲۵۵) میں فرماتے ہیں:

«وَالتَّنَفُّسُ فِی الْإِنَاءِ مُخْتَصٌّ بِحَالَةِ الشُّرْبِ.»

''یعنی برتن میں سانس لینا پینے کی حالت کے ساتھ مخصوص ہے۔''

چنانچہ ''صحیح بخاری'' میں حدیث ہے:

«اِذَا شَرِبَ اَحَدُکُمْ فَلَا یَتَنَفَّسْ فِی الْاِنَاءِ.» ❹

''جب تم میں سے کوئی شخص (کوئی چیز) پیے تو برتن میں سانس نہ لے۔''

قرآنی آیات پڑھ کر پانی پر دَم یا پلیٹ میں تحریر یا تعویذ بنا کر گلے میں ڈالنا

سوال: قرآنی آیات پڑھ کر پانی پر دَم کرنا یا قرآنی آیات پلیٹ پر لکھ کر پینا یا قرآنی آیات لکھ کر تعویذ گلے میں ڈالنا مسنون ہے یا بدعت؟ (سائل: عطاء اللہ کوارٹر نمبر ۱۲۶، ریلوے گارڈ کالونی کوئٹہ) (۱۴ فروری ۱۹۹۲ء)

جواب: دَم میں پھونک مارنی جائز ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

« اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ کَانَ یَنْفُثُ فِی الرُّقْیَةِ» ❺

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم دَم میں پھونک مارا کرتے تھے۔''

❶ فتح الباری: ۱۰/ ۱۹۵

❷ فتح الباری: ۱۰/ ۱۹۷

❸ المستدرك علی الصحیحین للحاکم، کِتَابُ الْأَشْرِبَةِ، رقم: ۷۲۰۷

❹ صحیح البخاری، کتاب الوضوء، بَابُ النَّهْیِ عَنْ اِلاسْتِنْجَاءِ بِالْیَمِینِ، رقم: ۱۵۳

❺ مصنف ابن ابی شیبة، مَنْ رَخَّصَ فِی النَّفْثِ فِی الرُّقَی، رقم: ۲۳۵٦٤ (ج: ۸، ص: ٤٤)

قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں، دَم میں پھونکنے سے مقصود اس رطوبت اور ہوا سے برکت کا حصول ہے جو ذکر کی معیت میں نکلتی ہے جس طرح لکھے ہوئے ذکر کے دھوؤں سے تبرک کیا جاتا ہے۔

نیز اس کا مقصد نیک شگون لینا بھی ہوسکتا ہے جس طرح کہ دَم کرنے والے سے سانس الگ ہو رہی ہے اسی طرح مریض سے تکلیف اور مرض دُور ہو جائے۔ ❶

اور صاحب ''تیسیر العزیز الحمید'' (ج:۱ص:۱۶۶) فرماتے ہیں، دَم طبِ ربانی ہے پس جب مخلوق میں سے نیک لوگوں کی زبان سے دَم کیا جائے تو اللہ کے حکم سے شفاء ہو جاتی ہے۔

اور علامہ ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں، دَم کرتے وقت پھونک مارنے سے منہ کی رطوبت، ہوا اور سانس سے مدد لی جاتی ہے جو ذکر، دُعا اور مسنون دَم کے ساتھ نکلتی ہے اس لیے کہ دَم پڑھنے والے کے دل اور منہ سے نکلتا ہے پس جب یہ دَم باطنی اجزاء میں سے رطوبت، ہوا اور سانس کے ساتھ مل جائے تو تاثیر کے لحاظ سے مکمل اور عمل کے لحاظ سے قوی ہو جاتا ہے اور ان کے مجموعے سے ایسی مجموعی کیفیت پیدا ہوتی ہے جیسا کہ مختلف دوائیوں کے باہم ملانے سے ہوتی ہے۔ ❷

امام احمد رحمہ اللہ کے بیٹے کا کہنا ہے کہ میں نے اپنے والد کو مریضوں کے لیے تعویذ لکھتے دیکھا اپنے اہل خانہ اور اہل قرابت کو تعویذ لکھ دیتے۔ اور عسر ولادت کی بناء پر عورت کو چاندی کے برتن یا لطیف چیز پر ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی تعویذ لکھ دیتے۔ ❸

ابن عباس رضی اللہ عنہما کے تعویذ کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مصنف ابن ابی شیبۃ، ج:۸،ص:۲۷۔

نیز مروی ہے حضرت لیث رحمہ اللہ اور مجاہد رحمہ اللہ بیمار کو قرآن کی آیت لکھ کر پلانے میں کوئی حرج نہیں جانتے تھے۔ ❹

قرآنی آیات اور ثابت شدہ دعاؤں پر مشتمل تعویذ لکھنا اگرچہ جائز ہے لیکن میرے نزدیک راجح اور محقق بات یہ ہے کہ تعویذوں سے مطلقاً پرہیز کیا جائے۔ صرف ثابت شدہ دَم پر اکتفاء کی جائے، اس بارے میں میرے قلم سے تفصیل ''الاعتصام'' میں چند ماہ قبل ہو چکی ہے۔

نماز میں باقاعدگی کے لیے کوئی دعا یا دَم یا وظیفہ بتائیں؟

سوال: میرے بھائی کا ایک بیٹا ۱۵ سال کا ہے اور دو بیٹیاں ۱۰۔۸ سال کی ہیں۔ ہمارا سارا گھرانہ حتی کہ دونوں بچیوں تک نماز پانچ وقت باقاعدگی سے پڑھتی ہیں لیکن میرا بھتیجا جو ۱۵ سال کا ہے۔ نماز باقاعدگی سے نہیں پڑھتا۔ دن میں

❶ فتح الباری، ج:۱۰، ص:۱۶۸

❷ الطب النبوی، ص:۱٤۰

❸ مسائل امام احمد بن حنبل، ج:۳، ص:۱۳٤۵

❹ مصنف ابن ابی شیبۃ، ج:۸، ص:۲۸

ایک یا دو نمازیں ڈانٹ ڈپٹ کر یا مار کر پڑھاتے ہیں۔ چھوٹی بہنوں کو نماز پڑھتے دیکھ کر شرمندہ نہیں ہوتا۔ کوئی دعاء یا دم بتائیں جو اس پر اثر انداز ہو۔ (نصرت ہاشمی مزنگ چونگی) (۲۱ جون ۱۹۹۶ء)

جواب: اس بچے کو ''سورۂ فاتحہ'' پڑھ کر دم کر دیا کریں۔ اس سے ان شاء اللہ جذبہ نیکی پیدا ہوگا۔

مزید کوشش کریں کہ وقتاً فوقتاً یہ کسی موحد عالم یا نیک صالح آدمی کے پاس بیٹھا کرے۔ اس سے قلبی جلاء کے علاوہ باطنی کیفیت بدل کر تعلق باللہ مضبوط ہوگا۔ ان شاء اللہ۔

انجانے خوف سے بچنے کے لیے کوئی وظیفہ بتائیے

سوال: میں جب چھوٹی تھی تو بہت بہادر ہوا کرتی تھی، مجھ میں بڑی ہمت اور شجاعت ہوا کرتی تھی لیکن اب جب کہ میری عمر ۱۷ سال ہے مجھے بے حد ڈر لگنے لگا ہے۔ خاص طور پر اندھیرے اور تنہائی کا تصور بھی رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔ جب کبھی رات کو اندھیرے والی جگہ پر نظر پڑتی ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے کوئی کفن پوش مردہ کھڑا ہے اور اگر کبھی گھر میں اندھیرے والی جگہ سے گزروں تو ایسا لگتا ہے جیسے کوئی خنجر لیے میرے پیچھے چلا آ رہا ہے۔ بچپن کے سنے ہوئے خطرناک واقعات بار بار ذہن میں آتے ہیں۔ کچھ لوگ آیات کے ورد کا مشورہ دیتے ہیں لیکن میرا یہ مسئلہ ہے کہ میرے ذہن میں فوراً یہ خیال آتا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اللہ میرے امتحان کے لیے کوئی جن بھوت نہ بھیج دے۔ میں آیت الکرسی، دعاءِ یونس، حسبی اللہ ونعم ...... معوذتین، لاحول ...... وغیرہ پڑھتی رہتی ہوں۔

خوف کے وقت جسم کے بال کھڑے ہو جاتے ہیں، دل دھڑکنے لگتا ہے اور ہاتھ پیروں سے جان نکل جاتی ہے۔ اور پورے جسم پر پسینہ آجاتا ہے۔ (سائل) (۱۹ مارچ ۲۰۰۴ء)

جواب: کتاب وسنت سے ثابت شدہ اوراد و وظائف کو بالعموم کثرت سے پڑھیں، امید ہے ذہنی کیفیت درست ہو جائے گی۔

- «لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْعَظِيْمُ الْحَلِيْمُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ»
- «يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِيْثُ»
- «اَللّٰهُ اَللّٰهُ رَبِّيْ لَا اُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا»

اذکار اور وظائف کے بعد جسم پر پھونک مارنا یا ہاتھوں پر پھونک مار کر جسم پر ملنا؟

سوال: اذکار کرنے کے بعد اپنے جسم پر پھونک مارنا یا ہاتھوں کو پورے جسم پر ملنا حضور ﷺ سے ثابت ہے یا نہیں؟

(خالد محمود بن غفور احمد۔ برکی، ضلع قصور) (۴ اپریل ۲۰۰۳ء)

جواب: معوّذات (الفلق، الناس، الاخلاص) پڑھ کر سوتے وقت یہ عمل کرنا سنت سے ثابت ہے۔[1] عمومی ذکر اذکار

---

[1] صحيح البخاري، بَابُ الرُّقَى بِالْقُرْآنِ وَالْمُعَوِّذَاتِ، رقم: ٥٧٣٥

میں عمل ہذا ثابت نہیں۔

خودساختہ ورد وظیفوں کی شرعی حیثیت

سوال : بعض مسجدوں اور دفتروں میں ایک اشتہار لگا ہوتا ہے جس کا عنوان ہے: روزانہ سوتے وقت کے عملیات۔" رسول اکرم ﷺ نے ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اے علی! رات کو پانچ کام کر کے سویا کرو (۱) چار ہزار دینار صدقہ کر کے (۲) ایک قرآن پڑھ کر (۳) جنت کی قیمت دے کر (۴) دو لڑنے والوں میں صلح کرا کے (۵) ایک حج کر کے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے معذوری ظاہر کی تو فرمایا:

(۱) چار دفعہ "سورۂ فاتحہ" پڑھنا چار ہزار دینار صدقے کے برابر ہے۔ (۲) تین بار قل پڑھنا قرآن پڑھنے کے برابر ہے۔ (۳) تین مرتبہ درود پڑھنا جنت کی قیمت ہے۔ (۴) دس مرتبہ استغفار دو آدمیوں میں صلح کے برابر ہے۔ (۵) چار مرتبہ تیسرا کلمہ پڑھنا حج کے برابر ہے...... کیا اس روایت کی کوئی اصل ہے؟ (عبدالستار۔ گوجرانوالہ) (۲ مارچ ۲۰۰۱ء)

جواب : مذکورہ وظائف اگرچہ قرآن وحدیث سے ہی ماخوذ ہیں مگر ان کے نتیجے میں بتایا گیا اجر وثواب کسی حدیث سے ثابت نہیں۔ اس اعتبار سے یہ وظائف خودساختہ ہی ہیں، شریعت میں ان کی کوئی اصل نہیں اور اس نیت سے ان پر عمل کرنا بدعت کے زمرے میں آتا ہے۔

مساجد میں خودساختہ طریقوں سے ذکر کی محافل کے انعقاد کا حکم؟

سوال : بہت سی مسجدوں میں ذکر کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں، جن میں خودساختہ طریقوں سے ذکر الٰہی کا اہتمام اور بعض الفاظ کا مخصوص انداز میں وِرد کرایا جاتا ہے۔ کیا احادیث میں ان کا کوئی ثبوت ملتا ہے؟ (ایک سائل لاہور) (۲۸ جنوری ۱۹۹۴ء)

جواب : بلاریب اللہ کی یاد اور اُس کا ذکر ہر مومن کا مطلوب اور حرزِ جان ہے۔ لیکن اس کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی اور مخصوص ہیئت اجتماعی اور خاص انداز میں ذکر مُقطّع کا شریعتِ مطہرہ میں کہیں نام ونشان نہیں ملتا۔ جس طرح کہ مشارٌ الیہ قوم کے ہاں مروّج ہے۔ یاد رہے جو شئے عہدِ نبوت میں دین تھی وہ آج بھی دین ہے اور جو اس وقت دین نہیں تھی وہ آج بھی دین نہیں بن سکتی، چاہے اس کے اثبات کے لیے سو جتن کیے جائیں۔ (قالہ الامام مالک)

اسی بناء پر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے مسجد میں جمے ہوئے حلقۂ ذکر جہاں سو سو دفعہ تسبیحات اور تکبیرات کا وِرد کرایا جا رہا تھا، تند وتیز لہجہ میں فرمایا:

«يَا أُمَّةَ مُحَمَّدٍ، مَا أَسْرَعَ هَلَكَتَكُمْ هَؤُلَاءِ صَحَابَةُ نَبِيِّكُمْ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُتَوَافِرُونَ، وَهَذِهِ ثِيَابُهُ لَمْ تَبْلَ، وَآنِيَتُهُ لَمْ تُكْسَرْ، وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، إِنَّكُمْ لَعَلَى مِلَّةٍ هِيَ أَهْدَى مِنْ مِلَّةِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَوْ مُفْتَتِحُو بَابِ ضَلَالَةٍ.

قَالُوا :وَاللَّهِ يَا أَبَا عَبْدِ الرَّحْمَنِ، مَا أَرَدْنَا إِلَّا الْخَيْرَ .قَالَ :وَكَمْ مِنْ مُرِيدٍ لِلْخَيْرِ لَنْ يُصِيبَهُ» ❶

''یعنی اے امت محمدیہ! تمھیں کیا ہوگیا کس قدر جلدی برباد ہورہے ہو۔ ابھی تو نبی اکرم ﷺ کے اصحاب تم میں بکثرت موجود ہیں اور یہ آپ ﷺ کے کپڑے بوسیدہ نہیں ہوئے اور برتن ٹوٹنے نہیں پائے مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ کیا تمہارا مسلک زیادہ ہدایت والا ہے یا محمد ﷺ کا دین یا کیا تم گمراہی کا دروازہ کھول رہے ہو؟ لوگوں نے کہا: ابوعبدالرحمٰن ہمارا ارادہ تو محض خیر ہے۔ جواباً فرمایا کتنے ہی وہ لوگ ہیں جو خیر کو چاہتے ہوئے بھی اس سے محروم رہتے ہیں۔''

لہٰذا ماثورہ ادعیہ کے ساتھ یادِ الٰہی کی کیفیت وہی ہونی چاہیے جس کی تصریح کتاب ھدیٰ میں بایں الفاظ موجود ہے: ﴿الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ ....﴾ (آل عمران:۱۹۱) ''جو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے (ہر حال میں) اللہ کو یاد کرتے ہیں۔''

یہاں یہ اشکال پیدا ہوسکتا ہے کہ بعض روایات میں وارد ہے:

«مَا جَلَسَ قَوْمٌ مَجْلِسًا يَذْكُرُونَ اللَّهَ فِيهِ إِلَّا حَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ، وَتَغَشَّتْهُمُ الرَّحْمَةُ، وَتَنَزَّلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِينَةُ، وَذَكَرَهُمُ اللَّهُ فِيمَنْ عِنْدَهُ.» ❷

''یعنی جب کوئی قوم کسی مجلس میں اللہ کا ذکر کرتی ہے تو فرشتے ان کا احاطہ کر لیتے ہیں اور رحمت ان کو ڈھانپ لیتی ہے اور ان پر تسلی نازل ہوتی ہے۔ اور ان کا ذکر خیر جو اللہ کے پاس (ملائکہ) ہیں ان میں ہوتا ہے۔''

اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی تفسیر ''صحیح مسلم'' کی حدیث میں یوں ہے:

«وَمَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِي بَيْتٍ مِنْ بُيُوتِ اللهِ، يَتْلُونَ كِتَابَ اللهِ، وَيَتَدَارَسُونَهُ بَيْنَهُمْ، إِلَّا نَزَلَتْ عَلَيْهِمِ السَّكِينَةُ، وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ وَحَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ، وَذَكَرَهُمُ اللهُ فِيمَنْ عِنْدَهُ، وَمَنْ بَطَّأَ بِهِ عَمَلُهُ، لَمْ يُسْرِعْ بِهِ نَسَبُهُ» ❸

''یعنی جب کوئی قوم اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر یعنی مسجد وغیرہ میں جمع ہوکر آپس میں کتاب اللہ کو پڑھتے پڑھاتے ہیں تو ان پر سکینت نازل ہوتی ہے۔ اور اللہ کی رحمت ان کو ڈھانپ لیتی ہے اور فرشتے گھیر لیتے ہیں اور ان کا تذکرہ جو اللہ کے پاس ہیں ان میں ہوتا ہے۔''

❶ سنن الدارمی، بَابٌ فِي كَرَاهِيَةِ أَخْذِ الرَّأْيِ، رقم:۲۱۰، (۱/ ۶۸) باسناد صحیح
❷ سنن ابن ماجه، بَابُ فَضْلِ الذِّكْرِ، رقم:۳۷۹۱
❸ صحیح مسلم، بَابُ فَضْلِ الِاجْتِمَاعِ عَلَى تِلَاوَةِ الْقُرْآنِ وَعَلَى الذِّكْرِ، رقم:۲۶۹۹

صاحب ''المرعاۃ'' «فِیْ بَیْتٍ مِنْ بُیُوْتِ اللّٰہِ» کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

«هُوَ شَامِلٌ لِجَمِیْعِ مَا یُبْنٰی لِلّٰهِ تَقَرُّبًا اِلَیْهِ مِنَ الْمَسَاجِدِ وَالْمَدَارِسِ وَالرِّبَاط»(۱۸۴/۱)

''یعنی لفظ حدیث ''اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں'' یہ لفظ شامل ہے تمام ان چیزوں کو جن کی تعمیر اللہ کے تقرب کے لیے ہوئی ہے۔ مثلاً مساجد، مدارس اور رباط یعنی فقراء کے لیے دینی وقف گاہیں وغیرہ۔''

اس سے معلوم ہوا ان احادیث کے مصداق وہ پاکباز لوگ ہیں جو ہمہ تن کتاب و سنت کی اشاعت میں مصروفِ کار رہتے ہیں نہ کہ اہل بدعت جو اپنی طرف سے محافل ذکر کا اختراع کر کے رسول الثقلین کے ذمے تھوپتے ہیں۔

دوسرے بات یہ ہے کہ پہلی حدیث میں سابقہ پروگرام کے تحت کسی خاص محفل کے انعقاد کا ذکر نہیں ہے بلکہ مقصود یہاں اتفاقی مجلس ہے جو عام طور پر مساجد میں جمتی رہتی ہے قطع نظر ذکری اجتماعی قیادت کے ہر ایک اپنی بساط کے مطابق انفرادی طور پر ذکر میں مصروف رہتا ہے۔ یہ بھی مجلس کی صورت ہی ہے۔

اور جہاں تک اس محفل سے آپ کے محظوظ ہونے کا تعلق ہے سو اس بارے میں عرض ہے بدعت کا یہ خاصہ ہے کہ ہمیشہ اس میں تحسینی پہلو غالب نظر آتا ہے جب کہ رسولِ اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

« مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَیْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ »[1]

''یعنی جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے۔''

« اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَارْزُقْنَا اِتِّبَاعَهُ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَارْزُقْنَا اجْتِنَابَه »

۱۵ منٹ میں ۹ قرآن پڑھنے کا ثواب؟

سوال : محترمی و مکرمی شیخ الحدیث صاحب۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

ایک پمفلٹ بعنوان ''صرف ۱۵ منٹ میں ۹ قرآن پاک اور ایک ہزار آیات پڑھنے کا ثواب مل سکتا ہے'' ارسال خدمت ہے۔ جس میں کلام حکیم کی کچھ سورتیں اور آیات درج ہیں۔ اس میں بحوالۂ احادیث بتایا گیا ہے کہ ان کی مجوزہ تلاوت سے مذکورہ ثواب مل سکتا ہے...... یہ طریقہ عام ہونے سے خدشہ ہے کہ اکثر لوگ مکمل قرآنِ کریم کی تلاوت چھوڑ دیں گے۔ آپ سے اس مسئلے پر روشنی ڈالنے کی درخواست ہے۔ (محمد اسلم رانا، شاہدرہ لاہور) (۱۳ جولائی ۲۰۰۱ء)

جواب : مذکور دعویٰ بے بنیاد ہے، شریعت اسلامیہ میں اس کی کوئی اصل نہیں، ''صحیح بخاری'' میں حدیث ہے کہ:

« مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَیْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ »[2]

''یعنی جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے۔''

---

[1] صحیح البخاری، بَابُ إِذَا اصْطَلَحُوا عَلَی صُلْحِ جَوْرٍ فَالصُّلْحُ مَرْدُودٌ، رقم:۲۶۹۷

[2] ایضًا

وظائف میں اپنی طرف سے تعداد مقرر کرنا کیسا ہے؟

سوال: اگر کوئی شخص کسی خاص وقت پر مخصوص تعداد میں کوئی ذکر کرے جو تعداد حدیث میں مذکور نہ ہو تو کیا ایسا فعل بدعت میں شمار ہوسکتا ہے یا نہیں؟ کیا ایسا فعل باعثِ ثواب ہوسکتا ہے؟ خصوصاً جو اسے ضروری سمجھ کر ہمیشہ کرے۔ (نور زماں۔بنوں) (۱۹ جنوری ۱۹۹۶ء)

جواب: جملہ ذکر و اذکار اور وِرد و وظائف میں اپنی طرف سے تعداد مقرر کرنی جائز نہیں۔ یہ صرف نبی اکرم ﷺ کا کام ہے۔اپنی طرف سے تعین کرنا بدعت شمار ہوگا۔ حدیث میں ہے:

« مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا ھٰذَا مَا لَیْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ »[1]

''یعنی جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے۔''

وظائف میں اپنی طرف سے تخصیص کرنا؟

سوال: تیسرا کلمہ «سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهَ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ» صبح وشام سو مرتبہ درود شریف صبح شام سو مرتبہ۔توبہ واستغفار صبح شام سو مرتبہ پڑھنا کیسا ہے۔اگر یہ تسبیحات پڑھی جائیں تو مسنون ہیں؟ (سائل) (۲۹ مارچ ۱۹۹۶ء)

جواب: مذکور وِرد کے کلمات بروایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ''صحیح مسلم'' میں ثابت ہیں۔ (۳۴۵/۳) اس روایت میں گنتی کا تعین نہیں لیکن اسی باب کے اخیر میں تسبیح میں سو دفعہ گنتی کا بھی ذکر ہے۔اس بناء پر اگر سو دفعہ وِرد ہذا کا تعین کر لیا جائے تو جواز کی گنجائش ہے لیکن وِرُود کی گنتی کو حسب توفیق پر چھوڑ دینا چاہیے کیونکہ تعین متعذر ہے اور اسی کے زمرہ میں عموی توبہ اور استغفار وغیرہ شامل ہے۔

وظائف میں اپنی طرف سے حد بندی ناجائز ہے؟

سوال: مکرمی ومحترمی مفتی صاحب۔السلام علیکم

کراچی کے حالات دن بدن ابتر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔اس سلسلہ میں بعض علماء کا یہ کہنا ہے کہ مساجد میں استغفار ''یا سلام'' اور آیت کریمہ کے ختم کیے جائیں۔سوا لاکھ مرتبہ اور چلتے پھرتے بھی ان کا وِرد کیا جائے۔کیا یہ اوراد احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہیں۔حوالہ تحریر فرمائیں اور کیا احادیث میں سوا لاکھ کی گنتی بھی ملتی ہے۔امید ہے کہ احادیث کے حوالے کے ساتھ ہماری رہنمائی فرمائیں گے۔

اسی طرح ایک دوسرے عالم کا فرمانا کہ انھوں نے طاعون کی وباء کے بارے میں تحریر فرمایا ہے کہ ''سورۂ یٰسین'' کی

---

[1] ایضًا

تلاوت کی جائے۔ اور لفظ مبین پر اذانیں دی جائیں۔ کتاب وسنت کی رہنمائی میں جواب مرحمت فرمائیں۔ والسلام

(محمد خان دوکاندار فرنٹیر کالونی کراچی) (۱۷ مارچ ۱۹۹۵ء)

جواب : مصائب ومشکلات سے نجات کے لیے بلاشبہ آیت کریمہ ﴿لَآ اِلٰـهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰـنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (الانبیاء:۸۷) کا وِرد کرنا مسنون ہے لیکن عدد اور وقت کا تعین کتاب وسنت سے ثابت نہیں۔

لہٰذا بلاتحدید یہ وظیفہ جاری رہنا چاہیے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت ساری دعائیں ایسے موقع پر پڑھنی رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں ان کا بھی اہتمام ہونا چاہیے۔ مثلاً:

۱۔ «لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ الْعَظِيمُ الْحَلِيمُ، لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ، لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ رَبُّ السَّمَوَاتِ وَرَبُّ الْأَرْضِ، وَرَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ» [1]

۲۔ «حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ» [2]

۳۔ «اللَّهُمَّ رَحْمَتَكَ أَرْجُو، فَلَا تَكِلْنِي إِلَى نَفْسِي طَرْفَةَ عَيْنٍ، وَأَصْلِحْ لِي شَأْنِي كُلَّهُ، لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ» [3]

بہتر ہے صحیح دعاؤں پر مشتمل کوئی کتاب "الکلم الطیب" بتحقیق الالبانی وغیرہ اپنے پاس رکھیں۔ فرصت کے لمحات میں اللہ کی یاد میں منہمک رہیں۔ اور عمومی استغفار وغیرہ کے لیے بھی مسجدوں کا انتخاب شرط نہیں۔ ہر طاہر مقام پر وِرد ہوسکتا ہے۔ اس طرح وباء طاعون میں ''سورۂ یٰسین'' کے ہر لفظ مبین پر اذانیں دینی بھی کتاب وسنت سے ثابت نہیں۔ اذانوں کے بغیر ہی مذکورہ سورت کی تلاوت باعثِ برکت اور حرزِ جان ہے۔ صحیح حدیث میں ہے:

« مَنْ اَحْدَثَ فِيْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ » [4]

یعنی ''جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے۔''

قرآنی آیات کے مختلف وظائف

سوال : قرآنی آیات کا کسی کام یا کاروبار کے لیے وظیفہ کرنا کیسا ہے؟ بعض کتابوں میں لکھا ہوا ملتا ہے کہ اس آیت کو اتنی مرتبہ پڑھنے سے فلاں کام ہو جائے گا وغیرہ۔ کیا اس طرح تعداد مقرر کرکے مخصوص قرآنی آیات کا وظیفہ کیا جا سکتا ہے؟ (سائل محمد یحییٰ عزیز ڈاھروی) (۹ فروری ۲۰۰۱ء)

جواب : بلاشبہ قرآنی آیات کی تلاوت باعث خیر وبرکت ہے لیکن ان کے ورد اور وظائف میں اپنی طرف سے تعداد

[1] صحیح البخاری، بَابُ الدُّعَاءِ عِنْدَ الْكَرْبِ، رقم:٦٣٤٦

[2] صحیح البخاری، بَابُ (إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ)، رقم:٤٥٦٣

[3] سنن أبی داؤد، بَابُ مَا يَقُولُ إِذَا أَصْبَحَ، رقم:٥٠٩٠، بسند حسن

[4] صحیح البخاری، بَابُ إِذَا اصْطَلَحُوا عَلَى صُلْحِ جَوْرٍ فَالصُّلْحُ مَرْدُودٌ، رقم:٢٦٩٧

مقرر کرنا درست عمل نہیں۔ ❶

جمعہ کے روز عصر کے بعد مخصوص وظیفہ کرنے کا حکم

سوال : جمعہ کے روز عصر کے بعد اسی جگہ بیٹھے بیٹھے اَسّی دفعہ خاص درود پاک پڑھیں تو ۸۰ سال کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ کیا یہ حدیث قوی ہے؟

جواب : میرے علم میں نہیں۔

بیٹے کی بیماری پر ستر دفعہ ''سورۃ یٰسین'' پڑھوانا؟

سوال : ایک عورت کا بیٹا سخت بیمار تھا۔ اس نے محلے کی تمام ہم مسلک عورتوں کو اکٹھا کر کے ''سورۃ یٰسین'' ستر ستر بار پڑھوا کر دعا منگوائی ہے کیا قرآن وحدیث میں اس کا کوئی جواز ہے؟۔ (محمد نعیم شہزاد واپڈا ابوائز سکول) (۹ جولائی ۱۹۹۳ء)

جواب : مذکورہ طریقہ کتاب وسنت کی کسی نص سے ثابت نہیں۔ بچے کی والدہ محترمہ کو خود ہی رب العزت کے حضور دعاء کرنی چاہیے تھی۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ حتمی ویقینی ہے۔

﴿ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ﴾ (البقرۃ:١٨٦)

''جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں۔''

نیز فرمایا:

﴿اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ يَكْشِفُ السُّوْءَ ﴾ (النمل:٦٢)

''بھلا کون بے قرار کی التجاء قبول کرتا ہے جب وہ اس سے دعا کرتا ہے اور (کون اس کی) تکلیف کو دور کرتا ہے۔''

قریب المرگ شخص کے پاس ''سورۂ یٰسین'' پڑھنا

سوال : کیا قریب المرگ انسان کی روح بآسانی قبض ہونے کے لیے ''سورۃ یٰسین'' پڑھی جا سکتی ہے؟ اس کے پڑھنے کا کوئی ثبوت یا جواز ہے؟ (فقط والسلام، ماسٹر غلام رسول، خانیوال) (۹ نومبر ۲۰۰۷ء)

جواب : اس سلسلہ میں وارد حدیث ضعیف ہے۔ ❷

مشکلات میں آسانی کا وظیفہ

سوال : جناب حافظ صاحب! السلام علیکم! گزارش ہے کہ اللہ نے مجھے دنیا کی بہت سی نعمتوں سے نوازا ہوا ہے، خدا کا

---

❶ غالباً اس سے حضرت مفتی صاحب کی مراد یہ ہے کہ اگر سنت سے کوئی تعداد ثابت نہ ہو تو کسی تعداد کے مسنون ہونے کا گمان کر لینا درست نہیں، البتہ اگر کوئی شخص اپنی سہولت کی خاطر اور ہمیشہ عمل کرنے کے لیے کوئی تعداد مقرر کر لیتا ہے تو اس کے جائز ہونے میں کوئی کلام نہیں ہے۔ (وَاللّٰهُ سُبْحَانَهُ وَتَعَالٰى اَعْلَمُ .) (عبدالوحید)

❷ ارواء الغلیل: ۳/ ۱۵۰

شکر ہے کہ مجھے کسی چیز کی کمی نہیں۔ لیکن میری بچی جوان ہے اس کے رشتے کے لیے کئی جگہ بات کی ہے مگر کوئی رشتہ نہیں ملتا، ایک جگہ رشتہ ہوا تھا ایک سال بعد انھوں نے بھی جواب دے دیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ رشتے کو باندھا ہوا ہے یا جادو وغیرہ کیا ہوا ہے۔ اسے کھولنے کے لیے وظیفہ کی ضرورت ہے۔ کیا کوئی وظیفہ ہے؟ اگر ہے تو براہِ کرم شائع کر دیں یا کوئی دعا وغیرہ بتا دیں، تاکہ میری پریشانی دور ہو، میں بہت پریشان ہوں۔ (شیخ محمد سعید، لاہور) (۸ جون ۲۰۰۱ء)

جواب : توہمات میں پڑنے کی ضرورت نہیں، اللہ کی طرف توجہ کریں، اپنے گناہوں کی معافی کی درخواست کریں، کیونکہ معافی مانگنے سے پریشانیاں دور ہوتی ہیں۔ اور کثرت سے یَاحَیُّ یَا قَیُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِیْثُ (اے زندہ، اے قیوم! میں تجھ سے تیری رحمت کے ساتھ ہی مدد کا طلب گار رہوں) پڑھا کریں مشکل آسان ہوگی۔ ان شاء اللہ

شفاء کے لیے پرندوں اور کیڑوں مکوڑوں کو دانہ ڈالنا

سوال : بیمار آدمی معالج کے پاس جاتا ہے، معالج کہتا ہے کہ فلاں جگہ پر کیڑے مکوڑوں کو اتنے دن تک دانے ڈالو، تو تم ٹھیک صحت مند ہو جاؤ گے۔ قرآن وسنت کی روشنی میں اس پر عمل کرنے یا نہ کرنے کے حکم کی وضاحت فرمائیں۔

(سائل) (۲۷ جولائی ۲۰۰۱ء)

جواب : بلاشبہ صدقہ ردّ بلا ہے لیکن مذکورہ صورت میں نسخۂ صحت تجویز کرنے کی کتاب وسنت میں کوئی دلیل نہیں۔

آنکھوں کی پلکوں کے پٹھے پھڑ کنے پر دم

سوال : ہمارے بوڑھے آنکھوں کی پلکوں کے پٹھوں کے پھڑکنے کے متعلق عجیب باتیں بتاتے ہیں۔ جب ڈاکٹر اسے آنکھ کی کمزوری لاعلاج اور مولوی دم درود والے اس کا دَم بھی نہیں بتاتے کیا اس میں کوئی عمیق اشارہ حالاتِ آدم کے متعلق بھی ہے؟

جواب : آنکھوں کی پلکوں کے پٹھوں کے پھڑکنے کا سب سے بہتر دم ''سورۂ فاتحہ'' پڑھ کر دَم کر دیا جائے۔ باذن اللہ درست ہو جائے گا۔ دراصل یہ کمزوری جسمانی تغیرات کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کا سب سے بہتر علاج خلوصِ نیت سے اللہ کی طرف رجوع ہے۔ اور ''سورۂ فاتحہ'' قرآن کے جملہ مضامین کا خلاصہ ہے جو اللہ سے لگاؤ کا بہترین ذریعہ ہے۔

چھوت کی بیماریوں سے بچنے کی کونسی دعاء پڑھی جائے؟

سوال : چھوت کی بیماریوں سے بچنے کی کوئی دعا منقول ہو تو بیان فرمائیں۔ (سائل) (۸ نومبر ۱۹۹۶ء)

جواب : «حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِیْلُ» کا وِرد کثرت سے کریں۔ [1]

[1] صحیح البخاری، بَابُ ﴿إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ﴾ (آل عمران:۱۷۳) الآیۃ، رقم:٤٥٦٣) (سورۃ آل عمران:۱۷۳)

دانت درد کے لیے تعویذ پر کیل ٹھنکوا کر دم کرانا

سوال: اسی طرح بعض لوگ دانت درد کے لیے تعویذ پر کیل ٹھنکوا کر دم کراتے ہیں اور وہ درد سے نجات پاتے ہیں۔ یہ بات مشاہدے میں ہے کیا یہ ہمارے امتحان کے لیے اللہ نے نظام بنایا ہے؟ یا شیطان کی طرف سے درد ٹھیک ہو گیا کہ لوگ بدعقیدہ ہو جائیں؟ (سائل) (۸/اکتوبر ۱۹۹۶ء)

جواب: یہ محض شیطانی فریب کاری ہے۔ بندے کو دینِ حنیف سے ورغلانے کی سازش ہے جس میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو توحیدِ خالص کی بنیاد پر ثابت قدم رکھتا ہے۔

جادو کے علاج کے لیے معوذتین کا وِرد کیسے کرنا چاہیے؟

سوال: میں نے ایک اخبار میں جادو کا علاج پڑھا تھا آپ یہ بتادیں کیا یہ صحیح ہے؟ (۱۲۱، مرتبہ سورۃ الفلق اور سورۃ الناس اس طرح پڑھیں کہ دونوں سورتیں پڑھ کر ایک دانہ شمار کریں۔ اول آخر گیارہ مرتبہ درود شریف پڑھیں اور جسم اور پانی پر پھونک مار کر دن رات میں پانچ مرتبہ پئیں۔ یہ عمل کم از کم چالیس دن کریں۔ (ایک سائل) (۱۱۸کتوبر ۱۹۹۶ء)

جواب: معوّذتین کا وِرد اور وظیفہ کرنا واقعہ شیطانی خرافات کا علاج ہے لیکن قراءت میں یہ گنتی مقرر کرنا شرع میں ثابت نہیں۔ بلا تعیین وِرد جاری رکھیں۔ ہر قسم کی مشکلات سے نجات حاصل ہوگی۔ نبی ﷺ سے ثابت ہے کہ رات کو سوتے وقت آپ ﷺ بستر پر بیٹھ کر اور دونوں ہاتھوں کو ملا کر ان میں معوّذات کی تلاوت کر کے بقدرِ استطاعت سارے جسم پر ہاتھ پھیرتے اور یہ عمل تین دفعہ کرتے۔ اس مقام پر چونکہ گنتی ثابت ہے لہٰذا عمل اس پر ہوگا۔ اور جہاں ثابت نہیں اپنی طرف سے مقرر نہیں کرنی چاہیے۔ نیز ان سورتوں کو پڑھ کر پانی کے بجائے اپنے جسم پر پھونک ماریں، جس طرح کہ آپ ﷺ کی عادت مبارک تھی۔

برکت کی نیت سے مکان ودکان پر قرآن کے مخصوص الفاظ فریم کروا کر کے لٹکانا

سوال: آج کل بازاروں میں دکان، مکان، جان و مال میں خیر وبرکت کے لیے قرآن کے مخصوص الفاظ فریم کیے ہوئے ملتے ہیں۔ کیا ان فریموں کو اپنی رہائش یا کاروباری جگہ پر لٹکایا جا سکتا ہے؟

جواب: کتاب وسنت کی نصوص سے کسی جگہ مخصوص الفاظ قرآنی کا لٹکانا ثابت نہیں۔

نئی دکان یا مکان کی خیر وبرکت کے لیے قرآن مجید پڑھوانا بدعت ہے؟:

سوال: جب کوئی نئی دکان لیتا ہے یا نیا مکان تعمیر کرواتا ہے تو رہائش سے پہلے قرآن مجید پڑھواتا ہے اس مکان میں اعزہ واقارب اکٹھے ہو کر قرآنِ مجید پڑھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح نئے مکان میں اللہ کا کلام پڑھنے سے برکت و رحمت نازل ہوگی۔ کیا یہ طریقہ بدعت ہے؟ نئے مکان میں حصولِ برکت کا درست طریقہ بتائیں۔ والسلام (معرفت شیخ

عنایت اللہ آفتاب، چوک کریم پارک، لاہور) (۲۳ مئی ۱۹۹۷ء)

جواب : یہ طریقہ کار سلف سے ثابت نہیں۔ بدعت ہے۔ مومن کے نیک اعمال تو سدا ہی اس کے لیے باعثِ برکت ورحمت بنے رہتے ہیں۔ حدیث میں ہے:

« مَنْ اَحْدَثَ فِيْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ »[1]

''یعنی جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے۔''

برکت کی نیت سے بخاری شریف کی تلاوت کرنا

سوال : دفع بلایا برکت کی نیت سے بخاری شریف کی تلاوت کرنا سنت ہے یا بدعت؟

جواب : بخاری شریف کی قراءت رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر ہونی چاہیے۔ دفع بلا یا برکت وغیرہ اس کے ثمرات میں سے ہے۔

نئے سال کے آغاز پر نظم یا مقالہ شائع کرنا

سوال : نئے سال کے آغاز پر تقریر کرنا یا نظم و مقالہ شائع کرنا کیسا ہے؟

جواب : نئے سال کے آغاز پر تاریخ اسلامی میں اہم حوادث اور وقائع کو اللہ کی نعمتوں کو تذکیر و عبر کے طور پر بیان کرنا جائز ہے کوئی حرج نہیں۔ ''صحیح بخاری'' کی پہلی جلد کے آخری میں مصنف نے تبویب قائم کی ہے: «بَابُ التَّارِيخِ ، مِنْ أَيْنَ أَرَّخُوا التَّارِيخَ» اور قرآن میں ہے: ﴿وَ ذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰمِ اللّٰهِ﴾ (ابراھیم:۵)

چھوت کی بیماریوں سے بچنے کے لیے کیا پڑھا جائے؟

سوال : چھوت کی بیماریوں سے بچنے کی کوئی دعا منقول ہو تو بیان فرمائیں۔ (سائل) (۸ نومبر ۱۹۹۶ء)

جواب : حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْل کا وِرد کثرت سے کریں۔[2]

وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ کی تشریح اور طبِ جدید:

سوال : موجودہ دور میں طرح طرح کے فتنے سر اٹھا رہے ہیں۔ اب یہ مسئلہ اٹھا ہے کہ قرآنِ مجید میں ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ وَ مَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَ مَا تَدْرِيْ نَفْسٌ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴾ (لقمان:۳۴)

لیکن ڈاکٹر حضرات بچے کی پیدائش سے تین چار ماہ قبل بتا دیتے ہیں کہ بچہ پیدا ہوگا یا بچی اس سے ذہن میں تردد

---

[1] صحيح البخاري، بَابُ إِذَا اصْطَلَحُوا عَلَى صُلْحِ جَوْرٍ فَالصُّلْحُ مَرْدُودٌ، رقم:٢٦٩٧

[2] صحيح البخاري، بَابُ (إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ) (آل عمران:١٧٣) الآيَةَ، رقم:٤٥٦٣

پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا مہربانی فرما کر اس مسئلہ کی شرح وبسط سے وضاحت فرما کر اس فتنے کا سدِ باب فرمائیں۔

(قاری حسان احمد) (۲۲ نومبر ۱۹۹۶ء)

جواب: بلاریب مَا فِی الْاَرْحَامِ کا علم پانچ مفاتیح الغیب میں سے ایک ہے۔ ان کا نام مفاتیح الغیب (غیب کی چابیاں) اس لیے رکھا گیا ہے کیونکہ یہ بنیادی قسم کی غیب کی چیزیں ہیں۔

آیت ہذا میں (مَا) اسم موصول عموم کا فائدہ دیتا ہے اور علم کا اس عموم کے ساتھ ربط و تعلق بھی عمومی ہے جس کی بناء پر آسانی سے یہ نتیجہ اخذ ہوسکتا ہے کہ جو کچھ ماؤں کے رحموں میں ہے وہ صرف اسی پر منحصر نہیں کہ نشو ونما پانے والا لڑکا ہے یا لڑکی، ایک ہے یا متعدد بلکہ (مَا فِی الْاَرْحَامِ) کا علم اس کے علاوہ بہت ساری چیزوں کو حاوی ہے مثلاً زندہ باہر آئے گا یا مردہ، تادیر دنیا میں زندہ رہے گا یا کم مدت، نیک بخت ہے یا بدبخت، ناقص ہوگا یا کامل، خوبرو ہوگا یا بدشکل، کالا ہوگا یا گورا، عالم ہوگا یا جاہل وغیرہ۔ یہاں تک کہ جملہ وہ امور جن کا تعلق حمل سے ہے ان باتوں کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔ چاہے وہ مقرب فرشتہ ہو یا نبی مرسل۔ مقصود یہ ہے کہ عموم اور خصوص کے اعتبار سے اس فرمان کا تعلق صرف باری تعالیٰ سے ہے۔ کائنات میں اس کا کوئی ثانی نہیں۔

سید معین الدین محمد بن عبدالرحمٰن نے اپنی مشہور ومعروف تفسیر ''جامع البیان فی تفسیر القرآن'' میں خوب فرمایا ہے:

«وَ کَذٰلِكَ لَا یَعْلَمُ اَنَّ مَا فِی الْاَرْحَامِ ذَکَرٌ اَوْ اُنْثٰی اِلَّا حِیْنَ مَا اَمَرَ بِکَوْنِهٖ ذَکَرًا اَوْ اُنْثٰی شَقِیًّا اَوْ سَعِیْدًا» (ص:۱۵۶)

یعنی ''اس طرح پیٹوں میں جو بچہ یا بچی ہے۔ اس کا علم بھی کسی کو نہیں ہوتا مگر اس وقت جب اللہ (فرشتے کو) حکم دیتا ہے کہ یہ لڑکا ہے یا لڑکی، بدبخت ہے یا نیک بخت۔''

اس سے مصنف رحمہ اللہ نے مشہور حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے کہ حمل جب ابتدائی مراحل سے گزر کر تذکیر یا تانیث کے مرحلہ پر پہنچتا ہے تو رحم پر مقرر فرشتہ رب العزت سے دریافت کرتا ہے۔ «اَذَکَرٌ اَمْ اُنْثٰی» [1] ''اے اللہ لڑکا یا لڑکی؟ حسب امر حمل اسی کیفیت میں بدل جاتا ہے۔ اس کے بعد جا کر کہیں طب حدیث کو آلاتِ جدیدہ اور مشینی ذرائع سے جنسیت کا علم ہوتا ہے۔ اس سے قبل قطعاً اس بات کا علم نہیں ہوسکتا۔ بچہ ہوگا یا بچی جب کہ اللہ کا علم تمام کیفیات کو محیط ہے۔ وَ یَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ کا یہی مفہوم ہے۔

یاد رہے جس طرح ایک فرشتے کا علم اس آیت کے منافی نہیں۔ اسی طرح اس حالت میں ڈاکٹری معلومات بھی آیت کے معارض نہیں۔

اصل صورتِ حال یہ ہے کہ ڈاکٹری تحقیق کا تعلق اتمام تخلیق کے بعد سے ہے جب کہ اللہ کو بچہ یا بچی کے معرض

[1] صحیح البخاری، بَابُ قَوْلِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ: (مُخَلَّقَةٍ وَغَیْرِ مُخَلَّقَةٍ)، رقم:۳۱۸

وجود میں آنے سے پہلے بدرجہ اَتم علم ہے کہ لڑکا ہوگا یا لڑکی اور بعد میں بھی جملہ کیفیات کا وہ احاطہ کئے ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اَزَل سے مقدر الاشیاء ہے۔ اس بناء پر سورہ رعد کے شروع میں جہاں رحمی کیفیات کا تذکرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اوصافِ حمیدہ عالم الغیب والشہادۃ بیان ہوئے ایک مومن مسلمان کو بار باران قرآنی آیتوں پر غور وفکر کرنا چاہیے:

﴿اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَ مَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَ مَا تَزْدَادُ وَ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ٥ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ٥﴾ (الرعد:۸، ۹)

''مادہ اپنے شکم میں جو کچھ رکھتی ہے اسے اللہ بخوبی جانتا ہے اور پیٹ کا گھٹنا بڑھنا بھی ہر چیز اس کے پاس اندازے سے ہے۔ چھپے کھلے کا وہ عالم ہے سب سے بڑا اور سب سے بلند و بالا۔''

پھر لفظ الارحام علی الاطلاق ہر مادہ کو شامل ہے چاہے اس کا تعلق جنس انسانی سے ہو یا حیوانی سے۔ تمام انواع کی کیفیت اللہ کے علم میں ہیں۔

اس بناء پر بڑے وثوق اور نہایت اعتماد سے کہا جاسکتا ہے کہ ہر وہ چیز جو نص قرآنی یا صحیح حدیث سے ثابت ہے وہ واقع کے خلاف نہیں ہوسکتی۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہماری ذہنی رسائی وہاں تک نہ ہوسکے۔

« فَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ .»

اس کا علم کہ ماں کے پیٹ میں لڑکا ہے یا لڑکی؟

سوال: حدیث شریف میں ہے کہ ماں کے پیٹ میں کیا ہے؟ لڑکی ہے یا لڑکا ہے؟ اس کے بارے میں کوئی نہیں بتا سکتا یا کوئی نہیں جانتا۔ اس کا علم صرف اللہ کو ہی ہے۔ جب کہ موجودہ وقت میں سائنس نے یہ ثابت کیا ہے کہ انسان معلوم کرسکتا ہے کہ لڑکی ہے یا لڑکا ہے۔ بلکہ یہاں تک وہ کہتے ہیں، مرد چاہے تو لڑکی پیدا کریں یا لڑکا پیدا کریں۔ ظاہر ہے یہ تو نہ ہونے والی بات تھی مگر اب ممکن ہوگیا ہے کیا کہتے ہیں علمائے کرام اس کے بارے میں؟

(آفتاب احمد خاں عباسی۔ ابوظہبی) (۸ جنوری ۱۹۹۹ء)

جواب: حدیث میں لڑکے اور لڑکی کا ذکر نہیں بلکہ قرآن و حدیث میں فی الارحام کے الفاظ وارد ہیں جو رحم کی فطرتی اور بنیادی تمام صلاحیتوں اور شکلوں کو حاوی ہے چاہے کوئی عورت شادی شدہ ہو یا نہ ہو۔ مقدر شکل کے معرض وجود میں آنے سے قبل اللہ رحم پر موکل فرشتے کو آگاہ فرماتے ہیں۔ پھر بہت بعد میں ڈاکٹروں کو معلوم ہوتا ہے تو بتایئے اس میں انسانی ترقی کا کیا کمال ہے؟

اس سے معلوم ہوا، ڈاکٹری علم شرعی نصوص کے منافی ہے۔ لڑکا یا لڑکی پیدا کرنا مرد کے اختیار میں نہیں بلکہ یہ سب کچھ اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ رحم پر مقرر فرشتہ بھی رب العزت سے دریافت کرتا ہے: «اَذَكَرٌ اَمْ اُنْثٰى» [1] یہ لڑکا بنے گا یا لڑکی؟

[1] صحيح البخاری، بَابُ قَوْلِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ: (مُخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ)، رقم:۳۱۸

سائنسی آلات سے بارش کے امکانات کی خبر دینا، یا بتانا کہ ماں کے پیٹ میں کیا ہے؟

سوال: بخاری شریف کی حدیث میں ہے کہ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ بارش کب ہوگی اور اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ ماں کے پیٹ میں کیا ہے؟ لیکن جو سائنسی آلات ایجاد ہو چکے ہیں اُن کے ذریعے پتا لگالیا جاتا ہے کہ فلاں روز بارش ہوگی اور فلاں مقام پر ہوگی اور بچی اور بچہ پیدا ہونے سے پہلے ہی اس کا پتا لگالیا جاتا ہے کہ ماں کے پیٹ میں بچہ ہے کہ بچی۔ بخاری شریف کی صحیح حدیث کے کیا معنی ہوں گے؟ (سائل) (۲۰۔اپریل ۲۰۰۷ء)

جواب: سائنسی ایجادات کے موجد ہواؤں کے رخ سے بارش کے بارے میں قیاس آرائی کرتے ہیں اس کا نام علم غیب نہیں۔ اور مافی الارحام سے مراد رحم کی جملہ کیفیات ہیں اس سے صرف لڑکا یا لڑکی مقصود نہیں ورنہ اس کا علم تو رحم پر مقرر فرشتے کو ڈاکٹروں سے بھی پہلے ہو جاتا ہے۔ اس موضوع پر تفصیلی فتویٰ الاعتصام میں پہلے چھپ چکا ہے۔

(قرآن مجید کی بعض آیات کی تفسیر کے متعلق سوالات)

''اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہدایت دیتا ہے'' کا مفہوم کیا ہے؟

سوال: اللہ قرآن میں فرماتا ہے کہ ''اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے، یا اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت عطا فرماتا ہے۔'' ایسا قرآن میں بہت سی جگہ ہے، اس سے کیا مراد ہے؟ (ایک سائل) (۱۴ جنوری ۱۹۹۴ء)

جواب: قرآنی آیات سے مقصود یہ ہے کہ لوگ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن میں ضبط کا مادہ ہوتا ہے اور نفس پر کنٹرول کر سکتے ہیں۔ دوسرے وہ جو اپنے آپ کو آزاد سمجھتے ہیں اور کسی کا حکم اپنے اوپر لینے کے لیے تیار نہیں۔ ایسے لوگوں کو ہدایت نہیں ہوتی بلکہ وہ انکار کر کے یا خواہشِ نفسانی کے تابع ہو کر حق سے دُور ہو جاتے ہیں اور اللہ کی طرف سے ایسے لوگوں کو توفیق نہیں ملتی۔ بلکہ اللہ تعالیٰ ناراض ہو کر ان کی باگ ڈور ڈھیلی چھوڑ دیتا ہے۔ جس سے گمراہی کے گڑھے میں جا گرتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّ هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ o وَ اَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَ مَاتُوْا وَ هُمْ كٰفِرُوْنَo﴾ (التوبة:۱۲۵)

''سو جو ایمان لائے ہیں ان کا تو ایمان زیادہ کیا اور وہ خوش ہوتے ہیں اور جن کے دلوں میں مرض ہے ان کے حق میں خبث پر خبث زیادہ کیا اور وہ مرے بھی تو کافر کے کافر۔''

نیز علامہ سعدی ''تیسیر الکریم الرحمن فی تفسیر کلام المنان'' میں فرماتے ہیں:

« فَاقْتَضَتْ حِكَمَتُهُ تَعَالٰى إِضْلَالَهُمْ لِعَمَدِ صَلْحِيَتِهِمْ لِلْهُدَى . كَمَا اقْتَضَى فَضْلُهُ

وَ حِكْمَتُهُ هِدَايَةَ مَنِ اتَّصَفَ بِالْإِيْمَانِ وَ تَحَلّٰى بِالْاَعْمَالِ الصَّالِحَةِ » (٦/١)

''یعنی اللہ کی حکمت کا تقاضا ہے کہ کفار میں ہدایت کی صلاحیت نہ ہونے کی بنا پر ان کو گمراہ کر دیا گیا جس طرح کہ اس کے فضل وحکمت کا اقتضاء ہوا کہ ایمان سے متصف اور اعمالِ صالحہ کو اپنانے والے کو ہدایت دے۔''

چھ دنوں میں آسمان وزمین کی تخلیق سے کیا مراد ہے؟

سوال : اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے کہ ہم نے زمین وآسمان کو چھ دن میں بنایا تو چھ دن سے کیا مراد ہے؟

(سائل) (۲۰۔اپریل ۲۰۰۷ء)

جواب : چھ دنوں میں اختلاف ہے۔ ایک قول میں دنیا کے دن مراد ہیں جب کہ دوسرے قول میں آخرت کے دن مقصود ہیں۔ مجاہد کا قول یہی ہے۔ ❶

« قِيْلَ هٰذِهِ الْاَيَّامُ مِنْ اَيَّامِ الدُّنْيَا وَ قِيْلَ مِنْ اَيَّامِ الْاٰخِرَةِ . » ❷

حقیقت حال اللہ بہتر جانتا ہے لیکن ظاہر دنیاوی دن ہیں کیوں کہ قرآن عربوں کے فہم کے مطابق نازل ہوا ہے۔

''شہید کو مردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہے'' اس کا مطلب کیا ہے؟

سوال : قرآن میں ہے: ''شہید کو مردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہے'' اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا قرآن میں شہید کو اعزازی طور پر زندہ کہا گیا ہے۔ شہید کے زندہ ہونے کا کیا مطلب ہے؟ آیت میں جہاں شہید کو مردہ کہنے سے منع کیا گیا ہے وہاں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ شہید زندہ ہوتا ہے۔ شہید کی زندگی کا کیا مطلب ہے؟

وہ لوگ کہتے ہیں کہ شہید کو جنت میں اڑنے والا نیا بدن دیا جاتا ہے، اس آیت کا یہی مطلب ہے۔ اگر اس سے مراد صرف برزخی حیات ہے تو وہ تو ہر نیک وبد کو حاصل ہے۔ شہید کے زندہ ہونے کا بطور خاص ذکر کیوں کیا گیا ہے؟

محترم! یہ لوگ مذکورہ بالا حدیث سے مرنے والے ہر انسان کا برزخی جسم ثابت کرتے ہیں اور برزخی جسم کا عقیدہ نہ رکھنے والے کو کافر قرار دیتے ہیں۔ یہ لوگ جس شخص کو بھی توحید کا متوالا دیکھتے ہیں، اسے اپنی جماعت میں شامل کرنے کے درپے ہوجاتے ہیں اور دنیاوی بدن کے تباہ ہوجانے اور نیا بدن عطا کیے جانے کے فلسفے کی بنیاد پر لوگوں کو گمراہ کررہے ہیں۔ (والسلام: حافظ عبدالصمد، مین بازار سراج پارک، شاہدرہ) (۸فروری ۲۰۰۸ء)

جواب : شہداء کو مردہ نہ کہنا ان کے اعزاز واکرام کی خاطر ہے۔ تاہم یہ برزخی زندگی ہے جس کی حقیقت کو پانے سے ہم قاصر ہیں۔ قرآنی الفاظ ﴿وَلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴾ کا یہی مفہوم ہے۔ جس بدن نے دنیا میں شہادت کی صعوبت

❶ فتح القدير شوكانى ٤/ ٥٠٨

❷ زبدة التفسير ، ص:٢٠١

برداشت کی، یہ اعزاز و تکریم بھی اسی کا حق ہے۔ حدیث میں جنت کے اندر شہید کی روح اُڑنے کا ذکر ہے نئے بدن کا نہیں عالم برزخ میں اس کا اصلی بدن سے تعلق قائم رہتا ہے۔ کیفیت اللہ بہتر جانتا ہے۔

جنت میں شہید کو چوں کہ زندگی کی امتیازی حیثیت حاصل ہوتی ہے اس لیے اس کی برزخی حیات کو بالخصوص ذکر کیا گیا ہے اگر چہ سب کو برزخی حیات حاصل ہے۔

شہید کی اعزازی زندگی کے بارے میں قرآن میں ہے:

﴿ بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ ۝ فَرِحِیْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ یَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِیْنَ لَمْ یَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴾ (آل عمران: ۱٦۹، ۱۷۰)

''بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس روزیاں دیئے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل جو انہیں دے رکھا ہے اس سے بہت خوش ہیں اور خوشیاں منا رہے ہیں ان لوگوں کی بابت جو ابھی تک ان سے نہیں ملے ان کے پیچھے ہیں اس پر کہ انھیں نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

تفصیل اس کی صحیح احادیث میں موجود ہے۔ یاد رہے کتاب و سنت کی باطل و فاسد تاویلیں، سلف صالحین پر کفریہ فتوے بازی کرنا اور اہل حق سے نفرت و بغض کا اظہار کرنا تکفیری گروہ کا محبوب مشغلہ ہے۔ خود ساختہ نظریات کی تشہیر کر کے باطل پرستوں کی معاونت کرنا ان کا خصوصی شیوہ ہے۔ حق و باطل کی کشمکش میں ہر لحہ شر و فساد کا علم اٹھائے سرگرداں پھرتے ہیں، ان جیسے ملحدوں کی علماء نے پہلے ہر دور میں خبر لی ہے مستقبل میں بھی احباب ان کی سرکوبی کے لیے اہل حق کو کمر بستہ پائیں گے۔ اس فتنہ کا قلع قمع کرنا ہمارا بنیادی فرض ہے۔ موقعہ بہ موقعہ رب العزت کی توفیق سے ہم اس فتنہ کی خبر لیتے رہیں گے، ان شاء اللہ۔

دراصل ان ظالموں نے اللہ مالک کی قدرت کو عاجز انسان جیسی قوت سمجھ رکھا ہے کہ مرنے کے بعد یہ جسم تو تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ ٹھنڈک کے بعد اس کے لیے دوبارہ زندگی ناممکن اور محال ہے۔ ان کو اس بات کا علم نہیں جو اللہ دوزخ کی جھلستی ہوئی آگ میں درخت اگا سکتا ہے وہ اصلی جسم کو بھی دوبارہ زندگی بخشنے پر قادر ہے۔

﴿ تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ وَ هُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ ۝ نِ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ ﴾ (الملك: ۱، ۲)

انبیائے کرام کی برزخی زندگی کیسی ہے؟ اور کیا شہداء زندہ ہیں؟

سوال: ''سورۃ البقرۃ'' کی آیت ۱۵۴ کے مطابق شہداء زندہ ہیں۔ کیا ہمارے نبی اکرم ﷺ اور باقی انبیائے کرام علیہم السلام اور اولیاء و صلحاء بھی شہداء کی طرح زندہ ہیں؟ شہداء کو اللہ تعالیٰ نے زندہ کہا ہے اور ہمیں یہ حکم ہے کہ انہیں مردہ نہ کہو۔

انبیائے کرام کا مرتبہ تو شہداء سے بلند ہے۔ ہم انبیائے کرام کو کیا کہیں گے؟ (سائل) (۲۰ مئی ۲۰۱۱ء)

جواب: واضح ہو کہ درجات کے اعتبار سے دنیوی زندگی کی طرح برزخی زندگی میں بھی تفاوت ہے۔ ایک عام مومن کی زندگی ہے۔ پھر شہداء کی زندگی جو طیورِ جنت سے تعلق کی بنا پر ممتاز ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی زندگی قرب الٰہی کی وجہ سے سب سے بڑھ کر ممتاز ہے۔ دنیاوی زندگی میں ہم اس کا شعور حاصل نہیں کر سکتے۔ قرآن نے یہی کچھ بیان فرمایا ہے:

﴿وَلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴾

دنیاوی زندگی میں انبیاء علیہم السلام کے بارے میں وہی عقیدہ رکھیں گے جو قرآن نے بیان فرمایا ہے:

﴿اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ﴾ (الزمر: ۳۰)

''اے نبی! تجھے بھی موت آنی ہے اور انہوں نے بھی مرنا ہے۔''

قرآن میں اللہ تعالیٰ کے لیے جمع کے الفاظ کیوں آئے ہیں؟

سوال: اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اپنے لیے جمع کا لفظ یعنی نَحْنُ استعمال کیا ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟ جب کہ علمائے لغت کے مطابق قدیم عربی زبان میں واحد کے لیے جمع کا لفظ استعمال نہیں ہوتا تو پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے ہم کا لفظ کیوں استعمال کیا ہے جب کہ اللہ واحد ہے؟ (سائل) (۲۰۔ اپریل ۲۰۰۷ء)

جواب: بلاشبہ اللہ اکیلا ہے، معبود برحق ہے لیکن بعض دفعہ اپنے لیے صیغہ جمع حاکمیت اور اظہار قدرت وغیرہ کے لیے استعمال فرماتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ﴿لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ﴾ (الانبیاء: ۲۳) ''وہ جو کام کرتا ہے اُس کی پرسش نہیں ہوگی اور جو کام لوگ کرتے ہیں اس کی ان سے پرسش ہوگی۔''

بندوں کو حتی المقدور اللہ کے لیے جمع کے صیغے استعمال کرنے سے احتراز کرنا چاہیے تاکہ توحیدی پہلو میں فرق نہ آئے۔ چناں چہ علامہ ابن قیم فرماتے ہیں پوری نماز میں نبی ﷺ کی دعائیں لفظ واحد سے ہیں جیسا کہ دعا « رَبِّ اغْفِرْلِيْ وَارْحَمْنِيْ وَاهْدِنِيْ .» اور دعائے استفتاح « اَللّٰهُمَّ اغْسِلْنِيْ مِنْ خَطَايَايَ ......» ہے۔ [1]

جہاں تک بندوں کا آپس میں بات چیت کا تعلق ہے تو اس میں صیغہ جمع کے استعمال میں کوئی حرج نہیں۔ لفظ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ اور وَعَلَيْكُمُ السَّلَام اس امر کی واضح دلیل ہے۔ مخاطب چاہے ایک ہو یا زیادہ صیغۂ جمع کا سب پر اطلاق ہے۔ ملاحظہ ہو: مشکوٰۃ المصابیح (۳/ ۱۳۱۸، طبع مکتب اسلامی) لہٰذا قدیم عربی زبان کا حوالہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا، شرعی دلیل سب سے محکم ہے۔

زمین کو کناروں سے گھٹانے کا کیا معنی ہے؟

سوال: اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے کہ ہم زمین کو اس کے کناروں سے گھٹاتے چلے آتے ہیں۔ اس سے کیا مراد

ہے؟ (سائل) (۲۰۔اپریل ۲۰۰۷ء)

جواب: اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ کفر دن بدن کم ہوتا جائے گا اور اہل اسلام کا غلبہ ہوگا۔ کسی نے کہا دیہات ویران ہوئے جاتے ہیں، کسی نے کہا کہ جانیں اور پھل اور میوے ضائع ہو رہے ہیں اور قرطبی نے کہا حکم رانوں کا ظلم مراد ہے، ان کے ظلم کی وجہ سے زمینی اور آسمانی برکات ناپید ہوتی جائیں گی۔ (۳۳۴/۹) مولانا مودودی فرماتے ہیں:

''زمین میں ہر طرف ایک غالب طاقت کی کارفرمائی کے یہ آثار نظر آتے ہیں کہ اچانک کبھی قحط کی شکل میں اور کبھی وباء کی شکل میں، کبھی سیلاب کی شکل میں، کبھی زلزلے کی شکل میں، کبھی سردی یا گرمی کی شکل میں اور کبھی کسی اور شکل میں کوئی بلا ایسی آ جاتی ہے جو انسان کے سب کیے دھرے پر پانی پھیر دیتی ہے۔ ہزاروں لاکھوں آدمی مر جاتے ہیں، بستیاں تباہ ہو جاتی ہیں، لہلہاتی کھیتیاں غارت ہو جاتی ہیں، پیداوار گھٹ جاتی ہے، تجارتوں میں کساد بازاری آنے لگتی ہے۔ غرض انسان کے وسائل زندگی میں کبھی کسی طرف سے کمی واقع ہو جاتی ہے اور کبھی کسی طرف سے اور انسان اپنا سارا زور لگا کر بھی ان نقصانات کو نہیں روک سکتا۔'' ❷

''باغ والوں'' کے قصے کی اصل؟

سوال: ''باغ والوں نے والدین کو خرچ دینا بند کر دیا تو اللہ نے ان کا باغ برباد کر دیا'' یہ قرآن مجید میں کس مقام پر مذکور ہے؟ (سائل) (۴ جولائی ۲۰۰۳ء)

جواب: اصل واقعہ یوں نہیں ہے، بلکہ بعض سلف کے بقول اصل صورتِ حال یہ ہے کہ والد کی وفات کے بعد اس کی اولاد نے فقراء و مساکین پر صدقہ کرنا بند کر دیا تو اللہ نے بطورِ سزا ان سے مال چھین لیا۔ ملاحظہ ہو: تفسیر ابن کثیر: ۵۲۳/۴۔ اور یہ واقعہ انتیسویں پارے کی ''سورۃ القلم'' میں ہے۔

کیا بعض احادیث کا قرآن سے یا باہم تعارض ہے؟

سوال: کتنی حدیثیں ایسی ہیں اور کون کون سی ہیں جو بہ ظاہر قرآن کی کسی آیت یا آپس میں ٹکراتی ہوں؟ قرآن اور حدیث کا حوالہ دے کر بتائیں۔ (سائل) (۲۰۔اپریل ۲۰۰۷ء)

جواب: کوئی ایسی صحیح حدیث نہیں جو قرآن سے ٹکراتی ہو۔ امام ابن خزیمہ نے فرمایا تھا اگر کوئی ایسا محسوس کرتا ہے تو میرے پاس آئے میں اس کا حل پیش کروں گا۔

بہ ظاہر آپس میں متعارض احادیث خاصی تعداد میں ہیں البتہ محدثین کرام رحمہم اللہ نے ان احادیث کی اُن کے محل اور

❶ زاد المعاد: ۱/ ۲٦۳، ۲٦٤

❷ تفهيم القرآن، ۳/ ۱٦۱

مقام کے مطابق شرح کر کے، اُن کے صحیح معانی بیان کر کے تعارض رفع کیا ہے۔ کتب احادیث کی طرف مراجعت کریں حقیقت حال واضح ہو جائے گی۔

''سورۂ سجدہ'' میں ملک الموت کا ذکر ہے؟، اور کیا ملک الموت کا نام عزرائیل ہے؟

سوال : ''سورۃ السجدہ'' (۳۲:۱۱) میں «مَلَكُ الْمَوْت» کا ذکر ہے، اسی طرح ''مسند احمد'' میں حدیث براء اور ''صحیح مسلم'' میں فضائل موسیٰ علیہ السلام میں بھی «مَـــلَك» کا تذکرہ ہے۔ بعض مفسرین نے ان کا نام عزرائیل نقل کیا ہے۔ کیا صحیح حدیث سے ملک الموت کا نام ''عزرائیل'' ثابت ہے؟ یا صرف ملک الموت ہی کہنا چاہیے؟

(محمد صدیق، ملتان) (افروری ۲۰۰۲ء)

جواب : ''ملک الموت'' کا نام صحیح مرفوع متصل حدیث سے عزرائیل ثابت نہیں۔ البتہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ ''تفسیر القرآن العظیم'' (۳/۵۹۹) میں فرماتے ہیں:

«اَلظَّاهِرُ مِنْ هَذِهِ الْآيَةِ أَنَّ مَلَكَ الْمَوْتِ شَخْصٌ مُعَيَّنٌ مِنَ الْمَلَائِكَةِ، كَمَا هُوَ الْمُتَبَادِرُ مِنْ حَدِيثِ الْبَرَاءِ الْمُتَقَدِّمِ ذِكْرُهُ فِي سُورَةِ إِبْرَاهِيمَ، وَقَدْ سُمِّيَ فِي بَعْضِ الْآثَارِ بِعِزْرَائِيلَ وَهُوَ الْمَشْهُورُ، قَالَهُ قَتَادَةُ وَغَيْرُ وَاحِدٍ وَلَهُ أَعْوَانٌ.»

''اس آیت سے ظاہر ہے کہ ملک الموت فرشتوں میں سے کسی معین شخص کا نام ہے۔ جس طرح کہ حدیث براء سے متبادر (ظاہر) ہے، جو ''سورۂ ابراہیم'' میں گزر چکی ہے۔ تاہم بعض آثار میں اس کا نام عزرائیل مشہور ہے جس طرح کہ قتادہ اور دیگر کئی ایک اہل علم نے بیان کیا ہے اور اس قول کے معاون مؤید بھی ہیں۔''

وَلَهُ أَعْوَانٌ (تصحیح واعتذار)...... ''الاعتصام'' کی گزشتہ اشاعت (۱ تا ۷ فروری ۲۰۰۲ء) کے ''احکام ومسائل'' کے کالم میں صفحہ ۸ پر سوال نمبر ۲ کے جواب میں ''وَلَهُ أَعْوَانٌ'' کا ترجمہ ''اور اس قول کے معاون ومؤید بھی ہیں۔'' شائع ہوا ہے جو غلط ہے اور یہ غلطی ان سطور کے راقم کے فہم غلط کا نتیجہ ہے۔ استاذ گرامی حضرت مفتی صاحب نے اس کا ترجمہ یوں کیا تھا ''اور اس کے معاون بھی ہیں۔'' یعنی اس فرشتے (ملک الموت) کے مددگار بھی ہیں۔ یہی بعد والا ترجمہ صحیح ہے، قارئین اپنے اپنے نسخوں میں تصحیح فرمالیں۔ (حافظ عبدالوحید)

قرآنی آیت کی تفسیر میں وارد اشکال کا جواب

سوال : محترم جناب حافظ ثناء اللہ مدنی صاحب حفظہ اللہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

عرض ہے بندہ آپ کے فتاویٰ جات مختلف مجلات میں عرصہ دراز سے بڑے اشتیاق کے ساتھ پڑھتا ہے۔ میں عموماً آپ کے فتوے کو ترجیحی نگاہ سے اس لیے دیکھتا ہوں کہ فتویٰ مدلل ہوتا ہے جب کہ یہ خاصیت باقی مفتیان میں مفقود ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ آپ کے علم وعمل میں برکت نصیب فرمائے۔ (آمین)

میں عرصہ دراز سے چند الجھنوں میں گرفتار ہوں۔ امید ہے آپ تسلی بخش رہنمائی فرما کر مشکور ہوں گے۔ سب سے اہم مسئلہ بخاری شریف میں وارد بعض روایات ہیں جو کہ عجیب خلجان پیدا کر دیتی ہیں۔ مثلاً کتاب التفسیر میں موجود عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ﴿وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ لَا نَبِيٍّ ﴾ (الحج:۵۲) کے ساتھ ﴿وَلَا مُحَدَّثٍ﴾ کا اضافہ اس روایت کو پڑھ کر چند اشکالات ذہن میں ابھرتے ہیں کہ موجودہ قرآن مجید مکمل نہیں؟

اگر مکمل ہے تو پھر یہ روایت ایک صحابی کی ایسی جرأت واضح کرتی ہے جو کہ ان کی شان کے یکسر منافی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ قراءت کا اختلاف ہے تو میرے خیال میں درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس قراءت میں نبی رسول کے علاوہ ایک اور منصب کا تذکرہ ہے جو کہ تیسرا منصب بیان ہوا ہے یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ایک قراءت میں دو منصب بیان ہوئے۔ تیسرا منصب جو کہ ان مناصبِ مذکورہ سے بالکل جدا ہے وہ مذکور نہیں ہے۔

۱۔ بہر حال یہ ایک قول ہے جو کہ اللہ کے رسول کا بھی نہیں ہے۔

۲۔ اس سے قرآن کا موجودہ صورت میں اُن الفاظ پر نہ ہونا۔ خود شک کا باعث ہے۔ اس قسم کی روایات کو محض اس بناء پر قبول کرنا کہ بخاری میں ذکر ہیں یہ انکارِ حدیث کی راہیں ہموار کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ اور قرآن پر لب کشائی کا موقع دینا بھی ہے۔ امید ہے اس پر آپ غور کر کے اپنی مجتہدانہ رائے دے کر تحقیق کا ایک راستہ کھولیں گے یا اس کے بارے میں جو صحیح تحقیق ہو جو ہم تک نہ پہنچ سکی فراہم کریں گے۔ جزاکم اللہ۔ (ابو اُواب جامعہ کراچی) (۲۰ اگست ۱۹۹۹ء)

جواب : ''صحیح بخاری'' کتاب التفسیر ''سورۃ الحج'' کے شروع میں یہ قول حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بایں الفاظ مروی ہے: «إِذَا حَدَّثَ أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي حَدِيثِهِ.» [1] لیکن اس میں قرآنی آیت ﴿وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ لَا نَبِيٍّ ﴾(الحج:۵۲) کا اضافہ نہیں جس طرح کہ سوال میں مصرح ہے۔ اکثر مفسرین کا قول یہ ہے کہ لفظ تمنی کا معنٰی قرأ اور تلا ہے۔ یعنی پڑھا اور تلاوت کی۔

اس امر کی وضاحت یوں ہے کہ شیطان رسول یا نبی کی قراءت میں شکوک و شبہات ڈالنے کی سعی کرتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ لوگوں کو نبی کی پیروی سے روک سکے۔

اس کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ اس طرح قرآن کے الفاظ ہیں افراط و تفریط واقع ہو جاتی ہو جب کہ حفاظت کی ذمہ داری تو خود اللہ تعالیٰ نے اٹھائی ہے۔ اسی بناء پر بعد میں فرمایا:

﴿فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ﴾ (الحج:۵۲)

''تو جو (وسوسہ) شیطان ڈالتا ہے اللہ اس کو دور کر دیتا ہے۔ پھر اللہ اپنی آیتوں کو مضبوط کر دیتا ہے اور اللہ علم

[1] صحیح البخاري، بَابُ (كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهُ وَعْدًا عَلَيْنَا) (الأنبياء:۱۰۴)، سورة الحج

والا اور حکمت والا ہے۔''

واضح ہو کہ اس مقام پر ایک واقعہ قصہ الغرانیق کے نام سے ذکر کیا جاتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ یہ قصہ نا قابلِ اعتماد ہے۔علامہ البانی رحمہ اللہ نے نصب المجانیق فی قصة الغرانیق کتاب لکھ کر بدلائل قویہ اس کا بطلان ثابت کیا ہے۔جس سے حقیقتِ حال منکشف ہو جاتی ہے۔شائقین کے لیے ایک نادر تحفہ ہے جس کا مطالعہ ضروری ہے۔سائل نے پھر بعد میں لب کشائی کی ہے میرے خیال میں تو اس کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔اشکال کی صورت میں پہلے اپنی بساط کے مطابق خود حل کرنے کی سعی کرنی چاہیے۔بصورتِ دیگر محققین اہل علم کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔قرآن میں ہے:

﴿فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (النحل:٤٣)

''اور حدیث میں ہے: «اِنَّمَا شِفَاءُ الْعَيِّ السُّؤَال» [1]

مسئلہ کو مزید سمجھنے کے لیے ملاحظہ ہو ہمارے شیخ محمد الامین کی تفسیر ''اضواء البیان: ۵/ ۷۲۷تا ۷۴۳۔

قرآنی آیت اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى کی تشریح وتفسیر اور چند اشکالات کا ازالہ

سوال: محترم جناب حافظ ثناء اللہ صاحب۔السلام علیکم!

قرآن حکیم عیسائیوں کے عقیدہ تثلیث ''عقیدۂ ابن اللہ کی وجہ سے ان کو کافر قرار دیتا ہے۔اور ان سے دوستی سے منع کرتا ہے لیکن ''سورۃ المائدۃ'' (آیت:٦٩) کو یہودی، عیسائی جو بھی اللہ پر ایمان لائے اور نیک عمل کیے تو وہ غمگین نہ ہوں گے۔اسی طرح ''سورۃ البقرۃ'' کی آیت نمبر:٦٢ میں ہے کہ وہ اللہ کے ہاں اجر پائیں گے۔

اس ضمن میں چند سوال پوچھوں گا۔

١۔ کیا حضرت محمد ﷺ پر ایمان لائے بغیر ان کو اجر ملے گا؟

٢۔ آج کل عیسائی رفاہِ عامہ کے یا دوسرے اچھے کام کرتے ہیں تو کیا انھیں اجر ملے گا یا نہیں۔اگر قرآن میں اس وقت کے یہودی، عیسائی مراد ہیں تو وہ پہلے ہی سے اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہیں۔

(محمد عبدالباسط فاروقی) (١٢اگست ١٩٩٩ء)

جواب: اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے چار قسم کے لوگوں کا ذکر فرمایا ہے۔پہلے وہ لوگ جو ایمان لائے۔اس سے مراد شریعت محمدیہ کے ماننے والے ہیں۔دوسری قسم یہودی ہیں۔یہ لوگ موسیٰ علیہ السلام کی امت ہیں۔تیسری قسم عیسائی۔یہ عیسیٰ علیہ السلام کی امت ہیں۔چوتھی قسم بے دین لوگ ہیں۔ان سے مراد معبودانِ باطلہ کے پجاری ہیں۔خواہ فرشتوں کو پوجیں یا بتوں کو یا آگ وغیرہ کو، ان کے متعلق سلف کے مختلف اقوال ہیں۔بعض کہتے ہیں کہ وہ اپنے مذہب کے مطابق نمازیں

[1] السنن الكبرى للبيهقى، بَابُ الْمَسْحِ عَلَى الْعَصَائِبِ وَالْجَبَائِرِ، رقم:١٠٧٧

بھی پڑھتے ہیں۔بعض ان میں سے زبور بھی پڑھتے ہیں۔ان چاروں کا نام لے کر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان لائے اور انھوں نے اعمالِ صالحہ کیے۔صرف ان کے لیے خوشخبری ہے۔

﴿فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾

ان لوگوں کا اپنے اپنے زمانہ میں ایمان اور عمل معتبر تھا۔مثلاً جب تک عیسیٰ علیہ السلام نہیں آئے،اس وقت تک موسیٰ علیہ السلام کی شریعت پر پوری طرح عامل رہے۔ان کے لیے یہ خوشخبری ہے۔عیسیٰ علیہ السلام کے آنے کے بعد پہلی شریعت منسوخ ہو گئی۔اب عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت پر جو پوری طرح عامل رہا وہ اس خوشخبری کا حق دار ہے۔اس کے بعد حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔اب پہلی تمام شریعتیں منسوخ ہو گئیں۔اب نجات کا دارومدار شریعتِ محمد یہ پر ہے۔

ایک اشکال: یہاں ایک شبہ ہوتا ہے کہ پہلی شریعتیں جو منسوخ ہو چکی ہیں۔صرف ان تینوں کا ذکر کافی تھا۔یہودی،عیسائی اور بے دین۔چوتھا فرقہ جو اس شریعت پر ایمان لایا اس کا ذکر یہاں بے محل ہے کیوں کہ اس شریعت پر جو ایمان لا چکے ان کے پھر ایمان لانے کا کوئی مطلب نہیں۔

جواب: اس کے دو جواب ہیں

۱۔ ایک یہ کہ ان کے ایمان لانے کا مطلب ایمان پر ہمیشگی اور ثابت قدمی ہے کیوں کہ دارومدار خاتمہ پر ہے۔خاتمہ سے پہلے ایمان لایا ہوا کافی نہیں جب تک خاتمہ ایمان پر نہ ہو۔

۲۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ یہاں ایمان لانے والے سے مراد وہ ہے جو مدعی ایمان ہے۔جیسے منافق یا کمزور ایمان والے۔اس صورت میں مطلب یہ ہوا کہ اس امت میں سے جن کا دعویٰ ایمان کا ہے وہ اس خوشخبری کے اس صورت میں مستحق ہوں گے کہ وہ حقیقی معنی میں ایمان لائیں اور عمل نیک کریں۔

تنبیہ: ایک لفظ کا معنی حقیقی اور مجازی دونوں کا ایک وقت میں مراد ہونا۔یہ امام شافعی کے نزدیک جائز ہے۔اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ منع کے قائل ہیں۔اس آیت سے امام شافعی رحمہ اللہ کے مذہب کو تائید ملتی ہے کیوں کہ ﴿مَنْ آمَنَ﴾ کے دو معنی ہوں گے۔پہلے فرقے کے حق میں اس کے معنی ہوں گے جو ایمان پر ثابت قدم رہے۔یہ آمَنَ کے مجازی معنی ہیں اور باقی فرقوں کے حق میں ہوں گے جو ایمان لائے اور یہ آمَنَ کے حقیقی معنی ہیں تو گویا اس میں حقیقی اور مجازی دونوں مراد ہوئے۔

شانِ نزول: سلمان فارسی اور ان کے ساتھیوں کی عمر مجوسی مذہب پر گزری۔کچھ عیسائیت پر۔پھر اللہ تعالیٰ نے ایمان نصیب کر دیا،ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنے ساتھیوں کا ذکر کر رہے تھے کہ وہ نمازیں پڑھتے تھے،روزے رکھتے تھے،اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان بھی لاتے تھے۔اور اس بات کی شہادت دیتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہوں گے۔ان کا کیا حکم ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ جہنمی ہیں (کیونکہ وہ یہ کام کسی شریعت کے تحت نہیں کرتے تھے۔سلمان

فارسی رضی اللہ عنہ سخت غمگین ہوئے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری۔ جس سے اس طرف اشارہ کیا۔ جس نبی کا زمانہ ہو اس نبی کی شریعت کے تحت رہ کر جو ایمان لائے اور عمل نیک کرے اس کے لیے یہ خوشخبری ہے نہ کہ اپنے طور پر کسی کام کو اچھا سمجھ کر کرنے لگ جائے۔ اس بناء پر نبی کریم ﷺ کے آنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿وَ مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾

(آل عمران: ۸۵)

''جو شخص اسلام کے سوا کوئی دین ڈھونڈے پس ہر گز نہیں قبول کیا جائے گا اس سے اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہے۔''

الفاظ کی تشریح: چونکہ یہاں ایمان کا معاملہ اعمال سے ہے۔ اس لیے ایمان سے مراد اعتقاد ہے۔ لیکن صرف اعتقاد نجات کے لیے کافی نہیں اس لیے ساتھ اعمال کا بھی ذکر کیا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایمان سے مراد عام ہو۔ جس میں اعمال بھی داخل ہوں۔ اور اعمال کا الگ ذکر یہ ان کی اہمیت ظاہر کرنے کے لیے ہو۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

﴿مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ جِبْرِيْلَ وَ مِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ﴾

(البقرة: ۹۸)

''یعنی جو شخص اللہ کا فرشتوں کا اور جبریل اور میکائیل کا دشمن ہو پس بے شک اللہ تعالیٰ دشمن ہے واسطے کافروں کے۔''

اس آیت میں فرشتوں کا ذکر کرنے کے بعد جبرئیل اور میکائیل کا الگ الگ ذکر کیا ہے۔ یہ صرف ان کی بزرگی اور بڑائی کے لیے ہے۔ اسی طرح اعمال کو اتنی اہمیت نہیں دی جاتی، اعتقاد کو ہی کافی سمجھ لیا جاتا ہے۔

عملِ صالح کی تین شرطیں ہیں۔ ایک اعتقاد کا صحیح ہونا۔ دوسرے شریعت کے موافق ہونا۔ تیسرے، اصلاحِ نیت۔ اعتقاد کے صحیح ہونے کا مطلب ہے کہ توحید کا قائل ہو اور شریعت کے موافق ہونے کا مطلب بدعت نہ ہو۔ شریعت میں اس عمل کا ثبوت ہو۔ اخلاصِ نیت کا یہ مطلب ہے کہ محض اللہ کی رضا کے لیے ہو۔ کسی کے دباؤ یا لحاظ یا دکھاوے کے لیے نہ ہو۔

حزن، خوف اور غم میں فرق یہ ہے کہ حزن اس چیز پر ہوتا ہے جو چھن گئی ہو۔ خوف آئندہ چیز کا ہوتا ہے جیسے تجارت میں کہیں نقصان نہ ہو جائے اور غم عام ہے۔ گزشتہ چیز پر بھی ہوتا ہے۔ جیسے کسی کا کوئی مر جائے اور آئندہ کا بھی جیسے امتحان میں کہیں ناکام نہ ہو جاؤں۔

«يَحْزَنُوْنَ» کا باب دو طرح سے آتا ہے۔ ایک حَزَنَ يَحْزُنُ بروزن نَصَرَ يَنْصُرُ اس کے مصدر حزن کے معنی ہیں۔ دوسرے کو غمگین کرنا چنانچہ قرآن میں ہے: ﴿لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ﴾ یعنی نہ

غمگیں کریں تجھے وہ لوگ جو کفر میں جلدی کرتے ہیں۔'' دوسرا باب حَزِنَ یَحْزَنُ بروزن سَمِعَ یَسْمَعُ یہ لازم ہے۔ اس کے معنی غمگین ہونے کے ہیں۔ اس آیت میں یہی مراد ہے۔ اس ساری بحث سے معلوم ہوا کہ نبی اکرم ﷺ کو خاتم النبیین تسلیم کیے بغیر کوئی عمل قابلِ قبول نہیں اور عیسائیوں کے اعمال بھی قابلِ قبول نہیں۔ جب تک آپ کی نبوت کا اقرار نہیں کرتے۔

کتاب و سنت کی نصوص اس امر پر واضح شواہد ہیں۔ قرآن میں ہے: ﴿وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ﴾ (النور: ۳۹) ''صحیح مسلم'' میں ہے۔ کافر کے لیے اعمالِ خیر کی صرف دنیا میں جزا ہے۔ آخرت میں نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب

قصہ ہاروت و ماروت کی قرآن کی روشنی میں وضاحت

سوال: قصہ ہاروت و ماروت کی قرآن کی روشنی میں وضاحت فرمائیے۔ (سائل) (۱۹ فروری ۱۹۹۹ء)

جواب: اللہ رب العزت نے سورہ بقرہ کی آیت ۱۰۲ کے ضمن میں بایں الفاظ بیان فرمایا ہے:

﴿وَ اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ وَ مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَ لٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ وَ مَاۤ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَ مَارُوْتَ وَ مَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَاۤ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ وَ مَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَ يَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ وَ لَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَ لَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾ (البقرۃ: ۱۰۲)

''اور وہ ان (ہزالیات) کے پیچھے لگ گئے جو سلیمان علیہ السلام کے عہد سلطنت میں شیاطین پڑھا کرتے تھے اور سلیمان علیہ السلام نے مطلق کفر کی بات نہیں کی بلکہ شیطان ہی کفر کرتے تھے کہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے اور ان باتوں کے بھی (پیچھے لگ گئے) جو شہر بابل میں دو فرشتوں (یعنی) ہاروت اور ماروت پر اتری تھیں۔ اور دونوں کسی کو کچھ نہیں سکھاتے تھے جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ ہم تو (ذریعہ) آزمائش ہیں تم کفر میں نہ پڑو۔ بعض لوگ ان سے ایسا (جادو) سیکھتے جس سے میاں بیوی میں جدائی ڈال دیں۔ اور اللہ کے حکم کے سوا وہ اس (جادو) سے کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے اور کچھ ایسے (منتر) سیکھتے جو ان کو نقصان ہی پہنچاتے اور فائدہ کچھ نہ دیتے۔ اور وہ جانتے تھے کہ جو شخص ایسی چیزوں (یعنی سحر اور منتر وغیرہ) کا خریدار ہوگا۔ اس کا آخرت میں کچھ حصہ نہیں اور جس چیز کے عوض انھوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا وہ بری تھی۔ کاش وہ (اس بات کو) جانتے۔''

اس آیتِ کریمہ میں اس جادو کا بیان ہے جس پر «اَرْذَلُ خَلْقِ اللّٰهِ» یہود عامل تھے۔ پھر یہ ان اشیاء میں سے ہے جن کو شیاطین نے سلیمان بن داؤد علیہ السلام کے عہد میں گھڑا تھا۔ (تاکہ اللہ کی مخلوق کو ورغلایا اور پھسلایا جا سکے) اور اس کا تعلق اس سے بھی ہے جو کچھ بابل کی سرزمین میں ہاروت اور ماروت پر نازل ہوا تھا۔ ثانی الذکر عہد کے اعتبار سے اوّل الذکر سے متقدم ہے کیونکہ قصہ ہاروت و ماروت بقول ابن اسحاق زمانہ نوح علیہ السلام سے پہلے کا ہے۔ جادو حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں بھی موجود تھا کیونکہ اللہ نے خبر دی ہے کہ قوم نوح علیہ السلام کا دعویٰ مزعومہ تھا کہ یہ (نوح علیہ السلام) ساحر ہے۔

اسی طرح جادو قوم فرعون میں بھی پھیلا ہوا تھا۔ یہ سارا کچھ عہد سلیمان سے (بہت) پہلے کا ہے۔ اس آیت سے کیا مراد ہے؟ اس کے بارے میں لوگوں کا اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے سحر و کہانت کی کتابوں کو جمع کرکے اپنی کرسی کے نیچے دفن کر دیا۔ کوئی شیطان کرسی کے نزدیک پھٹک نہیں سکتا تھا۔ جب سلیمان علیہ السلام اور وہ علماء جن کو اصل معاملہ سے آگاہی تھی، فوت ہوگئے تو شیطان انسانی شکل میں ان کے پاس آیا۔ یہودیوں سے کہا کہ میں آپ کو ایک ایسا خزانہ بتاتا ہوں جو بے مثال اور بے نظیر ہے۔ کہا ہاں بتاؤ! انھوں نے کرسی کے نیچے کھدائی کرکے ان کتابوں کو حاصل کرلیا تو شیطان نے ان سے کہا سلیمان کو انھی کے ذریعہ جن و انس پر کنٹرول حاصل تھا۔ اس واقعہ سے یہ بات عام پھیل گئی کہ سلیمان ساحر تھا۔ جب قرآن نے سلیمان علیہ السلام کا تذکرہ انبیاء میں کیا تو انھوں نے اس بات سے انکار کیا کہا: وہ تو جادوگر تھا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ (تفسیر طبری)

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں قصہ ہاروت و ماروت ''مسند احمد'' میں بسند حسن ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں مروی ہے۔ طبری نے اس واقعہ کے کئی طرق بیان کیے ہیں۔ [1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قصہ کا اصل موجود ہے۔ [2] بخلاف ان لوگوں کے جنھوں نے اس قصہ کو باطل قرار دیا ہے۔ جیسے قاضی عیاض وغیرہ۔

حاصل اس کا یہ ہے کہ اللہ نے بطورِ آزمائش دو فرشتوں میں شہوت ودیعت کردی، پھر ان کو حکم دیا کہ زمین پر

---

[1] قال ابن كثير: وَأَقْرَبُ مَا فِي هَذَا أَنَّهُ مِنْ رِوَايَةِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ، عَنْ كَعْبِ الْأَحْبَارِ، لَا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، كَمَا قَالَ عَبْدُ الرَّزَّاقِ فِي تَفْسِيرِهِ، عَنِ الثَّوْرِيِّ، عَنْ مُوسَى بْنِ عُقْبَةَ، عَنْ سَالِمٍ، عَنِ ابْنِ عُمَرَ، عَنْ كَعْبٍ، قَالَ ابن كثير أيضا . وَرَوَاهُ ابْنُ جَرِيرٍ أَيْضًا . حَدَّثَنِي الْمُثَنَّى، حَدَّثَنَا الْمُعَلَّى -وَهُوَ ابْنُ أَسَدٍ- حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيزِ بْنُ الْمُخْتَارِ، عَنْ مُوسَى بْنِ عُقْبَةَ، حَدَّثَنِي سَالِمٌ أَنَّهُ سَمِعَ عَبْدَ اللَّهِ يُحَدِّثُ، عَنْ كَعْبِ الْأَحْبَارِ، فَذَكَرَهُ فَهَذَا أَصَحُّ وَأَثْبَتُ إِلَى عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ مِنَ الْإِسْنَادَيْنِ الْمُتَقَدِّمَيْنِ، وَسَالِمٌ أَثْبَتُ فِي أبيه من مولاه نَافِعٍ .فَدَارَ الْحَدِيثُ وَرَجَعَ إِلَى نَقْلِ كَعْبِ الْأَحْبَارِ، عَنْ كُتُبِ بَنِي إِسْرَائِيلَ، وَاللَّهُ أَعْلَمُ.(١/ ١٨٤ـالتفسير)

[2] مولانا محمد عطاء اللہ حنیف نے ''احسن التفاسیر'' (۱/۱۰۹) کے حاشیہ پر فرمایا: لیکن اس بارے میں درست تحقیق ''حافظ ابن کثیر'' کی ہے کہ یہ مرفوع حدیث نہیں بلکہ اسرائیلی روایت ہے کیونکہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے دراصل یہ روایت کعب احبار سے اخذ کی ہے چنانچہ ایک مسند میں اس کا ذکر بھی ہے بنابریں زہرہ والی کہانی بے اصل ہے۔ (نعیم الحق نعیم)

قضاء کے فرائض سرانجام دو۔ مدت دراز تک انھوں نے بصورتِ بشر زمین پر عدل و انصاف قائم کیے۔ پھر حسین و جمیل عورت پر فریفتہ ہو کر فتنہ میں پڑ گئے۔ اس بنا پر ان کو بطورِ سزا بابل کے کنویں میں الٹا لٹکا دیا گیا۔ ان کی ابتلاء علم سحر کے ذریعے ہی ہوئی۔ جو اس علم تک رسائی چاہتا، ان کا قصد کرتا وہ اس وقت تک کسی کو تعلیم نہ دیتے جب تک اسے ڈراتے اور منع نہ کر لیتے۔ جب کسی کو اصرار ہوتا تو اس سے گفتگو کرتے اور تعلیم دیتے۔ اس علم کی حقیقت ان پر منکشف تھی۔ لوگ ان سے ان اشیاء کی تعلیم حاصل کرتے جن کی وضاحت قرآن میں ہے۔ [1]

ترکیب: ﴿مَا تَتْلُوا الشَّيَاطِيْنُ﴾ میں صحیح مسلک یہ ہے کہ ما موصولہ ہے ان لوگوں کا مسلک غلط ہے جنھوں نے اس کو ما نافیہ بنایا ہے کیونکہ نظم کلام اس سے انکاری ہے۔ تَتْلُوا لفظ فعل مضارع ہے لیکن یہ ماضی کی جگہ واقع ہے یہ استعمال کلامِ عرب میں معروف ہے۔ اور تَتْلُوْا کا معنی منقول ہے۔ اسی بناء پر اس کا ''عَلٰی'' سے تعدیہ ہے۔

﴿وَ مَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ﴾ کا مَا یقینی طور پر نافیہ ہے۔ اور ﴿وَلٰكِنَّ الشَّيَاطِيْنَ كَفَرُوْا﴾ میں واؤ عاطفہ ہے۔ اور یہ ماقبل سے جملہ استدراکیہ ہے۔

﴿يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ﴾ اَلنَّاس مفعول اور اَلسِّحر مفعول ثانی ہے۔ جملہ كَفَرُوْا کے فاعل سے حال ہے۔ اَيْ كَفَرُوْا مُعَلِّمِيْنَ اور وَمَا اُنْزِلَ میں مَا موصولہ محل نصب میں ہے۔ اَلسِّحْرَ پر عطف ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہے: يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ وَ مَا اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ یعنی لوگوں کو جادو کی تعلیم دیتے تھے اور اس شے کی جو دو فرشتوں پر نازل ہوئی تھی اور بِبَابِلَ مَا اُنْزِلَ کے متعلق ہے باء بمعنی فِیْ ہے۔ جمہور کے نزدیک اَلْمَلَكَيْنِ لام کے فتحہ سے ہے۔ بعض نے اس کو کسرہ سے بھی پڑھا ہے۔ ہاروت و ماروت اَلْمَلَكَيْنِ سے بدل ہے جو فتح کے ساتھ ہے یا عطف بیان ہے۔ یہ تعلیم ہے۔ یہ تعلیم انذاری تھی طلبی نہیں تھی۔

الفاظ کی مزید تشریح: ﴿وَ مَا اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ﴾ کا عطف مَا تَتْلُوْا پر ہے۔ معنی یہ ہیں کہ تابعداری کی انھوں نے اس چیز کی جو پڑھتے تھے۔ شیطان سلیمان علیہ السلام کی بادشاہی میں اور اس چیز کی جو دو فرشتوں ہاروت اور ماروت پر نازل ہوئی اَلْمَلِكَيْنِ لام کے کسرہ کے ساتھ قراءت غیر معروف ہے۔ مشہور لام کے فتحہ سے ہے۔ زیر کی صورت میں معنی یوں ہوا کہ ہاروت و ماروت کے ساتھ جب خواہشات نفسانی لگا دی گئیں تو وہ گویا مرد بن گئے۔ اور جب قاضی بنائے گئے تو اس طرح سے بادشاہ ہو گئے۔ پس دونوں قراءات آپس میں موافق ہو گئیں۔ بعض لوگ وَ مَا اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ کے ما کو نفی کا بناتے ہیں۔ اور معنی یوں کرتے ہیں کہ نہیں اتاری گئی فرشتوں پر کوئی چیز (جادو سے) اور لفظ بِبَابِلَ کو يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ سے متعلق بناتے ہیں۔ یعنی شیطان لوگوں کو جادو بابل شہر میں سکھاتے تھے۔ اور ہاروت اور ماروت کو شیاطین سے بدل بناتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہاروت اور ماروت شیطان تھے۔ اور وجہ یہ بیان کرتے

[1] فتح الباری: ۱۰/ ۲۲۵

ہیں کہ جب جادو کفر ہے تو فرشتوں پر کس طرح اتارا جا سکتا ہے۔ اور وہ لوگوں کو کس طرح سکھا سکتے ہیں۔ اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ اللہ جس چیز کے ساتھ چاہے، بندوں کی آزمائش کرے۔ اسی لیے وہ پہلے کہہ دیتے کہ یہ کفر ہے تاکہ کوئی شخص دھوکے میں نہ رہے۔ جب کوئی باز نہ آتا تو اس کو سکھا دیتے۔ اور نظمِ قرآن کے لحاظ سے مَـا اُنْـزِلَ کے مَـا کو نفی کے لیے بنانا صحیح نہیں کیوں کہ اس سے نظمِ قرآن میں کئی کمزوریاں پیدا ہوتی ہیں۔

۱۔ بِبَابِلَ کا تعلق اگر بِمَا اُنْزِلَ سے ہو تو پھر ہاروت ماروت کو شیاطین سے بدل بنانا صحیح نہیں کیونکہ شیاطین صیغہ جمع ہے۔ جب کہ ہاروت ماروت تثنیہ ہے نیز مَلَکَیْنِ سے بدل نہ بنانا تو اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ جادو مَلَکَیْنِ پر اتارا گیا ہے لیکن بابل میں نہیں بلکہ کسی اور جگہ۔ اور اگر بِبَابِلَ کا تعلق وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوْا الشَّيَاطِيْنَ سے ہو تو وہ بہت دور ہے۔ درمیان میں اور کلام آ گیا اس سے عبارت میں خلل پیدا ہوتا ہے۔

۲۔ ہاروت ماروت ظاہر نظم کے لحاظ سے مَلَکَیْنِ سے بدل ہے۔ کیونکہ مَلَکَیْنِ تثنیہ ہے اور ہاروت ماروت بھی دو ہیں۔ نیز ہاروت اور ماروت میں قرب بھی ہے۔ ہاروت ماروت کو شیاطین سے بدل بنانا ظاہر نظم کے بالکل خلاف ہے۔ كَمَا تَقَدَّمَ

۳۔ اگر ہاروت و مارت شیطان ہوں تو پھر ان کا تبلیغ کرنا کہ ہم آزمائش میں ہیں، تو کفر نہ کر۔ یہ صحیح نہیں کیونکہ نیکی کی تبلیغ کی توقع شیاطین سے نہیں ہو سکتی۔ پس صحیح معنی وہی ہے جو پہلے بیان ہو چکا کہ اُنْـزِلَ کا تعلق مَـا تَتْـلُوْا سے ہے اور معنی یوں ہے کہ تابعداری کی انھوں نے اس چیز کی جو وہ پڑھتے تھے۔ شیاطین سلیمان علیہ السلام کے عہد میں اور اس چیز کی جو اتاری گئی دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر بابل میں۔

اصحابِ کہف کتنے تھے اور ان کے نام کیا ہیں؟

سوال : اصحابِ کہف کتنے تھے اور ان کے نام کیا ہیں۔ تفصیل سے بتائیں؟

(شاہد اقبال شیر نگری متعلّم جامعہ کمالیہ راجووال) (۱۹ فروری ۱۹۹۹ء)

جواب : ظاہر یہ ہے کہ اصحابِ کہف سات تھے آٹھواں ان کا کتا تھا۔ کیونکہ قرآنی آیت میں اختتامی عدد یہی ہے۔

اصحابِ کہف کے ناموں کے بارے میں کوئی صحیح نص موجود نہیں۔ تاہم بعض مفسرین نے جو نام ذکر کیے ہیں ملاحظہ فرمائیں: مکسلینا، تملیخا، مرطوس، نینوس، ساربونس، ذونواس، فلیستطیونس۔ ❶

کیا اصحابِ کہف کا کتا بھی جنت میں جائے گا؟

سوال : کچھ لوگوں کو کہتے سنا گیا ہے کہ اصحابِ کہف کا کتا بھی جنت میں جائے گا۔ کیا یہ درست ہے؟ (سائل)

❶ الفتوحات الالٰھیة، ۳/ ۱۷۔

جواب: یہ بات بلا اصل اور بے بنیاد ہے کہ اصحاب کہف کا کتا جنت میں جائے گا۔ کتاب وسنت میں اس کا کوئی استناد نہیں۔ البتہ رطب ویابس کے جامع مفسرین نے اس واقعہ کو ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: تفسیر خازن (۳۰۲/۳) وغیرہ۔

''سورۃ صٓ'' کے سجدے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

سوال: سورۃ ص کے سجدے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے اور سجدہ تلاوت کا طریقہ کیا ہے؟ اور سجدہ تلاوت کی دعا صحیح حدیث سے کونسی ملتی ہے؟ (شاہد اقبال شیر نگری متعلم جامعہ کمالیہ راجووال) (۱۹ فروری ۱۹۹۹ء)

جواب: سورہ ص میں سجدہ ہونا چاہیے۔

''مرعاۃ المفاتیح'' میں ہے:

« فَالْحَقُّ عِنْدِیْ اَنْ یَسْجُدَ فِی اتِّبَاعِ لِلنَّبِیِّ ﷺ فِی الصَّلٰوۃِ وَ خَارِجِ الصَّلٰوۃِ لِاِطْلَاقِ الْأَحَادِیْثِ »(۴۶/۲)

بہتر ہے کہ سجدہ تلاوت کھڑے ہو کر کیا جائے خر راکعا کا تقاضا یہی ہے۔ خر واسجدا کی تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہما سے رکعاً کے ساتھ مروی ہے۔ [1]

سجدہ تلاوت کی دعا:

« سَجَدَ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ خَلَقَهٗ وَ شَقَّ سَمْعَهٗ وَبَصَرَهٗ بِحَوْلِهٖ وَ قُوَّتِهٖ » [2]

کیا یہ بات صحیح ہے کہ سیدنا ایوب علیہ السلام کے جسم میں کیڑے تھے؟

سوال: سیدنا ایوب علیہ السلام کے زخمی جسم میں کیڑوں کا جو ذکر کیا جاتا ہے کیا یہ صحیح ہے؟

(ابوعبدالوہاب، خوشاب) (۱۲ اکتوبر ۲۰۰۷ء)

جواب: انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام چوں کہ ساری امت کے لیے سیرت وصورت کے اعتبار سے بہترین نمونہ ہوتے ہیں۔ اس لیے ان میں نفرت دلانے والی امراض کا پایا جانا ناممکن اور محال ہے بخلاف اعراض بشریہ کے۔ لہٰذا حضرت ایوب علیہ السلام کے جسم میں کیڑے پڑ جانے والا قصہ ناقابل اعتبار ہے۔ (ملاحظہ ہو حاشیہ تفسیر سعدی: ۲۵۳/۵)

یہ بات کہاں تک درست ہے؟ ''کہ سیدنا ایوب علیہ السلام کے جسم میں کیڑے تھے''

سوال: حضرت ایوب علیہ السلام بیمار ہوئے تو اس کی نوعیت کیا تھی؟ کیا یہ صحیح ہے کہ ان کے سارے جسم میں کیڑے پڑ گئے تھے۔ اگر کوئی کیڑا نیچے گر جاتا تو اسے اٹھا کر اپنے جسم سے چپکا لیتے کہ تیری غذا تو اللہ نے میرے جسم میں رکھی ہے

[1] تفسیر قرطبی: ۹۹/۱٤

[2] صحیح الترمذی : ۵۸۰۔ قال الترمذی حدیث حسن .

اور کیا سارا جسم خراب ہو گیا تھا؟ اس کا کیا ثبوت ہے؟ اگر معمولی نوعیت کی بیماری تھی تو ایوب صابر کی شہرت کس بنا پر ہے؟ (سائل) (۱۲ جنوری ۲۰۰۱ء)

جواب : قرآن مجید کے بیان سے واضح ہے کہ ایوب علیہ السلام کسی شدید ترین بیماری میں مبتلا تھے۔ بائبل کا بیان بھی یہی ہے کہ سر سے پاؤں تک ان کا سارا جسم پھوڑوں سے بھر گیا تھا۔ تفسیر ابن کثیر اور تفسیر خازن وغیرہ میں سوال میں مشارٌ الیہ بیان کی طرف اشارات موجود ہیں مگر نبی ﷺ سے مستند کوئی شئے وارد نہیں تاہم بالاجمال صحیح حدیث میں ہے۔

«اَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً الْاَنْبِیَاءُ»

''لوگوں میں سب سے شدید ترین آزمائشیں انبیاء علیہم السلام پر آتی ہیں۔''

بعض اہل علم کا خیال ہے کہ ایسی بیماری جس سے لوگ نفرت کا اظہار کریں نبوت کے منافی ہے مثلاً پھوڑے نکل آنا، قوتِ سمع و بصر کا متاثر ہو جانا، وغیرہ چونکہ انبیاء کی حیثیت راہنما کی ہے۔ دعوت و تبلیغ کی خاطر عوام سے میل جول کی ضرورت ہے۔ نبی کو نفرت آمیز امراض لاحق ہوں تو کون اس کے قریب آئے گا۔ ایسی حالت میں کما حقہ واجبات ادا نہیں کر سکتا۔ اس لیے رسولوں کے لیے ضروری ہے کہ بہترین حالت اور خوبصورت ترین ہیئت میں ہوں البتہ بتقاضائے بشریت امراض کا لاحق ہونا درست ہے بشرطیکہ تنفر کرنے والے نہ ہوں۔ [1]

میرے خیال میں مذکورہ وجوہ میں سے بعض محل نظر ہیں۔ کہ اللہ رب العزت مختارِ کل ہے وہ جیسے چاہے بندوں کی آزمائش کرے کوئی اسے پوچھنے والا نہیں: ﴿لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَ هُمْ یُسْئَلُوْنَ﴾ (الانبیاء:۲۳)

حضرت یعقوب علیہ السلام کی بصارت ضائع ہونے کا قصہ تو قرآن میں موجود ہے تو پھر انکار کیسا؟ بہر صورت سیدنا ایوب علیہ السلام کی بیماری معمولی نوعیت کی نہیں تھی بلکہ وہ سخت تھی اسی وجہ سے تو قرآن نے ان کا لقب صابر رکھا ہے۔

کیا کوئی آیت منسوخ بھی ہے؟

سوال : میرا سوال ناسخ و منسوخ سے متعلق ہے۔

« اَلشَّیْخُ وَالشَّیْخَةُ إِذَا زَنَیَا فَارْجُمُوْهُمَا الْبَتَّةَ.» [2]

کیا یہ کوئی منسوخ آیہ ہے اگر منسوخ ہے تو اس کی ناسخ آیہ کون سی ہے؟ کیا کوئی اور بھی آیت ہے جو اس طرح منسوخ ہوئی۔ ملاحظہ: میرا سوال رجم کے بارے میں نہیں ہے ناسخ منسوخ کے بارے میں ہے؟ (فاروق، سمن آباد) (۱۵ جون ۲۰۰۷ء)

جواب : نسخ کی تین صورتیں ہیں:

① ..... آیت اور اس کا حکم دونوں منسوخ ہوں۔ جیسے بعض روایتوں میں آیا ہے ''سورۃ احزاب''، ''سورۃ بقرۃ'' کے برابر

---

[1] تیسیر الکریم الرحمن فی تفسیر کلام المنان ہامش (۵/ ۲۵۳)

[2] مسند احمد، رقم: ۲۱۲۰۷، سنن ابن ماجه، بَابُ الرَّجْمِ، رقم: ۲۵۵۳

تھی۔ اب صرف نصف پارہ رہ گئی باقی اٹھائی گئی۔

②.....آیت باقی رہے اور اس کا حکم اٹھا لیا جائے جیسے ﴿وَالّٰتِیْ یَأْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَائِكُمْ .....الخ﴾ (النساء:١٥)

یہ آیت باقی ہے اور اس کے حکم کو منسوخ کرکے درے لگانے یا سنگسار کرنے کا حکم بھیج دیا، چناں چہ اس آیت میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کوئی اور راستہ نکال دے یعنی حکم اتار دے۔

③.....کہ آیت اٹھ جائے اور حکم باقی رہے اس کی مثال سنگسار کرنے کا مسئلہ ہے۔ ''سورۃ احزاب'' میں یہ آیت تھی

﴿الشيخ والشيخة .... الاية﴾ (تفسیر ابن کثیر)

یہ آیت قرآن میں نہیں لیکن حکم باقی ہے۔

مزید مثالوں کے لیے ملاحظہ ہو! الاتقان في علوم القرآن: ٢/ ٢٤۔

اس آیت کی تلاوت کیوں اٹھی جب کہ حکم باقی ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: فتح الباری: ١٢/ ١٧٦۔

قرآنِ مجید کی کتنی آیات منسوخ ہوئی ہیں؟

سوال: کتنی قرآنی آیتیں ایسی ہیں جو منسوخ کر دی گئی ہیں؟ حوالے دے کر بتائیں! (سائل) (٢٠۔اپریل ٢٠٠٧ء)

جواب: لوگوں نے بہت ساری آیات کو منسوخ قرار دیا ہے جب کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے ''الفوز الکبیر'' میں صرف پانچ آیات کا نسخ تسلیم کیا ہے۔

قرآن کریم کی وہ کونسی آیات ہیں جن کی تلاوت منسوخ اور حکم باقی ہے؟

سوال: قرآن کریم کی کن آیات کی تلاوت منسوخ اور حکم باقی ہے اور کونسی آیات ہیں جن کی تلاوت باقی ہے اور حکم منسوخ ہے۔ (شاہد اقبال شیر نگری متعلم جامعہ کمالیہ راجووال) (١٩ فروری ١٩٩٩ء)

جواب: بطورِ مثال وہ آیت جس کی تلاوت منسوخ ہے اور حکم باقی ہے۔

« اَلشَّیْخُ وَالشَّیْخَةُ إِذَا زَنَیَا فَارْجُمُوْهُمَا اَلْبَتَّةَ.» [1]

اور وہ آیت جس کی تلاوت باقی ہے اور حکم منسوخ ہے۔

﴿إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۨ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ﴾ (البقرة: ١٨٠)

ابن عباس رضی اللہ عنہما اور حسن رضی اللہ عنہ نے کہا کہ والدین کے لیے ''سورۂ النساء'' میں وصیت بطورِ فرض منسوخ ہے۔ (تفسیر القرطبی: ٢/ ٢٦٣) اور ''صحیح بخاری'' میں ہے: ابن عباس نے کہا:

[1] فتح الباری: ١٢/ ١٤٣

«كَانَ الْمَالُ لِلْوَلَدِ وَكَانَتِ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ فَنَسَخَ اللَّهُ مِنْ ذَلِكَ مَا أَحَبَّ.»[1]

''سنن ابی داؤد'' میں ہے:

«بَابُ مَا جَاءَ فِي نَسْخِ الْوَصِيَّةِ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ.»

مسئلہ ہذا میں تفصیل کے لیے اصولِ تفسیر کی کتابوں کی طرف رجوع فرمائیں۔ جملہ حقائق سے آگاہی حاصل ہوگی۔

قرآنی تفاسیر میں سے کونسی تفسیر زیادہ اصح اور مفید ہے؟

سوال: شائع شدہ اُردو قرآنی تفاسیر مثلاً (تفہیم القرآن، احسن التفاسیر، ماجدی، ترجمان القرآن) وغیرہ میں سے کونسی تفسیر زیادہ اصح اور مفید ہے؟ تاکہ اس سے بھرپور استفادہ کیا جاسکے۔

(محمد صدیق تلیاں۔ سمندر کھ ضلع ایبٹ آباد) (۲۱ اگست ۱۹۹۸ء)

جواب: مذکورہ بالا کتابیں فی الجملہ اچھی ہیں۔ سب کا مطالعہ کریں لیکن احسن التفاسیر کا خاص اہتمام کریں۔

قرآن مجید کا لفظی اور با محاورہ اردو تراجم میں زیادہ صحیح اور مفید کونسا ہے؟

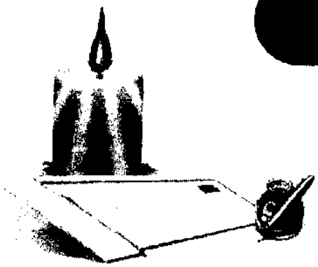
سوال: قرآن مجید کے لفظی اور با محاورہ شائع شدہ اُردو تراجم مثلاً (حافظ نذر احمد، عبید اللہ عبید، ڈاکٹر محمد دین وغیرہ) میں زیادہ صحیح اور مفید کونسا ہے۔ تاکہ اس سے فائدہ حاصل کیا جاسکے۔

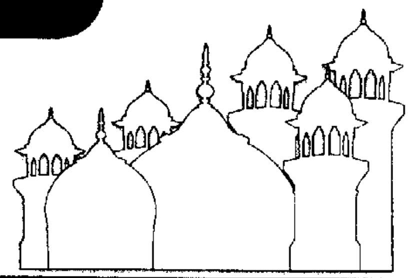
(محمد صدیق تلیاں۔ سمندر کھ ضلع ایبٹ آباد) (۲۱ اگست ۱۹۹۸ء)

جواب: مذکورہ بالا سب تراجم کا مطالعہ کریں۔ عبید اللہ عبید کے ترجمہ کا اہتمام کرنا مفید ہے۔

[1] صحیح البخاری، بَابٌ: لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ، رقم:۲۷٤۷

متفرقات





کیا رسول اپنی طرف سے شریعت بنا سکتا ہے؟

سوال : اللہ شریعت نافذ کرتے ہیں، کیا رسول کو بھی اختیار ہے؟ جب کہ قرآن میں ہے: ﴿اَمۡ لَهُمۡ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوۡا لَهُمۡ مِّنَ الدِّيۡنِ﴾ (الشوریٰ:۲۱) ''یعنی ایسا کرنا شرک ہے۔ جب کہ دوسری آیات واحادیث میں ہے کہ اللہ اور رسول نے فرض فرمایا۔ یا اگر مجھ کو لوگوں کی مشقت کا ڈر نہ ہوتا تو مسواک کرنا فرض قرار دیتا۔ اسی طرح تراویح کے متعلق بھی فرمایا۔ احادیث صحیح ہیں اور تضاد ظاہر ہے۔ وضاحت فرما کر ممنوع فرمادیں۔

جواب : رسول بمعنی مرسل اس کو کہا جاتا ہے جو دوسرے کے حکم کا پابند ہو۔ لہٰذا نبی یا رسول عام حالات میں جو کچھ وضاحت کرتا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے: ﴿وَمَا يَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰى﴾ (النجم:۳) شریعت مقرر کرنا صرف اللہ کا اختیار ہے۔ مخلوق اس کے حکم کی پابند ہے۔

کیا اللہ نے ہمارا نام مسلم رکھا ہے، اور کیا اہل سنت یا اہل حدیث کہلوانا فرقہ بندی ہے؟

سوال : اللہ نے ہمارا نام مسلم رکھا ہے، لہٰذا اہل سنت یا اہل حدیث کہلوانا ناجائز اور فرقہ سازی ہے؟

جواب : عہدِ رواں میں اس لایعنی بحث مباحثے کا بانی مسعود احمد ہے، محدثین عظام کی تضحیک، ان کے کارہائے نمایاں کا منہ چڑانا، اسلام کا لیبل لگا کر جہمیہ، معتزلہ، خوارج اور دیگر باطل فرقوں کی در پردہ وکالت کرنا اس کا وطیرہ ہے۔ مگر یاد رہے کہ:

﴿يُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ يُّطۡفِـُٔوۡا نُوۡرَ اللّٰهِ بِاَفۡوَاهِهِمۡ وَيَاۡبَى اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنۡ يُّتِمَّ نُوۡرَهٗ وَلَوۡ كَرِهَ الۡكٰفِرُوۡنَ﴾ (التوبة:۳۲)

بالفرض اگر ان کا دعویٰ تسلیم کر لیا جائے تو الفاظ قرآنی کے عموم کے پیش نظر اس کا اور اس کے جملہ حواریوں کا نام بھی المسلمین ہی ہونا چاہیے تھا، جب کہ واقعات اس کی تکذیب کر رہے ہیں۔ اصل صورت حال یہ ہے کہ آیت کریمہ میں ''مسلمین'' نام بطورِ صفت بیان ہوا ہے بطورِ علم نہیں۔ چناں چہ سورۃ الاحزاب میں مسلمین ہی کی متعدد دیگر صفات ذکر ہوئی ہیں، اس کے علاوہ ''مسند امام احمد'' کی صحیح حدیث میں ہے:

« فَادْعُوا الْمُسْلِمِيْنَ بِاَسْمَائِهِمْ بِمَا سَمَّاهُمُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ : اَلْمُسْلِمِيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ، عِبَادَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ » ❶

''پس تم مسلمین کو ان ناموں کے ساتھ پکارو جو نام اللہ عزوجل نے ان کے رکھے ہیں، یعنی مسلمین مومنین، عباداللہ۔''

مذکورہ آیت اور حدیث سے معلوم ہوا کہ مسلمین کے علاوہ بھی اللہ تعالیٰ نے ہمارے وصفی نام رکھے ہیں، جن سے چنداں انکار ممکن نہیں۔ مزید یہ کہ ان حضرات نے لفظ جماعت کا اضافہ کرکے اپنے فرقے کا نام ''جماعت المسلمین'' رکھا ہے، جو قرآنی الفاظ پر زیادتی ہے۔ اگر کوئی کہے کہ یہ نام ہم نے حدیث حذیفہ رضی اللہ عنہ سے لیا ہے تو پھر بطورِ استدلال قرآنی آیت پیش کرنا درست نہ ہوا، آیت کی بجائے حدیث حذیفہ کا نام لینا چاہیے جب کہ امر واقع یہ ہے کہ حدیث میں اس کا نام ونشان تک نہیں، حدیث میں گول تا (ــــة ئة) سے اس طرح جماعۃ المسلمین ہے، جب کہ ان کی جماعت کا نام، جماعت المسلمین، لمبی تا سے ہے جو اس کے بے اصل اور جعلی ہونے کی واضح دلیل ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ حدیث حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مصنوعی جماعت مراد نہیں، بلکہ اس سے مقصود مسلمانوں کی اجتماعی ہے۔ جو امارت وحکومت میں ایک خلیفہ پر مجتمع ہو۔ متعدد احادیث میں اس امر کی تصریح موجود ہے، امام بخاری رحمہ اللہ نے حدیث ہذا کو ''کتاب الفتن'' میں ذکر کیا ہے، جس سے مقصود یہ ہے کہ فتنہ وفساد کے زمانے میں مسلمانوں کو کیا کردار ادا کرنا چاہیے۔ پھر اس حدیث پر بایں الفاظ تبویب قائم کی ہے: «بَابُ كَيْفَ الْاَمْرُ اِذَا لَمْ تَكُنْ جَمَاعَةٌ» یعنی جب جماعت نہیں ہوگی تو ایسے وقت میں صورتِ حال کیا ہوگی؟ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس کی وضاحت یوں فرماتے ہیں:

''اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی ایک خلیفہ پر اجتماع سے پہلے اختلاف کی حالت میں مسلم کیا طرزِ عمل اختیار کرے گا؟۔'' ❷

نیز حدیث حذیفہ رضی اللہ عنہ میں فرقوں سے مراد سیاسی گروہ بندیاں ہیں جو کسی ایک خلیفہ اور امام کی قیادت سے محروم ہوں۔ جب منزل مقصود ایک ہو تو نام کے اختلاف سے کوئی فرق نہیں پڑتا، فرقے نام رکھنے سے نہیں بلکہ عقیدے اور

❶ مسند احمد، رقم ۱۷۱۷۰

❷ فتح الباری: ۱۲/ ۳۵

نظریات کی تبدیلی سے وجود میں آتے ہیں، جس طرح معتزلہ نے اپنا نام تو اہل العدل والتوحید رکھا ہوا تھا لیکن پس پردہ ان کا مقصود صفاتِ الٰہیہ کا انکار تھا، چناں چہ یہ نام ان کے لیے نفع بخش ثابت نہ ہو سکا۔ اسی طرح ان لوگوں نے اپنے فرقے کا نام ''جماعت المسلمین'' رکھا ہے لیکن مقصود جہمیہ کی پیروی میں صفاتِ الٰہیہ کا انکار ہے، لہٰذا یہ نام رکھنے سے ان لوگوں کو بھی (ان شاء اللہ) کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

واضح ہو کہ ''اہل الحدیث، یا اہل السنت، کسی ایک گروہ کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ منکرین صفاتِ الٰہیہ کے مدمقابل ایک محاذ اور تحریک کا نام ہے، جس کا مطمح نظر صرف اور صرف کتاب و سنت کی روشنی میں منہج سلف صالحین کو واضح کرنا ہے، یہ ایک طرزِ فکر و عمل اور منہج حیات کا نام ہے۔

کیا احمد بن حنبل شیعہ مسلک کے پیرو تھے؟

سوال: احمد بن حنبل شیعہ مسلک کا پیرو اور یہود و نصاریٰ کا ایجنٹ تھا؟۔ وہ اعادۂ روح کا قائل تھا، اور اس نے مسلمانوں میں یہ عقیدہ پھیلا دیا کہ مرنے کے بعد دنیاوی گڑھے (قبر) میں دنیاوی بدن سے روح کا تعلق قائم کر دیا جاتا ہے، لہٰذا احمد بن حنبل مخالف قرآن عقیدہ کی وجہ سے خود بھی کافر ہوا اور امت کی اکثرت کو بھی کافر کر دیا۔

جواب: جہم بن صفوان، بشر بن غیاث المریسی، واصل بن عطاء، احمد بن داؤد المعتزلی کی معنوی اولاد کو حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ جیسی عظیم ہستی کا نام کیسے ہضم ہو سکتا ہے؟ بات یہ ہے کہ سورج کی طرف تھوکنے سے تھوک اپنے چہرے پر ہی گرتی ہے، اس طائفہ باطلہ کی ہرزہ سرائی سے امام ذی شان کے مرتبہ و مقام میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی خاطر ان کی عظیم قربانیاں قیامت تک زندہ و جاوید رہیں گی۔ امام علی بن المدینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« اِنَّ اللّٰہَ اَعزَّ ھٰذَا الدِّیْنَ بِرَجُلَیْنِ لَیْسَ لَہٗ ثَالِثٌ، أَبُوْبَکْرِ الصِّدِّیْقُ یَوْمَ الرِّدَّۃِ، وَ أَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلٍ یَوْمِ الْمِحْنَۃِ »

''اللہ نے اس دین کی حفاظت و صیانت کا کام دو آدمیوں سے لیا ہے، تیسرا کوئی نہیں۔ فتنہ ارتداد میں ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ثابت قدمی کا ثبوت دیا اور فتنہ خلق قرآن میں احمد بن حنبل چٹان ثابت ہوئے۔''

تاریخ شاہد ہے کہ امام موصوف کے حاسدین ہر دور میں پیدا ہوئے اور صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔ ان بدبختوں نے اپنی آخرت بھی برباد کر ڈالی۔ خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْآخِرَۃَ ذٰلِکَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِیْنُ

امام احمد بن حنبل کی وفات پر سب سے زیادہ رنج و غم یہود و نصریٰ، مجوسیوں اور ان کے لے پالک سازشی عناصر (نام نہاد مسلمانوں) کو ہوا تھا، خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ جس روز احمد بن حنبل کی وفات ہوئی اس روز بیس ہزار یہودی، نصرانی اور مجوسی مسلمان ہوئے۔ مزید کہا کہ میں نے الورکانی کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جس دن احمد بن حنبل کی موت

واقع ہوئی اس روز چار مذاہب کے لوگوں (مسلمانوں، یہودیوں، نصرانیوں اور عیسائیوں) نے ماتم کیا۔ [1]

جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے اور یہ بات حقیقت بن گئی۔۔ جو لوگ ان کے موافق ہوئے اور اہل السنہ اور ناجی گروہ بنے اور جنھوں نے ان سے بغض اور عداوت کا اظہار کیا بد بخت فرقہ باطلہ میں شامل ہو گئے۔

کیا امام مہدی کا ظہور برحق ہے؟

سوال: امام مہدی کا ظہور نہیں ہوگا۔ظہورِ مہدی کا عقیدہ احمد بن حنبل جیسے شیعہ نے گھڑا ہے؟

جواب: امام مہدی کا ظہور برحق ہے، اس بارے میں وارد روایات صحیح ،حسن اور ضعیف کی قبیل سے ہیں۔تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، ہمارے شیخ عبدالمحسن العباد کی کتاب عقیدة اهل السنة والاثر فی المهدی المنتظر اور النهاية ابن كثير (۱۱/ ۲۷) امام احمد پر تشیع کا فتویٰ لگانا الزام تراشی ہے، امام موصوف اس سے بری تھے۔

کیا مولوی قابل نفرت لفظ ہے؟

سوال: ہمیں مولوی نہ کہو، مولوی تو ایک قابل نفرت لفظ ہے۔اس کا استعمال صرف اس شخص کے لیے جائز ہے جس نے قرآن کی تلاوت اور نماز کی امامت کو بطورِ پیشہ اختیار کیا ہو۔

جواب: لفظ مولوی کا معنی ہے، اللہ والا۔جس کو اس لفظ سے نفرت ہے گویا اس کی اللہ کے ساتھ تعلق داری کمزور ہے، جس کی فکر کرنی چاہیے۔قرآن کی تلاوت اور نماز کی امامت پیشہ نہیں بلکہ فرض کی ادائیگی کے طور پر مومن اس پر عمل پیرا ہوتا ہے۔

لا الٰہ الا اللہ کا صحیح ترجمہ

سوال: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کا ترجمہ ان دونوں میں سے کون سا صحیح ہے؟

۱۔اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔۲۔اللہ کے سوا معبودِ حقیقی کوئی نہیں۔(ام کلثوم۔لاہوتی) (۱۶۔اگست ۲۰۰۲ء)

جواب: دوسرا ترجمہ صحیح ہے۔

آسمان کہاں ہے اور کیسا ہے؟

سوال: سائنس نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ جو سامنے نیلا نیلا رنگ نظر آتا ہے۔یہ آسمان نہیں ہے کیونکہ خلا میں جا کر دیکھیں تو کالا نظر آتا ہے جیسے ہمیں رات کے وقت۔دین اس کے بارے میں کیا کہتا ہے؟ آسمان کہاں ہے؟ کیسا ہے؟ (سائل) (۸ نومبر ۱۹۹۶ء)

جواب: سائنسی معلومات کا دائرہ محدود ہے کیونکہ یہ خالقِ کون کے وجود اور اس کی راہنمائی سے محروم اور مستغنی ہے

[1] تاریخ بغداد: ۱/ ۴۲۳

جب کہ مذہب اور عقیدہ کا تعلق براہِ راست خالق کون سے ہوتا ہے۔

اس میں وارد جملہ حقائق پر ایمان لانا ایمانیات کا اہم جز ہے۔ چاہے وہ بشری عقول کے تحت ہوں یا اس کے ماوراء۔ بہر صورت آسمان کا وجود ذی جرم شکل میں نصوصِ شرعیہ سے ثابت ہے اس کا انکار ایک مومن کے لیے ناممکنات سے ہے بلکہ اس پر ایمان لانا واجب ہے۔

یاد رہے شریعت نے اس بات کا تعین نہیں کیا کہ صرف نیلے رنگ کا نام آسمان ہے۔قرآن میں ہے:

﴿فَإِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ﴾ (الرحمن:۳۷)

''پھر جب آسمان پھٹ کر تیل کی تلچھٹ کی طرح گلابی ہو جائے گا (تو) وہ کیسا ہولناک دن ہوگا۔''

غیر مسلموں کو قرآن کا تحفہ دینا

سوال: کیا غیر مسلم کو قرآن مجید برائے تحفہ دیا جا سکتا ہے؟ (عبدالحمید۔قصور) (۲۷ جولائی ۲۰۰۱ء)

جواب: کافر کو بطورِ تحفہ قرآنِ مجید پیش نہیں کرنا چاہیے۔''صحیح بخاری'' میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ:

«أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَهَى أَنْ يُسَافَرَ بِالْقُرْآنِ إِلَى أَرْضِ الْعَدُوِّ.» [1]

''رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا کہ دشمن کی سرزمین میں قرآن کے ساتھ سفر کیا جائے۔''

''سنن ابن ماجہ'' میں عبدالرحمٰن بن مہدی کے طریق سے مالک سے یہ زائد الفاظ بھی منقول ہیں کہ «مَخَافَةَ أَنْ يَنَالَهُ الْعَدُوُّ» ''اس ڈر سے کہ دشمن قرآن کی توہین نہ کرے۔''

جب کہ ''صحیح مسلم'' میں ایوب کے طریق سے زائد الفاظ یوں ہیں: «فَإِنِّي لَا آمَنُ أَنْ يَنَالَهُ الْعَدُوّ» مجھے تسلی نہیں کہ دشمن قرآن کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔'' اس سے معلوم ہوا کہ کوئی صورت ایسی نہیں اختیار کرنی چاہیے جس سے قرآن کا ادب واحترام مجروح ہونے کا خدشہ ہو۔ ہاں البتہ بطورِ دعوت وتبلیغ کافر کو ایک دو آیات لکھ کر بھیج دی جائیں تو قصۂ ہرقل کی بناء پر جائز ہے، یا کفار کو قرآن سنایا جائے تو یہ دینی فرض کی ادائیگی ہے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّى يَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ﴾ (التوبة:٦)

''اور اگر کوئی مشرک تم سے پناہ کا خواستگار ہو تو اس کو پناہ دے دو یہاں تک کہ کلام اللہ سننے لگے۔'' لیکن اس کے ہاتھ میں قرآن نہ پکڑایا جائے۔

غیر مسلموں کے لیے رحم کی دعا کرنا

سوال: کسی غیر مسلم کو تکلیف میں دیکھ کر اس کے لیے رحم کی دعا کر سکتے ہیں یا نہیں؟

(ام کلثوم۔لاہوتی) (۱۶۔اگست ۲۰۰۲ء)

[1] صحیح البخاری، باب السَّفَرِ بِالْمَصَاحِفِ إِلَى أَرْضِ الْعَدُوِّ. رقم:۲۹۹۰

جواب: غیر مسلم کے لیے تکلیف کی حالت میں رحم وصحت کی دعا ہوسکتی ہے بشرطیکہ ساتھ ہدایت کی بھی دعا کرے۔

نرم دل غیر مسلموں کے سلام کا جواب دینا

سوال: کیا یہ درست ہے کہ جو غیر مسلم مسلمانوں سے دشمنی نہ رکھتے ہوں ان کے سلام کے جواب میں ''وَعَلَیْکُمُ السَّلَامُ'' کہہ سکتے ہیں؟ (ام کلثوم۔لاہوتی) (۱۶۔اگست۲۰۰۲ء)

جواب: نہیں، غیر مسلم کے لیے سلام کے ساتھ ساتھ ہدایت کی دعا کرنی چاہیے۔«سَلَامٌ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی» جس طرح کہ قصہ ہرقل میں ہے۔

کیا اسلامی حکومت میں دیگر مذاہب اپنی تبلیغ کر سکتے ہیں؟

سوال: میں ایک P.C.O پر کام کرتا ہوں لیکن گرمی کی شدت کی وجہ سے ڈاکٹر نے دکان پر بیٹھنے سے منع کیا ہوا ہے کیونکہ مجھے گردوں کی تکلیف ہے لہٰذا دکان پر میرے ساتھ ایک عیسائی عورت جس کی عمر غالباً ۵۰ سال ہے کام کرتی ہے۔ صبح نو بجے سے شام ساڑھے سات بجے تک وہی ڈیوٹی دیتی ہے، اس نے دکان پر اپنے مذہب کے مطابق دو اسٹیکر لگائے ہوئے ہیں۔

(۱) یہواہ لیری سب کچھ مہیا کرتا ہے۔

(۲) With Jessus All Thing are Possible

میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ یہواہ لیری عبرانی لفظ ہے۔اور اس کا مطلب ''اللہ'' ہے بائبل کی ایک آیت ہے۔ اس لیے میں خاموش رہا ویسے بھی اس آبادی میں ۹۵ فیصد آبادی عیسائیوں کی ہے۔میری عقل کے مطابق ہمارا مذہب نفرت کی اجازت نہیں دیتا۔میرا اپنا مذہب ہے،اس کا اپنا مذہب ہے، میں اسی جگہ قرآن پاک کی تلاوت کرتا ہوں،نماز پڑھتا ہوں، وہ بائبل پڑھتی ہے۔میرا خیال ہے کہ ہمیں کسی پر پابندی نہیں لگانی چاہیے لیکن میرا ایک بہت پرانا مخلص ساتھی مجھ سے اس بات پر ناراض ہوگیا ہے حالانکہ دین کا اس کے پاس بہت زیادہ علم ہے، اس کا مطالبہ یہ ہے کہ اس کے اسٹیکر اتار دو، ورنہ میں اتار دیتا ہوں۔ میں نے اس کو بڑے پیار سے سمجھایا کہ نفرت نہ پھیلاؤ، پیار محبت سے تو بات کی جاسکتی ہے، کسی پر اپنا مسلک ٹھونسا نہیں جاسکتا، لیکن اس نے رواداری کی بجائے تنگ نظری کا مظاہرہ کیا اور مجھ سے ناراض ہوگیا۔ مجھے اپنے دوست کے ناراض ہونے کا بہت دکھ ہے بلکہ میں اس دن سے بیمار ہوں۔ براہِ مہربانی دینی نقطۂ نظر سے اس کا جواب دیں تا کہ مجھے سکون ہو۔ (صفدر) (۱۲۔اکتوبر۲۰۰۱ء)

جواب: مسلمان معاشرے میں عیسائی اور دوسرے لوگ اپنے عقیدے اور مذہب کے مطابق عبادت کر سکتے ہیں۔ نجران کے عیسائیوں نے سن نو ہجری میں اپنے عقیدے کے مطابق مسجد نبوی میں عبادت کی تھی، لیکن اسلام انہیں اپنے غلط

نظریات کی تشہیر کی اجازت نہیں دیتا، اس بارے میں ان پر ضرور پابندی ہونی چاہیے۔

مشکوٰۃ میں حدیث ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے ان کے ہاتھ میں تورات کا نسخہ تھا۔ عرض کی: یا رسول اللہ! یہ تورات کا نسخہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاموشی اختیار کی عمر نے پڑھنا شروع کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ انور متغیر ہوگیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے توجہ دلانے پر ان کو محسوس ہوا کہ میرا فعل درست نہیں۔ انھوں نے تعریفی کلمات کے ساتھ معذرت کا اظہار کیا تو آنحضرت نے انھیں مخاطب ہو کر فرمایا:

''مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے! اگر آج موسیٰ علیہ السلام تشریف لے آئیں اور تم مجھے چھوڑ کر ان کی پیروی کرنے لگ جاؤ تو سیدھی راہ سے بھٹک جاؤ، پھر فرمایا: ''موسیٰ علیہ السلام اگر زندہ ہوتے اور میری نبوت کو پالیتے تو وہ بھی میری پیروی کرتے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی آمد کے بعد واجب الاتباع صرف اور صرف حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، یہی پیغام عام کرنا چاہیے تاکہ دنیا و آخرت کی سرخ روئی حاصل ہو۔

''صحیح مسلم'' میں حدیث ہے کہ: مجھے اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے، جب کسی یہودی یا نصرانی کو میری آمد کا علم ہوگیا۔ لیکن وہ مجھ پر ایمان لائے بغیر مرگیا تو وہ یقیناً جہنمی ہے۔''

دوسری روایت میں ہے یہود و نصاریٰ میں سے مسلمان ہونے والے کے لیے دوہرا ثواب ہے۔''

بنا بریں محترمہ کو خوش اسلوبی کے ساتھ اسلام کے خصائص و امتیازات سے آگاہ کرتے رہنا چاہیے شاید اس کی ہدایت کا سبب بن جائے، البتہ آپ اس کے اسٹیکر اتروا دیں کیونکہ یہ بھی دعوت کا ایک حصہ ہے۔ اس کے بجائے قرآن و حدیث پر مشتمل پوسٹر آویزاں کریں اور اکثر آبادی عیسائی ہونے کی صورت میں آپ پر مزید فرض عائد ہوتا ہے کہ اس ماحول میں اسلامی تعلیمات کو عام کریں۔ اللہ رب العزت توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

غیر مسلم (این جی اوز) سے امداد قبول کرنا

سوال: ہمارے علاقہ میں مختلف قسم کی این جی اوز رفاہی کام کر رہی ہیں، جو لوگوں کو قرض، مویشی، پھل دار اور پھول دار پودے، سڑکیں، پانی کی سکیمیں اور اسی قسم کی دوسری سہولتیں مہیا کرتی ہیں جب کہ ایسی خدمات کی آڑ میں ان کے مقاصد بڑے مبہم اور خلافِ وطن و دین ہوتے ہیں۔ ان خدمات کے عوض میں یہ تنظیمیں لوگوں کے اذہان کو متاثر کر کے اپنا راستہ ہموار کرتی اور مخصوص مقاصد حاصل کرتی ہیں۔

شرعی نقطۂ نظر سے پسماندہ لوگ این جی اوز سے قرض لے سکتے ہیں یا نہیں؟ تاریخ اسلام میں کسی مشرک و کافر کی طرف سے دی گئی امداد مسلمانوں نے قبول یا مسترد کی ہو؟ وضاحت فرما دیں تاکہ لوگوں کو بالتفصیل آگاہ کیا جا سکے۔ (سائل: محمد بشیر، ایبٹ آباد) (۱۳ جولائی ۲۰۰۱ء)

جواب : دین وایمان کی سلامتی کے پیش نظر ان لوگوں سے حتی المقدور دور ہی رہنا چاہیے اور اگر جملہ تحفظات ممکن ہوں تو قرض سمیت جملہ سہولیات سے فائدہ بھی اٹھایا جا سکتا ہے۔ نبی ﷺ نے یہود سے قرض کا معاملہ کیا تھا لیکن ان کی شر سے بچنا اولین شرط ہے۔

نبی ﷺ نے صفوان بن امیہ کے مسلمان ہونے سے پہلے اس سے امداد لی تھی اور دوسرے ایک مشرک کی اعانت کو رد کر دیا تھا۔ اس سے اہل علم نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ غزوہ وغیرہ کے حالات میں کافر کی امداد قبول نہیں کرنی چاہیے ہاں البتہ اگر کوئی اور ذاتی ضرورت وغیرہ پیش ہو تو پھر جائز ہے یا ایسا کافر ہو جو مسلمانوں کی بابت اچھی رائے رکھتا ہو تو اس سے بھی استعانت کا جواز ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، شرح نووی: ۲/ ۱۱۸۔

غیر مسلم این جی اوز سے تعاون لینا کیسا ہے؟

سوال : کیا فرماتے ہیں مفتیان شرح متین کہ آغا خانی دیہی ترقیاتی تنظیموں کی رکنیت اختیار کر کے ترقیاتی فنڈ حاصل کرنا کتاب وسنت کی رُو سے جائز ہے یا حرام جب کہ صورت حال یہ ہے:

- شمالی علاقہ جات اور چترال میں آغا خان فاؤنڈیشن اور آغا خان رورل سپورٹ پروگرام کے تحت رفاہی اور فلاحی منصوبوں پر اربوں روپے خرچ کیے جا رہے ہیں، جس سے اقتصادی طور پر عوام کو فائدہ ہو رہا ہے۔
- شمالی علاقہ جات کے غریب عوام کے نام پر مغربی ممالک آغا خانی تنظیموں کے ذریعے بے تحاشا فنڈ دیتے ہیں، جب کہ ان سے غریب تر لوگ بلوچستان، سندھ وغیرہ میں بنیادی سہولیات سے بھی محروم ہیں، ان پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔
- حکومت پاکستان بھی جس قدر اسلام پسند رفاہی تنظیموں کا ناطقہ بند کر رہی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ مگر مغرب نواز این جی اوز کو ہر قسم کی چھوٹ دے رہی ہے، بلکہ عوام الناس کو ان اداروں کے آگے جھکنے پر مجبور بنانے اور ان کا احسان مند کرنے کے لیے بہت سے سرکاری فنڈ بھی آغا خانی تنظیم کے ذریعے فراہم کرتی ہے، جن میں سردست بیت المال کی طرف سے گرلز سکولوں میں دوپہر کا کھانا بھی شامل ہے۔
- آغا خانی اسماعیلی مذہب باطنی عقائد کا حامل ہے۔ ان کی تاریخ عہد فاطمی سے لے کر حسن بن الصباح، سقوط بغداد، صلاح الدین ایوبی کے خلاف سازشیں، سب اہل علم پر عیاں ہے۔
- ماہنامہ تکبیر وغیرہ میں اسماعیلیوں کے موجودہ سیاسی عزائم اور علیحدگی پسند تحریک سے متعلق تفصیلات آئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان رفاہی خدمات کے پس پردہ یہاں کے اہم ترین جغرافیائی خطوں پر مشتمل آغا خانی ریاست قائم کرنے کے منصوبے پر گامزن ہیں۔ حتی کہ جانباز فورس کے نام پر وہ اپنی الگ مسلح فوج بھی بنا رہے ہیں اور حکومت پاکستان بھی بین الاقوامی سازشوں کے زیر اثر ان کا دست و بازو بنی ہوئی ہے۔

- آغا خانی تنظیم سے منصوبہ طلب کرنے کے لیے شرط یہ ہے کہ متعلقہ علاقے میں آغا خان کے نام پر دیہی ترقیاتی تنظیم بنائی جائے۔ اس کے ارکان تھوڑی سی رقم بطورِ فیس جمع کر کے تنظیم کے نام پر بینک میں جمع کرتے ہیں جو فکس ڈیپازٹ میں رکھی جاتی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ سود حاصل ہو۔
- جب بعض لوگ اس فیس کو آغا خانی عقیدے کے مطابق مالِ امام یا مذہبی نذرانہ تصور کر کے رقم دینے سے کترانے لگے تو انھوں نے نظام میں تبدیلی کی۔ اب تنظیم سازی کے لیے ممبروں سے فیس نہیں لی جاتی، پھر منظور شدہ فنڈ میں سے ان کے قاعدے کے مطابق رقم کاٹ کر تنظیم کے اکاؤنٹ میں جمع کی جاتی ہے۔
- آغا خان رورل سپورٹ پروگرام کے مرد وزن ملازمین کو مختلف امور کے سلسلے میں کئی کئی دنوں تک مختلف علاقوں میں ٹھہرنا ہوتا ہے۔ جس کے دوران بے پردگی اور اختلاط سے معاشرے میں فحاشی وعریانی پھیلنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ (محمد یعقوب، سکردو بلتستان) (۲۸ مئی ۲۰۰۴ء)

جواب : استعمار کی پروردہ، الحاد اور بے دینی کی علمبردار آغا خانی تنظیموں سے تعاون حاصل کرنا حرام ہے، کیونکہ یہ لوگ سراسر جہنم کے داعی ہیں۔ «وَهُمْ دُعَاةٌ عَلٰى اَبْوَابِ جَهَنَّم» مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ دنیا کی عارضی مشکلات اور تکالیف پر صبر کریں۔

دوسری طرف اہل خیر مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس قسم کے پسماندہ علاقوں میں اپنے مسلمان بھائیوں کی ضروریات کا خیال رکھیں اور مشکلات کا ازالہ کرنے کی کوشش کریں۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِی الْاَرْضِ وَ فَسَادٌ كَبِیْرٌ﴾
(الانفال: ۷۳)

''کافر آپس میں ایک دوسرے کے معاون ہیں، اگر تم نے ایسا نہ کیا تو زمین میں فتنہ ہوگا اور بہت بڑا فساد برپا ہو جائے گا۔''

کیا غیر مسلم اور مشرکین جسمانی لحاظ سے پلید ہیں؟ ان کے ساتھ کھانا پینا جائز ہے؟

سوال : کیا مشرک روحانی اور جسمانی دونوں اعتبار سے پلید ہوتا ہے؟ اگر جسمانی طور پر پلید ہوتا ہے تو کیا اس کے ساتھ مل کر ایک ہی برتن میں کھانا یا پینا جائز ہے یا نہیں؟ اگر ہاں تو کیوں! اگر نہیں تو کیوں؟ (سائل) (۲۷ جون ۲۰۰۴ء)

جواب : غیر مسلم یا مشرک کی نجاست (پلیدی) سے مراد معنوی نجاست ہے، اصلاً اس کا جسم پاک ہے۔ جسمانی طہارت کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح و مباشرت کو جائز قرار دیا ہے۔ اگر ان کا جسم بھی پلید ہی ہوتا تو ان سے نکاح کی اجازت نہ دی جاتی۔ پھر یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ ہمیشہ سے مسلمانوں اور کفار کا آپس میں میل جول رہا ہے۔ یہ بات ان سے منقول نہیں ہو سکی کہ انھوں نے کفار و مشرکین سے ایسے بچاؤ اختیار کیا ہو،

جس طرح نجاسات سے کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو، تیسیر الکریم الرحمٰن فی تفسیر کلام المنان (۳/ ۲۱۸) ❶

پردے اور نماز کی نصیحت کے باوجود گھر والوں کے انکار پر عوام الناس کو نصیحت کرنا

سوال : ایک آدمی گھر میں پردے اور نماز کے متعلق کہتا رہتا ہے لیکن گھر والے کبھی مانتے ہیں کبھی سستی کر جاتے ہیں، کیا ایسا آدمی گھر سے باہر لوگوں کو تبلیغ کر سکتا ہے؟

جواب : واضح ہو کہ آدمی کا کام کسی بات کو منوانا نہیں، بلکہ اس کا فرض صرف احسن طریق سے دعوت پیش کرنا ہے۔ چاہے گھر میں ہو یا باہر۔ توفیق دینے والا وہ خالق و مالک ہے، جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ قرآنِ مجید میں ہے:

﴿فَذَكِّرْ إِنَّمَآ أَنتَ مُذَكِّرٌ ٥ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ ٥﴾ (الغاشیہ:۲۲)

''تو تم نصیحت کرتے رہو کہ تم نصیحت کرنے والے ہی ہو، تم ان پر داروغہ نہیں ہو۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿لَّيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَآءُ﴾ (البقرة: ۱۷۲)

(اے نبی ﷺ!) تم ان لوگوں کی ہدایت کے ذمہ دار نہیں ہو، بلکہ اللہ ہی جسے چاہتا ہے ہدایت بخشتا ہے۔''

میاں بیوی کا جماع کے وقت برہنہ حالت میں بات چیت کرنا

سوال : میاں بیوی کا جماع کے وقت ننگے ہونے کے بعد کسی قسم کی بات چیت کرنا کیسا ہے؟

(رانا محمد اقبال۔ساہیوال) (۲۷ جون ۱۹۹۷ء)

جواب : اصل خاموشی ہے۔حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ''فتح الباری'' میں رقمطراز ہیں:

«وَهِيَ مِمَّا أُمِرَ فِيهِ بِالصَّمْتِ.» ❷

یعنی حالت جماع میں اصل خاموشی مامور بہ ہے۔ ہاں البتہ بوقتِ ضرورت گفتگو ہو سکتی ہے۔ ابن ابی شیبہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے مروی ہے:

«أَنَّ ابْنَ مَسْعُودٍ كَانَ إِذَا غَشِيَ أَهْلَهُ فَأَنْزَلَ، فَقَالَ :اللَّهُمَّ لَا تَجْعَلْ لِلشَّيْطَانِ فِيمَا رَزَقْتَنَا نَصِيبًا.» ❸

''ابن مسعود جب اپنے اہل سے ملاپ کرتے انزال ہو جاتا تو فرماتے ،اے اللہ جو کچھ میرے مقدر میں

❶ البتہ یہ احتیاط ضروری ہے کہ آدمی کا اپنا دین و ایمان محفوظ رہے، ان کفار و مشرکین کی مشابہت اور اکلِ حرام وغیرہ سے بچے اور کوشش کرے کہ حکمتِ عملی اور حسنِ اخلاق و موعظت سے انھیں دعوتِ دین پیش کرتا رہے۔ (الاعتصام)

❷ فتح الباری:۱/ ۲٤۲

❸ مصنف ابن ابی شیبة ، بَابُ مَا يَدْعُو بِهِ الرَّجُلُ إِذَا دَخَلَ عَلَى أَهْلِهِ ، رقم:۲۹۷۳٤

ہے اس میں شیطانی حصہ نہ بنانا۔''

کیا دادا کو ابا کہہ سکتے ہیں، یا نہیں؟

سوال : کیا دادا کو ابا کہہ سکتے ہیں، یا نہیں؟ (ابو حنظلہ محمد محمود علوی، ضلع اوکاڑہ) (۱۳ جون ۱۹۹۸ء)

جواب : دادا کو ابا کہا جا سکتا ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿وَ اتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِ یْ اِبْرٰهِیْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ﴾ (یوسف:۳۸)

''حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا اور اپنے باپ دادا ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کے مذہب پر چلتا ہوں۔''

آیت ہذا میں باپ کے علاوہ دادے اور پڑدادے پر اب کا اطلاق ہوا ہے۔

ہر کام کے شروع میں پوری تسمیہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھیں یا صرف بسم اللہ؟

سوال : کچھ حضرات کہتے ہیں کہ ہر کام کے شروع میں پوری تسمیہ کی بجائے صرف ''بسم اللہ'' پڑھنا چاہیے۔ مثلاً کھانے کے شروع میں اور وضوء کے شروع کرنے سے پہلے صرف لفظ ''بسم اللہ'' پڑھنا چاہیے۔ بلکہ بعض کا کہنا ہے کہ وضوء شروع کرتے وقت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنا بدعت ہے۔ آپ سے اس مسئلے کی وضاحت کی درخواست ہے کہ کھانا شروع کرتے وقت یا خط کے آغاز پر یا وضوء کے شروع وغیرہ میں کون سے الفاظ پڑھنا درست ہے؟

(سائل) (۲۵ جنوری ۲۰۰۲ء)

جواب : اکثر اعمال کے شروع میں صرف ''بسم اللہ'' پڑھنی چاہیے، تلاوتِ قرآن کے دوران ''سورۂ توبہ'' کے علاوہ ہر سورت کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنی چاہیے۔ اسی طرح رسائل ومکتوبات اور علم کی کتابوں کے شروع میں بھی پوری بسم اللہ پڑھنی چاہیے۔

جس طرح کہ ''صحیح البخاری'' کے اوائل میں قصۂ ہرقل میں نبی ﷺ کے مکتوب گرامی میں واضح ہے۔ بعد میں خلفائے راشدین کا عمل بھی اسی طرح رہا۔ ملاحظہ ہو: مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ (ڈاکٹر حمید اللہ) اس طرح حضرت سلیمان علیہ السلام نے بھی بلقیس کی طرف اپنی چٹھی میں پوری ''بسم اللہ'' لکھی تھی۔ (سورۃ النمل:۲۹، ۳۰)

بسم اللہ کی جگہ ۷۸۶ لکھنا

سوال : کیا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھنے یا پڑھنے کی جگہ جو ۷۸۶ لکھتے ہیں، اس کا اجر وثواب ملتا ہے؟ یہ بدعت کہاں سے ایجاد ہوئی؟ میں نے کچھ بھائیوں سے سوال کیا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ صرف بے ادبی سے بچنے کے لیے لکھتے ہیں؟

(آفتاب احمد خاں عباسی۔ ابوظہبی) (۸ جنوری ۱۹۹۹ء)

جواب : بسم اللہ کی جگہ ۷۸۶ لکھنے سے اجر وثواب نہیں ملتا کیونکہ یہ منزّل من اللہ قرآن نہیں ہے۔ یہ بدعت علم الاعداد

کے حاملین نے نکالی ہے۔تحریر میں بسم اللہ لکھنا بے ادبی نہیں ہے۔ اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو رسول اللہ ﷺ ہرقل مشرک کافر کی طرف مرسلہ چٹھی میں بسم اللہ تحریر نہ فرماتے۔چٹھی میں بسم اللہ لکھنا بھی گویا دعوت کا ایک اہم حصہ ہے جب کہ ۷۸۶عدد یکسر اس سے خالی ہے۔

گرتے بالوں اور پاؤں کی ٹیڑھی ہڈی کا علاج:

سوال: (۱) سر کے بال گرنے کا علاج حضور اکرم ﷺ نے کیا بتایا؟

(۲) دائیں پاؤں کی ہڈی کو سیدھا کرنے کے لیے حضور ﷺ نے کیا فرمایا؟ تاریخ پیدائش ۸-۱۹۷۔۱۲۔۱۵عمر تقریباً ۱۸ سال کے قریب ہے۔ پاؤں کا آپریشن تقریباً ایک سال کی عمر میں کروایا تھا۔لیکن تھوڑی ہڈی ٹیڑھی رہ گئی اور بال تقریباً ۳۰۔۲۵ روزانہ گر جاتے ہیں۔ (محمد زاہد۔سول لائن۔ خانیوال ۲۱ مارچ ۱۹۹۷ء)

جواب: اپنے دونوں سوالوں کا مشترکہ جواب ملاحظہ فرمائیں۔

موطا امام مالک رحمہ اللہ میں زید بن اسلم کی روایت منقول ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے مبارک دور میں ایک شخص کو زخم آ گیا اور اس زخم سے خون بہنے لگا۔اس نے بنی انمار کے دو آدمیوں کو بلوایا۔انھوں نے مریض کو دیکھا تو انھوں نے سمجھا کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے دریافت کیا ہے کہ ان میں فنِ طب میں کون زیادہ ماہر ہے۔ اس نے دریافت کیا: یارسول اللہ ﷺ کیا طب میں خیر ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس اللہ نے بیماری نازل کی ہے اس نے اس کی دوا بھی نازل کی ہے۔لیکن سند کے اعتبار سے مُرسل ہے۔

دوسری روایت میں ہے۔ نبی ﷺ ایک مریض کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ طبیب کو بلا کر اسے دکھاؤ۔ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ یہ فرماتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔اللہ نے کوئی بیماری نہیں پیدا کی مگر اس کی دوا بھی ساتھ ہی نازل فرمائی۔ (زادالمعاد)

بخاری اور مسلم میں مرفوعاً روایت ہے۔''اللہ نے کوئی ایسی بیماری پیدا نہیں کی جس کی شفاء نہ پیدا کی ہو۔'' ❶

اور ایک روایت میں الفاظ یوں ہیں''اللہ نے کوئی بیماری پیدا نہیں کی مگر اس کی دوا بھی وہیں رکھ دی۔'' (زادالمعاد)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ ہر علم وصنعت میں اس کے سب سے زیادہ ماہر سے رجوع کرنا چاہیے۔لہٰذا میرا مشورہ ہے سر کے بالوں کے سلسلہ میں ماہر جلد کی طرف رجوع کریں اور پاؤں کی ہڈی طبیب حاذق سے مشورہ کریں۔ اس کے ساتھ روحانی علاج بھی جاری رہنا چاہیے۔

چنانچہ ''صحیح مسلم''میں حدیث ہے۔حضرت جبریل علیہ السلام، نبی ﷺ کے پاس آئے اور کہا اے محمد ﷺ! کیا آپ کو

❶ صحیح البخاری، بَابُ مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ دَاءً إِلَّا أَنْزَلَ لَهُ شِفَاءً، رقم:٥٦٧٨

کوئی تکلیف ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔ تو جبریل علیہ السلام نے کہا میں اللہ کے نام سے تجھ پر دم کرتا ہوں ہر تکلیف دہ چیز اور ہر نگاہِ بد سے اور حاسد کی بری نظر سے اللہ تجھے شفاءِ کلی عطا فرمائے۔ میں اللہ کے نام سے تجھ پر دم کرتا ہوں اور ''سورۃ فاتحہ'' پڑھ کر بھی دم کیا کریں۔ وغیرہ وغیرہ۔ ❶

بیماریوں سے بچاؤ حفاظتی ٹیکوں کے ذریعے پیشگی علاج کا حکم

سوال: آج کل محکمہ صحت کی ٹیمیں گھر گھر جا کر ۵ سال تک عمر کے بچوں کو اور ۱۵ سے ۴۵ برس تک کی عورتوں کو پولیو، تشنج وغیرہ مفروضہ بیماریوں کے نام پر ٹیکے لگاتی ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو ان بیماریوں سے دوچار بھی نہیں کیا ہے، کیا اس قسم کی حفاظت جائز ہے جب کہ قرآن کریم میں تو یہ آیت اس کے اُلٹ ہے یعنی

﴿وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ﴾ (الشعراء:۸۰)

''جب میں بیمار (پہلے) ہوتا ہوں پھر وہ (بعد) شفا دیتا ہے۔'' (عبدالرزاق اختر، محمدی چوک، حبیب کالونی گلی نمبر۱۲، رحیم یار خان) (مارچ ۲۰۰۵)

جواب: اس آیت کا قطعاً یہ معنی نہیں کہ احتیاطی تدابیر اختیار نہیں کرنی چاہئیں، شرع میں علاج معالجے کا حکم ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا «فَتَدَاوَوْا» ''پس علاج کرو'' ❷

دوائی کا استعمال اللہ کی طرف سے شفاء کا ذریعہ ہے، جس سے انکار کی گنجائش نہیں۔

غیبت، چغلی، حسد اور بغض میں کیا فرق ہے؟

سوال: غیبت، چغلی، حسد اور بغض میں کیا فرق ہے۔ تعریفیں وضاحت سے لکھیں۔ (سائل) (۱۹ فروری ۱۹۹۹)

جواب: غیبت کا مفہوم یہ ہے کہ جو عیب انسان میں موجود ہے۔ اس کا ذکر کرنا اور اگر وہ اس میں موجود نہیں تو اس کا نام بہتان ہے۔ ''صحیح مسلم'' میں حدیث ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« أَتَدْرُوْنَ مَا الْغِيْبَةُ قَالُوْا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ قَالَ اَعْلَمُ ذِكْرُكَ اَخَاكَ بِمَا يَكْرَهُ...... »

بحوالہ تفسیر قرطبی (۳۳۴/۱۶) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: فتح الباری: ۴۶۹/۱۰

چغلی کا مفہوم یہ ہے کہ دوسرے کی بات کو لوگوں تک شر اور فساد پھیلانے کی غرض سے نقل کیا جائے۔ ''صحیح مسلم'' میں ہے۔ حضرت حذیفہ کو یہ بات پہنچی کہ ایک شخص شر اور فساد کے لیے باتیں پھیلاتا ہے تو فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے:

---

❶ صحيح مسلم، بَابُ الطِّبِّ وَالْمَرَضِ، رقم:٢١٨٦

❷ سنن أبي داؤد، بَابٌ فِي الْأَدْوِيَةِ الْمَكْرُوهَةِ، رقم: ٣٨٧٤، السنن الكبرىٰ للبيهقي، رقم:١٩٦٨١

«لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ نَمَّامٌ» ❶

''چغلخور جنت میں داخل نہیں ہوگا۔''

حسد: دو طرح کا ہوتا ہے۔

۱۔ حاسد، دوسرے کی نعمت مال، علم، مرتبہ اور سلطنت کے زوال کی تمنا کرے اور یہ کہ اسے حاصل ہو جائے۔

۲۔ دوسرے کی نعمت کے زوال کی تمنا کرے، چاہے اُسے ملے نہ ملے اور یہ بدترین حسد ہے۔ ❷

بغض: حبّ کی ضد کو کہا جاتا ہے۔(ترتیب القاموس المحیط)

''صحیح بخاری'' کے کتاب الایمان کے آغاز میں ہے:

« وَالْحُبُّ فِي اللّٰهِ وَالْبُغْضُ فِي اللّٰهِ مِنَ الْإِيْمَان»

''اللہ کے لیے کسی سے محبت کرنا اور اللہ کے لیے کسی سے بغض رکھنا ایمان کا جزء ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، فتح الباری: ۱۰/۴۸۳۔

امام راغب فرماتے ہیں:

« اَلْبُغْضُ نَفَارُ النَّفْسِ عَنِ الشَّيْءِ الَّذِيْ تَرْغَبُ عَنْهُ وَ هُوَ ضِدُّ الْحُبِّ فَإِنَّ الْحُبَّ اِنْجِذَابُ النَّفْسِ إِلَى الشَّيْءِ الَّذِيْ تَرْغَبُ فِيْهِ۔» ❸

برے آدمی کو ذلیل کرنا یا برائی بیان کرنے کا نقصان

سوال: کیا برے آدمی کو ذلیل کرنے یا اُس کی برائی بیان کرنے سے اُس برے آدمی کے گناہ کم ہوں گے؟

(سائل) (۳۰ اپریل ۱۹۹۹ء)

جواب: ہاں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک چور کو برا کہا تو آپ ﷺ نے فرمایا: اس کے گناہ میں تخفیف مت کر۔ ❹

بیوہ کی دوسری جگہ شادی کے بعد بچوں پر یتیموں کا حکم لاگو ہوگا؟

سوال: ہمارا چھوٹا بھائی مقبوضہ کشمیر میں شہید ہوا اس کے چھوٹے بچے دو ہیں۔ ایک بچہ اور ایک بچی۔ اب اس کی بیوہ نے آگے شادی کرلی ہے۔ یعنی ہمارے چھوٹے بھائی سے۔ کیا اب بھی شہید بھائی کے بچے یتیم ہیں اور اُن سے یتیموں جیسا

---

❶ صحيح مسلم، بَابُ بَيَانِ غِلَظِ تَحْرِيمِ النَّمِيمَةِ، رقم: ۱۰۵، بحواله تفسير قرطبى: ۱۸/ ۲۳۲

❷ منهاج المسلم، ص: ۱٦٧

❸ المفردات، كتاب الباء، ص: ۸٦٦

❹ سنن أبى داؤد، بَابُ الدُّعَاءِ، رقم: ۱٤۹۷

سلوک ہونا چاہیے؟ یا اب یتیمی ختم ہوگئی ہے؟ (قاری عبدالغفار سلفی بلوچ۔لاہور) (۱۹ اکتوبر ۱۹۹۸ء)

جواب: یُتم کا زمانہ ماں کے آگے شادی کرنے سے ختم نہیں ہوتا بلکہ اس کی حد بچوں کا بالغ ہونا ہے۔ بچے جب سنِ بلوغت کو پہنچ جائیں تو یتیمی کا دَور اختتام پذیر ہوتا ہے۔ امام راغب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«اَلْيَتِيْمُ انْقِطَاعُ الصَّبِيِّ عَنْ اَبِيْهِ قَبْلَ بُلُوْغِهٖ.» [1]

''بچے کا اپنی بلوغت سے قبل ہی اپنے باپ سے جدا ہوجانے کا نام یُتم ہے۔''

طالب علم کا حاضری کے جواب میں لبیک کہنا

سوال: طالب علموں کو حاضری کے جواب میں اکثر لبیک کہتے ہوئے سنا گیا ہے۔ کیا ایسا کہنا درست ہے؟

(عبدالعزیز) (۱۲ مئی ۲۰۰۰ء)

جواب: موجودگی کا احساس دلانے کے لیے طالب علم کے لیے جائز ہے کہ حاضری کے جواب میں لبیک کہے۔ متعدد مواقع پر اس لفظ کا استعمال شریعت میں ثابت ہے۔ مثلاً قصہ معاذ میں ہے:

«لَبَّيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ .» [2]

اور امام ابوداؤد نے اس کے جواز پر اپنی ''سنن'' میں بایں الفاظ باب قائم کیا ہے:

« بَابٌ فِي الرَّجُلِ يُنَادِي الرَّجُلَ فَيَقُولُ :لَبَّيْكَ .»

''اس بات کا بیان کہ آدمی دوسرے آدمی کو آواز دے وہ ''لبیک'' کہے۔''

غیر مسلم بالغ لڑکی کا تعلیم کی غرض سے مسِّ قرآن

سوال: ایک غیر مسلم بالغ عورت ہمارے مدرسہ میں قرآنِ کریم کا ترجمہ پڑھنے کی خواہش مند ہے۔ کیا وہ قرآنِ کریم کے اوراق کو مَس کرسکتی ہے یا کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ (عبدالرزاق اختر، رحیم یار خان) (۲۰ مئی ۱۹۹۴ء)

جواب: اصل یہ ہے کہ غیر مسلمہ کو پہلے مسلمان بنائیں پھر اسے قرآن کی تعلیم دیں۔ بصورتِ دیگر احتراز کیا جائے۔

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«أَكْرَهُ أَنْ يَضَعَ الْقُرْآنَ فِي غَيْرِ مَوْضِعِهِ وَعَنْهُ إِنْ رَجى مِنْهُ الْهِدَايَةَ جَازَ .» [3]

---

[1] المفردات ، کتاب الیاء ، ص:۵۵۰

[2] صحیح البخاری ، بَابُ مَنْ خَصَّ بِالعِلْمِ قَوْمًا دُونَ قَوْمٍ ، كَرَاهِيَةَ أَنْ لاَ يَفْهَمُوا ، رقم: ۱۲۸ ، مشکوٰۃ کتاب الایمان ، حدیث:۲۵

[3] فتح الباری: ۱/ ۴۰۸

''یعنی میں اس بات کو ناپسند کرتا ہوں کہ کوئی قرآن کو بے محل رکھے۔''

اوران سے ایک روایت میں ہے اگر غیر مسلم کی ہدایت کی امید ہوتو جائز ہے۔ ورنہ ناجائز؟

سورج گرہن اور چاند گرہن کے ساتھ کوئی واقعہ منسوب کرنا

سوال : کچھ لوگوں نے سورج اور چاند گرہن کے ساتھ کچھ واقعات منسوب کرر کھے ہیں۔ کیا شرعاً یہ ٹھیک ہے؟

(خالد مصطفیٰ۔ ایس ایس ٹی گورنمنٹ نسیم ہائی سکول حاصلانوالہ تحصیل پھالیہ ضلع گجرات) (۴ ستمبر ۱۹۹۲ء)

جواب : شرعاً کوئی واقعہ رہن میں مؤثر نہیں۔ متعدد احادیث میں ہے:

« إِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ آيَتَانِ مِنْ آيَاتِ اللّٰهِ، لَا يَنْكَسِفَانِ لِمَوْتِ أَحَدٍ وَلَا لِحَيَاتِهِ، وَلَكِنَّ اللّٰهَ تَعَالَى يُخَوِّفُ بِهَا عِبَادَهُ »[1]

یعنی'' سورج چاند اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ ان کے ذریعے اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے۔''

بند کمرے میں پاؤں قبلہ رُخ کرنا

سوال : بند کمرے کے اندر قبلہ کی طرف پیر کرکے سویا جا سکتا ہے یا نہیں؟

(خالد مصطفیٰ۔ ایس ایس ٹی گورنمنٹ نسیم ہائی سکول حاصلانوالہ تحصیل پھالیہ ضلع گجرات) (۴ ستمبر ۱۹۹۲ء)

جواب : سونے والے کمرے کے اندر ہو یا باہر۔ کسی حدیث میں قبلہ رُخ پاؤں کرنا منع نہیں آیا۔ البتہ طبعی احترام کا تقاضا یہ ہے کہ قبلہ کی طرف پاؤں کرنے سے احتراز کیا جائے۔ قرآنِ مجید میں ہے:

﴿ وَ مَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴾ (الحج:۳۲)

قبلے کی طرف پاؤں کرنا

سوال : کیا قبلے کی طرف پاؤں کرکے سونا اور بیٹھنا منع ہے، صحیح حدیث کے حوالے سے وضاحت فرمادیں۔

(سائل) (۱۶ فروری ۲۰۰۱ء)

جواب : قبلے کی طرف پاؤں کرنے، سونے یا بیٹھنے سے حدیث میں ممانعت وارد نہیں۔

کسی کو بدنام کرنے کے لیے جاسوسی کرنا

سوال : کیا کسی کی اس لیے جاسوسی کرنا کہ اُسے بدنام کیا جائے یا رسوا کیا جائے، جائز ہے؟

(سائل محمد اکرم شیخ دوکاندار) (۶ مارچ ۱۹۹۲)

---

[1] صحيح البخاري، بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يُخَوِّفُ اللّٰهُ عِبَادَهُ بِالكُسُوفِ ......الخ، رقم:۱۰۴۸

جواب : اس قسم کے امر کو کتاب وسنت کی متعدد نصوص میں حرام قرار دیا گیا ہے۔مثلاً ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَّأْكُلَ لَحْمَ أَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ وَاتَّقُوا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ﴾ (الحجرات: ۱۲)

''اے اہل ایمان بہت گمان کرنے سے احتراز کرو کہ بعض گمان گناہ ہیں اور ایک دوسرے کے حال کا تجسس نہ کیا کرو اور نہ کوئی کسی کی غیبت کرے کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے اس سے تو تم ضرور نفرت کرو گے (تو غیبت نہ کرو) اور اللہ کا ڈر رکھو بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔''

اور حدیث میں ہے:

« عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ، فَإِنَّ الظَّنَّ أَكْذَبُ الحَدِيثِ، وَلَا تَحَسَّسُوا، وَلَا تَجَسَّسُوا، وَلَا تَنَاجَشُوا، وَلَا تَحَاسَدُوا، وَلَا تَبَاغَضُوا، وَلَا تَدَابَرُوا، وَكُونُوا عِبَادَ اللَّهِ إِخْوَانًا وَ فِي رِوَايَةٍ وَ لَا تَنَافَسُوْا » ❶

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بدگمانی سے بچو۔ بدگمانی بدترین جھوٹ ہے اور نہ معلوم کرو خبر اور نہ جاسوسی کرو اور بلا ارادہ خرید کے چیز کے بھاؤ کو مت بڑھاؤ اور نہ آپس میں حسد کرو اور نہ آپس میں بُغض رکھو اور نہ آپس میں غیبت کرو اور سبھی اللہ کے بندے بھائی بھائی بن جاؤ۔'' اور ایک روایت میں ہے: اور نہ حرص کرو۔'' (بخاری ومسلم)

نیز فرمایا: دو شخصوں کے درمیان برائی ڈالنے سے بچو، یہ شئے دین کو تباہ کرنے والی ہے۔ (ترمذی)

اور ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے منبر پر ارشاد فرمایا:

«يَا مَعْشَرَ مَنْ أَسْلَمَ بِلِسَانِهِ وَلَمْ يُفْضِ الإِيمَانُ إِلَى قَلْبِهِ، لَا تُؤْذُوا الْمُسْلِمِينَ وَلَا تُعَيِّرُوهُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا عَوْرَاتِهِمْ، فَإِنَّهُ مَنْ تَتَبَّعَ عَوْرَةَ أَخِيهِ الْمُسْلِمِ تَتَبَّعَ اللَّهُ عَوْرَتَهُ، وَمَنْ تَتَبَّعَ اللَّهُ عَوْرَتَهُ يَفْضَحْهُ وَلَوْ فِي جَوْفِ رَحْلِهِ » ❷

---

❶ متفق علیه بحواله مشکوٰة، باب ما ینهی عنه من التهاجر والتقاطع واتباع العورات ، صحیح البخاری، بَابُ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا ......الخ﴾ ، رقم:٦٠٦٦

❷ سنن الترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي تَعْظِيمِ الْمُؤْمِنِ، رقم:٢٠٣٢

''اے گروہ لوگوں کے جو اسلام لایا ہے اپنی زبان کے ساتھ اور نہیں پہنچا ایمان اس کے دل میں نہ ایذا دو تم مسلمانوں کو اور نہ عار دلاؤ ان کو اور نہ تلاش کرو عیب اُن کے۔ پس تحقیق جو شخص کہ ڈھونڈے عیب اپنے بھائی مسلمان کا، ڈھونڈے گا اللہ تعالیٰ عیب اس کا اور جس کا اللہ نے عیب ڈھونڈھا وہ اس کو رسوا کر دیگا اگرچہ وہ اپنی سواری کے کجاوے میں ہو۔''

تا مرگ بھوک ہڑتال غیر اسلامی فعل ہے

سوال: (۱) تا مرگ بھوک ہڑتال کرنا اسلام میں جائز ہے یا ناجائز؟

(۲) اور اگر ناجائز ہے تو اس کی شرعی سزا کیا ہے؟

(۳) تا مرگ بھوک ہڑتال کرنے والے کی حمایت کرنا جائز ہے یا ناجائز؟

(۴) اگر ناجائز ہے تو اس کی سزا کیا ہوگی؟

(۵) علمائے کرام کا تا مرگ بھوک ہڑتال کے بارے میں خاموشی اختیار کرنا کیسا ہے؟

(گلفام نبی میمن۔ حیدر آباد) (۲۱ فروری ۱۹۹۲ء)

جواب: تا مرگ بھوک ہڑتال کرنا غیر اسلامی تصور اور اللہ کی رحمت سے یأس اور ناامیدی کی عکاسی کرتا ہے۔ ایک مومن کے لائق نہیں ہے کہ لحہ بھر بھی اپنے محسن اعظم اللہ رب العزت سے روگردانی کر کے تعلق منقطع کرے۔ نفع و نقصان اور خیر و شر سب اسی کے ہاتھ میں ہے۔

کائنات کے فہیم ترین انسان حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو رسولِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

« وَاعْلَمْ أَنَّ الْأُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلَى أَنْ يَنْفَعُوكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَنْفَعُوكَ إِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللَّهُ لَكَ، وَلَوِ اجْتَمَعُوا عَلَى أَنْ يَضُرُّوكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَضُرُّوكَ إِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللَّهُ عَلَيْكَ، رُفِعَتِ الْأَقْلَامُ وَجَفَّتِ الصُّحُفُ » ❶

''یعنی سب لوگ جمع ہو کر اگر تجھے کوئی بھلائی پہنچانا چاہیں تو صرف اسی قدر دے سکتے ہیں جو کچھ اللہ نے تیرے لیے لکھا ہے۔ اور اگر سب لوگ جمع ہو کر تجھے نقصان پہنچانا چاہیں تو صرف اسی قدر پہنچا سکتے ہیں جو تیرے مقدر میں ہے۔ قلمیں کتابت سے فارغ ہو چکیں اور صحیفے خشکی کا مظہر ہیں۔''

اور دوسری روایت میں ہے:

« اِحْفَظِ اللّٰهَ تَجِدْهُ اَمَامَكَ ، تَعَرَّفْ اِلَى اللّٰهِ فِى الرَّخَاءِ يَعْرِفْكَ فِى الشِّدَّةِ » ❷

❶ سنن الترمذی، و قال حدیث حسن صحیح، ، رقم:٢٥١٦، عمل الیوم واللیلة لابن السنی، رقم:٤٢٥

❷ مسند احمد، رقم:٢٨٠٣، المعجم الکبیر للطبرانی، رقم:١١٢٤٣

''یعنی اللہ سے تعلق پیدا کر تو اُسے سامنے پائے گا۔ آسانی میں اس سے راہ ورسم پیدا کر وہ سختی میں تجھے پہچان لے گا۔''

قرآنِ مجید نے حضرت یعقوب علیہ السلام کا قول بایں الفاظ نقل کیا ہے:

﴿يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَ اَخِيْهِ وَ لَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ (یوسف:٨٧)

''بیٹا (یوں کرو کہ ایک دفعہ پھر) جاؤ اور یوسف اور ان کے بھائی کو تلاش کرو اور اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو کہ اللہ کی رحمت سے بے ایمان لوگ نا اُمید ہوا کرتے ہیں۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ يَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَ يَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ﴾ (النمل:٦٢)

''بھلا کون بے قرار کی التجا قبول کرتا ہے جب وہ اس سے دعا کرتا ہے اور (کون اس کی) تکلیف کو دُور کرتا ہے اور (کون) تم کو زمین میں (اگلوں کا) جانشین بناتا ہے (یہ سب کچھ اللہ کرتا ہے) تو کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی معبود ہے۔ (ہرگز نہیں)''

نیز فرمایا:

﴿وَ لَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ (البقرۃ:١٩٥)

نیز مصائب و مشکلات سے نجات حاصل کرنے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقۂ کار یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں منہمک ہو جاتے تھے۔

ان نصوصِ صریحہ سے معلوم ہوا کہ ہر حالت میں اعتماد بندوں کی بجائے صرف اللہ کی ذات پر ہونا چاہیے۔ کلمہ لاحول و لا قوۃ الا باللّٰہ کا مفہوم بھی یہی ہے۔

اور اگر کوئی ناعاقبت اندیش اس حالت میں مر جاتا ہے تو اس نے علی وجہ البصیرت جہنم کا مہنگا سودا کیا ہے۔ اہل اصول فرماتے ہیں:

« مَنْ تَعَجَّلَ بِشَیْءٍ قَبْلَ اَوَانِه عُوْقِبَت بِحُرِمَانِه »

دوسرے لفظوں میں اس فعل کا نام خودکشی بھی رکھا جا سکتا ہے جس کی وعید کے بارے میں کتاب وسنت میں بے شمار نصوص ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

بہرصورت فعل ہذا کے ارتکاب سے اجتناب ایک ضروری امر ہے۔ اس لیے کہ انسانی جسم چونکہ اللہ کی امانت ہے

لہٰذا اس کی حفاظت بذمہ انسان ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا﴾ (ال عمرٰن : ۲۹)

''اور اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو کچھ شک نہیں کہ اللہ تم پر مہربان ہے۔''

ذمہ داران سے مطالبات تسلیم کرانے کی بیسیوں شکلیں ہیں۔ کسی بھی مباح شکل کو بطورِ تدبیر اختیار کیا جا سکتا ہے۔ بِيَدِهِ الْخَيْرُ اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

علماء پر ضروری ہے کہ منکر کا انکار کریں تا کہ فعل تقصیر سے بری الذمہ قرار پائیں۔ واللہ ولی التوفیق۔ اور مرتکب کی شرعی سزا صرف تائب ہونا ہے۔

«اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهٗ » [1]

مروجہ ہڑتال اور احتجاج کا شرعی حکم

سوال : گزارش ہے کہ مروجہ ہڑتال، احتجاجاً کاروبار اور تجارتی مراکز بند رکھنا، جلوس نکالنا، سڑکوں پر پتلے اور ٹائر جلانے کی کتاب وسنت کی روشنی میں کیا حیثیت ہے؟

بعض علماء اس مذکورہ احتجاج کو صحیح اور جائز کہتے ہیں۔ دلیل کے طور پر بیعتِ رضوان کو اللہ کے رسول ﷺ کا احتجاج قرار دیتے ہیں۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں۔ (سائل: محمد حسین۔ بیگم کوٹ) (۹ جون ۱۹۹۵ء)

جواب : مروجہ نظامِ حکومت چونکہ استعماری قوتوں کی پیداوار ہے۔ اس کے کارہائے نمایاں میں سے یہ ہے کہ مطالبات تسلیم کرانے کے لیے درج بالا چیزیں ضروری اجزاء کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کے بغیر ان کے زعم کے مطابق نعرۂ جمہوریت نامکمل اور ناتمام ہے۔ اس کے برعکس اسلام ایسی لاقانونیت کا قطعاً حامی نہیں۔ اس کی سنہری تعلیمات میں سے ہے:

﴿لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ﴾ (البقرۃ:۲۷۹)

''یعنی تم کسی کو نقصان نہ دو۔ اور نہ دوسرا کوئی تم کو نقصان پہنچائے۔''

مقصد یہ ہے کہ پیمانۂ عدل وانصاف تھامے رکھو۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى﴾ (المائدۃ:۸)

''انصاف کیا کرو کہ یہی پرہیزگاری کی بات ہے۔''

ظاہر ہے جہاں عدل کا ترازو قائم ہوگا وہاں ایسے احتجاجات اور واویلے کی نوبت نہیں آئے گی بلکہ حکمران یتیموں، بیواؤں اور بے بس مظلوموں کے پہلو میں کھڑے اور ان کے دروازوں پر دستک دیتے ہوئے نظر آئیں گے۔ یقین نہ

[1] سنن ابن ماجه، بَابُ ذِكْرِ التَّوْبَةِ، رقم:٤٢٥٢

آئے تو عمرین (عمر خطاب رضی اللہ عنہ اور عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ) کے مثالی نظامِ حکومت کا مطالعہ کیجیے۔ یہ جھلک آپ کو بڑی واضح نظر آئے گی۔

قصہ بیعت الرضوان سے مروجہ طریق احتجاج پر استدلال کرنا جہالت اور لاعلمی پر مبنی ہے۔ نعوذ باللہ کیا رسول اللہ ﷺ نے اس بیعت کے انعقاد سے کافروں سے احتجاج کیا تھا؟ جو عقلاً نقلاً غیر معقول اور آپ کی شان سے بہت فروتر ہے۔ یہ بیعت تو اس عہدِ وفاداری کی تجدید تھی جو بندوں نے اپنے اللہ سے کر رکھا تھا۔ اس کا مخلوق کے ساتھ کوئی تعلق نہیں؟ مقامِ غور وفکر ہے کہ اس سے مروجہ طریق احتجاج کا جواز کیسے نکل آیا؟ اصل بات یہ ہے کہ اس قسم کے امور کا ارتکاب دراصل خواہشات کے پجاریوں کی سنن کا احیاء ہے اور یہ وہاں ہوگا جہاں عدل وانصاف کی بجائے ظلم وستم کا دَور دورہ ہوگا۔ اللہ رب العزت ہم سب کو صراطِ مستقیم پر گامزن رہنے کی توفیق بخشے۔ آمین۔

مناظرے یا مباہلے میں زہر پینے کی شرط

سوال : محترمی مفتی صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! ایک عیسائی نے مجھے خط لکھا ہے کہ ''یہ کھلا خط آپ سے اور عالم اسلام سے ہے کہ میں زہر کا جام پینے کو تیار ہوں اور زہر کا دوسرا جام آپ کے ہاتھوں میں ہو۔ ہم دونوں اس کو مل کر پییں جو سچ پر قائم وہ بچ جائے گا۔''

آپ کی خدمت میں درخواست ہے کہ اس سلسلے میں ایک مسلمان کی شرعی پوزیشن باوضاحت تمام تحریر فرمادیں۔

(محمد اسلم رانا، ایڈیٹر ماہنامہ المذاہب) (۱جون۲۰۰۱ء)

جواب : پہلے آپ اس شخص کو حکمت ودانائی سے دعوتِ اسلام پیش کریں، بصورتِ دیگر دعوتِ مباہلہ دے سکتے ہیں۔ جس طرح کہ بالتصریح قرآن میں موجود ہے۔ اور جہاں تک زہر پینے کا تعلق ہے کسی حد تک جواز تو ہے لیکن یہ فیصلہ انتہائی غور وخوض اور قانونی تقاضے پورے کرنے کے بعد کرنا چاہیے۔ ممکن ہے اس ادعاء کے پیچھے کوئی سازش کارفرما ہو۔

﴿وَاللّٰهُ مُحِيطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ﴾ (البقرۃ:۱۹)

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو فتح الباری: ۱۰/۲۴۶

جسمانی اعضا اور خون کے عطیے کا حکم

سوال : جسم ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت ہے کیا کسی کو خون، گردہ، آنکھ یا جسم کا کوئی بھی حصہ عطیہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر پاس کوئی مر رہا ہو تو کیا اس کو خون دینا چاہیے یا نہیں؟ (سائل اصغر محمود) (۷اکتوبر۱۹۹۴ء)

جواب : بنی نوع انسان کے لیے اپنے جسم میں ایسا تصرف جس سے انسانی زندگی کا ضیاع لازم آتا ہو یہ تو قطعاً ممنوع ہے جیسے خودکشی وغیرہ اور اگر اس کی اصلاح کی خاطر آپریشن کے مراحل سے بھی گزرنا پڑے تو سبھی جواز کے قائل ہیں۔

چاہے بعض زہر آلود عضوؤں کو کاٹ کر ہی اس کی اصلاح کیوں نہ کرنی پڑے بلکہ زندہ کی مصلحت کی خاطر کئی ایک اہل علم مردہ کی چیر پھاڑ کے بھی قائل ہیں۔

چنانچہ علامہ ابن حزم رحمہ اللہ ''المحلّٰی'' میں فرماتے ہیں:

''اگر حاملہ عورت فوت ہو جائے اور اس کے پیٹ میں بچہ حرکت کرتا معلوم ہو جس پر چھ ماہ سے اوپر مدت گزر چکی ہو تو اسے آپریشن کے ذریعہ نکال لیا جائے۔ قرآن میں ہے: ''جس نے ایک جان بچائی گویا اس نے سب لوگوں کی جانیں بچائیں۔''

امام نووی رحمہ اللہ نے ''المجموع'' (۳۰۱/۵) میں اس قول کی تصویب کی ہے اور اسے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور اکثر فقہاء کی طرف منسوب کیا ہے لیکن عمل ہذا کو ''کشاف القناع'' اور ابوداؤد نے اپنے مسائل میں ناجائز قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

«سَمِعْتُ اَحْمَدَ سُئِلَ عَنِ الْمَرْأَةِ تَمُوْتُ وَالْوَلَدُ يَتَحَرَّكُ فِيْ بَطْنِهَا أَ يُشَقُّ عَنْهَا قَالَ لَا . « كَسْرُ عَظْمِ الْمَيِّتِ كَكَسْرِهِ حَيًّا..»

یعنی امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس حدیث [1] کی رو سے پیٹ چاک کر کے بچہ نکالنے کو حرام قرار دیا ہے۔''

علامہ رشید رضا مصری اس کے حواشی میں رقمطراز ہیں:

''اس حدیث سے علی الاطلاق ترک جنین پر استدلال جائز نہیں ہے کیونکہ حدیث کا مقصد میت کی لاش کو بے حرمتی سے بچانا ہے یعنی لاش کی بے حرمتی کے لیے ہڈی وغیرہ توڑنا (مثلہ کرنا) حرام ہے۔ اور عمل جراحی بے حرمتی کے تحت نہیں آتا اور پھر بعض اوقات وہ بچہ زندہ بھی رہتا ہے۔ لہٰذا یہ طبی عمل بلاشبہ جائز ہے۔''

اسی طرح زندہ آدمی کی مصلحت کے پیش نظر سوال میں مذکورہ اشیاء کی منتقلی کا بھی جواز ممکن ہے۔ بشرطیکہ ان سے استفادہ کا ظن غالب ہو۔ سعودی عرب کی ہیئت کبار العلماء (علماء کی سپریم کونسل) نے بھی اکثریت سے مردہ کے اعضاء کی منتقلی کے جواز کا فتویٰ صادر کیا ہے۔ (قرار رقم ۶۲، تاریخ ۲۵/۱۰/۱۳۹۸ھ، مجلۃ البحوث الاسلامیۃ، عدد: ۱۴، ص: ۶۷۔۶۸)

نص کلمات کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں۔

''مطالعہ، بحث و تمحیص اور باہمی تبادلہ خیالات کے بعد علماء کے اجلاس میں اکثریت کے ذریعے درج ذیل فتویٰ طے پایا،

[1] سنن ابن ماجہ، بَابٌ فِي النَّهْيِ عَنْ كَسْرِ عِظَامِ الْمَيِّتِ، رقم: ۱۶۱۶، سنن ابی داؤد، بَابٌ فِي الْحَفَّارِ يَجِدُ الْعَظْمَ هَلْ يَتَنَكَّبُ ذٰلِكَ الْمَكَانَ؟، رقم: ۳۲۰۷

نمبر۱: کسی انسان کی موت کا تعین ہو جانے کے بعد اس کی آنکھ کے ڈھیلے کو منتقل کر کے کسی ایسے مسلمان کی آنکھ میں پیوند کرنا جائز ہے جو مجبور ہو اور پیوند کاری کے آپریشن کی کامیابی کے بارے میں ظن غالب ہو ،بشرطیکہ میت کے ورثاء کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہو۔ اس کی اجازت اس قاعدے کی رُو سے اس پر کوئی اعتراض نہ ہو۔ اس کی اجازت اس قاعدے کی رُو سے ہے جس میں دو مصلحتوں میں سے بہترین مصلحت کے حصول کو مدنظر رکھنے اور مضر رساں چیزوں میں سے کمتر ضرر والی کو اختیار کر کے اور زندہ انسان کی مصلحت کو مردہ شخص کی مصلحت پر مقدم کرنے کا تحقق پایا جاتا ہے، کیونکہ اس عمل میں یہ امید پائی جاتی ہے کہ زندہ شخص میں دیکھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی جب کہ پہلے اس میں یہ صلاحیت مفقود تھی۔ اس سے نہ صرف یہ کہ وہ شخص خود استفادہ کر سکے گا۔ بلکہ اس میں پوری امت کو فائدہ پہنچنے کا امکان موجود ہے۔ اور جس مردہ شخص سے یہ آنکھ لی گئی ہو اس کے (بدن) میں کوئی کمی بھی واقع نہیں ہوگی۔ کیونکہ اس کی آنکھ نے بالآخر مٹی کے ساتھ مٹی ہو کر برباد ہو جانا ہے اور آنکھ کو منتقل کرنے کے عمل میں بظاہر کوئی مثلہ (قطع وبرد) بھی نہیں پایا جاتا کیونکہ اس کی آنکھ بند ہو چکی ہے اور اس کے دونوں پپوٹے اوپر تلے مل گئے ہیں۔

نمبر۲: جس انسان کی آنکھ کے بارے میں طبی رپورٹ کی رُو سے یہ طے کیا گیا ہو کہ اس کا باقی رکھنا خطرے کا باعث ہے تو ایسی آنکھ کے صحیح وسالم ڈھیلے کا انتقال اور اسے کسی دیگر مجبور انسان کی آنکھ میں پیوند کرنا جائز ہے کیونکہ دراصل اس آنکھ کو اس سے نکالا گیا ہے تاکہ اس آنکھ والے شخص کی صحت کی حفاظت کی جا سکے۔ چنانچہ ایسے ڈھیلے کو منتقل کرنا اور کسی دیگر شخص کی مصلحت کی خاطر اس کی آنکھ میں پیوند کرنا مذکور شخص کے لیے قطعاً نقصان دہ نہیں۔ چنانچہ شریعت اور انسانیت اسی بات کی متقاضی ہے۔ اللہ تعالیٰ توفیق دینے والا ہے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَ اٰلِهٖ وَ صَحْبِهٖ وَ سَلَّمَ. (نامور علماء کی کمیٹی)

(بورڈ آف دی گریٹ سکالرز) آنکھ پر دیگر انسانی اعضاء کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔ نیز خون وغیرہ دینے کا معاملہ نسبتاً سہل ہے۔ لہٰذا یہ بطریقِ اولیٰ جائز ہے۔ (وَاللّٰهُ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى اَعْلَمُ.)

اپنی زندگی میں اپنے جسمانی اعضاء وقف کرنا

سوال: اپنی زندگی میں اپنے جسمانی اعضاء وقف کر جانا مثلاً میری آنکھیں گردے وغیرہ میرے مرنے کے بعد ان اعضاء سے محروم لوگوں کو لگا دیے جائیں۔ آیا جائز ہے؟

جب کہ مردے کے اعضاء اس کے کسی کام کے نہیں وہ مٹی میں مٹی ہو جائیں گے جب کہ دوسری طرف ایک جان کو فائدہ ہو جائے گا؟ (۲۶ جولائی ۱۹۹۶ء)

جواب: انسانی اعضاء اللہ کی امانت ہیں۔ انسان کو ان میں تصرف کا اختیار نہیں۔ اسی بناء پر خودکشی حرام ہے۔ اعضاء کی منتقلی سے دوسرے کو فائدہ پہنچانا غیر درست ہے کیونکہ میت کو گزند پہنچانا کبیرہ گناہ ہے۔ یہاں تک کہ آنحضرت ﷺ نے قبروں پر بیٹھے تکیہ لگانے سے منع فرمایا ہے۔ اس سے میت کا احترام مقصود ہے۔

ایک حدیث میں ہے:

«كَسْرُ عَظْمِ الْمَيِّتِ كَكَسْرِهِ حَيًّا.» [1]

یعنی گناہ میں میت کی ہڈی توڑنا اس طرح ہے جس طرح زندہ کی توڑنا ہے۔"

ابوداؤد، ابن ماجہ۔ ابن القطاع نے کہا اس کی سند حسن درجہ کی ہے۔

ایک مسلمان کا مرنے سے پہلے اعضاء کے وقف کی وصیت کر جانا

سوال: ایک مسلمان انسان مرنے سے قبل وصیت کر جائے کہ مرنے کے بعد اُس کے اعضاء کسی اور کو لگا دیے جائیں تو کیا یہ شرعاً درست ہے؟ (شیخ محمد محسن علی، کراچی) (۲۱ مئی ۱۹۹۹ء)

جواب: مرنے کے بعد اپنے اعضاء کی کسی دوسرے کے لیے وصیت کرنا درست نہیں۔ کیوں کہ انسانی بدن اللہ کی امانت ہے بندے کی مِلک نہیں۔ اسی بناء پر تو خودکشی کو جرم قرار دیا گیا ہے۔

پوسٹ مارٹم کا شرعی حکم کیا ہے؟

سوال: ایک حدیث سن اور پڑھ رکھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: مردے کو تکلیف پہنچانا اس طرح ہے جس طرح زندہ کو تکلیف پہنچانا ہے۔ اس حدیث کی روشنی میں اچانک موت یا مقتول کے قتل کی نوعیت کو جانچنے کے لیے میت کے پوسٹ مارٹم کا شرعی حکم کیا ہے؟ (عطا محمد جنجوعہ سرگودھا) (۲۰ جون ۲۰۰۳ء)

جواب: مردے کو ایذاء دینا واقعتاً درست نہیں بلکہ یہ اس کی توہین ہے اور اسلام مردوں کی اہانت سے منع کرتا ہے۔ البتہ ناحق مقتول یا مشتبہ میت کا پوسٹ مارٹم کرنا جائز ہے۔ کیونکہ یہ تفتیش جرائم کے تحت آتا ہے۔ اس سے اس امر کی تحقیق مقصود ہوتی ہے کہ ملزم کو ناجائز سزا تو نہیں مل رہی یا کسی نے سازش سے قتل کر کے اس کو خودکشی تو ظاہر نہیں کر دیا، مقصدِ اعلیٰ کے پیش نظر عام ایذا رسانی کی ممانعت سے یہ استثنائی شکل ہے۔

کیا مطب کا نام سلفی دواخانہ یا شفاخانہ درست ہے؟

سوال: ایک حکیم صاحب اپنے مطب کا نام سلفی شفا خانہ رکھے ہوئے ہیں جب کہ کچھ حضرات کا کہنا ہے کہ سلفی

[1] سنن ابن ماجه، بَابٌ فِي النَّهْيِ عَنْ كَسْرِ عِظَامِ الْمَيِّتِ، رقم:١٦١٦، سنن ابی داؤد، بَابٌ فِي الْحَفَّارِ يَجِدُ الْعَظْمَ هَلْ يَتَنَكَّبُ ذَلِكَ الْمَكَانَ؟، رقم:٣٢٠٧

دواخانہ نام ہونا چاہیے۔ سلفی شفاخانہ کہنے میں شرک ہے۔ اور سلفی دواخانہ کہنا درست ہے۔

(الماس الماثری کوٹ غلام محمد میرپوری خاص سندھ)

جواب: واقعی اصل یہی ہے کہ مطب کا نام سلفی دواخانہ ہونا چاہیے۔ ہاں البتہ اگر بطورِ تفاؤل اس کا نام سلفی شفاخانہ رکھ لیا جائے تو جواز کا پہلو موجود ہے۔ کیونکہ ایک مومن مسلمان کا اعتقاد قطعاً یہ نہیں ہوتا کہ مقامِ ہذا بذاتہٖ شفاء میں موثر ہے۔ بلکہ اس کا سراسر یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ شفاء من جانب اللہ ہے۔ اس بناء پر عام مطبوں کے اوپر آویزاں ہوتا ہے۔ ھو الشافی اور بعض مقامات پر یہ آیت بھی لکھی ہوتی ہے: ﴿وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ﴾ (الشعراء: ۸۰)

بہرصورت احتیاطی پہلو یہی ہے کہ اس لفظ کو ترک کر دیا جائے کیونکہ امام الحنفاء ابراہیم علیہ السلام نے شفاء کی نسبت کلیۃً اللہ عزوجل کی طرف کی ہے۔ لیکن آیت ہذا میں بیماری کی نسبت انھوں نے اپنی طرف کر دی۔ حالانکہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے تو یہ صرف ادب کی بناء پر ہے۔ ورنہ بلاشبہ بیماری بھی اللہ کی طرف سے نازل ہوتی ہے۔ اسی طرح قرآن مجید میں جنات کا قول ہے:

﴿أَشَرٌّ أُرِيدَ بِمَن فِي الْأَرْضِ أَمْ أَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا﴾ (الجن: ۱۰)

آیت ہذا میں ارادہ شر کی نسبت مجہول ہے جب کہ ارادِ خیر کی نسبت بصیغہ معروف ذکر ہوئی ہے۔ یہ بھی محض ادب کے پیش نظر ہے۔[1]

گائے کے بچوں کے سینگوں کو آگ لگانا

سوال: بعض لوگ گائے کے بچوں کے سینگ جب کہ اگنے شروع ہوتے ہیں اسی وقت ہی سینگ جلا دیتے ہیں جس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ گائے کے سینگ اسی وقت ختم ہو جاتے ہیں دوبارہ بڑھتے نہیں۔ اسی طرح ایسا جانور گھونا یعنی بے سینگ معلوم ہوتا ہے کیا ایسے جانور کی قربانی جائز ہے۔ (سائل) (۲۲ جون ۲۰۰۷)

جواب: مندرجہ بالا عمل شیطانی عمل ہے: ﴿فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللَّهِ﴾ کے زمرہ میں داخل ہے ایسے جانور کی قربانی نہیں کرنی چاہیے۔

منصوبہ بندی کی شرعی حیثیت

بچوں میں وقفہ کے لیے مصنوعی طریقہ اختیار کرنا

سوال: عمرو کی بیوی کے ہاں جب بھی بچہ پیدا ہوتا ہے آپریشن کے ساتھ ہوتا ہے۔ گزشتہ ۳۰ یا ۲۲ ماہ کے عرصہ میں اس

---

[1] اطباء کی اصطلاح میں دواخانہ پنساری کی دکان یا اسٹور کو کہا جاتا ہے۔ جب کہ شفاخانہ حکیم وطبیب کی دکان وغیرہ کو کہتے ہیں جہاں بیماریوں کی تشخیص اور پھر ان کے لیے دوائیں تجویز کی جاتی ہیں جن کے استعمال پر اللہ سے شفاء کی امید رکھی جاتی ہے۔ عربی میں ہسپتال کو ''مستشفیٰ'' کہا جاتا ہے۔ جس کے معنی ہیں ''شفاء طلب کرنے کی جگہ۔'' (ن۔ح۔ن)

کے تین آپریشن ہو چکے ہیں۔ دو تو بچوں کے لیے جب کہ ایک اپریشن ٹانگ ٹوٹنے کی بنا پر ہوا۔ اب کی بار بچہ کی پیدائش کے بعد لیڈی ڈاکٹر نے سختی سے کہا کہ آئندہ آپ کے ہاں کم از کم پانچ سال کا وقفہ انتہائی ضروری ہے۔ بصورتِ دیگر جان زبردست خطرہ میں ہے۔ اس صورت میں کیا وقفہ کے لیے کوئی مصنوعی طریقہ اپنایا جا سکتا ہے؟ اور شرعاً جائز بھی ہے یا نہیں؟ (ایک سائل) (۱۴ مئی ۱۹۹۳ء)

جواب : صورتِ ہذا میں اگر عزل کا طریقہ اختیار کر لیا جائے تو جواز ہے اگرچہ کراہت سے خالی نہیں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ بوقتِ انزال پانی باہر ڈال دیا جائے یا کوئی اور ذریعہ اختیار کیا جائے۔ بصورتِ دیگر یعنی سرعتِ انزال وغیرہ کی بنا پر ادویات کے استعمال کی بھی گنجائش ہے کیوں کہ جان کا بچانا فرض ہے۔ تاہم شرط یہ ہے کہ وہ قاطع نسل نہ ہوں۔ بایں وجہ اگر جماع کے وقت محفوظ مصنوعی آلہ کو اختیار کر لیا جائے تو بھی کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا۔ (هٰذَا مَا عِنْدِیْ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.)

عورت کی صحت کے پیش نظر اولاد میں دو یا تین سال کا وقفہ کا حکم

سوال : اولاد میں ۲ یا ۳ سال کا وقفہ کرنے کا اقدام کیسا ہے؟ جب کہ نیت یہ ہو کہ بچے کی تربیت بہتر ہو جائے، اور صحت بھی اتنی مشقت اٹھانے کی ہر سال متحمل نہ ہو؟ کیونکہ آج کل قدرتی وقفہ بالکل نہیں ہوتا؟

(مسز آسیہ۔ لاہور) (۱۵ اپریل ۱۹۹۶ء)

جواب : عورت کی صحت کے پیش نظر اولاد میں عارضی وقفہ کا جواز ہے۔ کیونکہ اسلام نے کراہت کے ساتھ بوقت ضرورت عزل (بوقت انزال علیحدہ ہو جانا) کی اجازت دی ہے۔ فرمایا:

«كُنَّا نَعْزِلُ عَلَى عَهْدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالْقُرْآنُ يَنْزِلُ .وَ زَادَ مُسْلِمٌ فَبَلَغَ ذٰلِكَ نَبِيَّ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَلَمْ يَنْهَنَا» ❶

یعنی ہم اس دور میں عزل کرتے جب کہ قرآن اترتا تھا۔'' یہ روایت بخاری اور مسلم کی ہے اور مسلم نے یہ الفاظ زیادہ کیے۔'' پس اس کی خبر نبی ﷺ کو پہنچی تو ہم کو منع نہ کیا۔''

اسی طرح دیگر عارضی ذرائع اختیار کرنے کا بھی بظاہر کوئی حرج نہیں بشرطیکہ عورت کی کمزوری پیش نظر ہو۔ مسئلہ ہذا پر تفصیلی گفتگو پہلے الاعتصام میں شائع ہو چکی ہے۔ (جلد:۴۶، شمارہ:۴۴)

خاندانی منصوبہ بندی کس حد تک کرنا جائز ہے؟

سوال : خاندانی منصوبہ بندی کس حد تک کرنا جائز ہے؟ (آپ کا دینی بھائی، محمد اسماعیل) (۸ مئی ۱۹۹۸ء)

❶ صحيح البخاري، بَابُ العَزْلِ، رقم:٥٢٠٩، صحيح مسلم، بَابُ حُكْمِ العَزْلِ، رقم:١٤٤٠

جواب: اسلام خاندانی منصوبہ بندی کا قائل نہیں۔ بلکہ اس نے تکثیر نسل کی ترغیب دی ہے۔اس قسم کی نصوص اہل علم سے مخفی نہیں۔ذخیرہ احادیث میں متعدد روایات موجود ہیں جو اس کی تردید کے لیے کافی وشافی اور وافی ہیں۔ واللہ ولی التوفیق۔

خاندانی منصوبہ بندی کس حد تک جائز ہے؟

سوال: اس کے علاوہ جلد نمبر ۵۰ شمارہ ۱۷ احکام ومسائل کے کالم میں ص:۸ پر آخری سوال کہ خاندانی منصوبہ بندی کس حد تک کرنا جائز ہے؟ تو اس کے جواب میں لکھا گیا ہے کہ اسلام منصوبہ بندی کا قائل نہیں۔ راقم الحروف کو اس نظریہ سے اختلاف ہے۔میرے ناقص مطالعہ کے مطابق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں عزل کیا کرتے تھے۔اور یہ بھی منصوبہ بندی کی ایک شکل ہے اور بعد میں اس پر عمل جاری رہا۔اور حضور اکرم ﷺ کے زمانہ کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کو جائز سمجھتے تھے۔اس کے شواہد بخاری ومسلم میں ہیں۔اس کے متعلق جو روایتیں ملتی ہیں ان پر آپ بحث کریں کہ ان کا مطلب یہ ہے؟ یہ کس لیے ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔یا اگر مجھے کہیں تو میں آپ کو ایک مضمون بھی لکھ کر بھیج سکتا ہوں۔امید ہے کہ آپ میرے سوالات پر غور فرما کر مجھے جواب سے نوازیں گے۔ (فیصل مختار) (۳ جولائی ۱۹۹۸ء)

جواب: منصوبہ بندی اور عزل میں فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں قطع نسل مقصود ہوتا ہے جب کہ فعل عزل عارضی اور وقتی شئے ہے۔ اس کے باوجود بسا اوقات حمل ہو جاتا ہے۔ پھر فعل عزل کو بھی شرع میں مکروہ سمجھا گیا ہے ۔ جواز کی صورت میں عورت کی رضا سے معلّق کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس سے لذت میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ لہٰذا منصوبہ بندی کو عزل پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔

ذاتی مسائل ووسائل کے پیش نظر بچوں میں وقفہ کا حکم؟

سوال: اپنے ذاتی مسائل ووسائل کو سامنے رکھتے ہوئے وقت کے تقاضوں کے مطابق موجودہ بچوں کی صحیح طور پر تعلیم وتربیت کی خاطر کیا مزید بچے پیدا نہ کرنے کی گنجائش ہے؟ بے شک رزق اللہ دیتا ہے۔ اور بھوکا کوئی نہیں مرتا۔مگر یہ بات مشاہدہ کی ہے کہ کم وسائل والے آدمی کی کثیر اولاد مناسب تعلیم وتربیت کی کمی یا نہ ہونے کی وجہ سے خود بھی ناگفتہ بہ حالت میں ہوتے ہیں۔ بلکہ اکثر اوقات ہمسایوں اور معاشرہ کے لیے بھی تکلیف دہ ثابت ہوتے ہیں۔ کیوں کہ حالات کے پیش نظر عمومی معیارِ زندگی بدل گیا ہے۔ جو چیزیں کل کلاں عیش وعشرت کا سامان تھیں۔ آج ضروریاتِ زندگی بن چکی ہیں۔ان کا انکار کرنا مشکل امر ہے کیونکہ انسان کو انسانوں کی طرح رہنے کا حق ہے۔مزید یہ کہ آسودگی میں انسان دین و مذہب پر بھی توجہ دیتا ہے جبکہ جہالت وافلاس نے منکر انسانوں کو شرک وگمراہی میں دھکیلا ہوا ہے۔ بے شک اس کے مقابلہ میں کثرتِ دولت بری چیز ہے جو عیاشی اور تکبر کو جنم دے کر انسانوں کو گمراہ کرتی ہے۔مگر سوال کا مدعا اوسط درجہ کی زندگی کے حصول کے متعلق ہے۔ (۱۵ نومبر ۱۹۹۶)

جواب: اس طرح کی حیلہ سازی دراصل عقیدۂ توحید میں ضعف وکمزوری کی مظہر ہے۔ اللہ رب العالمین صرف انسان کا روزی رساں نہیں بلکہ ہر ذی روح اور متنفس کی روزی کا ذمہ اس نے پہلے روز سے لیا ہوا ہے۔ ہر جنس کو اس کی طبیعت کے مطابق رزق مہیا کر کے اپنے رزاق ہونے کا ثبوت ہر آن دے رہا ہے۔

﴿إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ﴾ (الذاریات:۵۸)

لیکن کمزور فطرت انسان ہے کہ اس کے دل ودماغ میں یہ بات سماتی نہیں۔ محدود وسائل پر عارضی تسلّط کی وجہ سے اپنے کو رزاق سمجھ بیٹھا ہے۔ کمی اولاد کی صورت میں صحیح تعلیم وتربیت کا دعویٰ محض ایک مفروضہ ہے۔ جس کا حقیقتِ حال سے کوئی تعلق نہیں۔ لیل ونہار ہمارے مشاہدے میں ہے۔ بہت سارے لوگ ایسے ہیں کہ کثرتِ اولاد کے باوجود انھوں نے اولاد کی تربیت میں مثالی کردار ادا کیا اور وہ بھی ہیں جن کی اولاد کم لیکن تعلیم وتربیت سے عاری۔

شریعتِ اسلامیہ میں تکثیر اولاد میں ترغیب کی نصوص سے یہ بات عیاں ہے کہ اسلام میں تحدید نسل کا کوئی تصور نہیں۔ راوی کا بیان ہے بصرہ میں حجاج کی آمد (۷۵ ہجری) کے وقت حضرت انس رضی اللہ عنہ کے حقیقی بچے ایک سو بیس سے اوپر فوت ہو چکے تھے۔ ❶

اور ''صحیح مسلم'' میں اسحاق بن ابی طلحہ کی روایت میں ہے۔ زندہ اولاد واحفاد سوء (۱۰۰) کے قریب تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بایں الفاظ اس کے لیے دعا کی تھی۔

« اَللّٰهُمَّ ارْزُقْهُ مَالًا وَوَلَدًا، وَبَارِكْ لَهُ فِيهِ .» ❷

اس بناء پر ان کا باغ سال میں دو دفعہ ثمر آور ہوتا تھا۔ دراصل جب سے ہم میں فکر جہاد مفقود ہوئی ہے۔ اس وقت سے ہم کمی اولاد کی برکات کے وسوسوں میں مبتلا ہو گئے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ جذبۂ سلیمانی علیہ السلام کو لے کر مسابقت کی راہ اختیار کرتے۔ لیکن ہماری ترقی معکوس ہے۔ رب العزت سب کو سمجھ عطا فرمائے۔ پھر آسودگی کا دین و مذہب کی طرف توجہ کا باعث بننا محض خوش فہمی ہے تاریخ اوائل اس کی نفی کرتی ہے۔

وسائل کی کمی کی وجہ سے بچوں میں کمی کرنا اور روح پڑ جانے سے پہلے ''اسقاط'' کا حکم

سوال: جنین میں روح پڑنے سے پہلے اسقاط حمل کرنے سے گناہ ہوتا ہے یا نہیں؟ نیز وسائل کی کمی کی وجہ سے بچوں کی تعداد میں کمی کرنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

جواب: صورتِ مذکورہ میں جسمانی طور پر بچے کے چوں کہ بنیادی تخلیقی مراحل مکمل ہو چکے ہوتے ہیں، لہٰذا اسقاطِ حمل

---

❶ صحیح البخاری، بَابُ مَنْ زَارَ قَوْمًا فَلَمْ يُفْطِرْ عِنْدَهُمْ، رقم:۱۹۸۲

❷ ایضًا

ناجائز ہے۔ بلکہ خلقت کے آغاز میں بھی اسقاط ناجائز ہے۔ ہاں البتہ کسی طبی وغیرہ ضرورت کی بناء پر فقہائے کرام نے چالیس دن سے قبل اخراج نطفہ کی اجازت دی ہے۔ ❶

ہمارے شیخ علامہ محمد الامین الشنقیطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«إِذَا مَجَّتِ الرَّحِمُ النُّطْفَةَ فِي طَوْرِهَا الْأَوَّلِ قَبْلَ أَنْ تَكُونَ عَلَقَةً، فَلَا يَتَرَتَّبُ عَلَى ذَلِكَ حُكْمٌ مِنْ أَحْكَامِ إِسْقَاطِ الْحَمْلِ، وَهَذَا لَا خِلَافَ فِيهِ بَيْنَ الْعُلَمَاءِ.» ❷

''وسائل کی کمی کی وجہ سے اولاد کی تعداد میں کمی کرنا شرعاً ناجائز ہے کیونکہ یہ فعل اس انسانی فطرت کے خلاف ہے جو اللہ نے انسانوں میں ودیعت رکھی ہے اور شرع نے جس کی تحریض و ترغیب دی ہے۔ لہٰذا خاندانی منصوبہ بندی کے مختلف عصری ذرائع اختیار کرنا گویا جاہلی اعمال کی شکلوں میں سے ایک شکل ہے اور ساتھ ہی ساتھ اللہ پر بدگمانی کا اظہار ہے، فقر و فاقہ کے ڈر سے بالخصوص اس کا مرتکب ہونا جائز نہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے: ﴿إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِينُ﴾ (الذاریات:۵۸)

''حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی بہت زیادہ رزق دینے والا زور آور مضبوط ہے۔''

نیز فرمایا:

﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا﴾ (ھود:٦)

''اور زمین پر چلنے پھرنے والا کوئی نہیں مگر اس کا رزق اللہ کے ذمے ہے۔''

عزل کرنا کیسا ہے؟

سوال: عزل کرنا کیسا ہے؟ کیا حضور کے زمانے میں صحابہ کرام عزل کرتے تھے۔ آج دیکھا جاتا ہے کہ اکثر لوگ امریکی ایجاد کردہ پلاسٹک کا ربڑ (فرنچ لیدر) لگا کر جماع کرتے ہیں تو کیا ایسا کر سکتے ہیں؟ اور اس کا شمار عزل میں ہوگا اگر عزل جائز ہے تو؟ (محمد رضاء اللہ عبداللہ نیپالی) (یکم جولائی ۱۹۹۴ء)

جواب: آزاد عورت کی اجازت سے عزل کا جواز ہے۔ حدیث میں ہے:

«كُنَّا نَعْزِلُ عَلَى عَهْدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالْقُرْآنُ يَنْزِلُ.» ❸

''عہد رسالت ﷺ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عزل کرتے تھے۔ جس طرح کہ مذکور حدیث میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی تصریح موجود ہے۔ نیز بوقت جماع لفافہ کے استعمال کا بظاہر کوئی حرج معلوم نہیں ہوتا۔ زوجین کی باہمی رضا مندی پر

❶ فتاویٰ اسلامیہ:۳/ ۱۸۹

❷ تفسیر اضواء البیان:۵/ ۳۲

❸ صحیح البخاری، بَابُ الْعَزْلِ، رقم:۵۲۰۹، صحیح مسلم، بَابُ حُكْمِ الْعَزْلِ، رقم:۱۴۴۰

موقوف ہے۔ ویسے اصحابِ تجارب کا کہنا ہے کہ عمل ہذا متنوع امراض کو جنم دیتا ہے۔ (وَاللّٰهُ سُبْحَانَهُ وَتَعَالٰى اَعْلَمُ بِصِحَّتِهٖ.)

فعل ہذا عزل کی طرح ہے لیکن عزل سے سابقہ شکوک وشبہات جنم نہیں لیتے ماسوائے اس کے لذت جماع میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔

مسئلہ عزل پر وارد اشکالات کا ازالہ

محترم جناب حافظ ثناء اللہ مدنی صاحب۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

''الاعتصام'' مورخہ یکم جولائی ۱۹۹۴ء میں عزل کے متعلق آپ کا فتویٰ شائع ہوا۔ غالباً اس سے قبل بھی آپ اس مسئلہ پر اپنی رائے کا اظہار فرما چکے ہیں تاہم میرے ذہن میں کچھ خلش ہے جسے دور فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔ ﴿وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ﴾ (الاحزاب:۵۳)

سوال: زید نے اپنی رفیقۂ حیات سے عزل کے بارے میں بات کی۔ اس نے زید سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ یہ مانع حمل اور ممنوع فعل ہے۔ زید کہنے لگا یہ جائز ہے کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا فرمان ہے کہ نزولِ قرآن کے دَور میں ہم عزل کیا کرتے تھے۔ زید کا خیال تھا کہ اگر یہ فعل ناجائز ہوتا تو آسمان سے اس کے متعلق کوئی نہ کوئی حکم ضرور نازل ہوتا۔ یہ سن کر اس کی اہلیہ کہنے لگی کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشادگرامی ہے کہ عزل خفیہ طور پر قتلِ اولاد ہے۔ ممکن ہے صحابہ رضی اللہ عنہم کا فرمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ممانعت سے پہلے کے دور سے متعلق ہو لہٰذا جب تک تم واضح طور پر اس کو جائز اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی تنسیخ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی دوسرے فرمان سے ثابت نہیں کرو گے میں نہیں مانوں گی۔ کیوں کہ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ (الانعام:۱٤۰)

''گھاٹا پا گئے وہ لوگ جنھوں نے نادانستہ طور پر اپنی اولاد کو قتل کیا۔''

زید نے اپنی بیوی کو اس کی بیماری کی طرف متوجہ کر کے عزل کا جواز پیش کرتے ہوئے کہا ڈاکٹروں کے بقول بچے کی پیدائش تمہارے لیے جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے۔ مگر وہ کہتی ہے کہ میں اپنی جان کی خاطر دوسری جان کا حق زندگی تلف کر کے کیوں اُخروی ناکامی مول لے لوں تم چاہو تو عقد ثانی کر لو۔ زید جو صاحب عیال ہے اور کسی بھی صورت عقد ثانی کا خواہشمند نہیں۔ نہ ہی اسے صرف ایک خاص وجہ سے پسند کرتا ہے لِقَوْلِهٖ تَعَالٰى ﴿غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ﴾ کیوں کہ اس کے خیال میں باوجود کوشش کے انصاف کا دامن اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا اور عذابِ الٰہی کا مستوجب ٹھہرے گا۔

اندریں حالات شرعِ متین کی روشنی میں بتایئے کہ زید اور اس کی زوجہ میں کس کا نظریہ درست اور راجح ہے تاکہ دارین کی زندگانی سے بھرپور انداز میں لطف اندوز بھی ہو سکیں۔ اور آخرت میں عتابِ الٰہی سے بالکل محفوظ رہیں۔

امید ہے جواب عنایت فرما کر عنداللہ اجر پائیں گے۔ جزاك الله في الدارين خيراً۔

(سائل قاراب۔ لاہور) (۴ نومبر ۱۹۹۴ء)

جواب: حضرت جابر اور ابوسعید رضی اللہ عنہما وغیرہ سے مروی روایات واضح طور پر عزل (بوقتِ انزال علیحدگی) کے جواز پر دال ہیں۔ لیکن یہ جواز دو وجہ سے اولویّت کے منافی ہے۔

اوّلاً: جماعت عورت کا حق ہے۔ فعل ہذا کے ارتکاب سے لذتِ جماع میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اس بناء پر اہل علم کا کہنا ہے کہ اس کا جواز عورت کی اجازت پر موقوف ہے۔ امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

« لَا خِلَافَ بَيْنَ الْعُلَمَاءِ أَنَّهُ لَا يُعْزَلُ عَنِ الزَّوْجَةِ الْحُرَّةِ إِلَّا بِإِذْنِهَا لِأَنَّ الْجِمَاعَ مِنْ حَقِّهَا وَلَهَا الْمُطَالَبَةُ بِهِ وَلَيْسَ الْجِمَاعُ الْمَعْرُوفُ إِلَّا مَا لَا يَلْحَقُهُ عزل .» ❶

''یعنی اہل علم کا اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ آزاد عورت سے عزل اس کی اجازت سے ہونا چاہیے کیونکہ جماع عورت کا حق ہے وہ اس کا مطالبہ کر سکتی ہے اور معروف جماع وہی ہے جس میں عزل نہ ہو۔ اس کے باوجود شوافع کا اس میں اختلاف موجود ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جماع میں عورت کا اصلاً کوئی حق نہیں۔''

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس سے تکثیرِ نسل میں کمی واقع ہوتی ہے جو شریعت کا مطلوب ہے۔ البتہ امام ابن حزم نے جذامہ بنت وہب کی حدیث: «أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ عَنِ الْعَزْلِ فَقَالَ ذَلِكَ الْوَأْدُ الْخَفِيُّ » ❷ یعنی ''نبی ﷺ سے عزل کے بارے میں سوال ہوا تو جواباً فرمایا یہ خفیہ زندہ درگور کرنا ہے۔'' کی بناء پر وطی کو واجب اور عزل کو حرام قرار دیا ہے، لیکن ان کا یہ نظریہ درست نہیں ہے۔ چنانچہ ترمذی اور نسائی میں حدیث ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہماری کچھ لونڈیاں تھیں اور ہم ان سے عزل کرتے تھے۔ یہود نے کہا یہ تو چھوٹا زندہ درگور کرنا ہے یعنی زندہ اولاد کے بالمقابل۔ پس آپ ﷺ سے دریافت ہوا تو فرمایا: یہود جھوٹے ہیں اگر اللہ مخلوق پیدا کرنی چاہے کوئی اسے روک نہیں سکتا۔

امام بیہقی رحمہ اللہ نے رفع تعارض کی صورت یہ اختیار کی ہے کہ جذامہ کی حدیث کراہت تنزیہی پر محمول ہے اور بعض نے جذامہ کی حدیث کو ضعیف قرار دینے کی سعی کی ہے۔ لیکن یہ بات درست نہیں۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«وَالْحَدِيثُ صَحِيحٌ لَا رَيْبَ فِيهِ وَالْجَمْعُ مُمْكِنٌ .»

''یعنی بلاشبہ حدیث صحیح ہے اور متعارض حدیثوں میں تطبیق و جمع ممکن ہے۔''

---

❶ فتح الباري، ج:۹، ص:۳۰۸

❷ صحيح مسلم، بَابُ جَوَازِ الْغِيلَةِ، وَهِيَ وَطْءُ الْمُرْضِعِ، وَكَرَاهَةِ الْعَزْلِ، رقم ۱٤٤۲)

اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے مگر تاریخ معلوم نہ ہونے کی بناء پر اس پر نسخ کا حکم نہیں لگ سکتا۔

امام طحاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: احتمال ہے کہ حدیث جذامہ آپ ﷺ نے اہل کتاب کی موافقت میں فرمائی ہو کیونکہ غیر مامور بہ امور میں آپ اہل کتاب کی موافقت پسند فرماتے تھے۔ بعد میں اللہ نے اس کے حکم سے آگاہ فرمایا تو یہود کی تکذیب کردی۔ لیکن ابن رشد اور پھر ابن العربی نے اس کا تعاقب یوں فرمایا ہے کہ آپ ﷺ یہود کی پیروی میں کسی بات کو بالجزم بیان کریں اور پھر اسی امر میں ان کی تکذیب کی بھی تصریح کردیں یہ کیسے ہوسکتا ہے! بحث کے اختتام پر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

« وَجَمَعُوا أَيْضًا بَيْنَ تَكْذِيبِ الْيَهُودِ فِي قَوْلِهِمُ الْمَوْءُودَةُ الصُّغْرَى وَبَيْنَ إِثْبَاتِ كَوْنِهِ وَأْدًا خَفِيًّا فِي حَدِيثِ جُذَامَةَ بِأَنَّ قَوْلَهُمُ الْمَوْءُودَةُ الصُّغْرَى يَقْتَضِي أَنَّهُ وَأْدٌ ظَاهِرٌ لَكِنَّهُ صَغِيرٌ بِالنِّسْبَةِ إِلَى دَفْنِ الْمَوْلُودِ بَعْدَ وَضْعِهِ حَيًّا فَلَا يُعَارِضُ قَوْلُهُ إِنَّ الْعَزْلَ وَأْدٌ خَفِيٌّ فَإِنَّهُ يَدُلُّ عَلَى أَنَّهُ لَيْسَ فِي حُكْمِ الظَّاهِرِ أَصْلًا فَلَا يَتَرَتَّبُ عَلَيْهِ حُكْمٌ وَإِنَّمَا جَعَلَهُ وَأْدًا مِنْ جِهَةِ اشْتِرَاكِهِمَا فِي قَطْعِ الْوِلَادَةِ وَقَالَ بَعْضُهُمْ قَوْلُهُ الْوَأْدُ الْخَفِيُّ وَرَدَ عَلَى طَرِيقِ التَّشْبِيهِ لِأَنَّهُ قَطَعَ طَرِيقَ الْوِلَادَةِ قَبْلَ مَجِيئِهِ فَأَشْبَهَ قَتْلَ الْوَلَدِ بعد مَجِيئِه قَالَ ابن الْقَيِّمِ الَّذِي كَذَبَتْ فِيهِ الْيَهُودُ زَعْمُهُمْ أَنَّ الْعَزْلَ لَا يُتَصَوَّرُ مَعَهُ الْحَمْلُ أَصْلًا وَجَعَلُوهُ بِمَنْزِلَةِ قَطْعِ النَّسْلِ بِالْوَأْدِ فَأَكْذَبَهُمْ وَأَخْبَرَ أَنَّهُ لَا يَمْنَعُ الْحَمْلَ إِذَا شَاءَ اللَّهُ خَلْقَهُ وَإِذَا لَمْ يُرِدْ خَلْقَهُ لَمْ يَكُنْ وَأْدًا حَقِيقَةً وَإِنَّمَا سَمَّاهُ وَأْدًا خَفِيًّا فِي حَدِيثِ جُذَامَةَ لِأَنَّ الرَّجُلَ إِنَّمَا يَعْزِلُ هَرَبًا مِنَ الْحَمْلِ فَأَجْرَى قَصْدَهُ لِذَلِكَ مَجْرَى الْوَأْدِ لَكِنَّ الْفَرْقَ بَيْنَهُمَا أَنَّ الْوَأْدَ ظَاهِرٌ بِالْمُبَاشَرَةِ اجْتَمَعَ فِيهِ الْقَصْدُ وَالْفِعْلُ وَالْعَزْلُ يَتَعَلَّقُ بِالْقَصْدِ صِرْفًا فَلِذَلِكَ وَصَفَهُ بِكَوْنِهِ خَفِيًّا. » [1]

عبارت ہذا کا مفہوم یہ ہے:

تعارض: اس مقام پر دو احادیث کے درمیان ظاہری تعارض کا حل پیش کیا گیا ہے۔ پہلی وہ حدیث جس میں رسول اللہ ﷺ نے یہود کی تکذیب فرمائی ہے۔ یہود کا کہنا تھا کہ عزل موؤدۃ صغریٰ (یعنی واْدِ صغیر چھوٹا زندہ درگور کرنا) ہے تو آپ نے انھیں جھوٹا قرار دیا۔ دوسری حدیث وہ جس میں آپ نے فرمایا کہ عزل واْدِ خفی ہے۔ یعنی ایک حدیث میں عزل کو واْدِ صغیر کہنے کی نفی ہے اور دوسری حدیث میں عزل کو واْدِ خفی کہنے کا اثبات ہے۔

رفع تعارض۔ تو علماء نے ان دونوں احادیث کے درمیان تطبیق یہ دی کہ یہود کی تکذیب اس لیے کی کہ ان کی بات

[1] فتح الباری، ج:۹، ص:۳۰۹

کی رُو سے یہ حقیقی اور ظاہری واد ہے مگر مولود کو زندہ دفن کرنے کی نسبت ذرا کم ہے۔ نتیجتاً اس وعید کے تحت آتا ہے کہ ﴿وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ﴾ اور جو نبی ﷺ نے یہ فرمایا ہے: «اِنَّ الْعَزْلَ وَأْدُ خَفِيٍ» [1]

یہ جملہ اس بات پر دلالت کرتا ہے۔ یہ عزل ظاہری (یعنی حقیقی) واد ہے ہی نہیں کہ اس پر کوئی حکم یا وعید مترتب ہو مگر چونکہ مولود کو زندہ دفن کرنا اور عزل کرنا دونوں کا نتیجہ قطع الولادۃ ہے۔ لہٰذا اس اشتراک کی وجہ سے اسے واد قرار دیا۔ جب کہ حقیقی واد نہیں ہے تبھی تو اسے وادِ خفی فرمایا۔ چنانچہ دونوں احادیث باہم متعارض نہ رہیں۔

دیگر تطبیق: بعض نے کہا ہے کہ عزل پر واد کا اطلاق باہمی مشابہت کی وجہ سے کیا گیا ہے۔ کیونکہ عزل میں مولود کے پیدا ہونے سے پہلے ولادت کے ذریعے کو قطع کیا گیا ہے لہٰذا یہ مولود کے پیدا ہو جانے کے بعد اسے قتل کردینے کے مشابہ ہوا۔ لہٰذا علی وجہ التشبیہ عزل کو واد قرار دیا علی وجہ الحقیقۃ نہیں۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ کی توجیہ

امام ابن قیم رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ آپ ﷺ نے یہودیوں کو اس لیے جھوٹا قرار دیا کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ عزل کی صورت میں حمل قرار نہیں پا سکتا یعنی عزل حمل سے مانع ہے اور ان کے نزدیک یہ قطع نسل کے سلسلے میں ویسے ہی ہے جیسے زندہ دفن کرنا لہٰذا آپ نے انھیں جھوٹا قرار دیا۔ اور خبر دی کہ عزل حمل سے مانع نہیں بلکہ اللہ چاہے تو اسے پیدا کردے اور اگر اللہ اسے پیدا کرنے کا ارادہ ہی نہ کرے تو وہ وادِ خفی نہ رہا اور آپ ﷺ نے جذامہ کی روایت میں اسے وادِ خفی کا نام اس لیے دیا کیونکہ عزل کرنے والا اس لیے عزل کرتا ہے تاکہ حمل نہ قرار پائے یعنی وہ حمل سے فرار حاصل کرنا چاہتا ہے لہٰذا اس کے ارادہ اور قصد کو واد کے قائم مقام قرار دیا لیکن دونوں میں فرق واضح ہے اور وہ یہ کہ حقیقی واد وہ ہوتا ہے کہ جس میں انسان کا ارادہ بھی شامل ہو اور براہِ راست واد کے فعل کا بھی ارتکاب کرلے جب کہ عزل کا تعلق خالص ارادہ اور قصد سے ہوتا ہے اس وجہ سے اسے وادِ خفی کہا ہے۔

شیخنا علامہ البانی رحمہ اللہ نے بھی اپنی کتاب ''آداب الزفاف فی السنة المطهرة (ص:۵۵، طبع ۳) میں مذکور تطبیق کو خوب پسند فرمایا ہے۔ اس سے سائل کے بھی جملہ اشکالات کا ازالہ بطریقِ احسن ہو جاتا ہے۔ نیز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فرامین کا تعلق جملۂ عہد نبوت سے ہے۔ تخصیص کی کوئی دلیل نہیں۔ اصولِ حدیث میں مدوّن نسخ کی صورتوں میں (نص میں نسخ کی تصریح۔ تاریخ کا علم جمع ناممکن ہو صحابی کی وضاحت وغیرہ) میں سے کوئی صورت بھی اس پر منطبق نہیں ہوتی۔ بالخصوص جب کہ فرمانِ نبوی «اِعْزِلْ عَنْهَا اِنْ شِئْتَ» [2] ''اگر چاہو تو عزل کرلو۔'' میں اذن ماثور ہے۔ لہٰذا جمع و تطبیق ہی اصل ہے۔ کما تقدم (وَاللّٰهُ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى اَعْلَمُ.)

[1] أيضًا

[2] صحیح مسلم، بَابُ حُكْمِ الْعَزْلِ، رقم:۱٤۳۹، سنن أبي داؤد، بَابُ مَا جَاءَ فِي الْعَزْلِ، رقم: ۲۱۷۳

برتھ کنٹرول کے لیے عزل کرنا

سوال: بچوں کی اچھی تربیت کرنے کی وجہ سے برتھ کنٹرول کی کونسی صورت جائز ہے۔ اپریشن، انجکشن یا مرد کا عزل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ (۳۰ دسمبر ۱۹۹۴ء)

جواب: اچھی تربیت سے مقصود اگر کم بچے ہیں۔ تو یہ درست نہیں کیوں کہ احادیث میں تکثیر اولاد کی ترغیب ہے۔ بوقت ضرورت فعل عزل مع الکراہت درست ہے۔ دوسری ذکر کردہ صورتوں سے اقرب معلوم ہوتی ہے۔ عزل کی تعریف: «النَّزْعُ بَعْدَ الْإِيلَاجِ لِيُنْزِلَ خَارِجَ الْفَرْجِ» [1]

تصوف کی حقیقت کیا ہے؟

سوال: تصوف کے بارے میں اختصار سے بتایئے کہ یہ کیا ہے؟ (عبدالوحید۔ راولپنڈی) (۵ ستمبر ۱۹۹۷ء)

جواب: تصوف دراصل فلسفہ ہی کی ایک شکل ہے اور ایسے عقیدے کا نام ہے جس سے امورِ غیبیہ کا دل پر کشف ہوتا ہے۔ اس کا تعلق حضرات انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات سے بالکل نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں صوفیاء کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ہم براہِ راست اللہ سے یا براہِ راست اللہ کے رسول ﷺ سے بصورتِ کشف علوم حاصل کرتے ہیں۔ اور ہم اس حقیقت کو چھپانا گناہ سمجھتے ہیں کہ کائنات میں صرف اللہ کا وجود ہے۔ اس لحاظ سے ہر انسان اللہ ہے۔ اور اللہ انسان ہے۔ بلکہ حقیقت میں تمام ایک ہیں۔ البتہ صورتوں کے لحاظ سے فرق ہے۔ وہ برملا اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ غیبی علم کے حصول کے لیے کشف ہی ایک راستہ ہے جس میں مجاہدہ کرنا پڑتا ہے۔ مجاہدہ کی بے شمار صورتیں ہیں۔ جو بلحاظ وقت، جگہ، اشخاص کے تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔

البتہ نفس کو اذیتوں سے ہمکنار رکھنا معینہ وردووظائف کا بار بار کرنا لوگوں سے اختلاط نہ کرنا، بالکل الگ تھلگ رہنا، اور پاکیزگی کا خیال نہ کرنا لازمی امور ہیں۔ البتہ اتنی بات ذہن نشین کر لیجیے، ضروری نہیں کہ جو انسان تصوف کی طرف منسوب ہے۔ اس کا عقیدہ بعینہٖ وہی ہے جس کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ ہاں وہ شخص جو تصوف کے آخری مرحلہ پر پہنچ چکا ہے۔ اس کا عقیدہ واقعی یہی ہوتا ہے۔ اور جو صوفی ابھی تصوف کے مراحل طے کر رہا ہے اور آخری مرحلہ تک رسائی حاصل نہیں کر سکا ہے تو وہ جہاں تک پہنچا ہے، اسے بس اتنی ہی خبر ہے وہ آخری مراحل سے بے خبر ہے۔ اگر وہ ہمارے بیان کردہ عقیدے کا انکار کر رہا ہے۔ تو ہم اسے معذور سمجھتے ہیں، اس لیے کہ ابھی وہ اس مقام سے ناآشنا ہے جہاں صوفی کی آخری منزل ہے۔ (افکارِ صوفیہ، مترجم: ۱۸)

---

[1] فتح الباری: ۹/ ۳۰۵

کیا قرآن وحدیث میں طریقت اور تصوف کا لفظ منقول ہے؟

سوال : کیا طریقت اور تصوف کا لفظ کہیں قرآن یا حدیث میں آیا ہے اگر آیا ہے تو اس کے کیا معنی ہیں؟

(ایک سائل) (۱۴ جنوری ۱۹۹۴ء)

جواب : کتاب وسنت میں طریقت اور تصوف وغیرہ الفاظ کا استعمال نہیں ہوا۔ بعد کے آدوار میں تارک الدنیا لوگوں نے مخصوص معانی کے لیے ان الفاظ کو ایجاد کیا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ فتاویٰ اہل حدیث، جلد اول، ص:۴۴ تا ۵۴، لشیخنا محمد روپڑی رحمہ اللہ تعالیٰ

مشرک وکبائر کے مرتکب شخص کو قرآن خوانی وغیرہ اعمال نفع دیں گے؟

سوال : مشرک وکبائر کے مرتکب شخص کو قرآنی خوانی وغیرہ اعمال نفع دیں گے؟

جواب : مذکورہ صفات کے حامل شخص کو چاہیے کہ اپنی اوّلین فرصت میں امدادی ذرائع سے دعوۃ الرسل توحید خالص کو سمجھنے کی سعی کرے یا پھر کسی موحد بزرگ عالم کی صحبت کو اختیار کرے تاکہ اس کی باطنی کیفیت میں جلاء پیدا ہو کر اس میں جذبہ توحید موجزن ہو جو اوّل وآخر ذریعہ نجات ہے۔ ورنہ آپ جانتے ہیں کہ نکما بیج تو زمین بھی قبول نہیں کرتی۔ چہ جائیکہ سیاہ کاریوں اور بداعمالیوں کا سودا اللہ کے حضور پروان چڑھے۔ یہ حقیقت ہے کہ اللہ جل شانہ کا بندوں پر بہت زیادہ حق ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ بندہ کما حقہ حق عبودیت ادا کرے۔ اس کے ماسوا کسی کی پرستش نہ کرے اور نہ کسی کو نفع وضرر اور خوف ورجاء وغیرہ میں اس کا شریک وسہیم سمجھے۔ خالی گھر ہر ایک کی توجہ کا مرکز ہوتا ہے۔ ہر کوئی اس کو اپنے مقاصد میں استعمال کے لیے کوشاں ہوتا ہے۔ اسی طرح یادِ الٰہی سے غافل اور بے بہرہ دل ودماغ بڑی آسانی سے شیطانی قوتوں کا ملجأ وماوٰی بن جاتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں گناہ آلود زندگی خوبصورت ومزین لگنے لگتی ہے۔ آدمی ہوائی گھوڑے پر سوار ہو کر خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اللہ کی رحمت بڑی وسیع ہے۔ عمل کی کیا ضرورت ہے۔ وہ خود بخود معاملہ حسنہ کرے گا۔ میرے اعمال سے وہ مستغنی ہے، وغیرہ وغیرہ سوچنے کا مقام ہے۔ اگر یہ بات حقیقت کا رُوپ دھارے ہوتی تو انبیاء کرام اور اولیائے عظام کو عبادات کی مصائب ومشکلات کا بوجھ اٹھانے کی کیا ضرورت تھی۔ جب کہ تاریخ شاہد ہے کہ مجاہدہ نفس میں وہ اپنی نظیر آپ تھے۔ اس بناء پر وہ خلد بریں کے وارث ٹھہرے۔

سوال میں ذکر کردہ بہت ساری چیزیں شرکیات اور بدعات اور کبائر کی قبیل سے ہیں۔ دین اسلام سے غیر متعلق ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ پہلے دین کا صحیح فہم وادراک حاصل کیا جائے۔ پھر اس کے تقاضوں کے مطابق اپنے کو ڈھالا جائے:

« اَلْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ، وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ، وَالْعَاجِزُ، مَنْ أَتْبَعَ نَفْسَهُ هَوَاهَا،

ثُمَّ تَمَنّٰی عَلَی اللّٰہِ.» ❶

یعنی عقلمند اور دانا بینا وہ ہے جس نے اپنے نفس کو رب کی رضا کے تابع کردیا اور عاجز و بے بس وہ ہے جو نفسانی خواہش کی پیروی میں لگا رہا اور اللہ سے صرف ظنون کا متمنی ہے۔''

شخص ہذا منہیات کا مرتکب اگر مرگیا تو قرآن خوانی، ساتواں، چالیسواں وغیرہ اس کے لیے نفع بخش نہیں، کیونکہ بذاتِ خود ان اعمال کا بوجھ ہی شریعت اسلامیہ میں ثابت نہیں۔ دوسری طرف یہ شخص مشرک بھی ہے جس کی نجات ممکن نہیں۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ﴾ (النساء:۴۸)

مزید آنکہ یہ شخص کبائر کا مرتکب ہے جس کی نجات کا انحصار مشیت الٰہی پر موقوف ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

بہشتی دروازے کی شرعی حیثیت

سوال: پاکپتن میں بابا فرید گنج شکر کے مزار پر ''باب الجنة'' کے نام سے جو دروازہ ہے جسے عوام الناس ''بہشتی دروازہ'' کہتے ہیں۔ عرس کے موقعے پر مزار کا ''مجاور اکبر'' سجادہ نشین اس دروازے کی قفل کشائی کرتا ہے اور ہزاروں لوگ اس دروازے سے گزرتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ گویا انھوں نے جنت کا دروازہ عبور کرلیا ہے۔ اب جواب طلب مسئلہ یہ ہے کہ:

۱۔ جنت کا دروازہ تو رسول اکرم ﷺ کھلوائیں گے، کیا یہ توہین رسالت نہیں ہے؟ کیا یہ گستاخی رسول ﷺ نہیں ہے؟

۲۔ جو لوگ اس دروازے سے گزرتے ہیں ان کے بارے میں قرآن وحدیث کی روشنی میں کیا حکم ہے؟ بَيِّنُوْا تُوجَرُوْا۔ (سائل: مرزا سجاد انور، شیخوپورہ روڈ۔ فیصل آباد) (۲۸ اپریل ۲۰۰۶ء)

جواب: ۱۔ شریعت کی نگاہ میں ''بہشتی دروازہ'' کا اِطلاق صرف اُخروی جنت کے دروازے پر ہوتا ہے۔ چنانچہ ''صحیح مسلم'' میں حدیث ہے، نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«وَأَنَا أَوَّلُ مَنْ يَقْرَعُ بَابَ الْجَنَّةِ.» ❷

''سب سے پہلے میں جنت کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا''

''صحیح مسلم'' ہی کی دوسری روایت میں الفاظ یوں ہیں:

« آتِي بَابَ الْجَنَّةِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ.» ❸

❶ سنن ابن ماجه، بَابُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وَالِاسْتِعْدَادِ لَهُ، رقم:۴۲۶۰، سنن الترمذی، رقم:۲۴۵۹

❷ صحیح مسلم، بَابٌ فِي قَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَنَا أَوَّلُ النَّاسِ يَشْفَعُ فِي الْجَنَّةِ .....الخ، رقم: ۱۹۶

❷ صحیح مسلم، بَابٌ فِي قَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَنَا أَوَّلُ النَّاسِ يَشْفَعُ فِي الْجَنَّةِ .....الخ، رقم: ۱۹۷

''قیامت کے روز میں جنت کے دروازہ کے پاس آؤں گا۔''

اور ''صحیحین'' میں ہے: « فِي الْجَنَّةِ ثَمَانِيَةُ أَبْوَابٍ. » [1] ''جنت میں آٹھ دروازے ہیں۔''

ان نصوص سے معلوم ہوا کہ بہ طور شعار بہشتی دروازہ کا اطلاق صرف جنّاتِ خلد پر ہوتا ہے، اس کے علاوہ کسی محترم ومکرم چیز کی طرف منسوب دروازے کو باب الجنۃ نہیں کہا جا سکتا۔ امکانی حد تک اگر اس کا جواز ہوتا تو سلف صالحین اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانے یعنی قرونِ مفضلۃ اس کے زیادہ حق دار تھے۔ اسلامی تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی جس سے ''بہشتی دروازے'' کے جواز کا پہلو مترشح ہو۔ لہٰذا اس کا ڈھا دینا ضروری ہے تاکہ افرادِ امت کو شرک کی نجاست سے بچایا جا سکے، جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیعت الرضوان کی طرف منسوب درخت کو کٹوا دیا تھا جب کہ عامۃ الناس اسے متبرک سمجھ کر اس کی زیارت کا قصد کرنے لگے تھے، ملاحظہ ہو فتح الباری: ۷/ ۴۴۸۔

اسی طرح ''مسند احمد'' (۵/ ۲۱۸) اور ''سنن النسائی کبریٰ'' (حدیث نمبر: ۱۱۵۸) میں مذکور ہے کہ حنین سے واپسی پر ایک بہت بڑی بیری کے قریب سے گزرتے ہوئے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ ہمارے لیے بھی ''ذاتِ انواط'' مقرر کر دیں جیسے کفار کے لیے ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم نے وہی بات کہی جو موسیٰ علیہ السلام سے ان کی قوم نے کہی:

﴿اِجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ﴾

''کہ ہمارے لیے بھی ایک الٰہ بنا دیجیے جس طرح ان کے الٰہ ہیں۔ فرمایا تم بہت جاہل لوگ ہو۔''

۲۔ یاد رہے کہ اس دروازے کے متعلق بہشتی دروازہ ہونے کا اعتقاد رکھنا شرکیات وکفریات میں داخل ہے۔ کیوں کہ یہ ایسی بات ہے جس کا علم نصوصِ شریعت کی راہنمائی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا، جب کہ یہاں سرے سے کوئی نص اور دلیل موجود نہیں۔ لہٰذا عزم بالجزم کے ساتھ اس کو بہشتی دروازہ قرار دینا امورِ دین میں مداخلت ہے جس کی سزا انتہائی خطرناک ہے۔ ایسے اعتقاد سے فی الفور تائب ہونا ضروری ہے، ورنہ ڈر ہے کہ کہیں جہنم کا ایندھن نہ بن جائیں۔

اللہ تعالیٰ کتاب وسنت کی روشنی میں صحیح عقائد کی توفیق عطا فرمائے تاکہ حقیقی جنت میں داخلہ ہمارا مقدر ہو، آمین۔

مسلم اور مومن میں کیا فرق ہے؟

سوال: مسلم اور مومن میں کیا فرق ہے؟

(آپ کا شاگرد۔ آصف احسان ملک۔ گل بہار کالونی فیصل آباد) (۱۴ اکتوبر ۱۹۹۶ء)

جواب: ایمان اور اسلام دونوں مترادف ہیں۔ انفرادی صورت میں ہر ایک کا دوسرے پر اطلاق ہوتا ہے لیکن جب

---

[1] صحيح البخاري، بَابُ صِفَةِ أَبْوَابِ الجَنَّةِ، رقم: ٣٢٥٧

دونوں جمع ہو جائیں تو ایمان کا تعلق باطنی امور سے ہوتا ہے جب کہ اسلام کا ظواہر سے اس کی واضح مثال حدیث جبریل اور قصہ وفد عبدالقیس ہے حدیث جبریل میں ایمان کی تعریف باطنی امور سے کی گئی ہے۔فرمایا:

«الإِيمَانُ أَنْ تُؤْمِنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ، وَكُتُبِهِ، وَبِلِقَائِهِ، وَرُسُلِهِ وَتُؤْمِنَ بِالْبَعْثِ» ❶

اور قصہ وفد عبدالقیس میں ایمان کی تعریف ظاہری امور سے کی گئی ہے۔فرمایا:

«أَتَدْرُونَ مَا الإِيمَانُ بِاللَّهِ وَحْدَهُ قَالُوا: اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ، قَالَ: شَهَادَةُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ، وَإِقَامُ الصَّلَاةِ، وَإِيتَاءُ الزَّكَاةِ، وَصِيَامُ رَمَضَانَ، وَأَنْ تُعْطُوا مِنَ المَغْنَمِ الخُمُسَ» ❷

لیکن حدیث جبریل میں اسلام کی تعریف انہی ظاہری امور سے کی گئی ہے۔اس کی وجہ یہی ہے کہ حدیث جبریل میں چونکہ دونوں جمع ہو گئے ہیں۔اس لیے ایمان کی تعریف میں باطن کا لحاظ رکھا گیا ہے اور اسلام میں ظاہر کا۔

اسی بناء پر اہل علم نے کہا ہے کہ ایمان کا درجہ اسلام سے بڑا ہے۔اَلمسلم کی تعریف میں فرمایا:

«الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ» ❸

یعنی کامل مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان سلامت رہیں۔لیکن مومن کے بارے میں فرمایا:

«اَلْمُؤمِنَ مَنْ أمَنَ النَّاسُ بَوَائِقَه» ❹

یعنی مومن وہ ہے جس کی آفتوں سے لوگ مامون رہیں یعنی اس کی قلبی جلاء کی بناء پر لوگ اس سے خطرہ محسوس نہ کریں۔جب کہ اَلمسلم سے صرف ظاہری اذیت ناک پہلوؤں کی نفی کی گئی ہے۔اگرچہ دل سے لوگ اس سے خطرہ محسوس کرتے رہیں۔

اس دقیق فرق کے پیش نظر علامہ خطابی رقمطراز ہیں:

«وَالحَقُّ اَن بَيْنَهُمَا عُمُوْمًا وَ خُصُوْصًا فَكَلُّ مُؤْمِنٍ مُسلِمٌ وَ لَيْسَ كُلُّ مُسْلِمٍ مَؤْمِنًا»

حق بات یہ ہے کہ مومن اور مسلم میں عموم اور خصوص کی نسبت ہے پس ہر مومن مسلم ہے لیکن ہر مسلم کے لیے مومن ہونا ضروری نہیں۔امید ہے تشفی کے لیے بالاختصار بحث کافی ہوگی۔جملہ تفاصیل کے لیے ملاحظہ ہو: الایمان للامام ابن تیمیہ۔

---

❶ صحيح البخاری، بَابُ سُؤَالِ جِبْرِيلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الإِيمَانِ، وَالإِسْلاَمِ، وَالإِحْسَانِ، وَعِلْمِ السَّاعَةِ، رقم:٥٠

❷ صحيح البخاری، بَابٌ: أَدَاءُ الخُمُسِ مِنَ الإِيمَانِ، رقم:٥٣

❸ صحيح البخاری، بَابٌ: المُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ المُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ، رقم:١٠

❹ مسند أبي داؤد الطيالسی، ، رقم:١٤٣٧، مصنف ابن ابی شيبة، رقم:٢٢ ٢٥٤

ڈائجسٹوں میں موجود جھوٹی کہانیوں کا پڑھنا جائز ہے؟

سوال : کیا جھوٹی کہانیاں (جو کہ مختلف ڈائجسٹوں وغیرہ میں شائع ہوتی ہیں۔ پڑھنا جائز ہے کہ نہیں)؟ قرآن وسنت کی روشنی میں جواب دے کر شکریہ کا موقع دیں۔

(آپ کا شاگرد۔ آصف احسان ملک۔گل بہار کالونی فیصل آباد) (۱۴ اکتوبر ۱۹۹۶ء)

جواب : جھوٹے قصے کہانیاں ،افسانے ، ڈرامہ، ناول اور جنسی اور سنسنی خیز لٹریچر رسالے اور بے حیائی کے پرچارک اخبارات اور جدید ترین ایجادات، ریڈیو، ٹی وی، وی سی آر، ویڈیو فلمیں وغیرہ سے بے راہ روی کا درس لینا اپنی عاقبت کو خراب کرنا ہے۔

قرآن مجید میں ہے:

﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّ يَتَّخِذَهَا هُزُوًا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ﴾ (لقمان:٦)

''اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو لغو باتوں کو مول لیتے ہیں کہ بے علمی کے ساتھ لوگوں کو اللہ کی راہ سے بہکائیں اور اسے ہنسی بنائیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔''

قرآنی لفظ لھو الحدیث میں مذکورہ بالا سب چیزیں داخل ہیں۔ ''سیرۃ ابن ہشام'' وغیرہ میں موجود ہے کہ نضر بن حارث کا کاروبار یہی تھا کہ وہ مکہ سے عراق و فارس وغیرہ جاتا۔ وہاں سے شاہانِ عجم کے قصے اور رستم و اسفند یار کی داستانیں لا کر قصہ گوئی کی محفلیں جماتا۔ تاکہ لوگوں کی توجہ قرآن سے ہٹ جائے اور وہ قصے کہانیوں میں کھو جائیں۔ مسئلہ ہذا پر سیر حاصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن (۴/۸،مولانا مودودی)

معلوماتِ عامہ کے لیے قصے، کہانیاں ،ڈائجسٹ وغیرہ پڑھنے کا حکم؟

سوال : اگر کوئی شخص فارغ اوقات میں ایسی کہانیاں پڑھے جو فحاشی اور عریانی سے پاک ہوں لیکن ان کے پڑھنے سے معلوماتِ عامہ میں اضافہ ہو تو کیا یہ جائز ہے؟ (محمد مسعود P.P،کوٹلی، آزاد کشمیر) (۲۹ دسمبر ۲۰۰۰ء)

جواب : صحیح شرعی علوم میں اضافے کا باعث بننے والی کہانیاں پڑھنا جائز ہے۔ بالخصوص مجاہدینِ اسلام کے واقعات جن سے جذبۂ جہاد پیدا ہو۔ یا زہد وتقویٰ وغیرہ پر مشتمل واقعات تاکہ آخرت کا صحیح تصور پیدا ہو۔

کیا شاعری اشعار پڑھنا جائز ہے؟

سوال : کیا شاعری کرنا یا اشعار پڑھنا جائز ہے؟ ہمارے ہاں میٹرک سے ایف اے تک کے اُردو نصاب میں جو شاعری ہے،اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ (محمد مسعود P.P،کوٹلی، آزاد کشمیر) (۲۹ دسمبر ۲۰۰۰ء)

جواب: اچھی شاعری کرنا جائز ہے۔ جب کہ بری شاعری سے نبی کریم ﷺ نے سخت نفرت دلائی ہے۔ یہی حکم ان اشعار کا ہے جو داخلِ نصاب ہیں۔

اشعار میں مبالغے کی حدود و قیود

سوال: علامہ اقبال مرحوم کا شعر ہے:

حضور دہر میں آسودگی نہیں ملتی
وفا کی بو ہو جس میں وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اِک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے وہ جنت میں بھی نہیں ملتی

دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا جنت میں واقعتاً کسی چیز کی کمی محسوس ہوگی؟

(عبدالرزاق اختر، محمدی چوک، حبیب کالونی گلی نمبر۱۲، رحیم یار خان) (مارچ ۲۰۰۵)

جواب: شاعر کا مقصود محض مبالغہ ہے اگر احمد شوقی کی طرح استثنائی انداز میں کہا جاتا تو بہت بہتر ہوتا

آمَنْتُ بِاللّٰهِ وَاسْتَثْنَيْتُ جَنَّتَهُ
دِمَشْقُ جَنَّاتٌ وَرَيْحَانٌ

''میں اللہ پر ایمان رکھتا ہوں اور اُس کی جنت کو مستثنیٰ کرتے ہوئے کہتا ہوں کہ دمشق (اس زمین کی) جنت اور عظیم الشان نعمت ہے۔''

کیا کسی مسلمان کے لیے جانوروں کو خصی کرنا جائز ہے؟

سوال: (۱) بیل، سانڈ، بکرے وغیرہ، جو جانور خصّی کیے جاتے ہیں ان کی کیا دلیل ہے۔ مسلم و غیر مسلم دونوں خصی کر سکتے ہیں؟

(۲) کیا کوئی مسلمان بھی یہ کام کر سکتا ہے۔ وضاحت فرمائیں۔

(سائل محمد اسلم گھلوی، مرکزی مسجد اہل حدیث قلعہ دیدار سنگھ، گوجرانوالہ) (۱۳ مارچ ۱۹۹۲ء)

جواب: جانوروں کو خصی کرنے کے بارے میں اہل علم کے دو متضاد اقوال ہیں۔ ایک گروہ منع کا قائل ہے جب کہ دوسرا گروہ عملی جواز کا قائل ہے۔

اوّل الذکر طائفہ کے دلائل بالاختصار حسب ذیل ہیں:

۱۔ ﴿وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ﴾ (النساء:۱۱۹)

''اور (یہ بھی) کہتا رہوں گا کہ وہ اللہ کی بنائی صورتوں کو بدلتے رہیں۔''

زیرِ آیت ہذا میں امام بغوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''مفسرین کی ایک جماعت بشمول عکرمہ کا کہنا ہے مراد اس سے خصی کرنا۔ گودنا لگانا اور کان کاٹنا ہے۔اور بعض اہل علم نے خصی کرنے کو حرام قرار دیا ہے۔'' (معالم التنزیل)

نیز حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک اس سے مقصود جانوروں کا خصّی کرنا ہے۔ یہی رائے درج ذیل اسلاف کی ہے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما، انس رضی اللہ عنہ، سعید بن میسّب رحمہ اللہ، عکرمہ رحمہ اللہ، ابو العباس رحمہ اللہ، قتادہ رحمہ اللہ، ابو صالح رحمہ اللہ اور ثوری رحمہ اللہ۔''

۲۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دم گھونٹنے اور جانوروں کو خصی کرنا سختی سے منع فرمایا ہے۔ (رواہ البزار) امام شوکانی رحمہ اللہ نے اس پر صحت کا حکم لگایا ہے۔

۳۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ماثور ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹوں، گایوں، بھیڑ بکریوں، اور گھوڑوں کے خصّی کرنے سے منع فرمایا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں، افزائش نسل کا دارومدار اسی پر ہے۔ کوئی بھی مادہ نر کے بغیر اپنے فرائض انجام نہیں دے سکتی۔ (شرح معانی الآثار)

۴۔ مصنف ابن ابی شیبہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے۔ جانوروں کا خصی کرنا مثلہ کے حکم میں ہے پھر دلیل میں مذکور آیت پیش کی اور ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بھی عدمِ جواز پر اپنی مروی روایت اور مذکورہ بالا آیت سے استدلال کیا ہے۔

مذکورہ دلائل کا جواب

ان دلائل کے جواب میں ثانی الذکر فریق کا کہنا ہے کہ ﴿فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ﴾ کی تفسیر میں جانوروں کو خصی کرنے کی بات کسی صحیح یا ضعیف روایت سے مرفوعاً ثابت نہیں۔ اور جہاں تک سلف کی ایک جماعت کا تعلق ہے کہ اس نے آیت ﴿فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ﴾ سے خصی کرنا سمجھا ہے جب کہ ان کے بالمقابل دوسری جماعت نے ﴿خَلْقَ اللّٰهِ﴾ سے اللہ کا دین مراد لیا ہے چنانچہ امام بغوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ابن عباس رضی اللہ عنہما، حسن بصری، مجاہد، قتادہ، سعید بن میسّب اور ضحاک رحمہم اللہ نے اس کی تفسیر دین اللہ سے کی ہے اور نظیر میں دوسری آیت ﴿لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ﴾ پیش کی ہے۔ اور خلق اللہ کا معنی دین اللہ بتایا ہے۔ یعنی حرام کو حلال اور حلال کو حرام ٹھہرانا اور حافظ ابن کثیر نے بھی اپنی تفسیر میں قریباً ایسی ہی وضاحت فرمائی ہے۔

جب آیت کی تفسیر میں دونوں قسم کے اقوال ہیں تو فیصلہ حتمی اور یقینی نہ ہوا اور اگر سنت ثابتہ سے کوئی بات ثابت ہو تو

انکار کی گنجائش نہ تھی۔ جس کا وجود یہاں ناپید ہے اور طحاوی کی روایت کمزور نا قابلِ استدلال ہے۔ اس میں راوی عبد اللہ بن نافع ہے جو محدثین کے نزدیک ضعیف ہے اور ابن ابی شیبہ کی روایت میں ایک راوی مجہول ہے۔ پھر ابن عباس رضی اللہ عنہما پر موقوف ہے مرفوع نہیں اگرچہ مسند بزار کی روایت جس کو امام شوکانی رحمہ اللہ نے صحیح قرار دیا ہے۔ مطلقاً ممانعت پر دالّ ہے خواہ ماکول اللحم جانور ہو یا غیر ماکول اللحم۔ لیکن دیگر مرویات مثلاً ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، عائشہ رضی اللہ عنہا، ابو رافع رضی اللہ عنہ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما جواز پر مصرح ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب قربانی کا ارادہ فرماتے تو بڑے فربہ سینگوں والے سفید خصی کردہ دنبے خریدتے۔"[1]

جانوروں کی مصنوعی نسل کشی اور جانوروں کو انجکشن کے ذریعہ حاملہ کرنے کا کیا حکم ہے؟

سوال: جانوروں کی مصنوعی نسل کشی جائز ہے یا ناجائز؟ جانوروں کو انجکشن کے ذریعے حاملہ کرنا جائز ہے یا ناجائز؟

(محمد ناصر منچاکوٹی دربند) (۱۰ نومبر ۱۹۹۵ء)

جواب: جانوروں کی نسل کشی کا بظاہر جواز ہے۔ بشرطیکہ دوسری جنس کے سلسلہ نسل کو کلی طور پر نیست و نابود یا صریح نقصان پہنچانا مقصود نہ ہو۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے خچر کا تذکرہ بطورِ امتنان و احسان فرمایا ہے:

﴿وَّ الْخَيْلَ وَ الْبِغَالَ وَ الْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَ زِيْنَةً﴾ (النحل:۸)

"یعنی گھوڑے، خچر، گدھے، سواری کے لیے اور تمہاری زینت کے لیے ہیں۔"

یعنی گھوڑوں، خچروں، اور گدھوں کی پیدائش کا مقصد ہی زینت اور سواری ہے۔

پھر یہ بات معروف ہے کہ خچر کی اپنی کوئی نسل نہیں وہ محض گدھے اور گھوڑی کے ملاپ سے معرضِ وجود میں آتا ہے۔

امام طحاوی رحمہ اللہ وغیرہ نے آٹھ احادیث بیان فرمائیں ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خچر پر سواری کرنے کی تصریح موجود ہے۔

مندرجہ بالا دلائل سے معلوم ہوا کہ گدھے اور گھوڑے کے درمیان اختلاط ممنوع نہیں کیوں کہ اگر ممنوع ہوتا تو خچر پر سواری بھی جائز نہ ہوتی۔ جب سواری جائز ہے تو یہ فعل ممنوع نہیں۔

باقی رہیں وہ حدیثیں جن سے اس کی ممانعت ظاہر ہوتی ہے جیسے ابوداؤد کی وہ روایت جس میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خچر ہدیہ میں ملا۔ آپ نے اس پر سواری کی پھر علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اگر ہم نے گدھے اور گھوڑی کی جفتی کرائی ہوتی تو اسی طرح ہمارے پاس بھی خچر ہوتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نادان لوگ ایسا

[1] سنن ابن ماجه، بَابُ أَضَاحِيِّ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، رقم:۳۱۲۲

کرتے ہیں۔ ❶

نیز شرح ''معانی الآثار'' میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں (اہل بیت کو) دوسروں سے تین باتوں میں ممتاز بتایا۔ اسباغ الوضوء (اچھی طرح سے وضوء کرنا) صدقہ کا مال نہ کھانا اور گھوڑی اور گدھے کے درمیان جفتی نہ کرانا۔ علامہ عظیم آبادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ان کا جواب تین طریقے سے دیا گیا ہے۔

اولاً: یہ کہ علی رضی اللہ عنہ کی روایت میں ممانعت نہیں آئی ہے۔ بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ یہ وہ لوگ کرتے ہیں جو بے خبر ہیں۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ یہ کام وہ لوگ کرتے ہیں جو بے علم اور جاہل ہیں اور یہ کہ یہ کام اہل علم اور سادات کا نہیں کہ وہ اس کام میں وقت صرف کریں۔ اس معنی میں عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت بیان ہوئی ہے۔ یعنی یہ ممانعت کا حکم صرف ہاشمیوں کے ساتھ خاص ہے۔ دوسرے تمام لوگ اس حکم میں شامل نہیں یعنی انھیں رخصت ہے۔ اہل بیت کو صرف تین چیزوں میں دوسروں سے ممتاز کیا گیا ہے۔ ایک اسباغ الوضوء، یعنی ہر عضو کو تین بار ضرور دھوئیں جب کہ دوسرے (غیر ہاشمی) اگر ایک ایک دو دو بار بھی دھولیں تو مضائقہ نہیں۔ دوسرے یہ کہ صدقہ نہیں کھاتے اور گھوڑے گدھے میں جفتی نہیں کراتے۔ یہ حکم ہاشمیوں کے لیے ان کے شرفِ شان کی وجہ سے ہے کسی معصیت کی وجہ سے یہ تخصیص نہیں۔ اگر اس میں معصیت کو دخل ہوتا تو ہاشمیوں کی تخصیص نہ ہوتی کہ اوامر ونواہی میں امت محمدیہ برابر ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ گھوڑے اور گدھے کی جفتی کرانا اور اسباغ الوضوء نہ کرنا ہاشمیوں کی علوِ شان کے خلاف ہے۔ غیر ہاشمی اس حکم سے الگ ہیں۔ ہاشمیوں کے لیے ان تینوں باتوں کا حکم ان کی شان کی وجہ سے باقی ہے اور یہی ہمارا مدعا ہے۔

ثانیاً: یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول ''یہ کام وہ کرتے ہیں جو بے علم ہیں'' کا مطلب یہ ہے کہ جو یہ کام کرتے ہیں وہ نہیں جانتے کہ گھوڑوں کے استعمال میں کتنا اجر ہے۔ جو خچروں وغیرہ کے استعمال میں نہیں اگر انھیں اس کے صحیح اجر کا پتہ ہوتا تو کبھی بھی خچروں کی طرف راغب نہ ہوتے۔ گھوڑوں سے لگاؤ اور اس سے رغبت سے متعلق بہ کثرت حدیثیں آئی ہیں۔ ان میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کی یہ دو حدیثیں بڑی مشہور میں جو صحاح ستہ میں موجود ہیں۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گھوڑوں سے متعلق پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ تین طرح کے لوگوں کے لیے ہیں کسی کے لیے باعث اجر ہیں اور کسی کے لیے باعثِ زینت اور کسی کے لیے وبالِ جان اور ہلاکت خیز۔ پھر لوگوں نے گدھے سے متعلق پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گدھے کے فائدے سے متعلق۔ اس آیت کے علاوہ مجھ پر اور کچھ نازل نہیں ہوا:

﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝﴾

(جس نے ذرہ برابر بھی نیکی کی وہ اس کا اجر پائے گا اور جس نے ذرہ برابر بھی برائی کی اسے بھی دیکھے گا۔)

❶ سنن أبي داؤد، بَابٌ فِي كَرَاهِيَةِ الْحُمُرِ تُنْزَى عَلَى الْخَيْلِ، رقم:٢٥٦٥

یہ حدیث صحاح ستہ میں مذکورہ ہے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ گھوڑے کے ساتھ شغف میں قیامت تک بھلائی ہی بھلائی ہے۔ یہ حدیث بھی صحاح وسنن میں موجود ہے۔

امام طحاوی ''شرح معانی الآثار'' میں لکھتے ہیں اگر کوئی کہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اس قول کا کیا مطلب ہے کہ ''نادان ایسا کرتے ہیں۔'' تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ علماء کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ گھوڑے کے حصول اوراس کے استعمال میں جواجر اور فائدہ ہے وہ خچر میں نہیں۔ اسی وجہ سے نبی ﷺ نے فرمایا کہ گھوڑے کے فوائد بہت ہیں۔ یہ نسبت خچر کے جو گدھے اور گھوڑے کے ملاپ سے نادان لوگ حاصل کرتے ہیں۔ گویا وہ ایسی چیز پر توجہ نہیں کرتے جس میں اجر ہے بلکہ ایسی چیزوں پر توجہ دیتے ہیں جس میں اجر نہیں۔

ثالثاً: یہ کہ نبی ﷺ کے زمانے میں بنی ہاشم کے پاس گھوڑے بہت کم تھے۔ اس لیے آپ ﷺ نے یہ فرمایا تاکہ خچر کے مقابلے میں گھوڑے کی نسل پر توجہ دی جائے اوراس طرح ان کی افزائش ہو۔

امام طحاوی رحمہ اللہ نے ''شرح معانی الآثار'' میں عبید اللہ بن عبد اللہ کے واسطے سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمارے لیے (اہل بیت کے لیے) تین باتیں خاص کردی ہیں۔ اوّل یہ کہ ہم صدقہ نہ کھائیں۔ اچھی طرح وضوء کریں اور گھوڑے اور گدھے میں جفتی نہ کرائیں۔ راوی کہتے ہیں کہ میری عبد اللہ بن حسن سے ملاقات ہوئی۔ آپ بیت اللہ کا طواف فرمارہے تھے۔ میں نے ان سے یہ باتیں کیں۔ انھوں نے اس کی تصدیق کی اور کہا بنی ہاشم چاہتے تھے کہ گھوڑے کی نسل بڑھے۔ عبد اللہ بن حسن کی توجیہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گھوڑے اور گدھے کی جفتی کرانے کو حرام نہیں قرار دیا تھا۔ بلکہ گھوڑی کی قلت کی وجہ سے یہ بات کہی تھی پھر جب یہ علت دور ہوگئی تو اس سے کوئی چیز مانع نہ رہی۔ نیز یہ کہ اس عمل سے صرف بنی ہاشم کو روکا گیا ہے یعنی دوسروں کے لیے یہ عمل مباح ہے۔ (فتاویٰ عظیم آبادی، ص: ۳۲۶ تا ۳۳۰)

انجکشن کے ذریعے جانوروں کو حاملہ کرنا

سوال: جانوروں کو انجکشن کے ذریعے حاملہ کرنا جائز ہے یا ناجائز؟ (محمد ناصر منجاکوٹی دربند) (۱۰ نومبر ۱۹۹۵ء)

جواب: سابقہ دلائل سے جب مصنوعی نسل کشی کا جواز نکل آیا تو انجکشن کے ذریعے جانور کو حاملہ کرنے کا جواز بھی خود بخود ثابت ہوگیا[1]۔ کیونکہ ہر دو صورتوں میں مقصود مادۂ تولید کی منتقلی ہے۔ چاہے غیر معروف طریقہ سے ہی کیوں نہ ہو۔

[1] راقم کے خیال میں جانور کو بذریعہ انجکشن حمل ٹھہرانا علی الاطلاق جائز نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ یہ صرف اس صورت میں جائز ہونا چاہیے جب کہ مادہ جانور کو کسی مرض کی وجہ سے معروف طریقے کے مطابق حمل نہ ٹھہرتا ہو۔ اس لیے کہ جانور کو بغیر کسی وجہ کے اس کے ''حقِ استلذاذ'' سے محروم کرنا شرعاً مناسب اور درست نہیں کیونکہ شریعت نے انسان پر انسانوں کے علاوہ جانوروں کے بھی کچھ حقوق مقرر کررکھے ہیں۔ جن کا اسے خیال رکھنا چاہیے۔ (نعیم الحق نعیم)

انجکشن سے جانور کو حاملہ کرنا

سوال : انجکشن کے ذریعے گائے یا بھینس وغیرہ میں بچوں کی پیدائش کا طریقہ کیا ہے؟ جائز ہے یا نہیں؟

(نیاز محمد، تحصیل و ضلع بھکر) (۲۸ جون ۱۹۹۶ء)

جواب : بوقتِ ضرورت گائے اور بھینس وغیرہ کو انجکشن کے ذریعہ حاملہ کرنا جائز ہے۔ تفصیل ''الاعتصام'' کی کسی اشاعت میں ہو چکی ہے۔

انجکشن کے ذریعہ جانور سے دودھ حاصل کرنا

سوال : انجکشن لگا کر بھینس، گائے وغیرہ سے دودھ حاصل کرنا (دوہنا) جائز ہے یا حرام؟ دلیل کے ساتھ وضاحت کریں۔ (نیاز محمد، تحصیل و ضلع بھکر) (۲۸ جون ۱۹۹۶ء)

جواب : بوقتِ ضرورت انجکشن کے ذریعہ بھینس گائے وغیرہ کے دودھ کو حاصل کرنے کا جواز ہے۔ بشرطیکہ مالک نے جانور کو چارہ کا حق پورا ادا کیا ہو۔ کتب احادیث میں موجود ہے کہ نبی ﷺ سے ایک اونٹ نے شکایت کی تھی کہ مالک چارہ کم دیتا ہے اور کام زیادہ لیتا ہے۔ اس پر آپ ﷺ نے مالک کو تنبیہ فرمائی تھی۔

(ملاحظہ ہو مشکوٰۃ باب المعجزات)

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ حق کی ادائیگی کی صورت میں انسان ہر ممکنہ صورت میں جانور سے اپنا حق وصول کر سکتا ہے۔ یہاں وہ دودھ مراد ہے جو انسانی خوراک کا اہم ترین جز ہے۔ قرآن مجید میں رب العزت نے اسے بطورِ امتنان و احسان بیان فرمایا ہے:

﴿وَ اِنَّ لَکُمْ فِی الْاَنْعَامِ لَعِبْرَۃً نُسْقِیْکُمْ مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَیْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِیْنَ﴾ (النحل:٦٦)

''اور تمہارے لیے چارپایوں میں بھی (مقام) عبرت (وغور) ہے کہ ان کے پیٹوں میں جو گوبر اور لہو ہے۔ اس کے درمیان سے ہم تم کو خالص دودھ پلاتے ہیں جو پینے والوں کے لیے خوشگوار ہے۔''

ممنوحہ (عطا کردہ) جنگلات میں تبدیلی کا مطالبہ صحیح نہیں

سوال : علاقہ کوہستان کے جنگلات خوڑگئی و مرجونہ واقع رقبہ پالس تحصیل ٹین میں آج سے کچھ عرصہ قبل مندرجہ ذیل چار قبائل کے حصے میں آٹھواں حصہ تقسیم کیا گیا اور باقی سات حصے دوسری قوموں کو دیے گئے تھے۔

۱۔ کمال خیل

۲۔ چوتھا خیل فرائے خیل بھٹکہ

۳۔ اسحاق خیل

۴۔ فقیر خیل

مذکورہ بالا چار قبائل کو حصہ بحصہ برابر دیا گیا۔ اس پر خرچ بھی برابر کرتے رہے اور آمدن بھی برابر لیتے رہے۔ اور یہ سلسلہ آباؤ اجداد سے جاری رہا۔ اب ان قبائل میں بعض کے افراد بڑھ چکے اور بعض کے کم ہیں۔ زیادہ افراد والے مطالبہ کرتے ہیں کہ اب ہمیں افراد کی تعداد کے مطابق حصہ دیا جائے جب کہ دوسرے فریق سابق تقسیم کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ براہِ مہربانی قرآن وسنت کی روشنی میں وضاحت فرمائیں کہ اب یہ مسئلہ کیسے حل ہوگا۔

(سائل سرفراز کوہستانی) (۳ستمبر ۱۹۹۳ء)

جواب : علاقہ کوہستان کے جنگلات کا آٹھواں حصہ جو مذکورہ چار قبائل میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عطیہ حکومت یا جرگہ وغیرہ کی طرف سے ملا ہوگا بحتہ مساوی جب ان میں تقسیم کردیا گیا تو ہر ایک کے قبضہ میں جو کچھ آیا، شرعی طور پر وہ اس کا مستقل مالک ہے۔ اب ہر ایک کا دوسرے پر حق دعویٰ وجہ چاہے کوئی بھی ہو فضول اور ناقابلِ التفات ہے۔

لہٰذا مدعیان کو چاہیے کہ اپنا دعویٰ واپس لے کر اولاد کے لیے حصولِ رزق حلال کی نئی راہیں تلاش کریں۔ رب العزت کا قرآن کریم میں وعدہ ہے:

﴿ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ﴾ (الطلاق:۲، ۳)

''اور جو کوئی اللہ سے ڈرے گا وہ اس کے لیے (رنج ومحن) سے مخلصی (کی صورت) پیدا کردے گا۔ اور اس کو ایسی جگہ سے رزق دے گا جہاں سے (وہم و) گمان بھی نہ ہو۔ اور جو اللہ پر بھروسہ رکھے گا۔ تو وہ اس کو کفایت کرے گا۔ اللہ اپنے کام کو (جو وہ کرنا چاہتا ہے) پورا کردیتا ہے۔ اللہ نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔''

یہ بھی یاد رہے اگر ان جنگلات کی حیثیت مستقل ملک کی نہ ہو بلکہ مجرد انتفاع کی خاطر ان کے حوالے کیے گئے ہوں تو اندریں صورت مخولہ ذریعہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے وہ جیسے مناسب سمجھے ان میں تصرف کرسکتا ہے۔ (وَاللّٰهُ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى اَعْلَمُ وَ عِلْمُهٗ اَتَمُّ.)

اعمالِ صالحہ پر اتقاء (بھروسہ کرنے کا) مسئلہ

سوال : کوئی ایسا عمل یا کوئی ایسا طریقہ یا ایسا ذریعہ بتلایے کہ جس سے انسان کا جنت میں جانا یقینی ہوجائے۔

(محمد مسعود آثم) (۳۱ جولائی ۱۹۹۲ء)

جواب : کتب احادیث میں موجود صبح وشام کے وظائف کا اہتمام بالعموم اور سید الاستغفار کا التزام بالخصوص ہونا چاہیے جس کے الفاظ یوں ہیں:

«اللّٰهُمَّ أَنْتَ رَبِّی لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ، خَلَقْتَنِی وَأَنَا عَبْدُكَ، وَأَنَا عَلٰی عَهْدِكَ وَوَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ، أَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ، أَبُوءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَیَّ، وَأَبُوءُ لَكَ بِذَنْبِی فَاغْفِرْ لِی، فَإِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ » [1]

نبی ﷺ نے فرمایا جس نے صبح کے وقت یقین سے یہ کلمات کہے اور اس روز وہ شام سے پہلے مرگیا۔ سو وہ اہل جنت سے ہے اور جس نے شام کے وقت یقین سے یہ کلمات کہے اور اُسی رات وہ صبح سے پہلے مرگیا سو وہ اہل جنت سے ہے۔''

محض اعمال پر بھروسہ کر کے بیٹھ رہنا مومن کی شان سے بعید ہے۔ رب العزت کی بہشت رجاء اور خوف کے درمیان ہے۔ مسلسل عمل جدوجہد تادمِ مرگ جاری رہنی چاہیے۔

حدیث میں ہے کہ کوئی شخص صرف نیک عملوں کی وجہ سے جنت میں داخل نہیں ہو سکے گا۔ جب تک اللہ کی رحمت شامل حال نہ ہو۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی ''صحیح'' میں بایں الفاظ تبویب قائم کی ہے:

بَابُ خَوْفِ الْمُؤْمِنِ مِنْ أَنْ يَحْبَطَ عَمَلُهُ وَهُوَ لَا يَشْعُرُ ۔ وَقَالَ إِبْرَاهِيمُ التَّيْمِیُّ: مَا عَرَضْتُ قَوْلِی عَلٰی عَمَلِی إِلَّا خَشِيتُ أَنْ أَكُونَ مُكَذِّبًا وَقَالَ ابْنُ أَبِی مُلَيْكَةَ: أَدْرَكْتُ ثَلَاثِينَ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، كُلُّهُمْ يَخَافُ النِّفَاقَ عَلٰی نَفْسِهِ، مَا مِنْهُمْ أَحَدٌ يَقُولُ: إِنَّهُ عَلٰی إِيمَانِ جِبْرِيلَ وَمِيكَائِيلَ وَيُذْكَرُ عَنِ الْحَسَنِ مَا خَافَهُ إِلَّا مُؤْمِنٌ وَلَا أَمِنَهُ إِلَّا مُنَافِقٌ. »

یعنی مومن کا اس بات سے ڈرنا کہ عدمِ شعور میں کہیں اس کے اعمال ضائع نہ ہو جائیں۔ ابراہیم تیمی نے کہا جب میں نے اپنے قول کو عمل پر پیش کیا تو مجھے خوف لاحق ہوا کہیں عمل سے اپنی بات کی خود ہی تو تکذیب نہیں کر رہا اور ابن ابی ملیکہ کا بیان ہے میں نے تیس صحابہ کو پایا جو سب کے سب اپنی جانوں پر نفاق سے خوف زدہ تھے ان میں سے کوئی بھی یہ بات نہیں کہتا تھا کہ اس کا ایمان جبریل اور میکائیل فرشتوں جیسا ہے حضرت حسن سے بیان کیا جاتا ہے اللہ سے صرف مومن ڈرتا ہے اور منافق اپنے کو اس سے اَمن میں سمجھتا ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّتٰنِ﴾ (الرحمن:٤٦)

﴿فَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ (الاعراف: ٩٩)

بعض سلف فرمایا کرتے تھے کاش مجھے یقین ہو جائے کہ رب نے میری زندگی بھر کی صرف ایک نماز قبول کر لی ہے۔ اس لیے بے فکری کا کبھی نہ سوچیں۔ پیش آمدہ مسافت کے مراحل بڑے پرخطر ہیں۔ ان سے بچاؤ کی سعی و تدبیر

[1] صحیح البخاری، بَابُ أَفْضَلِ الِاسْتِغْفَارِ، رقم:٦٣٠٦

لحہ ہونی چاہیے۔ ﴿ إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴾ (المائدة:٢٧)

مدارس کے طلبہ کو کھانا کھلانا

سوال : مسکین کون لوگ ہیں۔ کیا مدارس میں پڑھنے والے بیرونی طلباء کو کھانا کھلانے سے مسکینوں کے کھانا کھلانے کا حق ادا ہو جاتا ہے۔ (ایک اللہ کا بندہ) ۱۳ستمبر ۱۹۹۱ء

جواب : مسکین وہ لوگ ہیں جن کی گزر اوقات بمشکل ہو۔ مدارس میں پڑھنے والے سبھی طلبہ پر اس کا اطلاق نہیں ہوگا۔ اس زمرہ میں صرف وہی داخل ہوں گے جو اس صفت سے واقعتاً متصف ہوں۔

یہ کہنا کہ اگر میں فلاں کام کروں تو کافر ہو جاؤں:

سوال : زید نے کہا کہ اگر میں فلاں کام کروں تو کافر ہو جاؤں۔ پھر وہ یہ کام بھی کر لیتا ہے تو کیا وہ کافر ہو جائے گا؟

جواب : ایسے شخص کو اپنے فعل سے تائب ہونا چاہیے اور اگر وہ اس پر مصر ہو اور توبہ کے لیے تیار نہ ہو تو اس کا عود الی الکفر ہوگا۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَ الَّذِيْنَ إِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوْٓا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَ مَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا اللّٰهُ وَ لَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ (آل عمران:١٣٥)

''اور وہ کہ جب کوئی کھلا گناہ یا اپنے حق میں کوئی اور برائی کر بیٹھتے ہیں تو اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں اور اللہ کے سوا گناہ بخش بھی کون سکتا ہے اور جان بوجھ کر اپنے افعال پر اڑے نہیں رہتے۔''

مروجہ دست بوسی اور قدم بوسی وغیرہ کا شرعی حکم

سوال : کسی نیک بزرگ یا پیر یا پیشوا کے ہاتھ اور پاؤں کو تعظیماً بوسہ دینا درست ہے یا نہیں کیونکہ ابوداؤد شریف ج:۳ حدیث نمبر ۵۱۸۴ میں ہے کہ کچھ لوگ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نبی اکرم ﷺ کے ہاتھ اور پاؤں کو بوسہ دیا کیا ہم بھی کسی نیک سیرت بزرگ کے ہاتھ اور پاؤں کو بوسہ دے سکتے ہیں۔

(سائل: محمد احمد قلعہ کالر والا تحصیل پسرور ضلع سیالکوٹ) (۷ستمبر ۱۹۹۰ء)

جواب : امام ابوداؤد نے اپنی ''سنن'' میں کئی احادیث نقل کی ہیں۔ جن میں رسولِ کریم ﷺ کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت کی ان صورتوں کا ذکر ہے جن میں صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ کے ہاتھ، پاؤں یا جسم کو بوسہ دیا۔ اسی طرح نبی ﷺ نے جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ماتھے پر بوسہ دیا اور انھیں اپنے ساتھ لگایا۔ اسی طرح آپ ﷺ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو چوما کرتے تھے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ملاقات میں دونوں کا آپس میں چومنا ثابت ہے۔ سوال میں جس

روایت کی طرف اشارہ ہے وہ وفد عبدالقیس کا واقعہ ہے جس میں ایک شخص منذر الاشج بھی تھا۔ لیکن دوسرے ساتھیوں کے رسول اللہ ﷺ کی طرف لپک کر بوسے دینے کے باوجود اس شخص نے تحمل اور وقار کا مظاہرہ کیا اور تسلی سے اپنا سامان اور سواری باندھ کر نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور دوسروں کو بوسوں سے اظہارِ محبت کے باوجود منذر کے تحمل اور تسلی سے کام کرنے کی تعریف فرمائی۔ (سنن ابی داؤد مع عون المعبود، ج:۴ ص:۵۲۳ تا ۵۲۶)

مذکورہ بالا احادیث میں ذکر کردہ واقعات محبت کی علامات ہیں اور رسولِ کریم ﷺ کی محبت دین کی اصل ہے جیسا کہ حدیث میں ہے:

«لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهٖ وَ وَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ» [1]

اور بخاری ہی کی ایک دوسری حدیث میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو آپ نے یہ وضاحت بھی فرمائی کہ اگر کوئی شخص اپنی جان سے بھی زیادہ نبی ﷺ سے پیار نہ کرے تو وہ بھی مومن نہیں۔''

یہ محبت اگرچہ رسول اللہ ﷺ کا خاصہ ہے جو کسی اور سے نہیں کی جا سکتی تاہم وہ افعال جو محبت کا مظہر ہیں۔ دوسروں کے ساتھ بھی انجام دیے جا سکتے ہیں جیسا کہ اپنی اولاد کے ہاتھ پاؤں چومنا پیار کی نشانی ہے۔ اور خود نبی ﷺ نے اس کی ترغیب فرمائی ہے اور ایسی چیزوں سے محرومی بے رحمی پر محمول کی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ہمارا یہی وطیرہ بزرگوں اور پیروں سے روا ہے بظاہر اگر اس کی وجہ دین کی محبت اور علم کا احترام ہو تو یہ صورت جائز معلوم ہوتی ہے لیکن بعض کام مختلف پہلوؤں کے حامل ہوتے ہیں۔ ایک پہلو سے پسندیدہ ہونے کے باوصف دوسرے پہلو سے خرابیوں کا باعث ہوتے ہیں یا کسی بڑے گناہ سے مشابہت ہو سکتی ہے تو برائی کے ذرائع بند کرنے کے لیے اہل علم اس سے روکتے بھی ہیں۔ جیسے کسی پیر، فقیر کے پاؤں کو بوسہ دینے کے لیے جھکنے کی صورت سجدہ کے مشابہ ہے۔ اور محمد ﷺ کی کامل شریعت میں اسی وجہ سے سجدہ تعظیمی تک کو شرک قرار دیا گیا ہے۔

امام شاطبی رحمہ اللہ وغیرہ نے بدعت کی بحث میں ایک بدعت اضافی کا ذکر کیا ہے جس کی تعریف ایسا کام ہے جو کتاب و سنت کی طرف منسوب ہو، لیکن شریعت کی مقررہ حدود سے متجاوز ہو جائے۔ سلف صالحین سے اس احتیاط کے پیش نظر ایسی چیزوں کو چھوڑنا یا مٹا دینا بھی ثابت ہے۔ جس سے عوام حدودِ شرعیہ کا پاس نہ رکھیں جیسے کہ صلح حدیبیہ کے وقت جس درخت کے نیچے چودہ سو صحابہ رضی اللہ عنہم نے نبی ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی جب بعد میں اُس کو دیکھنے کے لیے عوام اہتمام کرتے نظر آئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس درخت کو ہی کٹوا دیا۔

امام شاطبی رحمہ اللہ اولیاء اللہ کی تعظیم میں ان کی پیروی کی تاکید کرتے ہیں لیکن ان کو چومنا چاٹنا بدعات اضافیہ میں سے شمار کرتے ہیں۔ کیونکہ امام مالک رحمہ اللہ نے بزرگوں کی تعظیم کی غرض سے ان کے ہاتھوں کا بوسہ برا جانا ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، بَابٌ: حُبُّ الرَّسُوْلِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الإِيمَانِ، رقم: ١٤

اور امام سلیمان بن حرب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہاتھ کا بوسہ ایک چھوٹا سجدہ ہے۔ اسی طرح حافظ ابن عبدالبر نے بعض اسلاف سے نقل کیا ہے بلکہ اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے ہاتھوں کو بوسہ دینا چاہا تو اس شخص کو ایسا کرنے سے منع کر کے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ اور کہا کہ یہ کام عربوں میں ہلکا آدمی کرتا ہے، اور عجم میں ذلیل آدمی، یہی وجہ ہے کہ علماء ایسے کام کی خواہش رکھنے والے کو تکبر کا مریض قرار دیتے ہیں کہ اس غرض سے اپنے ہاتھوں کو لوگوں کے سامنے کرنا بالاتفاق مکروہ ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، الابداع فی مضار الابتداع، ص: ۱۹۲_۱۹۳)

شرک کی تاریخ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ابتداء نیک لوگوں کے ساتھ عقیدت کے ایسے اظہار سے ہوئی جو بظاہر ان کی نیکی کی عظمت کا اعتراف تھا جو بعد میں ان سے متعلقہ تصاویر اور قبروں کے احترام کی ایسی صورتیں اختیار کرتا رہا۔ جنھیں شریعت کی تکمیل میں بالآخر منع کر دیا گیا۔ لہٰذا تصویر کشی اب بدترین عذاب کی وعید کا مستوجب ہے تو خاص قبروں کی زیارت کے لیے سفر کرنے کی سختی سے ممانعت آئی ہے۔ آج کل مختلف تہذیبوں میں میل ملاقات کے آداب سے بعض لوگ ایک دوسرے کو بوسے بھی دیتے ہیں جس سے مقصد خلوص و محبت کا اظہار ہوتا ہے ایسا اظہار چونکہ تکبر کی بنا پر نہیں ہوتا۔ لہٰذا اسے بھی مکروہ نہیں کہا جا سکتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ دست بوسی اور قدم بوسی کی اجازت یا تو صرف محبت کی غرض سے ہو سکتی ہے جیسے انسان اپنے بچوں سے کرتا ہے یا نبی ﷺ کے ایسے احترام کی صورت میں جو عظمت رکوع اور سجود کے شبہ سے خالی ہو۔ فتنوں کے اس دور میں ایسے آداب جن سے مقررہ حدود سے تجاوز کرنے کا خطرہ ہو یا عوام کے شرک و بدعت میں مبتلا ہونے کا خوف ہو۔ احتراز ہی کرنا چاہیے۔ (واللہ اعلم بالصواب)

مزید تحقیق اور تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو التعليقات السلفية علی سنن النسائی للشيخ محمد عطا الله حنيف بهوجيانی رحمه الله رقم حدیث: ۴۰۸۳) نیز ملاحظہ ہو مولانا رحمہ اللہ کا مضمون "مروجہ قدم بوسی کی شرعی حیثیت" شائع شدہ الاعتصام جلد: ۳۵، ۹ مارچ ۱۹۸۴ء، ص: ۸۱_۸۲۲)

مروّجہ قدم بوسی کی شرعی حیثیت

(از مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ)

سوال: دورانِ سفر ایک مولوی صاحب کو دیکھا گیا کہ معتقدین ان کے پاؤں، گھٹنے اور ہاتھ چوم رہے ہیں۔ میں نے اس پر اعتراض کیا تو انھوں نے اس کے ثبوت میں ایک دو روایتیں لکھ کر مجھے دیں جو یہ ہیں:

وَ عَنْ بُرَيْدَةَ بْنِ الْحُصَيْبِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ قَالَ سَأَلَ اَعْرَابِيٌّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ آيَةً تَدُلَّ عَلٰى اَنَّهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَهُ قُلْ لِتِلْكَ الشَّجَرَةِ رَسُوْلُ اللّٰهِ يَدْعُوْكَ فَدَعَاهَا فَمَالَتِ الشَّجَرَةُ عَنْ يَمِيْنِهَا وَ شِمَالِهَا وَ بَيْنَ

يَدَيْهَا وَ خلفها فَتَقَطَّعَت عُرُوْقُهَا ثُمَّ جَاءَ تْ تنحد الارض تبحر عروقها مغبرة حَتّٰى وَقَفَتْ بَيْنَ يَدَىْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ « اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ» قَالَ الْاَعْرَابِيُّ مُرْهَا فَلْتَرْجِعْ اِلٰى مَنْبَتِهَا فَرَجَعَتْ فَدَلَّتْ عُرُوْقُهَا فَاسْتَوَتْ فَقَالَ الْاَعْرَابِيُّ اِئْذَنْ لِيْ اَنْ اَسْجُدَ لَكَ (اَىْ بَعْدَ اَنْ اٰمَنَ كَمَا صَرَّحَ فِي رِوَايَةٍ) فَقَالَ لَهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ اَمَرْتُ اَحَدًا اَنْ يَسْجُدَ لِاَحَدٍ لَاَمَرْتُ الْمَرْاَةَ اَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا فَقَالَ الْاَعْرَابِيُّ فَاْذَنْ لِي اُقَبِّلَ يَدَيْكَ وَ رِجْلَيْكَ (رواہ البزار)

و اخرجه العلامه زينى دحلان المكى ،ص:۳۰۳، ج:۲)

وَ فِي السِّيْرَةِ اَيْضًا وَ شَرْحِ الْمَوَاهِبِ فِي قِصَّةِ وَفْدِ عَبْدِ الْقَيْسِ. اِنَّهُمْ دَخَلُوْا عَلَى النَّبِيِّ فَتَبَادَرُوْا يُقَبِّلُوْنَ يَدَهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَ رِجْلَهٗ ......الخ(ص:۱۵۰، ج:۳) وَ فِي الدُّرِ الْمُخْتَارِ طَلَبُ مِنْ عَالِمٍ اَوْ زَاهِدٍ اَنْ يَدْفَعَ اِلَيْهِ قَدَمَهٗ وَ يُمَكِّنَهٗ مِنْ قَدَمِهٖ لِيُقَبِّلَهٗ اَجَابَهٗ وَ قِيْلَ لَا يُرَخَّصُ......

وَ فِي رَدِّ الْمُخْتَارِ يَدْفَعُ اِلَيْهِ قَدْمَهٗ اَجَابَهٗ لِمَا اَخْرَجَهُ الْحَاكِمُ اَنَّ رَجُلًا اَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! اَرِنِيْ شَيْئًا اَزْدَادُ بِهٖ يَقِيْنًا فَقَالَ اِذْهَبْ اِلٰى تِلْكَ الشَّجَرَةِ ...... فَادْعُهَا فَذَهَبَ اِلَيْهَا فَقَالَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ يَدْعُوْكَ فَجَاءَ تْ حَتّٰى سَلَّمَتْ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَهَا ارْجِعِيْ فَرَجَعَتْ قَالَ ثُمَّ اَذِنَ لَهٗ فَقَبَّلَ رَأْسَهٗ وَرِجْلَيْهِ وَ قَالَ الْحَاكِمُ صَحِيْحُ الْاِسْنَادِ. (شامی ،ص: ۳۷۸، ج:۵)

براہِ کرم ارشاد فرمائیں کہ ان کی استنادی حیثیت کیا ہے؟ ساتھ میں اصل مسئلہ پر ممکن روشنی ڈال دیجیے گا۔

(بندہ محمد بشیر لکی شاہ صدر، ضلع دادو، سندھ)

جواب: (ا) اس بارے میں اصل امر ثابت صرف مصافحہ ہے بکثرت احادیث اس کے ثبوت وفضیلت میں وارد ہیں اور اسی پر صحابہ رضی اللہ عنہم کا عمل تھا۔ کسی صحیح حدیث میں یہ ذکر نہیں کہ صحابہ کرام مصافحہ کے علاوہ تعظیماً آنحضرت ﷺ کے یا آپس میں ایک دوسرے کے ہاتھ پاؤں چومتے ہوں۔

علامہ محمد منیر دمشقی رحمہ اللہ، شرح ''عمدۃ الاحکام'' کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

« لَمْ يَرِدْ فِي الصَّحِيحِ اَنَّ اَحَدًا مِنَ الصَّحَابَةِ كَانَ يُقَبِّلُ يَدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَا يُقَبِّلُ بَعْضُهُمْ يَدَ بَعْضٍ.» (ص:۴۳، ج:۳)

(۲) بعض روایات میں ہاتھ چومنے کے دو تین شاذ واقعے ملتے ہیں اگر ان کی روایتی حیثیت کچھ ہو بھی تو وہ غیر

ارادی طور پر محض اظہارِ محبت پر محمول ہوں گے جیسا کہ عربوں میں ایسا قومی رواج تھا۔ اور اب بھی غالباً پایا جاتا ہے کہ وہ پیشانی، پہلو، شانے وغیرہ ملاقات کے وقت بعض دفعہ چومتے ہیں بلکہ رخسار بھی۔ چنانچہ یہ واقعات بھی بالکل تازہ اسلام قبول کرنے والے لوگوں سے واقع ہوئے ہیں اور آں حضرت ﷺ نے معمول کے مطابق ہونے یا بعض مصالح کی بنا پر ان کو روکا نہیں لیکن اس کو امر تشریعی سے کوئی تعلق نہیں، ورنہ اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم آپ سے یہ معاملہ عموماً کرتے جس کا صریح و صحیح ثبوت کوئی نہیں۔

علاوہ ازیں جھک کر ہاتھ چومنے کا ذکر ان روایات میں بھی نہیں جیسا کہ پیر پرست حلقوں کا معمول ہے۔

(۳) مروجہ قدم بوسی اور گھٹنوں بوسی کی مشروعیت پر کوئی دلیل نہیں جو دو روایتیں آپ کو دی گئی ہیں، ان میں سے کوئی بھی پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتی۔ نہ وہ مروجہ قدم بوسی کی دلیل ہوسکتی ہے۔

(الف) بریدہ والی روایت کی سند میں صالح بن حیان ایک راوی ہے جو سخت مخدوش ہے۔ ''مجمع الزوائد'' (ص:۱۰،ج:۹) میں ہے: «رَوَاهُ الْبَزَّارُ وَفِيْهِ صَالِحُ بْنُ حَيَّان وَ هُوَ ضَعِيْفٌ» ''تقریب التھذیب'' (ص:۸۷) میں ہے: «ضَعِيْفٌ» امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: «فِيهِ نَظَرٌ» (یہ بھی محلِ نظر ہے) (تاریخ صغیر، ص:۷۵)، التعلیقات السّلفیہ علی سنن نسائی (ص:۱۶۵،ج:۲) میں بحوالہ ''میزان الاعتدال''، حافظ ذہبی اور ''تہذیب حافظ ابن حجر، امام ابن معین، امام ابوداؤد، امام بخاری، امام نسائی، حافظ ابن حبان، حافظ دارقطنی، حربی سے اس کی سخت تضعیف نقل کی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ روایت سخت مخدوش ہے۔ رہی امام حاکم کی تصحیح تو ان کا تساہل مشہور ہے۔ اس بارے میں اہلِ فن ان پر اعتبار نہیں کرتے۔ اس لیے روایت ناقابلِ اعتماد ہی قرار پاتی ہے۔

(ب) وفد عبد القیس والی روایت بھی قابلِ حجت واعتماد نہیں۔ اس کی سند میں مطر بن عبد الرحمٰن الاعنق ایک راوی ہے جس کے متعلق ''سنن نسائی'' کے حاشیہ پر ''تہذیب'' (ص:۱۴،ج:۱) کے حوالہ سے لکھا ہے: «يَرْوِی الْمَقَاطِعَ» (التعلیقات السلفیه علی سنن النسائی، ص:۱٦۵، ج:۱) ''یہ راوی مقطوع روایتیں بیان کرتا ہے۔''

(ج) یہ واقعہ بھی عرب کی قومی عادت کی بناء پر فرطِ محبت کے نتیجے میں ہوگیا ہے۔ بطورِ امر شرعی نہیں۔ قرینہ اس پر یہ ہے کہ یہ وفد حدیث العہد بالاسلام (اسلام کے شروع زمانہ میں) تھا۔ ایسی معمولی باتوں کو ابتداء میں آں حضرت ﷺ نظر انداز فرما دیا کرتے تھے۔ ایسے ہی موقع کے لیے علماء کا اصول ہے: «وَاقِعَةُ عَيْنٍ لَا عُمُوْمَ لَهَا» (ایک اتفاقی واقعہ سے عموم ثابت نہیں ہوتا) (۹ مارچ ۱۹۸۴ء)

کیا کراماً کاتبین غیبی اُمور کا علم رکھتے ہیں؟

سوال: کراماً کاتبین قلبی اعمال پر بھی مطلع ہو جاتے ہیں، یا عملی صورت میں ظہور کے بعد؟

(سائل حبیب اللہ) (۱۳ جولائی ۱۹۹۰ء)

جواب : کتاب وسنت سے یہ بات بداہۃً معلوم ہے کہ دلوں کے بھیدوں سے صرف اللہ عزوجل ہی واقف ہے اس کے سوا کوئی نہیں جانتا ہے۔ وہ فرشتے ہوں یا انس وجن وغیرہ۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِاجْهَرُوْا بِهٖ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ o اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ o﴾ (الملك:١٤)

''اور تم (لوگ) بات پوشیدہ کہو یا ظاہر وہ دل کے بھیدوں تک سے واقف ہے، بھلا جس نے پیدا کیا، وہ بے خبر ہے؟ وہ تو پوشیدہ باتوں کو جاننے والا اور ہر چیز سے آگاہ ہے۔''

اور صورتِ مرقومہ میں فرشتوں کی طرف جس علم کی نسبت کی گئی۔ یہ وہ علم ہے جو تجدد اور استمرار کی شکل میں معرضِ وجود میں آتا ہے۔ آیت کریمہ میں مضارع کے صیغوں کا استعمال بھی اس بات کی واضح دلیل ہے۔ اس لیے کہ صیغہ مضارع میں حال اور مستقبل کا زمانہ پایا جاتا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا:

﴿اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ o مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ o﴾ (ق:١٧۔١٨)

''جب (وہ کوئی کام کرتا ہے تو) دو لکھنے والے جو دائیں اور بائیں بیٹھے ہیں، لکھ لیتے ہیں کوئی بات اس کی زبان پر نہیں آتی مگر ایک نگہبان اس کے پاس تیار رہتا ہے۔''

لیکن اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ ''صحیح بخاری'' میں حدیث ہے۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے جب میرا بندہ برائی کا ارادہ کرتا ہے حکم ہوتا ہے کہ فرشتو! اسے تحریر میں مت لاناحتی کہ عمل کر گزرے، اگر یہ عمل کر لیتا ہے تو صرف ایک برائی لکھو۔ اور اگر اس نے میری رضا کی خاطر برائی کو ترک کر دیا تو اس کے لیے ایک نیکی لکھ دو۔ [1]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے باطنی قلبی امور پر مطلع ہو جاتے ہیں۔

اس اشکال کا جواب یوں ہے کہ یہاں فرشتوں کا قلبی امر پر مطلع ہونا اللہ کی طرف سے آگاہی پانے کی وجہ سے ہے۔ چنانچہ ''ابن ابی الدنیا'' نے ابوعمران الجونی سے بیان کیا ہے کہ بارگاہِ ایزدی سے آواز آتی ہے فلاں کے لیے اتنا اتنا ثواب لکھ دو۔ فرشتہ عرض کرتا ہے۔ اے پروردگار! اس نے تو یہ عمل کیا بھی نہیں۔ اللہ فرماتا ہے، اس نے نیت تو کر لی ہے۔ اور بعض نے یہ بھی لکھا ہے کہ برائی کی بدبو اور نیکی کی خوشبو کی وجہ سے فرشتوں کو معلوم ہو جاتا ہے۔ یا یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ فرشتے میں علم کا ادراک پیدا کر دیتا ہے، جس سے اس کو محسوس ہو جاتا ہے۔ بہرصورت وجہ کوئی بھی ہو، یہ بات مسلمہ ہے کہ دلوں کے راز صرف اللہ کے ہاں محفوظ ہیں اور وہی واقف ہے۔ اس کے سوا یہاں تک کسی کی رسائی نہیں۔ ﴿اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: فتح الباری، ج:١١،ص:٣٢٥)

---

[1] صحیح البخاری، کتاب التوحید، بَابُ قَوْلِ اللّٰهِ تَعَالَى: (يُرِيدُونَ أَنْ يُبَدِّلُوا كَلَامَ اللّٰهِ) (الفتح:١٥)، رقم:٧٥٠١

قربِ قیامت کی علامات، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول، ظہورِ مہدی کے بعد ہوگا؟

سوال: الاعتصام کے ۱۵ ستمبر کے شمارے میں ایک مضمون ''پندرہ خصلتیں'' کے عنوان سے چھپا تھا۔ اس کے حوالہ سے عرض ہے کہ یہ پندرہ کی پندرہ خصلتیں آج پوری امت میں موجود ہیں اور کچھ لوگ ان کو قربِ قیامت کی علامات بیان کرتے ہیں۔ کیا یہ درست ہے۔ دوسرے بریلوی حضرات چودھویں صدی کا بہت ذکر کرتے ہیں جو کہ اب گزر چکی بلکہ اگلی صدی کے دس سال بھی گزر گئے ہیں۔ اس کے بارے میں قرآن اور حدیث کا کیا فرمان ہے۔ دونوں باتوں کے بارے میں تفصیلاً الاعتصام میں جواب دے کر ممنون فرمائیں۔ (ساجد حفیظ، لاہور) (۸ جون ۱۹۹۰ء)

جواب: قربِ قیامت کی بہت ساری علامات ہیں، جن کا تذکرہ متعدد احادیث میں موجود ہے۔ ان میں سے بہت سی روایات کو حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ''النھایۃ'' میں جمع کر دیا ہے۔ کتاب ہذا پہلی دفعہ ۱۳۸۸ھ میں ریاض (سعودی عرب) سے دو جلدوں میں شائع ہو کر منظر عام پر آ چکی ہے۔ تصنیف لطیف بے حد مفید اور لائق مطالعہ ہے۔

بنا بریں محولہ بالا ''پندرہ خصلتیں'' بھی قربِ قیامت کی نشانیوں میں سے ہیں۔ اسی روایت کے آخر میں ہے۔ پھر یکے بعد دیگر بلا وقفہ علامات کا ظہور ہوگا۔ جس طرح تسبیح کا جواہر دھاگہ اور لڑی ٹوٹنے سے پے در پے دانے بکھر جاتے ہیں۔ صاحبِ مشکوٰۃ نے بھی اس روایت کو ''اشراط الساعۃ'' کے عنوان کے تحت بیان کیا ہے۔

(ملاحظہ ہو غزنوی ترجمہ مشکوٰۃ، ج:۴، ص:۱۰۱)

بعض آثار میں وارد ہے کہ دنیا کی کل عمر سات ہزار سال ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت چھ ہزار سال کے دوران ہے۔ مفسر سلیمان الجمل فرماتے ہیں، آثار سے پتہ چلتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی مدت ہزار سال سے متجاوز ہے۔ لیکن یہ زیادتی پانچ سو سال کو نہیں پہنچ سکے گی۔ موضوع ہذا پر علامہ سیوطی کی ایک تصنیف بنام الکشف عن مجاوزۃ هذه الامة الالف موجود ہے۔ (الفتوحات الالٰہیہ، ج:۴، ص:۴۱۳، طبع مصر)

انہی آثار پر اعتماد کرتے ہوئے بعض حضرات نے چودھویں صدی ہجری کی اہمیت اجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ تحدید کے بارے میں وارد آثار و اقوال لائق اعتنا و استناد اور قابلِ تسلی نہیں۔ قرآنی فیصلہ حتمی و یقینی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ﴾

(الاعراف:۱۸۷)

''یعنی (یہ لوگ) تم سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ اس کے واقع ہونے کا وقت کب ہے کہہ دو کہ اس کا علم تو میرے پروردگار ہی کو ہے۔ وہی اسے اس کے وقت پر ظاہر کر دے گا۔''

اور حدیث جبریل میں ہے آپ نے قیامت کے بارے میں سائل کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

« مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِاَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ »

''مسئول عنہ کو بھی سائل سے زیادہ علم نہیں۔''

حضرت عیسیٰ اور امام مہدی میں سے پہلے کون آئیں گے؟

سوال : حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا امام مہدی دونوں میں سے کون پہلے آئے گا اور حدیث نبوی میں اس بارے میں کیا ارشاد ہے؟ (ساجد حفیظ، لاہور) (۸ جون ۱۹۹۰ء)

جواب : حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ مسئلہ مہدی پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

« وَ اَظُنُّ ظُهُوْرَهٗ قَبْلَ نُزُوْلِ عِيْسٰى ابْنِ مَرْيَمَ كَمَا دَلَّتْ عَلٰى ذَالِكَ الْاَحَادِيْثُ »

''یعنی میرا خیال ہے مہدی کا ظہور حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام سے پہلے ہوگا، جس طرح کہ کئی ایک احادیث اس بات پر دال ہیں۔''

(بسط و تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، النہایۃ ص: ۲۷، تا ۳۳، اور عون المعبود، ج:۴، ص:۱۷۰)

سیدنا یوسف کی بیوی کا نام کیا تھا؟

سوال : سیدنا یوسف علیہ السلام کی بیوی کا نام کیا تھا؟ ہمارے ہاں ایک مولوی صاحب نے زلیخا نامی عورت کے سیدنا یوسف علیہ السلام کی بیوی ہونے کی نفی کی ہے اور کہا ہے کہ وہ زانیہ ہے۔ کیا موصوف کا یہ کہنا درست ہے۔ مولوی صاحب کا کہنا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی بیوی کا نام آمس ناتھ تھا۔ حوالہ مولانا سلیمان منصور پوری رحمہ اللہ کی کتاب ''الجمال والکمال'' کا دیتے ہیں۔ اس کی وضاحت فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

(ابو حنظلہ محمد محمود علوی، ضلع اوکاڑہ) (۱۵ مئی ۱۹۹۸ء) (۲۰ مئی ۲۰۱۱ء)

جواب : واقعی قاضی سلیمان منصور پوری نے اپنی کتاب ''الجمال والکمال'' میں بدلائل اس بات سے انکار کیا ہے کہ زلیخا حضرت یوسف علیہ السلام کی بیوی ہو۔ میرے خیال میں انھوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کی بیوی کا نام راعیل ذکر کیا ہے۔

عیسیٰ علیہ السلام تو زندہ ہیں عیسائی اپنے انبیاء کی قبروں کی پوجا کیسے کرتے ہیں؟

سوال : حدیث شریف میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اس بیماری میں (جس سے اچھے ہو کر نہیں اٹھے) یوں فرمایا: اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے، انھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔

(بخاری شریف، ج:۱، ص:۶۰۱، کتاب الجنائز)

اب آپ سے مسئلہ یہ پوچھنا ہے کہ یہودیوں نے تو اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا ہے مگر نصاریٰ نے کیسے اپنے نبی یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قبر کو سجدہ گاہ بنا لیا؟ کیونکہ نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والوں کو کہتے ہیں۔ ایک

قادیانی نے مجھ سے یہ سوال کیا ہے اور اس سلسلے میں مَیں بہت پریشان ہوں۔ (ایک سائل۔ لاہور) (۱۷ اپریل ۱۹۹۸ء)

جواب: نصوصِ صحیحہ صریحہ کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو زندہ آسمان پر ہیں۔ قربِ قیامت میں ان کا نزول ہوگا تو پھر دنیا میں ان کی قبر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا مرزا قادیانی اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہے کہ ان کی قبر کشمیر میں ہے۔ حدیث ہذا میں جو کچھ بیان ہوا مجمل ہے۔ ''صحیح مسلم'' میں جندب کے طریق میں مفصل ہے:

« كَانُوْا يَتَّخِذُوْنَ قُبُوْرَ اَنْبِيَاءِ هِمْ وَ صَالِحِيْهِم مَسَاجِد» ❶

''یعنی یہود و نصاریٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام اور اپنے نیک لوگوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔''

مقصود یہ ہے کہ یہود نے انبیاء علیہم السلام کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔ جب کہ نصاریٰ نے نیک لوگوں کی پوجا پاٹ کی۔ دلیل اس امر کی یہ ہے کہ دیگر روایات میں تذکرہ جب نصاریٰ کا ہوا تو وہاں صرف نیکو کار کی تصریح ہے۔ انبیاء کا ذکر نہیں۔ حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ اُم سلمہ نے رسول اللہ ﷺ سے سرزمین حبشہ کے ایک کنیسہ کا ذکر کیا ہے وہ دیکھ کر آئی تھیں، اسے ماریہ کہا جاتا ہے۔ انھوں نے ان تصویروں کا ذکر کیا۔ جنھیں وہ دیکھ کر آئی تھیں تو سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

« أُولَئِكَ قَوْمٌ إِذَا مَاتَ فِيهِمُ الْعَبْدُ الصَّالِحُ، أَوِ الرَّجُلُ الصَّالِحُ، بَنَوْا عَلَى قَبْرِهِ مَسْجِدًا، وَصَوَّرُوا فِيهِ تِلْكَ الصُّوَرَ، أُولَئِكَ شِرَارُ الْخَلْقِ عِنْدَ اللَّهِ.» ❷

''یعنی یہ وہ لوگ ہیں جب ان میں کوئی نیک آدمی فوت ہو جاتا تو اس کی قبر کو سجدہ گاہ بنا لیتے۔ اور اس میں یہ تصویریں بناتے۔ اللہ کے ہاں یہ مخلوق میں بدترین ہیں۔''

اور جب انفرادی طور پر یہود کا تذکرہ ہوا تو فرمایا:

«قَاتَلَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَاءِ هِمْ مَسَاجِدَ.» ❸

''یعنی اللہ تعالیٰ یہود کو برباد کرے انھوں نے اپنے انبیاء علیہم السلام کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔''

یہاں صرف انبیاء علیہم السلام کا ذکر ہے نیکو کاروں کا نہیں۔

یہ بھی احتمال ہے کہ یہود کے ساتھ نصاریٰ کا ذکر اس بناء پر ہو کہ نصاریٰ تو انبیاء یہود کو برحق تسلیم کرتے تھے جب کہ یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ گویا انبیاء یہود دونوں گروہوں کے نزدیک مکرم

❶ صحيح مسلم، بَابُ النَّهْيِ عَنْ بِنَاءِ الْمَسَاجِدِ، عَلَى الْقُبُورِ وَاتِّخَاذِ الصُّوَرِ فِيهَا وَالنَّهْيِ عَنِ ......الخ ، رقم:۵۳۲

❷ صحيح البخاری، بَابُ الصَّلاَةِ فِي البِيعَةِ ، رقم:۴۳۴

❸ صحيح البخاری، بَابُ الصَّلاَةِ فِي البِيعَةِ ، رقم:۴۳۷

ٹھہرے۔ اس بناء پر دونوں ان کی عبادت میں شریک ہو گئے اور یہ بھی ممکن ہے یہاں حواری اور حضرت مریم کو غیر مرسل قرار دیا گیا ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ انبیاء سے مراد بذاتِ خود انبیاء اور ان کے کبار متبعین ہوں۔ ❶

عقل کا مرکز دل ہے یا دماغ؟

سوال: بندہ کو دو سوالوں کے جواب درکار ہیں، امید ہے تسلی بخش اور مدلل جواب دے کر شکریہ کا موقع دیں گے۔

① قرآن مجید میں ہے:

(۱) ﴿لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا﴾ (الاعراف:۱۷۹)

(۲) ﴿اَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوبٍ اَقْفَالُهَا﴾ (محمد:۲۴)

مندرجہ بالا آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ غور و تدبر اور فہم کا تعلق دل سے ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ کام دل کا نہیں ہے بلکہ دماغ کا ہے۔ (جواب کا منتظر حافظ محمد فاروق، نیو کیمپس لاہور)

جواب: عقل و شعور اور تدبر و فہم کا اصل محل اور مقام بنی آدم کا دل ہے جس طرح کہ متعدد قرآنی آیات اور بے شمار احادیث نبویہ میں تصریح موجود ہے۔ بطورِ مثال "سورۃ الحج" کی آیت نمبر:۴۶ ملاحظہ فرمائیں: فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَ لٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ﴾ (الحج:۴۶)

"کیا ان لوگوں نے ملک میں سیر نہیں کی تاکہ ان کے دل (ایسے) ہوتے کہ ان سے سمجھ سکتے اور کان (ایسے) ہوتے کہ ان سے سن سکتے۔ بات یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہے (وہ) اندھے ہوتے ہیں۔"

زیر آیت ہذا امام شوکانی رقمطراز ہیں:

« وَ اَسْنَدَ التَّعَقُّلَ اِلَى الْقُلُوْبِ لِاَنَّهَا مَحِلُّ الْعَقْلِ كَمَا اَنَّ الْاٰذَانَ مَحَلُّ السَّمْعِ وَ قِيْلَ الْعَقْلُ مَحَلُّهُ الدِّمَاغُ وَلَا مَانِعَ مِنْ ذٰلِكَ فَاِنَّ الْقَلْبَ هُوَ الَّذِيْ يَبْعَثُ عَلٰى اِدْرَاكِ الْعَقْلِ وَ اِنْ كَانَ مَحَلُّهُ خَارِجًا عَنْهُ.» ❷

"یعنی ادراک و شعور کی نسبت قلوب کی طرف اس لیے کہ وہ عقل کا محل ہیں جس طرح کہ کان سماع کا محل ہیں۔ اور ایک غیر معروف قول یہ بھی ہے کہ عقل کا محل دماغ ہے۔ یہ بات اوّل الذکر قول کے منافی نہیں کیونکہ دل منشائے ادراک و فہم ہے۔ اگرچہ عقل کا جائے استقرار قلب سے خارج دماغ ہے۔"

❶ فتح الباری:/ ۵۳۲

❷ فتح القدیر، ج:۳، ص:۴۵۹

اس توضیح وتشریح سے معلوم ہوا کہ اصلاً دل ہی چشمۂ ظہورِ عقل وفہم ہے۔ اور من وجہ اس کا تعلق دماغ سے بھی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا قرآن نے اصل کے اعتبار سے فہم وتدبر کی نسبت دل کی طرف کی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِمَن كَانَ لَهُ قَلْبٌ أَوْ أَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيدٌ﴾ (ق:۳۷)

اور علامہ فخر الدین رازی سوال نمبر۴ کا عنوان قائم کر کے فرماتے ہیں:

« هَلْ تَدُلُّ الآيَةُ عَلَى اَنَّ الْعَقْلَ هُوَ الْعِلْمُ وَ عَلَى اَنَّ مَحَلَّ الْعِلْمِ هُوَ الْقَلْبُ؟ »

''کیا آیت اس بات پر دال ہے کہ عقل سے مراد یہاں علم ہے اور اس بات پر بھی کہ علم کا محل دل ہے؟''

جواباً فرماتے ہیں، ہاں اس لیے کہ اللہ کے قول ﴿قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا﴾ سے مقصود علم ہے اور اللہ کا قول ﴿يَعْقِلُونَ بِهَا﴾ مثل دلیل کے ہے کہ قلب آلہ فہم وادراک ہے۔ پس اس سے ثابت ہوا کہ دل محل عقل وفہم ہے۔ ❶

نیز مفسر قرآن مولانا امیر علی فرماتے ہیں: بعض نے لکھا ہے آیت میں قلوب کی طرف سمجھنے کی نسبت فرمائی۔ بقولہ ﴿يَعْقِلُونَ بِهَا﴾ یعنی ان قلوب سے سمجھتے تو یہ نسبت اس وجہ سے ہے کہ عقل کا محل قلب ہے جیسے سننے کا محل کان۔ ❷

اور جن متجدّدین اور فلاسفہ نے عقل کا ابتدائی اور استقراری تعلق صرف دماغ سے تسلیم کیا ہے وہ سعی موہومہ اور تحصیل لا حاصل کا شکار ہیں۔ خواہ مخواہ اپنی کمزور عقل کے سہارے تاویلاتِ باطلہ پر اعتماد کر کے منصبِ نبوت کو بھلا بیٹھنا اچھی بات نہیں۔ دراں حالیکہ صحیح عقل ہر لحہ نبوت کی روشنی کی محتاج ہے۔ والتوفیق بید اللہ۔

کتاب وسنت سے قطعاً اس نظریہ کی تائید نہیں ہوتی بلکہ یہ واضح نصوص کے برعکس ہے۔ ایک حدیث میں وارد ہے:

« إِنَّ اللَّهَ جَعَلَ الحَقَّ عَلَى لِسَانِ عُمَرَ وَقَلْبِهِ . » ❸

''یعنی اللہ تعالیٰ نے عمر کی زبان اور دل پر حق کو جاری کر دیا ہے۔''

حدیث ہذا سے بھی معلوم ہوا کہ اصل منبع تعقّل دل ہے۔

یاد رہے اس مسئلہ میں مولانا مودودی مرحوم سے لغزش ہوئی ہے انھوں نے اس قسم کے کلام کو محض ادبی اسلوب اور تخیل قرار دے کر ٹال دیا ہے اور کہا ہے کہ قرآن سائنس کی زبان میں نہیں بلکہ ادب کی زبان میں کلام کرتا ہے گویا اس میں مسلمہ امر کا انکار ہے جس کی مزید تشریح وتفسیر محتاجِ بیان نہیں۔ ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، ج:۱، ص:۲۳۶۔

نبی کریم ﷺ کا صرف ایک کے مسلمان ہونے کے لیے دعا کرنے کا مطلب؟

سوال: رسولِ اکرم ﷺ نے دعا فرمائی: «اَللّٰهُمَّ اَعِزَّ الْاِسْلَامَ بِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ اَوْ بِعَمْرِو بْنِ هِشَامٍ» ❹

❶ تفسیر کبیر جزء:۲۳، ص:۴۵ ❷ تفسیر مواهب الرحمن، جز:۱۷، ص:۳۴۳

❸ سنن الترمذی، بَابٌ فِي مَنَاقِبِ أَبِي حَفْصٍ عُمَرَ بْنِ الخَطَّابِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، رقم:۳۶۸۲، مع تحفة الاحوذی

❹ سنن الترمذی، بَابٌ فِي مَنَاقِبِ أَبِي حَفْصٍ عُمَرَ بْنِ الخَطَّابِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، رقم:۳۶۸۳

سوال یہ ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے دونوں کے لیے دعا کیوں نہ کی۔ دونوں میں سے ایک کیوں مانگا؟

(جواب کا منتظر حافظ محمد فاروق، نیوکیمپس لاہور)

جواب: پہلے روایت کے اصل الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

« اَللّٰهُمَّ أَعِزَّ الْإِسْلَامَ بِأَحَبِّ هٰذَيْنِ الرَّجُلَيْنِ إِلَيْكَ بِأَبِي جَهْلٍ أَوْ بِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ . قَالَ: وَكَانَ أَحَبَّهُمَا إِلَيْهِ عُمَرُ. » [1]

''یعنی یا اللہ! ابوجہل یا عمر دونوں میں سے جو تیرے ہاں زیادہ پیارا ہے اس کے ذریعہ اسلام کو قوت عطا فرما۔'' راوی نے کہا اللہ کے ہاں دونوں میں سے محبوب ترین عمر رضی اللہ عنہ تھے۔''

یہاں جو اشتباہ پیدا ہوتا ہے وہ لفظ أو (یا) سے ہے اس کا جواب یوں ہے کہ یہاں أوْ شک کے لیے نہیں بلکہ تنویع کے لیے ہے۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں میں سے کوئی ایک مسلمان ہو جائے یا دونوں ہی مسلمان ہو کر حاضرِ خدمت ہوں لیکن حکمتِ الٰہیہ کا تقاضا یہ تھا کہ صرف عمر مسلمان ہو۔

اس مسئلہ کو دوسری مثال سے یوں سمجھئے۔ صحیح حدیث میں وارد ہے جو شخص جہاد کے لیے نکلتا ہے پھر واپس آتا ہے تو وہ «......نَالَ مِنْ أَجْرٍ أَوْ غَنِيمَةٍ» [2] ثواب یا مالِ غنیمت لے کر لوٹتا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مجاہد کو اگر مالِ غنیمت ہاتھ لگ گیا تو وہ اجر وثواب سے محروم ہے۔ بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ثواب اور مالِ غنیمت دونوں جمع ہو سکتے ہیں کیونکہ یہاں بھی أو تنویع کے لیے ہے جس طرح کہ پہلی حدیث میں ہے۔ (هٰذَا مَا عِنْدِيْ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ.)

جامعہ کے فنڈ سے وظیفہ کے طور پر کچھ رقم اپنی ذات پر خرچ کرنا

سوال: سائل نے ۱۸ سال قبل ایک ادارے کی بنیاد رکھی جس میں ایک مسجد، طلبہ کا جامعہ اور طالبات کا جامعہ موجود ہے۔ تینوں ذیلی ادارے باحسن طریق دین کی خدمت ادا کر رہے ہیں۔ جامعہ کا جملہ انتظام والنصرام بذمہ سائل ہے اور سائل سرکاری ملازم ہے۔ سرکاری ملازمت کے بعد سارا وقت جامعہ کے امور پر گزارتا ہوں۔ ۱۶ کے قریب معلّمین اور معلّمات تدریسی فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ بلکہ بطور مدیر میں ۱۸ سال سے تنخواہ بھی نہیں لے رہا۔ اب اولاد جوان ہو رہی ہے، مہنگائی کی وجہ سے سرکاری تنخواہ اخراجات کو پورا نہیں کر رہی۔

---

[1] جامع ترمذی، ج:۱۰، ص:۱۶۹، مع تحفة الاحوذی) (سنن الترمذی، بَابٌ فِي مَنَاقِبِ أَبِي حَفْصٍ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، رقم:۳۶۸۱

[2] صحیح البخاری، بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ: أُحِلَّتْ لَكُمُ الغَنَائِمُ، رقم: ۳۱۲۳)

ایسے حالات میں کیا جامعہ سے تنخواہ/ وظیفہ کے طور پر کچھ رقم اپنے اوپر خرچ کرسکتا ہوں؟

صدقات وخیرات کے جانور سے یا جامعہ سے کھانا وغیرہ کھا سکتا ہوں یا نہیں؟ اگر یہ مراعات لی جاسکتی ہیں تو اُن کی حد کیا ہونی چاہیے؟ جب کہ جامعہ کا جملہ کام حتی کہ فنڈ اکٹھا کرنا بھی میری ہی ذمہ داری ہے اور میں اکثر بیمار رہتا ہوں۔

قرآن وسنت کی روشنی میں اخبار الاعتصام میں فتویٰ جاری کرکے شکریہ کا موقع دیں۔ بَیِّنُوْا تُوجرُوْا

جواب: بوقت ضرورت ادارے کے فنڈ سے آپ بقدر حاجت اپنے اوپر خرچ کرسکتے ہیں ایسی صورت میں قرآنی آیت ﴿ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۖ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ ﴾ (النساء:٦)

''جو شخص آسودہ حال ہو اس کو (ایسے مال سے قطعی طور پر) پرہیز رکھنا چاہیے اور جو بے مقدور ہو وہ مناسب طور پر (یعنی بقدرِ خدمت) کچھ لے لے۔''

یہ آیت کریمہ پیش نظر رہنی چاہیے آپ جیسے محتاج کے لیے جواز کی دلیل ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جب خلیفہ منتخب ہوئے تو فرمایا ''میری قوم کو علم ہے کہ میرا پیشہ میرے اہل وعیال سے تنگ نہ تھا۔ اب میں مسلمانوں کے کام میں مشغول ہوگیا ہوں پس میں اور میرے اہل وعیال اس مال سے کھائیں گے اور اسی میں حرفت کریں گے۔''[1]

تیموں کی کفالت کے سلسلے میں قرآن کی تنبیہ سے بھی درس عبرت حاصل ہونا چاہیے کہ ﴿وَاللَّهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ﴾ ''اللہ خوب جانتا ہے کہ خرابی کرنے والا کون ہے اور اصلاح کرنے والا کون۔''

لطیفہ یاد آیا، ایک دفعہ مدرسین نے انتظامیہ سے تنخواہ میں اضافے کا مطالبہ کیا، اس اثناء میں ایک خاموش حلیم الطبع مدرس سے دریافت کیا گیا، کیا اضافہ ہونا چاہیے؟ کہا اہل بیت سے پوچھ کر بتاتا ہوں۔ جواباً انھوں نے کہا گزارا ہو رہا ہے، تو بھری مجلس میں کہا مجھے اضافے کی ضرورت نہیں۔ سچ ہے من تواضع لله رفعه الله ۔ دراصل یہ معاملہ دیانت وامانت کا ہے جس کا تعلق خالق اور مخلوق سے ہے۔ روز جزاء جملہ معاملات کھل کر سامنے آجائیں گے۔ اللہ رب العزت ہم سب کو کامیابی نصیب فرمائے، آمین۔

الحاصل بایں صورت آپ تنخواہ لے سکتے ہیں جب کہ جامعہ سے خورد ونوش کا بھی جواز ہے۔ (وَاللّٰهُ سُبْحَانَهُ وَتَعَالٰى اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ وَ عِلْمُهُ اَتَمُّ.)

انسان کی تخلیق مٹی سے یا پانی سے؟

سوال: قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ بعض جگہ فرماتا ہے کہ ہر جاندار کی پیدائش پانی کے ذریعے ہوئی۔ (سورۃ الانبیا: ٣٠) (سورۃ النور: ٤٥) انسان بھی جاندار ہے۔ اس لیے اس کی تخلیق بھی پانی سے ہوئی۔ جب کہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا

[1] صحيح بخاری، بَابُ كَسْبِ الرَّجُلِ وَعَمَلِهِ بِيَدِهِ، رقم:٢٠٧٠

ہے کہ انسان کو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔ (سورۃ المومنون:۱۲) (سورۃ السجدہ:۳۲) (ایم فاروق) (۹ مئی ۱۹۹۷ء)

جواب : ان نصوص کا مفہوم یہ ہے کہ اصلاً آدمی مٹی سے بنا ہے بعد میں منوی مادہ منتقل ہوگیا۔

مومن اور مسلم میں کیا فرق ہے؟

سوال : مومن اور مسلم میں کیا فرق ہے؟ (آصف احسان ملک ستیانہ روڈ۔فیصل آباد۔۱۱اپریل ۱۹۹۷ء)

جواب : سوال ہذا کا جواب قبل ازیں بھی آپ ہی کے حوالہ سے الاعتصام میں تفصیلاً شائع شدہ ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ ایمان اور اسلام میں سے ہر ایک کا دوسرے پر اطلاق ہے لیکن جمع کی صورت میں ایمان میں باطن کا لحاظ ہوتا ہے جب کہ اسلام میں ظاہر کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ حدیث جبریل اس امر کی واضح دلیل ہے۔

کیا حمل ٹھہرنے کے بعد عورت کا رحم جماع سے متاثر ہوسکتا ہے؟

سوال : رحم میں نطفہ جب پہنچتا ہے تو ایک ہی جرثومہ بیضہ میں داخل ہوتا ہے پس اسی کیساتھ بچہ پیدا ہوتا ہے۔ اگرچہ بعد میں جتنی بار بھی جماع کرے اور آزاد عورت جب حاملہ ہو تو اس کے ساتھ جماع برداشت کی حد تک ہوسکتا ہے۔ اس میں جواز ہے لیکن اعتراض یہ ہے کہ مشکوٰۃ جلد ثانی باب استبراء رحم میں نبی ﷺ نے ''غیلہ'' سے منع فرمایا ہے اور ارشاد فرمایا کہ یہ غیر کی کھیتی کو پانی پلانے والی بات ہے۔

حالانکہ زمین کو پانی ملنے سے فائدہ ہوتا ہے۔ اس لونڈی کو تو رحم میں کوئی فائدہ نہیں۔ مشبہ، مشبہ بہ کے موافق ہی نہیں تو یہ آزاد عورت حاملہ ہو تو اجازت اور اسی طرح لونڈی کے لیے ممنوع اور علت «سَقِيَ الْمَاءَ زَرْعَ غَيْرِهِ» حالانکہ معلول لہ میں معلول علیہ والی علت ہے ہی نہیں۔ (احسان اللہ فاروقی۔ڈیرہ غازی خان) (۲۶ مارچ ۱۹۹۹ء)

جواب : بلاریب حمل جب ٹھہرتا ہے تو اس کا استقرار ایک محفوظ مقام پر ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ○ فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ○ اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ○ فَقَدَرْنَا فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ○﴾ (مرسلات:۲۰ ـ ۲۳)

''کیا ہم نے تم کو حقیر پانی سے نہیں بنایا (پہلے) اس کو ایک محفوظ جگہ میں ایک معین وقت تک رکھا پھر اندازہ مقرر کیا۔ اور ہم کیا ہی خوب اندازہ مقرر کرنے والے ہیں۔''

اس کے باوجود اجسام میں وطی کے اثرات کا ظہور پذیر ہونا ایک طبعی امر ہے۔ اس کے کم از کم نفسیاتی تاثیر سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اہل تجارب کے ہاں یہ بات مشہور و معروف ہے۔ جماع کا اثر خواہ بچہ کی تخلیق پر ہو یا نشوونما اور غذا وغیرہ میں سے جونسی بھی صورت ہو، کسی نہ کسی نوع کی تاثیر کا امکان موجود ہے۔ حدیث «سَقْيُ الْمَاءَ زَرْعَ غَيْرِهِ» میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔ اس طرح مشبہ اور مشبہ بہ یعنی ولد اور زرع میں مطابقت پیدا ہو جاتی ہے اس امر کی

تصدیق ایک دوسری روایت سے بھی ہوتی ہے جس کے الفاظ یوں ہیں:

«كَيْفَ يَسْتَعْبِدُهُ وَ قَدْ غَذَاهُ فِيْ سَمْعِهِ وَ بَصَرِهِ.» ❶

''یعنی پہلے کی حاملہ سے جماع کرنے والا بچہ کو اپنا غلام کیسے بنائے گا حالانکہ اس کے کان اور آنکھ میں اس نے غذا پہنچائی ہے۔''

یادر ہے وطی صرف اس لونڈی سے ممنوع ہے جو قیدی بنتے وقت حاملہ تھی تاکہ سلسلہ نسب کا اختلاط نہ ہونے پائے ورنہ عام حالات میں استبراء رحم (رحم کو پاک کرنا یعنی ماہواری کی آمد کا انتظار کرنا) کے بعد آزاد عورت کی طرح لونڈی سے بھی جماع جائز ہے۔ بعد ازاں خواہ مالک سے حاملہ ہی کیوں نہ ہو پھر بھی جماع جائز ہے۔ سو حدیث «سَقِيَ الْمَاءَ زَرْعَ غَيْرِهِ» کا تعلق صرف غیر کے حمل سے ہے نہ کہ اپنے سے اس میں تو آزاد عورت اور لونڈی دونوں کا جواز یکساں ہے۔

اس توجیہ اور تشریح سے باہمی علت کا اشتراک بھی عیاں ہو جاتا ہے۔ نیز واضح ہو کہ غیلة سے منع والی روایت مشکوٰۃ میں باب استبراء کے تحت بیان نہیں ہوئی بلکہ اس کا تعلق باب المباشرة سے ہے۔ اگرچہ اصلاً غیلہ جائز ہے لیکن موضوع ہذا سے غیر متعلق ہے۔ غیلہ کی تعریف امام مالک رحمہ اللہ اور اصمعی کے نزدیک یوں ہے۔

«اَنْ يُجَامِعَ اِمْرَأَتَهُ وَ هِيَ مُرْضِعٌ.»

''حالت رضاعت میں بیوی سے مجامعت کرنا۔ یہ بھی یاد رہے اصل لفظ غیلہ ہے غلیہ نہیں ہے جس طرح کے سوال میں ہے۔ ملاحظہ ہو شرح مسلم نووی: ۱۰/۱۶۔

حالت حمل میں بیوی سے وطی کرنا

سوال: ایک کتاب ''وہ ہم میں سے نہیں'' عبدالکریم اثری خطیب جامع مسجد الغائیہ گجرات کی لکھی ہوئی میرے پاس ہے، کے صفحہ: ۲۳۷ پر ایک حدیث لکھی ہوئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اپنی حاملہ بیوی سے حالتِ حمل میں ازدواجی تعلق قائم کرے وہ ہم میں سے نہیں۔'' (کنز العمال، ج:۵، ص:۱۸۵، بحوالہ طبرانی عن ابن عباس)

اس حدیث کی حقیقت کے بارے میں مطلع فرما دیں۔ (منیر احمد، رحیم یار خان) (۲۶ فروری ۱۹۹۹ء)

جواب: حالتِ حمل میں بیوی سے وطی کرنا منع نہیں کیوں کہ اصلاً ہر حالت میں استمتاع کا جواز ہے۔ ماسوا اس حالت کے جس میں شریعت نے وطی سے منع کیا ہے۔ مثلاً فرمایا:

«اِصْنَعُوا كُلَّ شَيْءٍ إِلَّا النِّكَاحَ.» ❷

❶ بداية المجتهد: ۲/ ٤٨

❷ صحيح مسلم، بَابُ اصْنَعُوا كُلَّ شَيْءٍ إِلَّا النِّكَاحَ، رقم: ۳۰۲

یعنی ماہواری کی حالت میں وطی کے ماسوا ہر قسم کے استمتاع کی اجازت ہے۔ ہاں البتہ باندی اگر غیر سے حامل ہو یا آزاد عورت حبلی بالزنا ہے تو اس صورت میں حالتِ حمل میں وطی کرنا حرام ہے لیکن وہ اس لیے نہیں کہ یہ حالتِ حمل میں ہیں۔ بلکہ اس لیے کہ غیر کا حمل ہے۔ بالفرض اگر حمل زانی کا ہو تو ایسے منکوحہ سے بھی وطی حرام ہے کیونکہ شرعاً زانی کے نطفہ کی حرمت نہیں وہ ایسے ہی ہے جیسے غیر کی کھیتی کو پانی پلا رہا ہے۔ بلکہ راجح مسلک کے مطابق حاملہ بالزنا سے نکاح ہی نہیں ہوتا جب تک وضع حمل نہ ہو۔ اور صدقِ دل سے دونوں تائب نہ ہوں۔

اور سوال میں مشارٌ الیہ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اصل الفاظ یوں ہیں:

«عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ :قَالَ رَسُولُ اللَّهِ -صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ :-لَيْسَ مِنَّا مَنْ وَطِءَ حُبْلَى. رَوَاهُ أَحْمَدُ فِي حَدِيثٍ طَوِيلٍ، وَالطَّبَرَانِيُّ، وَفِيهِ الْحَجَّاجُ بْنُ أَرْطَاةَ، وَهُوَ مُدَلِّسٌ.» ❶

''ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ ہم میں سے نہیں جس نے حاملہ سے مجامعت کی، اس ٹکڑے کو احمد اور طبرانی نے ایک لمبی حدیث میں بیان کیا ہے اور اس میں راوی حجاج بن ارطاۃ مدلّس ہے۔

اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«صُدُوْقٌ كَثِيْرُ الْخَطَاءِ وَالتَّدْلِيْسِ.» ❷

''بہت غلطیاں کرنے والا صدوق اور مدلس ہے۔''

اور امام ذہبی رحمہ اللہ نے کہا اپنی حدیث میں کمزور ہے اس پر تدلیس کا عیب لگایا گیا ہے۔ تقریباً چھ سو احادیث کا راوی ہے۔ ابن معین رحمہ اللہ نے کہا قوی نہیں وہ صدوق مدلس ہے۔ ❸

حافظ ہیثمی رحمہ اللہ نے باب ہذا کے تحت مزید احادیث بیان کی ہیں لیکن وہ سب ضعیف ہیں۔ بغرضِ صحت ان کا تعلق لونڈیوں سے ہے جس طرح کہ بعض روایات میں تصریح ہے۔ صاحبِ ''مجمع الزوائد'' نے بایں الفاظ تبویب قائم کی ہے:

«بَابٌ فِيمَنْ وَطِءَ امْرَأَةً وَحَمْلُهَا لِغَيْرِهِ.»

''اس آدمی کے بارے میں جس نے کسی عورت سے وطی کی اور اس کا حمل غیر کا ہے۔''

اور ''صحیح مسلم'' میں حدیث ہے ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کہا، میں اپنی بیوی سے عزل کرتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ فعل تو کیوں کرتا ہے:

---

❶ مجمع الزوائد:٤/ ٢٩٩، بَابٌ فِيمَنْ وَطِءَ امْرَأَةً وَحَمْلُهَا لِغَيْرِهِ رقم:٧٦٠٠

❷ التقریب:١/ ١٥٢

❸ میزان الاعتدال:١/ ٤٥٨

«فَقَالَ الرَّجُلُ : أُشْفِقُ عَلَى وَلَدِهَا.» ❶

آدمی نے کہا کہ میں اس کے بچہ سے ڈرتا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر یہ فعل نقصان دِہ ہوتا تو فارس و روم کو بھی اس سے نقصان پہنچتا۔ تو یہ حدیث بھی حالتِ حمل میں وطی کے جواز پر دال ہوئی۔

کیا حجۃ الوداع کے بعد کوئی حکم جاری ہوا؟

سوال : ''سورۂ مائدہ'' کی آیت ﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ﴾ (المائدۃ:۳) میں دین مکمل ہونے کی خوشخبری دی گئی ہے۔ یہ آیت حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہوئی۔ کیا اس کے بعد دین میں کوئی نیا حکم نہیں آیا۔ کچھ منسوخ نہیں ہوا۔؟ بعض علماء نے لکھا ہے کہ آیت ربا اور آیتِ کلالہ بعد میں نازل ہوئیں تو دین مکمل ہونے کا کیا مطلب ہوا؟ کیا یہ آیات پہلے نازل ہو چکی تھیں؟ (ایک سائل) (۴ نومبر ۱۹۹۸ء)

جواب : مشارٌ الیہ آیت سے مراد معظم احکام ہیں، جس طرح حدیث میں ہے: «اَلْحَجُّ عَرَفَة» ❷ ''یعنی حج عرفات میں ٹھہرنے کا نام ہے۔'' حالانکہ احکامِ حج اور بھی ہیں۔ اسی طرح آیت سے مقصود یہ ہے کہ اکثر و بیشتر احکام مکمل ہو چکے تھے۔ اگرچہ بعض مسائل بعد میں نازل ہوئے۔

کسی ولی اللہ کے نام کے ساتھ رضی اللہ تعالیٰ عنہ استعمال کرنا درست ہے؟

سوال : کیا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے الفاظ صحابی کے نام کے علاوہ کسی ولی اللہ کے نام کے ساتھ استعمال کیے جا سکتے ہیں؟ کیوں کہ علامہ سید رشید الدین شاہ المعروف بصاحب اللواء الثالث مرحوم کی ملفوظات جو انکے خاص جماعتی (مرید) قاضی فتح محمد نظامانی مرحوم نے بنام ''تحفۃ المحبین'' (قلمی) میں ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ (یاد رہے کہ اس کا قلمی نسخہ سعید آباد سندھ میں سید بدیع الدین شاہ راشدی کی لائبریری میں موجود ہے) اس کے نقل نمبر ۶۰ میں درج ہے کہ'' حضرت مرشد کریم رضی اللہ عنہ کے پاس عرب ملک سے شہد کے دو ڈبے لائے گئے۔ ان ڈبوں میں ایک میں سے ایک مرا ہوا چوہا نکلا۔ پھر آپ کریم نے فقہی روایت کے موجب شہد میں پانی ڈلوایا اور اس کو آگ پر ابالا گیا۔ یہ عمل دو تین مرتبہ کیا گیا۔ شاید پاکی کے ارادے سے کیا ہو۔

پھر فتح محمد صاحب لکھتے ہیں کہ اچانک میں بھی وہاں پہنچ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ آپ اس شہد کے شربت میں سے ایک گھونٹ پی چکے ہیں۔ میں نے حضور سے عرض کیا یہ شہد کسی حالت میں بھی پاک نہیں ہوگا۔ اور رسول اللہ ﷺ کی حدیث پیش کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اگر جمے ہوئے گھی میں چوہا گر کر مر جائے تو وہ پلیدی والی جگہ کاٹ کر پھینک

---

❶ صحيح مسلم، بَابُ جَوَازِ الْغِيلَةِ، وَهِيَ وَطْءُ الْمُرْضِعِ، وَكَرَاهَةِ، رقم:۱٤٤٣

❷ سنن ابن ماجه، بَابُ مَنْ أَتَى عَرَفَةَ، قَبْلَ الْفَجْرِ، لَيْلَةَ جَمْعٍ، رقم: ۳۰۱۵

دی جائے۔ اگر گھی جما ہوا نہ ہو بلکہ پانی کی صورت میں ہو تو اس کے قریب نہ جاؤ۔ مگر دیا جلانے یا کسی دوسرے کام میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ پھر آپ نے احادیث کی کتب منگوا کر حدیث شریف کے الفاظ دیکھ کر شہد کا پورا ڈبہ پھینک دیا۔ اور جو گھونٹ پی لیا تھا اس کے متعلق افسوس کا اظہار کیا۔'' (بدیع التفاسیر، مصنف سید بدیع الدین شاہ راشدی، ج:۳، ص:۴۴۵) (جان محمد گاہو، ڈاکخانہ خاص پھلاڈیوں سندھ) (۱۱ ستمبر ۱۹۹۸ء)

جواب: ارشاد باری تعالیٰ ﴿وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِإِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ﴾ (التوبة: ۱۰۰) ''اور جنھوں نے نیکوکاری کے ساتھ ان کی پیروی کی اللہ اُن سے خوش ہے اور وہ اللہ سے خوش ہیں۔''

مذکورہ بالا آیت کریمہ کے پیش نظر غیر صحابی پر بھی رضی اللہ عنہ کا اطلاق ہو سکتا ہے۔

خود کو اہلحدیث کہلانا درست ہے یا مسلمین

سوال: کیا اپنے آپ کو اہل حدیث کہلانا درست ہے جب کہ قرآن پاک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ مدلل جواب تحریر فرمائیں۔ اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔

(حافظ خوشی محمد و حافظ عبدالرحمٰن ضلع اوکاڑہ) (۱۱ ستمبر ۱۹۹۸ء)

جواب: کتاب و سنت کے ساتھ مخلصانہ وابستگی کی بناء پر اہل حدیث نام کے اطلاق کا جواز ہے۔

«لَا مَشَاحَةَ فِي الاصْطِلَاحِ.»

کئی ایک محدثین عمل بالحدیث کی بناء پر اہل بدعت سے بالمقابل اس لقب سے موسوم تھے۔ تفصیل کیلیے ملاحظہ کتاب شرف اصحاب الحدیث۔

قرآن میں المسلمین بطورِ تسمیہ صفت بیان ہوا ہے جس سے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ جملہ مسلمان متصف ہیں۔ ورنہ تو لازم آئے گا حافظ عبدالغفور نام رکھنا بھی ناجائز ہو جس کا کوئی بھی قائل نہیں۔

گھروں میں پرندے پالنا کیسا ہے؟

سوال: گھر میں پرندے (طوطے وغیرہ) پالنا کیسا ہے؟ (ابوطلحہ، لودھراں) (فروری ۲۰۰۵ء)

جواب: گھر میں پرندے پالنا جائز ہے بشرطیکہ ان کی خوراک کا طبائع کے مطابق بندوبست ہو۔

حدیث میں ہے ایک عورت نے بلی کو باندھے رکھا، کھانے پینے کو کچھ نہ دیا اور نہ چھوڑا کہ زمین سے وہ اپنی روزی حاصل کرے۔ اس کے سبب وہ دوزخ میں چلی گئی۔ الفاظ حدیث ملاحظہ فرمائیں:

«عُذِّبَتِ امْرَأَةٌ فِي هِرَّةٍ سَجَنَتْهَا حَتَّى مَاتَتْ، فَدَخَلَتْ فِيهَا النَّارَ، لَا هِيَ أَطْعَمَتْهَا

وَلَا سَقَتْهَا، إِذْ حَبَسَتْهَا، وَلَا هِيَ تَرَكَتْهَا تَأْكُلُ مِنْ خَشَاشِ الْأَرْضِ» ❶

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جانور کے کھانے پینے کا انتظام ہو تو پھر گھر میں رکھنے کا کوئی حرج نہیں۔

شریعت مطہرہ میں کتا پالنا جائز ہے یا ناجائز؟

سوال : کتا پالنا شریعتِ مطہرہ (قرآن وسنت) کی رُو سے بالکل ممنوع ہے یا بعض صورتوں میں اس کے لیے مسنون اجازت ہے؟ ہمارے گاؤں کا مسئلہ یہ ہے کہ دوسری جگہوں سے ٹیکسی ڈرائیور کتوں کو گاڑی میں ڈال کر یہاں لاتے ہیں اور ہمارے گاؤں میں چھوڑ دیتے ہیں۔ اس وقت یہاں اس قسم کے پانچ چھ آوارہ کتوں نے جھاڑیوں میں پناہ لے کر بھیڑ بکریوں پر حملہ کرنا شروع کر دیا ہے بلکہ خود ہمارے لیے اور ہمارے سکول جانے والے چھوٹے بچوں کے لیے خطرہ بنے ہوئے ہیں۔ کیا اس قسم کے آوارہ کتوں کو قرآن وسنت کی رُو سے ہلاک کرنے کی اجازت ہے؟ (حاجی عبدالرحمٰن السلفی، مدی جون۔ چترال) (۱۱ستمبر ۱۹۹۸ء)

جواب : شوقیہ کتا پالنا ناجائز ہے۔ اس سے اجر وثواب میں یومیہ ایک قیراط اور بعض دفعہ دو قیراط کی واقع ہو جاتی ہے۔ البتہ شکار اور مویشی اور کھیتی باڑی وغیرہ کی حفاظت کے لیے پالنا جائز ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں بایں الفاظ تبویب قائم کی ہے:

« بَابُ مَنِ اقْتَنَى كَلْبًا لَيْسَ بِكَلْبِ صَيْدٍ أَوْ مَاشِيَةٍ .» ❷

اہل علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کاٹنے والے کتے کو تلف کرنا جائز ہے۔

لہٰذا نقصان دہ کتوں کو آپ بھی قتل کر سکتے ہیں۔

کیا گھر میں شوقیہ کتا رکھا جا سکتا ہے؟

سوال : گھر میں شوقیہ کتا رکھنا اسلام کی رُو سے کیسا ہے؟ کتے کو اپنے بستر میں لٹانا کیسا ہے، کیا اس سے بستر پلید ہو جاتا ہے۔ (قاری حسان احمد میر پوری) (۲۵ جولائی ۲۰۰۳ء)

جواب : گھر میں بطورِ شوق کتا رکھنا حرام ہے۔ حدیث میں ہے:

«قَالَ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ لَا تَدْخُلُ الْمَلَائِكَةُ بَيْتًا فِيهِ كَلْبٌ وَلَا تَصَاوِيرُ.» ❸

کتے کو بستر وغیرہ پر نہیں لٹانا چاہیے کیونکہ کتا نجس ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی رطوبت وغیرہ سے لیٹنے کی جگہ بھی پلید ہوگی۔

---

❶ صحیح البخاری، بَابُ فَضْلِ سَقْيِ الْمَاءِ: ۲۳۶۵، صحیح مسلم، بَابُ تَحْرِيمِ تَعْذِيبِ الْهِرَّةِ وَنَحْوِهَا مِنَ الْحَيَوَانِ الَّذِي لَا يُؤْذِي، رقم: ۲۲۴۲

❷ نیل الاوطار: ۸/ ۱۳۵

❸ صحیح البخاری، باب التَّصَاوِيرِ ، رقم: ۵۹۴۹

مال کی نگہبانی کی نیت سے کتے کا گھر آنا

سوال: کتا گھروں میں رکھنا کیسا ہے جب کہ مال کی نگہبانی کے لیے رکھ سکتے ہیں۔ اب ہمارے ہاں گھروں کے ساتھ کی دیوار مال کے لیے حویلی بنائی گئی ہے۔ کتا گھروں میں متواتر آتا رہتا ہے۔ کیا ایسی صورت میں کتا گھروں میں آسکتا ہے۔ جب کہ نیت مال کو رکھوالی کی ہے۔ (سائل) (۱۹ اپریل ۱۹۹۹ء)

جواب: کوشش کرنی چاہیے کہ کتا گھر میں گھسنے نہ پائے سستی و کاہلی کی صورت میں ثواب میں کمی آنے کا اندیشہ ہے۔

گھروں میں جانور اور پرندے پالنے کا حکم

سوال: کیا گھروں میں طوطا پالنا جائز ہے؟ جب کہ حلت کے بارے میں قرآن وسنت میں واضح الفاظ نہیں ملتے؟

(ابوطلحہ گوالہ کالونی لاہور) (۱۶ جولائی ۱۹۹۹ء)

جواب: جانور یا پرندے کے پنجرے وغیرہ میں رکھنے کا جواز ہے۔ بشرطیکہ اس کی خوراک کا انتظام ہو۔ چاہے وہ ماکول اللحم (جس کا گوشت کھایا جا سکتا ہے۔ یا غیر ماکول اللحم ہو صحیح حدیث میں ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ایک عورت کو بلی کے سبب آگ کا عذاب دیا گیا۔ اس نے اس کو روکے رکھا۔ کھانے پینے کو کچھ نہ دیا۔ اور نہ اس کو چھوڑا کہ وہ زمین کے کیڑے وغیرہ کھا سکے۔ [1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بلی کو بند رکھنے کی صورت میں اگر وہ عورت کھانے پینے کو دیتی تو عذاب میں مبتلا نہ ہوتی۔

کیا بچوں کے کھلونوں کے طور پر گھر میں جانوروں کے مجسّمے رکھے جا سکتے ہیں؟

سوال: حدیث مبارک ہے کہ ''جس گھر میں تصویر یا کتا ہو اس گھر میں رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔'' تو بچوں کے کھلونے (مثلاً شیر، ریچھ، کتا اور دوسرے جانوروں کے مجسّمے) گھر میں لانا رکھنا شرعی لحاظ سے کیسا ہے؟

(ظفر اقبال، گوجرانوالہ) (۳۱ جنوری ۲۰۰۳ء)

جواب: مخصوص حالات میں مصلحت اور تربیت کے پیش نظر بچوں کے لیے جانوروں کی تصویریں بنانا اور رکھنا شرعاً جائز ہے۔ صحیحین وغیرہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی گڑیوں والا قصہ اس امر کی واضح دلیل ہے، یہ عموم نہی سے مستثنیٰ ہے۔ تاہم ایسی تصویروں سے بچنا چاہیے جن سے کفار کے ساتھ مشابہت لازم آئے۔ جیسے حرام جانوروں کی تصویریں ہیں:

«مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ.» [2]

---

[1] صحيح البخاري، كتاب بدء الخلق، بَابُ فَضْلِ سَقْيِ المَاءِ، رقم:٢٣٦٥

[2] سنن أبي داؤد، بَابٌ فِي لُبْسِ الشُّهْرَةِ، رقم:٤٠٣١

کیا بلی، کتا کی شکل کے کھلونے رکھنا درست ہے؟

سوال: بچوں کے اکثر کھلونے اصل کی شکل کے ہوتے ہیں، مثلاً بلی، کتا وغیرہ کیا ایسے کھلونے رکھنا درست ہے؟

(میر عبدالمجید) (۱۲ مئی ۲۰۰۰ء)

جواب: بخاری مسلم، ''مسند احمد'' کی مشہور روایت میں ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا گڑیوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھیں۔ اس حدیث سے استدلال کیا گیا ہے کہ بچیوں کے کھیلنے کے لیے گڑیاں بنانا جائز ہے تاکہ انھیں بچپن ہی سے امورِ خانہ داری کی تربیت دی جاسکے۔ میرے خیال میں محض کھیل کے لیے حرام جانوروں کی تصویروں سے بالخصوص احتراز کرنا چاہیے۔ لیکن شئے کا اصل کے مشابہ ہونا کوئی عیب کی بات نہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: عون المعبود: ۴/ ۴۳۹۔

بچوں کو مصروف کرنے کے لیے فلم چلانا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین کہ میرے دو بچے ہیں جن کی عمریں ۱۴ ماہ اور ساڑھے چار سال ہیں۔

یہ دونوں انتہائی تنگ کرتے ہیں۔ ہمارا گھرانہ مذہبی ہے بچوں کو قرآن اور احادیث بھی بتائی جاتی ہیں اور پردہ بھی۔ نیز ٹی وی بالکل بند ہے۔ اکثر وبیشتر میری بیوی کو نماز پڑھنے میں بہت تنگ کرتے ہیں۔ ہمارے پاس ایک فلم ہے جس میں ہاتھی، شیر، گھوڑے وغیرہ ہیں ہمیں اس حدیث کا پتا چلا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا گھوڑوں سے کھیلتی تھیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم منع نہیں فرماتے تھے۔

فتویٰ عنایت کریں کیا مذکورہ صورت میں میری بیوی نماز اور قرآن خشوع سے پڑھنے کی خاطر لالچ کے طور پر بچوں کو یہ فلم ٹی وی پر لگا کے دے سکتی ہے؟ کیا مندرجہ بالا حدیث تصویروں کی حرمت کے احکام کے باعث منسوخ ہے؟

(فرحان احمد، کراچی) (۱۳۔ اپریل ۲۰۰۷ء)

جواب: اسلام کھیل براہِ کھیل کا قائل نہیں۔ تصویر کا اس وقت جواز ہے جب اس سے مصلحت یا تربیت کا کوئی پہلو وابستہ ہو جو تہذیب نفوس، ثقافت یا تعلیم کے لیے مفید ہو مشار الیہ حدیث کو اہل علم نے تربیت اولاد پر محمول کیا ہے منسوخ نہیں۔ چناں چہ امام قرطبی فرماتے ہیں:

« قَالَ الْعُلَمَاءُ وَ ذٰلِكَ لِلضَّرُوْرَةِ اِلٰى ذٰلِكَ وَحَاجَةَ الْبَنَاتِ حَتّٰى يَتَدَرَّبْنَ عَلٰى تَرْبِيَةِ اَوْلَادِهِنَّ ثُمَّ اِنَّهٗ لَا بَقَاءَ لِذٰلِكَ .» [1]

مذکورہ بالا کھیل میں چوں کہ تربیت اولاد مقصود نہیں اس لیے اس پر بچوں کو مصروف رکھنا ناجائز ہے۔ ان کو مشغول رکھنے کا کوئی مباح طریقہ کار اختیار کرنا چاہیے۔ مثلاً: کھانے کے لیے ٹافیاں یا بچوں کی کسی مرغوب شے سے ان کا دل

[1] احکام القرآن: ١٤/ ٢٧٥

بہلایا جاسکتا ہے۔

امانت میں نقصان کا ذمہ دار کون ہے؟

سوال: الف اپنے کام میں مصروف تھا۔ ب اس کے پاس آیا۔ الف نے ب سے پوچھا کہاں جا رہے ہو؟ ب نے جواب دیا کہ ایک ذاتی کام سے شہر جا رہا ہوں۔ الف نے اس کو کہا کہ میری گھڑی لیتے جاؤ اس میں بیٹری سیل لگوا دینا۔ ب نے وہ گھڑی لے لی اور شہر چلا گیا۔ گھڑی ساز نے وہ گھڑی مرمت نہ کی اور ب کو واپس دے دی اور ب واپس اپنے مقام کی طرف لوٹ رہا تھا کہ راستہ میں موٹر سائیکل کو حادثہ پیش آ گیا اور اُس حادثہ کی وجہ سے وہ گھڑی گم ہوگئی۔ سوال یہ ہے کہ وہ گھڑی جو گم ہوئی ہے وہ نقصان الف کا ہوا ہے یا ب کا؟ مہربانی فرما کر کتاب وسنت کی روشنی میں رہنمائی فرمائیں۔ (اختر پینٹر، ضلع گھوٹکی، سندھ) (۱۹ جون ۱۹۹۸ء)

جواب: مذکورہ بالا صورت میں گھڑی الف کی ہے۔ نقصان بھی اسی کا ہوا ہے۔ اور ب کی حیثیت صرف امین کی ہے جس کا وہ ذمہ دار نہیں۔ ہاں البتہ اگر اس کی کوتاہی ثابت ہو جائے تو پھر اسے بھرنی پڑے گی۔

امانت گم ہو جانے کی صورت میں کیا کرے؟

سوال: محترم جناب حافظ صاحب! ایک آدمی نے امانت کے طور پر مدرسہ کے ریال تبدیل کرنے کے لیے مجھے دیئے اور وہ ریال میری کوتاہی کے بغیر میری جیب سے جیب تراش نے نکال لیے۔ مجھے اس کی کچھ خبر نہ ہوئی۔ بعد میں جب مجھے احساس ہوا تو بسیار تلاش کے باوجود وہ نہ مل سکے۔ منتظمین مدرسہ مجھ سے وہ ریال واپس طلب کرتے ہیں۔ میں غریب آدمی اور طالب علم بھی ہوں۔ ادائیگی کی طاقت نہیں رکھتا۔ میرے لیے قرآن وسنت کی روشنی میں کیا حکم ہے؟

(جاوید اقبال۔ فیصل آباد) (۱۳ اکتوبر ۲۰۰۰ء)

جواب: حقائق اور واقعات سے اگر یہ بات واضح ہو جائے کہ رقم کا ضیاع آپ کی کوتاہی کی وجہ سے ہوا ہے۔ اس صورت میں آپ اس رقم کی ادائیگی کے ذمہ دار ہیں۔ اور اگر کوئی کوتاہی ثابت نہ ہو تو ریالات ادا نہیں کرنے کیونکہ اس کی حیثیت امانت کی ہے۔

خرید وفروخت کے معاہدے کے بعد قبضے سے پہلے اگر سامان چوری ہو جائے تو؟

سوال: ایک شخص ''احمد علی'' نے ''خان محمد'' سے ایک بکرا خریدا۔ دونوں کے درمیان سودا طے پا گیا۔ مشتری نے کہا میں بکرا کل لے جاؤں گا۔ اگلی رات بکرا بائع کے گھر سے چوری ہو گیا پوچھنا یہ ہے کہ آیا: (۱) مشتری کو اس کی رقم بائع کو ادا کرنی ہوگی یا نہیں؟ (۲) ایسی بیع شریعت میں منعقد ہو جاتی ہے یا نہیں۔

(احمد علی چیچہ وطنی، ضلع ساہیوال) (۱۹ مارچ ۲۰۰۴ء)

جواب: شرعاً بیع کے پانچ ارکان ہیں:

۱۔ بائع (فروخت کنندہ) جو چیز وہ فروخت کر رہا ہے ضروری ہے کہ اس کا مالک ہو یا اس کی بیع کی اس کو اجازت ہو۔ عقل مند ہو، بے وقوف نہ ہو۔

۲۔ مشتری: (خریدار) ضروری ہے کہ جائز التصرف ہو، نادان اور بچہ نہ ہو۔

۳۔ مبیع: (بیچا جانے والا سامان) وہ جائز اور پاک ہو اور بائع اس کی ادائیگی پر قادر ہو۔ اور مشتری کو اس کا علم ہو، چاہے وصف کے اعتبار سے ہو۔

۴۔ ایجاب وقبول قول یا فعل سے حاصل ہو۔ مثلاً مشتری کہتا ہے یہ چیز مجھے فروخت کر دیں! بائع کہتا ہے میں نے فروخت کر دی۔ یا مثلاً مشتری کہتا ہے یہ کپڑا مجھے فروخت کر دیں، بائع اس کو پکڑا دیتا ہے تو بیع مکمل ہو جائے گی۔

۵۔ باہمی رضا مندی: طرفین کی رضامندی کے بغیر بیع منعقد نہیں ہوتی۔ سنن ابن ماجہ (۲۱۸۵) میں بسند حسن حدیث ہے۔ «اِنَّمَا الْبَیْعُ عَنْ تَرَاضٍ» ''کہ بیع تو باہمی رضا مندی سے مکمل ہوتی ہے۔''

موجودہ بیع میں چونکہ تمام ارکانِ بیع موجود ہیں لہٰذا بیع منعقد ہوگی۔ جب شرعی طور پر بیع قابل اعتبار ہے تو ظاہر ہے بائع کے پاس اس بکرے کی موجودگی محض امانت کی حیثیت سے تھی، چوری کی صورت میں مشتری کی ضائع ہوگی بائع اس کا ذمہ دار نہیں، بشرطیکہ اس کی کوتاہی ثابت نہ ہو۔ اگر اس چوری میں بائع کی غفلت اور کوتاہی ثابت ہو جائے تو پھر وہ ذمہ دار ہے۔

جب شرعاً بیع درست ہے تو ظاہر ہے کہ مشتری کو قیمت ادا کرنا ہوگی۔ واضح ہو کہ فی الفور قیمت کی ادائیگی ضروری نہیں بعد میں بھی ادا ہو سکتی ہے۔

کیا جمعہ کی چھٹی ضروری ہے؟

سوال: جمعہ کی چھٹی ضروری ہے؟ یا کسی اور دن بھی چھٹی کی جا سکتی ہے۔

(سائل: عرفان مجید مہر۔ امریکہ) (۵ جون ۱۹۹۸ء)

جواب: عام حالات میں اسلام میں چھٹی کا تصور نہیں۔ البتہ آدمی اپنی راحت اور آرام کی خاطر کسی دن بھی چھٹی کر سکتا ہے۔ اسلام میں کوئی پابندی نہیں۔ تاہم اولیٰ معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ کے دن چھٹی کی جائے تاکہ عبادت گو آدمی دن کے پہلے حصہ میں فضیلت کے اوقات کو بآسانی پا سکے جن کی تصدیق صحیح احادیث میں موجود ہے۔

حافظ ثناء اللہ مدنی حفظہ اللہ کی ذاتی زندگی کے متعلقہ سوالات

سعودی عرب سے مبعوث ہونے کا مطلب کیا ہے؟

سوال : رسائل و جرائد میں بعض علماء کے نام کے بعد سعودی مبعوث لکھا ہوتا ہے۔ اس سے کیا مراد ہے؟ کیا آپ بھی سعودی مبعوث ہیں؟ (محمد صدیق تلیاں۔سمندر کٹھ ضلع ایبٹ آباد) (۲۱ اگست ۱۹۹۸ء)

جواب : اس کا مفہوم یہ ہے کہ سعودی حکومت کی طرف سے ملازم ہیں۔ میرا شمار بھی ان میں سے ہے۔

اس وقت عالم اسلام کے سب سے عظیم عالم دین کون ہیں؟

سوال : آپ کے نزدیک اس وقت عالم اسلام کے سب سے عظیم عالمِ دین کون ہیں؟ جب کہ بہت سے اہل علم کے نزدیک علامہ محمد ناصر الدین البانی دمشقی ہیں۔ (محمد صدیق تلیاں۔سمندر کٹھ ضلع ایبٹ آباد) (۲۱ اگست ۱۹۹۸ء)

جواب : ذخیرۂ حدیث کی تحقیق میں علامہ البانی کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا اور فقاہت حدیث میں سماحۃ الشیخ ابن باز کا ہمسر ملنا مشکل امر ہے۔ مَتَّعَنَا اللّٰهُ بِطُوْلِ حَيَاتِهِمَا ۔میں نے مختلف مجالس میں مشاہدہ کیا۔ شیخ ابن باز، علامہ البانی کے بے حد قدر دان ہیں۔ ایک دفعہ طائف میں ان کی آمد پر بہت زیادہ مسرت کا اظہار فرمایا۔ شیخ کی عادت ہے کہ علامہ موصوف کی آمد پر جملہ مشاغل چھوڑ کر صرف دینی مسائل میں مصروف رہتے ہیں۔ اس کے باوجود کہ وہ کثیر المشاغل ہیں۔ جزاهم الله عنا خير الجزاء و تقبل مساعيهم

''الاعتصام'' کی اشاعت میں آپ کے کالم ''احکام و مسائل'' میں تعطل کی کیا وجہ ہے؟

سوال : ''الاعتصام'' کی اشاعت میں آپ کے کالم ''احکام و مسائل'' میں تعطل کیوں واقع ہوتا ہے؟

جواب : معزز قارئین ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور، ہم شدت سے محسوس کرتے ہیں کہ بعض دفعہ اشاعت فتویٰ میں تعطل کی وجہ سے آپ کے ساتھ رابطہ میں انقطاع پیدا ہو جاتا ہے، اس کی بنیادی وجہ بیرونی دورے ہیں۔ بالخصوص دولت کویت میں وزارت شؤون اسلامیہ کی نگرانی میں ایک عرصہ سے حدیث کی مشہور سات کتابوں کا سماع شروع ہے۔ مختلف ممالک اسلامیہ اور فرانس وغیرہ سے سینکڑوں خواتین وحضرات اس میں شرکت کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ اس سے قبل صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی کا سماع بتوفیق اللہ تعالیٰ مکمل ہو چکا ہے۔ آئندہ فروری کے اواخر میں ''سنن ابی داؤد'' اور ''سنن ابن ماجہ'' کے سماع کا پروگرام ہے۔ (ان شاء اللہ) دراصل مروجہ انداز تدریس کا مقصود محدثین کرام کے طریقہ تحدیث کو زندہ کر کے ''اجازۃ الروایات'' کا حصول ہے جو سلسلہ واسطہ در واسطہ رسول اللہ ﷺ تک پہنچتا ہے۔

اللہ رب العزت نے اس عظیم نعمت سے بالخصوص پاک و ہند کے بہت سارے علماء کو نوازا ہے جن کے اصل حضرت

شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ ہیں اور بعد میں شیخ الکل سید نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ ہیں۔ زمانہ دراز سے یہ سلسلہ متروک تھا دوبارہ اس میں روح پھونکنے کی سعی کی جارہی ہے۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے وزارت کویت کو جو اس مادی دور میں اسلام کی سربلندی کے لیے کوشاں ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس دورہ کے اثرات کئی ایک علاقوں میں محسوس ہونے لگے ہیں۔ سابقہ مجلس میں سعودی عرب کے معالی (اعلیٰ) وزیر ترکی اور قطر کے ایک اہم عہدہ دار نے شرکت کر کے بہترین تاثرات کا اظہار فرمایا کہ ایسی مبارک مجالس کا انعقاد ہم بھی اپنے ہاں کریں گے جب کہ دولت بحرین تیاری کے مراحل میں ہے۔ واللہ ولی التوفیق

(الراقم: ثناء اللہ بن عیسیٰ خاں)

شیخ ثناء اللہ مدنی صاحب کے علم وتعلیم کے متعلق ایک سوال

سوال: آپ نے مدینہ یونیورسٹی سے کب اور کس شعبہ میں سندِ فراغت حاصل کی۔ نیز وہاں جامعہ میں اور یہاں پاکستان میں آپ کے مشہور اساتذہ کون کون سے ہیں؟ (محمد صدیق تلیاں۔سمندر کھ ضلع ایبٹ آباد) (۲۱ اگست ۱۹۹۸ء)

جواب: میں مدینہ یونیورسٹی سے ۱۹۶۸ء میں شریعت کالج سے امتیازی حیثیت سے فارغ ہوا۔ اس وقت یہ واحد کالج تھا، باقی سب بعد میں بنائے گئے۔ بعد میں ڈبل ایم اے کیا۔ میرے بہت سارے شیوخ ہیں۔ ان میں سے حافظ عبد اللہ محدث روپڑی۔ محدث گوندلوی۔ علامہ البانی، علامہ محمد الامین الشنقیطی صاحب تفسیر اضواء البیان۔ ڈاکٹر تقی الدین الہلالی رحمہ اللہ، شیخ الحدیث مولانا محمد عبدہ الفلاح، مولانا عبدالغفار حسن، علامہ الشیخ حماد الانصاری۔ علامہ قادر بخش بہاول پوری وغیرھم۔

مکمل تفصیل میری کتاب "تذکرۃ الجھابذۃ الدرری" میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

آپ کی کوئی کتاب، یا کتابیں شائع ہوئی ہوں تو کہاں سے منگوائی جاسکتی ہیں؟

سوال: آپ کی کوئی کتاب، یا کتابیں شائع ہوئی ہوں تو کہاں سے منگوائی جاسکتی ہیں؟ قرآن وسنت سے اپنے عشق کی تسکین اور اپنی علمی پیاس کو بجھانے کے لیے قرآن وسنت کے علم پر مبنی سلفی علمائے کرام کی لکھی ہوئی زیادہ سے زیادہ کتابیں پڑھنے اور ان کو اپنے پاس ذخیرہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے کسی ایسے ادارے کا پتہ وغیرہ بتا دیجیے جو اس سلسلے میں میرے ساتھ تعاون کرے اور قیمت لے کر مجھ کو ترجیحاً اردو میں لکھی ہوئی کتابیں فراہم کرے۔

جواب: تاحال قابلِ ذکر میری کوئی تالیف نہیں کیونکہ زیادہ تر مشغلہ تدریس اور دعوت وتبلیغ ہے روزانہ دو مدرسوں میں تدریسی فرائض سرانجام دینے ہوتے ہیں تاہم فتاویٰ چند جلدوں میں زیر تدوین ہے۔ مکتبہ سلفیہ شیش محل روڈ کے علاوہ اُردو بازار لاہور میں ہمارے کافی تعداد میں کتب خانے پائے جاتے ہیں۔ ان سے رابطہ کریں۔ امید واثق ہے جملہ حضرات آپ سے تعاون کریں گے۔ ان شاء اللہ

آپ کی کتاب تذکرۃ الجھابذۃ الدرری کہاں سے مل سکتی ہے؟

سوال: آپ کی کتاب/ سند جو کہ فاروقی کتب خانہ والوں نے چھاپی تھی وہ کہاں سے مل سکتی ہے؟ اس کی ہمیں ضرورت ہے۔ (تذکرۃ الجھابذۃ الدرری) (محمد صدیق تلیاں، ایبٹ آباد) (۱۸ جون ۱۹۹۹ء)

جواب: تذکرۃ الجھابذۃ میرے پاس ہے لیکن یہ عام مطالعہ کی کتاب نہیں یہ تو صرف اس کو دی جاتی ہے جس کے تلمذ کا انتساب میری طرف ہو۔

فتویٰ کو مزید آسان بنائیں

سوال: محترم ومکرمی جناب شیخ الحدیث مولانا حافظ ثناء اللہ مدنی صاحب۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کے جاری کردہ فتویٰ جات ہفت روزہ الاعتصام میں بڑے شوق سے پڑھتا ہوں جو کہ بڑے معلوماتی ہوتے ہیں۔ جزاک اللہ۔ مگر فتویٰ میں قرآن وحدیث کے جو حوالہ جات آپ تحریر کرتے ہیں۔ ان کا اردو ترجمہ شامل نہیں ہوتا۔ جس سے پڑھنے والوں کو فتویٰ مکمل طور پر سمجھ نہیں آتا۔ حوالہ ہفت روزہ الاعتصام مورخہ ۱۵/۱۲/۹۵ (صفحہ: ۸۔۹) آپ نے صفحہ نمبر ۸ پر سوال نمبر ۳ کے جواب میں سبحانک اللہ پڑھنے میں تشریح نہیں فرمائی جس کی وضاحت بہت ضرورت ہے۔ دوسری مؤدبانہ گزارش ہے کہ آپ مہربانی فرما کر آسان اردو میں جواب تحریر فرمایا کریں تاکہ ہر پڑھنے والا سمجھ سکے۔ شکریہ۔ آپ کا مخلص (محمد یعقوب گڑھی شاہو۔ لاہور) (۱۵ مارچ ۱۹۹۶ء)

جواب: محترم جناب محمد یعقوب صاحب! گزارش ہے مقدور بھر میری کوشش ہوتی ہے کہ ہر فتویٰ آسان انداز میں تحریر ہو۔ بعض عربی عبارتوں کا ترجمہ اس لیے ترک کردیا جاتا ہے کہ ان کا مفہوم اردو عبارت میں واضح کیا جاچکا ہوتا ہے۔ یا پھر اس عبارت کی اصل ضرورت صرف عربی دانوں تک محدود ہوتی ہے۔ دوسری طرف الاعتصام کی تنگ دامنی پیش نظر ہوتی ہے۔ اس کے باوجود تعمیل کی سعی ہوگی۔

آپ نے جس سوال کے جواب کی عدم وضاحت کی نشاندہی فرمائی ہے وہ شاید کسی سہو کا نتیجہ ہے۔ آپ کی یاددہانی کا شکریہ۔

نماز میں ''سورۃ فاتحہ'' کی قراءت چونکہ ضروری ہے اور سبحانک اللہ پڑھنا مسنون ہے۔ لہٰذا صرف فاتحہ کی قراءت کا اہتمام ہونا چاہیے۔ ہاں البتہ مقتدی اگر یہ سمجھتا ہے کہ ثناء کے بعد امام کے رکوع میں جانے سے پہلے فاتحہ کو پا سکتا ہے تو ثناء بھی پڑھ سکتا ہے اور ''سورۂ فاتحہ'' کے علاوہ دوسری سورت بھی ملا سکتا ہے۔

تفسیر احسن البیان کہاں سے مل سکتی ہے؟

سوال: مولانا حافظ صلاح الدین یوسف صاحب کہاں ہوتے ہیں اور ان کی تفسیر ''احسن البیان'' کہاں سے مل سکتی

ہے۔منگوانے کا پتہ لکھنے کی زحمت کیجیے۔ (حاجی عبدالرحمٰن السّلفی چترال) (۱۵ جنوری ۱۹۹۹ء)

جواب: محترم مولانا حافظ صلاح الدین یوسف صاحب کی رہائش مصطفیٰ آباد (دھرم پورہ) مدنی روڈ لاہور۔جامع مسجد اہل حدیث کے ساتھ والے مکان میں ہے۔

ان کی تفسیر ''احسن البیان'' مکتبہ دارالسلام رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور سے مل سکتی ہے۔

مقامی خطیب کی بجائے دوسرے عالم سے سوال کرنا؟

سوال: اگر مسجد میں امام وخطیب موجود ہو جو درس وخطابت کے فرائض سرانجام دیتا ہو کیا اس کی موجودگی میں کسی اور سے مسئلہ پوچھنا جائز ہے اور جس سے پوچھا جائے اسے بتانا چاہیے یا نہیں؟ مجھے ایک آدمی نے کہا تھا کہ ایسے شخص کے لیے روا نہیں کہ وہ امام مسجد کی موجودگی میں مسئلہ بتائے۔ (کلیم بن محمد حسین۔راولپنڈی) (۱۹ اکتوبر ۲۰۰۱ء)

جواب: مسجد میں مقرر امام وخطیب سے اگر کوئی بڑا عالم موجود ہو تو مسئلہ اس سے پوچھنا چاہیے اور اگر کوئی علم میں امام وخطیب سے کم تر ہو تو پھر امام کو ترجیح دینی چاہیے۔ایک دفعہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو علم میراث کے ایک مسئلہ میں غلطی لگی جب کہ حضرت ابن مسعود نے درست بیان فرمایا، تو اس سے متاثر ہو کر انھوں نے کہا جب تک یہ بڑا عالم تم میں موجود ہے مجھ سے مسئلہ مت پوچھو، اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بڑے عالم کے علم کا اعتراف اور اس کی عظمت کا اظہار ہونا چاہیے تاکہ عوام اس کے علم سے کما حقہ مستفید ہو سکیں۔

سعودی حکومت کی طرف سے قائم شدہ ادارے کا ایڈریس چاہیے؟

سوال: سعودی حکومت کی طرف سے دعوت الی القرآن والسنۃ کا کوئی ادارہ (میرے خیال میں) پاکستان میں کام کر رہا ہے۔اس ادارے سے کہاں اور کس طریقے سے رابطہ کیا جا سکتا ہے۔یا اپنے اس علاقے میں قرآن وسنت کی اشاعت کے لیے سعودی عرب کے دعوت وارشاد کے کسی محکمے سے براہِ راست یہاں سے رابطہ کیا جا سکتا ہے۔

(حاجی عبدالرحمٰن السّلفی چترال) (۱۵ جنوری ۱۹۹۹ء)

جواب: اس سلسلہ میں سعودی عرب کے ادارہ مکتب الدعوۃ اسلام آباد سے رابطہ کریں وہ یقیناً آپ سے معاونت کریں گے۔ان کا ایڈریس ملاحظہ فرمائیں۔

SH.Abdul Rehman
H.No:85 Service Road F:10/1 Islamabad

آپ کون سے امام صاحب کے مقلد ہیں؟

سوال: سوال یہ ہے کہ آپ چار اماموں میں سے کس امام کے مقلد ہیں؟ اگر تو آپ کسی امام کے مقلد ہیں تو ٹھیک ہے اور اگر آپ کسی امام کے مقلد نہیں تو پھر اہل حدیث لوگ امام شافعی رحمہ اللہ کے مسلک کے مسائل کیوں بیان کرتے

ہیں؟ (سائل) (۱جون۲۰۰۱ء)

جواب: معلوم نہیں آپ نے چار اماموں کی تخصیص کیسے کر دی؟ اہل اسلام میں صرف چار امام نہیں، سینکڑوں امام گزرے ہیں، دین کی خاطر جن سب کی کاوشیں اپنی اپنی جگہ قابلِ قدر ہیں۔ جہاں تک تقلید کا تعلق ہے، اس بارے میں عرض ہے کہ اہل علم نے ''تقلید'' کی تعریف یوں کی ہے کہ:

«اَخْذ قَوْلِ الْغَیْرِ بِغَیْرِ دَلِیْلٍ»

یعنی دوسرے کی بات کو دلیل کے بغیر قبول کر لینا۔''

اہل حدیث کا مسلک تقلیدی نہیں بلکہ وہ کتاب وسنت کے دلائل کے ساتھ مزین بات کو قبول کرتے ہیں چاہے کسی امام کے مسلک و مذہب کے مطابق ہو یا خلاف، اہل حدیث صرف امام شافعی کے نہیں بلکہ جملہ اہل اسلام کے تقابلی مسالک بیان کرتے ہیں، تاکہ دلائل کے ذریعے راجح بات واضح ہو سکے۔ اہمیت صرف اس بات کو دیتے ہیں جو کتاب و سنت کے مستند دلائل سے ثابت ہو۔ مثلاً امام شافعی کا مسلک یہ ہے کہ ''تیمّم'' عارضی طہارت ہے ہر نماز کے لیے علیحدہ علیحدہ تیمّم کرنا ہوگا جب کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تیمّم عارضی طہارت نہیں بلکہ وضوء کے قائم مقام ہے۔ اہل حدیث کا مسلک بھی یہی ہے۔ اس بناء پر نہیں کہ یہ حنفیہ کا مسلک ہے بلکہ اس لیے کہ اس کی دلیل مستند، قوی اور مضبوط ہے۔

چنانچہ حدیث میں ہے کہ «اَلصَّعِیْدُ الطَّیِّب وُضُوء»[1]

پاکیزہ مٹی سے تیمّم کرنا وضوء ہی ہے۔''

امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی ''صحیح بخاری'' میں یہی مسلک اختیار کیا ہے۔ رہ گیا معاملہ تقلید کا تو ائمہ کرام نے خود اپنی تقلید سے روکا ہے۔ چنانچہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو میری دلیل نہیں پہچانتا اس کے لیے حرام ہے کہ میرے قول کے ساتھ فتویٰ دے۔ ملاحظہ ہو: الانتقاء لابن عبدالبر اور ''اعلام الموقعین'' ابن قیم وغیرہ۔

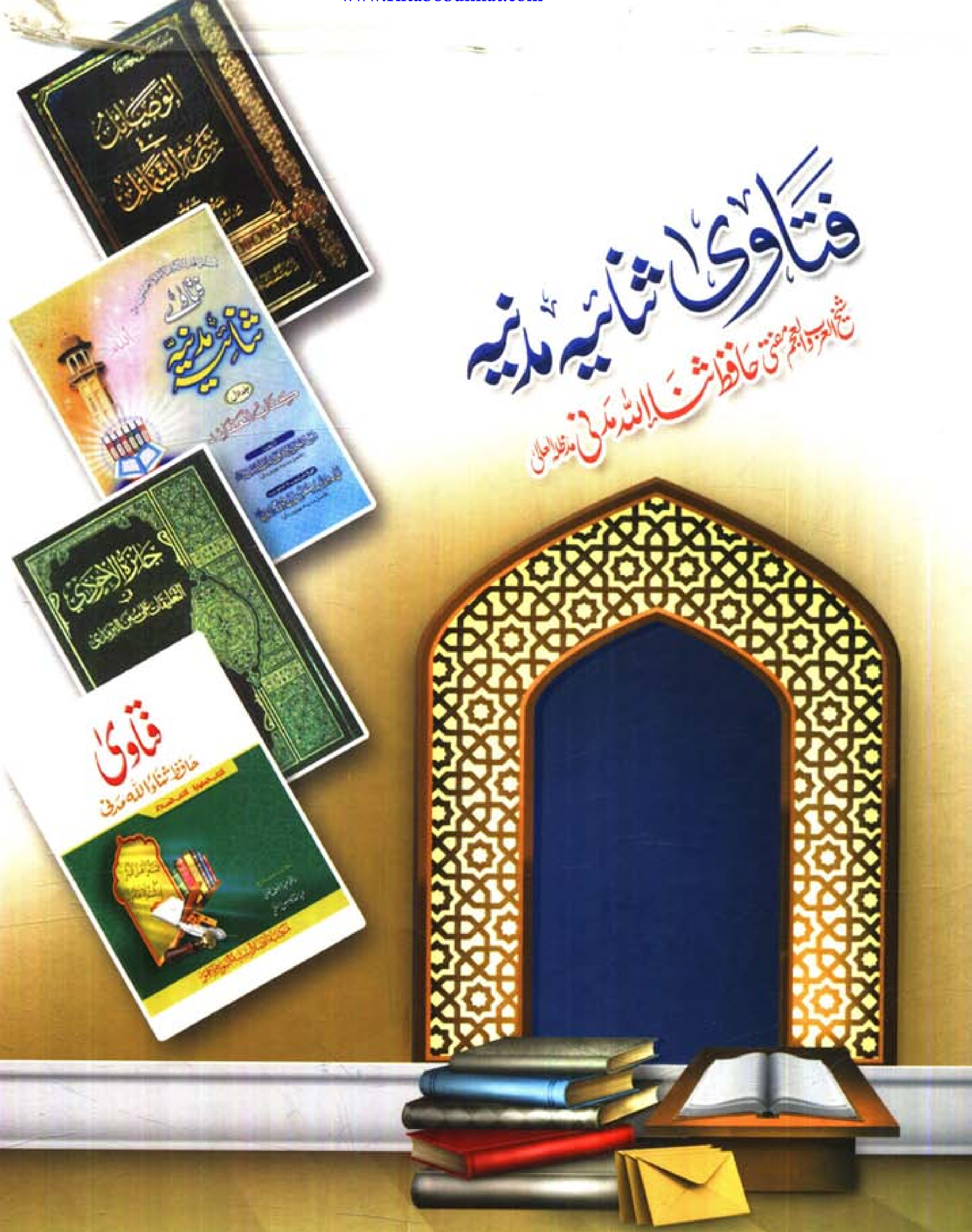
امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ جس کے لیے رسول اللہ ﷺ کی سنت واضح ہو جائے اس کے لیے حلال نہیں کہ کسی کے قول کی بناء پر اس کو چھوڑ دے۔'' (الایقاض فلانی)

نیز فرمایا: ''صحیح حدیث میرا مسلک ہے۔'' (المجموع نووی رحمہ اللہ)

---

[1] سنن أبی داؤد، بَابُ الْجُنُبِ يَتَيَمَّمُ، رقم:۳۳۲

یادداشت



كلية القرآن الكريم والتربية الاسلامية

البدر (بونگہ بلوچاں) نزد پھول نگر قصور

Phone: 049-4513116 Mob: 0333-4358421, 0333-4296679
Fax: 049-4513115 Mob: 0333-4084583, 0300-4306893
www.quraancollege.com Email.quraancollege@hotmail.com